
سسپنس ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
موت کے سوداگر
6
چھٹا حصہ
www.paksociety.com

موت کے سوداگر

اقلیم علیم

ایک نوجوان کی خودنوشت جوانیوں کے ہاتھوں برباد ہو کر منزل کے نشان کھو بیٹھا تھا۔ ان نوجوانوں کی داستان عبرت جن کی پرورش کمال سے ہوئی تھی۔ زر پرستوں کا احوال جنہیں سونے چاندی کی خیرہ کن چمک نے بینائی سے محروم کر دیا تھا۔ موت کے ان سوداگروں کا ماجرا جو اپنے بچوں کو گود میں ہی اپنے ہاتھوں زہر پلا رہے ہیں

سسپنس کا ایک تحیر خیز سلسلہ مدہوشوں کی کہانی ہوشمندوں کی عبرت کے لیے

"پھر بھی تم غنیمت ہو۔ اطالوی مرد تو ہر خوبرو عورت پر پہلی ہی نظر میں مر مٹنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہر نئی لڑکی سے ملتے ہی پچھلی عورت کو یکسر بھول جاتے ہیں۔"

نادیہ نے تیسری منزل کے کمرا نمبر ۱۲ پر دستک دے کر جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی کنجی سے دروازہ کھول دیا۔ میں باہر ٹھٹکا تھا لیکن اُس نے مجھے اپنے پیچھے ہی اندر بلا لیا۔

وہ کمرا میرے کمرے سے مشابہ تھا لیکن اس وقت خالی اور بکھرا ہوا تھا۔ باتھ روم کے بند دروازے کے پیچھے شاور سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید زوتی باہر جانے سے پہلے غسل کرنے میں مصروف تھا۔

نادیہ نے کمبل اور کپڑے سمیٹ کر میرے لیے ایک کرسی خالی کی۔ میں نے اس کا اوور کوٹ اُتروانے میں اس کی مدد کی پھر وہ جوتے اُتار رہی تھی کہ زوتی بدن پر تولیا لپیٹے باتھ روم سے برآمد ہوا اور میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

وہ اساطیری دیوتاؤں کی طرح مردانہ حسن اور وجاہت کا شاہکار تھا۔ سیاہ گھونگریالے بالوں کے نیچے روشن اور چمکدار آنکھیں زندگی سے بھرپور تھیں۔ چوڑے شانوں، کشادہ سینے اور مضبوط بازوؤں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسرت کا عادی تھا۔ اس کا قد کسی بھی طرح سوا چھ فٹ سے کم نہیں تھا اور اگر نادیہ نے اس کے چکر میں اپنی زندگی برباد کر لی تھی تو وہ کچھ ایسی قصوروار بھی نہیں تھی۔ زوتی آزاد خیال عورتوں کے لیے ہر زاویے سے سحر انگیز شخصیت کا مالک تھا لیکن مجھے حیرت تھی کہ اس قدر شاندار مرد ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی کامیابیوں کے لیے نادیہ بنگالا کو سیڑھی بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ پیٹر ہے زوتی، میرا نیا دوست!" نادیہ نے انگریزی میں میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "نچلی منزل پر ٹھہرا ہوا ہے۔ میں نشے کی جھونک میں آج اسی کے کمرے میں چلی گئی تھی، یوں ہم دوست بن گئے۔"

زوتی نے ملائم آواز میں رسمی فقرے ادا کرتے ہوئے مجھ سے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا پھر بولا "تم نادیہ کے حسن سے تو ضرور مرعوب ہوئے ہو گے، یہ بہت غیر معمولی لڑکی ہے۔"

"یقیناً!" میں نے پُرزور لہجے میں اس کی تائید کرتے ہوئے دانستہ ایک بے لگام فقرہ کہا۔ "میں نے اسے دیکھا اور اس کے ساتھ لگا ہوا تمہارے کمرے تک چلا آیا۔ کسی لڑکی کا اس سے زیادہ غیر معمولی پن اور کیا ہو گا؟"

خلافِ توقع زوتی کی پیشانی پر بل تک نہ آیا بلکہ وہ فخریہ انداز میں زور زور سے ہنسنے لگا اور اسی لمحے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے شیر جیسے پنجر میں واقعی گیدڑ کی روح پناہ گزیں تھی۔

"تم پھر دوموڑ سے ملنے جا رہے ہو، میرا موڈ ہوا تو میں پیٹر کے

ساتھ باہر جاؤں گی،" نادیہ نے کہا اور وہ والہانہ انداز میں مُسکرا دیا۔

"ضرور جاؤ لیکن اپنا دھیان رکھنا۔ کِدھر جانے کا ارادہ ہے؟" آخری سوال اُس نے مجھ سے کیا تھا۔

"کوئی خاص پروگرام نہیں ہے۔ موقع ملا تو ڈوم کے علاقے میں کسی کلب میں جا بیٹھیں گے۔" میں نے ڈاکٹر گوسیپی کے نائٹ کلب کا تصور کرتے ہوئے اپنے جواب سے نائٹ کا لفظ حذف کرتے ہوئے کہا۔

"اس طرف گیمبلرز نامی نائٹ کلب بہت بہتر اور مہنگا ہے۔" زوتی نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "پیشگی بکنگ کے بغیر عام طور پر وہاں کے ٹکٹ نہیں ملتے۔ وہاں جانا چاہو تو میرے ایک دوست سے مل لینا، وہ وہاں چیف بارٹینڈر ہے۔ کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لے گا۔"

زوتی یا تو بہت سادہ لوح تھا یا پھر بلا کا خود غرض اور مکار کہ مجھے اپنی گرل فرینڈ کو شہر کے ایک مہنگے نائٹ کلب میں لے جانے کا مشورہ دے رہا تھا۔ شاید اس طرح وہ میری مالی حیثیت کا تعین کرنا چاہ رہا تھا۔

"تم لڈوگ ہان کی بات تو نہیں کر رہے جو کچھ دن ہمارا مہمان رہا تھا؟" نادیہ نے زوتی سے سوال کیا۔

"ہاں وہی، یہ اچھی بات ہے کہ تم اُسے بھولی نہیں ہو۔"

میں چند منٹ بعد وہاں سے رخصت ہوا تو میرے ذہن میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ اس جوڑے کا باہمی رویہ ڈیپلک کے ہر معیار سے مجھے عجیب اور سنسنی خیز محسوس ہو رہا تھا۔ باہمی رواداری کی اور بات تھی، وہاں تو زوتی خود نادیہ کو دلدل کی طرف دھکیلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پھر معاً مجھے ویرا یاد آ گئی جو روم میں ایک طویل مدت ڈان مرسیانو کی سرپرستی میں گزار چکی تھی۔ ویرا کے نزدیک وہ صرف ایک مہربان دلال تھا جب کہ ڈان مرسیانو اچھی طرح جانتا تھا کہ ویرا اس کی اکلوتی بیٹی تھی مگر پھر بھی ڈان مرسیانو یا جمی لائیڈ ویرا کے چہرے پر دن رات گناہوں کی سیاہی ملتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسا ہولناک نفسیاتی مرض تھا جو زوتی اور جمی لائیڈ جیسے شاندار مردوں کو اپنی محبوب ہستیوں کے ہتک آمیز استحصال پہ مجبور کر رہا تھا۔

پھر وہیں سے میری ذہنی رَو ڈاکٹر گوسیپی کی طرف بھٹک گئی جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود میلان میں شی کا چیف تھا۔ کارلو نے میرے ہاتھوں مرنے سے پہلے بتایا تھا کہ ڈوم کے علاقے میں ڈاکٹر گوسیپی نے ایک نائٹ کلب کھولا ہوا تھا۔ میرے دل میں خواہش اُبھری کہ کاش زوتی کا بتایا ہوا گیمبلرز نائٹ کلب اسی کی ملکیت ہو تاکہ میں نادیہ اور لڈوگ ہان کے مراسم سے فائدہ اُٹھا کر شی کے مقامی رازوں تک رسائی حاصل کر سکوں تاکہ جمی لائیڈ کا سر کچلنے کا کام آسان ہو سکے۔

اپنے کمرے میں آ کر بھی میں دیر تک اسی بارے میں سوچتا رہا۔ میں جمی لائیڈ کو اس کے سارے وسائل سمیت چکمہ دے کر مارسیلز سے نکل آنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن ویرا اور سلطان شاد کے نہ پہنچنے کی وجہ سے میری طبیعت بہت پریشان تھی، اگر وہ راستے میں شی والوں کے ہاتھ لگ جاتے تو میلان میں میرے ہاتھوں کارلو وغیرہ کے قتل کی خبر پھیلتے ہی ان کے لیے ناقابلِ تصور مشکلات کا آغاز ہو سکتا تھا۔ میں نے ان تینوں کی لاشوں کو کار سمیت نذرِ آتش کر کے بہت سی نشانیاں مٹا دینے کی کوشش کی تھی جن میں چارلس ڈویلین کی شناخت بھی شامل تھی لیکن ان ڈھانچوں کی باقیات کو اگر میز پر لے جانا ممکن ہو جاتا تو پوسٹ مارٹم کے ذریعے یہ راز فاش ہونے کا اندیشہ تھا کہ ان کی موت آگ سے نہیں بلکہ دلوں کو چھید دینے والی کسی ایسی آتشیں چیز سے واقع ہوئی تھی جس میں گولی وغیرہ کی قسم کی کوئی چیز استعمال نہیں کی گئی تھی اور یہ اشارہ شی کے ذمے داروں کو فوراً بیم گن کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتا جو تنظیم سے باہر صرف میرے قبضے میں موجود تھی اور یوں میلان میں میری موجودگی کا راز کُھل سکتا تھا۔

میں ان ہی خیالات میں اُلجھا ہوا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک کی آواز سُن کر چونک پڑا۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا تو نادیہ پوری تیاریوں کے ساتھ شعلۂ جوالہ بنی ہوئی میرے سامنے موجود تھی۔

"ارے تم ابھی تک اسی حُلیے میں ہو۔ کیا باہر چلنے کا ارادہ نہیں ہے؟" اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"مجھے کیا تیار ہونا ہے؟ بس اسی طرح ساتھ چلوں گا۔" میں نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے گیمبلرز میں داخلے کے لیے لباس کی پابندی ہو۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"پھر بازار سے کوئی ریڈی میڈ سوٹ خرید لوں گا۔ اس وقت تو ایسے ہی چلوں گا۔" میں نے اس کی نگاہ بچا کر بیم گن جیب میں ڈال لی۔

ہم دونوں لفٹ سے نیچے پہنچے تو نشست گاہ میں کئی افراد موجود تھے۔ "خبریں سُنو گے؟" نادیہ نے سوال کیا۔

"بیکار ہی ہو گا۔ زبان نہ آتی ہو تو آدمی بالکل ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "تم سُن کر دہرا سکو تو رُکنے کے لیے تیار ہوں۔" آخری فقرہ میں نے اس امید پر کہا کہ شاید ٹی وی پر الفارد میو کی تباہی کے بارے میں کچھ بتایا جائے۔

پھر ہم بھی خبریں سُننے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ اس وقت بار پر رونق آئی تھی۔ ہیملٹ گردش کر رہے تھے میں نے بھی بڑھ کر دو پیگ لیے اور نادیہ کے پاس آ کھڑا ہوا۔ گلاس سے اپنے لب تر کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہاں موجود بشتر

اطالوی مرد نادیہ کی ذات میں دلچسپی لے رہے تھے۔ شرفا زدیدہ نظروں پر اکتفا کر رہے تھے جبکہ دو تین ڈھیٹ قسم کے نوجوان اسے مسلسل گھورے جا رہے تھے اور نادیہ ان سب کو نظر انداز کر کے ٹی وی پر خبریں دیکھ رہی تھی۔

چند منٹ بعد اناؤنسر کی آواز کے ساتھ ٹیلی وژن پر ایک میدان میں شعلوں میں گھری ہوئی کار دکھائی دی تو وہاں موجود لوگوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دیکھا کہ جب کیمرے نے اس حادثے کو اپنی گرفت میں لیا تو خوفناک شعلے بڑی حد تک ماند پڑ چکے تھے اور شاندار الفارد میو کی باڈی کا بیشتر حصہ آگ سے پگھل کر نیست و نابود ہو چکا تھا۔ مجھے امید تھی کہ ایسی ہولناک آگ میں ان تینوں کے جسموں کی بس راکھ ہی بچ سکی ہو گی۔

اسکرین پر آگ بجھانے والی دو گاڑیاں اور ایک پولیس کار بھی نظر آئی پھر دوسری خبریں شروع ہو گئیں۔ جب تک خبریں جاری رہیں، اس مختصر سے لاؤنج میں مکمل خاموشی طاری رہی پھر خبریں ختم ہوتے ہی تقریباً سب نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا اور نادیہ میرا ہاتھ تھام کر وہاں سے باہر نکل آئی۔

ہوٹل سے باہر نکلتے ہی بھیگی ہوئی سرد ہواؤں نے ہمارا استقبال کیا تھا۔

"کیا خبریں تھیں؟" میں نے نادیہ کو اس کا وعدہ یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"امریکی صدر نے لیبیا کے کرنل قذافی کو ایک بار پھر عالمی دہشت گرد قرار دیا ہے۔ شمالی سمندر میں مزید تیل کے ذخائر دستیاب ہوئے ہیں۔ لبنان میں خانہ جنگی جاری ہے لیکن آج شہر میں ایک روح فرسا حادثہ رونما ہوا ہے۔" وہ بولی۔

"وہی جس میں کار جلتی ہوئی دکھائی گئی تھی؟"

"ہاں! وہ کار سڑک کے بجائے کھیل کے ایک میدان میں تھی جو سردی کی وجہ سے بالکل ویران پڑا ہوا تھا۔ آگ اتنی شدید تھی کہ باڈی اور انجن کے بیشتر حصّے پگھل گئے۔ اس میں سے کوئلہ بنے ہوئے تین انسانی ڈھانچے بھی ملے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انھیں خاص طور پر جلایا گیا ہے۔ کار کی آگ سے جلتے تو ان کے جسم کے کچھ حصّے ضرور باقی بچ جاتے۔"

"پھر تو ان بے چاروں کی شناخت بھی نہ ہو سکی ہو گی؟" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

نادیہ نے اپنے سر کو مایوسی کے ساتھ نفی میں جنبش دی۔ "البتہ تفتیشی ماہرین کو ملبے میں سے کچھ نقصان زدہ فرانسیسی سکّے ملے ہیں جن کی بنا پر سوچا جا رہا ہے کہ اگلی نشست پر ڈرائیور کے برابر میں بیٹھا ہوا شخص فرانس سے آیا تھا۔ کار کی رجسٹریشن نمبر کی پلیٹیں تک آگ میں پگھل گئی ہیں اس لیے اب انجن اور چیسز کے نمبروں کے ذریعے کار کے مالک کا سراغ لگانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ پتا نہیں وہ حادثہ تھا یا کسی شقی القلب درندے نے ان تینوں کو اپنا نشانہ بنایا ہے!"

"کوئی پرانی دُشمنی رہی ہو گی۔" میں نے تبصرہ کیا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرنے والے خود بھی شریف آدمی نہ ہوں۔ مجرمانہ رقابتوں میں ہی ایسے مجرمانہ شاہکار سامنے آتے ہیں۔"

ہم ٹیکسی کے ذریعے چند منٹ میں روشنیوں سے جگمگاتی ہوئی اس عمارت کے سامنے پہنچ گئے جس پر بڑے بڑے روشن حروف میں گیمبلرز کا نام چمک رہا تھا۔ اندر ٹکٹ گھر کُھلا ہوا تھا۔ اتنی آسانی کے ساتھ ٹکٹ مل جانے پر مجھے مایوسی ہوئی کیونکہ لڈوگ سے تعارف حاصل کرنے کا وہ موقع ضائع ہو گیا تھا۔

دس ہزار لیرا فی کس ٹکٹ لے کر ہم اندر داخل ہوئے تو الف لیلوی ماحول نے فوراً ہی ہمیں مسحور کر لیا۔ وسیع و عریض ہال میں دبیز سرخ قالین پر بیش قیمت چوبی فرنیچر لگا ہوا تھا۔ ہال میں جا بجا دھیمی روشنیوں والے بلور کے فانوس جھلملا رہے تھے۔ بیشتر میزیں بھری ہوئی تھیں اور ان پر شیشے کی چمنی والے شمع دانوں میں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ فضا میں الکحل اور تمباکو کی خوشگوار بُو رچی ہوئی تھی۔ اسٹیج پر پردہ گرا ہوا تھا مگر پوشیدہ اسپیکروں سے اُبھرنے والی ہیجان انگیز موسیقی میں کئی عورتیں ناکافی لباس اور رنگین دھجیوں میں ملبوس میزوں کے درمیان، ہال میں ناچتی پھر رہی تھیں۔

ہمارے اندر داخل ہوتے ہی ایک اسٹیورڈ نے ہمارے ٹکٹ دیکھے اور پھر احترام کے ساتھ میز کی طرف ہماری رہنمائی کرنے لگا۔ نادیہ نے راستے ہی میں اس سے لڈوگ کے بارے میں کچھ بات کی اور جب وہ ہمیں میز کے گرد بٹھا کر چلا گیا تو نادیہ نے بتایا کہ لڈوگ ڈیوٹی پر موجود تھا۔ اسٹیورڈ نے اسے میز پر بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

مین اسٹیج شو کا وقت ساڑھے نو بجے تھا اس لیے اس وقت ہال میں کھانے پینے کا دور چل رہا تھا۔ بیرا مینو لایا تو اس کے پہلے صفحے پر نگاہ ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ گیمبلرز کی مہنگائی کے بارے میں زوتی کا تبصرہ غیر ضروری نہیں تھا۔ ڈی لکس اسکاچ کا ایک سنگل پیگ ساڑھے چار ہزار لیرا کا تھا اور وائن کی سب سے سستی بوتل بیس ہزار لیرا کی تھی۔ کھانے کی کوئی ڈش تیس ہزار لیرا سے کم نہیں تھی۔ "یہ تو بہت مہنگا کلب ہے۔" مینو پر نگاہ ڈال کر نادیہ پریشان ہو گئی۔

"فکر نہ کرو۔ اگر کم پڑ گئے تو ڈالروں میں ادائیگی ہو جائے گی۔ تم جو چاہو وہ منگوا سکتی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔ "تم جیسی نازنین کے ساتھ یہ شام ہر داموں سستی ہے۔"

نادیہ ویٹر کو آرڈر نوٹ کرانے لگی۔ اسی اثنا میں ایک سُبک اندام رقاصہ میزوں کے درمیان ناچتی ہوئی میرے قریب آ کر تھم گئی اور اس وقت تک وہیں ٹھہری، ناچ ناچ کر چھیڑ چھاڑ کرتی رہی جب تک میں نے ایک نوٹ اسے نہ تھما دیا۔

"کس قدر کاروباری ماحول ہے یہاں کا۔ مجھے تو ابھی سے وحشت ہو رہی ہے۔" نادیہ منمنائی۔

"کھلا کاروبار ہے۔ یہاں لوگ تماشا دیکھنے آتے ہیں اور وہی دکھایا جاتا ہے۔ اسے تم قصاب کی دکان بھی سمجھ سکتی ہو جہاں رانیں کانٹے میں لٹکانے کے بجائے فلور پر نچائی جاتی ہیں۔ دیکھو، پسند کرو اور پھر خرید لو۔"

"مجھے تو یہ سب کراہت آمیز لگتا ہے۔ پتا نہیں کس ذوق کے لوگ اس ماحول سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔"

"دیکھ لو، ہال تقریباً بھرا ہوا ہے۔ مس اٹلی بننے کے لیے تمھیں ایسے ہی مرحلوں سے گزرنا پڑے گا۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ وہاں تماشائیوں کے علاوہ ججوں پر مشتمل ایک جیوری بھی ہوگی۔"

"زوقی کہتا ہے کہ وہ سب صرف ایک بار ہوگا۔ میں جیت گئی تو ہزار پردوں میں بھی مس اٹلی ہی کہلاؤں گی۔ یہاں تو ہر روز کٹھ پتلیوں کا یہی کھیل ہوتا ہوگا۔"

ہماری گفتگو وہیں منقطع ہو گئی کیونکہ اسی وقت سامنے سے آتا ہوا بڑی بڑی مونچھوں والا ایک دراز قامت شخص ہمارے قریب آ کر رک گیا تھا۔ میرے بعد اس کی نظر جب نادیہ پر پڑیں تو وہ اسے پہچان کر بہت تپاک سے ملا تھا۔ نادیہ نے اس سے میرا تعارف کرایا اور پھر لڈوگ ہماری میز کے گرد ہی بیٹھ گیا۔

ان دونوں میں بڑے جوشیلے انداز میں رسمی گفتگو کی ابتدا ہوئی۔ لڈوگ نے زوقی کے بارے میں بہت سے سوالات کیے اور جب وہ باہمی دلچسپی کے سارے موضوعات ختم کر لینے کے بعد میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق کلب کی تعریف کر دی جس پر اس کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا۔

"یہ نیا کلب ہے۔" وہ مجھے بتانے لگا۔ "اس کی بہت احتیاط سے پیشہ ورانہ انداز میں منصوبہ بندی کی گئی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کلب میں کامیاب ترین شو ہونے کے باوجود کبھی کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔"

"مالکان سے سارے شہر کے بدمعاش ڈرتے ہوں گے۔" میں نے رائے ظاہر کی۔

"ڈاکٹر گوسیپی بہت پڑھا لکھا مگر سخت گیر آدمی ہے۔ جو سوچ لیتا ہے اُسے ہر قیمت پہ کر گزرتا ہے۔" اس کے منہ سے وہ نام سنتے ہی میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ "دراصل اُس ہوٹل کے داخلے کے راستے پر خفیہ ویڈیو کیمرے لگے ہوئے ہیں جن کی مدد سے ہر شو میں آنے والوں کی فلم بنتی رہتی ہے اور پولیس کے محکمے کا ایک ریٹائرڈ افسر مانیٹرنگ روم میں اسکرین پر براہِ راست آنے والوں کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ اگر کوئی ناپسندیدہ شخص اندر آ جائے تو کلب کے محافظ خاموشی کے ساتھ اُسے اُٹھا کر ہال سے باہر فٹ پاتھ پر پھینک دیتے ہیں۔ اسی لیے میلان کے شرفا کی بڑی تعداد ہمارے مستقل سرپرستوں میں شامل ہوتی جا رہی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہماری بھی فلم بنی ہوگی؟" میرے بجائے وہ اہم سوال نادیہ نے کر ڈالا۔

"بالکل بنی ہوگی۔" اُس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "آج ڈاکٹر گوسیپی اپنے ایک مہمان کے ساتھ بذاتِ خود مانیٹرنگ روم میں موجود ہے ورنہ میں وہاں فاضل اسکرین پر تمھیں تمھاری فلم دکھا سکتا تھا۔ تم آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ تمھاری تصویریں بہت عمدہ آئی ہوں گی جنھیں ڈاکٹر بھی دیکھتا رہ گیا ہوگا۔"

وہ اطلاع میرے لیے چونکا دینے والی تھی۔ اس لیے میں نے سرسری لہجے میں دریافت کیا۔ "کیا آج کوئی خاص بات ہے جو تمھارا ڈاکٹر بذاتِ خود مانیٹرنگ روم میں موجود ہے؟"

"میرے لیے تو سب سے خاص بات یہی ہے کہ آج نادیہ بنگالا میرے کلب میں آئی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "دوسری کوئی بات میرے علم میں نہیں۔ ویسے ضرور کوئی خاص بات ہی ہوگی ورنہ ڈاکٹر ان معاملات میں دخل نہیں دیتا۔"

"ڈاکٹر ہو کر نائٹ کلب چلا رہا ہے۔ اسے تو کوئی اسپتال کھولنا چاہیے تھا۔" نادیہ نے مُنہ بنا کر کہا۔

"وہ پی ایچ ڈی ہے۔ معاشیات میں ڈگری لی ہے اُس نے۔" لڈوگ اس کی قابلیت سے مرعوب نظر آ رہا تھا۔

میرا دل چاہا کہ اس سے ڈاکٹر گوسیپی کے اس مہمان کے بارے میں تفصیلات دریافت کروں جو اس کے ہمراہ مانیٹرنگ روم میں موجود تھا لیکن ایسے خصوصی سوالات پر لڈوگ میری طرف سے بھڑک سکتا تھا اس لیے میں نے اس بارے میں اپنی زبان بند رکھنے کا فیصلہ کر لیا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت میں جلد از جلد اس نائٹ کلب سے نکل بھاگنے کی فکر میں پڑ گیا تھا۔ ویڈیو کیمروں کی موجودگی کے انکشاف نے مجھے ذہنی طور پر پریشان کر دیا تھا۔ پھر رہی سہی کسر اس خبر نے پوری کر دی تھی کہ گوسیپی اپنے کسی مہمان کے ساتھ خلافِ معمول خود مانیٹرنگ روم میں موجود تھا۔

آدمی کا ذہن کسی ایک راہ پہ لگ جائے تو بہتیرے واقعات کی کڑیاں خود بخود ملتی چلی جاتی ہیں۔ اس وقت بھی میرے ساتھ یہی کچھ ہو رہا تھا۔ لڈوگ نادیہ کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا اور میرے ذہن میں تیزی کے ساتھ واقعات کی ایک فلم بنتی جا رہی تھی۔

کار کے ساتھ تینوں لاشیں جل کر راکھ ہو گئی تھیں جس کی وجہ سے پولیس کو اس واقعے کی تہ تک پہنچنے میں بہت سی دشواریاں پیش آ سکتی تھیں لیکن جمی لائیڈ بے پناہ وسائل کے ذریعے تیزی سے نتائج اخذ کرنے کا اہل تھا۔

کارلو موریرو بنیادی طور پر میلان کا باشندہ نہیں تھا بلکہ مارسیلز سے چارلس ڈولین کا پیغام ملنے پر پور تو گوریرو سے اپنے ذاتی ہوائی جہاز پر پائلٹ کے ساتھ میلان آیا تھا۔ اُس کا بھائی پالو موریرو اس کا دستِ راست تھا اس لیے ان تفصیلات سے اس کا باخبر ہونا ضروری تھا۔ کارلو اور اُس کے پائلٹ کا اپنے جہاز پر واپس نہ پہنچنا، پھر ایک ویران میدان میں جلی ہوئی الفاردمیو میں تین لاشوں کا پایا جانا جمی لائیڈ کو کڑیاں ملانے میں مدد دے سکتا تھا۔

اُسے ایک فون کال کے نتیجے میں لیزلی درہام سے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ چارلس ڈولین کی ڈیوٹی مارسیلز ایئرپورٹ پر تھی اس لیے وہ سمجھ لیتا کہ چارلس نے مارسیلز سے کسی مشتبہ آدمی کا تعاقب شروع کیا تھا جو میلان تک جاری رہنا تھا۔ وہاں اس نے اپنی مدد کے لیے پور تو گوریرو سے کارلو کو طلب کر لیا تھا لیکن پھر جلی ہوئی کار میں تین لاشیں تو دستیاب ہو گئیں لیکن مشتبہ آدمی کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

اس سے لازمی طور پر ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ میلان میں مشتبہ آدمی کے حامی بھی موجود تھے جن کی مدد سے اس نے اپنے تینوں دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پوسٹ مارٹم ہوتا یا نہ ہوتا۔ جمی لائیڈ پوری صورتِ حال سمجھ سکتا تھا۔ پھر اس مشتبہ آدمی کے خانے میں صرف میرا ہی نام فٹ ہوتا تھا۔

جمی لائیڈ کو ایک بار یہ علم ہو جاتا کہ میں میلان میں موجود تھا تو وہ بہت کچھ اندازے لگا سکتا تھا۔ میلان میں شی کے مفادات کو نشانہ بنانا میری فہرست کی پہلی ترجیح ہوتی جب کہ ڈاکٹر گوسیپی میلان میں شی کا چیف تھا اس لیے پہلی فرصت میں میرا اُدھر کا رُخ کرنا ضروری تھا۔ اس وجہ سے عین ممکن تھا کہ جمی لائیڈ اپنے کسی بہروپ میں خود ڈاکٹر گوسیپی سے جا ملا ہو اور پھر میرے استقبال کے لیے اس کے ہمراہ مانیٹرنگ روم میں اسکرین کے سامنے جم گیا ہو۔ مجھ سے نجات حاصل کرنا اس کے لیے دن بہ دن ایک ڈراؤنا خواب بنتا جا رہا تھا جس کو پورا کرنے کے لیے وہ مسلسل دو چار دن بھی مانیٹرنگ روم میں گزار سکتا تھا۔ لیکن یہ اُس کی خوش نصیبی تھی کہ نادیہ کی دوستی اور اُس کے بوائے فرینڈ زوقی کی سفارش پر میں پہلی ہی شام گیمبلرز میں آ پہنچا تھا جہاں دشمن میری گھات لگائے بیٹھا تھا۔

"آج واقعی کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔" لڈوگ کی تشویش آمیز آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ بڑے غور سے ہال کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کیوں؟ خیریت تو ہے؟" نادیہ اس کے لہجے پر پریشان ہو گئی۔ "کوئی خطرہ ہو تو ہم آرڈر کینسل کر کے ابھی واپس چلے جاتے ہیں۔"

"تمھیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اُس نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آج پھر کوئی خطرناک شخص ہال میں گھس آیا ہے۔ نیلے سوٹ اور سرخ ٹائیوں والے ہوٹل کے محافظ ہیں جنھیں صرف ایسے ہی موقع پر ہال میں بھیجا جاتا ہے۔"

اگر وہ ان کے لباس کی نشان دہی نہ کرتا تو میرے فرشتے بھی ان تینوں پر شبہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں میں شراب کے پیمانے لیے ایک دوسرے سے الگ تھلگ میزوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔

"یہ تو اسی طرف آ رہے ہیں۔" نادیہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے اختلاج ہو رہا ہے۔ میں اب زیادہ دیر تک یہاں نہیں بیٹھ سکتی۔"

"تمھارے آس پاس ہی کوئی شیطان ہوگا جو دو چار گلاس لے کر آپے سے باہر ہونا شروع ہو جائے گا اور یہ بڑے اطمینان سے اُسے باہر نکال دیں گے۔ تم کیوں اپنی تفریح برباد کر رہی ہو۔" لڈوگ نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا کیونکہ ہمارے لیے کھانے کی ٹرالی آ گئی تھی۔

"نادیہ تمھاری باتوں سے ڈر گئی ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے لڈوگ سے کہا۔ "میں آرڈر کا پورا بل ادا کیے دیتا ہوں تم ذرا نادیہ کو سہارا دے کر میرے ساتھ باہر پہنچا دو۔ موقع ملا تو دو چار روز میں دوبارہ زوقی کے ساتھ آئیں گے۔"

وہ تینوں اس اثنا میں ایسی جگہوں پر جم گئے تھے کہ ان کے قریب سے گزرے بغیر میں نہ نکاسی کے راستے کی طرف جا سکتا تھا نہ ہنگامی دروازے کا رُخ کر سکتا تھا اور نہ ہی ٹوائلٹ جا سکتا تھا۔ چوتھی سمت میں پردے کے پیچھے چھپا ہوا اسٹیج تھا جدھر بھاگنا اندھے کنویں میں چھلانگ لگانے کے مترادف ہوتا۔ اس لیے اس وقت مجھے لڈوگ کے مراسم کی آڑ لے کر فرار

کی راہ اختیار کرنے میں ہی عافیت نظر آرہی تھی ورنہ وہ نائٹ کلب میرے لیے موت کا پھندا ثابت ہوسکتا تھا۔

"عجیب بزدل آدمی ہو،" منہ پھٹ لڈوگ میری فرمائش پر چڑ کر بولا۔"یہاں کوئی چاندماری یا دھینگا مشتی نہیں ہوتی۔ سارے معاملات بہت مہذب انداز میں نمٹائے جاتے ہیں۔ نادیہ کو حوصلہ دینے کے بجائے تم تو خود بھاگنے پر آمادہ نظر آرہے ہو۔"

"غلطی تمھاری ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔"تمھیں یہ ساری باتیں ہمیں سنانے کی کیا ضرورت تھی؟ دوسروں کی طرح بے خبری میں بیٹھے مزے سے کھانے اور پروگرام سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔ سارا موڈ غارت کردیا تم نے۔"

"یہ بہت بدتمیز آدمی ہے۔" وہ نادیہ کی طرف جھک کر دھیمے لہجے میں غرایا۔"آئندہ اسے گیمبلرز میں ساتھ نہ لانا ورنہ میں خود اسے کسی گٹر میں ڈلوا دوں گا۔"

لڈوگ سے بات کھل گئی تھی۔ مجھے نظر آرہا تھا کہ میں اس بند ہال میں بری طرح گھیر لیا گیا تھا اور کوئی بڑا ہنگامہ کھڑا کیے بغیر میرا وہاں سے نکلنا ناممکن ہوکر رہ گیا تھا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور بائیں ہاتھ سے لڈوگ کے منہ پر بھرپور تھپڑ رسید کرتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈالا۔ جوں ہی وہ مشتعل ہوکر میرے اوپر جھپٹا، میں نے اپنے جسم کو اس کے بدن سے ملاتے ہوئے اپنی جیب ہی میں بیم گن کا ٹریگر دبا دیا۔ لڈوگ ایک کربناک چیخ مار کر اچھلا اور میزوں کے درمیان قالین پر گر کر تڑپنے لگا۔

تھپڑ کی پرشور آواز اور پھر لڈوگ کی چیخ گونجتے ہی ہال میں افراتفری مچ گئی۔ لوگ میز اور کرسیاں الٹتے ہوئے دیوانہ وار چیخوں کے ساتھ نکاسی کے دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔ ہوٹل کے تینوں محافظوں نے بیک وقت اپنی جگہ چھوڑ کر میری طرف بڑھنا چاہا تھا لیکن میزوں سے اٹھ کر بھاگنے والے خوف زدہ گاہکوں کی یلغار میں بری طرح الجھ کر رہ گئے۔

"بھاگو۔" میں نے نادیہ کو جھنجوڑا اور وہ بھی ہذیانی آوازیں نکالتی ہوئی بھاگنے والوں کی بھیڑ میں شامل ہوگئی۔

مجھے اندازہ تھا کہ محافظ راستہ بناتے ہوئے فطری طور پر سب سے پہلے میری طرف آئیں گے۔ میرے پاس بمشکل چند سیکنڈ کی مہلت تھی۔ میں بھاگنے والوں کے قدموں میں تڑپتے ہوئے لڈوگ پر یوں جھکا جیسے اسے سہارا دینا چاہتا ہوں پھر نہایت سرعت کے ساتھ کسی چوپائے کی طرح چلتا ہوا میزوں اور کرسیوں کے درمیان گھس گیا

اس وقت وہاں ایسی افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم طاری تھا کہ سب لوگ بلا سوچے سمجھے ایک دوسرے کی تقلید کر رہے تھے۔ مجھے ہاتھ پیروں پر دوڑتے دیکھ کر میرے آس پاس کئی معقول مردوں اور عورتوں نے بھی بالکل وہی پوزیشن اختیار کرلی۔ اسی لمحے ایک شاندار واقعہ ہوا۔ ہال میں موجود مسلح محافظوں میں سے کسی نے جھلا کر ایک ہوائی فائر جھونک مارا اور افراتفری میں مزید اضافہ ہوگیا۔

ہال میں بھانت بھانت کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ مائیکروفون پر گاہکوں سے کئی زبانوں میں پُرسکون رہنے کی اپیلیں کی جا رہی تھیں۔ وہاں کوئی اس بکواس پر کان دھرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

قالین پر بکھری ہوئی کراکری اور بوتلوں کے درمیان اچانک مجھے ایک اوورکوٹ پڑا ہوا نظر آگیا تھا اور میں پھرتی کے ساتھ اسے پہنتے ہوئے سیدھا کھڑا ہوگیا۔ میری تقلید کرنے والے اندھے چوپایوں کی طرح مضحکہ خیز حالت میں میزوں اور کرسیوں کے درمیان بھٹکتے پھر رہے تھے۔ ایک فائر کی آواز نے ان سب سے سیدھا کھڑا ہونے کا حوصلہ بالکل ہی نچوڑ لیا تھا۔

میں اپنی میز اور زخمی لڈوگ سے تو دور نکل آیا تھا لیکن میری بھی سمت غلط تھی۔ اٹھتے ہی میں نے پوری قوت سے دوڑ لگائی اور پھر اکھڑے ہوئے دروازوں سے باہر نکلتا چلا گیا۔

جاتے جاتے میں نے بس اتنا دیکھا کہ گیمبلرز کا خوب صورت اور آراستہ ہال بری طرح تباہ ہوچکا تھا۔ کئی جگہ گری ہوئی موم بتیوں سے آگ لگ گئی تھی۔ تنگ دروازے سے بیک وقت گزرنے کی کوششوں میں نیم مدہوش گاہکوں کی یلغار نے نفیس چوبی دروازے اکھاڑ پھینکے تھے۔ یوں طرب و نشاط کا وہ خوب صورت مرکز آناً فاناً میدانِ جنگ کا سماں پیش کرنے لگا تھا۔

اوورکوٹ پہن لینے کے بعد دور سے میرا پہچان لیا جانا ناممکن ہوگیا تھا لیکن میرے لیے وہاں رکنا خطرناک ہوسکتا تھا۔ دوسری طرف مجھے نادیہ کی ہمدردی کا بھی یقین نہیں تھا اس لیے میں اس سے پہلے ہوٹل وینی پہنچ کر اپنی رقم پر دوبارہ قابض ہونا چاہتا تھا۔ اس وقت سلطان شاہ اور ویرا کے انتظار سے بڑھ کر میری سلامتی کا معاملہ اہم ہوگیا تھا۔

گیمبلرز سے بھاگنے والوں میں سے جس کو جو سواری سامنے نظر آئی وہ اسی میں بھاگ نکلا تھا اس لیے مجھے دور دور تک کوئی ٹیکسی نظر نہ آئی۔ میں اندازے سے ایک طرف دوڑ پڑا۔ شاید میں اپنی دھن تک میں اسے نظرانداز ہی کردیتا لیکن اس کے رونے کی آواز میں شناسائی کا جھلک محسوس کرکے میں رک گیا۔

وہ نادیہ ہی تھی اور روتی ہوئی اسی سمت میں چلی جارہی تھی جدھر میرا رخ تھا۔

"ارے! تم رو رہی ہو؟" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"چلے جاؤ!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔"تم بالکل وحشی اور درندے ہو۔ تمھیں لڈوگ پر ہاتھ اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟ پتا نہیں اس ہنگامے میں کتنے لوگ زخمی ہوئے ہوں گے..."

"یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔"تم خوف زدہ ہوگئی تھیں اور وہ تمھارا مضحکہ اڑا رہا تھا۔ مجھے اسی بات پر طیش آگیا۔ لوگ تو خود ہی بھڑک کر بھاگ نکلے تھے ورنہ ذرا سی دیر میں بات ختم ہوجاتی۔"

"میں اتنی خوف زدہ تو نہیں ہوئی تھی کہ رسیاں تڑا کر وہاں سے بھاگ نکلتی۔" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں بولی۔"تم تو بس اٹھنے کے لیے کسی بہانے کی تلاش میں تھے جو میں نے تمھیں فراہم کردیا۔"

"یہ تمھاری زیادتی ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔"میں نے جو کچھ کیا تمھاری ہمدردی میں کیا تھا۔ اب تم بالکل بری الذمہ ہونا چاہتی ہو تو اور بات ہے لیکن مجھے تم سے ایسی سرد مہری کی توقع نہیں تھی۔"

"پھر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اس نے تند لہجے میں سوال کیا۔"تم جانتے ہو کہ یہ پولیس کیس بنے گا اور تمھارے ساتھ مجھے بھی گواہوں کے کٹہرے میں بلایا جائے گا۔ اس اسکینڈل کی وجہ سے میرا مستقبل بھی برباد ہوسکتا ہے۔"

"وہ تو تم افغانستان سے ہیروئن لاکر بھی بناسکتی ہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔"اب شاید تم ہوٹل جاکر سب کو اس واقعے سے آگاہ کردو گی تاکہ میرے لیے سر اٹھا کر چلنا دشوار ہوجائے۔"

"یہ تو ہونا ہی ہے۔ میں خاموش رہ کر تمھارا جرم اپنے سر نہیں لے سکتی۔ صبح کے سارے اخبارات یہ کہانی چھاپیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ لڈوگ، گیمبلرز کی ویڈیو فلم سے میری اور تمھاری تصاویر نکال کر اخبارات کو جاری کردے۔ پھر میں کہاں جاؤں گی؟"

میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ ہوٹل پہنچ کر میرے لیے مشکلات کھڑی کرنے کا مستحکم ارادہ کرچکی تھی۔ اس وقت وہاں افراتفری کا راج تھا اور کسی کو کسی پر توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی اس لیے میں نے چلتے چلتے بادلِ ناخواستہ اسے ایک دیوار کے ساتھ دھکیل کر اس کے دہانے پر ہاتھ رکھا اور دوسری ہتھیلی سے اس کی کنپٹی پر ہلکی سی ضرب لگادی۔ ایک جھٹکا لے کر وہ میری بانہوں میں جھول گئی۔ اگر کسی نے ہم دونوں کو دیکھا بھی ہو تو متوالے سمجھ کر نظرانداز کردیا ہوگا۔

بے ہوش نادیہ کو فٹ پاتھ پر دیوار کے سہارے لٹاتے ہوئے مجھے اپنی اس حرکت پر دلی افسوس ہوا لیکن اس احمق لڑکی نے میرے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر کسی راہگیر نے اس پر ترس کھاکر پولیس یا کسی اسپتال کو مطلع نہ کیا تو وہ کم ازکم دو گھنٹے تک ہوش میں نہیں آسکے گی۔ اس دوران میں میں نہایت اطمینان کے ساتھ ہوٹل وینی میں اپنا حساب بے باق کرکے کسی اور ٹھکانے کی تلاش میں روانہ ہوسکتا تھا۔

کافی دور چلنے کے بعد میں بالآخر ٹیکسی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ہوٹل کی طرف واپس جاتے ہوئے مجھے رہ رہ کر نادیہ کے بارے میں قلق ہو رہا تھا کہ اسے اتنی سردی میں مجھے فٹ پاتھ پر بے ہوش چھوڑنا پڑا تھا۔ حسینۂ اٹلی کے منصب کا خواب دیکھنے والی نرم و نازک دوشیزہ کے لیے ٹھنڈی اور سنگلاخ فٹ پاتھ سے زیادہ سزا کا تصور بھی محال تھا جو اس نے اپنی ضد اور حماقت کی وجہ سے خود اپنے اوپر مسلط کی تھی جب کہ میری نگاہ میں تو ہوٹل وینی کے بستر بھی اس لڑکی کے شایانِ شان نہیں تھے۔

میں ہوٹل پہنچا تو کاؤنٹر پر موجود داڑھی والے شخص نے چابی دیتے ہوئے مجھے کسی مہمان کی آمد سے آگاہ کیا۔ میں تیزی سے لاؤنج کی طرف مڑا تو سلطان شاہ میری موجودگی سے بے خبر ٹیلی وژن دیکھنے میں منہمک تھا۔

"ویرا کہاں ہے برخوردار؟" میں نے اس کے قریب پہنچ کر اردو میں سوال کیا تو وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

"وہ سرحد پار نہیں کر سکی۔" اس نے اُٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "شاید تمھیں مجھ سے زیادہ اس کا انتظار تھا۔"

"بکواس مت کرو ورنہ تمھاری بھی کنپٹی چٹخا کر ابھی کسی نٹ پاتھ پر ڈال دوں گا۔" میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی ہے کہ دیرا کے بغیر تم اتنی آسانی کے ساتھ براہِ راست اس ہوٹل تک آ گئے۔"

"فٹ پاتھ والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔" وہ سنجیدگی کے ساتھ بولا۔

"میرے پاس وقت نہیں ہے کیونکہ یہاں قدم رکھتے ہی کھیل شروع ہو چکا ہے۔ اس وقت یہاں سے بھاگنے کی فکر کرنی ہے ورنہ رات کسی حوالات میں ہی بسر ہو گی۔" میں نے اسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس دلانا چاہا۔

"لیکن دیرا تو موقع پاتے ہی یہیں پہنچے گی۔" اُس نے کہا۔

"مجبوری ہے۔ اس کے انتظار میں میں اپنی آزادی کو داؤ پر لگانے کی حماقت نہیں کر سکتا۔"

"پھر کہاں جائیں گے ہم؟"

"تھوڑی دیر صبر کر لو پھر سب کچھ بتا دوں گا۔" اس سے بات کر کے میں داڑھی والے سے مخاطب ہو گیا۔ میری زبان سے حساب بنانے کا ذکر سن کر وہ چونکا تھا۔

"لیکن تم تو دو چار روز ٹھہرنے والے تھے۔ یا یہ رات بھی نہیں گزار رہے؟"

"میرا ساتھی ایک ایسی ہی خبر لایا ہے کہ مجھے فوراً واپس جانا پڑ رہا ہے۔ چند روز میں واپس لوٹوں گا تو تمھارے ہی ہوٹل میں قیام کروں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے اسے اطمینان دلایا اور وہ رسید بنانے میں مصروف ہو گیا۔

"سرحد پر اطالوی بڑی سخت چیکنگ کرتے ہیں۔" لفٹ میں اوپر جاتے ہوئے اس نے بتایا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ دیرا ایک آدھ روز میں ہی کوئی نہ کوئی راستہ نکال لے گی۔ وہ واقعی بہت چالاک عورت ہے۔"

"خوشی کی بات ہے کہ تم اس کی تعریف کر رہے ہو کہو تو تمھارے رشتے کی بات ڈال دوں اس سے؟" میں نے دوسری منزل پر لفٹ سے اترتے ہوئے ہنس کر کہا اور وہ بُرا سا مُنہ بنا کر رہ گیا۔

میرا کمرا دیکھ کر سلطان شاہ حیران رہ گیا۔ وہ سمجھا کہ میں نے دانستہ تین بستروں والا کمرا ایک کرایا تھا تاکہ تینوں ایک ساتھ رہ سکیں۔ میری وضاحت پر وہ اطالوی کھوپڑیوں کے حق میں دعائے خیر کر کے رہ گیا۔

سلطان شاہ مُنہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوا تو میں اپنا مختصر سا بیگ لے کر کمرے سے واپس ہو لیا۔

"مقدر میں کہیں بھی چین نہیں ہے۔ سوچا تھا کہ چند روز میلان میں آرام کریں گے تو تم پہلے ہی بھاگنے پر تلے بیٹھے ہو۔" وہ بڑبڑایا۔

"آج ستارے ہی یاد رکھتے کہ زندہ لوٹ آیا ورنہ بے خبری میں ہی دھر لیا جاتا۔ صبح کے اخبارات اس واقعے کے بارے میں عجیب عجیب کہانیاں چھاپیں گے اور اس آزادی کا سبب ایک ایسی حسین لڑکی بنی ہے جو مس اٹلی کے مقابلے میں حصہ لینے کی امیدوار ہے۔"

"لڑکی تمھیں یہاں بھی مل گئی؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔ میرے پہنچنے سے پہلے اسی ہوٹل میں میرا انتظار کر رہی تھی اور تمھیں یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ میں نہایت بے رحمی کے ساتھ اسے ایک ٹھنڈی فٹ پاتھ پر سلا کر آیا ہوں۔"

"کنپٹی چٹخا کر؟" اس نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

"درست سمجھے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "شی کے اڈے پر اگر اس لڑکی کی واقفیت نہ ہوتی تو اس وقت میرے بجائے شی کے ہرکارے ہی اس ہوٹل میں تمھارا استقبال کرتے۔"

"پھر تو یہاں سے جلدی نکلو۔ معلوم ہوتا ہے کہ شی والے بھی سایہ بن کر تمھارا پیچھا کر رہے ہیں۔"

نیچے آ کر میں نے داڑھی والے سے رسید کے ساتھ اپنی پیشگی جمع کرائی ہوئی رقم کا بقایا وصول کیا۔ عینک والے کو ٹپ دی اور ان دونوں کا شکریہ ادا کر کے واپسی کے لیے مڑا تو زوقی دروازہ کھول کر ہوٹل میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن پھر بھی دروازہ پکڑے کھڑا رہا پھر یکے بعد دیگرے چار خوش حال اور بے فکرے افراد اندر داخل ہوئے اور زوقی نے دروازہ چھوڑ دیا۔

اس کے ساتھ آنے والوں کی چال ڈھال اور اطوار سے واضح طور پر امیرانہ بے نیازی ٹپک رہی تھی۔ وہ بے پروایانہ انداز میں ہم دونوں کے قریب سے گزر گئے لیکن زوقی میرے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے سانسوں سے الکحل کی بو آ رہی تھی۔ آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اپنے فیاض ملاقاتیوں کے ساتھ وہ اپنی اوقات سے زیادہ پی کر آیا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ بڑے غلط وقت پر آیا تھا۔ اگر اسے چند منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو میں کسی بھی ناخوشگوار بازپرس سے دوچار ہوئے بغیر ہوٹل ونیٹی سے رخصت ہو سکتا تھا۔

چند ثانیے اعصاب شکن خاموشی طاری رہی پھر وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔

"نادیہ کہاں ہے؟" زوقی نے سرد اور انتہائی غیر دوستانہ لہجے میں سوال کیا تھا۔

کے بارے میں زوقی کا وہ سوال میرے لیے غیر متوقع اور پریشان کُن تھا۔ اگر میں جھوٹ بول دیتا کہ وہ اوپر اپنے کمرے میں موجود ہے تو زوقی چند ثانیوں میں میرا جھوٹ پکڑ سکتا تھا۔ وہ کاؤنٹر سے انٹرکام پر اپنے کمرے کا نمبر ملاتا اور وہاں سے کوئی جواب نہ ملنے پر بآسانی میرا جھوٹ پکڑ لیتا۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا بہانہ اسے مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نشے کی حالت میں ضرور تھا لیکن اس کے تیوروں اور لکنت سے عاری لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اپنے ذہن پر پوری طرح قابو حاصل تھا اور اسے فریب دینا آسان کام نہیں تھا۔

"وہ وہیں رُک گئی ہے۔" میں نے سوچ بچار میں زیادہ وقت ضائع کیے بغیر پُرسکون لہجے میں کہا۔ "شو ختم ہونے کے بعد تمھارا دوست لڈوگ ہان مجھے بھی روکنا چاہ رہا تھا لیکن میرا یہ مہمان آنے والا تھا اس لیے میں اس کی دعوت قبول نہیں کر سکا لیکن اس نے نادیہ کو روک لیا۔ وہ بعد میں آ جائے گی۔"

"شاید تم ہوٹل چھوڑ کر جا رہے ہو۔" اس نے مجھے اور سلطان شاہ کو باری باری گھورتے ہوئے چُبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر نادیہ رات بھر واپس نہ آئی تو میں اسے کہاں تلاش کروں گا؟"

"رات بھر نہ آئی تو صبح ضرور آ جائے گی۔" میں نے بے خوفی کے ساتھ کہا۔ "وہ لڈوگ ہان سے خاصی متاثر نظر آ رہی تھی۔ کوئی گڑبڑ ہو تو تم لڈوگ کو فون کر کے نادیہ کی واپسی کا مطالبہ کر سکتے ہو۔"

اسی لمحے زوقی کے ہمراہ ہوٹل میں داخل ہونے والے چار اوباش امراء میں سے ایک نے اونچی آواز میں اطالوی میں اسے مخاطب کیا۔ زوقی نے پلٹ کر اطالوی میں اسے کچھ بتایا اور وہ چاروں ہی بیک وقت کچھ تحیّر آمیز آوازیں نکالتے ہوئے کاؤنٹر سے واپس ہماری طرف آ گئے تھے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ زوقی پر ان چاروں کو بالادستی حاصل تھی اور وہ ان سے پوری طرح مرعوب نظر آ رہا تھا۔

پھر ان چاروں میں سے ایک نے سلطان شاہ کے سامنے رُک کر کچھ دریافت کیا۔ اس شخص کی انگلی میں ہیرے کی بیش قیمت انگوٹھی کے علاوہ کلائی پر طلائی گھڑی بھی نظر آ رہی تھی۔ اس کے اندازِ گفتگو سے نخوت ٹپک رہی تھی لیکن تمام تر آسودہ حالی اور خود پسندی کے باوجود وہ غنڈہ گردی یا مار دھاڑ کا عادی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"یہ صرف انگریزی سمجھتے ہیں۔" زوقی نے بڑھ کر خوشامدانہ لہجے میں اس سے انگریزی میں ہی کہا۔ "یہ نادیہ کے ساتھ گیا تھا۔ دوسرے کو میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

"نادیہ کہاں ہے؟" زوقی سے اشارہ پاتے ہی وہ شخص انگریزی میں مجھ سے مخاطب ہو گیا۔

"زوقی کے ایک پرانے دوست کے پاس ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "چاہو تو یہی بات کسی دیوار پر لکھ دوں تاکہ مجھے بار بار یہی الفاظ نہ دہرانے پڑیں۔"

"کس دوست کے پاس ہے وہ؟" اس نے زوقی سے سوال کیا۔ اس وقت اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی تھی جو شاید اس کے دل میں انگڑائیاں لیتی ہوئی حیوانی خواہشات کی عکاسی کر رہی تھی۔

"اس کا ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔" زوقی نے اسے یقین دلاتے ہوئے بے بسی کے ساتھ کہا۔ "اسے معلوم تھا کہ آج شام میں مقابلۂ حُسن کے سلسلے میں تم لوگوں سے ملنے والا ہوں۔ وہ کہیں نہیں رُک سکتی... اتنا تو وہ بھی سمجھتی ہے کہ مقابلۂ حُسن میں حصّہ لینے اور پھر جیتنے کے لیے کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔"

"وہ جانتی ہے تو اس وقت اسے یہاں ہونا چاہیے تھا۔" اس شخص نے زوقی کی کمزوری بھانپ کر بے پروائی کے ساتھ سخت لہجے میں کہا۔ "ہم اس کے انتظار میں اپنی رات کالی نہیں کر سکتے۔"

"یہ تم لوگوں کے آپس کے معاملات ہیں۔ ہمارا اس سے کیا واسطہ؟" میں نے یہ کہتے ہوئے نکاسی کے راستے کی طرف بڑھنا چاہا لیکن زوقی نے ہماری راہ روک لی۔

"جب تک میں فون پر لڈوگ ہان سے بات نہ کر لوں تمھیں یہیں رُکنا ہو گا۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "اگر اس نے اپنے پاس نادیہ کی موجودگی کی تصدیق کر دی تو تمھیں جانے کی اجازت مل جائے گی۔"

"ورنہ تم ہمیں سولی پر لٹکا دو گے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "نادیہ کہاں ہے اور کہاں نہیں ہے یہ اس کا اور تمھارا ذاتی معاملہ ہے شاید وہ تم سے زیادہ خوش بھی نہیں ہے۔ پھر ہمیں اس چکر میں کیوں گھسیٹ رہے ہو؟"

"میں گھسیٹ رہا ہوں!" وہ آنکھیں نکال کر بولا۔ "وہ تمھارے ساتھ گئی تھی اور اسے تمھارے ساتھ ہی واپس آنا تھا۔ اب وہ نہیں آئی ہے تو اس کی پوری ذمّے داری تم پر آتی ہے۔"

اسی وقت ہوٹل کے کاؤنٹر سے ایک باریش شخص نکل کر وہاں آ پہنچا۔ لہجوں کی بنا پر غالباً اس نے کسی تنازعے کا اندازہ لگا لیا تھا اس لیے آتے ہی قدرے بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم لوگوں کو اس تنگ راہ داری میں آنے جانے والوں کی وجہ سے پریشانی ہو سکتی ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ تم اپنے کمرے یا ہوٹل کی لابی میں بیٹھ کر اپنے معاملات طے کر لو۔" اس نے خوبصورتی کے ساتھ ہمیں راہ داری خالی کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

زوتی نے ہمیں نظر انداز کر کے استفسار طلب نگاہوں سے اپنے مہمانوں کی طرف دیکھا اور ہیرے کی انگوٹھی والا فوراً ہی بول پڑا۔ "چلو! اوپر کمرے میں چلتے ہیں۔ اگر لڑکی کی جلد واپسی کی امید نہ ہو تو ہمیں اسی وقت چلے جانا چاہیے۔ ہمارا وقت بہت قیمتی ہے۔ بعد میں تم نادیہ کو کسی وقت میرے پاس لا سکتے ہو۔"

وہ زوتی کا کمزور پہلو تھا کیونکہ اس شخص کے منہ سے واپسی کا ذکر سنتے ہی اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ شاید وہ بڑی محنت کے ساتھ ان چاروں کو پھانس کر ہوٹل ذینی تک لایا تھا تاکہ انہیں نادیہ بنگالا کے حسن سے مسحور کر کے ان کے گرد اپنی گرفت مضبوط کر سکے لیکن نادیہ کے موجود نہ ہونے کے باعث وہ ہاتھ آئی ہوئی چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر نکلتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور زوتی اپنی محنت کو اتنی آسانی کے ساتھ رائیگاں جاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"اوپر چلو۔" اس نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔ "چند منٹ میں سارا معاملہ صاف ہو جائے گا۔ یہ دونوں بھی ہمارے ساتھ اوپر ہی چلیں گے تاکہ وہاں ہم اطمینان سے بات کر سکیں۔"

"میرے مہمان کو اس معاملے سے الگ رکھو۔ یہ نیچے ہی میرا انتظار کرے گا۔" میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"تم نیچے ہی میرا انتظار کرو، میں ان سے پیچھا چھڑا کر واپس آتا ہوں۔" زوتی کی خاموشی کو اس کی رضامندی تصور کرتے ہوئے میں نے اردو میں سلطان شاہ سے کہا۔ "یہ معاملہ گلے پڑتا ہوا نظر آ رہا ہے۔"

سلطان شاہ لابی کے راستے پر ہو لیا اور میں ان پانچوں کے ساتھ لفٹ کی طرف ہو لیا۔ مختصر سی لفٹ میں ہم سب ایک ساتھ سوار ہوئے تو فوراً ہی پینل پر اوورلوڈ کی سرخ روشنی جل اٹھی۔ وہ صورتِ حال پیچیدہ تھی۔ زوتی کو کمرے کا دروازہ کھولنے کے لیے مہمانوں کی پہلی کھیپ کے ساتھ اوپر جانا ضروری تھا اس لیے وہ تذبذب میں تھا لیکن ان چاروں میں سے ایک نے زوتی کے ساتھ چند فقروں کے تبادلے کے بعد اس کی مشکل آسان کر دی اور زوتی مجھے ساتھ لے کر لفٹ سے باہر نکل گیا۔

"میں تمہیں تمہارے مہمانوں کے سامنے شرمندہ نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔" لفٹ کا دروازہ بند ہوتے ہی میں نے اس سنہری موقعے سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرتے ہوئے زوتی سے بے تکلفانہ لہجے میں کہا۔ "نادیہ کو گیمبلرز میں ایک اونچا شکار نظر آ گیا تھا۔ وہ پورا پروگرام دیکھے بغیر مجھے اکیلا چھوڑ کر اس کے ساتھ چلی گئی۔ . . . لڈوگ بے چارہ اس کے بارے میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتا سکے گا۔"

"اوہ! یہ بہت برا ہوا۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "آج نادیہ کو کہیں نہیں جانا چاہیے تھا۔ یہ میلان کے وہ بارسوخ امراء ہیں جو کسی لڑکی پر مہربان ہو جائیں تو راتوں رات اسے شہرت کے آسمان پر پہنچا سکتے ہیں۔ میں بڑی مشکل سے انہیں گھیر گھار کر یہاں تک لایا تھا اور یہ نادیہ کے ساتھ کچھ وقت گزار کر اس کے بارے میں اپنی رائے قائم کرنے والے تھے۔"

"لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟" میں نے سادگی کے ساتھ کہا۔ "تم تو مجھ سے لڑنے پر ہی تل گئے تھے۔ اب کہو تو یہی بات اُن کے سامنے بھی دہرا دوں۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ لوگ میری سنائی ہوئی کہانی پسند نہیں کریں گے۔"

وہ چاہتا تو مجھ سے سوال کر سکتا تھا کہ ابتدا میں اس نے خلوت میں مجھ سے بات کی تھی اس وقت میں نے اسے حقیقت سے آگاہ کیوں نہیں کیا؟ اس کے مہمان تو بعد میں ہماری گفتگو میں دخل انداز ہوئے تھے لیکن زوتی اس وقت نشے کی حالت میں تھا۔ اس کا ذہن بیدار ضرور تھا لیکن زنگ آلود ہو چکا تھا اور پھر اس پر اس وقت ایک ہی فکر سوار تھی کہ وہ جن سونے کی چڑیوں کو پھانس کر لایا تھا وہ کسی بھی لمحے پھر سے اُڑ سکتی تھیں۔

"ہرگز نہیں۔ اچھا کیا کہ تم نے اصل بات نہیں بتائی، لیکن اب کیا ہو گا؟"

"یہ خریدار ہیں نادیہ کے؟" میں نے دھیمے اور ہمدردانہ لہجے میں سوال کیا۔

"احمق ہو تم۔" وہ بگڑ کر بولا۔ "یہ فیشن کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ تین برس سے صرف وہی لڑکی مس اٹلی منتخب ہوتی ہے جسے یہ چاروں کسی نہ کسی طرح آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ ان میں سے ایک بی۔ ایم۔ ڈبلیو کار کا مقامی ایجنٹ ہے۔ اس بار تو وہ خود ایک لڑکی کو اس مقابلے کے لیے اسپانسر کرنے والا ہے۔ میری کوشش ہے کہ وہ کسی طرح نادیہ کو اپنے ادارے کی نمائندگی کے لیے منتخب کر لے تو ہمارے وارے کے نیارے ہو سکتے ہیں۔" اسی وقت لفٹ مہمانوں کو چھوڑ کر نیچے لوٹ آئی۔

"پھر اب میں اوپر جا کر کیا کہوں؟ تم نے تو انہیں میری طرف سے بدظن کر ہی دیا ہے۔"

"بھاگ جاؤ۔" وہ اعتماد سے عاری لہجے میں بولا۔ "تم اوپر جا کر میرا معاملہ بگاڑ دو گے۔ اب اپنا کھیل مجھے خود ہی سنبھالنا ہو گا۔ نادیہ کو بھی غائب ہونے کے لیے آج کی رات ہی ملی تھی۔"

اپنی بات پوری کرتے ہوئے وہ لفٹ میں داخل ہو گیا اور میں پھرتی سے لابی کی طرف ہو لیا۔ سلطان شاہ وہاں ٹیلی وژن دیکھنے کے بجائے اسی طرف متوجہ تھا جدھر سے میں واپس لوٹا تھا۔ میرا اشارہ پاتے ہی اس نے خوشگوار حیرت کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑ دی اور ہم دونوں تیزی کے ساتھ ہوٹل ذینی سے باہر نکل گئے۔

رات کُہر آلود اور یخ بستہ تھی۔ اندر کے گرم ماحول سے باہر نکلتے ہی خنک ہوائیں بہت ناگوار محسوس ہوتی تھیں۔ ہم نے اپنی جیکٹوں کے کالر کھڑے کیے اور پھر تیزی کے ساتھ میٹرو اسٹیشن جانے والے راستے پر ہو لیے کیونکہ رات کافی گزر چکی تھی اور سڑک میں پیوست آہنی پٹڑیوں پر کسی ٹرام کے نمودار ہونے کی کوئی امید نہیں رہ گئی تھی۔

"بڑی جلدی لوٹ آئے!" سلطان شاہ نے سردی سے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اوپر جانے کی نوبت ہی نہیں آئی، اس نے نیچے سے ہی مجھے بھگا دیا۔"

"کیا وہ لڑکی اسی کی بیوی ہے؟" سلطان شاہ نے احمقانہ لہجے میں سوال کیا۔

"مس کنواری لڑکی کو کہتے ہیں۔" میں نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ مس اٹلی بننے کے خواب دیکھ رہی ہے اس لیے مقابلہ منعقد ہونے تک اس کی شادی کا کوئی امکان نہیں۔ زوتی اس کا بوائے فرینڈ ہے۔ بہت ہی گھناؤنے کردار کا مالک ہے۔ اس سے ملنے کے بعد اطالوی مردوں کے بارے میں میری رائے بدل گئی ہے۔ ان میں مردانگی نام کو بھی نہیں پائی جاتی۔"

وہ ہنسا۔ "اپنے معیار سے دیکھو گے تو پورے مغرب میں ایک بھی مرد نہیں مل سکے گا۔ معزز ترین لوگ بھی اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو دوسروں کی آغوش میں دے کر خود نت نئی عورتوں کے ساتھ ناچنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔"

"ناچنے کی بات نظر انداز کی جا سکتی ہے کیونکہ اسے انھوں نے اپنی معاشرتی مجبوری بنا لیا ہے۔ ایسے تبادلوں کی کوکھ سے اکثر بے مثال دوستیاں اور ناقابلِ تصور کاروباری فائدے بھی جنم لیتے ہیں لیکن زوتی اپنی مردانہ وجاہت کے باوجود نادیہ کے حق میں کھلا کھلا بردہ فروش بنا ہوا ہے۔ اسے ان چاروں سے یہ امید ہے کہ وہ اس کی گرل فرینڈ کو ایک بار اچھی طرح دیکھ لیں تو اسے مس اٹلی کے مقابلے میں نامزد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

"لعنت ہے اس چھ فٹے حسین نوجوان پر۔" سلطان شاہ نے حقارت سے کہا۔ "اور وہ لڑکی بھی خوشی کے ساتھ اس کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے؟"

اسٹیشن ذرا دور تھا اس لیے میں نے اختصار کے ساتھ اس انوکھے جوڑے کی کہانی چھیڑ دی۔ سلطان شاہ کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ دونوں نیپلز سے پاکستان جانے کا قصد کر کے نکلے تھے تاکہ خیبر کے سرحدی علاقوں سے سستے داموں کچھ ہیروئن خرید کر واپس یورپ آ سکیں اور ہیروئن کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کے سہارے اپنی زندگی عیش سے گزار سکیں۔

"ہیروئن کے لیے پاکستان اتنا بدنام ہو گیا ہے کہ اب عام لوگ بھی اسے ایک آسان مرکز سمجھنے لگے ہیں؟" اس نے حیرت کے ساتھ مجھ سے سوال کیا تھا۔

"پاکستان ہی نہیں بلکہ افغانستان بھی!" میں نے اس کی تصحیح کی۔ "روسیوں کے خلاف مزاحمت کرنے والوں نے اپنی مالی ضروریات سے مجبور ہو کر سرحد کے دونوں طرف دل کھول کر پوست کی کاشت کی ہے اور ہیروئن کے کارخانے لگائے ہیں۔ ان کی آڑ میں پیشہ ور منشیات فروشوں نے بھی ہاتھ رنگے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ افغانستان میں جنگ جاری ہے۔ راستے مخدوش اور زندگی بہت کٹھن ہو گئی ہے جبکہ پاکستان میں امن ہے اس لیے مہم جُو لوگ زیادہ تر پاکستان کا ہی رُخ کرتے ہیں۔ سیاحت کے بہانے مطلوبہ اڈوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور مال لے آتے ہیں۔"

"اس کی ایک وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ منشیات فروشوں کے خلاف ہمارے قوانین بہت نرم ہیں اور جو تھوڑی بہت سزائیں مقرر ہیں وہ بھی اس لیے غیر مؤثر ہو کر رہ گئی ہیں کہ معاشرے میں رشوت کو بے پناہ فروغ ملا ہے۔ لے دے کر بڑے سے بڑا جُرم بھی آسانی کے ساتھ چھپایا جا سکتا ہے . . . . منشیات فروشوں کے خلاف سخت قانون کیوں نہیں بنایا جاتا؟ یہ لوگ باہر سے زیادہ ہمارے ملک میں زہر پھیلا رہے ہیں۔ باہر کے ملکوں میں بیشتر لوگ منشیات کے عادی ہیں۔ وہ الکحل اور شراب چھوڑ کر ہیروئن کے تیز نشے کی طرف راغب ہوتے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں نئے لوگوں کو اس کا عادی بنایا جا رہا ہے، مزدور اور طالب علم تباہ ہو رہے ہیں۔"

"سخت قانون بنانا اب اتنا آسان نہیں رہا مائی ڈارلنگ۔" میں نے تلخ ہنسی کے ساتھ کہا۔ "تم بہت دیر میں میرے ساتھ ملے ہو ورنہ تمہیں بھی معلوم ہوتا کہ بہتیرے معتبر اور بارسوخ لوگ بھی پیسے کی کشش میں ہیروئن کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ اوّل تو وہ ہی پوری قوت کے ساتھ ایسے قوانین کی مخالفت کریں گے اور اگر قانون بن بھی گیا تو صرف رشوت کا بھاؤ چڑھے گا اور رشوت خور اہلکار ایسے ہر قانون کو بُری طرح ناکام بنا دیں گے۔"

"تمہارے لب و لہجے سے مایوسی کی بُو آ رہی ہے۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ہم اس عفریت سے کبھی بھی نجات حاصل نہ کر سکیں گے اور یہ ہولناک بلا دھیمے دھیمے ہماری نئی نسل کو اپنے شکنجے میں لیتی چلی جائے گی۔"

"مایوسی نہیں یہ حقائق ہیں۔ تلخ اور بدترین حقائق۔ آج تم میرے ساتھ ہیروئن کے خلاف جہاد کر رہے ہو لیکن سچ سچ بتاؤ کہ تم اپنا گھر بار چھوڑ کر سیکڑوں میل دور عقرب خان اور مقرب خان کے پاس کیا اس لیے نہیں آئے تھے کہ ان سے راتوں رات امیر بننے کا نسخہ معلوم کر کے خود بھی دولت مند بن سکو؟ وہ تو انھوں نے ہی تمھیں اپنے دھندوں کی ہوا نہیں لگنے دی اور تم اپنی گزر اوقات کے لیے عیسیٰ خان کے پاس نوکری کرنے پر مجبور ہو گئے!"

"ورنہ آج میں بھی خاصا مشہور منشیات فروش ہوتا۔" اس نے اپنی دانست میں میری بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ تو بتاؤ کہ اب اس وبا سے نجات کی بھی کوئی ضرورت نظر آتی ہے یا نہیں؟"

"بظاہر یہ قانون شکنی کا معاملہ نظر آتا ہے لیکن اب بات اس سطح سے بہت آگے نکل چکی ہے۔" میں نے قدرے توقف کے دوران میں سگریٹ سلگانے کے بعد کہا۔ "جن لوگوں کو اس دھندے کی چاٹ لگ گئی ہے وہ آسانی کے ساتھ اس سے دست بردار نہیں ہوں گے۔ پاکستان کی حکومت اپنے سارے وسائل استعمال کر کے سرکاری کاروبار چلانے کے لیے بجٹ کے نام پر پورے سال میں جتنی رقم فراہم کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ رقم چند گنے چنے اور بارسوخ منشیات فروش ہیروئن کے کالے دھندے سے کماتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اپنی آمدنی پر وہ حکومت کو کوئی محصول یا ٹیکس نہیں دیتے۔ اس طرح ملک میں دو متوازی معیشتیں چل رہی ہیں۔ ان کالے دھن والوں کو جب بھی اپنا مستقبل خطرے میں نظر آیا، وہ مزاحمت کے لیے اپنی تجوریوں کے دہانے کھول دیں گے۔ تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ جب ان کی آمدنی اتنی بے تول ہے تو ان کے اثاثے کس قدر بیش قیمت ہوں گے۔ ۔ ۔"

"لیکن تجوریاں کھول کر وہ کیا کریں گے؟ وہ دس بیس افسروں کو تو رشوت سے خرید سکتے ہیں لیکن دس کروڑ عوام اور پوری انتظامیہ کو تو نہیں خرید سکتے۔ انھیں ہر حال میں ہتھیار ڈالنے پڑیں گے۔"

"عوامی قوت کو پارہ پارہ کرنے کے دوسرے طریقے ہوتے ہیں۔ تم دیکھ ہی چکے ہو کہ شیخ ہیروئن کے بعد اسلحے کی غیر قانونی تجارت میں دلچسپی لیتی ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں بلکہ ایک گھناؤنی سازش ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں کچھ حساس سیاسی مسائل اور قوتیں ہوتی ہیں۔ کہیں ان کا زور کم اور کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اگر حکومت منشیات فروشی کے خلاف سخت قانون بنانے اور

پھر اس کے نفاذ پر تُل جائے تو حساس مسائل کو چھیڑ دیا جائے گا۔ زیر زمین قوتوں کو اسلحہ اور سرمایہ فراہم کر کے میدان میں لایا جائے گا۔ جب لوگ ذات پات اور علاقوں کی بنیاد پر ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار اٹھا لیں تو بڑی بڑی مستحکم حکومتیں لرزہ براندام ہو جاتی ہیں اور نظم و نسق کے گمبھیر مسائل میں الجھ کر منشیات فروشی کو بھول جاتی ہیں۔ لوگ منشیات اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو قومی ترجیحات کی فہرست میں شامل کرنا کسر شان سمجھتے ہیں۔ وہ اس سے مقامی سطح کی معاشرتی لعنت کے طور پر نمٹتے ہیں لیکن دنیا کے بہت سے ملکوں میں کالے دھن کی یہ سیاست زور پکڑ رہی ہے۔ ایک نہ ایک دن لوگوں کو یہ احساس کرنا پڑے گا کہ بڑے بڑے قومی سانحوں کی پشت پر صرف اور صرف ڈرگ مافیا کے مفادات کارفرما تھے۔ جنوبی امریکا کے کئی ملکوں میں ایسے مفادات کے نتیجے میں حکومتیں عتاب میں آ چکی ہیں۔ کالے دھن کی معیشت کے بادشاہ خود کسی ملک پر حکمرانی نہیں کرتے لیکن بادشاہ گر ضرور بن بیٹھے ہیں۔ کرسیٔ اقتدار پر بس وہی لوگ ٹِک سکتے ہیں جو انھیں پسند ہوں۔ غنیمت یہ ہے کہ پاکستان میں ایسے لوگوں کو ابھی ایسی لامحدود طاقت نہیں مل سکی ہے لیکن ان سے غفلت برتی گئی تو وہاں بھی یہ سروں پر ناچنے لگیں گے۔"

"تم مبالغے سے کام لے رہے ہو۔" وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "جس بات کو ثابت کرنے پر تُل جاؤ، اس کے حق میں سارا زورِ بیان صرف کر دیتے ہو۔ کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ پاکستان میں آئے دن ہونے والے لسانی اور علاقائی فسادات ڈرگ مافیا کرا رہی ہے جب کہ سرکاری اہل کاروں کی بڑی تعداد ناقص قوانین کی وجہ سے یا رشوت کے باعث ان کی سرگرمیوں سے چشم پوشی کر رہی ہے اور وہ کسی بڑی رکاوٹ کے بغیر اپنا کام کر رہے ہیں؟"

"بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے لیکن حقیقت شاید اتنی سادہ نہیں ہے۔ سیاسی بلیک میلنگ میں پہل کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ فیصلہ سامنے آ جائے تو اسے واپس نہیں لیا جا سکتا اس لیے فیصلوں کو رد کرنے کی خاطر طاقت اور دہشت گردی کے بدترین مظاہرے کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی اسباب ہو سکتے ہیں لیکن یہ سمجھ لو کہ گوریلا چھاپوں کی طرز پر ہونے والی مسلح کارروائیاں مضبوط پشت پناہی اور منصوبہ بندی کے بغیر نہیں کی جا سکتیں۔ وہ زبان، مسلک اور علاقے کا لحاظ کیے بغیر بربریت کا ننگا ناچ ناچتے ہیں پھر ہر مرنے والے کے ہم زبان اور ہم خیال ان کا مشن خود سنبھال لیتے ہیں۔ نادانستگی میں ہونے والا یہ فطری

ردِ عمل ان بھیڑیوں کا بہترین ہتھیار ہے اسی وجہ سے لوگوں کی نگاہیں ان تک نہیں پہنچ پاتیں۔"

"یہ سب چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ اس کہانی کا کہیں اختتام بھی ہوگا یا یہ یوں ہی چلتی رہے گی؟"

"قیادت۔ صرف بے لوث قیادت ہی عبرتناک قوانین بنا کر اس فتنے کا سدِ باب کر سکتی ہے۔ سچ پوچھو تو ہمارے معاشرے میں ابھی تک منشیات فروشی سے حقیقی نفرت پیدا نہیں کی جا سکی ہے۔ دس بیس روپے کی پڑیا بیچنے والوں سے بہتیرے لوگ عداوت رکھتے ہیں اور جو دن رات دولت میں کھیلتے ہیں انھوں نے اپنی سخاوت اور دریا دلی سے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کی ہوئی ہیں۔ ہر شیطان اپنے علاقے کا سلطانہ ڈاکو بنا ہوا ہے جو امیروں کو لوٹ کر غریبوں کی حاجت روائی کرتا ہے اور کوئی اس کی مخبری نہیں کرتا، نہ اسے اپنے گھر سے نکالتا ہے۔ جب تک یہ رجحان ختم کر کے لوگوں کو ان بھیڑیوں کا اصل روپ نہیں دکھایا جائے گا، ان کی بیخ کنی نہیں کی جا سکے گی۔ انھیں ہنگامی بنیادوں پر پورے وسائل اور قوت کے ساتھ کچلنا پڑے گا۔"

آخر کار پاستیور میٹرو اسٹیشن آ گیا اور ہم دونوں سردی سے بچنے کے لیے تیزی کے ساتھ زیرِ زمین جانے والے زینوں میں گھس گئے۔

لندن کے برعکس میلان میں زیرِ زمین ریلوے کا نظام بہت سہل تھا کیونکہ وہاں صرف دو ہی روٹ تھے جو چند گنے چنے اسٹیشنوں پر ایک دوسرے کو کراس کرتے تھے ورنہ ہر اسٹیشن سے صرف ایک ہی ٹرین ملتی تھی۔ سفر کی سمت کے لحاظ سے مسافر دو میں سے اپنی ضرورت کے پلیٹ فارم کا انتخاب کر سکتا تھا۔

اندر بنے ہوئے کشادہ برقی زینوں سے پہلے داخلے کے راستے پر خود کار رکاوٹیں تھیں اور وہیں ایک شخص کیبن میں ٹیلی وژن کی روشن اسکرین پر مسافروں کا جائزہ لینے پر مامور تھا۔ اس وقت رات ڈھل رہی تھی اور موسم خراب تھا اس لیے اسٹیشن پر سناٹا تھا۔ ہم دونوں ٹکٹ مشین سے گزر کر اندر پلیٹ فارم پر پہنچے تو کہیں اکا دکا جوڑے راز و نیاز میں مصروف تھے۔ چند منٹ بعد ہی ہلکی سی گونج کے ساتھ ایم ون روٹ کی روشن اور کشادہ میٹرو آئی جس کی پیشانی پر اس کے آخری اسٹیشن کا نام مولینو ڈورینو ج تھا۔ بیشتر ڈبے خالی پڑے ہوئے تھے۔ دروازے کھلے تو ہم قریبی ڈبے میں سوار ہو گئے۔ چند سیکنڈ کے توقف کے بعد میٹرو سبک رفتاری کے ساتھ سفر پر روانہ ہو گئی۔

کھڑکی سے اوپر بنے ہوئے نقشے سے پتا چلا کہ پورے شہر میں ایم ون اور ایم ٹو کی میٹرو ایک دوسرے کو صرف دو مقامات پر قطع کرتی تھیں جن سے ایک پاستیور سے اگلا اسٹیشن لوریتو تھا اور دوسرا کارڈورنا تھا۔ ان دونوں کے درمیان سین بابیلا نامی اسٹیشن تھا جہاں سے ۷۳ نمبر کی بس کے ذریعے لیناتے ایئرپورٹ پہنچا جا سکتا تھا مگر میں نے اس وقت سین بابیلا سے اگلے اسٹیشن پر ڈوم کے علاقے میں اترنے کا فیصلہ کیا جہاں وقت گزاری کے ساتھ ہی ہم دور سے گیمبلرز نائٹ کلب کا جائزہ بھی لے سکتے تھے۔

رات کافی ڈھل چکی تھی اس لیے ڈوم کے علاقے میں چاروں طرف بنی ہوئی پُرشکوہ گیلریاں، وسطی میدان اور اندرونی بند راہداریاں جو دن کے اوقات میں اور خصوصاً ہفتے اور اتوار کو پُرہجوم رہتی تھیں، سنسان پڑی ہوئی تھیں۔ روشن اشتہارات کے سناٹے میں بس چند ہوٹل اور طعام خانے کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہم دونوں بند دکانوں کی روشن کھڑکیوں کی سیر کرتے ہوئے اونچی چھت والے عالیشان آرکیڈ میں بڑھ رہے تھے کہ آخری سرے پر ایک وسیع گنبد سے ذرا پہلے ایک اسنیک بار نظر آیا جہاں کا ماحول لندن کے ویمپی اور کان ٹکی اسنیک بار جیسا تھا۔ اندر صاف ستھرے لڑکے لڑکیاں غالباً بار بند کرنے کی ابتدائی تیاریوں میں مصروف تھے۔

"عجیب نام ہے۔" سلطان شاہ نے بار میں آنے والی اشتہا انگیز خوشبوؤں میں گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "برگی پڑھتے ہی ذہن میں مرگی کا تصور ابھرتا ہے۔ پتا نہیں یہاں کے کھانے کیسے ہوں؟"

"برگی اٹلی کی کوئی مشہور فاسٹ فوڈ چین معلوم ہوتی ہے۔" میں نے رائے ظاہر کی۔ "اندر کے تیکھے اور بانکے انداز سے ظاہر ہو رہا ہے کہ کھانا بھی لذیذ ہوگا۔ میں نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا ہے اب بھوک چمک اٹھی ہے۔"

"تم نے یہاں کھانے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو اب برگی میں مرغی کی مشابہت محسوس ہونے لگی ہے۔ لیکن وہ بھی جھٹکے والی ہی ہو گی۔" اس نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔

"اللہ معاف کرنے والا ہے۔ یورپ میں حلال اور حرام سے بچنا ہی کافی ہوتا ہے۔ ویسے بیشتر فاسٹ فوڈ چین یہودیوں کی ملکیت ہیں۔ وہ عام طور پر ذبح کیا ہوا گوشت استعمال کرتے ہیں۔"

"حلال اور حرام!" اس نے مجھے گھورتے ہوئے دہرایا۔ "کمال ہے کہ شراب پینے کے باوجود تم ایسی باتیں کر لیتے ہو!"

بے اختیار مجھے مارسیلز کا وہ گائیڈ، لوستان یاد آگیا جس نے رواروی میں یورپ آنے والے مسلمانوں کی خورد ونوش کی احتیاطی عادات اور عیاشیوں پر بھرپور اور معنی خیز تبصرہ کیا تھا۔ مادام فلورا کے حسنِ فسوں خیز سے مسحور اس گائیڈ کو یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ہم دونوں مسلمان تھے ورنہ وہ خنزیر اور نامحرم عورت کی حُرمت پر اپنی بلیغ تقریر کو خود ہی سنسر کر دیتا۔ وہ گائیڈ تھا اور اپنی پیشہ ورانہ ضروریات کے تحت دُنیا کے ہر بڑے مذہب کے بارے میں موٹی موٹی باتیں جانتا تھا اور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ بیشتر مسلمان خنزیر کو مطلق حرام اور پلید تصوّر کرتے ہیں لیکن شراب کو شیرِ مادر سمجھ کر پیتے ہیں اور ہر نامحرم عورت پر نگاہ بلکہ ڈورے ڈالنا اپنا فرضِ منصبی تصوّر کرتے ہیں اس کے بے باکانہ تبصرے پر میں بھی بغلیں جھانک کر رہ گیا تھا اور مداخلت میں ایک لفظ بھی نہ بول سکا تھا۔

برگی کے عملے کی وردیوں سے لے کر فرنیچر اور درودیوار تک میں صرف دو ہی رنگ نمایاں تھے۔ زرد اور سفید۔ ان رنگوں کے درمیان دلکشی پیدا کرنے کے لیے جا بجا قدِآدم آئینے آویزاں کیے گئے تھے۔ ان سے ہٹ کر اس صاف ستھرے اسنیک بار میں خاصی اشتہا انگیز رنگینی پائی جاتی تھی۔ کیونکہ اندر کا تقریباً سارا ہی عملہ گلابی ہونٹوں، سیاہ آنکھوں اور دہکتے رخساروں والی نوجوان لڑکیوں پر مشتمل تھا۔ باہر سے جو لڑکے نظر آرہے تھے، اندر پہنچنے کے بعد ان کی جنس بھی بدلی ہوئی نظر آرہی تھی۔

شیشے کے دروازے سے اندر داخل ہو کر ہم دونوں سروس کاؤنٹر کے عقب میں دیوار پر آویزاں فہرست اور نرخنامے کا جائزہ لینے کے لیے ٹھٹکے تھے کہ فوراً ہی دو سمتوں سے دو نوخیز لڑکیاں مسکراہٹیں نچھاور کرتی ہماری طرف لپکیں۔ ان کا کہا ہوا سمجھ میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن ان کے انداز اور تیوروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بیبیاں ہماری مدد پر کمر بستہ تھیں۔ میں نے سر ہلا کر "گراتسی" کہا اور ہاتھ سے دیوار پر آویزاں نرخنامے کی طرف اشارہ کیا۔ اس یک لفظی اطالوی شکریے کا اثر خوشگوار رہا۔ گلابی لبوں پر مسکراہٹ قدرے شوخ اور گہری ہو گئی۔ ایک نے پسپائی اختیار کر لی مگر دوسری نے لب کشائی کر کے ہمیں حیران کر دیا۔

"یہ فہرست بھی اطالوی ہے، چاہو تو کھانے کے انتخاب میں میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔" اس نے انگریزی میں کہا۔

"بالکل بالکل!" مجھ سے پہلے سلطان شاہ نے وہ پیشکش قبول کر لی اور پھر براہ راست لڑکی سے ایک ایسا بونگا سوال کر ڈالا کہ میں بھونچکا رہ گیا۔ "یہ ہوٹل یہودی کی ملکیت ہے یا کسی اور کی؟" اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا تھا۔

یہ دیکھ کر میری جان میں جان آئی کہ لڑکی بُرا ماننے بغیر بدستور مسکرائے جا رہی تھی۔ "یہ تو پتا نہیں۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "لیکن وہ جس شرح سے اپنے ملازمین کو معاوضے دیتا ہے اس سے تو یہودی نہیں لگتا۔" اس کے تبصرے سے ظاہر ہو گیا تھا کہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہودیوں کے خلاف موہوم سی مخاصمت بسی ہوئی تھی لیکن میں نے اس متنازعہ موضوع کو وہیں ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"جہاں سیلف سروس کا رواج ہو وہاں تنخواہ اچھی ہی دینی پڑتی ہے، ورنہ دوسرے ہوٹلوں میں تو سروس اسٹاف کو اچھی خاصی ٹپ بھی مل جاتی ہو گی۔ چاہو تو اس وقت تمہاری میزبانی کر کے مجھے خوشی ہو گی۔"

سلطان ہولے سے کھنکھارا اور میں اسے گھور کر رہ گیا۔

"ڈیوٹی کے اوقات میں ہمیں کسی گاہک کی دعوت قبول کرنے کی اجازت نہیں ہے۔" وہ خوش دلی کے ساتھ کہہ رہی تھی، "میں تمہارے ساتھ میز پر بیٹھ بھی نہیں سکتی۔ ویسے اس وقت سنّاٹا ہے۔ تم یہیں کھانا کھاؤ گے تو میں قریب رہ کر باتیں کرتی رہوں گی۔ اطالوی بولتے بولتے میری زبان اینٹھ کر رہ گئی ہے۔ دن میں کوئی ہم زبان تلاش کرنے کا ہوش نہیں رہتا اور رات گئے زیادہ تر مقامی جوڑے ہی اپنے خوابوں کی دُنیا سے چونک کر خورد ونوش کے لیے ادھر کا رُخ کرتے ہیں۔ تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟"

اس کا وہ سوال اتنا بے ساختہ تھا کہ بمشکل پاکستان کا نام زبان پر آنے سے روک سکا۔ "میں برٹش ہوں اور یہ انڈین۔"

"اوہ! پھر تو تم میرے ہی ہم وطن ہو۔" اس کے بُشرے پر مسرّت کی علامات قدرے گہری ہو گئیں۔ مذاکرات میں خاصا وقت گزر گیا تھا اس لیے لڑکی کے مشورے سے میں نے چند اشیاء کا انتخاب کیا اور کاؤنٹر پر ایک کیش رجسٹر کی طرف بڑھ گیا۔

"پٹاٹینی بھی لے لینا۔" پیچھے سے سلطان شاہ نے ہانک لگائی۔

"یہ کیا بلا ہے؟" میں نے پلٹ کر تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

"آلو کے چپس بتا رہی ہے۔ کچھ اور نکلا تو چھوڑ دیں گے۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

تلی ہوئی گرم گرم مرغی اور مچھلی بے حد لذیذ ثابت ہوئیں۔ میرا ارادہ اس کے ساتھ بیئر لینے کا تھا لیکن پتا چلا کہ برگی میں الکحل کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا اس لیے چائے پر قناعت کرنی پڑی۔

میں کھانے کی ٹرے لے کر پلٹا تو سلطان شاہ صحرا کے کسی اکلوتے شجرِ بے ثمر کی طرح ہال کے وسط میں اداس کھڑا ہوا تھا۔ "وہ کہاں گئی؟" میں نے ایک میز کی طرف بڑھتے ہوئے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"میں نے نہیں بھگایا۔ ایکسکیوزمی کہہ کر اچانک ہی کاؤنٹر کے پیچھے چل دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے میرے حصّے کی ساری کشش بھی تم ہی کو بخش دی ہے۔ ایک سے فارغ نہیں ہوتے کہ دوسری مل جاتی ہے۔ ایسا کوئی شوق نہ ہونے کے باوجود مجھے کبھی کبھی تم پر رشک آنے لگتا ہے۔ آخر تم خواتین کو اتنی آسانی کے ساتھ اپنی طرف مائل کیسے کر لیتے ہو؟"

"بس حیوانی جبلت کہہ لو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تمھیں تو شاید ویرا کی بددعا لگی ہوئی ہے۔ تم نے اس کی بہت دل آزاری کی ہے۔"

"عورت، عورت ہی اچھی لگتی ہے۔" وہ تنک کر بولا۔ "ویرا جس سے بھی شادی کرے گی اسے بیوی بنا کر خود شوہر کے اختیارات سنبھال لے گی۔ ہر بات میں پہل کرنے پر تلی رہتی ہے۔ ڈان مرسیانو نے اس کے دیدوں کا پانی ہی مار دیا ہے۔"

ہم کھانے میں مصروف تھے کہ وہ مسکراتی ہوئی واپس آ گئی۔ "اپنی مینیجر سے اجازت لینے گئی تھی۔ ڈیوٹی کے دوران میں ہمیں خاص طور پر کسی گاہک سے زیادہ دیر تک بات چیت کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔"

"بڑے سخت اصول ہیں اس ادارے کے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "خاصا نیک نام بھی ہوگا؟"

"کسی حد تک ٹھیک ہی ہیں ورنہ پیشہ ور لڑکیاں تو ایسے بھیڑ بھاڑ والے مقامات پر گھسنے کی فکر میں رہتی ہیں۔ نوکری کے ساتھ ساتھ انھیں ایک مستقل ٹھکانا بھی مل جاتا ہے لیکن اس طرح ماحول گندہ ہو جاتا ہے۔ یہاں زیادہ تر طالبات فارغ اوقات میں نوکری کرتی ہیں اس طرح وہ اپنے اسکول اور کالج کے اخراجات بآسانی پوری کر لیتی ہیں۔"

"اور تم؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ادھورا لیکن بھرپور سوال کیا۔

"میں یہاں کمپیوٹر سائنس میں ڈاکٹریٹ کر رہی ہوں، شام کو یہاں کام کرتی ہوں۔"

"ڈاکٹریٹ کر رہی ہو لیکن تمھیں میزیں اور ڈسٹ بن صاف کرنے میں عار محسوس نہیں ہوتا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں؟ اس میں کیا خرابی ہے؟" اس نے الٹا مجھ ہی سے سوال کر ڈالا۔ "کسی پر بوجھ بننے سے کچھ کرنا ہی بہتر ہے۔ اگر ہم ان کاموں میں عار محسوس کریں گے تو کیا باہر کے لوگ بلائے جائیں گے؟ کام تو صرف کام ہی ہوتا ہے۔ صبح یہاں ایک لڑکی فرش کی صفائی پر مامور ہے جبکہ وہ میڈیکل کالج کی طالبہ ہے۔ کبھی کبھی اس کے ہم جماعت بھی یہاں آتے ہیں لیکن نہ وہ ان سے شرماتی ہے نہ ہی اس کے ساتھی ان پر طعنہ زنی کرتے ہیں۔ یہ باتیں ہماری پرانی نسل کے ساتھ ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ پیشہ کوئی برا نہیں ہوتا۔ جب تک پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ ہر کام میں نہیں گھسیں گے، پیشوں کا صدیوں سے کھویا ہوا احترام بحال نہیں ہو سکے گا۔"

برگی میں چند نوجوان لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی ہنستی اور قہقہے لگاتی ہوئی داخل ہوئی اور وہ ہمیں چھوڑ کر ان کی طرف چلی گئی۔

"تم نے سنا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی؟" سلطان شاہ نے مچھلی کا ایک پارچہ توڑتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"محنت کی عظمت اب عالمگیر ہوتی جا رہی ہے۔" میں نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "پہلے یہ کمیونزم اور سوشلزم کا نعرہ کہلاتا تھا لیکن غور کرو تو اس پر حقیقی معنوں میں مغربی معاشرے میں عمل ہو رہا ہے جہاں اپنا بوجھ ہر ایک اٹھاتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا اور گندے سے گندہ کام کرتا ہے اور شام کو نفیس کپڑے پہن کر کسی احساسِ کمتری کے بغیر اعلیٰ ہوٹلوں اور تھیٹروں میں دوسروں کی طرح زندگی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔"

"اور کبھی تم نے پاکستان کے شہری معاشروں پر غور کیا۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "کراچی، لاہور، ملتان، حیدر آباد اور پشاور کے رہنے والوں کے بارے میں سوچو گے تو تمھیں شرم آئے گی۔ کراچی ان میں سب سے بڑا ہے اس لیے وہاں پیشہ ورانہ رجحانات کی بڑی بھرپور تصویر نظر آتی ہے اور یہی صورتِ حال ہر بڑے شہر میں کم و بیش اسی طرح نظر آئے گی۔"

"پاکستان کی بات مختلف ہے۔ وہاں روزگار کے مواقع محدود ہیں....." میں نے کہنا چاہا۔

"یہی غلط ہے۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "شہروں میں تمھیں پیشہ ورانہ تقسیم نظر آئے گی۔ بعض پیشوں کو معزز سمجھ لیا گیا ہے۔ اور شہر میں رہنے والا ہر پڑھا لکھا، نیم خواندہ شخص ان ہی کے پیچھے دوڑتا نظر آتا ہے۔ ملازمت اور تجارت کے سوا کہیں کسی کو دلچسپی نظر نہیں آتی۔ محنت اور مشقت کے کاموں سے لے کر چھوٹے موٹے ہنر، حتیٰ کہ ڈرائیونگ تک کو عار سمجھا جاتا ہے۔ ایک طرف بے روزگاری ہوتی ہے اور دوسری طرف بہت سے چھوٹے یا شہری زبان حقیر پیشوں میں افرادی قوت کا خلا پایا ہے جسے لازمی طور پر دیہی اور

اندرونی علاقوں سے نقل مکانی کرنے والے پورا کرتے ہیں۔ یہ کام شاید وہ بھی نہ کریں لیکن وہ دیہاتوں اور چھوٹی بستیوں سے بڑے شہروں میں آتے ہیں تو شہروں اور شہریوں سے بُری طرح مرعوب ہوتے ہیں۔ یہ سمجھ کر ہجرت کرتے ہیں کہ روزگار کے میدان میں وہ شہریوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے وہ آتے ہی ان شعبوں کا رخ کرتے ہیں جہاں شہریوں کے لیے کوئی کشش نہیں ہوتی۔ اپنی محنت اور جذبے سے یہ لوگ کامیاب ہو جاتے ہیں اور یوں ہر شہر میں پیشہ ورانہ بنیاد پر تقسیم کا ایک ان کہا عمل جاری ہے جو آگے چل کر خطرناک رخ بھی اختیار کر سکتا ہے اور یہاں کے بارے میں تم نے سن ہی لیا کہ ڈاکٹریٹ کرنے والی میزیں صاف کرتی ہے، دوسروں کا جھوٹا اٹھاتی ہے۔"

"یہ احساس اور جذبہ لوگوں پر اوپر سے مسلط نہیں کیا جاتا۔ یہ شعور خود بخود پیدا ہوتا ہے اور میرا خیال کہ آہستہ آہستہ لوگوں میں یہ تصور ابھر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چند برسوں میں پیشوں کے حوالے سے تحقیر کرنے کا رجحان ختم ہو جائے۔"

"یہی نہیں، اس وقت تو مجھے تازہ گل کا قصہ بھی یاد آ رہا ہے۔ اس کا لڑکا بہت پڑھا کو تھا۔ اپنے شوق کی بنا پر وہ ایک وظیفہ لے کر ولایت آنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ شاید وظیفے کی رقم کم ہوگی تو اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے کوئی پارٹ ٹائم ملازمت کر لی ہوگی۔ پھر زمیندار کا لڑکا سیر و تفریح کے لیے ولایت آیا یہاں وہ تازہ گل کے لڑکے سے بھی ملا۔ جانتے ہو کہ گاؤں پہنچ کر اس نے کیا کیا...؟" لمحہ بھر کے توقف کے بعد وہ خود ہی بولنے لگا۔ "اس نے پورے گاؤں کو بتایا کہ تازہ گل کا لڑکا ولایت میں گاؤں کی عزت کو بٹہ لگا رہا ہے۔ ایک ہوٹل میں جھوٹے برتن دھوتا ہے تب دو وقت کی حلال حرام روٹی کھاتا ہے۔ پورے گاؤں نے تازہ گل پر ایسی لعنت ملامت کی کہ اُس کا وہاں رہنا دشوار ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے بیٹے کو کسی قیمت پر واپس نہ بلا سکے گا اس لیے اس نے خاموشی کے ساتھ گاؤں ہی چھوڑ دیا۔ مجھے بتاؤ کہ ایسے لوگ کب اور کیسے سدھر سکیں گے۔؟"

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں میرے بچے!" میں نے کاغذی گلاس سے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "پاکستان پہنچیں گے تو وہاں کے معاشرے کی اصلاح پر بھی غور کر لیں گے۔ یہ نہ بھولو کہ اس وقت ہم میلان میں ہیں اور یہاں کے حالات ہمارے حق میں ذرا بھی سازگار نہیں ہیں۔ ہم تازہ گل کے بارے میں سوچتے رہے تو شی کا کوئی بھی آدمی ہماری کھوپڑی پر تازہ گل کھلا دے گا۔"

سلطان شاہ ہنس دیا۔ "برگی کے کھلے کھلے ماحول نے بہکا دیا۔ لیکن تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمہارا اگلا پروگرام کیا ہے۔ نادیہ کو نقصان پہنچانے کے بعد زوتی کے چنگل سے تو نکل آئے۔ اب کدھر جاؤ گے؟"

"بات بہت زیادہ کھل گئی ہے۔" میں نے کھانے سے فارغ ہو کر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "صبح کے اخبارات خبروں سے بھرے ہوئے ہوں گے۔ اس بار ہم میلان میں رُکے رہے تو بُری طرح مارے جائیں گے۔"

"پھر کہاں جاؤ گے؟" اس نے سوال کیا۔ "میلان کے بعد تو وینس ہی رہ جاتا ہے جہاں شی کا مرکز قائم کیا گیا ہے۔"

"دراصل مقابلوں اور جوابی مقابلوں کا ایسا تسلسل چل پڑا ہے کہ ہم ایک دن کے لیے بھی خود کو پوری طرح شی والوں کے مشاہدے سے محفوظ نہیں رکھ سکے ہیں۔ ہمیں کچھ عرصے کے لیے مکمل خاموشی اختیار کرنی ہوگی۔"

"یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر کسی ہوٹل کے کمرے میں محصور ہونے سے تو بہتر ہے کہ پاکستان کا ایک چکر لگا لیا جائے۔ اس طرح تمھیں بھابی سے ملنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ دو تین ہفتوں کے بعد ہم دوبارہ ادھر آ سکتے ہیں۔"

سلطان شاہ کا وہ مشورہ بہت صائب تھا۔ ہوٹل وینس سے نکلتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ کچھ دن کے لیے روم چلا جاؤں۔ وہاں میں تفریح کے دوران جمی لائیڈ یا ڈان مرسیانو کے بارے میں اہم معلومات بھی حاصل کر سکتا تھا لیکن اس کے مقابلے میں پاکستان جانا ہر اعتبار سے بہتر ہوتا۔ اگر گیمبلرز کے بارے میں ملنے والی معلومات درست تھیں تو ڈاکٹر گوسیپی لڈوگ ہان سے ملنے والی معلومات کی روشنی میں وڈیو ٹیپ سے میری تصاویر حاصل کر سکتا تھا پھر اس کے آدمی نادیہ بنگالا کے سہارے ہوٹل وینس پہنچ جاتے جہاں سے انھیں میرے فرضی نام کے ساتھ ہی پاسپورٹ کے سارے اہم کوائف مل جاتے اور جمی لائیڈ اپنے رسوخ کو بروئے کار لاتے ہوئے ان دستاویزات کے سہارے میرا اٹلی میں آزاد رہنا یا وہاں سے باہر نکلنا ناممکن بنا دیتا۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ جمی لائیڈ کے پورے وسائل حرکت میں آنے سے قبل ہی ہم اٹلی کو خیرباد کہہ کر کسی اور سمت میں نکل جاتے۔

میری دانست میں ہمارے لیے وہی واحد راستہ رہ گیا تھا لیکن اس پر عمل کرنے کے لیے کچھ اور بھی لوازم درکار تھے جو برگی سے نکل کر ہی پورے کیے جا سکتے تھے۔ میں نے ٹشو پیپر سے ہاتھ منہ صاف کر کے ہال کا جائزہ لیا لیکن انگریزی داں لڑکی کا کہیں پتا نہیں تھا لیکن جب ہم میز چھوڑ کر باہر جانے لگے تو وہ اچانک کہیں سے نمودار ہو گئی۔

"جا رہے ہو؟" اس نے آتے ہی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

"جانا ہی تھا۔" میں نے اداس لہجے میں کہا۔ "یہ گھر تو نہیں ہے کہ

جب تک ادر جیسے جی چاہے بیٹھے رہو۔"

"میلان میں رہو تو پھر آنا۔ میں چھ بجے شام سے رات دو بجے تک یہاں ہوتی ہوں۔"

"نام نہیں بتایا تم نے اپنا۔ مجھے پیٹر اور اسے راما کہتے ہیں۔" میں نے اپنا تعارف کرایا۔

"میرا نام کیتھرین ہے۔ تم کیتھی بھی کہہ سکتے ہو۔ میں لڑکیوں کے ہوسٹل میں رہتی ہوں جہاں رات آٹھ بجے کے بعد کسی مرد ملاقاتی کو اندر جانے یا رہنے کی اجازت نہیں ہے' ورنہ چھٹی ہونے پر تمھیں اپنے ساتھ لے جاتی۔ مجھے تمھاری ذات میں بڑی اپنائیت سی محسوس ہو رہی ہے۔ تم دوبارہ نہ آئے تو مجھے دکھ ہوگا۔"

وہ احمق لڑکی بلاوجہ جذباتی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس لیے ہم دونوں نے باری باری اس سے ہاتھ ملائے اور برگی سے باہر آ گئے۔

"یہ بھی تم پر مر مٹی تھی۔" چند قدم دور نکل آنے کے بعد سلطان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ راجا اندر سے تمھاری کوئی نہ کوئی رشتے داری ضرور رہی ہوگی۔ میں بھی تمھارے ساتھ ہوتا ہوں۔ ایسا بدشکل بھی نہیں ہوں پھر بھی ساری مہربانیاں تم پر نچھاور کی جاتی ہیں' یہ راز کیا ہے آخر؟ سالا کا دل کا بدلا ہوا رویہ دیکھ کر تو میری عقل دنگ رہ گئی تھی۔"

"مجھ میں اور تم میں بس اتنا فرق ہے کہ تم ہر ایک کی میٹھی باتوں میں آ جاتے ہو۔ کیتھی مجھے ذرا بھی مرعوب نہیں کر سکی۔ میں انگریزی ضرور بولتا ہوں لیکن میرا لب و لہجہ انگریزوں سے بالکل ہی مختلف ہے۔ اس بارے میں اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اس لیے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ وہ ہمیں اُلّو بنا رہی تھی۔"

"تم نے اسے کون سی ٹپ دے دی جو وہ تمھیں اُلّو بنا رہی تھی۔" سلطان شاہ نے چیخ کر کہا۔

"اہم بات یہ ہے کہ گیمبلرز اسی علاقے کے قرب و جوار میں واقع ہے اور کیتھی نے ہم دونوں میں صرف اس وجہ سے دلچسپی لی کہ ہم غیر ملکی نظر آ رہے تھے۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ کسی کے انفارمر کے طور پر بھی کام کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر گوسیپی کی ابتدائی ہدایات مشتبہ غیر ملکیوں کو چیک کرنے تک محدود ہوں۔ لڈوگ نے اسے یہ تو بتا ہی دیا ہوگا کہ نادیہ کے ساتھ آنے والا غیر ملکی نظر آ رہا تھا۔"

"ضروری نہیں کہ ڈاکٹر گوسیپی کے مخبروں کا جال اتنا وسیع ہو اور کیتھی اسی کے لیے کام کرتی ہو۔"

"دنیا کے ہر قابلِ ذکر اڈے کے گرد مخبروں کا جال پھیلا ہوا ہوتا ہے جو حالات پر ہر لمحے کڑی نظر رکھتے ہیں۔ پھر کیتھی ڈوم کے ایک ایسے اسنیک بار میں کام کرتی ہے جہاں سرِ شام گاہکوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اس بھیڑ بھاڑ میں وہ بہت آسانی سے اپنا کام کر سکتی ہے۔ اس پر شبہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا رویّہ برگی کے دوسرے ملازمین سے مختلف تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے ہمارے پاس سے غائب ہو کر اپنے نامعلوم آقا کو ہمارے بارے میں اطلاع دے دی ہو۔"

"قیاس آرائی تو کچھ بھی کی جا سکتی ہے لیکن اس کی تصدیق یا تردید کیسے ہو سکے گی؟"

"تھوڑی دیر یہیں ڈوم کی گیلریوں میں گھومتے رہو کہیں بھی کوئی آ ٹکرائے گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "اس دوران میں بھی اپنا تھوڑا سا کام کر لوں گا۔"

اس نے مجھ سے کام کی نوعیت پوچھنے کی کوشش نہیں کی اور میں کسی پبلک فون بوتھ کی تلاش میں نظریں دوڑاتا رہا۔ میری جیب میں گیمبلرز کے دو ٹکٹ موجود تھے جن سے مجھے ڈاکٹر گوسیپی کا نمبر مل سکتا تھا۔ فون بوتھ تک پہنچ کر میں نے گیمبلرز کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا گیا جب میں نے انگریزی میں ڈاکٹر گوسیپی سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میرا نام دریافت کر کے ہولڈ آن کرا دیا گیا۔ میں نے دانستہ اپنا غلط نام بتایا تھا۔

"میں وہی بول رہا ہوں جس کی تمھیں تلاش ہے ڈاکٹر!" فون پر اس کا نام سن کر میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم نے دیکھ لیا کہ میں تمھاری ناک کے نیچے من مانی کارروائی کر کے صاف نکل گیا اور تم اپنے وڈیو مانیٹرنگ یونٹ پر مجھے پہچان لینے کے باوجود کچھ بھی نہ کر سکے۔"

"تم آج میلان سے زندہ نہ نکل سکو گے۔ صبح کا اجالا نمودار ہونے سے پہلے تم میری قدموں میں پڑے سسک رہے ہو گے۔" دوسری طرف سے ڈاکٹر گوسیپی کی آواز غصے کی شدت سے بگڑ کر رہ گئی تھی۔

"تمھاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ اس وقت بھی میں میلان سے باہر ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ شہر میں تمھارے کتّے ہر طرف مجھے تلاش کریں گے۔ اس لیے مجھے دھمکانے کے بجائے اپنے آقا کو بتا دو کہ صبح میں وینس پہنچوں گا۔ اس کے لیے اگلے دو چار دن فیصلہ کن ثابت ہونے والے ہیں۔ تم لوگوں کا وقت اب پورا ہو چکا ہے۔ روم سے بھاگ کر بھی تمھیں پناہ نہ مل سکے گی۔"

"وینس کا رُخ کرنے سے پہلے تمھاری گردن توڑ دی جائے گی!" غراتی ہوئی آواز ابھری۔

"بری بات ڈاکٹر!" میں نے سلطان شاہ کو آنکھ مارتے ہوئے ماؤتھ پیس میں کہا۔ "مانا کہ تم غبن کے الزام میں نکالے گئے تھے لیکن پھر بھی ایک ذمّے دار سابق سرکاری ملازم ہو۔ تمھیں قانون اپنے ہاتھ میں لے کر خونریزی کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ احتیاطاً میں اس وقت کی ساری گفتگو ریکارڈ کر رہا ہوں۔ اگر مجھے کچھ ہوا تو میرا ایک مقامی دوست اس گفتگو کا ٹیپ پولیس کے اعلیٰ افسران کو پہنچا دے گا۔ اس لیے میری حفاظت کی قانونی اور اخلاقی ذمّے داری بھی اب تم پر آ گئی ہے۔"

وہ بہت ہی تیز مزاج آدمی معلوم ہوتا۔ میری بات پوری ہونے سے قبل ہی اس نے جھلا کر گندی گندی گالیاں بکنی شروع کر دیں اور میں نے فوراً ہی سلسلہ منقطع کر دیا کیونکہ میں اپنا مقصد حاصل کر چکا تھا۔

"تم نے اسے بلاوجہ ہی چھیڑا ہے۔" بوتھ سے باہر نکلتے ہوئے سلطان شاہ نے کہا۔

"اس طرح میں انھیں الجھانا چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں کامیاب رہا ہوں۔ اب وہ اپنی ساری نفری وینس جانے والے مسافروں کی نگرانی پر لگا دیں گے۔ میں نے اسے یہ تاثر دیا ہے کہ میرا فی الحال میلان چھوڑ کر بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے جب کہ درحقیقت ہم صبح کی کسی بھی پرواز سے اٹلی چھوڑ دیں گے۔ مجھے پاکستان واپسی کے بارے میں تمھارا مشورہ پسند آیا ہے۔"

"اس کا کیا ردِعمل تھا؟" سلطان شاہ نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

"غصے میں پاگل ہو رہا ہے۔ صبح تک پکڑوانے کی دھمکی دے رہا تھا۔" میں نے ہنستے ہوئے بتایا اور اسی لمحے میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے کیونکہ ہم سے چند قدم دور ایک ویران اور نیم تاریک بغلی راہداری سے اچانک ہی دو مضبوط مسلح آدمی نکل کر ہماری راہ میں حائل ہو گئے تھے ان کی گنوں کے دہانے ہماری طرف اٹھے ہوئے تھے اور دور دور تک کوئی مداخلت کرنے والا موجود نہیں تھا۔

"ہینڈز اَپ!" ان میں سے ایک نے پھنکارتی ہوئی سرگوشیانہ آواز میں کہا۔ "تمھیں بے چون و چرا ہمارے ساتھ چلنا ہے۔ ذرا بھی مزاحمت کی تو بے دریغ گولی مار دیں گے۔"

"تمھیں یہ جسارت مہنگی پڑے گی۔" میں نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے سرد اور پُرسکون لہجے میں کہا۔ "ڈاکٹر گوسیپی اپنے مفادات کے ساتھ اپنے آدمیوں کی حفاظت بھی کرنی جانتا ہے۔ اس نے ہمیں شاید تم دونوں ہی کی تلاش میں ادھر بھیجا تھا۔"

لمحے بھر کے لیے حیرت سے ان کے چہرے بگڑ گئے۔ اپنی کہانی میری زبان سے سن کر ان کا اعتماد پل بھر میں متزلزل ہو گیا تھا۔ میں نے قدرے توقف کے بعد اپنا وار جاری رکھا۔ "اس وقت ہم دونوں یہاں تنہا نہیں ہیں۔ ڈاکٹر کے اٹھارہ بیس آدمی ان گیلریوں میں تم دونوں کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ وہ تمھیں باہر نکلنے سے پہلے ہی مار لیں گے۔"

"ہمیں یہ سب نہیں بتایا گیا۔" ان میں سے بھاری جسم والا تشویش زدہ لہجے میں بولا۔ "صرف ہم ہی کو دو مشتبہ غیر ملکیوں کو پکڑنے کے لیے بھیجا گیا تھا اور تم دونوں اس تعریف پر پورے اترتے ہو۔"

"میلان آنے والا ہر غیر ملکی ڈوم کی سیر کو آتا ہے۔ ان دونوں کے بارے میں تم نے برگی والی انفارمر سے ملاقات کی تھی؟"

"اس نے تم دونوں کے علاوہ تمھارے تھیلے کے بارے میں بھی بتایا تھا جو تمھارے ساتھی کے پاس موجود ہے۔"

میں خوش دلی کے ساتھ ہنس دیا۔ "اس نے ہمیں بھی یہی بتایا تھا۔ ہم نے تھیلے کی بنیاد پر ان دونوں کو پکڑ لیا تھا وہ اب بھی میٹرو اسٹیشن کے دروازے پر تعمیراتی ملبے کی اوٹ میں بے ہوش پڑے ہوں گے۔ یہ تھیلا ڈالروں سے بھرا ہوا تھا اس لیے ہم اٹھا لائے۔ لو تم بھی دیکھ لو کہ اس میں کتنا بڑا خزانہ پوشیدہ ہے۔"

میں نے ان کی اضطراری کیفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطان شاہ سے بیگ لے کر کھول دیا اور اوپر ہی سے ڈالروں کی ایک گڈی نکال کر بھاری جسم والے کی طرف اچھال دی۔ گڈی لپکتے ہوئے اس نے گن غیر ارادی طور پر ہولسٹر میں اڑس لی' دوسرے کا ہاتھ بھی نیچے جھک گیا تھا۔ میں نے دوسری گڈی اس کی طرف پھینک دی۔

وہ ایک ڈالر میں بارہ سو لیرا والا ملک تھا اس لیے اتنی بڑی رقم کا تصور کر کے وہ حیرت زدہ رہ گئے اور مسحور انداز میں میری طرف بڑھنے لگے اس دوران میں بیگ ہی میں ٹٹول کر یم گن اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔

"اس میں تو میرے اندازے سے زیادہ مال بھرا ہوا ہے۔" میں نے بیگ میں سے ہاتھ باہر نکالے بغیر مسرت آمیز لہجے میں کہا اور بھاری جسم والا اضطراری طور پر بڑھ کر بیگ پر جھکا تھا۔ نوٹوں کی گڈیوں کے ساتھ بیگ میں یم گن کی نال دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں لیکن اسے اپنی مرضی سے وہاں سے ہٹنا نصیب نہ ہو سکا۔

بیم گن چلی اور اس کی نیلگوں شعاعیں بھاری جسم والے کے چہرے اور گردن سے گزرتی ہوئی دل میں پیوست ہوگئیں۔ وہ ایک خوفزدہ چیخ کے ساتھ پھڑکا اور پھر بے جان ہوکر پختہ فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کا انجام دیکھ کر دوسرے نے اپنی گن کو سیدھا کرنا چاہا لیکن سلطان شاہ جونک کی طرح اس کے بدن سے لپٹ گیا۔

ان دونوں میں ابتدا ہی سے بھیانک زور آزمائی شروع ہوئی تھی جب کہ میں مختصر ترین عرصے میں وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا اس لیے بھاری جسم والے کے گرتے ہی میں بھی سلطان شاہ کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ ہم دونوں کے مقابلے میں وہ واضح طور پر کمزور تھا اس لیے میں نے فوراً ہی اس سے پستول چھین لیا پھر سلطان شاہ نے اس کا گریبان تھام کر اس کے چہرے پر پوری قوت سے ٹکر رسید کی اور وہ اپنی تمام شہ زوری کے باوجود لڑکھڑا گیا۔ میں نے اس کی پنڈلیوں میں ٹانگ اڑائی اور وہ پشت کے بل اپنے مردہ ساتھی پر جا گرا۔

رات ڈھل جانے کے باعث اس وقت بند گیلریوں میں سنّاٹا ضرور تھا لیکن کسی بھی لمحے کہیں سے کوئی نمودار ہوسکتا تھا اس لیے میں وہ مقابلہ جلد از جلد ختم کرنے کے لیے مضطرب تھا۔ میں بیم گن سنبھالتا ہوا گرے ہوئے شکار کی طرف لپکا ہی تھا کہ سلطان شاہ نے اس کے سینے پر سوار ہوکر اس کا نرخرا دبوچ لیا۔

جسمانی طور پر سلطان شاہ اسے پوری طرح زیر کرنے کا اہل تھا لیکن میں نے اسے موقع دیے بغیر اس کے شکار کی پسلیوں سے نال لگا کر بیم گن چلادی اور وہ چند ہی ثانیوں میں ساکت ہوگیا۔

ان دنوں شاید ڈوم کے علاقے میں مرمّت اور تعمیرات کا کام وسیع پیمانے پر ہو رہا تھا اس لیے جا بجا تعمیراتی سامان کے ڈھیر اور فولادی پائپوں کے اونچے ڈھانچے ایستادہ تھے۔ میدان صاف پاکر ہم نے پھرتی کے ساتھ انھیں پختہ فرش پر گھسیٹ کر اوپر تلے ایک عارضی چوبی کیبن کے پہلو میں ڈالا اور پھر انھیں ایک میلے پلاسٹک میں اس طرح لپیٹ دیا کہ بادی النظر میں وہ بھی ملبے کا ایک حصہ نظر آنے لگے۔ اس کے بعد ہمارا وہاں رکنا حماقت ہوتا۔ ان دونوں کے بھرے ہوئے پستول اور نوٹوں کی گڈیاں سمیٹ کر ہم تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئے۔ مجھے ہر لمحے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی ہماری راہ نہ روک لے۔

کئی سنسان راہداریوں میں گھومنے کے بعد ایک موڑ پر ہمیں اچانک ہی اطالوی پولیس کے دو سپاہی نظر آئے جو اپنے نیلے ہیٹ اور لمبے کوٹوں میں ملبوس پہلو بہ پہلو مشینی انداز میں پیش قدمی کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی رفتار کم و بیش کیے بغیر گہری نظروں سے ہمارا جائزہ لیا اور کوئی تعرض کیے بغیر آگے بڑھ گئے۔

"تمھارے اندازے واقعی سو فیصد درست ہوتے ہیں"۔ اوسان بحال ہو جانے کے بعد سلطان شاہ نے تعریفی لہجے میں کہا: "برگی والی لڑکی نے واقعی مخبری کی تھی۔ کیوں نہ لگے ہاتھوں اسے بھی دیکھ لیا جائے"۔

"ہوسکتا ہے کہ اب وہ اسنیک بار بند ہوگیا ہو۔ یہ امکان بھی ہے کہ دُور سے لڑکی کی حفاظتی نگرانی کی جا رہی ہو۔ اگر ہم اس پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو عورت ذات پر میں نے کسی کا ہاتھ نہ اٹھ سکے گا اس لیے اب اسے بھول جانے کی کوشش کرو۔ اس سے ملے تو وہ اپنے باس کو تازہ ترین اطلاع ضرور فراہم کرے گی۔"

"پتا نہیں نادیہ کا کیا ہوا ہوگا؟ اس پر تو تم نے ہاتھ چھوڑ دیا تھا"۔ وہ بولا۔

"ہوش میں آکر وہ ہوٹل پہنچ جائے گی۔ اسے بھی میں نے مارا نہیں تھا لیکن اس کے عزائم سے آگاہ ہونے کے بعد سنّاٹے بلکہ افراتفری سے فائدہ اٹھا کر زور سے اس کی کنپٹیاں دبائی تھیں جس کے نتیجے میں وہ بے ہوش ہوگئی"۔

"الو کی پٹھی کس قدر سادہ لوح اور معصوم بنی ہوئی تھی"۔ سلطان شاہ نے غصیلے لہجے میں کیتھی کی شان میں مدح سرائی کی۔ "اس ماحول میں آدمی بھلا کس پر اعتبار کر سکتا ہے۔ برگی کی انتظامیہ بھی اس بات سے لاعلم ہوگی کہ ان کے عملے میں مجرموں کی ایک مخبر پرورش پا رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر ڈرگ ٹریفکنگ میں بھی ملوّث ہو!"

"اس کے بارے میں سوچ کر اپنا ذہن نہ تھکاؤ"۔ میں نے اس کی پشت سہلاتے ہوئے کہا: "ہمیں یہ سوچنا ہے کہ باقی ماندہ رات ہم محفوظ رہ کر کس طرح گزار سکیں گے؟ شہر کے سارے تفریحی اڈّے بھی دو بجے تک بند ہوجاتے ہیں"۔

"ہوٹل کا رُخ کرنا خطرناک ہوسکتا ہے پھر یہاں اپنی طرز کے بازارِ حسن بھی نہیں ہیں جہاں دولت کے سہارے صرف گانے سن کر بھی پوری رات گزاری جاسکتی ہے۔ جہاں جائیں گے سیدھی سیدھی مول تول کی بات ہوگی اور باہر سڑکوں پر سخت سردی پڑ رہی ہے۔ یہ بند راہداریاں تو پھر بھی خاصی محفوظ اور گرم ہیں"۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔

اسی وقت ڈوم کے زیرِ زمین میٹرو اسٹیشن میں داخلے کا راستہ سامنے آگیا اور میں غیر ارادی طور پر سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ پلیٹ فارم کی طرف جانے والے راستوں سے پہلے بند دکانوں سے ذرا آگے ٹوائلٹ کی علامات نظر آئیں تو اس کے استعمال کی شدید ضرورت کا احساس ہوا کیونکہ مثانہ چائے کے بڑے گلاس سے خاصا زیرِ بار ہوچکا تھا۔

میں ٹوائلٹ روم میں داخل ہوا تو اندر دروازے کے ساتھ ہی ایک نوجوان عورت میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ میری آہٹ سن کر اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں کھولیں اور میں نگاہیں چار ہوتے ہی سر کی خفیف سی جنبش کے ساتھ ہولے سے مسکرا دیا۔ اپنی دانست میں اسے کوئی بے گھر پناہ گزین سمجھتے ہوئے میں اندر صاف ستھرے پیشاب خانے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کی تیز آواز نے میرے قدم روک لیے۔ زبان سمجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اس کے ہاتھ کا اشارہ قابلِ فہم تھا۔ سلطان شاہ میز کے پاس کھڑا ہوا تھا اور وہ مجھے واپس بلا رہی تھی۔

واپس لوٹتے ہوئے مجھے خیال ہوا کہ شاید وہ کوئی چندہ طلب کرے گی لیکن قریب پہنچنے پر اس نے سفید گتّے پر مارکر سے لکھی ہوئی ایک تحریر میرے سامنے ڈال دی۔ اس پر پیشاب خانہ استعمال کرنے کی فیس چار سو لیرا درج تھی۔

"ایک پیشاب کے سات روپے تو خاصے مہنگے ہیں"۔ سلطان شاہ حساب لگا کر پُرتشویش لہجے میں بولا۔

"لیرے تو دینے ہی پڑیں گے ورنہ یہ عورت کیا سوچے گی کہ پیشاب کرنے کے پیسے لیے بغیر ہم آوارہ گردی کرنے نکل پڑے"۔

میں نے اس عورت کے پیچھے نصب ایک بورڈ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس بورڈ پر ایمرجنسی بٹن اور سرخ بتی کے ساتھ ہی سائرن بھی نصب تھا۔ یعنی وہ مفت میں پیشاب کرنے کی عیاشی پر آمادہ کسی بھی شخص کے خلاف فی الفور مدد طلب کرسکتی تھی۔

عورت کے صبر کا پیمانہ تیزی سے لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ تحریر کا اثر نہ ہوتے دیکھ کر اس نے ہاتھ بھی پھیلا دیا اور میں نے مجبوراً ایک ہزار لیرا کا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ "کیپ دی چینج!"

دو سو لیرا کی ٹپ دے کر ہم دونوں ایک ساتھ سفید دمکتے ہوئے ٹائلوں والے پیشاب خانے میں داخل ہوئے جہاں کی فضا جراثیم کش دواؤں کی ناگوار بو کے بجائے پھولوں کی سی مہک میں رچی ہوئی تھی۔

"یہ تو واقعی بہت مہنگا اور بدتمیز ملک ہے"۔ واپسی پر سلطان شاہ نے برا سا منہ بنا کر کہا: "آخر یہاں عورت بٹھانے کی کیا تُک ہے جب کہ زنانہ بیت الخلا دوسری طرف بنا ہوا ہے"۔

"پہلا فائدہ تو یہی ہے کہ مرد ہوتا تو تم لڑنے پر آمادہ ہوجاتے لیکن اسے فیس کے ساتھ ٹپ بھی دُم دبا کر دے آئے۔ پھر ایک عورت کے سامنے سے محض چار سو لیرا کے لیے واپس لوٹنے میں مردانہ سبکی محسوس ہوتی ہوگی۔ اندر آنے والا کوئی بھی شخص پیسے دیے بغیر واپس نہ جاتا ہوگا۔ شاید تمھیں علم نہیں کہ یہاں ایئرپورٹ پر ٹرالی لینے کے لیے بھی ایک ہزار لیرا دینے پڑتے ہیں"۔

"ایسا تو پاکستان جیسے پسماندہ ملک میں بھی نہیں ہوتا"۔ وہ بدستور غصے میں تھا۔

"وہ اسی لیے پسماندہ ہے۔ اگر سات کے بجائے فی کس صرف پانچ روپے بھی فیس مقرر کر دی جائے تو ان لوگوں کو ہزاروں روپے ماہانہ کی آمدنی ہوسکتی ہے جن کی دیواروں کی بنیادیں چوری چھپے اور زبردستی کمزور کی جاتی ہیں"۔ میں نے اسے چڑاتے ہوئے کہا: "آمدنی کے مواقع کو اخلاق کے نام پر ضائع کرنا سراسر احمقانہ فعل ہے"۔

"یہاں رک کیوں گئے؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"اسے دوبارہ ایک ہزار لیرا دوں گا"۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"لعنت ہے تم پر!" وہ سر جھٹک کر زینوں کی طرف بڑھ گیا۔

"بلا مان گئے"۔ میں نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "یہ عورت کا چکر نہیں بلکہ ہماری مجبوری ہے۔ رات کو میٹرو بند رہتی ہے۔ یہاں آرام دہ حرارت میں ہم باہر کی کُھلی ہواؤں سے محفوظ رہ سکیں گے۔ اندر کسی کونے کھانچے میں رات گزار کر صبح ایک ہزار لیرا خرچ کرکے تازہ دم ہوں گے اور ایئرپورٹ روانہ ہوجائیں گے۔ اس طرف ہمارے کسی دشمن کا خیال بھی نہ پھٹک سکے گا"۔

"اور ہمیں کوئی باہر نہیں نکالے گا؟" اس نے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا۔ "یہ نہ بھولو کہ ہم قریب ہی دو لاشیں چھپا کر آئے ہیں۔ ان کا انکشاف ہوتے ہی پورے علاقے میں ہلچل مچ جائے گی"۔

"صبح مزدوروں کے آنے سے پہلے ڈاکٹر گوسیپی کے آدمی بھی ان کا سُراغ نہیں لگا سکیں گے اور ہم اس سے پہلے یہاں سے روانہ ہوچکے ہوں گے۔ یہ بھول جاؤ کہ تھوڑی دیر پہلے ہم نے کسی کا خون کیا ہے"۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تمھارا خون واقعی بہت ٹھنڈا ہے"۔ وہ تحیر آمیز لہجے میں بولا۔

"کم از کم میں تو کئی دن تک ان دونوں کو نہ بھول سکوں گا جو تمھاری بیم گن کا نشانہ بنے ہیں۔ بعض اوقات ہم ایسی خونریزی پر بھی مجبور ہوجاتے ہیں جس سے ذرا سی کوشش سے بچا جاسکتا ہے"۔

"شی میں ان کا ماتم کرنے والے کافی لوگ ہیں تم اپنی ننھی سی جان ہلکان نہ کرو۔ آؤ! کوئی ٹھکانا بنائیں۔ اب کمر سیدھی کرنے کا موڈ ہو رہا ہے"۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا اور وہ بے بسی کے ساتھ ہنس کر رہ گیا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد ہمیں اس تہ خانے میں اپنی پسند کا ایک نیم روشن گوشہ مل گیا پھر جب ہم نالی دار گتّے کے خالی ڈبے تلاش کرکے ٹھنڈی اور سخت کنکریٹ پر اپنا بستر تیار کرنے میں مصروف تھے تو پختہ فرش پر اونچی ایڑیوں کے سینڈل کی کھٹ کھٹ کے ساتھ دو عورتوں کے بولنے کی قریب آتی ہوئی اور پھر زینوں پر معدوم ہوتی ہوئی آوازیں سنائی دیں تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ ٹوائلٹس میں ڈیوٹی دینے والی خواتین واپس جاچکی تھیں اور اس زیرِ زمین اسٹیشن میں ہم دونوں کے سوا کوئی باقی نہیں رہا تھا۔

چند منٹ بعد سیڑھیوں پر وزنی جوتوں کی مشینی دھمک سنائی دی تو میں نے سگریٹ فوراً بجھا دی۔ ہم دونوں اور زیادہ تاریکی میں سرک کر بالکل دیوار سے جا لگے کیونکہ پولیس والوں کی پیش قدمی کا وہ انداز ہمارے لیے نامانوس نہیں رہا تھا۔

زینوں سے نیچے وہ آہٹیں فرش پر گونجتی رہیں۔ دونوں پولیس والے اپنے معمول کے اتنے عادی تھے کہ انھوں نے آپس میں کوئی بات تک کرنے کی زحمت نہیں کی اور پھر وہ دونوں واپس باہر چلے گئے۔ اوپر سے آہنی دروازہ بند کیے جانے کی پُرشور آوازیں سنائی دیں اور شاید آخری رسمی جائزے کے بعد اسٹیشن کا وہ دروازہ مقفل کر دیا گیا۔

"اب تم اسے اپنا گھر ہی سمجھو، اگلی صبح تالے کھلنے تک کوئی تمھارے پاس نہیں آنے گا۔ مجھے شاید نیند نہ آئے لیکن تم بے فکری کے ساتھ گہری نیند سو سکتے ہو۔ ضرورت ہوئی تو اٹھا لوں گا۔"

"ہو سکتا ہے کہ یہاں سے نکاسی کے اور بھی راستے ہوں پھر ریلوے لائنوں والی سمت سے بھی کوئی اندر آ سکتا ہے اس لیے ہمیں باری باری جاگنا ہوگا۔ کچھ پتا نہیں کہ کب کوئی آوارہ گرد یا مخبر ادھر آ نکلے۔"

"دروازے تو سب ہی مقفل کر دیے گئے۔ رہا ٹریک کا معاملہ تو ایسے خراب اور کہر آلود موسم میں کوئی ادھر کا رُخ کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ خاردار تاروں کی باڑھ کے اندر واقع ان لائنوں میں طاقتور برقی رو موجود رہتی ہے جس سے ٹرینیں چلتی ہیں اس لیے ہر سمجھدار آدمی ان سے دُور رہتا ہے۔ تم بے فکر ہو کر سو جاؤ، میں جاگ رہا ہوں، غنودگی کا حملہ ہوا تو تمھیں جگا لوں گا۔"

سلطان شاہ آرام سے گتّوں کے بستر پر دراز ہو گیا اور میں اپنے ذہن میں مستقبل کے نقشے جمانے لگا۔

مجھے پوری امید تھی کہ میرے فون نے ڈاکٹر گوسیپی کو بوکھلا کر رکھ دیا ہوگا۔ ان کے ہیڈ کوارٹرز کی روم سے وینس منتقلی رازداری کے ساتھ عمل میں آئی تھی لیکن مجھے خوش قسمتی سے کارلو موریرو کی زبانی اس کا علم ہو گیا تھا۔ ان حالات میں ڈاکٹر گوسیپی وینس کے بارے میں میری دھمکی کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بیشتر وسائل وینس کے راستوں پر ہماری تلاش کی نذر ہو جاتے دوسری طرف ان دو افراد کی گمشدگی اسے پریشان کر دیتی جنھیں اس نے برگی والی کیتھی کی مخبری کے بعد ہماری تلاش میں ڈوم کی عمارات میں روانہ کیا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک سکون کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار کر سکتا تھا۔ اس کے بعد اس پر بے چینی سوار ہو جاتی۔ وہ ان کی تلاش میں دوسرے آدمی روانہ کر سکتا تھا لیکن مجھے پوری امید تھی کہ ان میں سے کوئی بھی پلاسٹک کے نیچے چھپی ہوئی لاشوں کا سراغ نہیں لگا سکتا تھا۔ شی کے خونخوار کارکنوں کو اس غیر یقینی صورتِ حال میں چھوڑ کر ہم دونوں مُنہ اندھیرے ڈوم کے اسٹیشن سے لینا تے ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو سکتے تھے۔

اس پورے معاملے میں مجھے فکر صرف اخباری تشہیر کی تھی۔ صبح آنے والے اخبارات میں ایک طرف کارلو موریرو، چارلس ڈولین اور ان کے ڈرائیور کے جل مرنے کی روح فرسا خبر ہوتی اور دوسری طرف گیمبلرز میں ہنگامہ آرائی کے ساتھ ہی نادیہ بنگالا کے ساتھ میری بدسلوکی کا قصہ بھی چھپنے کا امکان تھا۔ اگر شہر میں شی والے پوری طرح فعال ہو جاتے تو گیمبلرز میں بننے والی وڈیو فلم سے میری تصویریں نکال کر ان واقعات کے حوالے سے اخبارات کو جاری کر سکتے تھے جس کے نتیجے میں ہمارے لیے آزادانہ نقل و حرکت کے امکانات ختم ہو سکتے تھے بلکہ ڈاکٹر گوسیپی کے قول کے مطابق ہمارا اٹلی سے نکلنا ناممکن ہو سکتا تھا۔

پاکستان میں رہتے ہوئے تنظیم کی جڑیں کاٹنے کا عمل میرے لیے زیادہ دشوار نہیں تھا۔ میں خود تنظیم کے لیے کام کرتا رہا تھا اس لیے اس کے طریقۂ کار سے اچھی طرح واقف تھا اور میرا اندازہ تھا کہ میں تھوڑے ہی عرصے میں ان ہیروئن فروشوں کی زندگی عذاب بنا کر ان کا مذموم کاروبار ختم کرا دوں گا لیکن پھر ویرا درمیان میں آ گئی اور اس نے مجھے جھکانے کے لیے غزالہ کو اغوا کرا لیا۔ بات اگر وہیں تک رہتی تو ویرا سے سمجھوتے کے بعد غزالہ گھر واپس لوٹ سکتی تھی لیکن ویرا نے ظلم یہ کیا کہ غزالہ کو راتوں رات انگلینڈ روانہ کر دیا۔ غزالہ کوئی ڈرپوک اور بے ضمیر لڑکی ہوتی تو وہاں سمجھوتوں کے تحت پُرآسائش زندگی گزار سکتی تھی لیکن وہ ویرا کے ہمدردوں کے گھناؤنے عزائم سے واقف ہوتے ہی خونریز مقابلے کے بعد لاپتا ہو گئی اور مجھے اس کی تلاش میں سفر کرنا پڑ گیا۔

پاکستان میں رہتے ہوئے میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکا تھا کہ شی عالمگیر پیمانے پر جرائم کی سرپرستی کر رہی ہوگی لیکن انگلینڈ پہنچ کر جب غزالہ کی تلاش کی مہم میں شی والوں سے میرا تصادم شروع ہوا تو پیچ در پیچ راز کھلنے شروع ہو گئے۔ یوں کسی ارادے اور واضح پروگرام کے بغیر شی کے عالمی مفادات میری زد میں آ گئے۔

شاید دنیا کا کوئی بھی قابلِ ذکر خطہ ان کی ناپاک شورشوں سے محفوظ نہیں تھا۔ جمی لائیڈ کے کارندے اس کے ذہن میں جنم لینے والے ہر شیطانی تصور کو عملی روپ دینے کی قوت رکھتے تھے اور اسے ختم کیے بغیر شی کے خاتمے کا تصور احمقانہ خام خیالی سے زیادہ نہیں تھا مگر وہ ایک صبر آزما کام تھا جس کے لیے وقت اور سرمائے کی ضرورت تھی۔ سرمائے کی کمی ہم نے شی والوں کی گن بوٹ کے سودے سے پوری کر لی تھی لیکن غزالہ کے پاکستان لوٹ جانے کے بعد میرے پاس وقت نہیں رہا تھا۔

غزالہ اپنی قابلِ رشک جدوجہد کے بعد پاکستان لوٹ جانے میں کامیاب ہوئی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اپنے وطن میں ہوتے ہوئے بھی بالکل بے یار و مددگار اور اکیلی تھی۔

کوکین کے شوق نے آہستہ آہستہ اس کی ماں کو قبر میں اتار دیا تھا۔ اس کا اکلوتا بھائی اپنی ماں کے نشے کی بھاری مقدار استعمال کرنے کے نتیجے میں دماغی خلل کا شکار ہو کر ایک اسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ اس کے باپ نے اپنی بیوی کی موت پر دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی تھی اور پورے شہر میں کوئی ایسا نہیں رہا تھا جسے وہ اپنا سمجھ سکتی۔

مجھ سے اس کی گہری دوستی تھی۔ ہم نے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کے وعدے کیے تھے اس لیے پُرہول تنہائی اور اکیلے پن کے اس دور میں غزالہ کا مجھے تلاش کرنا فطری امر تھا۔ اسے میرے روابط کا زیادہ علم نہیں تھا۔ لے دے کر وہ بس جہانگیر سے ہی واقف تھی اور پاکستان پہنچنے کے بعد میرے بارے میں غزالہ نے اسی سے رجوع کیا تھا مگر وہ بے چارہ خود میرے بارے میں لاعلم تھا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان حالات میں غزالہ کو کیسی کرب ناک مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ جب بھری دنیا میں انسان کو دُور دُور تک کوئی ایسا نظر نہ آئے جسے محبت سے اپنا کہا جا سکے تو پھر زندگی ایک بوجھ معلوم ہونے لگتی ہے جسے اٹھانا عام حوصلے والوں کے بس میں نہیں رہتا۔

"شاید ایسے ہی لوگ خودکشی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔" میں نے سوچا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں خود اپنے ہاتھوں سے نہ جانے کتنے ہی انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا لیکن اپنی ایک محبوب ہستی کی خودکشی کا تصور ہی میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ غزالہ کے بارے میں وہ خیال اس لیے زیادہ تکلیف دہ تھا کہ اس کا باپ خودکشی کر چکا تھا اور اس گھرانے نے شکست و ریخت کے جو مرحلے دیکھے تھے ان کے بعد غزالہ کے ذہن میں مایوسی کا جنم لینا بعید از قیاس نہیں تھا۔

زیرِ زمین اسٹیشن کے سنسان ماحول اور رات کے سناٹے میں وہ سب سوچتے ہوئے میرے وجود پر اضطراب طاری ہونے لگا۔ یہ غنیمت تھا کہ حالات نے پلٹا کھایا تھا اور میں پاکستان واپسی کا ارادہ کر چکا تھا جہاں میری غزالہ اپنی پُرفسوں آنکھوں میں سہانے مستقبل کے سپنے سجائے میری منتظر تھی اور اس سفر کی راہ میں صرف وہی ایک رات حائل تھی جو سسک سسک کر دھیمے دھیمے گزر رہی تھی۔ اس وقت میرے ذہن سے شی اور اس کی مکروہ مصروفیات محو ہو گئی تھیں اور دل و دماغ پر بس غزالہ کا پُرسرور سراپا اپنی تمام تر محبت اور لطافت کے ساتھ چھاتا چلا جا رہا تھا۔

میں رات بھر دیوار سے ٹیک لگائے سگریٹیں پھونکتا رہا۔ پاکستان واپسی کے فیصلے اور آنے والے خوشگوار دنوں کے تصوّر نے خیالات کے طلسم میں کچھ عجیب ہی رنگ بھر دیے تھے اور مجھے وہ دن یاد آ رہے تھے جب غزالہ ایک سنگِ میل بن کر نہایت غیر محسوس طریقے پر میری زندگی میں داخل ہوئی تھی۔

وہ اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ اپنے کالج کے سالنامے کے لیے اشتہار لینے میرے دفتر میں آئی تھی۔ اس کی موہنی صورت اور دلکش اندازِ گفتگو نے اسی وقت میرا دل موہ لیا تھا پھر جب اس نے میری شرکت کے اصرار کے ساتھ کالج کے سالانہ فنکشن کا دعوت نامہ دیا تو میں انکار نہ کر سکا اور وہیں میں نے پہلی بار اس آواز کو دیکھا جو برسوں سے مجھ پر حکمرانی کر رہی تھی۔ میں مدت سے چرس اور پھر ہیروئن فروخت کرنے کے دھندے سے منسلک تھا۔ ہم جس کے لیے کام کرتے تھے وہ ہم سے اور ہماری بہتیری کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھا لیکن ہم نے اس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اپنی سرد اور سپاٹ آواز میں فون یا ٹرانسمیٹر پر ہمیں حکم دیتا تھا اور ہم پالتو کُتّوں کی طرح اُس کے حکم کی تعمیل کے لیے مجبور ہوتے تھے۔ غزالہ کے کالج میں لاؤڈ اسپیکر پر میری وہی شناسا آواز گونج رہی تھی۔ وہ تقریب کا مہمانِ خصوصی تھا اور منشیات کی لعنت کے خلاف ایک بھرپور اور جامع تقریر کر رہا تھا۔ تنظیم کی دو عملی اور نفرت انگیز سرگرمیوں کے خلاف وہی تقریب میری جدوجہد کا نقطۂ آغاز بن گئی۔ غزالہ میرے قریب آتی چلی گئی اور میں دن بدن تنظیم سے دُور ہوتا چلا گیا۔

ابتدا میں غزالہ کو میری خفیہ سرگرمیوں کا ذرا بھی علم نہیں تھا لیکن اس کا منشیات کا ڈسا ہوا گھرانا میرے سامنے تھا۔ پھر جب ہمارے مراسم بڑھتے ہی چلے گئے تو ایک دن غزالہ پھٹ پڑی۔ اس نے اپنے گھرانے کے کئی سربستہ رازوں سے پردہ ہٹاتے ہوئے رو رو کر کہا کہ اتنے گندے پس منظر کے ساتھ وہ خود کو میرے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے اعتراف نے میرے دل میں اس کی عظمت کو چار چاند لگا دیے اور میں نے بھی کھلے دل کے ساتھ اسے وہ سب بتا ڈالا جو میں برسوں سے کرتا آ رہا تھا اور یوں ہم نے ایک دوسرے کو اس کی ساری کمزوریوں کے ساتھ قبول کرتے ہوئے یہ عہد بھی کیا تھا کہ ہم تنظیم کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔

سلطان شاہ تھکا ہوا تھا اس لیے تھوڑی دیر میں گہری نیند سو گیا مگر میرے ذہن میں پُرانی یادوں کا فیتہ چلتا رہا حتیٰ کہ اوپر آمد و رفت کی اِکّا دُکّا آوازیں سنائی دینے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد پُرشور آواز کے ساتھ آہنی دروازہ کھولا گیا اور میٹرو کے عملے کے کئی افراد اونچی اور پُرجوش آوازوں میں باتیں کرتے ہوئے نیچے اتر آئے۔ میں نے آہستگی کے ساتھ سلطان شاہ کا بازو ہلایا اور اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

"آمد و رفت شروع ہو گئی ہے اب ہمیں چوکنا رہنا چاہیے۔ گتّے وغیرہ سمیٹ کر ڈسٹ بن میں ڈال دو تاکہ ہماری یہاں شب بسری کا کوئی ثبوت باقی نہ رہے۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں ہدایت کی اور وہ فوراً ہی گتّوں کے بستر سے اٹھ گیا۔

اندر کمرے وغیرہ کھلنے کی آوازیں آتی رہیں پھر پورا اسٹیشن صفائی کی برقی مشینوں کے شور سے گونجنے لگا۔ وقفے وقفے سے عملے کے مزید ارکان آتے رہے اور پھر معمول کی روشنیوں کے ساتھ ہی مسافروں کی رہنمائی کرنے والی برقی علامات بھی جل اٹھیں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کا جائزہ لیا اور پھر چہل قدمی کے انداز میں اپنی جگہ چھوڑ دی۔

ہم کسی کی خصوصی توجہ کا مرکز بنے بغیر اسٹیشن سے باہر نکل آئے جہاں سیڑھیوں سے چند قدم کے فاصلے پر ایک ہاکر اپنا اسٹال درست کر رہا تھا۔ مجھے وہاں کوئی انگریزی اخبار نظر نہیں آیا اس لیے میں نے سب سے اونچی گڈی سے ایک اطالوی اخبار اُٹھا لیا۔ گڈی کی اونچائی سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ میلان کا کوئی مقبول روزنامہ تھا۔

"یہ اٹالین زبان میں ہے۔ کس سے پڑھواؤ گے؟" اسٹال سے ہٹنے کے بعد سلطان شاہ نے تمسخرانہ لہجے میں سوال کیا۔

"اپنی چونچ بند رکھو!" میں نے اسے گھُورا۔ "تصویروں کی کوئی زبان نہیں ہوتی، وہ میں بھی دیکھ سکتا ہوں!"

میں نے وہیں ایک اسٹریٹ لیمپ کے نیچے کھڑے ہو کر اس نصف کلو وزنی اخبار کی ورق گردانی کر ڈالی اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ پورے اخبار میں کہیں بھی میری کوئی تصویر نہیں تھی۔ البتہ پہلے صفحے پر جلی ہوئی بی ایم ڈبلیو کی تصویر کے ساتھ دو خبروں میں کچھ ایسے مانوس الفاظ موجود تھے جن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خبریں گیمبلرز کے ہنگامے اور جلنے والی کار کے بارے میں تھیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ اس علاقے میں تیزی کے ساتھ چہل پہل میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ہم دونوں دوبارہ اسٹیشن میں داخل ہوئے۔ مطلوبہ سمت سے آنے والی ٹرین میں دس منٹ باقی تھے۔ ہم نے ٹکٹ لیے اور پلیٹ فارم پر پہنچ گئے۔ اس وقت تک صفائی کا کام تیزی سے ختم ہو رہا تھا اور پلیٹ فارم پر چند مسافر بھی نظر آ رہے تھے۔

"تم نے باتھ روم والی کو دوبارہ ہزار لیرے نہیں دیے؟" سلطان شاہ کا موڈ اس وقت خاصا خوشگوار تھا۔

"ضرورت محسوس ہو رہی ہو تو تم دے آؤ۔ اس وقت وہ بھی تمہاری طرح تروتازہ ہو گی!"

"اس وقت تو کوئی اور ہی ڈیوٹی پر ہو گی۔ وہ آدھی رات کے بعد گئی ہے۔ اس وقت بستر میں آرام کر رہی ہو گی اور تم اس کے فراق میں ساری رات ویران پلیٹ فارم پر جاگتے رہے۔ بہرحال اس طرح تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ میری نیند پوری کرا دی۔"

"میری رات بڑی بے چینی میں گزری ہے۔ میں واقعی عزالا کے ساتھ بڑی بے وفائیوں کا ارتکاب کرتا رہا ہوں اور وہ بے چاری میری یاد کو سینے سے لگائے اپنی وفا کی آنچ میں دھیمے دھیمے سلگ رہی ہے۔"

"غنیمت یہ ہے کہ ابھی تمہارے ذہن میں اپنی غلطیوں کا احساس زندہ ہے۔ افسوس وہاں ہوتا ہے جہاں آدمی اپنی غلطیوں کا اُلٹا سیدھا جواز بھی پیش کرنے لگتا ہے۔" وہ یک بیک سنجیدہ ہو گیا۔

میٹرو آئی تو اس میں خاصے مسافر سوار تھے۔ ہم اندر دروازے کے قریب ہی کھڑے ہو گئے کیونکہ ہمیں اگلے اسٹیشن پر اترنا تھا۔ ٹرین نے پوری طرح رفتار بھی نہیں پکڑی تھی کہ اگلا اسٹیشن آ گیا اور ہم اُتر گئے۔ ڈوم سے وہ فاصلہ اتنا مختصر تھا کہ ہم پیدل بھی بآسانی طے کر سکتے تھے لیکن میں اس وقت خود کو حتی الامکان چُھپائے رکھنا چاہتا تھا۔ غیر ضروری طور پر سامنے آنے میں خطرہ تھا کہ کہیں شی کے کسی گرگے نے دیکھ لیا تو پھر ایک نیا محاذ کُھل سکتا تھا جبکہ میں جلد از جلد اٹلی سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔

سان بابیلا کے اسٹیشن کے قریب ہی بس اسٹاپ موجود تھا جہاں لینلتے ایئرپورٹ جانے والی ۷۳ نمبر بس تیار کھڑی تھی۔ میرے پاس ہوٹل وینی سے خریدے ہوئے ٹکٹ موجود تھے اس لیے ہم نے بس میں سوار ہو کر مشین پر ٹائم پنچ کیا اور نشستیں سنبھال لیں۔

لینلتے ایئرپورٹ تک کا سفر کسی قابلِ ذکر واقعے کے بغیر طے ہو گیا۔ اس دوران میں، مَیں احتیاطاً اپنی پیشانی اگلی نشست کی پُشت گاہ سے ٹیک کر اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپائے رہا۔ میرے لاشعور میں یہ خوف جاگزیں تھا کہ میں نے میلان کا ایک بڑا اخبار تو دیکھ لیا تھا لیکن یہ امکان باقی تھا کہ ڈاکٹر کیپی نے میری تصویر کسی اور اخبار میں نہ چھپوا دی ہو اس لیے جس حد تک ممکن تھا خود کو چُھپائے رکھنے میں ہی میری عافیت کا راز پوشیدہ تھا۔

ایئرپورٹ کے بین الاقوامی لاؤنج میں بہت سی ایئرلائنز کے سیلز کاؤنٹرز موجود تھے جن میں سے بیشتر بند پڑے ہوئے تھے البتہ ایئر فرانس اور الاطالیہ کے کاؤنٹرز آباد تھے۔ اس وقت میری رسٹ واچ چھ بجا رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ آٹھ بجے تک دوسری ایئرلائنز کا عملہ اپنی جگہوں پر آجائے گا اس دوران میں ہم وہیں کے ریستوران میں ناشتے سے فارغ ہو سکتے تھے۔

ریستوران اس وقت تقریباً خالی پڑا ہوا تھا۔ ہم نے ایک

دور افتادہ گوشے میں میز سنبھال لی۔ ہم گفتگو کرتے ہوئے ناشتے میں مصروف تھے کہ ایک دراز قامت سفید فام ہماری میز کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ وہ پورا ہال چھوڑ کر ادھر آ رہا تھا اس لیے میرا چونکنا فطری امر تھا لیکن وہ خلافِ توقع ہم دونوں پر کوئی توجہ دیے بغیر ہمارے قریب ہی ایک دوسری میز کے گرد بیٹھ گیا۔

"تم اسے دیکھ کر کیوں چونکے تھے؟" سلطان شاہ نے سوال کیا۔

"قدرتی بات تھی۔ وہ پورا خالی ہال چھوڑ کر ادھر آ رہا تھا۔ اگر اسے تخلیے کی تلاش تھی تو اسے دوسرے کسی گوشے کی طرف جانا چاہیے تھا جہاں کوئی گاہک موجود نہیں ہے۔ اس وقت وہ میری پُشت پر اور تمہارے سامنے ہے اس لیے تم ہی کو اس پر نگاہ رکھنی ہو گی۔ یہ مجھے کچھ مشکوک نظر آ رہا ہے!" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔ وہ کن انکھیوں سے بار بار ہمارا جائزہ لے رہا ہے!" سلطان شاہ کے ان الفاظ نے میرے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ اگر وہ شی کا ہی آدمی تھا تو ہمارے لیے کسی بڑی مصیبت کا آغاز ہونے والا تھا۔

بھرپور ناشتے سے فارغ ہو کر ہم چائے کی دوسری پیالی پی رہے تھے کہ سلطان شاہ نے اضطراری طور پر اپنی کرسی میں اس طرح پہلو بدلا کہ میں گردن گھمانے پر مجبور ہو گیا۔

نووارد سفید فام اپنی کُرسی چھوڑ رہا تھا اور بغور ہماری طرف دیکھ کر ڈھٹائی کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی مسکراہٹ کے ذریعے کسی پُرانی شناسائی کا اظہار کرنا چاہ رہا ہو۔ میرے لیے وہ صورتِ حال بڑی صبر آزما تھی کیونکہ اس ریستوران میں نووارد پر ہاتھ ڈال کر خود بچ نکلنا آسان نہیں تھا جبکہ وہ ہماری میز کی طرف آنے پر تُلا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میرے اعصاب تن گئے اور ذہن فوری طور پر مدافعانہ حکمتِ عملی کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

وہ اپنی کُرسی چھوڑ کر آہستہ آہستہ باوقار انداز میں چلتا ہوا ہماری طرف آیا تھا۔ اس کے قریب پہنچنے سے پہلے میں جارحانہ تیوروں کے ساتھ کُرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" قریب آ کر اس نے بدستور مسکراتے ہوئے اطالوی لہجے مگر انگریزی زبان میں سوال کیا۔

"ہال میں بہتیری میزیں خالی ہیں!" میں نے ترش لہجے میں جواب دیا۔ "ہم کچھ نجی اور ضروری گفتگو کر رہے ہیں!"

"میرا شی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تمہارے لیے ایک دوستانہ پیغام لایا ہوں!" اس نے میری طرف جُھک کر رازدارانہ لہجے میں کہا۔

اس کے الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا ہمارے مسائل سے بہت زیادہ باخبر معلوم ہو رہا تھا ورنہ اس قدر بے باکی اور اعتماد کے ساتھ شی کا حوالہ نہ دیتا لیکن یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ میلان جیسے اجنبی شہر میں ہمارا وہ اجنبی ہمدرد کہاں سے پیدا ہو گیا تھا جو ہماری نظروں میں آئے بغیر ہماری نگرانی کر رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ!" میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا اور اپنی کرسی میں گر گیا۔

"شکریہ!" اس نے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ "میرا نام فرانکو لومبارڈی ہے۔ تم شاید پیٹر واک ہو اور یہ تمہارا ساتھی رلماند ہے!" اس نے ایک ہی سانس میں ہمیں اپنی معلومات سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آج کل تم دونوں کے یہی قانونی نام ہیں کیونکہ تمہاری سفری دستاویزات پر یہ نام درج ہیں لیکن میری معلومات کے مطابق تم ڈینی کے نام سے پہچانے جاتے رہے ہو!"

"تمہاری معلومات قابلِ رشک ہیں!" میں نے اعتراف کیا۔ "لیکن تمہارا اپنا تعارف بہت ناکافی ہے۔ گفتگو آگے بڑھانے سے پہلے میں تمہارے بارے میں کچھ اور بھی جاننا چاہوں گا کہ تمہارا تعلق کس حریف سے ہے اور ہمارے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہو؟"

اس نے ایک گہرا سانس لے کر اپنے سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دی پھر ٹھیرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پہلے تو میں تمہاری یہ غلط فہمی دُور کر دوں کہ میں تمہارا پیچھا نہیں کر رہا بلکہ تمہاری حفاظت کر رہا ہوں۔ کل جب سے تم ہوٹل وینی پہنچے تھے اس وقت سے میں ہر لمحے سائے کی طرح تمہارے قریب رہا ہوں۔ پچھلی رات جب تم گیمبلرز نائٹ کلب میں ایک کٹھن صورتِ حال سے دوچار ہو گئے تھے تو میں نے ہی وہاں ہوائی فائر کر کے افراتفری پھیلائی تھی تاکہ تمہیں باہر نکل جانے کا موقع مل سکے۔ اس کے بعد جب تم کسی چوپائے کی طرح الٹی ہوئی میزوں کے درمیان بھٹک رہے تھے تو میں نے نائٹ کلب کے دو محافظوں کو ایسے موقعے پر بے ہوش کیا تھا جب وہ تمہیں دھوکا دے کر خطرناک حد تک تمہارے قریب پہنچ چکے تھے۔ پھر پچھلی رات ڈوم میں جب دو مسلح افراد نے تمہیں للکارا تو میں تمہاری مدد کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ اگر تم کسی وجہ سے ان پر قابو پانے میں ناکام رہتے تو میں فوراً ہی حرکت میں آ جاتا۔ رات تم نے ڈوم کے زیرِ زمین میٹرو اسٹیشن میں گزاری اور میں باہر کسی امکانی خطرے کے خلاف نگرانی کرتا رہا اور اب تمہارے ساتھ ہی ایئرپورٹ پہنچا ہوں!"

"تم نے یہ سب بتا کر مجھے حیران کر دیا ہے لیکن تمھاری یہ مہربانیاں بلا سبب تو ہرگز نہ رہی ہوں گی! آخر میری ذات میں تمھیں اتنی شدید دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی ہے؟"

"جب سے تم نے کھلے سمندر میں شی والوں کی گن بوٹ فروخت کی ہے اسی وقت سے تم ہماری نظروں میں آگئے تھے۔ ہمارے چند سرکردہ لوگ تمھاری دلیری، کارکردگی اور سخت جانی سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ اس کے بعد سے تم پر قریب سے نظر رکھی جا رہی ہے۔ تمھاری پل پل کی خبریں ہمیں ملتی رہی ہیں۔ پاکستان سے بھی تمھارے بارے میں کافی معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اب تم ہمیں اپنے دشمنوں میں شمار نہیں کرو گے۔"

"لیکن میرے ہوٹل وینی پہنچنے کے بارے میں تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" میرے لیے اپنی حیرت پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا۔

"یہ ذرا پیچیدہ کہانی ہے۔" وہ بولا۔ "وینی میلان میں ہمارا ایک مضبوط ٹھکانا ہے۔ تم اس ہوٹل کے نوجوان مالک سے ضرور ملے ہو گے جو ہاریش ہے۔ اس سے جمی لائیڈ کی بیٹی کے پرانے مراسم ہیں۔ وہ جب بھی میلان آتی ہے وہیں ٹھہرتی ہے۔ ہمیں اندازہ تھا تم جلد یا بدیر میلان کا رخ ضرور کرو گے کیونکہ وہی مارسیلز سے قریب ہے اس لیے ہم ہوشیار تھے۔ تمھارے وہاں پہنچتے ہی ہمیں خبر مل گئی تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ شی والے تمھارے لہو کے پیاسے ہو رہے ہیں اس لیے فوری طور پر تمھاری حفاظت شروع کرا دی گئی۔"

"بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ ان مہربانیوں کا اصل مقصد کیا ہے؟"

"ہمارے بڑے چاہتے ہیں کہ تم ہمارے لیے کام کرو۔ شی اب سنڈیکیٹ کے بجائے جمی لائیڈ کی ذاتی جاگیر بن کر رہ گئی ہے جس میں صرف خوشامدی ٹولے کو آگے بڑھنے کے مواقع ملتے ہیں۔"

"کھل کر بات کرو کہ مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟" میں نے ٹھنڈی چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے کہا۔

"وہی جو تم اب تک کرتے آئے ہو۔" اس نے کہا۔

"میں تو شی کی بیخ کنی کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے تمھارے بڑے اپنی بربادی تو نہ چاہتے ہوں گے؟"

وہ پہلی بار ہولے سے مسکرایا۔ "میں بغاوت سے پہلے کی بات کر رہا تھا۔ ہم اپنا کام بڑھانا چاہ رہے ہیں۔"

"ہیروئن؟" میں نے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم چاہو تو دنیا کے کسی بھی خطے میں فروخت کے انتظامات سنبھال سکتے ہو۔ پاکستان لوٹنے کی خواہش ہو تو وہاں کی سرحدی ایجنسیوں سے پیشگی ادائیگیوں کی بنیاد پر پوری پیداوار اور فصلوں کا سودا کر سکتے ہو۔"

"تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمھارا گروپ کس نام سے پہچانا جاتا ہے؟"

"چھوٹے موٹے گروپ شی کے سائے سے بھی ڈرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم پیشہ ورانہ اخلاقیات کا پاس کرتے ہوئے یہ بات اپنی ذات تک محدود رکھو گے کہ تمھارے لیے یہ پیشکش [illegible] مافیا کی طرف سے لایا ہوں۔ ہمارے علاوہ کسی میں یہ مجال [illegible] طاقت نہیں کہ شی کے کسی دشمن کو مؤثر تحفظ کے ساتھ پناہ دے۔"

"اگر میں یہ پیشکش قبول نہ کر سکوں؟" میں نے قدرے [illegible] کے بعد کہا۔

"تمھیں اس کا اختیار ہے۔" اس نے پرسکون لہجے میں [illegible] "لیکن میں اتنا ضرور بتانا چاہوں گا کہ اب مافیا کا سہارا [illegible] تم خود کو زیادہ دنوں تک شی والوں کے عتاب سے محفوظ [illegible] سکو گے۔ اپنے جانی اور مالی نقصان کے باوجود انھوں [illegible] چاروں طرف سے تم پر ایسا دباؤ ڈالا ہوا ہے کہ تم میلان میں چوبیس گھنٹے گزارنے سے پہلے ہی ائیرپورٹ پر واپس آ [illegible]"

وہ حقائق بھی تھے اور ایک طرح سے انکار کی صورت میں برے انجام کی دھمکی بھی۔ اس کے ذو معنی بیان کو ہر طرح کے معنی پہنائے جا سکتے تھے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ [illegible] فوری انکار کی صورت میں مافیا والے میرے بارے میں اپنی معلومات شی تک پہنچا دیتے۔ میرے لیے مافیا کی وہ پیشکش کسی اعزاز سے زیادہ ایک کڑا امتحان بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

"تمھارا اندازہ درست ہے۔" میں نے کچھ دیر کے سکوت کے بعد کہا۔ "میلان میں آتے ہی مجھے بدترین اعصابی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اب میں سنجیدگی سے پاکستان واپس [illegible] کر کچھ عرصے کے لیے مکمل آرام کرنا چاہ رہا ہوں۔ فوری طور پر تمھاری پیشکش کا جواب دینا میرے لیے ناممکن ہے۔ مجھے سوچنے کے لیے مہلت درکار ہو گی۔"

"تمھارا یہ جواب میرے لیے غیر متوقع نہیں ہے۔" وہ دوسری بار مسکرایا۔ "تم جتنا وقت چاہو لے سکتے ہو لیکن یہ یاد رکھنا اب شی میں تمھاری واپسی کا ہر راستہ بند ہو چکا ہے۔ اس بار کی گفتگو کے بعد اگر تم نے شی سے مصالحت کی کوئی کوشش [illegible] تو فوری طور پر ہماری ہٹ لسٹ میں سرفہرست آجاؤ گے۔ تمھارے لیے دو ہی راستے رہ گئے ہیں کہ ہمارے لیے کام کرو یا بڑی [illegible] کا تصور کیے بغیر زندگی بھر شی کے عتاب سے اپنا دفاع کرتے [illegible]"

"میں جانتا ہوں۔" اس بار میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد سے کہا۔ "موت کے جبڑوں میں ہاتھ ڈال کر زندگی کی نوید لانے والوں کو مارنا آسان نہیں ہوتا۔"

تم مطمئن رہو کہ شی کی طرف میری واپسی ناممکن ہے۔"

"میرے بڑے تمھارا احترام کرتے ہیں اس لیے میں کچھ اور تو نہیں کہہ سکتا لیکن یہ بتا دوں کہ جمی لائیڈ نے تمھاری موت کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ شی کے وسیع حلقوں میں یہ بات پھیل گئی ہے کہ ایک ایشیائی باغی نے جمی لائیڈ کی زندگی کو عذاب بنا دیا ہے۔ اس لیے وہ تمھیں دوسروں کے لیے عبرتناک انجام کا ایک شاہکار بنا دینا چاہتا ہے۔ اس نے پیشہ ور خونی درندوں کو تمھارے پیچھے لگایا ہوا ہے۔ رات کوڈوم کے علاقے میں تم نے جو آدمی مارے وہ ڈاکٹر گوسپی کے بھیجے ہوئے تھے۔ اگر ان کی جگہ جمی لائیڈ کے خاص آدمی ہوتے تو ان سے نمٹنے میں تمھیں دانتوں پسینہ آ سکتا تھا۔ تم سے ذرا بھی غفلت ہوئی تو بڑے خسارے میں رہو گے۔"

"مشوروں کا شکریہ۔" میں نے بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے پیشہ ورانہ اخلاقیات کا حوالہ دیا ہے تو اسی حوالے سے میں بھی یاد دلا دوں کہ میری نئی منزل کی خبر باہر نہ نکلنی چاہیے۔ میں بھی جمی لائیڈ پر اپنی بالادستی کا ہوا قائم رکھنا چاہتا ہوں۔"

"بے فکر رہو۔" اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک بات تو بتاؤ کہ ویرا تمھیں میلان بھیج کر خود کہاں رہ گئی ہے؟" مائیکل وینی بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا ہے۔"

"وہ کسی بھی وقت پہنچ سکتی ہے۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "شاید اسے مائیکل کی وفاداری کا علم نہیں ہے؟"

"کیسے ہو سکتا ہے!" وہ بولا۔ "وہ بے چارہ تو خاندانی جائیداد کو ہوٹل میں تبدیل کر کے اپنے اخراجات پورے کر رہا ہے۔ ان دونوں کے مراسم کو ہم لوگ شی پر اپنی فتح اور بڑائی کی علامت تصور کرتے ہیں۔"

"یہ تمھاری اپنی سوچ ہے ورنہ ویرا تو خود مردوں کو کھلونا سمجھنے کی عادی ہے۔ تم خود بتا رہے ہو کہ مائیکل اس کے انتظار میں دن کاٹ رہا ہے جبکہ وہ کسی ضرورت کے بغیر مائیکل کا تصور بھی نہ کرتی ہو گی۔"

"اوہ! شاید تم برا مان گئے! چاہو تو مائیکل کی معرفت تمھارا کوئی بھی پیغام ویرا تک پہنچایا جا سکتا ہے۔"

"نہیں! اس کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ اپنے رابطے کا ذریعہ ضرور بتا دو۔"

"میں تو ایک ادنیٰ سا پیغام رساں ہوں۔ آج یہاں ہوں، کل نہ جانے کہاں چلا جاؤں۔ ذرا سی مہلت دو تو میں تمھیں کوئی نہ کوئی کانٹیکٹ دے سکتا ہوں جس پر تم بوقت ضرورت رابطہ قائم کر سکو گے۔"

"کسی کو فون کرو گے؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں! چاہو تو تمھارے ٹکٹ بھی بنوا دوں۔ تمھارا غیر ضروری طور پر ائیرپورٹ پر گھومنا مناسب نہیں ہو گا۔"

اس کی تجویز مناسب تھی لیکن وہ ہماری پہلی ملاقات تھی اس لیے میں اس پر آنکھیں بند کر کے اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ ہمارے پاسپورٹ لے کر غائب ہو جاتا تو ہمارے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا اس لیے میں نے اس کی پیشکش قبول کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں! رامانند کو ساتھ لے جاؤ۔ میری کوشش یہ ہو گی کہ اٹلی یا فرانس کی ائیرلائن پر سفر نہ کرنا پڑے۔"

"واقعی بہت محتاط ہو تم۔" وہ تعریفی لہجے میں بولا۔ "بڑی دور کی بات سوچی ہے۔ ان دونوں ائیرلائنز پر کوئی تمھیں پہچان بھی سکتا ہے۔ میں دیکھوں گا کہ آج کون کون سی ائیرلائنز یہاں سے مشرق کی طرف جاتی ہیں۔"

میں وہیں بیٹھا رہا۔ بڑے ڈالروں کی ایک گڈی سلطان شاہ کی جیب میں موجود تھی اس لیے وہ پاسپورٹ لے کر فرانکو لومبارڈی کے ساتھ ریستوران سے باہر چلا گیا۔

میرے لیے وہ صورتِ حال بہت عجیب اور ناقابلِ یقین تھی۔ میں فرانکو کے ساتھ واجبی انداز میں گفتگو کرتا رہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کے ہر انکشاف کے ساتھ مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ اس نے میری مصروفیات کی جو روداد سنائی اس کی وجہ سے اس کی باتوں پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں تھی۔ میں شروع سے آخر تک بے حد محتاط رہا تھا خاص طور پر تعاقب یا اپنے قرب و جوار میں کسی مشتبہ آدمی کی موجودگی پر میں نے مسلسل نگاہ رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن فرانکو کا سراغ لگانے میں بری طرح ناکام رہا تھا جو بڑی مہارت کے ساتھ سائے کی طرح میرے پیچھے لگا رہا تھا۔

یہ حقیقت تھی کہ گیمبلرز کے ہال میں اگر ہوائی فائر نہ کیا گیا ہوتا تو بڑے پیمانے پر شروع ہونے والی ہڑبونگ کے بغیر میرا وہاں سے بچ نکلنا ناممکن ہو کر رہ جاتا۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید کلب کے کسی مسلح محافظ نے بوکھلاہٹ میں وہ احمقانہ حرکت کر کے میرا کام آسان کیا تھا جبکہ وہ ترکیب فرانکو کی تھی۔ افراتفری پیدا کرنے کے بعد وہ خود وہاں سے نکلنے میں کامیاب رہا تھا۔

ان سب ضمنی باتوں سے اہم نکتہ یہ تھا کہ میں نے پاکستان میں اپنے نجی معاملات کی بنا پر شی سے بغاوت

کا علم بلند کیا تھا مگر پھر رفتہ رفتہ میرا نام مافیا جیسی رسوائے زمانہ تنظیم کے ذمّے داروں کی نگاہوں میں آگیا۔ حقیقت یہ تھی کہ شی کا نام پاکستان میں میں نے کبھی سُنا بھی نہیں تھا۔ وہاں سے باہر نکلنے کے بعد پہلی بار مجھے پتا چلا کہ میں جس تنظیم کے لیے کام کرتا رہا تھا وہ شی کے نام سے پہچانی جاتی تھی جبکہ مافیا برسہا برس سے دُنیا میں اخلاقی اور سیاسی جرائم کی سب سے بڑی پُشت پناہ سمجھی جاتی تھی۔ ایک ایسی بدنام اور سفّاک تحریک کی طرف سے میری تعریف و توصیف اس مرحلے پر مجھے اپنے لیے ایک گالی محسوس ہو رہی تھی — میں جرائم ترک کر کے صاف ستھری گھریلو زندگی کے خواب دیکھ رہا تھا لیکن مافیا والے مجھے بتا رہے تھے کہ مجھ میں ایک شہرۂ آفاق مجرم بننے کی زبردست صلاحیت موجود تھی۔

ان دونوں کی واپسی اس وقت ہوئی جب میں انتظار سے اُکتا کر فرانکو کے خلاف سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

”معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔“ فرانکو نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ یہاں سے براہِ راست پاکستان کے لیے کوئی پرواز نہیں ہے۔ وہ روٹ روم سے مل سکتا ہے۔ روم تک تمھیں الاطالیہ سے ہی سفر کرنا ہو گا۔“

”مجبوری ہے تو یہی سہی۔ وہاں سے کون سی ایئر لائن ملی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”لفت ہنسا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تمھارا معاملہ تو صاف ہے۔ برٹش نیشنل ہونے کی بنا پر تمھیں کراچی ایئر پورٹ پر پندرہ دن کا ویزا مل جائے گا۔ لیکن بھارتی شہریوں کو پیشگی ویزا لینا پڑتا ہے۔ شاید راما نند کو پاکستان میں داخلے کی اجازت نہ مل سکے۔“

”ٹکٹ کا کیا ہوا؟“ میں نے بے تابی کے ساتھ پوچھا۔

”ٹکٹ تو بن گئے۔ ایئر لائن والے ویزا نہیں دیکھتے لیکن یہ نکتہ اسی نے بتایا تھا اس لیے راما نند کا بمبئی تک کا ٹکٹ بنوا لیا ہے۔ اگر اسے ویزا نہ مل سکا تو یہ دو دن بعد اسی ٹکٹ پر بمبئی جا سکتا ہے۔ اسے وہاں سے ویزا حاصل کر کے پاکستان آنا ہو گا۔ لفت ہنسا کی یہ پرواز کراچی اور بمبئی سے ہوتی ہوئی مشرقِ بعید تک جاتی ہے۔“

”اچھا ہوا کہ یہ مسئلہ بھی یہیں سامنے آگیا۔ میں نے تو اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ پاکستان اور بھارت کے مراسم واقعی ایسے نہیں ہیں کہ شہریوں کو سفر میں سہولتیں حاصل ہوں۔“

”میرا پاکستان میں داخلہ مشکل ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ تم بھی میرے ساتھ سیدھے بمبئی چلو؟ وہاں سے ہم ایک ساتھ پاکستان واپس آسکتے ہیں۔“ سلطان شاہ نے رائے ظاہر کی۔

”یہ بہت آسان ہو گا۔ بھارت کامن ویلتھ کا رکن ہے، پیٹرواک اپنے برٹش پاسپورٹ کی وجہ سے بلا روک ٹوک بھارت میں داخل ہو سکتا ہے۔“ فرانکو نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”اب جو ہو گیا ہے وہی بہتر ہے۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”پاکستان میں جو ہو گا وہ دیکھا جائے گا۔ ضرورت محسوس ہوئی تو میں وہاں سے نیا ٹکٹ بھی خرید سکتا ہوں۔“

”روم کے لیے تمھاری پرواز نو بجے روانہ ہو گی۔ اس وقت تک میں تمھارے آس پاس ہی موجود رہوں گا۔“ فرانکو نے مجھے آگاہ کیا۔ ”ویسے میں نے پاکستان میں رابطے کے بارے میں بھی معلوم کر لیا ہے۔ طریقہ ذرا طویل ہے لیکن ہر اعتبار سے محفوظ ہے۔ تمھیں کراچی سے شائع ہونے والے کسی قومی اخبار میں گمی گمبی کے عنوان سے ایک اشتہار شائع کرانا ہو گا۔ مضمون جو بھی ہو مگر عنوان یہی ہونا چاہیے۔ اشتہار میں تم اپنا جو بھی نمبر دو گے اس پر مافیا کے کراچی بیورو کا سربراہ خود فون کرے گا۔ وہ کاسٹ کے نام سے اپنا تعارف کرائے گا۔ تمھارا کوڈ شوٹر ہو گا۔ شناخت کے بعد تم اس سے کھل کر بات کر سکو گے۔ ضرورت ہوئی تو اس کے ذریعے تمھیں اٹلی سے بھی ہدایات موصول ہو سکیں گی۔“

”رابطے کا کوئی آسان ذریعہ نہیں ہے وہاں؟“ میں نے سوال کیا۔

”مجبوری ہے۔ فی الحال مجھے یہی بتایا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے رابطے کے بعد کراچی والا خود ہی کوئی مستقل طریقہ بتا دے۔“

وہ اپنا کام پورا کر چکا تھا اس لیے ہم دونوں سے پُرتپاک انداز میں ہاتھ ملا کر رخصت ہونا چاہا مگر مجھے نادیہ کا خیال آگیا۔ مائیکل ونینی مافیا کا رُکن تھا اس لیے فرانکو کو اس کے ذریعے نادیہ کے بارے میں معلوم ہو سکتا تھا مگر میرے پاس اس لڑکی کا عشر معلوم کرنے کا کوئی بھی ذریعہ نہیں تھا۔ اس نے بتلایا۔ ”میں تمھاری ڈیوٹی پر تھا اس لیے تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔ رات فون پر صرف اتنا پتا چلا تھا کہ پروموٹرز اس کا انتظار کر کے واپس چلے گئے۔ رات گئے وہ واپس آئی تو اپنے بوائے فرینڈ سے اس کی خاصی مار دھاڑ ہوئی اور وہ ہوٹل چھوڑ کر چلی گئی۔“

”زوتی وہیں ٹھہرا ہوا ہے؟“

”ہاں! وہ کہاں جائے گا۔ پیسے ختم ہونے تک نادیہ سے صلح نہ ہوئی تو ضرور نیپلز واپس لوٹ جائے گا۔“

”ہو سکے تو کسی سے زوتی کی ٹھکائی کرا دو۔“ میں نے اس سے التجا کی۔ ”وہ بہت ہی کمینہ اور خود غرض شخص ہے۔“

فرانکو ہنس پڑا۔ ”شہر میں کس کس کو پٹواؤ گے؟ آج کل کے زیادہ تر نوجوان اسی کی طرح کاہل اور عیش پرست ہو گئے ہیں۔ ایسے مقامی معاملات کے بارے میں اپنے ذہن پر زور نہ ڈالو۔ چند دن میں وہ دونوں پھر ایک ہو جائیں گے۔“

اس کے جاتے جاتے میں نے اس کے ٹھکانے کے بارے میں دریافت کیا اور وہ کاغذ کے ایک رقعے پر اپنا فون نمبر لکھ کر میرے حوالے کرتا ہوا عجلت میں روانہ ہو گیا۔ اس کے رویّے میں یک بیک اس طرح تبدیلی رونما ہوئی تھی جیسے اسے کوئی غیر معمولی چیز یا چہرہ نظر آگیا ہو۔ میں نے متجسّس نظروں سے ریستوران کے ہال اور داخلی راستے کا جائزہ لے ڈالا لیکن وہاں کوئی غیر متوقع تبدیلی نظر نہیں آئی اور میں سر جھٹک کر سلطان شاہ کی طرف متوجّہ ہو گیا۔

”اگر مجھے اکیلے بمبئی جانا پڑا تو بڑی مشکل کھڑی ہو جائے گی۔“ سلطان شاہ تشویش آمیز لہجے میں بولا۔

”مجبوری ہے۔ یہ تو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ان پاسپورٹوں پر واپسی کی صورت میں ایسی کوئی دشواری پیش آسکے گی — بہرحال اس کا بھی کوئی توڑ سوچنا ہی ہو گا۔“

”یہاں گھپلا چل گیا۔ ہندوستان میں تو میں فوراً دھر لیا جاؤں گا۔ پاسپورٹ پر راما نند کا پتا اور جائے پیدائش مدراس کی ہے جبکہ میں کسی بھی طرح مدراسی نظر نہیں آسکتا۔ مجھ پر فوراً ہی غیر ملکی جاسوس ہونے کا الزام عائد کر دیا جائے گا۔ وقتی طور پر گلو خلاصی ہو گئی تو پھر کہیں نہ کہیں دھر لیا جاؤں گا۔ نہ شہروں کا علم ہو گا نہ راستوں کا۔ پھر سُنا ہے کہ پاکستان کے لیے ویزا بھی صرف دہلی سے جاری ہوتا ہے۔“

میں اس کی بے بسی پر بے اختیار ہنس پڑا۔ ”اپنا خون خشک نہ کرو، پاکستان اپنا ہی ملک ہے۔ کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔ جیب میں رقم موجود ہو تو وہاں بڑے سے بڑا کام آرام سے ہو جاتا ہے۔“

”روانہ ہونے سے پہلے یہ بھی سوچ لینا کہ ہماری جیبوں میں دو بھرے ہوئے پستول اور ایک بم گن کے علاوہ تین لاسلکی اپریٹس بھی موجود ہیں۔ لاکھوں ڈالر کی خطیر رقم اس کے علاوہ ہے۔“

”تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہ ساری چیزیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ پستول وغیرہ جیب میں نہیں ہونے چاہئیں۔ روم میں سوٹ کیس لے کر رقم سمیت ساری اشیاء اسی میں ڈال دیں گے۔“

”اپریٹس تو پھینک ہی دو۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”اب وہ ہمارے کس کام آئیں گے؟“

”چلو! پھینک دینا۔“ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”ویسے بات کو مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اگر میٹرو اسٹیشن پر میں جمی لائیڈ والا اپریٹس آن کر لیتا تو شاید دوسری طرف کا کوئی پیغام سُننے میں کامیابی ہو جاتی۔ ہو سکتا ہے کہ جمی لائیڈ دُنیا کے ہر شہر میں ذاتی رابطے کے لیے اسی مخصوص فریکوینسی کو استعمال کرتا ہو۔“

”وہ وقت گزر گیا۔ اب میں بیگ لے کر ریستوران کے باتھ روم میں جا رہا ہوں۔ تینوں اپریٹس وہیں ڈسٹ بن میں یا پانی کی ٹنکی میں ڈال دوں گا۔“ اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

”اور جیب والا پستول تھیلے میں ڈال دینا۔“ میں نے اسے یاد دلایا اور وہ تھیلا اٹھا کر باتھ روم کی طرف چل دیا۔

میلان سے روم تک کا سفر ہر اعتبار سے پُرسکون اور آرام دہ رہا۔ طیارے سے اتر کر ہم بس کے ذریعے ٹرمینل کی عمارت میں آئے اور جہاز سے سامان اتارے جانے کے بعد اپنا بیگ لے کر بین الاقوامی پروازوں والے حصّے کی طرف چل دیے۔

راستے میں ایک دُکان سے میں نے ایسا مختصر سا چرمی سوٹ کیس خرید لیا جس میں رقم والا بیگ جوں کا توں سما گیا پھر اس بیگ کو چھُپانے اور سہارا دینے کے لیے ہم نے کچھ ملبوسات بھی خریدے اور ایک گوشے میں بیٹھ کر سارا سامان مضبوط سوٹ کیس میں مقفل کر دیا۔

لفت ہنسا کی پرواز فرینکفرٹ سے آنے والی تھی جو پینتالیس منٹ تک روم کے ہوائی اڈے پر ٹھہرنے کے بعد براہِ راست کراچی کے لیے روانہ ہو جاتی۔ ہم نے ایئر لائن کے کاؤنٹر پر چیک اِن کرتے ہوئے سوٹ کیس سلطان شاہ کے ٹکٹ پر عملے کے حوالے کر دیا اور پھر بورڈنگ کارڈ لے کر امیگریشن وغیرہ کے مراحل کی تیاری کرنے لگے۔

ہمارے پاس وقت کافی تھا اس لیے تھوڑی دیر تک ہم اپنے گرد و پیش میں مسافروں کی بھاگ دوڑ اور بھانت بھانت کے مسائل سے لطف اندوز ہوتے رہے پھر الیکٹرانک اسکیننگ کے مراحل سے گزر کر بین الاقوامی پروازوں کے مسافروں والی انتظار گاہ میں پہنچ گئے، جہاں مسافروں کی خاصی تعداد موجود تھی۔

روم میں ہمارا وہ قیام صرف ایئر پورٹ کی حدود تک محدود رہا تھا لیکن میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ روم اٹلی کا دارالخلافہ ہونے کے باوجود صنعتی اور تجارتی مرکز میلان سے بہت مختلف تھا۔ یکساں زبان ہونے کے باوجود دونوں شہروں کے لب و

لہجے میں تو فرق تھا ہی لیکن باشندوں کے خدوخال میں بھی نمایاں فرق تھا۔ میلان والوں میں یورپ کا رنگ واضح طور پر جھلکتا تھا جبکہ رومنوں کے خدوخال میں مشرقیت کی جھلک ملتی تھی۔ غور کیا جاتا تو اٹلی کے ان دونوں حصوں میں اور بھی بہت سے تضادات دریافت کیے جا سکتے تھے لیکن میں نہ محقق تھا اور نہ اٹلی کے حصے بخرے کرنے پر مامور کیا گیا تھا، اس لیے ان سب باتوں کو بھول کر بار کی طرف بڑھ گیا۔ گیمبلرز سے فرار کی راہ اختیار کرنے کے بعد سے میں نے کسی مشروب کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا اس لیے اٹلی سے نکاسی کی امید ہوتے ہی اس بارے میں میری اشتہا یک بیک بیدار ہو گئی تھی۔

بس کے ذریعے لفت ہنسا کے طیارے میں منتقل تک میں وہیں بار کاؤنٹر پر ڈٹا رہا۔ اس دوران میں عمدہ اسکاچ کے چار ڈبل پیگ میرے معدے میں منتقل ہوئے اور سلطان شاہ مجھے باز رکھنے کی ناکام کوششوں کے دوران بھلا کے چائے کی دو پیالیاں پی گیا۔ میں جہاز پر سوار ہوا تو میرے ذہن پر خاصا سرور سوار ہو چکا تھا۔

جہاز کی کافی نشستیں خالی تھیں۔ اس لیے ہم دونوں کے حصے میں اگلی پچھلی قطار کی تین تین نشستیں آئی تھیں، مگر فوری طور پر سلطان شاہ میرے برابر ہی میں بیٹھ گیا۔ پچھلی تین نشستوں پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے اس نے اپنی بریکیٹ وہاں ڈال دی تھی تاکہ بستر جمانے کا کوئی شوقین وہاں قابض نہ ہو سکے۔

"تم نے بہت زیادہ پی لی ہے۔ اب ذرا اپنی کھوپڑی پر قابو ہی رکھنا۔" سلطان شاہ نے [illegible] لگانے کے بعد ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

"کھانے پینے پر نہ ٹوکا کرو۔" [illegible] نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو جہاز میں کئی دور چلیں گے۔"

میری آواز شاید [illegible] وسطی قطار میں بیٹھے ہوئے خشخشی [illegible] بنائے ہوئے چونک کر میری طرف [illegible] رنگ [illegible] وہ پاکستانی یا بھارتی مسلمان [illegible] علاوہ بھی کافی ایشیائی [illegible] جو [illegible] روم سے سوار [illegible] والوں میں صرف ہم دو [illegible] اس کے مسافر تھے۔ ورنہ بقیہ سب لوگ [illegible] نام تھے۔

"میں تمھیں جہاز میں ہرگز پینے نہ دوں گا۔" سلطان شاہ غصیلے لہجے میں بولا۔

"تم پیچھے اپنی سیٹ پر کیوں نہیں چلے جاتے۔ میں ذرا آرام سے ہاتھ پیر پھیلا کر بیٹھنا چاہتا ہوں۔"

"تم جتنا چاہو پھیل لو، ایک بار کراچی پہنچ گئے تو بھابی تمھیں نکیل لگا دے گی۔ پردیس میں ساتھ رہ کر میں نے تمھاری کئی بری عادتیں نوٹ کر لی ہیں۔ گن گن کر سب بتا ڈالوں گا۔"

"مجھے زیادہ تاؤ نہ دلاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمھیں کراچی میں [illegible] کی اجازت ہی نہ ملے اور تم بمبئی سے غزالہ کو فریاد بھرے خط لکھتے رہو۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا ہوں۔ ذرا سی اور لوں گا تو کراچی پہنچنے سے پہلے چند گھنٹوں کی نیند اور لے لوں گا۔ [illegible] ہم رات گئے ہی پہنچیں گے۔ ہوٹل وغیرہ کے بند و بست میں [illegible] کالی ہو جائے گی۔"

"اب تم نے ہوش کی بات کی ہے تو رعایت مل جائے گی لیکن مافیا والا چکر ابھی تک میرے ذہن پر سوار ہے۔ میں تم سے اس بارے میں کچھ دیر بات کرنی چاہ رہا تھا۔"

"جب تک جاگ رہا ہوں۔ زبان چلتی رہے گی، جو پوچھنا ہے وہ پوچھ لو۔" میں نے خشخشی داڑھی والے کو گھورتے ہوئے نیچی آواز میں کہا اور وہ مجھے اپنی طرف نگران پا کر بوکھلائے ہوئے انداز میں طیارے کی چھت کا جائزہ لینے لگا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ اب بھی ان کا کوئی آدمی ہمارے آس پاس موجود ہو؟" اس نے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا۔

"روم سے پرواز کے بعد طیارہ کراچی میں ہی اترے گا۔ انھیں پورا یقین ہے کہ ہم راستے میں کہیں غائب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے نگرانی کا خوف بے سود ہے۔ البتہ کراچی میں ہماری نگرانی کا بند و بست کر لیا جائے گا۔"

"مجھے ڈر ہے کہ ہم آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والے ہیں۔"

"شاید ایسا نہ ہو۔ اس کا سارا انحصار ہماری خواہش پر ہو گا۔ اگر ہم کھجور میں نہ اٹکنا چاہیں تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اس امر پر مجبور نہیں کر سکے گی۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اسی وقت طیارے میں روانگی کا اعلان ہوا اور [illegible] کے لیے پیدا ہونے والی ہلکی سی ہلچل کے بعد طیارہ [illegible] سکوت چھا گیا۔

طیارے کی تیز اڑان کا عمل ختم ہونے پر تمباکو نوشی کی ممانعت کی [illegible] ہدایات معدوم ہوئیں تو میں نے سگریٹ سلگا لی اور سلطان شاہ اٹھ کر پیچھے نشست پر چلا گیا۔ پھر [illegible] دونوں درمیانی نشستوں [illegible] ہٹتے اور کیے اور آرام سے پھیل کر بیٹھ گیا تاکہ بیلٹ [illegible] باندھے رکھنے کی ہدایت ختم ہونے پر تین نشستوں والے [illegible] ہو سکوں۔

[illegible] رات کا جاگا ہوا تھا۔ اس لیے جب [illegible] موقع [illegible] پیٹ [illegible] بھرے ہوئے خمار کے باعث فوراً [illegible] دگی کی لہر طاری ہو گئی۔ میں نہ جانے کتنی دیر سوتا رہا۔ ائیر ہوسٹس کی نرم اور دلکش آواز نے مجھے بیدار کر دیا۔ میرے اٹھتے ہی اس نے میز کھول کر کھانے کی ٹرے رکھ دی۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ بورڈنگ کارڈ لیتے ہوئے مسلم فوڈ کا مطالبہ کر کے میں نے غلطی کی تھی۔ میرے استفسار پر ائیر ہوسٹس نے میرے اندیشے کی تائید کر دی کہ کھانے میں لحم خنزیر موجود تھا۔ اتفاق ہی تھا کہ اس وقت ٹرالی میں مچھلی اور سبزیوں پر مشتمل کھانا بھی موجود تھا۔ جو میری فرمائش پر پچھلی ٹرے سے بدل دیا گیا۔ سلطان شاہ کو بھی مچھلی والی ٹرے دی گئی لیکن خشخشی داڑھی والا جو میرے پینے پلانے کے ذکر پر ناک بھوں چڑھا رہا تھا، وہ بڑی رغبت کے ساتھ مجرب گوشت کے سرخ پارچوں پر نمک اور کالی مرچیں چھڑک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے دکھ ہوا اور دل میں بڑی شدت کے ساتھ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش! وہ مسلمان نہ ہو، لیکن میں پورے سفر کے دوران اس سے کوئی سوال کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ میرے سوال کے جواب میں اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کر لیتا تو میرا وہ پندار ٹوٹ جاتا جو مارسیلز کے گائیڈ، لوستاں نے میرے دل میں پیدا کر دیا تھا۔

سفر طویل لیکن خاصا خوشگوار تھا۔ جوں جوں منزل قریب آتی جا رہی تھی میرے دل میں غزالہ کے بارے میں دلفریب تصورات ترتیب پاتے جا رہے تھے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھے مدت گزر چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پیشگی اطلاع کے بغیر وہ مجھے اچانک اپنے سامنے پا کر حیرت اور خوشی سے دیوانی ہو جائے گی۔

مجھے اس کے گھر کا علم ہوتا تو میں ائیرپورٹ سے سیدھا اسی کے گھر پہنچتا، لیکن مشکل یہ تھی کہ جہانگیر بھی فون پر گفتگو کے دوران اس کا پتا نہیں بتا سکا تھا۔ جب کہ میرا گھر شی کے مقامی بڑوں کی ہدایت پر نذرِ آتش کر دیا گیا تھا۔ فیکٹری میں بھی... آگ لگوا دی گئی تھی۔ دوستوں میں لے دے کر بس جہانگیر ہی بچا تھا جس کے گھر پر میں پوری بے تکلفی کے ساتھ قیام کر سکتا تھا لیکن اول تو سلطان شاہ کے ساتھ وہاں جانا مناسب نہیں تھا پھر اس کی بیوی سلمیٰ کے تیوروں سے میں ہمیشہ ہی خوفزدہ رہتا تھا۔ وہ میرے ایک عزیز دوست کی بیوی تھی اور مجھ سے ہمیشہ خصوصی اپنائیت کے ساتھ ملتی تھی جو جہانگیر کی موجودگی میں احترام آمیز ہوتی تھی، لیکن اس کی عدم موجودگی میں بے تکلفی میں بدل جاتی تھی۔ اس بارے میں میں ہمیشہ محتاط رہتا تھا کیونکہ کسی عورت کی وجہ سے اپنے اس اکلوتے دوست سے محروم ہونا مجھے کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں تھا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر میں ائیرپورٹ سے سلطان شاہ کو شہر میں نکال لے جانے میں کامیاب ہو گیا تو شہر کے کسی اچھے ہوٹل میں قیام کر دوں گا اور سلطان شاہ کو وہاں چھوڑ کر جہانگیر کے ساتھ غزالہ کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔

جہاز مشرق کی طرف محوِ پرواز تھا اس لیے وقت بہت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ میلان کے مقابلے میں کراچی کا وقت چار گھنٹے آگے رہتا ہے۔ اس لیے دورانِ پرواز کھانوں کا درمیانی وقفہ کم کر کے جہاز کا عملہ وقت کے اس فرق کو پورا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا میلان کے وقت کے مطابق ایک بجے دیا گیا تھا پھر بھی چھ بجے رات کا کھانا شروع ہو گیا۔ جب خالی برتن سمیٹنے میں عجلت کا مظاہرہ کیا جانے لگا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ جہاز پاکستان کی فضائی حدود میں داخل ہونے والا ہے۔

آخر کار لینڈنگ کی تیاریاں ہونے لگیں اور بے اختیار میرا دل بھاری ہونے لگا۔ ایک طویل مدت تک غریب الوطن رہنے کے بعد میں ایک بار پھر وطن کی سرزمین پر اترنے والا تھا۔ وطن میں رہتے ہوئے مجھے کبھی اپنی مٹی کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا تھا، بلکہ میں منشیات فروشی کے مذموم کاروبار کے ذریعے اپنے وطن کی رگوں میں ہلاکت کا زہر پھیلاتا رہا تھا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ پوری دنیا میں بس وہی سرزمین تھی جو مہربان آغوشِ مادر کی طرح ہر وقت اور ہر حالت میں مجھے پناہ دے سکتی تھی اور اسی سے میری شناخت تھی ورنہ ہر جگہ میں اجنبی اور بے وطن تھا۔

لینڈنگ کے بعد طیارہ رکنے سے پہلے ہی کراچی میں اترنے والے بیشتر مسافروں نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں اور اپنا دستی سامان سمیٹنے لگے لیکن ہم دونوں سکون سے بیٹھے کھڑکیوں سے باہر کراچی ائیرپورٹ کی روشنیوں کا نظارہ کرتے رہے۔

"تم یک بیک کچھ سنجیدہ ہو گئے ہو؟" سلطان شاہ نے مجھے ٹوکا۔

"بعض چیزوں کو کھو کر ان کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے لیکن مجھے یہاں اترنے کے بعد اپنے وطن کی عظمت کا احساس ہوا ہے۔ یہی مندا سی روشنیاں، خوابیدہ شہر اور دھیمی دھیمی زندگی تو ہماری شناخت ہے۔"

"جو لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹتے ہیں، اگر انھیں بھی حوالات اور جیلوں میں قید کرنے کے بجائے کچھ عرصے کے لیے جلاوطن کر دیا جائے تو شاید ان کے دلوں میں بھی اپنی مٹی اور اپنے رشتوں کی محبت بیدار ہو سکتی ہے۔"

"تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ سنتے ہیں، پہلے عادی مجرموں کو کالے پانی کی سزا دی جاتی تھی۔ وہ بھی جلاوطنی کی ہی ایک شکل تھی، شاید انگریزوں نے مجرموں کی اصلاح کے لیے وہ سزا رائج کی تھی۔"

"انگریز نہیں، اپنے ہی حکمرانوں نے مجرموں کا مزاج سمجھ کر کالے پانی بنائے تھے۔ غیر آباد اور دور افتادہ جزیروں میں زندگی ہر نعمت سے محروم، بیڑیوں میں قید رہ کر ہی آزادی اور اس کی صحیح نعمتوں کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے ...!"

ہماری حب الوطنی کی وہ لہر وہیں دم توڑ گئی کیونکہ جہاز کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔ اور شاید سیڑھیاں لگائی جا رہی تھیں۔ پھر نشستوں کے درمیان مسافروں کی قطار دھیمے دھیمے آگے سرکنے لگی۔ خشخشی داڑھی والا نہایت سکون سے اپنی نشست پر براجمان تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اول تو وہ حرام خور مسلمان نہیں تھا اور اگر مسلمان بھی تھا تو کم از کم پاکستانی نہیں تھا۔

ٹرمینل کی عمارت کے آگے میں دانستہ تاخیر سے بس سے اُترا تھا اور ہم دونوں نے اتنی سست روی اختیار کی تھی کہ امیگریشن والی قطار میں ہم خود بخود آخری سرے پر رہ گئے تھے۔

امیگریشن کارڈ جہاز پر بھر والیے گئے تھے اس وقت میرا دل بے اختیار زور زور سے دھڑک رہا تھا کیونکہ سلطان شاہ کے لیے پورے سفر میں وہی مرحلہ سب سے اہم تھا۔ میرے پاسپورٹ پر بلا باز پرس ویزا لگا کر افسر نے سر اٹھایا تو میرے ساتھ وہاں صرف سلطان شاہ باقی رہ گیا تھا۔

"نہیں جناب!" اس نے سلطان شاہ کا پاسپورٹ ہاتھ میں لیتے ہی حقارت سے اس کے آگے پھینک دیا۔ "بھارتی شہریوں کو اپنے ملک سے پیشگی ویزا لینا ہوتا ہے۔ انھیں ایئر پورٹ پر ویزا نہیں دیا جاتا۔"

"مگر یہ اٹلی سے آرہا ہے۔" میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "اس کی بیوی یہاں اپنے میکے میں قریب المرگ ہے۔ اسے صرف چند گھنٹوں کا ویزا دے دیں تاکہ یہ مرنے سے پہلے اس کی شکل دیکھ سکے۔ یہ آپ کی ہر فیس ادا کرنے کو تیار ہے بیچارہ۔" میں نے اپنی گفتگو میں 'ہر فیس' کے الفاظ پر خاصا زور دیا تھا جو رائیگاں نہیں گیا۔

"ویزا تو کسی صورت میں نہیں مل سکتا۔" اس نے پاسپورٹ اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ کچھ دور کھڑا ہوا سنتری بھی نہ سن سکے۔ "ایسی ہی مجبوری ہے تو اپنے رسک پر بغیر ویزا کے جا سکتے ہو۔"

"میں اس پر بھی تیار ہوں جناب!" سلطان شاہ نے گڑگڑا کر کہا۔

"کتنے ڈالر ہیں تمہارے پاس؟" اس نے مزید دھیمی آواز میں سوال کیا۔ "تین سو ڈالر پاسپورٹ میں رکھ کر لاؤ۔" اس نے اسی لہجے میں کہا پھر اونچی آواز میں بولا۔ "لو۔ ادھر کونے میں جا کر یہ فارم دوبارہ بھر کر لاؤ۔ جو انٹری سمجھ میں نہ آئے خالی چھوڑ دینا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک سادہ امیگریشن کارڈ اسے تھما دیا۔

سلطان شاہ کا بھارتی پاسپورٹ دور ہی سے پہچانا جا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے وہ جلدی سے اپنی جیب میں ڈال لیا اور جیب سے چار سو ڈالر نکال کر اپنے برطانوی پاسپورٹ کے اندر رکھ دیے۔ ہم مزید چند منٹ اس طرح ضائع کیے جیسے واقعی عقل پر زور دے کر امیگریشن فارم بھر رہے ہوں پھر ہم ایک ساتھ کاؤنٹر پر لوٹ آئے۔

پاسپورٹ سے وہ ڈالر کب اور کیسے اس کی دراز میں منتقل ہوئے یہ ہم دونوں کوشش کے باوجود نہ دیکھ سکے۔ اس نے دائیں بائیں دیکھ کر آہنی مہر پر شور آواز کے ساتھ اپنے سامنے پڑے ہوئے فالتو کاغذ پر ثبت کی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے پاسپورٹ مجھے لوٹا دیا۔

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ میرا خوف سے خون خشک ہوا جا رہا تھا۔" وہاں سے آگے نکل جانے کے بعد سلطان شاہ نے دھیمی، تحیر آمیز آواز میں کہا۔ "اس طرح تو کوئی بھی رشوت دے کر ملک میں گھس سکتا ہے۔"

"مجرموں کے معاملے میں بس مقدر اور ان لوگوں کا تجربہ ہی اُن کی رہنمائی کرتا ہے ورنہ اس جیسے بہتیرے اہل کار تو بس گاہک کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکو، تخریب کار اور دہشت گرد اسی طرح ملک میں آتے جاتے ہیں۔ تم نے یہ نہیں دیکھا کہ اس نے خود کو کتنی صفائی سے بچا لیا ہے۔ ویزا لگا دیتا تو تمہارے ساتھ وہ بھی اندر ہو سکتا تھا۔ اس وقت تم پکڑے جاؤ تو وہ صاف کہہ دے گا کہ تم اس کی نظر بچا کر امیگریشن ایریا سے نکلے ہو۔ کیونکہ تمہارے پاسپورٹ پر داخلے کا کوئی اندراج نہیں ہے۔"

"کمال ہے۔" سلطان شاہ سر جھٹک کر بڑبڑایا۔ "مہر کیسی مہارت کے ساتھ بجائی تھی اس نے! میں سمجھا کہ وہ میرا ویزا بھی تمہارے ہی پاسپورٹ پر لگانے والا تھا۔"

"لعنت بھیجو! ایسے لوگ نہ ہوتے تو اس وقت سپاہی تمھیں زبردستی جہاز پر بٹھا رہے ہوتے یا تمھیں ٹرانزٹ لاؤنج میں اگلی پرواز کی دستیابی تک قید کر دیا جاتا۔ اب ہوٹل پہنچ کر اپنے پاسپورٹ کو آگ لگا دینا۔ بھول جاؤ کہ کبھی تم رامانند بھی بنے تھے۔"

اپنے اہل کاروں کی کارکردگی کے بارے میں، میں نہ صرف بہت کچھ سنتا رہا تھا بلکہ شی کے لیے کام کرتے ہوئے میں نے ایسے فرض شناسوں کی کارکردگی بہت قریب سے دیکھی تھی لیکن امیگریشن کے بارے میں وہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ اس مرحلے سے گزرتے ہی میری سمجھ میں آگیا کہ ہزاروں کی تعداد میں بنگلہ دیشی، سیلونی اور دوسری قوموں کے مرد اور عورتیں پاکستان میں کیسے رہ رہی تھیں۔ ان کے خدوخال چیخ چیخ کر اعلان کرتے تھے کہ وہ غیر ملکی ہیں لیکن ان کے شناختی کارڈ انھیں پیدائشی پاکستانی ثابت کرتے تھے۔ بھوک اور بے روزگاری کے ستائے ہوئے وہ لوگ کراچی میں کم تر تنخواہوں پر بیش تر کام کر رہے تھے اور پاکستانیوں کے لیے ملازمتوں کا کال پڑا ہوا تھا۔

امیگریشن کے اس خوشگوار تجربے سے مجھے خاصی ڈھارس ملی اور میں نے سوٹ کیس نکالنے کے لیے بھی اسی نخار مولے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بیگیج ہال میں کوئی قلی موجود نہ تھا۔ اُجلی اُجلی وردیوں میں ملبوس افسران فرصت کے ان اوقات میں عقابی نظروں سے مسافروں کی کیفیات کا بغور جائزہ لے رہے تھے کیونکہ ان میں سے بیشتر کا تجربہ ہی ان کا کل اثاثہ تھا جس کی مدد سے وہ اپنے اثاثوں میں اضافہ کرتے تھے۔ ان کے حضور گرفت کی عموماً دو ہی صورتیں ہوتی تھیں کہ مول تول ناکام ہو جائے یا کوئی بدخواہ کسی حریف کی مخبری کر دے جب کہ ہم لاکھوں ڈالر اور دو عدد پستول نکال لے جانے کے لیے نہ صرف ہر مول تول کے لیے تیار تھے بلکہ اپنے بدخواہوں کو بھی دنیا کی راہ پر لگا آئے تھے۔

ربر کے بھاری کنویئر کے حرکت میں آتے ہی سارے افسران ٹہلتے ہوئے اپنے اپنے مورچوں کی طرف چلے گئے۔ میں نے دیکھا کہ چوبی بینچ نما میز پر وہ ایک دوسرے سے خاصی دور کھڑے ہوئے تھے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ ہر افسر اپنے سامنے موجود مسافر کے سامان کو اطمینان سے بینچ پر پھیلا کر اس کی جانچ پڑتال کر سکے۔ لیکن میرا امیگریشن کا تجربہ تازہ تھا اس لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے انھوں نے اپنے اور مسافروں کے درمیان ہونے والے راز و نیاز کو ایک دوسرے کی سماعت سے محفوظ رکھنے کے لیے رضا کارانہ طور پر وہ فاصلہ مقرر کیا ہو۔ مجھے یقین تھا کہ وہ سب ایسے نہیں تھے۔ لیکن یہ بھی یقین تھا کہ ان میں ایسے بالکل نہیں تھے۔

اس پرواز سے کراچی پہنچنے والوں میں سفید فاموں کی اکثریت تھی۔ مقامی چہرے دس پندرہ ہی تھے۔ سامان آتا گیا اور لوگ باری باری کسٹم کے مرحلے سے گزرتے رہے۔ کافی غور کے بعد بھی مجھے لین دین کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو یہ سمجھنا پڑا کہ یورپ سے آنے والوں اور خصوصاً سفید فاموں کے ساتھ خصوصی برتاؤ کیا جاتا تھا۔ اصل چھان بین ان کی ہوتی ہوگی جو دبئی، مسقط اور خلیج کے دوسرے ملکوں سے لدے پھندے چھٹیوں پر گھر آتے ہیں۔ ان کے پاس باہر سے کمائی ہوئی رقم بھی ہوتی ہے اور وہ جلد سے جلد ماں باپ اور بیوی بچوں میں پہنچنے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر رکاوٹ کو پیسے کی کلید سے دور کر کے نکل بھاگنے پر تلے ہوئے ہوتے ہیں۔

اپنے سوٹ کیس کے انتظار میں، میں نے وقت ضائع کرنے کے بجائے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ مجھے کس افسر سے رجوع کرنے سے افاقہ ہو سکے گا۔ میرا سوٹ کیس نمودار ہوا تو میں اسے ٹرالی پر لاد کر اسی افسر کی طرف بڑھا۔ میرے آگے ایک سفید فام جوڑا تھا۔ جب میں نے اس افسر کو ان دونوں کے سامان کی تفصیلی تلاشی لیتے دیکھا تو میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں نے سوچا اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف چلا جاؤں لیکن اس وقت ایسی کوئی حرکت مجھے مشکوک بنا سکتی تھی اس لیے میں دل پر صبر کی سل رکھے وہیں کھڑا رہا۔

ان دونوں کو فارغ کر کے وہ افسر میرے بجائے سلطان شاہ سے مخاطب ہوا تھا۔ "آپ کا سامان کہاں ہے؟"

"ہم دونوں ساتھ ہیں!" میں نے جلدی سے کہا۔

"اور صرف یہ چھوٹا سا سوٹ کیس ہے!" اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "کیا کیا مال ہے اس میں؟"

"ذاتی کپڑے اور بوتلیں ..." میں نے فی البدیہہ کہنا چاہا لیکن اس نے فوراً میری بات کاٹ دی۔

"ہوں ...! آہستہ بولو بھائی! ہمارے ڈی سی بھی یہیں گھوم رہے ہیں انھوں نے سن لیا تو حدود کا کیس بنا دیں گے۔ جلدی سے باہر نکل جاؤ، اپنے ہی قبیلے کے آدمی ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے سوٹ کیس پر چاک سے ایک مہمل سا نشان بنا دیا۔

خوشی سے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا جی چاہا کہ اچھل کر اس شریف افسر کے گلے میں باہیں ڈال کر اس کا منہ چوم لوں لیکن ڈی سی کا خوف خوشی کے ان جذبات پر غالب آگیا اور میں اس کا شکریہ ادا کر کے ٹرالی سمیت آگے بڑھ گیا۔

پاکستان پہنچتے ہی ساری مشکلات یوں حیرت ناک طور پر آسان ہو گئی تھیں کہ اس وقت مجھے اپنے مقدر پر رشک آنے لگا تھا۔ قدرت مجھ پر پوری طرح مہربان تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس کا شکر کیسے ادا کروں۔

ہال کے دروازے سے باہر نکلتے ہی بہت سے لوگوں نے ہماری طرف یوں ہاتھ ہلائے جیسے کافی دیر سے ہمارے ہی منتظر ہوں۔ وہ سب چہرے میرے لیے اجنبی تھے میں نے سلطان شاہ کی طرف دیکھا لیکن اس کا چہرہ بھی سپاٹ تھا۔ پھر جوں ہی ہم نے ریلنگ سے باہر نکلے، تو نا افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا گروہ ہم پر جھپٹ پڑا۔ ایک نے براہِ راست سوٹ کیس ٹرالی پر سے اُٹھا کر آگے بڑھنا چاہا لیکن سلطان شاہ نے بائیں ہاتھ سے اس کا کالر گھسیٹ کر اس سے سوٹ کیس چھین لیا۔ اس اثنا میں یہ واضح ہو چکا تھا کہ وہ سب ٹیکسی ڈرائیور یا ان کے دلال تھے۔ وسیع برآمدے سے نیچے فٹ پاتھ پر ٹریفک پولیس کے دو سپاہی ہماری طرف پشت کیے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

سلطان شاہ کے حلق سے اس کی مادری زبان میں کچھ غراہٹیں بھی بلند ہوئی تھیں۔ اسے طویل عرصے کے بعد ایک غلط موقع پر اس زبان سے مدد لینے کا موقع ملا تھا لیکن اس کے نتیجے میں ہمارے گرد سے بھیڑ چھٹ گئی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے میں کئی ہوٹلوں کے کتبے دیکھ چکا تھا جن کی گاڑیاں مسافروں کو ایئر پورٹ سے

ہوٹل تک لے جانے کے لیے موجود تھیں۔ اپنے فیصلے کے مطابق میں نے کانٹی نینٹل کے ڈرائیور سے رجوع کیا اور اس کے ساتھ آئے ہوئے باوردی پورٹر نے ہمارا سوٹ کیس ٹرالی پر رکھے ہوئے دوسرے سامان کے ساتھ لاد کر ہمیں ایک طرف انتظار کرنے کا مشورہ دیا جہاں پہلے سے چار سفید فام عورتیں تین مردوں کے ساتھ موجود تھیں۔

جب اندر سے آخری مسافر بھی نکل آیا تو ہمارا کارواں پارکنگ لاٹ کی طرف ہولیا۔ سامان کی دو وزنی ٹرالیوں کے علاوہ مسافروں کی تعداد بارہ ہوچکی تھی۔ ڈرائیور اور پورٹر اس کے علاوہ تھے۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے اپنا کمرا بک کراتے ہوئے وہی کوائف درج کیے جو میرے جعلی پاسپورٹ پر موجود تھے۔ شہر کا اندازہ لگائے بغیر میں کھل کر سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ سلطان شاہ نے اپنا اصل نام اور پتا درج کرایا، بکنگ کلرک نے اس سے پاسپورٹ طلب کیا تو میں نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا کہ وہ گاؤں سے میرا استقبال کرنے کراچی آیا ہوا تھا۔

ہم پانچویں منزل پر اپنے کمروں میں پہنچے تو رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ سلطان شاہ چند ثانیوں بعد ہی اپنا کمرا مقفل کر کے میرے کمرے میں آگیا۔ ”بلاوجہ دو کمرے بک کرالیے ان کشادہ کمروں میں ہم بآسانی ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ یہاں کم از کم ایک دوسرے سے بات تو کرسکیں گے۔ اکیلے میں نیند بھی نہیں آئے گی۔“

”جہانگیر جلدی سو جانے کا عادی ہے، سوچ رہا ہوں کہ اسے فون کردوں یا نہ کروں؟“ میں نے جیکٹ اتار کر آرام دہ بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ”کراچی پہنچنے کے بعد اب میرا دل غزالہ کے لیے مضطرب ہو رہا ہے۔“

”غزالہ کا پتا تو وہ تمھیں فون پر بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ اسے تلاش ہی کرنا پڑے گا۔ میری رائے میں اس وقت آرام کرکے صبح اس سے رجوع کرنا مناسب رہے گا۔ فون بھی ہوٹل کے بجائے باہر سے کرنا تاکہ آزادی کے ساتھ گفتگو کرسکو۔“

”یہاں سے بھی آزادی سے بات کی جاسکتی ہے، بہرحال صبح کا انتظار کرنا ہی پڑے گا۔“

”ایک بار تم نے بتایا تھا کہ غزالہ کا بھائی دماغی امراض کے ایک اسپتال میں زیرِ علاج ہے۔ ہوسکتا ہے کہ غزالہ اس سے ملنے اسپتال جاتی رہی ہو اور اس نے بھائی کے وارث کے طور پر اپنا نام پتا بھی لکھوایا ہو۔ وہاں سے اس کے بارے میں صحیح اطلاع مل سکے گی۔“

”بہت پرانی بات ہوگئی۔ انھوں نے اب تک اسے کہاں رکھا ہوگا۔ وہ بہت مہنگا نجی اسپتال ہے اور غزالہ تو ابھی تھوڑے ہی عرصے پہلے واپس آئی ہے۔ شاید وہ خود بھی اپنے بھائی سے نہ مل سکی ہو لیکن میں وہاں بھی معلوم کروں گا۔ غزالہ کا تو ہر قیمت پر سراغ لگانا ہوگا۔“

”مقدر جس طرح اب تک تمھارا ساتھ دیتا آیا ہے، مجھے امید ہے کہ تم جلد ہی بھابی کا سراغ لگا لوگے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ پاکستان میں میری کون سی بیوی اپنے میکے میں قریب المرگ ہے!“

”وقت پر جو سوجھ گیا وہی کہہ ڈالا۔ یہ نہ بھولو کہ تمھارا پاسپورٹ بھارتی تھا اس لیے پاکستان کی سرزمین سے سسرال کے علاوہ تمھارا کوئی اور قریبی رشتہ ایجاد نہیں کیا جاسکتا تھا۔“

پاسپورٹ کا ذکر آتے ہی اس نے وہ دستاویز میری جیکٹ کی جیب سے نکال لی اور ماچس لے کر باتھ روم میں جاگھسا۔ پاسپورٹ کی راکھ بہا کر وہ واپس آیا تو ہمارے درمیان پھر باتیں چھڑ گئیں۔ امیگریشن کاؤنٹر پر تو بہرحال رشوت دینی پڑی تھی لیکن کسٹم کا مرحلہ اس کے لیے ناقابلِ یقین ثابت ہوا تھا جب میں نے اسے بتایا کہ اس نرم خو افسر کو میں نے پہلے ہی تاڑ لیا تھا اور دو بوتلوں کے بعد اسے تھوڑی سی رقم کے بارے میں بھی بتانے والا تھا جس کا موقع ہی نہیں دیا گیا تو وہ میرے مشاہدے کی تعریف کرنے لگا۔

”تم جس کے بارے میں جو کہہ دیتے ہو وہ اٹل ہوجاتا ہے۔“

”بارہا میں نے منہ کی بھی کھائی ہے۔ سارا کاویل پر مجھے شبہ تھا لیکن وہ بہت سیدھی اور سچی لڑکی ثابت ہوئی۔۔۔!“

”سچی ضرور ثابت ہوئی لیکن تم سے سمجھوتا ہونے تک اس کے عزائم وہی تھے جو ہم سوچ رہے تھے۔ پھر کیتھی کا معاملہ لے لو۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کسی کی مخبر ہوگی لیکن تمھیں نہ جانے کیسے چھوٹی چھوٹی باتوں سے سنگین خطرات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ تمھاری یہ صلاحیت واقعی خداداد ہے۔ ورنہ اب تک نہ جانے کتنی بار مارے گئے ہوتے۔“

”کیتھی کے بارے میں تو میں واقعی بہت معمولی سی بات پر بھڑکا تھا کہ اس نے انگریز ہوتے ہوئے بھی میرے لب و لہجے پر کوئی اعتراض نہیں کیا جب کہ میں نے اس کے سامنے برطانوی قومیت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے چوکنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ انگریز اپنی زبان اور روایات کے بارے میں متعصب ہونے کی حد تک قدامت پرست ہوتے ہیں۔“

”تمھاری جگہ میں ہوتا تو یہی سوچتا کہ کیتھی نے مجھے برطانیہ میں آباد تارکِ وطن سمجھ کر معاف کردیا ہوگا۔ وہاں بہتیرے ایسے لوگ آباد ہیں جو اردو یا پنجابی لب و لہجے میں انگریزی بولتے ہیں۔“

”میں نے اپنا نام عبداللہ یا جانکی داس نہیں بلکہ پیڈرو بتایا تھا۔ اتنے واضح اشاروں کے باوجود اگر اسے نظرانداز کردیا جاتا تو یہ ہماری زبردست کوتاہی ہوتی۔“

”چلو وہ تو سب ہوگیا دیکھنا یہ ہے کہ اب تم گمبی سے کیسے نمٹتے ہو؟“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”فرانکو نے نمٹ جانے سے پہلے کسی سے کافی دیر تک فون پر بات کی تھی۔ میرا تو خیال ہے کہ ایک آدھ روز میں اشتہار دے ہی ڈالو تاکہ یہ الجھن بھی دور ہو جائے۔“

”ابھی میں نے فرانکو سے سوچنے کے لیے وقت لیا ہوا ہے۔ اشتہار دینے کے بعد وہ میرا جواب چاہیں گے۔ اس بارے میں ہمیں بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا ورنہ شی اور مافیا کے درمیان پس کر رہ جائیں گے۔“

”سوچنا سمجھنا تمھارا کام ہے۔ مجھے تو جو بتاؤ گے وہ کرتا رہوں گا۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے کی روشنیاں گل کردیں اور بستر پر دراز ہوگیا۔

کمرے میں اندھیرا ہو جانے کے باوجود کچھ دیر تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے پھر پہلے سلطان شاہ پر نیند کا غلبہ ہوا اس کے بعد نہ جانے کس وقت میری بھی آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا۔ میری رسٹ واچ دس بجا رہی تھی مگر سلطان شاہ گہری نیند سو رہا تھا۔

میں نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور پھر فون پر جہانگیر کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ دیر ہوجانے کے باعث کہیں وہ گھر سے کسی کام پر نہ نکل گیا ہو۔

سلسلہ ملنے پر دوسری طرف سے جہانگیر کی بیوی نے ریسیور اٹھایا تھا اور فوراً ہی میری آواز پہچان گئی۔ ”بہت دنوں بعد خیال آیا ہے ہمارا۔ کہاں سیر تفریح کرتے پھر رہے ہو اتنے دن سے؟“ وہ سمجھی تھی کہ میں نے باہر سے پاکستان فون کیا تھا۔

”خیال تو لگا ہی رہتا ہے تم لوگوں کا۔ پچھلے دنوں بھی مارسیلز سے جہانگیر کو فون کیا تھا۔“

”واپس کب تک آنے کا ارادہ ہے؟“ اس نے چہک کر سوال کیا تھا۔

”میں کل رات واپس آچکا ہوں اور کراچی کے ایک ہوٹل میں مقیم ہوں۔“

”اوہ واقعی!“ اس کی آواز میں تحیر آمیز بے یقینی تھی۔ ”تو ہوٹل میں کیا کر رہے ہو؟ ادھر ہی چلے آؤ نا!“

”آؤں گا۔ جہانگیر کہاں ہے؟“ میں نے نرمی سے سوال کیا۔

”وہ کل فیصل آباد گئے ہیں۔ کپڑا خرید کر دو چار دن میں واپس آئیں گے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے، یہ تمھارا اپنا گھر ہے۔ بے تکلفی کے ساتھ یہاں آکر رہ سکتے ہو، مجھے بھی تنہائی سے نجات مل جائے گی۔“ وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔

”کپڑے کی کیا ضرورت پیش آگئی اسے؟“

”شاید تمھیں نہیں معلوم کہ انھوں نے ایک گارمنٹ فیکٹری خرید لی ہے۔ اسی کے چکر میں فیصل آباد جاتے رہتے ہیں۔“

”کیا فیکٹری فیصل آباد ہی میں خریدی ہے؟“ میں نے قدرے حیرت سے پوچھا کیوں کہ جہانگیر اپنی بیوی سے ڈرنے کے باوجود حیلے بہانوں سے رسی تڑا کر بھاگنے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔

”ارے نہیں بھئی۔ فیکٹری تو کورنگی میں ہے۔“ اس کی ادائیں دکھانے کی عادت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ”فیصل آباد سے کپڑا آتا ہے۔ کافی بڑے پیمانے پر کام چل پڑا ہے ان کا۔ یہیں آجاؤ تو تفصیل سے باتیں ہوں گی۔ کہیں سے ان کا فون آگیا تو تم سے بات کرکے حیران رہ جائیں گے۔ تمھیں ہر وقت بہت مس کرتے ہیں۔ اکثر کہتے ہیں کہ مردود نہ جانے کہاں جا مرا ہے۔“ ہمیشہ کی طرح وہ میرے ساتھ بے تکلفی برتنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کر رہی تھی اور اسی وجہ سے میں اس سے دور بھاگتا تھا۔

”میں آج ہی کسی وقت چکر لگاؤں گا۔۔۔!“

”چکر وکر نہیں، بس تم ہوٹل کو خیرباد کہہ کر یہیں آجاؤ۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”میں تمھارے لیے کمرا صاف کرا رہی ہوں۔“

”فی الحال میں منتقل نہیں ہوسکتا سلمیٰ! میرے ساتھ ایک دوست بھی ٹھہرا ہوا ہے۔ اس سے فارغ ہوکر تمھارے ہی پاس ٹھہروں گا۔ شہر میں تمھارے سوا اب رہ ہی کون گیا ہے؟“

”تم بہانے بازی کر رہے ہو۔ پتا نہیں مجھ سے دور کیوں بھاگتے ہو؟“ اس کی آواز چڑچڑی ہوگئی۔

”چاہو تو ہوٹل آکر خود دیکھ سکتی ہو کہ میں تنہا نہیں ہوں۔“ میں نے ایک گہرا سانس لے کر شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

”میں سب سمجھتی ہوں، تمھارے ساتھ وہی غزالہ ہوگی۔ مجھ سے کیوں دوست کا بہانا کر رہے ہو؟“ وہ بلاوجہ مجھ سے الجھنا چاہ رہی

تھی اور خوشی کی بات یہ تھی کہ اس نے خود ہی غزالہ کا ذکر نکال لیا تھا۔

”غزالہ سے میں ملنا چاہتا ہوں تمھیں ہمارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ وہ کہاں مل سکے گی؟“

”مجھے کیا پتا۔ تمھارا پچھلا فون آنے سے پہلے وہ آخری بار ہمارے گھر آئی تھی اور بہت بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ تمھارے بارے میں پوچھ گچھ کر کے چلی گئی تھی۔ جہانگیر نے اس کا پتا معلوم کیا تھا لیکن اس نے بتانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔“

”یہ اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ وہ کراچی میں ہے یا کسی اور شہر میں رہ رہی ہے؟“ میں نے اضطراری طور پر پوچھا۔

”شاید مجھے کچھ معلوم ہے مگر یہ میرا وہم بھی ہو سکتا ہے۔ تم گھر آؤ گے تو جب ہی اس بارے میں بات ہو سکے گی۔ جہانگیر اپنے پیچھے تمھارے آنے کا ذرا بھی برا نہیں مانیں گے۔ تم تھوڑی دیر کے لیے تو وقت نکال ہی سکتے ہو۔“

”کوئی اشارہ و کنایہ تو دو کہ تمھیں کیا معلوم ہے!“ میں نے زچ ہو کر کہا۔

”بس آ جاؤ!“ اس کی طوطے کی طرح ایک ہی رٹ تھی۔

”اچھا! میں تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہوں۔“ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

میں سلمیٰ کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ بڑے گھرانے کی لڑکی تھی۔ جن دنوں جہانگیر نے اس سے شادی کی وہ سر تا پا تنظیم کی سرگرمیوں میں غرق تھا کیونکہ میں نے خود کو پیچھے ہٹا کر عملاً اسے کراچی کے معاملات کا نگراں مقرر کیا ہوا تھا مگر جہانگیر اس بات سے لاعلم تھا کہ درحقیقت وہ مجھ ہی کو جواب دہ تھا۔ ان دنوں اس کی وقت بے وقت کی پراسرار مصروفیات نے سلمیٰ کو شروع ہی سے الجھا دیا۔ جہانگیر اسے اپنی اصل سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا تھا اس لیے بے سروپا بہلنے بناتا تھا۔ یوں ان دونوں میں ابتدا ہی سے اعتماد کی وہ بنیاد استوار نہ ہو سکی جو کامیاب ازدواجی زندگی کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ سلمیٰ کو ہمیشہ یہ گمان رہا کہ جہانگیر اسے دانستہ نظر انداز کرتا ہے۔ اس وجہ سے اس نے میری ذات میں دلچسپی لینی شروع کر دی لیکن میں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ان معاملات کو کبھی ایک حد سے متجاوز نہیں ہونے دیا تھا۔ سلمیٰ کی اس ذہنی کیفیت کے پیشِ نظر یہ امکان تھا کہ اس نے صرف مجھے بلانے کی خاطر ’کچھ معلوم ہونے‘ کا شوشہ چھوڑا ہو لیکن غزالہ کی ذات میرے لیے اس قدر اہم تھی کہ اس کا سراغ حاصل کرنے کے سلسلے میں میں کسی موہوم ترین امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے فوراً ہی سلطان شاہ کو جگا دیا۔

کمرے میں ایک ساتھ ناشتا کرتے ہوئے میں نے اسے صرف اتنا بتایا کہ میں غزالہ کے سلسلے میں کسی سے ملنے جا رہا تھا اس لیے اسے کمرے میں ہی رہ کر میری واپسی کا انتظار کرنا تھا کیونکہ [illegible] نہ کمرے میں چھوڑنے کا خطرہ مول لیا جا سکتا تھا نہ اسے ساتھ جایا جا سکتا تھا اور نہ ہی ہوٹل کی انتظامیہ کے حوالے کیا جا سکتا [illegible] نے اسے یہ اطمینان دلایا تھا کہ واپسی میں تاخیر کی صورت میں فون پر اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیتا۔

میں ویسے تو سلمیٰ سے ملنے جا رہا تھا لیکن مجھے پتا [illegible] کہ اس کے انکشاف کی روشنی میں میرے ساتھ کیا صورتِ حال [illegible] تھی۔ اس لیے میں نے سوٹ کیس میں سے ایک بھرا ہوا پستول لے لیا تھا۔

ٹیکسی کے ذریعے میں جہانگیر کے گھر پہنچا تو دربان نے کے انجن کی آواز سنتے ہی پھاٹک کھول دیا مگر میں نے کرایہ [illegible] کر کے ٹیکسی کو باہر سے رخصت کر دیا۔ اندر برآمدے میں سلمیٰ [illegible] میک اپ کے ساتھ میری منتظر تھی۔ اس نے حیرت آمیز گرمجوشی کے ساتھ میرا استقبال کیا تھا پھر جب میں اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میز پر مے نوشی کے لوازمات پہلے سے تیار تھے۔

”یہ شوق کب سے لگا لیا تم نے؟“ میں نے حیرت سے سوال کیا۔

”میرا نہیں، یہ تمھارا شوق ہے۔“ وہ میری آنکھوں میں [illegible] ہوئے بولی۔ ”جہانگیر کی غیر موجودگی میں میں تمھاری میزبانی میں کوئی کمی نہیں کرنا چاہتی۔ جہانگیر نے کئی بار کوشش کی کہ میں [illegible] ساتھ دے سکوں لیکن اس کا تلخ ذائقہ زبان پر [illegible] تے ہی مجھے [illegible] ہو جاتی ہے۔ پتا نہیں تم لوگ یہ کڑوا زہر کیسے پیتے ہو؟“

”بس پی ہی لیتے ہیں!“ میں نے زبردستی مسکراتے [illegible] کہا۔ اس وقت میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت تھی۔ [illegible] رہا تھا کہ سلمیٰ میرے پوچھنے سے پہلے خود ہی وہ سب اُگل جائے جو اسے غزالہ کے بارے میں معلوم تھا۔

”تو پھر بناؤ نا۔“ اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”ساقی [illegible] میرے بس کی بات نہیں ہے۔“

”اس کا وقت سورج ڈھلنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ تم نے اہتمام کر لیا ہے تو پھر یوں ہی سہی!“ میں نے اپنے ایک مختصر سا پیمانہ بناتے ہوئے کہا۔ اس میں شراب کم پانی زیادہ تھا۔

”سورج کا کیا ہے، ابھی پردے پھیلا دوں تو غروب ہو جائے گا۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ”باہر سے تم خاصے [illegible] کر آئے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں دل کھول کر تفریح کی ہے تم [illegible]“

”کاش ایسا ہوتا۔“ میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ”وہاں [illegible] غزالہ کو تلاش کرتا رہا یہاں بھی اُسی کی تلاش ہے۔ تم کیا بتانا چاہ رہی تھیں اُس کے بارے میں؟“

”مجھے معلوم ہے کہ تم اُسے ٹوٹ کر چاہتے ہو۔“ اُس نے کہنا شروع کیا اور میں نے اضطراری طور پر پورا گلاس معدے میں اُنڈیل لیا۔

”شاید اِسی وجہ سے مجھے اس سے کچھ حسد بھی ہو گیا ہے۔“ وہ ڈھٹائی کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ ”لیکن پھر بھی میں نے جو کچھ دیکھا مجھے یقین ہے کہ میرا وہم نہیں بلکہ حقیقت تھی۔“

”کیا دیکھا تھا تم نے؟“ میں نے خالی گلاس پر اپنی گرفت سخت ہوتی ہوئی محسوس کی۔

”میرا خیال ہے کہ تم سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہو۔“

”کھل کر کہو، کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور پیٹ میں گرہیں سی پڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی ڈینی!“ وہ سنجیدگی کے ساتھ بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ تم غزالہ کا خیال ترک کر دو۔“

”کیوں؟“ میں اپنی غضب ناک غراہٹ پر قابو نہ رکھ سکا۔ ”یہ خیال کیوں آیا تمھارے دماغ میں؟“

”کچھ دن پہلے میں نے اُسے صدر میں ایک خوب صورت نوجوان کے ساتھ دیکھا ہے۔“ وہ قدرے سہمے ہوئے انداز میں بولی۔

”بس سلمیٰ! اب کچھ اور نہ کہنا!“ میں نے غصے کے عالم میں گلاس قالین پر دے مارا اور اس کی کرچیاں بکھر گئیں۔ میرے خون نے اچانک ہی آنکھوں اور کنپٹیوں پر یلغار کر دی تھی اور بدن غصے سے کانپنے لگا تھا۔ سلمیٰ عورت اور جہانگیر کی بیوی نہ ہوتی تو شاید میں نے اُس کی زبان حلق سے اکھاڑ پھینکی ہوتی مگر وہ عورت تھی اور میرے عزیز ترین دوست کی بیوی بھی۔

”وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے۔“ میری بدلتی ہوئی کیفیت سے خوف زدہ ہو جانے کے باوجود وہ چپ نہ رہ سکی۔ ”بھائی بہن کبھی ایسے انداز میں بازار میں نہیں گھوما کرتے۔“

اُس نے میرا ذہن پڑھ لیا تھا اور وہی ابہام دور کر دیا تھا جس کی میں پناہ لینی چاہ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی وحشی سانڈ نے پوری قوت سے میرے سینے پر ٹکر رسید کر دی ہو اور میں لڑکھڑا کر وہیں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

جو کام بڑے بڑے شہ زور اور سورما نہیں کر سکے تھے وہ ایک مختصر سی خبر نے کر دکھایا تھا۔

سلمیٰ کو اپنے الفاظ کے اتنے شدید ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ میرے صوفے پر گرتے ہی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنی جگہ چھوڑ کر مجھ پر جھک گئی۔

”کیا ہوا؟ کیا محسوس کر رہے ہو؟ ڈاکٹر کو بلاؤں؟“ اس نے اضطراری طور پر میرے بائیں پہلو پر ہاتھ رکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں محسوس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے اور پھر شرمسار لہجے میں بولی۔ ”مجھے معاف کر دینا ڈینی! اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ میرے انکشاف کا تم پر اتنا شدید ردِعمل ہو گا تو میں ہرگز زبان نہ کھولتی۔ جلد یا بدیر تم کو خود ہی حقیقت کا علم ہو جاتا۔ میں نے اپنے غلط انداز سے تم کو گہرا ذہنی صدمہ پہنچایا ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے ترش لہجے میں کہنا چاہا اور اپنے لہجے میں نقاہت محسوس کی۔ ”بعض اوقات انسان جو کچھ دیکھتا ہے وہ حقیقت سے بہت زیادہ مختلف ہوتا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ غزالہ کے بارے میں تمھیں غلط فہمی ہوئی ہو گی۔ تم نے اس کے بارے میں غیر ذمے داری سے اپنی رائے کا اظہار کر کے مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔“

”میں شرمندہ ہوں ڈینی! مجھے معاف کر دو۔“ اس نے میری پیشانی سہلاتے ہوئے کہا۔ اس کی ہتھیلی کا لمس مجھے آگ کی طرح تپتا ہوا محسوس ہوا جیسے اس کے وجود میں یک بیک حرارت سما گئی ہو۔

”تمھاری پیشانی برف کی طرح سرد ہو رہی ہے۔“ اس نے تشویش زدہ لہجے میں مجھے میری حالت سے آگاہ کیا۔ ”مجھے ڈاکٹر کو بلا ہی لینا چاہیے شاید تم پر دل کا ہلکا سا دورہ پڑا ہے۔“

لمحہ بھر کے لیے میں نے غور کیا۔ نہ میرے دل میں درد تھا نہ سینہ دکھ رہا تھا بس شاید یک بیک دورانِ خون ناقابلِ برداشت حد تک تیز ہو گیا تھا اس لیے میں نے تھکی ہوئی آواز میں اسے روک لیا۔ ”کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں یہ عارضی کیفیت ہے تھوڑی دیر میں خود بخود نارمل ہو جائے گی۔ تم آرام سے بیٹھو اور مجھے ایک گلاس ٹھنڈا پانی دے دو۔“

اس نے والہانہ انہماک کے ساتھ فوراً ہی مجھے ٹھنڈا پانی دیا اور جب میں نے گلاس خالی کر کے اسے لوٹا دیا تو وہ اسے میز پر رکھ کر میرے قریب ہی سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

”میں نے غزالہ کو اس شخص کے ساتھ دیکھ کر جو کچھ اندازہ لگایا تھا وہی تمھارے سامنے دُہرا دیا۔ اس میں میری کسی بدنیتی کا دخل نہیں تھا۔ میں خود بھی ایک عورت ہوں اور اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ محرموں اور نامحرموں کے لیے اظہارِ پسندیدگی میں کیا فرق ہوتا ہے۔

پہلی نظر میں مجھے بھی شبہ ہوا تھا کہ کہیں وہ شخص اس کا پاگل خانے والا بھائی نہ ہو لیکن گہرا جائزہ لینے پر مجھے اپنا شبہ غلط مان لینا پڑا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ غزالہ کا کوئی رشتے دار رہا ہو۔ اس لڑکی کو تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ میرے دل میں اس کی طرف سے جلن موجود تھی اس لیے شاید میں نے بالکل ہی غلط سمت میں سوچا ہو۔ بھائی اور محبوب کے درمیان اور بھی بہتیرے رشتے ہوسکتے ہیں۔ اب تم اس بات کو اپنے ذہن سے جھٹک دو۔" اسے سوچنے کا موقع مل گیا تھا اس لیے اس نے میری دلجوئی کے لیے ایک خوبصورت راہ تلاش کرلی تھی لیکن اس کے کمزور لہجے سے میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ وہ اس وقت زبان سے جو کچھ کہہ رہی تھی، دل سے اس پر ذرا بھی یقین نہیں رکھتی تھی۔

اپنی اس لمحاتی کیفیت سے میں نے تھوڑا سا سنبھالا لے لیا تھا لیکن میرے دل و دماغ میں بدستور ایک ہلچل سی برپا تھی۔ میں غزالہ کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ ہم نے پاکیزہ تنہائیوں میں زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کے بہتیرے عہد و پیمان کیے تھے۔ میں اسے اور اس کی فطرت کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے مزاج میں بے وفائی نام کو بھی نہ پائی جاتی تھی۔ وہ اِس دَور کی ان لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی جو بہتر انداز میں اپنا وقت گزارنے کے لیے کسی بھی مرد سے دوستی کرلیتی ہیں اور جب انتخاب کے لیے اس سے بہتر کوئی موقع سامنے آجائے تو اپنے پچھلے وعدوں کو یکسر بھلا کر طوطا چشمی کے ساتھ نئی راہ پر چل پڑتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ میں سلمٰی کی باتوں کو بالکل ہی نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے میرے اور غزالہ کے تعلق کو جانتے بوجھتے ہوئے زبان کھولی تھی۔ شاید اس نے اپنی رائے کے اظہار میں مبالغے سے کام لیا ہو لیکن اس کی باتوں کو سرے سے نظر انداز کرنا مجھے دشوار نظر آرہا تھا۔ میرے لیے وہ صورتِ حال ایک پیچیدہ پہیلی سے کسی طرح کم نہیں تھی اور اس پہیلی کا حل صرف غزالہ کے پاس تھا جس کا میرے پاس کوئی سراغ باقی نہیں تھا۔ اسے تلاش کیے بغیر مجھے نہ سلمٰی کے الزام کی صداقت کا اندازہ ہوسکتا تھا اور نہ ہی میرے دل کو صبر و قرار آسکتا تھا۔ میرے دل میں غزالہ سے ملنے کی طلب شاید کبھی اتنی شدید نہیں رہی تھی جتنی اس وقت تھی۔

سلمٰی مُصر تھی کہ میں اپنی حالت نارمل ہونے تک اس کی خواب گاہ میں آرام کروں لیکن میں اسے ٹالتا رہا۔ وہ بلاشبہ میرے عزیز ترین دوست جہانگیر کی بیوی تھی لیکن اس کے بارے میں میری رائے کچھ اچھی نہیں تھی۔ میرے حق میں وہ اس وقت ایک عیار شکاری کا رول ادا کر رہی تھی اور نفسیاتی محرومی اور مایوسی کے لمحات میں میرا ہانکا کرکے مجھے اس طرف لے جانا چاہتی تھی جہاں مجھے مغلوب کرنے کے لیے اسے زیادہ آزادی اور وسائل میسر تھے۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی ہمدردی اور دردمندی نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ بھی ایک عورت ہی تھی۔ جب وہ کسی کی بیوی ہوتے ہوئے ایک دوسرے شخص کی ذات میں اتنی دلچسپی لے سکتی تھی تو کسی قانونی اور مذہبی بندھن سے آزاد ایک عورت کو کون سی قوت محض وعدوں کا پابند رکھ سکتی تھی؟ میرے لیے وہ تصور ہی سوہانِ روح تھا۔ میں نے اپنی دلی کیفیت سلمٰی سے پوشیدہ رکھنے کے لیے آنکھیں موند لیں۔

"تم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تم سوچ سوچ کر اپنی حالت اور خراب کرلو گے۔" خاصے توقف کے بعد اس نے مجھے ٹوکا۔

"میں تمھیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ پاگل خانے میں زیرِ علاج ایک بھائی کے علاوہ پوری دنیا میں اس کا کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ اس کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا اور باپ نے اس سانحے پر دل برداشتہ ہوکر خودکشی کرلی تھی۔" میں نے آنکھیں کھول کر کہا پھر پُرامید لہجے میں سوال کیا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ تم سے غزالہ کو پہچاننے میں غلطی ہوئی ہو؟ تم نے صدر میں کسی اور لڑکی کو دیکھا ہو؟"

"وہ چند روز پیشتر تمھارے بارے میں دریافت کرنے ہمارے گھر نہ آئی ہوتی تو میں واقعی اسے نہیں پہچان سکتی تھی لیکن وہ کافی دیر یہاں موجود رہی تھی۔ میں نے اچھی طرح اسے دیکھا تھا۔ اب اس کی لمبی لمبی ریشمی زلفیں باقی نہیں رہی ہیں۔ اس نے انگریزی وضع کے بال ترشوائے ہوئے ہیں۔ وزن بھی تھوڑا سا بڑھ گیا ہے۔ سفید رنگت پر سُرخی یوں چھائی ہوئی تھی کہ اس پر کوئی سفید فام ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ تم خود ہی بتاؤ کہ اتنے قریبی اور گہرے مشاہدے کے بعد میں دھوکا کھا سکتی تھی؟"

اگر اسے دھوکا نہیں ہوا تھا تو میں فریب خوردہ تھا۔ سلمٰی نے غزالہ کے سراپا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر چھیڑ کر گویا میرے دکھتے ہوئے زخم پر نمک پاشی کی تھی۔ غزالہ کے بارے میں میری آتشِ شوق کچھ اور بھڑک اُٹھی۔ اس آگ میں اب صرف چاہت اور محبت ہی نہیں رہی تھی بلکہ حسد، غصّے اور رقابت کی سوزش بھی شامل ہوگئی تھی۔

وہ سلمٰی کا گھر تھا اور میں وہاں مہمان تھا لیکن اس نے از خود مجھے اتنی ڈھیل دی ہوئی تھی کہ میں اس سے کچھ بھی کہہ سکتا تھا اس لیے میں ...... نے اپنے لیے ایک نیا گلاس بناتے ہوئے آہستگی کے ساتھ کہا۔ "ہوسکے تو کچھ دیر کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

اس کی آنکھوں میں غصّہ جھلک آیا اور وہ تنک کر کھڑی ہوگئی۔ "مجھے معلوم ہے کہ میرے وجود سے زیادہ تمھیں غزالہ کی یادیں عزیز ہیں۔ نہ جانے یہ مردوں کی کیا فطرت ہے کہ یہ ان ہی کے پیچھے بھاگتے ہیں جو ان سے دور بھاگتے ہیں۔ میں اپنے کمرے میں جارہی ہوں، ضرورت محسوس کرو تو ادھر ہی چلے آنا، شرم محسوس کرو تو آواز دے لینا۔"

اپنی بات پوری کرکے میرا جواب سنے بغیر وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔ وقتی طور پر وہ مجھ سے ناراض ہوگئی تھی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس کا غصّہ زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔

میں بیٹھا آہستہ آہستہ اپنے معدے میں آتشیں سیال انڈیلتا رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے وجود پر طاری ہونے والی دردناک اضطرابی لہر بھی اعتدال میں تحلیل ہوتی چلی گئی جس کے نتیجے میں میری سوچ کا رُخ قدرے تبدیل ہوگیا مگر اس کے باوجود میں آرام کی شدید ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ غزالہ کی تلاش میں اگر میں فوری طور پر بھاگ دوڑ کا آغاز کرتا تو اس کے نتیجے میں بالکل ہی بستر سے لگ سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ سلطان شاہ کو فون کرکے وہیں بلالوں لیکن وہ ہوٹل کے کمرے میں رقم سے بھرے ہوئے بیگ کی حفاظت پر مامور تھا۔

غیر قانونی طور پر حاصل کی ہوئی وہ رقم ہمارے لیے بہت اہم تھی لیکن اسے ساتھ لیے پھرنے میں کوئی بھی ناگوار صورتِ حال پیش آسکتی تھی۔ مجھے اس بارے میں جہانگیر پر مکمل اعتماد تھا لیکن اس کے نہ ہونے کی صورت میں مَیں سلمٰی پر بھی بھروسا کرسکتا تھا۔

میں نے صوفے سے اُٹھتے ہوئے کافی نقاہت محسوس کی۔ آنکھوں کے سامنے پل بھر کے لیے تاریک دائرے ناچ کر رہ گئے لیکن پھر بھی میں نے سنبھل کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ سلمٰی کو وہاں بلانے کے بجائے اس کے کمرے میں جاکر میں آسانی کے ساتھ اسے مناسکتا تھا۔

جہانگیر کا گھر شروع سے بہت خوبصورت، آراستہ اور وسیع تھا لیکن میرے لیے اس مکان کا کوئی گوشہ اجنبی نہیں تھا اس لیے میں کسی دقت کے بغیر سلمٰی کی خواب گاہ کے بند دروازے پر پہنچ گیا۔

میری ہلکی سی دستک پر اندر سے سلمٰی نے بلند آواز میں 'کون ہے؟' کہا تھا پھر میرا نام سن کر بولی تھی۔ "دروازہ بولٹ نہیں ہے، اندر چلے آؤ۔" میں نے بند دروازے پر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ہلکا سا دباؤ ڈالا اور پھر اس آراستہ خواب گاہ میں داخل ہوگیا جہاں معطر اور مسحور کن فضا میں سلمٰی وسیع و عریض آبنوسی بستر پر تنہا لیٹی ہوئی تھی۔

خواب گاہ میں کھڑکیوں پر دبیز پردے کھنچے ہوئے تھے۔ دھیمی روشنی والے ایک بلب نے کمرے میں بس اتنی روشنی کی ہوئی تھی کہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھائے بغیر ایک دوسرے کو شناخت کیا جاسکتا تھا۔ اس سحر انگیز ماحول میں ایک کیبنٹ پر رکھی ہوئی سلمٰی اور جہانگیر کی شادی کی ایک بڑی تصویر پر نگاہ ڈالتے ہوئے میں بستر سے دور، دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے آرام دہ دیوان پر بیٹھ گیا۔ آبنوسی مسہری کے سرہانے پوری دیوار پر چھت تک بیش قیمت آئینے آویزاں تھے جن میں ہم دونوں کے عکس ہر زاویے سے مجسم ہو رہے تھے۔

"مجھے افسوس ہے سلمٰی کہ میری باتوں کا تم برا مان گئیں۔" میں نے بات چھیڑتے ہوئے کہا۔

"میرے برا ماننے کا افسوس ہے، اپنی غلطی اب بھی نہیں مانو گے؟" وہ لیٹے لیٹے ہی میری طرف پہلو بدل کر بولی۔

"غلطی تمھاری ہے۔ تم کو غزالہ کے ساتھ اپنا موازنہ نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "اسے درمیان میں لائے بغیر ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔"

"غنیمت ہے کہ تم نے مجھے دوست تو سمجھا! یہ بتاؤ کہ تمھاری طبیعت اب کیسی ہے؟" وہ اچانک ہی تر و تازہ انداز میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"طبیعت ٹھیک ہے لیکن نقاہت محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے ایمانداری کے ساتھ کہا۔ "شاید ایک دو روز تک مجھے بستر پر ہی دراز رہنا پڑے۔" اصل مدعا کی طرف آتے ہوئے اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ میں کوئی بے سر و سامان خانہ بدوش نہیں تھا بلکہ اسی شہر میں میری فیکٹری کے ساتھ میرا مکان بھی تھا۔ آخری ایام میں شہر کے سرکردہ مقامی لوگوں نے تنظیم کے خلاف میرے عزائم سے واقف ہونے کے بعد نہ صرف مجھے ہر طرف سے گھیرنے کی کوششیں شروع کردی تھیں بلکہ میرے ان اثاثوں کو بھی آگ لگا دی تھی۔ میں نے دانش مندی یہ کی تھی کہ فیکٹری اور اسٹاک کے ساتھ ہی گھر کا بھی بیمہ کرایا ہوا تھا لیکن ان دنوں حالات اس قدر مخدوش ہوچکے تھے کہ اپنی جان کے خوف کے باعث میں اپنے دعوے کے لیے سامنے آنے کی جرأت نہ کرسکا اور سارے معاملات میں اپنے ایک قابلِ اعتماد ملازم کو مختار نامہ دے کر خود بدستور روپوش رہا اور اسی دوران میں مجھے ملک سے باہر جانا پڑ گیا۔

پاکستان چھوڑنے کے بعد واقعات اتنی تیزی کے ساتھ میرے گرد اپنا جال بُنتے چلے گئے کہ میں اپنے خوشگوار ماضی کو یکسر فراموش کر بیٹھا۔ نہ پاکستان سے میرا کوئی رابطہ رہا، نہ کسی اور ذریعے سے مجھے کوئی خبر ملی۔ شب و روز کے ہولناک معرکوں میں مَیں نے پوری طرح کسی خانہ بدوش مہم جو کا روپ دھار لیا اور ان واقعات میں اس بری طرح ملوث ہوا کہ مجھے یہ تک یاد نہ رہا کہ پاکستان میں میرے بھی کچھ اثاثے تھے جن کے سہارے میں دوبارہ باعزت زندگی کی ابتدا کرسکتا تھا۔

"میری فیکٹری وغیرہ کے بارے میں کچھ معلوم ہے تمھیں؟" میں

نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد اسی سے سوال کیا۔

"تم نے اپنی طویل غیر حاضری سے بہت بڑے بڑے نقصانات اُٹھائے ہیں۔" وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ "ان دنوں جہانگیر کو کوئی ایسی بڑی مجبوری درپیش تھی کہ تم سے ہمدردی اور دوستی کے باوجود وہ یہاں تمھارے مفادات کی دیکھ بھال نہ کر سکا۔ تمھارے لیے اب پاکستان میں شاید ایک تنکا بھی ایسا نہ رہا ہو جس پر تم اپنی ملکیت کا دعویٰ کر سکو۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" میں نے بے یقینی کے ساتھ سوال کیا۔ "میری فیکٹری، میرا مکان؟ ان سب کا کیا ہوا؟ میں ان کا بلا شرکتِ غیرے مالک تھا۔ بینکوں میں میرا کافی سرمایہ جمع تھا۔"

"تفصیل تمھیں جہانگیر ہی بتا سکیں گے۔ انھوں نے مجھے بس اتنا بتایا تھا کہ تم دیدہ و دانستہ کچھ ایسے لوگوں کی خون آشام دشمنی مول لے بیٹھے تھے جن کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور وہ اپنی مرضی کا ہر کام کر گزرنے کے وسائل رکھتے تھے۔ تمھارے ملک سے چلے جانے کے بعد انھوں نے سراغ لگا لیا کہ تم اپنے سارے مالی مفادات اپنے کسی ملازم کو سونپ گئے ہو۔ انھوں نے اسے اغوا کرایا، لالچ دیے، تشدد بھی کیا اور آخر کار کچھ ہی دنوں میں تمھارے اٹارنی نے مکان کے ساتھ فیکٹری بھی فروخت کر دی، بینکوں سے ساری رقمیں نکلوائیں اور پھر وہ لاپتا ہو گیا۔ اس کے بارے میں تمھارے دوسرے ملازمین کا خیال تھا کہ اس کی نیت میں فتور آ گیا اور وہ رقم بٹور کر اپنی بیوی اور اکلوتے بچے سمیت ملک سے بھاگ گیا تاکہ تم واپس لوٹ کر اس سے اپنے اثاثوں کا مطالبہ نہ کر سکو مگر جہانگیر کو پورا یقین ہے کہ تمھارے دشمنوں نے پہلے اسے سنہرا باغ دکھا کر اس کے ہاتھوں تمھیں دیوالیہ کرایا پھر کسی خفیہ سازش کے ذریعے اس سے سب کچھ چھین کر اسے، بیوی اور بچے سمیت سفاکی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تاکہ وہ راز ہمیشہ کے لیے یوں ہی دفن ہو جائے۔"

شی کے ہرکاروں کی وہ کہانی میرے لیے ناقابلِ یقین تھی۔ میں حیرت سے منہ کھولے سلمیٰ کی کہانی سنتا رہا۔ ان لوگوں نے مجھے ہر طرف سے بے دست و پا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جن دنوں میں نے تنظیم سے بغاوت کی، جہانگیر درپردہ میرا ساتھ دینے کے باوجود بہ ظاہر شی کا وفادار تھا اس لیے میری مالی تباہی کے بارے میں اس کی رائے بے بنیاد نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ پورا قصہ یقیناً اسی طرح پیش آیا ہو گا جس طرح جہانگیر نے سلمیٰ کو بتایا تھا۔ میری اس لڑائی میں میرا بدنصیب منیجر اپنے مختصر سے گھرانے سمیت قربانی کا بکرا بن گیا تھا۔ اپنے لاکھوں کے نقصان سے زیادہ مجھے اس بے چارے کے دردناک انجام پر صدمہ ہوا تھا۔

"یہ بہت برا ہوا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ لوگ انتقام کی آگ میں اس حد تک اندھے ہو جائیں گے۔" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "اصل بات جہانگیر سے ہی معلوم ہو سکے گی۔"

"واقعی بہت برا ہوا۔ اب تمھیں زندہ رہنے کے لیے از سرِ نو جدوجہد کرنی پڑے گی۔"

"زندہ رہا تو جدوجہد بھی کر لوں گا۔ مجھے اپنے مالی نقصانات کا اتنا غم نہیں جتنا دکھ ان تینوں کی موت کا ہے۔ مجھے اس پر اندھا اعتماد تھا۔ مجھے یقین ہے کہ لاکھوں تو کیا کروڑوں پر بھی اس کی نیت متزلزل نہیں ہو سکتی تھی۔"

"آخر وہ کون لوگ ہیں جن سے تمھاری دشمنی چل رہی ہے؟" اس کا لہجہ متجسس ہو گیا۔

"کاروباری حریف ہیں۔" میں نے اسے ٹالنا چاہا۔

"کاروبار میں ایسی خونریز دشمنیاں تو میں نے کبھی نہیں سنیں۔ میرا بھی پورا میکا کاروبار کرتا ہے۔ شاید تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ سیدھے سادے کاموں میں دشمنی اس حد تک نہیں بڑھتی۔"

"مقابلہ کم ظرفوں سے ہو تو اس سے بھی برے واقعات پیش آ جاتے ہیں..."

"میں ننھی سی نادان بچی نہیں ہوں۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ "نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ مگر میں بھی عقل رکھتی ہوں۔ تمھاری اور جہانگیر کی گہری دوستی ہے اس لیے تم دونوں کے مسائل میں بھی خاصی مشابہت ملتی ہے۔ اب تو خدا کا شکر ہے کہ جہانگیر گارمنٹ فیکٹری خریدنے کے بعد کافی عرصے سے معمول کی زندگی گزار رہے ہیں ورنہ تمھارے جانے تک ان کی ساری سرگرمیاں مشکوک اور پُراسرار تھیں۔ وہ فون پر چوروں کی طرح سرگوشیوں میں کسی سے مختصر باتیں کرتے تھے۔ کال آ جاتی تو آدھی رات کو بستر چھوڑ کر کہیں چل دیتے۔ بہانہ وہ بھی کاروبار کا کرتے تھے۔ دنیا میں ایسا کون سا کاروبار ہے جو رات رات بھر ملتا رہتا ہے؟ پھر آخر میں تو وہ اپنے سائے سے بھی خوفزدہ رہنے لگے تھے۔ کبھی بلٹ پروف کار خریدی جا رہی ہے، کبھی گھر میں دن رات خونخوار کتے کھلے رکھے جاتے تھے اور کبھی گھر کی چار دیواری کو قلعے کی فصیل بنا کر نشانہ بازوں کو دن رات چوکیداری پر مامور کیا جاتا تھا۔ اگر یہ سب کاروبار ہی کے سلسلے میں تھا تو مجھے کہنا پڑے گا کہ تم دونوں مل کر کوئی ناجائز اور غیر قانونی کاروبار کر رہے تھے۔"

اس کی چمکتی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کے استدلال کا وزن گھٹانے کے لیے میں ہنس پڑا۔ "تم تو واقعی بہت سمجھ دار ہو گئی ہو۔ اب آنکھیں موند کر کوئی منتر پڑھو اور یہ بھی بتاؤ کہ ہم کون سا کاروبار کر رہے تھے؟"

"ایک کیا، پچاس دھندے ہو سکتے ہیں۔" وہ طنزیہ لہجے میں

بولی۔ "اسلحے سے لے کر چرس، شراب اور ہیروئن تک سارے ہی کالے دھندے ہیں۔ پتا نہیں تم دونوں کیا کرتے تھے؟ ایسے غیر قانونی کاموں کو کاروبار کہنا بھی میں شریف کاروباری برادری کی ہتک سمجھتی ہوں۔ یہ تو سراسر چوری اور ڈکیتی کے برابر بلکہ اس سے بھی بُرے کام ہیں۔"

شاید اس کی رائے اپنی جگہ درست رہی ہو مگر وہ ایک خانہ دار عورت تھی اور اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے اپنے بزرگوں کے آبائی پیشے کا دفاع کر رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ اسے ان شریف کاروباری لوگوں کے بارے میں بتاؤں جو شرافت کا لبادہ اوڑھ کر قانون کی آبرو اچھالتے ہیں، محاصل چوری کرتے ہیں، اسمگلنگ کی سرپرستی کرتے ہیں، ملاوٹ اور جعل سازی کو فروغ دیتے ہیں لیکن میں خاموش ہی رہا۔ اوّل تو میرا دامن خود داغ دار تھا دوم یہ کہ کاروباری برادری میں سب ہی لوگ ایسے نہیں تھے۔ ان کی برادری کے نیک ناموں کے طفیل بدناموں کے گناہ بھی معاف کیے جا سکتے تھے۔

"دراصل تم ساری دنیا کو اپنے میکے کی ترازو میں تولنے کی عادی ہو گئی ہو جب کہ سسرال کا پیمانہ الگ ہوتا ہے۔ ہم دونوں سسرالی قسم کے کاروبار کرتے رہے ہیں جو تمھاری سمجھ میں نہیں آ سکیں گے۔" میں نے اس سنگین موضوع کو مذاق میں ٹالتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو حیرت ہے کہ پاکستان آ کر اپنے گھر بار اور فیکٹری کی خبر لینے کے بجائے تم اتنے اطمینان سے ہوٹل میں گوشہ نشین ہو گئے۔ اس وقت بھی یہ ذکر سرسری طور پر نکل آیا ورنہ تمھاری نظروں میں ان چیزوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ تمھاری جگہ کوئی اور ہوتا تو مجبوراً کی بے دفائی کی خبر شاید برداشت کر جاتا لیکن اتنے بڑے مالی دھچکے پر اسے ضرور دل کا دورہ پڑ جاتا۔"

وہ حد سے بڑھ رہی تھی۔ میرے لیے اسے لگام دینا ضروری ہو گیا تھا اور پھر ان نازک لمحات میں مجھے ایک نادر راہ سوجھ ہی گئی۔ "دورہ اُسے پڑے جس کا نقصان ہوا ہو۔ میرا کیا بگڑا ہے؟" میں نے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"تمھیں دل کا دورہ تو نہیں پڑا لیکن اب اس صدمے سے تمھارا دماغ ضرور چل گیا ہے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "تن کے کپڑوں اور تھوڑی بہت رقم کے علاوہ تمھارے پاس اب رہ کیا گیا ہے جس پر اتنا خوش ہو رہے ہو؟"

"میں تم سے مذاق کر رہا تھا۔" میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "جہانگیر بے چارہ محض اس وجہ سے میرے نقصانات کی فکر میں دبلا ہوتا رہا کہ میرا اس سے رابطہ قائم نہیں ہو سکا ورنہ یہاں جو کچھ ہوتا رہا اس میں سو فیصد میری ہدایات کا دخل تھا۔ اگر میں یہاں سے بروقت اپنے اثاثے نہ سمیٹتا تو میرے دشمن واقعی سب کچھ مٹی میں ملا دیتے۔"

"پھر تمھارا منیجر کہاں ہے؟ اس کی بیوی اپنے بچے سمیت کہاں گئی؟ تمھاری رقم کہاں ہے؟" اس نے بے یقینی کے ساتھ یکے بعد دیگرے کئی سوال کر ڈالے۔ میری نئی قلابازی اس کے لیے ناقابلِ فہم ثابت ہوئی تھی۔

"منیجر اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ فرانس میں عیش کر رہا ہے۔" میں نے دکھی دل کے ساتھ خوشگوار لہجے میں وہ سفید جھوٹ بولا۔ "اور رقم میرے پاس ڈالروں کی صورت میں موجود ہے۔"

اس کی آنکھیں حیرت سے پیشانی پر جا چڑھیں۔ "میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا... اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمھارے منیجر نے پوری رقم ایمانداری کے ساتھ تمھیں باہر پہنچا دی اور تم اسے کندھے پر لادے نگر نگر گھومتے رہے؟"

"کندھے پر لادے پھرنے والے مفروضے کے علاوہ باقی بات درست ہے۔ وہ رقم پاکستان سے غیر قانونی طور پر باہر گئی تھی۔ وہاں بہتیرے بینک ایسے ہیں جو صرف رقم دیکھتے ہیں۔ اس کے حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں دریافت کرتے۔ میں نے رقم ایسے ہی ایک بینک میں جمع کرا دی۔ میرا ارادہ تھا کہ اپنے دشمنوں کی دسترس سے دور رہ کر بقیہ زندگی باہر ہی گزاروں گا لیکن جہانگیر سے عذرا کے بارے میں اطلاع ملنے کے بعد میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اپنا وطن اپنا ہی ہوتا ہے۔ یہاں کی تنگی ترشی میں بھی باہر کی عیاشیوں سے زیادہ مزہ ہے۔ اس لیے میں آتے ہوئے اپنا تمام سرمایہ ڈالروں کی شکل میں واپس لے آیا ہوں۔"

"اب وہ رقم کہاں ہے؟" اس کے لہجے میں بے یقینی بدستور برقرار تھی۔

"ہوٹل کے کمرے میں۔" میں نے ڈرامے کی تکمیل پر دل ہی دل میں اطمینان کا گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "وہ رقم میں غیر قانونی طور پر ملک میں لایا ہوں اس لیے اسے براہِ راست کسی بینک میں نہیں ڈال سکتا۔ جہانگیر آئے گا تو اس کے مشورے سے کوئی راہ نکالوں گا۔ اس وقت یہ رقم تم امانت کے طور پر اپنے پاس رکھ لو۔"

"تم مذاق تو نہیں کر رہے؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"تم رضامندی ظاہر کرو تو میں ابھی ہوٹل فون کر کے رقم کا تھیلا یہیں منگوائے لیتا ہوں؟"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ تھیلا اسی طرح تجوری میں ڈال دوں گی۔"

ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ میں سلمیٰ کے ساتھ ہوٹل جا کر اسی کی کار میں گن بوٹ کی فروخت سے حاصل کی ہوئی رقم لے آتا جس کی حفاظت میرے لیے ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی لیکن فون کر کے سلطان شاہ کو بلا لینا زیادہ مناسب تھا۔

سلمیٰ کی زبانی اپنے اثاثوں کی تباہی کی داستان سننے کے بعد میرے لیے اس رقم کی اہمیت یک بیک بڑھ گئی تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ اس رقم کے بارے میں ایک من گھڑت کہانی سنا کر میں نے اسے مطمئن کر دیا تھا، ورنہ وہ اس بارے میں مجھ پر اس قدر سوالات کی بوچھاڑ کرتی کہ میں اپنا سر پیٹتا ہوا اس کے گھر سے چلا جاتا۔

میں نے سلمیٰ کی خواب گاہ سے ہی ہوٹل فون کر کے سلطان شاہ کو تھیلے سمیت جہانگیر کے گھر پہنچنے کی ہدایت کی تو وہ کچھ حیران سا ہو گیا۔

"کیا اسے ٹھکانے لگانے کا کوئی بندوبست ہو گیا ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں، یہ تھیلا ہماری آزادی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ تم فوراً چلے آؤ!" میں نے اسے تاکید کرتے ہوئے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا اور سلمیٰ کی طرف مڑ کر بولا۔ "آؤ! ڈرائنگ روم میں چلیں۔ اس کا وہیں انتظار کرنا مناسب رہے گا... پورے گھر میں ابھی تک مجھے کوئی دوسرا متنفس نظر نہیں آیا۔ کیا کوئی ملازم نہیں ہے یہاں؟"

"پورے چھ ملازموں کی فوج پل رہی ہے یہاں۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر بستر سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ "مگر وہ سب پیچھے رہتے ہیں۔ ایک ملازمہ صبح اندر آتی ہے اور پورے گھر کی صفائی کر کے میرے بیدار ہونے سے پہلے باہر چلی جاتی ہے۔ دوسری رات کو دن بھر کے گندے برتن دھونے آتی ہے۔ ان کے علاوہ دو چوکیدار، ایک مالی اور ایک ڈرائیور بھی یہیں رہتا ہے مگر اُنھیں گھر میں بلاتے ہوئے مجھے الجھن ہوتی ہے۔ ویسے بھی اکیلی رہتے رہتے میں بیزار ہونے لگی ہوں۔ خود کو مصروف رکھنے اور وقت گزارنے کے لیے کھانے پکانے کے سارے کام خود کرتی ہوں... اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ تم بھی ہوٹل سے یہیں آ جاؤ۔ دونوں کا ہی وقت اچھا گزرے گا... میرے پکائے ہوئے کھانے اور چپاتیاں جہانگیر کو بہت مرغوب ہیں۔" اس کا لہجہ چڑانے والا تھا جیسے جہانگیر کی پسندیدگی کا اظہار کر کے مجھے اپنا فیصلہ بدلنے پر اکسا رہی ہو۔

"چند روز بعد شاید ایسا ممکن ہو سکے... سلطان شاہ کے ساتھ مشکل ہے۔"

"تم بلاوجہ اسے دوست کیے جا رہے ہو۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ سلطان شاہ تو شاید ملازم تھا تمھارا؟"

"بعض ملازم اس قدر وفادار اور جاں نثار ہوتے ہیں کہ دوستوں سے بھی زیادہ عزیز ہو جاتے ہیں۔ اس کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کہہ دینا، وہ برا مان جائے گا...!"

"چاہو تو اسے پیچھے رکھ سکتے ہو۔" وہ میری بات سُنی اَن سُنی کر کے بولی۔ "میں اس کے لیے کوئی سرونٹ کوارٹر خالی کرا دوں گی۔"

"میں ہمیشہ اسے اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔" میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "اس کے ساتھ مجھے بھی سرونٹ کوارٹر میں رہنا ہوگا۔"

وہ موضوع وہیں ختم ہو گیا کیونکہ ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہو چکے تھے جہاں صفائی کرنے والی ملازمہ شاید سلمیٰ کی ہدایت پر قالین پر سے گلاس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے سمیٹ رہی تھی۔

ملازمہ خوش شکل اور باسلیقہ تھی۔ سلمیٰ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے سراسیمگی جھانکنے لگی اور برش قالین پر مشینی انداز میں تیز تیز چلنے لگا۔ شاید سلمیٰ اپنے ملازمین کے ساتھ کوئی نرمی برتنے کی عادی نہیں تھی لیکن غنیمت یہ ہوا کہ اس نے ملازمہ کو کئی بار گھورنے کے باوجود میرے سامنے کچھ نہیں کہا اور چند منٹ بعد ہی وہاں پھر تخلیہ ہو گیا۔

سلمیٰ نے انٹرکام پر چوکیدار کو سلطان شاہ کے بارے میں ہدایت دے دی تھی اس لیے ہم دونوں آرام سے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں مَیں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ اپنے دشمنوں کے خطرے کی وجہ سے ان دنوں میں اطالوی نژاد پیٹروا ک بنا ہوا تھا اور شہر کے حالات کا جائزہ لیے بغیر اپنی اصل شناخت ظاہر نہیں کرنی چاہتا تھا۔ اس لیے وہ مجھے کسی تیسرے کے سامنے میرے اصل نام سے نہ پکارے۔ میں نے اُسے تاکید کی تھی کہ جہانگیر کو بھی اس احتیاط سے آگاہ کر دے تاکہ اس کی لاعلمی میرے لیے کوئی خطرہ پیدا نہ کر سکے۔

سلطان شاہ کے آنے کی اطلاع ملنے پر سلمیٰ اندر چلی گئی اور سلطان شاہ بیگ شانے سے لٹکائے ہوئے، چوکیدار کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر حیرت کے آثار پھیل گئے۔

"یہ تمھیں کیا ہوا؟ صبح تو بالکل ترو تازہ تھے۔ اس وقت چہرہ زرد پڑا ہوا ہے اور آنکھوں سے نقاہت جھانک رہی ہے۔" اس نے رقم کا تھیلا میرے قدموں میں ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

"طبیعت بگڑ گئی تھی۔ اب ٹھیک ہوں۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ "ذرا گن لو کہ تھیلے میں اب کتنی رقم باقی رہ گئی ہے؟"

اس نے گڈیاں گننی شروع کر دیں۔ ان ہی میں پستول بھی موجود تھا جو میں نے اُٹھا کر سلطان شاہ کی جیب میں ڈال دیا۔ اپنی ضروریات کے لیے دو ہزار ڈالر نکال کر میں نے گنی ہوئی رقم دوبارہ تھیلے میں ڈالی اور زِپ بند کر دی۔

سلمیٰ کے مزاج کے پیشِ نظر میں نے اسے سلطان شاہ کے سامنے آنے سے منع کیا تھا لیکن جب میں بیگ اندر لے جانے کے لیے اُٹھنے لگا تو وہ ٹرے میں اسکواش کا ایک گلاس لیے واپس آئی اور میں دانت پیستے ہوئے دوبارہ اپنی نشست میں دھنس گیا۔

سلطان شاہ نے اُٹھ کر ادب اور احترام کے ساتھ سلمیٰ کے ہاتھ سے اسکواش کا گلاس لیتے ہوئے اسے سلام کیا اور وہ کوئی جواب دیے بغیر صوفے پر آ بیٹھی۔ "تو تم ہو سلطان شاہ!" چند ثانیوں تک اس کا جائزہ لینے کے بعد سلمیٰ بولی۔ "ڈینی تمھیں اپنی ذات سے زیادہ عزیز رکھتا ہے ورنہ اس شخص کو کسی کی بھی پروا نہیں ہوتی۔"

سلطان شاہ خاصا ذہین نوجوان تھا۔ فوراً ہی بات کی تہ میں چھپے ہوئے طنز کو سمجھ گیا۔ اس کا چہرہ اور کان کی لویں سرخ ہو گئیں۔ پھر وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "اُنھیں کسی کی پروا کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے جی؟ ان کی ذات میں تو اتنی کشش ہے کہ بہتیرے لوگ ہر وقت پروانوں کی طرح ان کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔"

اس نے سلمیٰ کو اسی کے انداز میں جواب دیا تھا۔ بہ ظاہر میری تعریف کی گئی تھی لیکن ان فقروں میں سلمیٰ کے لیے طنز بھی پنہاں تھا جسے وہ بھی نظر انداز نہ کر سکی اور اس کے زبان کھولنے سے پہلے ہی مجھے گفتگو میں دخل اندازی کرنی پڑ گئی۔

"آپس کی شاعری میں مجھے نہ رگیدو!" میں نے ہنستے ہوئے ان دونوں سے کہا۔ "اس بار کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ تم دونوں کا باقاعدہ تعارف ہو گیا۔ یہ بیت بازی بعد میں ہوتی رہے گی۔ اس وقت ہمیں چلنا چاہیے۔"

میں نے تھیلا سلمیٰ کے حوالے کیا تو اس کو تالے کی فکر ہوئی پھر اس نے رقم کے بارے میں استفسار کیا مگر میں نے بے پروائی کے ساتھ اسے بیگ تجوری میں ڈالنے کا مشورہ دیا اور وہ متردد انداز میں اندر چلی گئی۔

وہ دوبارہ واپس آئی تو میں روانگی کی نیّت سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اتنی ہی جلدی ہے تو سلطان کو ڈرائیور کے ساتھ جانے دو، تمھیں میں خود چھوڑ آؤں گی۔" سلمیٰ نے سلطان شاہ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا لیکن میں نے شکریے کے ساتھ اسے ٹال دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس کی وہ پیشکش صرف سلطان شاہ کو چڑانے کے لیے تھی، ورنہ یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ ہم دونوں کو ڈرائیور کے ساتھ واپس جانا تھا۔

سلمیٰ برآمدے تک ہمارے ساتھ آئی پھر ہم اسے الوداع کہہ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

❀❀

سلطان شاہ راستے بھر سلمیٰ کے ڈرائیور کی موجودگی کی وجہ سے خاموش رہا لیکن وہ جن نظروں سے بار بار میرا جائزہ لے رہا تھا اُن سے پتا چل رہا تھا کہ وہ میری کسی تاویل سے مطمئن نہیں ہوا تھا اس لیے میں ذہنی طور پر خود کو اس کی باز پُرس کے لیے تیار کرنے لگا جس کا آغاز کمرے میں داخل ہوتے ہی ہو سکتا تھا۔

"تمھاری چال تک بگڑی ہوئی ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ تمھیں کچھ نہیں ہوا!" اُس نے پورٹیکو سے لفٹ والی راہداری کی طرف جاتے ہوئے جھجکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایسی کیا طبیعت بگڑ گئی تھی کہ ابھی تک اس کے اثرات سے نہیں سنبھل سکے ہو؟"

"کچھ نہیں، تمھیں وہم ہو رہا ہے۔ ایک نیٹ پیگ جلدی جلدی معدے میں اُتار لیا تھا جس کے نتیجے میں سارا کھایا پیا باہر آ گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں طبیعت پوری طرح سنبھل جائے گی۔"

"میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ سچے ہو تو میرے ساتھ سوئمنگ پول کے گرد دوڑ لگا کر ایک پورا چکر لگا کر دکھاؤ۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ تم اس وقت چند قدم بھی نہ دوڑ سکو گے اور تیورا کر گر جاؤ گے۔"

"چلو تم ہی سچے ہو۔ پہلے کمرے میں پہنچو پھر باتیں ہوتی رہیں گی۔"

کمرے میں پہنچنے کے بعد مجھے شدید تکان کا احساس ہونے لگا اور میں بستر پر بے سدھ ہو کر گر گیا۔ چند قدموں پر مشتمل وہ فاصلہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں ہلکی ہو چکی تھیں اور پیشانی پر پسینے کی سرد بوندوں کے اُبھرنے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس وقت مجھے وہم ہوا کہ شاید سلمیٰ کا اندازہ درست ہی تھا۔ غزالہ کے بارے میں اُس کی ہرزہ سرائی سُن کر مجھ پر شاید ہلکا سا دل کا دورہ پڑا تھا جس کے بعد مجھے کم از کم چار چھ گھنٹوں تک چلنے پھرنے سے گریز کر کے بستر پر آرام کرنا چاہیے تھا۔

سلطان شاہ اپنی جرح بھول کر میری تیمارداری میں مصروف ہو گیا۔ اُس نے بھی ڈاکٹر کو طلب کرنے کی اجازت چاہی مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے منع کر دیا اور پھر میرا ذہن تیزی کے ساتھ کہر آلود دھندلکے میں ڈوبتا چلا گیا۔

کافی دیر بعد مجھے دوبارہ ہوش آیا تو سلطان شاہ کے ساتھ ہی ایک جواں سال ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ میرے ہوش میں آنے کے بعد وہ مزید چند منٹ وہاں رکا، مجھ سے باتیں کیں پھر واپس چلا گیا۔ دورانِ گفتگو پتا چلا کہ اُسے سلطان شاہ نے روم سروس کی معرفت طلب کیا تھا۔ اُس نے مجھے دو انجکشن لگائے تھے اور چند دوائیں تجویز کر کے چلا گیا تھا۔ سلطان شاہ اس سے مشورہ کر کے مجھے امراضِ قلب کے قومی ادارے میں لے جانا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

میں ہوش میں ضرور آ گیا تھا لیکن میرا ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ اس لیے میں شام تک یوں ہی بستر پر پڑا رہا۔ اس دوران میں سلطان شاہ نے مجھے سگریٹ کو ہاتھ تک نہ لگانے دیا کیونکہ ڈاکٹر نے اس کے لیے منع کیا تھا۔

مجھے اپنے اوپر جھلاہٹ ہو رہی تھی کہ محض سلمیٰ کے الفاظ

پہ میری حالت کیوں بکھر کر رہ گئی تھی۔ اس کے پیدا کیے ہوئے وہم سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں جلد از جلد غزالہ کو تلاش کر کے اُس تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ حقیقت کا علم ہو سکے لیکن ڈاکٹر نے دو تین دن تک آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا اور میں خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ فوری طور پر بھاگ دوڑ کی کوشش کی تو شہر کی کسی بھری پُری سڑک پہ لوگوں کے لیے تماشا بن سکتا تھا۔ دوسری طرف سلطان شاہ کو پوری طرح اعتماد میں لینے میں میری انا بُری طرح حائل تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اپنی زبان سے غزالہ کے بارے میں سلمٰی کے کہے ہوئے الفاظ کسی اور کے سامنے دہراؤں۔

جب شام ڈھلنے لگی اور کھڑکیوں سے باہر اندھیرا پھیلنے لگا تو میں نے سلطان کو پوری بات بتائے بغیر اس سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس وقت مجھے خود پر حیرت ہوئی کہ اتنی آسان سی بات اس سے پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آسکی تھی۔

"تم نے میری باز پُرس کے بارے میں اپنی باز پُرس کا سلسلہ کیوں ترک کر دیا؟" میں نے سوچ سمجھ کر اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"اگر تم کوئی بات چُھپانا ہی چاہتے ہو تو بلاوجہ کریدنے سے کیا فائدہ!" وہ پھیکی ہنسی کے ساتھ بولا۔

"اب میں تو بستر پہ دراز ہو گیا ہوں، تمھیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔"

"مجھے معلوم ہے، میں کل صبح سے غزالہ بھابی کی تلاش کی مہم کا آغاز کروں گا۔"

اس کی بات سُن کر میں چونک پڑا۔ "تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟"

"بڑی آسان سی بات ہے۔ تم فون پہ سلمٰی سے بات کرنے کے بعد اسی لیے اُس کے گھر گئے تھے کہ بھابی کے بارے میں وہ اہم معلومات حاصل کر سکو جو وہ تمھیں فون پر نہیں بتا رہی تھی اور وہیں تمھاری طبیعت کسی وجہ سے بگڑ گئی۔ پاکستان آنے کے بعد تم ہر قیمت پہ جلد از جلد غزالہ بھابی سے ملنا چاہتے ہو جس کا کہیں سے کوئی سُراغ نہیں مل رہا۔ اب کسی نہ کسی کو تو اس کا کھوج لگانا ہی ہوگا ورنہ تم یوں ہی ذہنی اذیت سے دوچار رہو گے۔"

"کیسی ذہنی اذیت؟" اس نے دوبارہ مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

"اس کا سیاسی جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جب دو چاہنے والے ایک دوسرے سے دور ہوں تو لازماً دونوں ہی ذہنی اذیت سے دوچار رہتے ہیں۔ مگر میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ بے ہوش ہونے کے بعد تم کئی بار بڑبڑائے تھے، پہلی مرتبہ تو میں کچھ نہ سمجھ سکا مگر غور کرنے پر بعد میں تمھارے الفاظ سمجھ میں آگئے۔ تم یہی تکرار کر رہے تھے کہ 'غزالہ میری محبت ہے، وہ کبھی بے وفائی نہیں کر سکتی۔ سلمٰی جھوٹی ہے۔' اب تم خود ہی بتاؤ کہ اس کے بعد کیا باقی رہ جاتا ہے؟ میرے پاس سلمٰی کا فون نمبر نہیں تھا ورنہ میں اُس سے ضرور معلوم کرتا کہ اس نے غزالہ بھابی کی کون سی بے وفائی کی کہانی تم کو سُنا کر یوں مفلوج کیا ہے۔"

"اچھا ہوا کہ تمھیں خود ہی معلوم ہو گیا۔" میں نے [illegible] لہجے میں کہا۔ "مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں ایسی منحوس بات اپنی زبان سے دُہراتا۔ حقیقت جان لینے کے بعد تم یقیناً اس کی تلاش میں کوئی کسر نہیں چھوڑو گے۔"

وہ غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن زبان نہیں کھول پا رہا تھا۔

"کہو، کہو! تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟ تم ہی سے تو کھل کر درد کی بات کی جا سکتی ہے۔"

"آج تمھیں دیکھ کر مجھے عورت کی صحیح قوت کا اندازہ ہوا ہے۔" وہ سر جھٹک کر صدمے کے ساتھ بولا۔ "تم نے نہ کچھ دیکھا ہے، نہ بھابی سے ملے ہو، لیکن اس کے بارے میں چند الفاظ نے تم جیسے ذہین اور شہ زور آدمی کو بستر پہ لٹا دیا۔ اگر کسی کی کوئی محبوب ہستی واقعی بے وفائی کر بیٹھے تو کیا ہوگا۔ ہر ایک تو تمھاری طرح مضبوط اور سخت جان نہیں ہوتا۔"

"یہ بڑے نازک معاملات ہوتے ہیں مائی ڈیئر۔" میں نے نقاہت آلود مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہیرا تو سخت سے سخت چیز کو کاٹ دیتا ہے مگر پھول کی پتی سے اس کا جگر کٹ سکتا ہے۔ . . ."

"ایسے بہتیرے شعر فرنٹیئر سے آنے والے ٹرکوں کے پیچھے لکھے ہوتے ہیں مگر میں نے کبھی اُنھیں اہمیت نہیں دی تھی۔" وہ سادگی اور سنجیدگی کے ساتھ بولا۔ "لیکن تمھیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ شاعری خلا سے نہیں نازل ہوتی، اسی دنیا کے لوگوں اور مسائل کے بارے میں ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہزاروں لاکھوں لوگ ایسے مسائل سے دوچار ہوئے بغیر ہی زندگی گزار لیتے ہیں۔ شاید میرا شمار بھی ان ہی میں ہوتا ہے۔ اس لیے میں شاعری کو ذہنی عیاشی یا فضول کی شکل یا دل بہلانے کا ذریعہ سمجھتا ہوں اور بس۔"

وہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھا لیکن ذہین اور تجربے کار ضرور تھا۔ اُس نے بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ ہزاروں لاکھوں انسان اس دور میں دردِ دل سے آشنا ہوئے بغیر اپنی طبعی عمر پوری کر لیتے ہیں۔ وہ عورت کے حوالے سے بات کر رہا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ دردِ دل کے لیے عورت کا موجود ہونا ناگزیر نہیں ہوتا۔ محبت تو کسی سے بھی ہو جاتی ہے یا کی جا سکتی ہے لیکن اس مشینی دور میں یہ دردِ دل عنقا ہی ہوتا جا رہا تھا۔

اس رات کا کھانا بھی ہم نے کمرے میں ہی کھایا پھر میں نے ڈاکٹر کی دی ہوئی گولیاں کھائیں جن میں شاید کوئی خواب آور دوا بھی تھی جس کے زیرِ اثر میں جلد ہی گہری نیند سو گیا۔

صبح ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر سلطان شاہ نے سب سے پہلے اپنے کمرے کی بکنگ کینسل کرائی جسے وہ سرے سے استعمال ہی نہیں کر رہا تھا اور بلاوجہ کرائے کی رقم چڑھ رہی تھی۔ اس فضول خرچی کا ذکر آنے پر میں نے اُسے بتایا کہ کراچی میں بس وہی رقم ہماری کُل کائنات تھی جو ہم نے گن بوٹ فروخت کر کے حاصل کی تھی ورنہ شی والوں نے شہر میں میرے سارے اثاثے خورد بُرد کرا کے مجھے قلاش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس معاملے کی تفصیل میری طرح اس کے لیے بھی حیرت ناک ثابت ہوئی تھی۔ میرے مینجر کے بارے میں اس کی رائے بھی وہی تھی جو میری تھی کیونکہ ہم دونوں نے ہی شی کو اور اُس کے سفاکانہ طریقِ کار کو قریب سے دیکھا تھا۔ وہ لوگ جب کسی جرم کے ارتکاب کا فیصلہ کر لیتے تھے تو اُس کے پیچھے ہر قیمت پر ہر شہادت بھی تلف کرنے کی منصوبہ بندی کر لیتے تھے خواہ اس کی زد میں مرد آتے ہوں یا عورتیں یا شیر خوار ـــ اور میرے مینجر کے معاملے میں تو مرد، عورت اور شیر خوار تینوں شامل تھے اور ان بدنصیبوں کو اس طرح موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا کہ ان کے باقیات کے بارے میں کسی کو کوئی اطلاع نہیں مل سکی تھی۔ حد تو یہ تھی کہ مینجر کے ماتحت خود اسی کو غاصب اور خائن تصوّر کر رہے تھے۔

پھر میں نے اُسے گن بوٹ والی رقم کے بارے میں وہ کہانی سنائی جو میں سلمٰی کو سنا کر امانت داری پر آمادہ کر چکا تھا اور وہ میرے بروقت فیصلے کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا۔ پاکستان میں اپنی مالی بربادی کی داستان سُن کر میں نے جس مہارت سے اپنے پاس موجود گن بوٹ والی رقم کو اپنے گم گشتہ مفادات سے منسلک کیا تھا وہ ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ میں سلمٰی کے بہت سے نامعقول اور ناگفتنی سوالات کا شکار ہونے سے بال بال بچ گیا تھا۔

اس تمام بریفنگ کے بعد سلطان شاہ میرے اصرار پہ غزالہ کی تلاش کی مہم پر روانہ ہو گیا جو انسانوں کے اس سمندر میں جُوئے شیر لانے کے مترادف تھی لیکن میں نے اُسے یہ بتا دیا تھا کہ غزالہ کا کوئی بنیادی سراغ شاید اس اسپتال سے مل سکے جہاں اُس کا اکلوتا بھائی کامران زیرِ علاج تھا۔ وہاں سے ناکامی کی صورت میں اُسے شہر میں گلی گلی گھوم کر ہی غزالہ کا سراغ لگانا پڑتا جو آسان کام ہرگز نہ ہوتا۔

سلطان شاہ کے چلے جانے کے بعد میں انٹر کام کے رحم و کرم پر رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت اپنی جگہ پر تھی لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ بستر چھوڑ کر کہیں باہر جانے کا ارادہ کر سکوں۔ اس لیے میں نے جب پہلی بار روم سروس کے ویٹر کو طلب کیا تو چائے کی ٹرے لانے کے عوض اُسے پورے ایک ڈالر کی ٹِپ دی تاکہ وہ خصوصی طور پر میری کال پر توجہ دے سکے۔

اپنی ڈیوٹی ختم کرنے تک وہ مجھ سے پانچ ڈالر کما چکا تھا جس کے نتیجے میں اُس نے چھٹی کرنے سے قبل اپنی جگہ آنے والے دوسرے ویٹر کو کمرے میں لا کر مجھ سے متعارف کرایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں اخلاق کے بعد یا شاید اخلاق سے بھی زیادہ مؤثر ہار رقم کی ہوتی ہے۔ پیسہ خرچ کر کے دنیا کے ہر گوشے میں ہر آسائش خریدی جا سکتی ہے، بجز خالص محبت کے، کیوں کہ خالص محبت کا تعلق شفاف جذبوں سے ہوتا ہے جو پیسے کے بل پر خریدی جائے وہ کاروباری محبت ہوتی ہے جو سیج کے پھول مُرجھاتے ہی ایک نئے سودے کی متقاضی ہوتی ہے۔

سلطان شاہ نو بجے کے قریب کسی تھکے ہارے کولھو کے بیل کی طرح واپس آیا تو اُس کے چہرے پر اُداسی نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

غزالہ کا بھائی کامران پوری طرح صحت یاب ہو کر کئی ہفتے قبل اسپتال سے رخصت ہو چکا تھا۔ میرے چلے جانے کے بعد اُس کے علاج کے اخراجات کسی گمنام محسن نے ادا کیے تھے۔ اس لیے اسپتال والے کچھ نہ بتا سکے کہ کامران رخصت ہو کر کہاں گیا ہوگا کیونکہ اس کے ملاقاتیوں کی فہرست میں بھی کوئی نام نہیں تھا جو اس بارے میں مددگار ثابت ہوتا۔

وہاں سے ناکام ہونے کے بعد سلطان شاہ نے اُس مکان کا رُخ کیا جہاں کرنل زوار زیدی نے اپنے مختصر سے کنبے کے ساتھ اپنے آخری ایّام بسر کیے تھے لیکن وہ کرائے کا مکان تھا اس لیے وہاں سے کوئی کارآمد بات معلوم نہ ہو سکی۔ غزالہ کے گھر میں خاصا مال و اسباب بھرا ہوا تھا۔ اس میں نقدی اور زیور بھی ضرور رہا ہوگا لیکن مالک مکان کو شکایت تھی کہ مرنے والے جوڑے کی تجہیز و تکفین کے اخراجات بھی اُسے پیشگی جمع کیے ہوئے اُس کرائے میں سے ادا کرنے پڑے جو سالانہ معاہدے کی بقیہ مدت میں خود بخود اس کا حق بن جاتا۔ اموات مشتبہ تھیں اس لیے پولیس نے گھر کے سارے مال و اسباب کو لاوارث

قرار دیتے ہوئے اپنی تحویل میں لیتے ہوئے مکان کو سیل کر دیا تھا جو رشوت کی ادائیگی اور سفارشوں کے نتیجے میں دو ماہ بعد ٹوٹ سکی تھی۔

مالک مکان نے دوٹوک انداز میں سلطان شاہ سے کہا تھا کہ مشتبہ انداز میں مرنے والے لوگوں کو کم از کم یہ احتیاط ضرور کرنی چاہیے کہ مرتے وقت وہ کرائے کے مکان کے بجائے کسی ذاتی جاگیر یا سرکاری سڑک پہ ہوں تاکہ اُن کی مشتبہ موت کی صورت میں غیر متعلقہ فریقوں کو ذہنی کوفت، وقت کے ضیاع اور مالی نقصان سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ اپنے دلائل سے وہ اتنا دکھی معلوم ہوتا تھا کہ سلطان شاہ اپنی شدید خواہش کے باوجود اُسے یہ نہ بتا سکا کہ مرنے والوں کو نہ اپنی موت کے وقت کا پیشگی علم ہوتا ہے نہ طریقے کا — زوار زیدی نے اگر خودکشی کی تھی تو وہ اس کی بیوی کی موت کا ایک جذباتی اور اضطراری ردِعمل تھا جس میں اُس کی کسی منصوبہ بندی کا کوئی دخل نہیں تھا۔

سلطان شاہ کی پہلے دن کی وہ رپورٹ بہت حوصلہ شکن تھی۔ ہم دونوں ہی اس بارے میں مایوسانہ انداز میں تبادلہ خیال کرتے ہوئے کھانا کھا رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی اور آپریٹر کی آواز کے بعد ہی جہانگیر کی پُرجوش آواز سنائی دی۔

"ہیلو پیٹر! تم زندہ تو ہو نا؟" اُس نے خوش دلی کے ساتھ پوچھا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ سلمٰی نے میرے نام کے بارے میں اُسے ایک اہم احتیاط سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا۔

"زندہ ہوں مگر تمھاری بیوی نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ . ." میں نے کہنا چاہا لیکن اُس نے تیز لہجے میں فوراً ہی میری بات کاٹ دی۔

"وہ سب مجھے معلوم ہے۔ سلمٰی بتا چکی ہے کہ اس کا انکشاف سنتے ہی تم مجنوں کی طرح ہائے لیلیٰ کہہ کر فرش پر ڈھیر ہو گئے تھے۔ لیکن گھر ہوتے ہوئے تم ہوٹل میں کیوں جھک مار رہے ہو؟"

"میں اکیلا نہیں ہوں، میرا ایک دوست بھی میرے ساتھ ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

"بکومت!" اُس کی پُرجوش غرّاہٹ سنائی دی۔ "سلمٰی مجھے بتا چکی ہے کہ وہ تمھارا نوکر ہے۔ غزالہ کے بعد اگر اس سے دل لگا بیٹھے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، اُسے بھی اپنی خواب گاہ میں رکھ لینا۔ تم تیار رہو، بس میں فوراً گھر سے نکل رہا ہوں۔" اپنی بات پوری کر کے اُس نے یکلخت فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

"سوٹ کیس پیک کرو، جہانگیر ہمیں لینے کے لیے آرہا ہے۔" میں نے ریسیور رکھ کر شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"مجھے یہیں رہنے دو تو بہتر ہوگا۔ میرے بارے میں اُس کی بیوی کے تیور اچھے نہیں تھے۔ پتا نہیں کیوں ہر خوش شکل اور جوان عورت تم سے ملتے ہی میری طرف سے حسد کا شکار ہو جاتی ہے۔"

"تمھیں سلمٰی کو برداشت کرنا ہوگا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں اکیلا وہاں منتقل ہوا تو میری بیماری کے بہانے وہ مجھ پر حاوی ہوتی چلی جائے گی۔ جہانگیر تو شاید دن بھر اپنی فیکٹری کے چکر میں لگا رہتا ہوگا۔"

ہمارا نہ کوئی سامان تھا نہ اثاثہ۔ اٹلی سے ایک عدد سوٹ کیس بھی صرف اس لیے خرید لیا تھا کہ اس میں رقم والا بیگ مقفل کیا جاسکے۔ اس لیے سلطان شاہ نے چند ہی منٹ میں روانگی کی تیاری مکمل کر لی۔ "میں تیار ہوں۔" اُس نے اعلان کیا۔

"پورٹر کو بُلالو۔ کمرے کے بجائے نیچے ہی اُس کا انتظار کر لیں گے۔ اِس دوران میں ہوٹل کا حساب بھی بے باک ہو جائے گا۔"

"پورٹر کی کیا ضرورت ہے؟ لفٹ تک تو میں خود یہ سوٹ کیس اُٹھا لوں گا۔ اس میں رکھا ہی کیا ہے؟" اُس نے اکلوتا سوٹ کیس اٹھایا اور میں نے بستر چھوڑ دیا۔

ہوٹل کے کاؤنٹر پر ایک اور مسافر کے ساتھ اپنا حساب بے باق کرتے ہوئے مجھے دُکھ ہوا کہ میں کیوں نہ ایسی کسی کمپنی کے حوالے سے ہوٹل میں ٹھہرا جس کے سال میں چار چھ مہمان آتے ہوں۔ اپنا سب کچھ سٹی کے ہاتھوں گنوا دینے کے بعد میرا وہ خیال بالکل فطری تھا کیونکہ ہم سے آگے والے مہمان کو محض اسی بنا پر کرائے میں ایک خطیر رعایت دی جا رہی تھی۔

حساب کتاب سے فارغ ہو کر ہم دونوں لابی میں صوفوں پر آ بیٹھے اور سلطان شاہ نے خالص انتظار کی کوفت میں کمی کی نیت سے قریبی بار سے چائے منگوا لی تاکہ ہم جہانگیر کی آمد تک خود کو مصروف رکھ سکیں۔

جس وقت ویٹر چائے کی ٹرے ہمارے سامنے میز پر رکھ رہا تھا، میں اچانک مضطرب ہو گیا کیوں کہ ہوٹل کے عقب میں پیٹرول پمپ کی سمت سے آنے والی راہداری میں غزالہ نظر آ گئی تھی جو نہایت متانت اور وقار کے ساتھ نظریں جھکائے سیدھی بڑھی جا رہی تھی۔ اُس کا ایک ایک نقش میرا آشنا سا تھا لیکن سلمٰی کے بیان کے عین مطابق اُس کے بال ترشے ہوئے تھے۔ ہلکے پھلکے سراپا پر موہوم سی فربہی آ گئی تھی اور رنگ و روپ میں سُرخی ہر رنگ پر حاوی تھی۔ قمیض شلوار اور دوپٹے میں ملبوس وہ کوئی سفید فام خاتون نظر آ رہی تھی جس نے محض شوق کی بنا پر مقامی لباس زیب تن کر لیا ہو۔

سلطان شاہ سارا دن برباد کر کے جس کا سراغ نہیں لگا سکا تھا وہ اچانک ہی خود بخود میرے سامنے آ گئی تھی۔ میں نے اضطراری طور پر اپنی نشست چھوڑ دی لیکن شاید سلطان شاہ بھی اُسے دیکھ اور پہچان چکا تھا اسی لیے اُس نے مضبوطی سے میرا بازو تھام لیا۔ "سکون سے اپنی جگہ بیٹھے رہو۔ میں نے بھی اُسے دیکھ لیا ہے۔ اس کے پیچھے جا کر تم مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکو گے۔"

"کیوں حاصل نہ ہوگا؟" میں نے اُسے گھورتے ہوئے ترش لہجے میں سوال کیا۔

"میں اس کا سراغ لگا چکا تھا۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "مجھے اگر معلوم ہوتا کہ وہ یوں اچانک تمھارے سامنے آ جائے گی تو تمھارے سامنے ہرگز جھوٹ نہ بولتا۔ سلمٰی کے اندیشے درست تھے۔ اب وہ مسز دلدار کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔"

"تم بکواس کر رہے ہو۔" میں اضطراری طور پر غرّا کر بولا اور پھر اُس کا ہاتھ جھٹک کر غزالہ کے پیچھے ہو لیا جو اس وقت تک میرے سامنے سے گزر کر استقبالیہ کاؤنٹر تک پہنچ چکی تھی۔ وہ کاؤنٹر سے آگے نکل کر داہنی طرف ہوٹل ڈیمی ٹاسی کی طرف مڑی تو میں چند قدم کے محفوظ فاصلے سے اُس کے تعاقب میں تھا۔

میرے لیے وہ لمحات بہت سنسنی خیز اور صبر آزما تھے۔ میری متاعِ حیات میرے وجود سے بے خبر مجھ سے چند قدم آگے چلی جا رہی تھی مگر سلمٰی اور سلطان شاہ نے اُسے میرے لیے شجرِ ممنوعہ بنا دیا تھا۔ وہ میری تھی مگر میں اپنائیت کے ساتھ اُس کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کہیں کسی گوشے سے اُس کا اصل دعویدار میرے مقابل نہ آ جائے۔

وہ چائے خانے سے گزر کر اندر ریستوران میں ایک ایسی میز کی طرف بڑھ گئی جہاں ایک زرد رو جوڑے نے اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو کر اُس کا استقبال کیا۔ اس کی نشست دیکھ لینے کے بعد میں وہیں سے اُلٹے پاؤں مڑا تو مجھے اپنے سے چند قدم پیچھے سلطان شاہ نظر آیا۔ میری قہر بار نگاہوں کا سامنا کرتے ہی وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بول پڑا۔ "میں احتیاطاً تمھارے پیچھے آیا تھا کہ کہیں راستے میں تمھاری طبیعت پھر نہ بگڑ جائے۔ میں تمھارا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔"

"تم دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔" میں اُس کے قریب پہنچ کر اپنے غصّے پر قابو نہ رکھ سکا۔ "تم جھوٹے ہو۔ واپس آنے کے بعد کس قدر معصومیّت سے اپنی ناکامی کی داستان سُنا رہے تھے اور اُسے دیکھتے ہی تمھاری زبان چل پڑی؟"

"اس میں میری کسی بدنیتی کا دخل نہیں تھا۔" اُس نے سر جھکا کر میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پُرتاسف لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ میری دریافت کی ہوئی باتیں سُن کر تمھیں شدید ذہنی صدمہ پہنچے گا اس لیے میں نے تمھاری طبیعت سنبھلنے تک اپنی زبان بند رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کامران کے اسپتال سے مجھے اُس کا پتا تو نہیں مل سکا تھا لیکن ایک فون نمبر مل گیا تھا۔ میں نے وہ نمبر ملایا تو دوسری طرف سے غزالہ نے ہی ریسیور اٹھایا تھا۔ اس کے بعد میرا کام آسان ہو گیا اور میں نے سب کچھ معلوم کر لیا۔"

غزالہ پرائی ہو چکی تھی اس لیے سلطان شاہ نے اس وقت پہلی بار اُس کے لیے بھابی کا خطاب استعمال نہیں کیا تھا۔ میرے لیے وہ تصوّر ہی درد انگیز تھا۔ اس خیال سے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا اور سلطان شاہ پر جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

نہ جانے دلدار کون تھا جس سے غزالہ نے اپنی شادی رچائی تھی! وہ کن حالات میں اس فیصلے پر مجبور ہوئی تھی؟ یہ سب ایسے سوالات تھے جن کے جواب غزالہ ہی دے سکتی تھی اور اس کے ردِعمل سے قطعِ نظر میرا اس سے ملنا ضروری ہو چکا تھا لیکن اِس وقت وہ ہوٹل میں اپنے دو غیر ملکی مہمانوں سے ملنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ اس لیے یوں سرِراہ اس سے ٹکرانا مناسب نہیں تھا لیکن میں پہلی فرصت میں جلد از جلد اس سے ملاقات کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ اس وقت غزالہ مجھے تنہا ہی نظر آئی تھی۔ اگر اس کا شوہر بھی ساتھ ہوتا تو میں رقابت سے مغلوب ہو کر نتائج کی پروا کیے بغیر اس سے بھڑ سکتا تھا۔ پھر وہیں سے میرا ذہن دوسری راہ پہ بھٹک گیا۔

غزالہ کی شادی زیادہ پرانی بات نہیں تھی لیکن وہ جاپانی نژاد جوڑے سے ہوٹل میں ملاقات کرنے کے لیے اکیلی ہی آئی تھی۔ اگر وہ کوئی نجی ملاقات تھی تو وہ اس جوڑے کو اپنے گھر لے جا سکتی تھی اور اگر کاروباری معاملہ تھا تو دلدار کا ساتھ آنا لازمی تھا۔ میرے لیے اس ملاقات میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اچانک ہی ذہن میں چبھنے لگی تھی۔

ہم دونوں لابی میں واپس آئے تو سلطان شاہ پھر بولنے لگا۔ "غزالہ ڈیفنس میں ایک بڑے اور خوب صورت مکان میں رہ رہی ہے۔ اس کا بھائی کامران بھی اسی کے ساتھ رہتا ہے۔"

"دلدار کرتا کیا ہے؟" میں نے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"دوائیں بنانے کے ایک کارخانے کا مالک ہے۔ رہن سہن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے کاروبار سے بہت معقول آمدنی ہوتی ہے۔ اسے میں نے دور ہی سے دیکھا تھا۔"

اُسی وقت جہانگیر داخلی دروازے سے ہوٹل کی لابی میں داخل ہوا اور مجھے دیکھتے ہی تیر کی طرح میری طرف آیا۔ میں صوفے سے اٹھا تو اُس نے والہانہ گرم جوشی کے ساتھ مجھے اپنے گلے لگا لیا۔

لابی میں اور لوگ بھی موجود تھے اس لیے وہاں زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں تھا لہٰذا ہم تینوں فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ گاڑی جہانگیر خود چلا رہا تھا...... میں نے اُس کے برابر والی نشست سنبھال لی۔ سلطان شاہ عقبی سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی ہوٹل سے روانہ ہو گئی۔

"مدتوں کے بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔" اس نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے خوشی سے مغلوب لہجے میں کہا۔ "تمہارے چلے جانے کے بعد میں تو کسی سے دل کی بات کرنے کو بھی ترس گیا تھا۔"

"سلطان شاہ کے سامنے تم ہر موضوع پر کھُل کر بات کر سکتے ہو۔ شی سے غزالہ تک، ہر معاملے میں یہ میرا رازدار رہا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس طرح میں نے سلطان شاہ کی موجودگی کے بارے میں اس کی جھجک بھی دُور کرنے کی کوشش کی تھی۔

"شی! یہ کیا بلا ہے؟" اُس کے لہجے سے حیرت جھانک رہی تھی۔

"اوہ! میں بھول گیا تھا کہ اب میں پاکستان میں واپس آچکا ہوں۔ ہم جس تنظیم کے لیے یہاں کام کرتے تھے وہ یورپ اور باقی دنیا میں شی کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ یہاں رہتے ہوئے تو میں ان لوگوں کی قوت اور اختیارات کا صحیح تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

"مجھے حیرت ہے کہ ان کے ساتھ کھُل کر محاذ آرائی کرنے کے باوجود تم زندہ سلامت لوٹ آئے ہو۔ یہی نہیں بلکہ سلمٰی کی زبانی مجھے یہ سن کر بھی خوشی ہوئی کہ فیکٹری اور مکان کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم بھی تم نے ہوشیاری سے باہر منگوا لی تھی۔" جہانگیر حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

"وہ رقم تو بالکل ڈوب ہی گئی۔ مجھے کچھ پتا نہیں کہ منیجر پر کیا گزری اور رقم کہاں گئی۔ وہ کہانی میں نے سلمٰی کو اس لیے سنائی تھی کہ وہ میرے پاس موجود رقم کے بارے میں شبہے کا شکار نہ ہو جائے۔ ویسے اب وہ بھی کچھ سمجھنے لگی ہے۔" اتنا کہہ کر میں نے اختصار کے ساتھ اسے گن بوٹ کی فروخت کا واقعہ سنا ڈالا جو وہ حیرت سے مُنہ کھولے سنتا رہا۔

"پھر تو یہ سودا بُرا نہیں رہا۔" پوری کہانی سُن کر وہ بولا۔ "اِدھر وہ تمہارے اثاثے لُوٹنے کی تیاری کر رہے تھے اور اُدھر تم گن بوٹ کا سودا کر رہے تھے۔ اس معاملے میں بس تمہارا منیجر اپنے بیوی بچوں سمیت بُری طرح روندا گیا۔ ویسے تمہارے جانے کے چند ہی ہفتوں بعد یہاں سناٹا ہو گیا تھا۔ کم از کم پاکستان میں تنظیم کے پاؤں اتنی بُری طرح اُکھڑے ہیں کہ اب اس کا شاید وجود ہی ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ مدتوں سے مجھے بھی کوئی ہدایت نہیں ملی۔ دوسرے لوگ بھی رفتہ رفتہ نئے دھندوں میں لگ گئے ہیں۔ اس طرف سے سکون ہونے کے بعد ہی میں نے کورنگی میں ایک گارمنٹ فیکٹری کا سودا کیا تھا جو خاصا منافع دے رہی ہے۔ چاہو گے تو اسی کاروبار میں تمھیں بھی شریک کر لوں گا۔"

"تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ یہاں تنظیم بالکل مٹ چکی ہے تو پھر وہ کون لوگ تھے جنھوں نے میرے منیجر پر ہاتھ ڈالا تھا؟"

"وہ سب ابتدائی دنوں میں ہو گیا تھا۔ مجھے خبر مل رہی تھیں کہ کچھ جانے پہچانے لوگ تمہارے منیجر کے پیچھے لگ گئے تھے لیکن انھیں میرے ذریعے احکام نہیں ملتے تھے۔ میں نے اُڑتی اُڑتی سی خبر سنی تھی کہ ڈی ڈی نامی کوئی شخص خاص طور پر تمہاری بیخ کنی پر مامور کیا گیا تھا۔ سارا چکر اُسی کا چلایا ہوا تھا۔ پھر سرحدی علاقوں سے آنے والوں سے بھی ڈی ڈی کا نام سُنا جو اُن تمام ٹھکانوں سے ہیروئن خرید رہا تھا جہاں تنظیم کے روابط تھے۔ بعد میں میں نے ایسی خبروں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی اور زیرِ زمین دنیا کے رابطوں سے بھی کنارہ کش ہوتا چلا گیا۔"

"پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ پاکستان میں تنظیم ختم ہو چکی ہے؟"

"میری مراد یہ تھی کہ نچلی سطح کا سارا کاروبار ترک کر دیا گیا ہے۔ وہ دھندا چھوٹے موٹے مقامی بدمعاشوں نے سنبھال لیا ہے اور تنظیم کی دلچسپی صرف ہیروئن کی برآمد تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ہو سکتا ہے ڈی ڈی دو چار افراد کے ساتھ مل کر خاموشی کے ساتھ یہ لائن چلا رہا ہو، مرا حد تو یہ ہے کہ تباہی کے بعد ایک ایک کر کے سارے ٹھکانے بھی بیچ دیے گئے تھے۔"

"یہ ڈی ڈی کیا بلا ہے؟" میں نے پُرخیال لہجے میں سوال کیا۔

"اُس سے میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ بس پرانے لوگوں کی زبان سے اُس کا ذکر ہی سنتا رہتا تھا۔ اس کا بھی یہی طریقہ کار ہے کہ خود کسی کے سامنے نہیں آیا اور نہ اُس نے تنخواہ دار رکھے ہوئے ہیں۔ معاوضہ ادا کر کے کسی سے بھی کوئی کام لے لیتا ہے۔ تمہارے منیجر کے لیے اُس نے تنظیم کے چار پرانے آدمیوں کو بیس بیس ہزار روپے دے کر صرف اتنا کام سونپا تھا کہ مسلسل دو ہفتوں تک ہر دوسرے تیسرے دن اُسے اُٹھا کر بُری طرح اُس کی ٹھکائی کریں اور اُسے ختم کیے بغیر زخمی حالت میں شہر میں کہیں بھی ڈال دیں۔ اس عجیب کام پر وہ چاروں چکرا کر رہ گئے۔ انھوں نے اس معاملے میں اپنے باس سے مشورہ کیا اور یوں درجہ بدرجہ بات میرے علم میں آگئی لیکن میں ان میں سے کسی کو نہ روک سکا کیونکہ ڈی ڈی کام ہو جانے پر معاوضے کے وعدے کے ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دے ڈالتا ہے کہ اُس کے احکام سے روگردانی کرنے والوں کے سنگین جرائم کے سارے ثبوت پولیس کو فراہم کر دیے جائیں گے۔ یہ سب مہینوں پرانی باتیں ہیں، آج کل پتا نہیں شہر میں کیا ہو رہا ہے۔"

"اور غزالہ کے بارے میں کیا معلوم ہے تمھیں؟" میں نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

"جو کچھ سلمٰی تمھیں بتا چکی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم۔ باہر سے تمہارا فون آنے سے پہلے وہ ایک دن بڑے خراب تیوروں کے ساتھ اچانک ہی میرے پاس آ پہنچی تھی۔ اُس وقت اُسے بڑی شدت سے تمہاری تلاش تھی۔ اس کے کئی دن بعد سلمٰی نے اُسے صدر میں کسی کے ساتھ دیکھا تھا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ وہ تم سے بے وفائی کر کے اُس سے پینگیں بڑھا رہی ہے یا اس سے شادی کر چکی ہے؟"

"شادی کا خیال کیسے آگیا تم کو؟" میں نے چونک کر دریافت کیا۔ "یہ شبہ تو سلمٰی نے بھی ظاہر نہیں کیا تھا۔"

"اِس سے قطعِ نظر کہ تم سے اُس کے کیسے مراسم تھے، میرا خیال ہے کہ وہ صاف ستھرے خیالات کی مالک تھی۔ شاید اُس نے بھاگ دوڑ اور بے یقینی سے اُکتا کر اپنا گھر بسانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ یہ صرف میری رائے ہے۔ میں اس کا دفاع نہیں کر رہا۔ ویسے بھی انسان کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ذرا دیر نہیں لگتی۔"

میں خاموش ہی رہا۔ جہانگیر نے اندازہ کر لیا کہ اُس نے غزالہ کے بارے میں تبصرہ کرنے میں بے صبری کا مظاہرہ کیا تھا اس لیے چند ثانیوں کے بعد اُس نے خود ہی خوش دلی سے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ اتنے عرصے تک کہاں کہاں عیش کرتے رہے؟"

"یہاں رہتے ہوئے مغرب کی زندگی بہت پُرکشش نظر آتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہاں دن رات عیش و عشرت کی محفلیں گرم ہوتی ہوں گی۔ آدمی ہفتے عشرے کی سیاحت کے لیے جائے تو واقعی یہ تمام رنگینیاں دعوت دیتی نظر آتی ہیں لیکن قیام کی مدت طویل ہو جائے تو ان آزادیوں کی ساری کشش ماند پڑ جاتی ہے اور کسی نہ کسی مرحلے پر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا ہمیں حیوانوں کی طرح بے لگام زندگی گزارنے کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے...؟"

"خوب!" اُس نے میری بات کاٹ کر قہقہہ لگایا۔ "یہاں رند بنے ہوئے تھے۔ مے خانے میں غسل کی آزادی ملی تو پارسائی کی لہر نے مغلوب کر لیا... شاید یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ صرف پابندیوں کو پامال کر کے ہی لُطف اندوز ہوتا ہے!"

"میں واقعی اُکتا گیا تھا۔ دل یہی چاہتا تھا کہ رسیاں تڑا کر کسی طرح پاکستان واپس بھاگ نکلوں لیکن واقعات کا تسلسل یکے بعد دیگرے میرے قدموں کی زنجیر بنتا رہا ورنہ میں بہت پہلے واپس آگیا ہوتا۔"

"اور یہ پیٹر ڈاک کیوں بنے ہوئے ہو؟" اُس نے متجسس لہجے میں سوال کیا۔

"جس نام کی سفری دستاویزات مل گئیں، وہی بننا پڑ گیا۔ سلطان شاہ بھی پاکستان میں داخل ہونے تک را مانند بنا ہوا تھا۔ دراصل مجھے یہاں کے حالات کا کچھ اندازہ نہیں تھا، اس لیے میں نے اپنا نیا نام برقرار رکھا۔ اب تم نے ڈی ڈی کا قصہ سنایا ہے تو مجھے اس کو بھی دیکھنا ہوگا۔ شی والوں نے یورپ میں میرے ہاتھوں اتنے نقصانات اٹھائے ہیں کہ وہ کسی قیمت پر بھی مجھے معاف نہیں کر سکتے۔ وہ مجھے اب بھی اٹلی میں تلاش کر رہے ہوں گے۔ انھیں بھنک بھی مل گئی تو وہ یہاں دھاوا بول دیں گے۔" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ڈی ڈی کی بات پرانی ہو گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اب وہ سرگرم نہ رہا ہو مگر احتیاط مناسب ہے۔ تم نے اتنے مصائب جھیلے ہیں تو اب بے پروائی سے کام نہیں لینا چاہیے۔" جہانگیر محتاط انداز میں بولا۔

"ڈی ڈی کسی کے نام کا مخفف بھی تو ہو سکتا ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے اُسے قیاس آرائی کا موقع فراہم کیا۔

"بالکل ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اے ٹو، ڈی ڈی ون اور ڈی ٹو کی طرح یہ بھی محض ایک کوڈ ہو۔"

"دلدار کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟ ڈی ڈی اس کا مخفف بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"ویسے تو یہ ایک ہی لفظ ہے لیکن الگ الگ کر لو تو ڈی ڈی سے دل دار بھی بن سکتا ہے۔ کیا اس نام کا کوئی آدمی تمہاری نگاہ میں آگیا ہے جو ان خطوط پر سوچ رہے ہو؟"

"ابھی تو کوئی بھی نگاہ میں نہیں ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ ایک دو روز میں کوئی صورت واضح ہو سکے۔"

باتوں ہی باتوں میں جہانگیر کا گھر آگیا۔ گاڑی اندر داخل ہوئی تو سلمٰی انجن کا شور سُن کر برآمدے میں آگئی۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ "میرے کہنے سے

نہیں رُکے تھے لیکن اب آنا ہی پڑ گیا۔" اُس نے میرے اُترتے ہی تبصرہ کیا۔ سلطان شاہ کار سے اُتر کر سر جھکائے ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔

"تم وہاں کیوں رُک گئے؟ تم بھی اندر آؤ نا!" جہانگیر نے اُسے الگ تھلگ دیکھ کر کہا اور پھر ہم چاروں ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔

"فی الحال میں بھی سفر سے تازہ تازہ لوٹا ہوں، تمھاری طبیعت بھی ناساز ہے اس لیے آج رات آرام ہی کیا جائے تو مناسب ہو گا۔ کل کسی وقت بیٹھک جمائیں گے۔" ڈرائنگ روم میں چند منٹ بیٹھنے کے بعد جہانگیر نے میرے دل کی بات کہہ دی اور دونوں میاں بیوی ہمیں خوابگاہ کی طرف لے گئے۔ ہمارا ہلکا پھلکا سوٹ کیس دربان اندر لے آیا تھا۔

میدان صاف ہو گیا۔ یُوں تو سلطان شاہ سے بھی بے تکلف تھا اور جہانگیر سے بھی لیکن ان دونوں کے بارے میں کچھ ایسے حجاب بھی تھے جو ایک دوسرے کے سامنے ختم نہیں کیے جا سکتے تھے۔ جہانگیر میرا گہرا جگری دوست تھا لیکن دوستی کے ناتے سے اُس کے سامنے اپنی مردانگی کا بھرم قائم رکھنا بھی لازمی تھا۔ اس لیے غزالہ کے بارے میں بہتیری باتیں ایسی تھیں جو میں سلطان شاہ سے تو کر سکتا تھا لیکن جہانگیر کے سامنے انھیں زبان پر لانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"تم خبر تو لے آئے ہو، لیکن یہ اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ مجھ سے مُنہ پھیر کر کسی اور سے شادی پر کیوں مائل ہوئی؟" تخلیہ ہو جانے پر میں نے رازدارانہ لہجے میں سلطان شاہ سے سوال کیا۔

"اصل جواب تو وہ خود ہی دے سکے گی مگر قیاس یہ کہتا ہے کہ اس نے جو کچھ کیا، انتہائی مجبوری کے عالم میں کیا ہو گا۔ وہ لاکھ دلیر اور باحوصلہ سہی، لیکن کہیں نہ کہیں تو اس کی ہمت جواب دے ہی گئی ہو گی۔"

"اور دلدار والے نظریے کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ جو کچھ تم نے کہا، وہی میں بھی سوچ رہا تھا۔ دلدار کو تمھاری بیخ کنی پر مامور کیا گیا تھا اور وہ ہر طرف سے تمھیں گہری زک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس نے ڈی ڈی کے روپ میں تمھاری فیکٹری اور مکان کا تیا پانچا کیا پھر جوں ہی اسے تمھاری محبوبہ، غزالہ کی آمد کی اطلاع ملی، اس نے ایسے بھیانک اور روح فرسا حالات پیدا کیے ہوں گے کہ غزالہ کو اس کی ذات میں پناہ لینے میں عافیت نظر آئی ہو گی۔ وہ تمھیں ہر اعتبار سے تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے اور ابھی تک اپنے مشن میں کامیاب جا رہا ہے۔"

"پھر اس کا توڑ کیا ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟" میں نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔ اس وقت میں خود کو حالات کے مقابلے میں کسی ننھے سے بچے کی طرح بے بس اور لاچار محسوس کر رہا تھا۔ کھل کر سامنے آ سکتا تھا اور نہ ہی چھپا رہ سکتا تھا۔ سامنے آتا تو ڈی ڈی اپنی پوری قوت کے ساتھ مجھے کچل ڈالنے پر تل جاتا اور چھپا رہتا تو غزالہ کو کبھی بھی حقائق کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔

"تمھیں سب سے پہلے فون پر غزالہ سے بات کرنا چاہیے، اور اگر وہ آمادہ ہو تو اس سے تنہائی میں ملنا چاہیے۔ تاکہ تمھیں اندر کے معاملات کا علم ہو سکے۔ اس کے بعد ہی تم کوئی حکمتِ عملی مرتب کرنے کے قابل ہو سکو گے۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ دلدار اور ڈی ڈی کے بارے میں میرا سوچا ہوا مفروضہ سراسر بے بنیاد ہو...!"

"بات خود بخود صاف ہو جائے گی۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "غزالہ سے تمھاری گفتگو بہت ضروری ہو گئی ہے۔ خوابگاہ میں فون موجود ہے۔ میرے پاس نمبر بھی ہے۔ چاہو تو ابھی بات کر سکتے ہو۔"

"اس وقت؟" میں نے رسٹ واچ پہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ دلدار گھر پہ موجود ہوا تو میری کال سے شبہے میں پڑ جائے گا۔ اس وقت فون کرنا مناسب نہیں ہے۔"

"میرے خیال میں یہی وقت سب سے زیادہ مناسب ہے۔" سلطان شاہ نے اصرار کیا۔ "دلدار موجود ہو تو کچھ کہے بغیر سلسلہ منقطع کر دینا۔ غزالہ ریسیور اٹھائے تو گفتگو کر لینا۔ پہلا امتحان تو یہی ہے کہ دلدار شریف آدمی ہے تو اسے اس وقت اپنے گھر پہ اپنی نئی نویلی بیوی کے پاس موجود ہونا چاہیے۔ بصورتِ دیگر غزالہ اس وقت گھر پر اکیلی ہو گی۔"

میری قوتِ فیصلہ کمزور ہو گئی تھی لیکن میں نے سوچے سمجھے بغیر سلطان شاہ کا مشورہ قبول نہیں کیا۔ ہر پہلو سے غور کرنے کے بعد جب میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ فون کرنے میں کوئی نقصان نہیں ہے تو میں نے سلطان شاہ سے دلدار اور غزالہ کے مکان کا فون نمبر لے کر رابطہ قائم کرنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔

وہ یورپ کا کوئی شہر نہیں، بلکہ کراچی تھا۔ اس لیے میں پے در پے کئی کوششوں کے لیے تیار تھا۔ لیکن مجھے اس وقت تحیر آمیز خوشی کا سامنا کرنا پڑا جب پہلی ہی کوشش میں دوسرے سرے سے گھنٹی کی آواز سنائی دینے لگی۔

ایک طویل وقفے کے بعد غزالہ سے براہِ راست رابطے کی

وہ میری پہلی کوشش تھی۔ اس لیے میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ ٹیلی فون کے بزر کی آواز اس وقت میرے لیے ایک سنسنی خیز پہیلی بن کر رہ گئی تھی۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ آخر کار دوسری طرف سے دلدار بولتا ہے یا غزالہ ریسیور اٹھاتی ہے لیکن میں انتظار کرتا رہا اور پھر دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔

سکوت کے چند ثانیے میرے لیے اضطراب انگیز ثابت ہوئے۔ ریسیور اٹھانے والے نے فوری طور پر بولنے کے بجائے میری طرف سے آغازِ کلام کا انتظار کیا لیکن میں سانس روکے، ریسیور کان سے لگائے کھڑا رہا۔ اور پھر میرے کانوں میں ایک شناسا نسوانی آواز ترنم کا رس گھول گئی۔ غزالہ نے فون پر صرف ہیلو کہا تھا اور وہی ایک لفظ میرے لیے بہت کافی ثابت ہوا تھا کیونکہ میں اس کے جواب میں فون بند کرنے کے بجائے سلسلۂ کلام جاری رکھ سکتا تھا۔

"دلدار صاحب موجود ہیں؟" میں نے حتی الامکان اپنی آواز کو نارمل رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟" اس کے لہجے میں تذبذب تھا جیسے وہ ذہن پہ زور دے کر میری آواز پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ جب میں اس کی آواز پہچان سکتا تھا تو میری آواز اس کے لیے اجنبی نہیں ہو سکتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مجھے معلوم تھا کہ دوسری طرف وہی موجود تھی جب کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کال میری رہی ہو گی۔

"ڈینی!" میں نے سرد، سپاٹ اور دھیمی آواز میں کہا۔

"ڈینی!" اس کے وجود کی گہرائیوں سے اٹھنے والی کرب ناک چیخ ریسیور میں گونجی۔ میرا نام سنتے ہی وہ اضطراری طور پر تڑپ اٹھی تھی۔ اس کا وہ پہلا ردِ عمل میری سلگتی ہوئی رگوں میں ٹھنڈک اور حلاوت بن کر اتر گیا۔ وہ جہاں بھی اور جس حال میں تھی اس کے دل کی بے اختیار گہرائیوں میں بہر حال میرا نام باقی تھا جسے دلدار کی دلداری بھی کھرچ کر نہ پھینک سکی تھی۔

غزالہ کی اس اضطراری چیخ کے بعد گویا چند لمحوں کے لیے کائنات اپنی جگہ تھم گئی۔ لائن پہ مرگ آسا سکوت چھا گیا پھر وہ بولی تو اس کی آواز سرد اور جذبات سے عاری تھی جیسے ان چند ثانیوں میں اس کی ذات اور احساسات بالکل ہی بدل کر رہ گئے ہوں۔ "تم کہاں سے بول رہے ہو؟ میرا پتا تمھیں کس نے دیا؟"

"میں اسی شہر میں موجود ہوں۔ طلب صادق ہو تو کسی کا بھی کھوج لگانا دشوار نہیں رہتا۔ یہ بتاؤ کہ تم کیسی اور کس طرح زندگی گزار رہی ہو؟" میرے دل میں جذبات کا ایک طوفان امڈا چلا آ رہا تھا لیکن میں نے اپنے لب و لہجے سے اس کا مطلق اظہار نہیں ہونے دیا۔ اگر وہ بے وفا نکل گئی تھی تو مجھے بھی بے مہری دکھانے کا پورا حق حاصل تھا۔ اس دن اس نے زندگی میں پہلی بار آپ کے بجائے مجھے تم کے صیغے سے مخاطب کیا تھا جیسے وہ یک بیک میری برابری کی سطح پہ آ گئی ہو۔

"تم نے میرے گھر فون کیا ہے۔ اس لیے تم بے خبر نہ ہو گے کہ اب میں کسی کی آبرو بن گئی ہوں۔ میرے شوہر گھر پر موجود نہیں ہیں اس لیے تم سے اتنی بات بھی کر رہی ہوں اور التجا کرتی ہوں کہ اب مجھ سے رابطہ قائم نہ کرنا۔ شادی کے بعد میری راہ تم سے الگ ہو گئی ہے۔ میں نہیں چاہوں گی کہ تمھاری وجہ سے میری پُرسکون گھریلو زندگی میں کوئی تلاطم پیدا ہو۔"

اس کا جواب سن کر میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس کا لہجہ شکستہ اور آواز لرزاں تھی جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے دل میں وہ سب نہیں تھا جو وہ زبان سے کہہ رہی تھی، لیکن یہ ایک اٹل حقیقت تھی کہ اس کی شادی کے بعد ہمارے راستے جدا ہو گئے تھے جن کے دوبارہ ملنے کا بظاہر کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔

"چاہت پا لینے کا ہی دوسرا نام نہیں ہوتا غزالہ!" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "ہر شخص کو اپنے مستقبل کے فیصلوں کی پوری آزادی ہوتی ہے۔ میں خود بھی نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمھاری زندگی میں کوئی بدمزگی پیدا ہو مگر میں ایک بار تم سے روبرو ملاقات ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ تم سے ان سوالوں کے جواب دریافت کر سکوں جنھوں نے میرا سکھ چین برباد کر کے رکھ دیا ہے۔"

"لیکن میں تم سے نہیں مل سکتی۔" اس کی آواز میں کرب سمٹ آیا۔ "ماضی میں ہماری دوستی ضرور رہی ہے، لیکن اب تمھیں مجھ سے کوئی سوال کرنے کا کوئی حق نہیں رہا ہے۔ میں کسی اور کی ہو چکی ہوں۔ تمھیں یہ حقیقت تسلیم کر لینا چاہیے، تمھارے لیے اب میں غزالہ نہیں رہی ہوں۔ میرا نام مسز دلدار ہے جو تمھیں بھی قبول کر لینا چاہیے۔"

"ایک بار تو تمھیں ملنا ہی پڑے گا مسز دلدار۔" میں نے اپنے لہجے کو سپاٹ رکھنا چاہا لیکن آواز میں خود بخود تلخی سی در آئی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم اب بھی گھر سے باہر لوگوں سے تنہا ملتی ہو۔ کچھ دیر پہلے ہی تم کانٹی نینٹل میں ایک جاپانی جوڑے کے ساتھ تھیں اس لیے مجھ سے کوئی حیلہ بہانہ نہیں چل سکے گا۔ برسوں کے عہد و پیمان ..... اور گہرے مراسم پل بھر میں نہیں بھلائے جا سکتے۔ یہ یقین رکھو کہ میری ذات سے تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا جسے چاہا جاتا ہے اسے ہر حال میں عزیز رکھنا پڑتا ہے۔"

"تم ضد کر رہے ہو۔ اپنے حالات کو میں تم سے بہتر جانتی ہوں۔

مجھے اس ملاقات پر مجبور نہ کرو۔"

"کیا تم دلدار سے خوفزدہ ہو؟" میں نے پہلا براہِ راست سوال کیا۔

"ہرگز نہیں، تمھیں ایسی غیر ذمے دارانہ بات زبان سے نہیں نکالنا چاہیے۔ اچھا ایسا کرو کہ تم میرے گھر آجاؤ۔ آج دلدار شہر سے باہر ہیں۔ اگر تم جذباتی نہ ہونے کا وعدہ کرو تو میں تمھیں کچھ وقت دے سکتی ہوں۔"

"جذبات لاابالی نوجوانوں کا کھلونا ہوتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ میں بہت ٹھنڈے مزاج کا آدمی ہوں۔ اور پھر اب جذبات کی رو میں کس کے لیے بہوں گا؟ جب تم ہی بدل گئی ہو تو میرے لیے سب کچھ بدل گیا ہے لیکن میں تمھارے گھر نہیں آسکوں گا نہ میں تم کو اپنے ٹھکانے پر بلانا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ جو بھی جگہ تجویز کرو۔ میں وہاں پہنچنے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں ہر وقت نادیدہ محافظوں کے حصار میں رہتی ہوں۔ مجھے خود علم نہیں ہوتا کہ ان کی تعداد کتنی ہوتی ہے اور وہ مجھے کہاں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ گھر سے باہر وہ لوگ مجھے تم سے ملتے ہوئے دیکھیں۔ میں ان سے واقف نہیں ہوں اس لیے نہ انھیں روک سکتی ہوں، نہ انھیں جل دے سکتی ہوں۔"

"اوہ! تو اپنی نئی نئی ازدواجی زندگی قید میں بسر کر رہی ہو۔" میرا لہجہ خود بخود استہزائیہ ہو گیا۔

"قید نہیں حفاظت کہو۔" اس نے میری تصحیح کی۔ "پاکستان آکر بھی میں نے بُرا وقت دیکھا ہے۔ اسی کے سدِباب کے لیے انھوں نے محافظ رکھے ہوئے ہیں تاکہ میں بے خوف و خطر نقل و حرکت کر سکوں۔"

"یہ سب الفاظ کا ہیر پھیر ہے۔ ورنہ بات ایک ہی ہے مجھے تو شبہ ہے کہ کہیں تمھارا فون بھی ٹیپ نہ کیا جاتا ہو تاکہ تمھارے دلدار صاحب گھر پر نہ رہتے ہوئے بھی تمھاری ایک ایک لمحے کی مصروفیات سے باخبر رہ سکیں۔ کیا انھیں علم ہے کہ جو شادی تم نے ان کے ساتھ کی ہے اس کا وعدہ کسی اور سے کیا ہوا تھا؟"

"خدا کے لیے ڈینی، یوں طنز کے تیر نہ چلاؤ۔" اس کی آواز روہانسی ہو گئی۔ "تمھیں معلوم ہے کہ میں پہلے ہی بہت دکھی ہوں۔ اگر تمھیں سارے حالات کا علم ہوتا تو تمھیں ماننا پڑتا کہ میرے پاس اس فیصلے کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔"

"وہی تو جاننے کے لیے تمھیں ملاقات کی زحمت دے رہا ہوں۔ کاؤنٹری سے بدتر حالات تو یقیناً کہیں بھی نہ رہے ہوں گے۔"

"اچھا تو میں دس منٹ میں ہالیڈے اِن پہنچ رہی ہوں۔ اسی کے ریستوران میں ملاقات ہو گی۔" اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"لیکن یہ یاد رکھنا کہ میرے اردگرد میرے کچھ نگران بھی ہوں گے جو مجھے کسی طرح جواب دہ نہیں ہیں۔"

"تم نے میری بات مان لی ہے۔ میں تمھاری شرائط کا احترام کروں گا۔" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ریسیور رکھتے ہی انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف جہانگیر لائن پر تھا۔

"فون پر کس سے اتنی لمبی بات ہو رہی تھی؟" اس کی چہکتی ہوئی آواز ابھری۔

"غزالہ سے بات کر رہا تھا۔" جواب دیتے ہوئے شکست کے احساس نے میرے حلق میں تلخی سی گھلنے لگی۔ "اچھا ہوا کہ تم نے بات کر لی۔ مجھے تمھاری گاڑی درکار ہو گی۔ دس منٹ میں ہالیڈے اِن پہنچنا ہے۔"

"میں ابھی ڈرائیور سے کہے دیتا ہوں۔ چاہو تو میں لیے چلتا ہوں۔" اس نے پیشکش کی۔

"میں اس سے تنہائی میں دو ٹوک باتیں کرنا چاہتا ہوں سلطان بھی یہیں رُکے گا۔"

"جاؤ، میں تمھاری گُم شدہ محبت کی بازیابی کے لیے دُعاگو رہوں گا۔" وہ پورے پس منظر سے بے خبر تھا اس لیے اس خواہش کا اظہار کر رہا تھا۔ اسے صرف اتنا ہی معلوم تھا جتنا سلمیٰ نے مجھے بتایا تھا۔ اگر سلطان شاہ کی دریافت کی ہوئی باتیں اس کے علم میں بھی آجاتیں تو اسے اندازہ ہو جاتا کہ نکاح پینسل کی لکھی ہوئی تحریر نہیں ہوتی جسے آسانی کے ساتھ مٹایا جا سکے۔

میں بستر سے اٹھا تو سلطان شاہ ہمدردانہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میری یک طرفہ گفتگو سن کر وہ بہت کچھ سمجھ چکا تھا اور اس وقت زبان کھولنے کی ہمّت نہیں کر پا رہا تھا لیکن جب میں نے جوتے موزے پہننے کے بعد ایک پستول میں بھرا ہوا میگزین لوڈ کیا تو وہ ضبط نہ کر سکا اور اپنی جگہ چھوڑ کر میرے مقابل آگیا۔ "یہ کہاں لے جا رہے ہو؟" اس نے پستول پر ہاتھ ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

"فکر نہ کرو، یہ غزالہ کے لیے نہیں ہے۔" میں نے پستول اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "لیکن اس کا ساتھ لے جانا ضروری ہے۔ غزالہ کے شوہر نے اس کی نگرانی کے لیے کچھ لوگ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی طرف سے کوئی مداخلت ہوئی تو شاید اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ میرا تصادم میں پہل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"یہ تو خطرناک صورتِ حال ہے۔ میرا بھی ساتھ چلنا ضروری نظر آرہا ہے۔" اس نے پستول چھوڑ دیا۔ "تم اندر جا کر غزالہ کے ساتھ گفتگو میں منہمک ہو جاؤ گے۔ تمھارے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوگا اور وہ لوگ خاموشی سے تمھارے گرد گھیرا ڈال لیں گے۔ ان کے عزائم خطرناک ہوئے تو کہیں سے بھی چلائی جانے والی ایک نادیدہ گولی تمھارا کام کر جائے گی اور تمھیں اپنے پاس موجود پستول کو چھیڑنے تک کی مہلت نہیں مل سکے گی۔ میں تمھارے ساتھ چلوں گا تاکہ باہر رہ کر تمھارے گرد و پیش پر نظر رکھ سکوں۔"

اس کی دلیل وزنی اور معقول تھی۔ "پھر جہانگیر کو بھی ساتھ لینا پڑے گا، ورنہ وہ بُرا مان جائے گا۔ اس نے خود ساتھ چلنے کی پیشکش کی تھی۔ وہ بھی تمھارے ساتھ باہر رکا رہے گا۔"

میری رضامندی پاتے ہی سلطان شاہ فوراً میرے ساتھ ہو لیا۔ ہم راستے میں ہی تھے کہ جہانگیر بھی مل گیا۔ "ڈرائیور نے گاڑی نکال لی ہے۔ ذرا جلدی واپس لوٹنے کی کوشش کرنا۔ ذہن تمھاری طرف لگا رہے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ تم بھی ساتھ چلو، ڈرائیور کو چھوڑ دیتے ہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

اس کی آنکھوں سے حیرت جھانکنے لگی۔ "خیریت تو ہے؟ ابھی منع کر دیا تھا، اب ساتھ لے جا رہے ہو۔ کیا کوئی لمبا چکر ہے؟"

"آجاؤ، راستے میں بتاؤں گا۔" میں نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور وہ سر جھٹک کر اندر چلا گیا۔ ہم پھر دونوں ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔

"جہانگیر کو دلدار سے غزالہ کی شادی کے واقعے کی ہَوا بھی نہیں لگنا چاہیے۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں سلطان شاہ کو ہدایت کی۔ "میں اسے صرف اتنا بتاؤں گا کہ اس کے کسی ہمدرد نے اس کی حفاظت پر آدمی مامور کیے ہوئے ہیں جن کی طرف سے کسی کارروائی کا خطرہ پیش آسکتا ہے۔ اس لیے میں تم دونوں کو ساتھ لیے جا رہا ہوں۔"

اسی اثنا میں جہانگیر کے ساتھ سلمیٰ بھی آگئی اور مجھے دیکھ کر دور ہی سے بولی۔ "کمال ہے کہ تم نے اتنی جلدی غزالہ کا سراغ لگا لیا اور ہمیں اس کی ہَوا بھی نہیں لگنے دی۔ کہاں ہے وہ اور کس حال میں ہے؟"

"ملاقات ہو گی تو تفصیل کا علم ہو گا۔" میں نے براہِ راست اس کی طرف دیکھے بغیر سرسری لہجے میں کہا۔ "وہ کسی کے ساتھ رہ رہی ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ ان دونوں میں تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔" جہانگیر سے غزالہ کی شادی چھپانے کا واحد مقصد یہ تھا کہ اس اعتراف کے بعد میں سلمیٰ کی نظروں میں شرمسار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

"دیکھا، میں غلط نہیں کہہ رہی تھی۔" اسے بولنے کا موقع بہرحال مل گیا تھا۔ "جا ہی رہے ہو تو میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ تمھارے مقابلے میں میں اسے اچھی طرح کرید سکوں گی کیونکہ میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔"

"معاملات کچھ اُلجھے ہوئے ہیں۔ تمھارا ساتھ جانا مناسب نہیں۔" میرے جواب دینے سے قبل جہانگیر نے اسے نرمی سے منع کر دیا۔ "بات صاف ہو جائے تو جب چاہو اس سے مل لینا۔ اس وقت ڈینی کو اس سے اکیلے ہی ملنے دو۔"

"اکیلے!" اس نے استہزائیہ لہجے میں دہرایا۔ "پھر تم دونوں کہاں جا رہے ہو؟" اس نے میری اور سلطان شاہ کی طرف اشارہ کیا۔

"ارے بابا، ہم باہر ہی رُکے رہیں گے۔" جہانگیر بے بسی کے ساتھ بولا۔ "میں ڈرائیونگ کروں گا۔ سلطان مدد کے لیے ساتھ رہے گا۔ ڈینی کی طبیعت اس قابل نہیں ہے لیکن یہ اسی وقت غزالہ سے ملنے پر مصر ہے۔"

وہ خاموش ہو گئی لیکن اس کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جہانگیر کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی ہے۔

"سلمیٰ کو تو میں نے چُپ کرا دیا تھا، لیکن میں خود ابھی تک اُلجھن میں ہوں۔ جلدی سے بتا ڈالو کہ معاملہ کیا ہے؟" جہانگیر نے کار گیٹ سے نکالتے ہی اُلجھن آمیز لہجے میں سوال کر ڈالا۔

"وہ کسی کے ساتھ رہ رہی ہے۔" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان دونوں کے مراسم کی کیا نوعیت ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اسے بلیک میل نہ کیا جا رہا ہو۔ ایسا ہوا تو غزالہ کی نگرانی بھی کی جا رہی ہو گی۔ تم دونوں کو باہر رُک کر مشتبہ افراد پر نگاہ رکھنا ہو گی کیونکہ غزالہ اپنے ساتھی کے علم میں لائے بغیر مجھ سے ملنے آرہی ہے۔"

"سمجھا!" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "تم مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہو، لیکن پھر بھی اتنا بتا دوں کہ اس سے ملتے ہوئے اپنے دل و دماغ پر قابو رکھنا۔ رقابت کی آگ بھڑک اٹھے تو مضبوط سے مضبوط آدمی کی عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں۔"

"اسی لیے میں نہتا جا رہا ہوں۔" میں نے اپنا لوڈ کیا ہوا پستول جیب سے نکال کر اس کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "تم بھی شدید ضرورت کے بغیر اسے استعمال نہ کرنا۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہی، ہم کسی صحیح فیصلے پر پہنچ سکیں گے۔"

ہالیڈے اِن تک ہمارا سفر مشوروں اور قیاس آرائیوں کے درمیان طے ہوا پھر میرے مشورے پر جہانگیر نے کار اندر لے جائے بغیر مجھے سروس لین میں اتار دیا اور کار آگے بڑھا لے گیا تاکہ لمبا چکر کاٹ کر کار اندر کسی مناسب جگہ پارک کر سکے۔

میں خوب صورت برآمدے سے گزر کر اندر داخل ہوا تو براہِ راست میری نظریں غزالہ پر پڑیں جو مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی۔ وہ داخلی دروازے کی طرف نگراں تھی اس لیے اس نے بھی

فوراً ہی مجھے دیکھ لیا۔ اضطراری طور پر اس نے کرسی پر پہلو بدلا تھا لیکن پھر میری پیشوائی کے لیے اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میرے بارے میں وہ کوئی اٹل فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔ پرانے تعلق کے حوالے سے اس کے وجود میں ایک شدید کشمکش جاری تھی جس پر غالب آنا اس کے لیے دشوار نظر آ رہا۔

ترشے ہوئے خوب صورت بالوں اور تر و تازہ چہرے کے ساتھ وہ آسمان سے اتری ہوئی کوئی حسین حور نظر آ رہی تھی۔ اس کے بدن پر گلابی سلک کا وہی نرم اور لچکیلا سوٹ موجود تھا جس میں ملبوس وہ تھوڑی دیر قبل نظر آئی تھی۔

"وعدے کی پاسداری کا شکریہ مسٹر دلدار!" قریب پہنچ کر میں نے اس کے مقابل کرسی سنبھالتے ہوئے آہستگی کے ساتھ کہا۔ اسے اپنے روبرو پا کر میرے دل و دماغ میں محبت، اپنائیت، نفرت اور خلش کی ایک ہولناک آگ بھڑک اٹھی تھی جس کی ہلکی سی کسک میرے لہجے میں بھی جھلک آئی تھی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا جن میں میرے لیے ہمدردانہ جذبات نمایاں تھے۔ لمحہ بھر کے لیے ہماری نگاہیں چار ہوئیں پھر اس نے میری شکایتی نظروں کی تاب نہ لا کر پلکیں جھپکاتے ہوئے سر جھکا لیا۔

"تم نے بلایا تھا، میں آ گئی ہوں لیکن ہمارا زیادہ دیر تک یوں مل بیٹھنا مناسب نہ ہو گا۔"

"مل بیٹھنے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے تم نے۔ لیکن میں تمہارے اس فیصلے کا سبب ضرور جاننا چاہتا ہوں۔"

"سبب بتانے کی ضرورت تو نہیں ہونی چاہیے۔" وہ مجھ سے نظریں چرا کر میرے لیے چائے بناتے ہوئے بولی "جب تم نے میرا سراغ لگا لیا ہے تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہو گا کہ ممی اور ڈیڈی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

"تمہاری تلاش میں نکلنے سے پہلے میں وہ سب دیکھ چکا تھا۔ وہ واقعہ جس طرح ہوا اس پر آج بھی میرا دل اداس ہے لیکن کسی کے بھی ماں باپ ساری عمر ساتھ نہیں دیتے۔ ان کے نہ ہونے کا تمہارے فیصلوں پر کیا اثر پڑ سکتا تھا؟"

"شاید تمہیں سمجھانا دشوار ہو۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ اس نے چائے کی پیالی اٹھا کر مجھے دی۔ اس سے چائے لیتے ہوئے ہماری انگلیاں ایک دوسرے سے مس ہوئیں۔ میرے پورے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ غزالہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور اس نے ہڑبڑا کر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اگر میں پیالی نہ تھام چکا ہوتا تو اس کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی، گرنے والی چائے ہمارے کپڑے خراب کر دیتی۔

وہ بہت خطرناک کھیل تھا۔ غزالہ پرائی ہو چکی تھی، میں اپنی محرومی پر سلگ رہا تھا۔ آگ اور تیل کی اس یکجائی میں ایسے شعلے بھی بھڑک سکتے تھے جو ہم دونوں کو خاکستر کر دیتے۔ وہ اس صورتحال کو خوب سمجھ رہی تھی اسی لیے کسی بھڑکے ہوئے غزال کی طرح ہر لمحے چوکنا اور ہوشیار نظر آ رہی تھی۔ اس کا لمس تو آتش انگیز تھا ہی لیکن وہ زبان یا نگاہوں سے بھی کسی حوصلہ افزائی پر آمادہ نہیں تھی۔ ہاتھ پیچھے کھینچتے ہی وہ یک بیک اپنی کرسی میں یوں سمٹ گئی جیسے مجھ سے خوف زدہ ہو گئی ہو لیکن میں جانتا تھا کہ وہ میرا خوف نہیں تھا۔ میرا خیال اس کے دل میں زندہ تھا اور وہ اپنے من کے اس چور سے ڈر رہی تھی جو موقع پا کر اسے کسی لغزش پر اکسا سکتا تھا۔

"انگلینڈ میں اپنی عزت اور زندگی کے تحفظ کے لیے میں نے خون کا سمندر عبور کیا ہے۔" چند ثانیوں کی خاموشی اور چند گہرے گہرے سانسوں کے بعد وہ بولی "میں ہر طرف بکھرے ہوئے زہریلے کانٹوں سے اپنا دامن بچائے رکھنے کی کوشش میں نجانے کتنی بار خود بھی لہولہان ہوئی۔ ہر موڑ پر مجھے تمہارا انتظار رہا، میں کسی مضبوط سہارے کے لیے ترستی رہی لیکن تم شاید مجھ سے بہت دور کہیں اپنی انا کی کوئی خوف ناک جنگ لڑ رہے تھے۔ تمہاری یاد کو اپنے سینے سے لگائے میں نے اپنی ناقابلِ تصور جدوجہد جاری رکھی اور کچھ عرصے پہلے انگلینڈ میں اپنے خون کے پیاسوں کو چکما دے کر پاکستان آنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہاں گھر گئی تو وہ برباد ہو چکا تھا۔ مجھے یہ تک نہ معلوم ہو سکا کہ میرے ماں باپ کی قبریں شہر کے کس کونے میں ہیں، نہ تمہارا کوئی پتا تھا۔ میں دو دن تک میوہ شاہ قبرستان میں بھوکی پیاسی ان بے نام قبروں سے لپٹ لپٹ کر روتی رہی جن پر کوئی کتبہ نہیں تھا۔ زمین میرے ماں باپ کو نگل چکی تھی اور میں انسانوں کے اس جنگل میں بالکل...... بے یار و مددگار رہ گئی تھی۔" اس مقام پر اس کی آواز بھرانے لگی اور گزرے ہوئے دنوں کی یاد میں اس کی آنکھوں کے گوشے نمناک ہو گئے۔ اس نے خاموش ہو کر اپنے بیگ میں سے رومال نکالا اور میں نے اضطراب کے عالم میں اپنے لیے سگریٹ سلگا لی۔

اس کی کہانی واقعی دردناک تھی۔ وہ محض اپنے عزم اور حوصلے کی وجہ سے زندہ تھی ورنہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو ان بدترین حالات سے دہشت زدہ ہو کر کبھی کی خودکشی کر چکی ہوتی۔ اس کی گفتگو میں محو ہو کر میں لمحاتی طور پر یہ فراموش کر بیٹھا تھا کہ وہ کسی اور کی ہو چکی تھی۔ اس وقت وہ مجھے اپنی وہی معصوم سی غزالہ نظر آ رہی تھی جس کے ساتھ میں نے بارہا اپنا چھوٹا سا گھر بسانے کے ارمان انگیز منصوبے بنائے تھے۔ وہ میری چاہت، محبت اور رفاقت ہی نہیں تھی بلکہ میری غم گسار اور رازداں بھی تھی۔ اس کے مشوروں نے بارہا خطرناک مواقع پر میری رہنمائی کی تھی۔ پاکستان میں شی کی بنیادوں کو ہلانے میں اس نے میرے ساتھ شانہ بشانہ کام کیا تھا اور ہمیشہ احسان مندی کے جذبے کے ساتھ میرے ہی گن گاتی رہتی تھی۔

"پورے شہر میں صرف ایک ہستی رہ گئی تھی جسے میں اپنا سمجھ سکتی تھی لیکن اس کے بارے میں میں زیادہ پُریقین نہیں تھی کیوں کہ تمہارے لاپتا ہو جانے کے بعد کامران کے علاج کے خطیر اخراجات ادا کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہیں اسپتال والوں نے اسے لاوارث قرار دے کر باہر نہ نکال دیا ہو اور وہ شہر میں بچوں سے پتھر اور گالیاں نہ کھاتا پھر رہا ہو۔ خود پر قابو پا لینے کے بعد اس نے خود بخود بولنا شروع کر دیا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ پوری کہانی اپنے سینے میں دفن کیے بیٹھی رہی ہو اور مجھے سب کچھ سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہی ہو۔

"لیکن امید اور سہارے کی بس وہ ایک کرن رہ گئی تھی۔ جب تک عورت کے سر پر کسی مرد کا سایہ نہ ہو، وہ ہمارے بدنصیب معاشرے میں عزت کی زندگی نہیں گزار سکتی۔ میرے ذہن میں اس وقت بھولے سے بھی شادی کا کوئی خیال نہیں آیا۔ بس ایک ہی دھن سوار ہو گئی کہ کامران کو تلاش کروں۔ وہ پاگل تھا لیکن اسی کے ساتھ میرا بھائی اور ایک مرد تھا۔ میں اسپتال پہنچی تو مجھ پہ شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ کامران اسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ وہ پہلے سے بہت بہتر تھا لیکن مجھے نہ پہچان سکا۔ شہر کا کوئی گمنام مخیر شخص سامنے آئے بغیر اسپتال کو علاج کے اخراجات ادا کر رہا تھا۔ ڈاکٹروں کی رائے میں کامران کا علاج مکمل ہو چکا تھا اور ضرورت اس بات کی تھی کہ اسے معاشرے میں واپس لوٹ کر روزمرہ کے معمولات میں بھرپور شرکت کا موقع دیا جائے۔ اسی طرح اس کی ماضی کی گمشدہ یادیں واپس لوٹ سکتی تھیں۔ ان دنوں وہ ماضی سے کٹا ہوا ایک صحت مند انسان تھا۔ اس نے خوش دلی سے میرے دعوے کو تسلیم کر لیا لیکن اس فطری محبت کا اظہار نہ کر سکا جو کھوئے ہوئے بھائی بہن کے درمیان پہلی ملاقات پر دیکھنے میں آتی ہے۔ چند روز میں کسی ٹھکانے کا بندوبست کر کے اسے اسپتال سے چھٹی ملنے کا ارادہ کر کے میں اپنے خیالوں میں گم اسپتال سے نکل کر ایک ٹیکسی میں سوار ہوئی تو مجھ پر ایک قیامت گزر گئی۔ میں سیٹ پر بیٹھے ہی بیٹھے بے ہوش ہو گئی اور جب آنکھ کھلی تو ایک تہہ خانے میں تین بدمعاشوں کے رحم و کرم پر تھی۔ ان کے مکروہ عزائم ان کی بگڑی ہوئی صورتوں اور شیطانی آنکھوں سے بالکل واضح تھے۔ انھوں نے باتوں ہی باتوں میں موت کا خوف دلا کر مجھے شیشے میں اتارنا چاہا اور مجھے آخری سانس تک مزاحمت پر آمادہ دیکھ کر ان درندوں نے مجھ پر یلغار کر دی۔ وہ میری زندگی کے بدترین اور ڈراؤنے لمحات تھے۔ جس ذلت سے میں ساری زندگی بچتی چلی آئی تھی اس روز وہ میری پیشانی کی سیاہی بنتی ہوئی نظر آ رہی تھی کہ اچانک میری چیخوں میں کسی کی مردانہ للکار سنائی دی۔ باہر کی فضا میں چند گولیاں چلنے کی آواز آئی اور وہ تینوں بری طرح خوف زدہ ہو گئے۔ وہ ہاتھ آیا ہوا شکار چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے لیکن کوئی نامعلوم شخص موت بن کر ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ انھوں نے چیخیں روکنے کے لیے میرا منہ بند کرنا چاہا لیکن میں نے دانتوں اور ناخنوں سے انھیں نوچ کر رکھ دیا۔ مدد کی امید پیدا ہوتے ہی میرے بدن میں لڑ مرنے کی ایک نئی قوت بیدار ہو گئی تھی۔" جھیل جیسی گہری آنکھیں خلا میں کسی نقطے پر مرکوز کیے وہ اس انہماک سے اپنی کہانی سُنا رہی تھی جیسے گزرے ہوئے واقعات اس کے سامنے فلم کی طرح گزر رہے ہوں اور میں مبہوت بیٹھا وہ داستان سن رہا تھا جو شاید میرے حالات سے بھی زیادہ دردناک تھی۔

"آخر کار وہ تینوں مجھے چھوڑ کر فرار ہونے لگے۔ میں بھی ان کے پیچھے تہ خانے سے نکلی تو خود کو ایک ویران عمارت کے کھلے ہوئے اور اجاڑ احاطے میں پایا۔ وہ تینوں خودرو جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لے کر کسی طرف بھاگ نکلے اور میں نے اس ویرانے میں ایک سیاہ کار کے باہر ایک شخص کو ریوالور بدست دیکھا تو بے اختیار اسی کی طرف دوڑ پڑی۔ مجھے مکمل تباہی سے بچانے والے اس شخص کا نام دلدار تھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ویران عمارت ایک سرکاری زرعی ادارے کی تھی جس سے کسی زمانے میں وہاں تجرباتی فارم قائم کیا تھا۔ ادارہ ٹوٹنے کے بعد مدت سے وہ عمارت ویران پڑی ہوئی تھی جسے کبھی کبھار جرائم پیشہ افراد اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتے رہتے تھے۔ دلدار اسی علاقے میں زرعی جاگیر کے مالک تھے اور شہر واپس جاتے ہوئے میری چیخیں سن کر وہاں رُک گئے تھے۔"

دلدار کا ذکر آتے ہی غزالہ کی کہانی میں میرا انہماک یکلخت ختم ہو گیا اور اپنائیت کا احساس بھی محرومی کی کسک میں بدل گیا پھر جب اس نے تجرباتی فارم اور زرعی جاگیر کا ذکر کیا تو میرے ذہن میں تنظیم کے مقامی سربراہ راجا سکندر علی کا خیال آ گیا جو غزالہ کے کالج میں انسدادِ منشیات کے ایک مذاکرے میں مہمانِ خصوصی بنا تھا۔ وہیں اس کی تقریر سن کر میں نے اسے پہچانا تھا کیونکہ وہ آواز برسوں سے میرے اعصاب پر حکمرانی کر رہی تھی پھر مجھے علم ہوا کہ

ملیر کے مضافاتی علاقے میں راجا سکندر علی کے باغات "راجا فروٹ فارمز" کے نام موسوم تھے اور وہ عیاشیوں کے لیے اکثر اسی طرف کا رخ کرتا تھا۔ وہ معلومات حاصل ہونے کے بعد میں نے سکندر کو اسی فارم کے کاٹیج میں موت کے گھاٹ اتارا تھا اور غزالہ کو بعد میں شبہ ہو گیا تھا کہ وہ واردات میرے ہی ہاتھوں سرانجام پائی تھی۔

"یہ واقعہ ملیر کے زرعی علاقے میں تو پیش نہیں آیا تھا؟" اپنے شبے کے پیشِ نظر میں نے سوال کیا۔

"تمھیں کیسے معلوم؟" میرے سوال پر وہ حیران رہ گئی۔

"ادھر دلدار کے فروٹ فارمز تو نہیں ہیں؟" میں نے اس کے اثباتی سوال کو نظرانداز کر دیا۔

"فروٹ فارم ہی ہیں۔" وہ بدستور حیران تھی لیکن پھر فوراً ہی وہ بات کی تہ تک پہنچ گئی۔ "شاید تم ماضی کی کچھ کڑیاں اس واقعے سے ملانے کی کوشش کر رہے ہو۔ راجا فروٹ فارمز میں کالج کے مہمانِ خصوصی راجا سکندر علی کے قتل کا قصہ مجھے بھی یاد ہے۔ لیکن دلدار کے والدین نے چالیس سال پہلے وہ باغات قائم کیے تھے۔ جو اسی زمانے سے ان کی ملکیت چلے آ رہے ہیں۔۔۔"

"ظاہر ہے کہ یہ بات تمھیں دلدار نے ہی بتائی ہو گی۔" مجھے غزالہ کی سادہ لوحی پر غصہ آنے لگا تھا۔

"کسی نے بھی بتائی ہو، تمھیں تلخ ہونے کی ضرورت نہیں۔" غزالہ کا لہجہ قدرے بدل گیا۔ "یہ میرے اور ان کے معاملات ہیں۔ جن میں تمھیں دخل انداز ہونے کی ضرورت نہیں، بلاوجہ انھیں میری نظروں سے گرانے کی کوشش نہ کرو۔ میں جانتی ہوں کہ تم زندگی بھر ان کے لیے پسندیدگی کے جذبات نہیں رکھ سکتے لیکن میں اپنے شوہر کو تم سے زیادہ جانتی ہوں۔"

غزالہ دلدار کے بنائے ہوئے مکڑی جیسے جال میں جکڑی ہوئی تھی اور خود ہی اس سحر سے نکلنے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس لیے میں کسی بھی طرح اسے یقین نہیں دلا سکتا تھا کہ کامران کو صرف چارا بنانے کے لیے اسپتال میں زیرِ علاج رکھا گیا تھا تاکہ ہم دونوں میں سے جو بھی واپس لوٹ کر اس سے ملنے کی کوشش کرے اس پر ہاتھ ڈال دیا جائے۔ یہ غزالہ کی بدقسمتی تھی کہ وہ مجھ سے پہلے پاکستان لوٹی اور دلدار کے آدمیوں نے اسے اٹھوا لیا۔ شاید ان لوگوں کے عزائم خطرناک ہی تھے لیکن غزالہ کو دیکھنے کے بعد دلدار کا ارادہ بدل گیا۔ وہ واقعی اس سے دل ہار بیٹھا اس نے مجھے مستقل سوہانِ روح میں مبتلا کرنے کے لیے غزالہ کو اپنے فریب میں پھانسنے کا ارادہ کر لیا اور ملیر کے مضافاتی علاقے میں ایک ڈرامائی صورت پیدا کر کے محسن کے روپ میں غزالہ کے سامنے آ گیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا ہو گا وہ واضح تھا لیکن صحیح نتائج اخذ کرنے کے لیے غزالہ کی پوری کہانی سننا ضروری تھی۔ وہ ویسے بھی دلدار کے خلاف کوئی بات سننے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس لیے وقتی طور پر میں نے اس سے الجھنے کا ارادہ ترک کر دیا تاکہ وہ اپنی بات پوری کر سکے۔ دلدار کے خلاف بھرپور مواد جمع ہو جانے کے بعد میں غزالہ کو کسی بھی طرح قائل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

"مجھے تلخ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے معقول لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "البتہ ان تلخ حقائق کو تسلیم کرنے پر مجھے دقت ضرور لگے گا۔ شاید دلدار کے اسی احسان کے نتیجے میں تم نے کوئی جذباتی فیصلہ کیا ہو گا؟"

"وہ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں تھا۔" وہ نظریں اٹھا کر بولی۔ "اس پُرہول ویرانے میں میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن دلدار بہت عظیم آدمی ہیں۔ میرے تار تار لباس کو دیکھ کر انھوں نے مجھے اپنی کار کی عقبی نشست پر بٹھایا اور اپنے گھر لے آئے وسیع و عریض مکان میں وہ تنہا رہتے تھے۔ میرے لیے انھوں نے ایک ملازمہ سے کپڑے منگوا لیے۔ اس وقت میں ذہنی طور پر تھک چکی تھی، میرے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ تمھارا نام میرے لیے ایک سراب بن کر رہ گیا تھا۔ نہا دھو کر میں نے تنظیم یا کسی گروہ بندی کا ذکر کیے بغیر انھیں اپنی کہانی سنائی۔ جس میں تمھارا بھی ذکر تھا۔ ان کے ہمدردانہ رویے کو دیکھتے ہوئے میں نے ان سے کہا کہ میں جس سے شادی کے خواب دیکھ رہی تھی وہ کمانے کی دُھن میں پردیس جا کر لاپتا ہو گیا ہے اور میں بالکل بے یار و مددگار رہ گئی ہوں۔ اس لیے سہارے کے لیے جلد از جلد کسی ڈھنگ کے آدمی کے ساتھ اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں۔ یہ ان کی نہیں بلکہ میری خواہش تھی۔ میں ان کی عظمت کو سلام کرتی ہوں کہ انھوں نے میرے ماضی کو کریدنے کی کوشش نہیں کی، جو کچھ میں نے بتایا اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا۔ ایک گم شدہ محبوب کے وجود کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا۔ اور خود میرے ساتھ شادی کی پیشکش کر بیٹھے۔ میرے لیے ان کی پیشکش ناقابلِ یقین تھی۔ ساری دنیا کی ٹھوکریں کھانے کے بعد میں اس عزت افزائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں ان کے سینے سے لگ کر بلک کر رو پڑی۔۔۔ پھر بھی میرے ذہن میں تمھارا خیال باقی تھا۔ اگلے روز میں جہانگیر کے پاس گئی، لیکن وہ تمھارے بارے میں ایک لفظ بھی نہ بتا سکا۔ تم خود سوچو کہ اس کے بعد میرے لیے کیا باقی رہ گیا تھا۔ اسی شام ہم دونوں نے سادگی اور خاموشی کے ساتھ شادی کر لی لیکن میں ان غنڈوں کی طرف سے خوفزدہ تھی جن کے عزائم کو دلدار نے ناکام بنایا تھا۔ وہ مجھ پر دوبارہ ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ ان کے خوف سے میں دن میں بھی گھر سے اکیلی نہیں نکلتی تھی۔ میرے خوف کو بھانپتے ہوئے دلدار نے کچھ لوگوں کو ملازم رکھ لیا جو دن رات میری حفاظت پر مامور رہتے ہیں۔ ان جیسا سمجھدار، بُردبار اور عظیم آدمی آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ وہ اس قدر مہربان ہیں کہ انھوں نے چند ہی دنوں میں میرے دل سے تمھیں کھونے کا احساس مٹا دیا ہے۔"

"اس لیے اب میں تمھاری زندگی کا ایک بھولا بسرا خواب بن کر رہ گیا ہوں۔"

"ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ضرور ہو گئے ہیں لیکن تم میری بات کا غلط مفہوم اخذ نہ کرو تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ زندگی میں تم نے بھی مجھے بہت بڑا سہارا دیا تھا۔ ہم نے کافی اچھا وقت ایک ساتھ گزارا ہے لیکن تقدیر کا فیصلہ ہمارے خلاف تھا۔ بدلے ہوئے حالات میں جو کچھ ہوا ہے اس پر مجھے کوئی ملال نہیں ہے اور نہ میں واپس مڑ کر دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر تم میرے مخلص اور ہمدرد دوست ہو تو تمھیں بھی میری کامیاب زندگی کے لیے دعا کرنا چاہیے۔ مجھ میں اب دکھ اٹھانے کا ذرا بھی حوصلہ نہیں رہا۔ ملیر والے ڈراؤنے واقعے کے بعد میں اندر سے بُری طرح ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ہوں۔ دلدار میرا ہاتھ نہ تھام لیتے تو میں خودکشی ہی کر لیتی۔"

"کیا میں یہ سمجھوں کہ تم پرانا تعلق ختم کر کے مجھے ازسرِنو مخلصانہ دوستی کی پیشکش کر رہی ہو؟"

"اب میں اکیلی نہیں رہی ہوں۔ میرے فیصلے دلدار کی پسند اور ناپسند کے تابع ہوتے ہیں۔ میں انھیں بلاکم و کاست سب کچھ بتا دوں گی۔ اگر انھوں نے قبول کیا تو ہم دونوں کے دوستوں میں شامل ہو سکو گے۔ مجھ پر اب تمھارا کوئی قانونی، مذہبی یا اخلاقی حق باقی نہیں رہا ہے جب کہ دلدار میری زندگی کے مالک ہیں۔ جب تمھاری انا تمھیں ان کا مقام تسلیم کرنے سے روک رہی ہے تو ہو سکتا ہے وہ بھی اب میرے نزدیک تمھارا وجود برداشت نہ کر سکیں۔ ان سے اجازت لیے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"شادی سے پہلے تم نے دلدار کو میرے بارے میں کیا بتایا تھا؟" میرے حلق میں تلخی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

"جوانی کی ایک خیال انگیز بھول۔ خوابوں کا ایک روایتی شہزادہ۔" وہ مغموم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "اس کے علاوہ میں اور کیا بتا سکتی تھی۔"

"میرا نام تو بتایا ہو گا تم نے۔" میں اس بارے میں ہر تفصیل جاننے کے لیے مضطرب تھا۔

"نہ میں نے بتایا، نہ انھوں نے جاننے کی ضرورت سمجھی۔ ان کے لیے صرف اتنا جان لینا ہی کافی تھا کہ اس تجربے کی بھٹی سے گزرنے کے باوجود میرا دامن داغ دار نہیں ہوا تھا۔ وہ کردار کی پارسائی کی بڑی قدر کرتے ہیں۔"

"پھر مجھے دلدار کے لیے انجان ہی رہنے دو۔ اس سے میرا کوئی ذکر نہ کرنا۔"

"لیکن یہ یاد رکھنا کہ پھر ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں مل سکیں گے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "ایک طویل لاتعلقی کے بعد آج ہم پہلی اور آخری بار مل رہے ہیں۔ میں صرف اس لیے آ گئی کہ تمھیں بہت کچھ بتانا اور سمجھانا تھا تاکہ لاعلمی یا غلط فہمی میں تم کوئی غلط قدم نہ اٹھا لو۔ اس کے بعد کبھی تم نے ملنا چاہا تو میں تمھیں وقت نہ دے سکوں گی۔ ہمارے راستے بالکل جدا ہو گئے ہیں لیکن تمھیں مجھ سے وعدہ کرنا ہو گا کہ دلدار کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔"

"میں خود بھی تمھیں بھول جانے کی کوشش کروں گا۔ ہم ملتے رہے تو چاہت کی چتا دھیمے دھیمے سلگتی رہے گی۔ اس میں کبھی چنگاریاں بھی بھڑک سکتی ہیں۔ ایک دوسرے سے دور رہ کر ہی شاید ہم دونوں ہی سکون سے رہ سکیں گے۔ میں اگر دوبارہ تم سے ملا تو یقین رکھو کہ میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

"شکریہ ڈینی۔" وہ دل گرفتہ آواز میں بولی۔ "مجھے تم سے یہی امید تھی، تم بھی شریف اور عظیم انسان ہو۔"

چند ثانیوں کے لیے فضا پر بوجھل سکوت طاری ہو گیا۔ غزالہ کے سینے کے زیر و بم سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔ رونا چاہتی تھی لیکن نہیں رو سکتی تھی کیونکہ دلدار کے درمیان میں آتے ہی میں اپنے سے یکایک غیر ہو گیا تھا اور غیروں سے ہر غیرت مند انسان اپنے اندر کے دکھ چھپایا ہی کرتا ہے۔ میں نے ٹھنڈی چائے کی پیالی ایک ہی سانس میں اپنے معدے میں انڈیل لی۔

"کامران کیسا ہے؟" ذاتی گفتگو اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ نہ اس نے اُٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا نہ میں ان لمحوں سے خود دستبردار ہونے پر آمادہ تھا۔ اس لیے میں نے موضوع بدلنے کے لیے وہ سوال کر ڈالا۔ ویسے بھی کامران کی اہمیت اپنی جگہ مسلم تھی کیونکہ میرے نظریے کے مطابق دلدار نے غزالہ کو اپنے ہشت پا چنگل میں بے بس کرنے کے لیے کامران ہی کو چارا بنایا تھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ ہمارے ساتھ ہی رہ رہا ہے لیکن ماضی کے بارے میں اُسے کچھ یاد نہیں۔ ساری یادیں اور واقعات لاشعور کے کسی بند خانے میں دفن ہو کر رہ گئے ہیں۔"

وہ بھاری لہجے میں بولی: "دلدار نے اُسے حقیقی بھائی جیسا پیار دیا ہوا ہے۔"

"خوش نصیب ہے وہ ۔۔ کاش میرے لیے بھی ماضی کو بھلانا اس قدر آسان ہو سکے!

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔"

"ڈینی! زخموں کو نہ کریدو۔" وہ تڑپ کر بولی: "تم تو پھر بھی اپنی مرضی کے مالک ہو۔ میں نے تو اپنا سب کچھ کسی اور کو سونپ کر اُسے اپنا مجازی خدا بنا لیا ہے۔ وہ ماضی صرف تمھارا ہی نہیں میرا بھی تھا۔ اس کے بہتیرے لمحے ایسے بھی گزرے ہیں جو دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں انھیں کبھی نہیں کھرچ سکوں گی۔ جب میں عورت ہو کر ان یادوں سمیت زندہ رہ سکتی ہوں تو تم کیوں نہیں رہ سکتے!"

"مجھ میں اور تم میں فرق ہے مسز دلدار!" میرے تخاطب پر اس کی آنکھوں میں کرب کے سائے لہرا گئے لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی: "تم نے اپنے راستے کا انتخاب خود کیا ہے جب کہ میں اپنا فیصلہ خود نہیں کر سکتا، مجھے بھٹکانے کا فیصلہ بھی تمھارا ہی ہے۔"

"میں چلوں گی ڈینی۔" وہ پرس سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر ٹرے میں ڈالتی ہوئی یکلخت اُٹھ گئی۔ اُس کی آواز فرطِ جذبات سے رندھ گئی تھی: "یہاں رُکی رہی تو تم میرا دل چھلنی کر دو گے حالانکہ تم میری مجبوری اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ دلدار ایک مکمل شوہر ہیں۔ انھوں نے مجھے ذرا بھی شکایت کا موقع نہیں دیا جو کوئی اور خیال دل میں بیدار ہوتا۔ . . ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔"

وہ جانے کے لیے مڑی لیکن میں نے اُسے روک لیا۔

"بس ایک سوال کا جواب اور دیتی جاؤ غزالہ!" میں نے غیر ارادی یا شاید والہانہ طور پر غزالہ کہہ کر پکارا تھا۔ وہ رُک کر میری طرف گھومی تو اُس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی اور فرطِ جذبات سے یاقوتی لبوں کے گوشے ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔

"کیا محبت ایک بار جنم لینے کے بعد مر بھی جایا کرتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"محبت!" وہ آہستگی سے بولی۔ اُس کی آواز میں حسرت اُمڈ آئی تھی: "یہ وہ چراغ ہوتا ہے ڈینی، جو ایک بار جل اُٹھے تو پھر اَمر ہو جاتا ہے۔ محبت تو زندگی بھر کا روگ ہوتی ہے جو قبر کے کیڑے بھی نہیں مٹا سکتے۔"

اُس کی آواز اُس کے سینے میں گھٹ گئی، آنکھوں میں دو شفاف موتی چمکنے لگے اور وہ مزید کچھ کہے بغیر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی نکاسی کے راستے کی طرف بڑھ گئی۔

میں خالی الذہنی کے عالم میں تنہا وہاں کھڑا رہ گیا۔ جاتے جاتے وہ بہت عجیب اور پُرخیال بات کہہ گئی تھی جس کی تاویلیں تلاش کرنے میں پوری زندگی بھی ایک لذت انگیزی کے ساتھ گزاری جا سکتی تھی۔

محبت اگر امر ہوتی ہے تو جس طرح میں اُسے بھولنے پر قادر نہیں تھا، وہ بھی عمر بھر مجھے بھلا نہیں سکتی تھی!

چند ثانیوں کے بعد میں بھی شکستہ قدموں سے غزالہ کے نقوشِ پا پر چل پڑا۔ میرے برآمدے سے اُترتے ہی کہیں سے سلطان شاہ نمودار ہوا اور میرے ساتھ چلتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولا: "بڑی طویل ملاقات رہی تمھاری۔"

"طویل لیکن بے ثمر!" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "دلدار نے اُس کی نفسیاتی کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اُٹھا کر اُس پر اپنی عظمت اور شرافت کا ایسا جادو چلایا ہے کہ وہ اُس کے خلاف ایک لفظ بھی سننے پر آمادہ نہیں۔"

"لیکن تم نے تو اُسے دلدار کے کرتوت بتائے ہوں گے۔"

"اوّل تو ابھی تک سارے قیاسات ہی قیاسات ہیں، میرے پاس اپنے کسی دعوے کا ثبوت نہیں۔ پھر اگر میں اُسے اپنی بات سننے پر مجبور کرتا تو نہ وہ اپنی پوری کہانی سناتی اور نہ یہ ملاقات اتنی دیر جاری رہتی۔ وہ اسی وقت مجھے چھوڑ کر واپس چلی جاتی۔"

"پھر اب جہانگیر کو کیا بتاؤ گے؟" اُس نے سوال کیا۔

"دیکھتے جاؤ، جیسی صورتِ حال ہو گی اسی کے مطابق بات کرنی پڑے گی۔"

جہانگیر گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ "اسکوٹر پر سوار دو افراد اس کی نگرانی کر رہے تھے۔" گاڑی کے حرکت میں آتے ہی جہانگیر نے مجھے مطلع کیا: "وہ دونوں اُس کی مرسڈیز کے پیچھے روانہ ہوئے ہیں۔ انھوں نے ہیلمٹ چڑھائے ہوئے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے اُن میں سے ایک کو پہچان لیا ہے۔"

وہ اطلاع میرے لیے سنسنی خیز تھی: "کون تھا وہ؟"

"لسبیلہ کے علاقے کا ایک مشہور بدمعاش تھا۔ امیر دادا کے نام سے مشہور ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ تمھارے منیجر کے اغوا اور پھر مرمت پر مامور کیے گئے چار افراد میں سے ایک وہ بھی تھا۔ مجھے تو یہ غزالہ والا معاملہ بھی کچھ سنگین ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔"

"معاملہ سنگین ہو چکا ہے مائی ڈیئر!" میں نے ایک فوری فیصلے کے تحت کہا: "غزالہ کو بدترین ڈرامائی حالات سے دوچار کر کے شادی پر مجبور کیا جا چکا ہے۔ اُسے اس چال بازی کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا ہے۔ اس طرح وہ میری رسائی سے نکل چکی ہے۔"

"کون ہے وہ کمینہ شخص، جو ایسے اوچھے وار پر اُتر آیا ہے؟" جہانگیر غصے سے بھڑک اُٹھا۔

"دلدار!" میں نے اختصار سے کہا اور اُس کے منہ سے تحیر آمیز سیٹی کی آواز نکل گئی۔

"جب ہی تم دلدار اور ڈی ڈی میں مشابہت پر غور کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ تم بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہے تھے۔ وہ لوگ تمھیں ہر طرف سے بے بس اور مجبور کر کے سامنے لانا چاہتے ہیں۔ گھر بکوا دیا، کاروبار برباد کر دیا اور اب ایک منظم سازش کے تحت تمھاری محبت پر ڈاکا ڈالا گیا ہے۔ جب ہی امیر دادا اس معاملے میں ملوث ہے۔ وہ شاید درمیانی عرصے میں مستقل طور پر ڈی ڈی کے لیے کام کرتا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے پرانے ساتھی بھی اس کے ساتھ ہی ہوں۔"

"کیوں نہ ڈی ڈی کو ہلاک کر دیا جائے؟" سلطان شاہ نے سفاکانہ لہجے میں تجویز پیش کی۔

"نہیں۔" میں نے مایوسانہ انداز میں سر کو جنبش دے کر کہا: "غزالہ اُسے معصوم اور بے گناہ سمجھتی ہے۔ اُس نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ میں دلدار کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اُسے کوئی اتفاقی حادثہ بھی پیش آ گیا تو غزالہ اسے میری ہی کسی تخریب کاری سے منسوب کرے گی۔ دوم یہ کہ دلدار اگر مشی کا ہی آدمی ہے تو اس پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہو گا۔"

"تم ابھی تک اس کی اصلیت کی طرف سے شبہات میں مبتلا ہو؟" جہانگیر نے حیرت سے کہا: "امیر دادا کے سامنے آنے سے تو یہ بات اب بالکل ہی واضح ہو گئی ہے کہ وہ کون ہے اور اس کے کیا عزائم ہیں۔"

"شبہ نہیں ہے، سلطان شاہ کو خطرات کا احساس دلانا چاہ رہا تھا۔ یہ سمجھ رہا ہے کہ بھرا ہوا پستول لے جا کر، جب چاہے گا، اطمینان سے اسے گولی مار کر بحفاظت واپس لوٹ آئے گا۔"

"پھر تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟" سلطان شاہ نے سوال کیا۔

"اس پر غور کرنا پڑے گا اور کچھ ہو یا نہ ہو ہمیں دلدار کے گھناؤنے کردار کو غزالہ کے سامنے ضرور بے نقاب کرنا ہو گا تاکہ وہ میرے خلاف ہونے والی سازش میں اپنے کردار پہ شرمندہ ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے میرے دل پر بہت گہرا گھاؤ لگایا ہے جو اس کی نظروں میں دلدار کو ذلیل و خوار کر کے کسی حد تک مندمل ہو سکے گا۔"

"مشی تو آکاس بیل کی طرح ہماری زندگیوں میں پیوست ہو کر رہ گئی ہے۔" جہانگیر نے کہا: "اگر تنظیم یہاں اتنی فعّال ہے تو کسی بھی وقت میری خدمات دوبارہ طلب کی جا سکتی ہیں۔"

"یہ شکر کرو کہ آتے ہوئے تم نے مجھے پارکنگ ایریا سے باہر اُتارا تھا اور ہماری واپسی غزالہ کے بعد ہو رہی ہے، ورنہ تمھاری کار کا نمبر ڈی ڈی تک پہنچایا جا سکتا تھا کہ غزالہ سے ملنے والا اس نمبر کی گاڑی میں دیکھا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ چاہتا تو نمبروں کی مدد سے بآسانی تم پر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔"

"لیکن وہ خطرہ تو اب بھی باقی ہے۔" سلطان شاہ نے لقمہ دیا: "امیر دادا ڈی ڈی کو غزالہ کی کسی اجنبی سے ملاقات کی اطلاع دے گا اور وہ اُسے تمھارے بارے میں سب کچھ بتا دے گی۔"

"غزالہ کو میں نے منع کر دیا ہے کہ وہ میرے بارے میں دلدار کو کچھ نہ بتائے۔"

"جب امیر دادا اطلاع دے گا تو غزالہ اس ملاقات سے انکار نہیں کر سکے گی۔"

"وہ میرا کچھ بھی نام بتا سکتی ہے۔ امیر دادا کو میرے نام کا علم تو نہیں ہو سکتا۔"

"بات نہیں بنے گی ڈینی صاحب!" جہانگیر نے کہا۔ "سلطان شاہ صحیح کہہ رہا ہے۔ اِتنی عقل تو دلدار کو بھی ہو گی کہ وہ غزالہ کے اس اہم ملاقاتی کے بارے میں اندازہ لگا سکے جس سے ملنے کے لیے وہ گھر سے رات کو تنہا نکل سکتی ہے۔"

"وہ اُس کا اندازہ ہو گا۔ ہمارے پاس توڑ یہی ہے کہ اُسے میری ہوا بھی نہ لگ سکے۔ مشی والے ابھی تک میری تلاش میں میلان یا وینس میں ہی سرگرداں ہوں گے۔ انھیں خبر ملی کہ دلدار نے کراچی میں میرا سراغ لگا لیا ہے تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے جمی لائیڈ کا منظورِ نظر بن جائے گا۔ وہ لوگ ہر اُس شخص کو تہس نہس کر ڈالیں گے جس کا مجھ سے ذرا بھی تعلق ہو گا۔"

"یار مجھے تو نہ ڈراؤ۔ غزالہ ویسے ہی میرے گھر آ چکی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں پہلے ہی ڈی ڈی کی نگاہوں میں آ چکا ہوں!" جہانگیر نے ہنستے ہوئے خطرے کا اظہار کیا۔ "اور اب تم میرے پاس رہ رہے ہو۔"

"اِس کا امکان نظر نہیں آتا کیونکہ غزالہ کی نگرانی شادی

کے کئی دن بعد شروع کرائی گئی تھی ویسے مجھے جلد از جلد تمھارے گھر کو خیر باد کہنا ہی پڑے گا۔ وہاں میرا گزارا مشکل ہو جائے گا۔"

"بس! بُرا مان گئے۔" اُس نے میرے شانے پر ہاتھ مارا۔ "ارے یار، میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

"مگر میں سنجیدہ ہوں۔ ماضی کی طرح ہماری نقل و حرکت میں سرگرمی آ جائے گی، اسلحہ بھی جمع کرنا پڑے گا۔ یہ باتیں زیادہ دن تک سلمٰی سے پوشیدہ نہیں رکھی جا سکیں گی۔ وہ ویسے ہی کہہ چکی ہے کہ میرے چلے جانے کے بعد سے تمھاری مصروفیات معمول پر آ گئی تھیں۔ میں اُسے کسی طرح مطمئن نہیں کر سکوں گا۔"

"وہ بیوی میری ہے اور اُس سے ڈرتے تم ہو۔" اُس نے قہقہہ لگایا۔ شاید وہ دانستہ میرا ذہن غزالہ کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "مجھے دیکھو، میں کتنی دلیری کے ساتھ اس کے ساتھ گزارا کر رہا ہوں۔"

"اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی یہ ذکر نکال لیا۔ سلمٰی کو معلوم ہے کہ ہم غزالہ سے ملنے کے لیے نکلے تھے۔ اب واپسی پر اسے کیا بتانا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے غزالہ پر ہنسنے کا موقع ملے۔"

"ارے! اب وہ پرائی ہو گئی ہے۔ تم کیوں اس پر دانت لگائے بیٹھے ہو؟ سلمٰی ہنستی ہے تو ہنسا کرے۔ اس میں تم کو کیا ضرورت ہے پریشان ہونے کی؟ وہ تو ویسے بھی غزالہ کو پسند نہیں کرتی تھی۔"

"بات غزالہ کی نہیں میری اپنی ہے۔ میں کل تک اس کا دم بھرتا تھا۔ آج سلمٰی کو علم ہو گا کہ اس نے مجھے چھوڑ کر کسی اور کا گھر آباد کر لیا ہے تو وہ مجھ پر بھی ہنسے گی اور یہ ہتک شاید مجھ سے برداشت نہیں ہو سکے گی۔"

"چلو اسے کچھ بھی نہیں بتائیں گے۔" جہانگیر نے فراخ دلی کے ساتھ کہا۔ "میں اسے منع کر دوں گا کہ وہ غزالہ کے بارے میں تم سے کوئی بات نہ کہے۔ ویسے تم چاہو تو میرے ایک فلیٹ کی چابیاں بھی لے سکتے ہو۔ سلمٰی اس ٹھکانے سے واقف نہیں ہے۔ وہاں تم بے فکری اور آرام کے ساتھ رہ سکو گے۔"

"یہ تجویز بہت مناسب ہے۔" میں فوراً ہی بول پڑا۔ "اس پر تو کل صبح ہی عمل کر لینا چاہیے۔ فلیٹ کس علاقے میں واقع ہے تمھارا؟"

"بہادر آباد کا صاف ستھرا علاقہ ہے۔ شاید شرف آباد کہلاتا ہے۔ میں کبھی کبھی وہاں جاتا رہا ہوں۔ روزمرّہ ضروریات کا سارا ساز و سامان وہاں موجود ہے۔ فون بھی لگا ہوا ہے۔"

میری اور جہانگیر کی دوستی رسمی باتوں کی پابند نہیں تھی۔ وہ بڑے خلوص کے ساتھ کم از کم چند روز کے لیے مجھے اپنا مہمان رکھنا چاہ رہا تھا لیکن میں سلمٰی کے تیوروں سے اچھی طرح واقف تھا۔ جہانگیر اسے منع کر دیتا پھر بھی وہ تنہائی میں موقع پا کر میرے سر پر سوار ہو جاتی اور غزالہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ کر یدلے میں کامیاب ہو جاتی۔ اس کے علاوہ سلطان شاہ کا معاملہ بھی پہلے ہی جہانگیر کے علم میں لا چکا تھا اس لیے میرے اصرار پر وہ اگلے روز میری منتقلی پر آمادہ ہو گیا۔

میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اُتر گیا۔ غزالہ کی شادی کی تصدیق ہو جانے کے بعد مجھے اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس عالم میں سلمٰی کی شوخیوں سے مشتعل ہو کر میں کہیں بہک گیا تو ہمیشہ کے لیے جہانگیر جیسے جگری دوست سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں گے اور میں مراسم کے بارے میں ان دنوں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ غزالہ کو کھوتے ہی میرے دل میں رشتوں کی قدر و قیمت کا احساس یکسر بڑھ گیا تھا۔

❀❀

فلیٹ بہت کشادہ اور آرام دہ تھا۔ اس بلڈنگ کے ...... گراؤنڈ فلور پر دکانیں، پہلی منزل پر کار پارکنگ اور اوپر رہائشی فلیٹ تھے جن میں ہم دوسری منزل پر تھے۔ پارکنگ فلور سے وہ فاصلہ بس چند سیڑھیوں کا تھا۔ جہانگیر نے گارمنٹ فیکٹری جانے سے پہلے خود ہی ہمیں وہاں چھوڑا تھا۔

میرے لیے پچھلا دن خاصا بھاری گزرا تھا۔ طبیعت خراب ہونے کے باوجود مجھے بھاگ دوڑ کرنی پڑ گئی تھی لیکن غزالہ کا معاملہ صاف ہونے کے بعد میری طبیعت پر یاس انگیز سکون طاری ہو گیا تھا۔ میرے برعکس سلطان شاہ مشتعل تھا اور بہت کچھ کر گزرنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے اسے سنبھالا ہوا تھا۔ مجھے کم از کم ایک دو روز مکمل آرام کی ضرورت تھی ورنہ میں خود محسوس کر رہا تھا کہ کہیں میری علالت مجھے لمبی مدت کے لیے ہی نہ لے بیٹھے اور وہ سلطان شاہ کو لگام دیے رکھنے کا ایک معقول جواز تھا۔

"اگر تم کچھ بھی نہیں کرنا چاہتے تو پھر دو ہفتوں کے لیے مجھے چھٹی دے دو۔" میری طرف سے صبر کی مسلسل تلقین سے عاجز آ کر سلطان شاہ نے کہا۔ "مجھے بہت دن ہو گئے ہیں، اس دوران میں گاؤں ہو آؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ اکیلے رہ کر تم زیادہ بہتر اور مثبت انداز میں سوچ کر کچھ فیصلہ کر لو۔"

"ابھی تو پہلا دن بھی نہیں گزرا ہے اور تم پھر ٹک رہے ہو۔ کم از کم مجھے کل تو آرام کرنے دو۔ اس کے بعد کوئی فیصلہ کر لیں گے ویسے میں نے تمھارے لیے ایک اہم کام سوچا ہوا ہے۔"

"تمھیں دیکھ دیکھ کر میں دل ہی دل میں کڑھ رہا ہوں میں

جس قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں وہاں اوّل تو عشق و محبت شجرِ ممنوعہ سمجھے جاتے ہیں۔ کوئی کسی عورت کو نظر بھر کر دیکھ لے تو آناً فاناً میں پہاڑی وادیاں انسانی لہو میں ڈوب جاتی ہیں اور اگر کسی کی عورت بے وفائی کر جائے تو پھر اسے کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑا جاتا۔ یہی تو مرد کی عزت اور غیرت ہوتی ہے۔ اس پر آنچ آ جائے تو پھر مرنے مارنے کے بغیر زندگی بے کیف ہو جاتی ہے۔ پتا نہیں تم نے غزالہ کا روگ کیوں پال لیا ہے؟ اس نے تمھیں چھوڑ دیا ہے، تم اس کے سینے میں چھ گولیاں اتار دیتے، پھر دیکھتے کہ تمھاری خودی کتنی بلند ہو جاتی ہے۔ یوں بستر سے نہ لگے رہتے۔" اس نے میرے نجی مسئلے پر پہلی بار کھل کر اپنے قبائلی انداز میں رائے ظاہر کی۔ "لیکن نہ خود کچھ کرنے پر آمادہ ہو نہ مجھے کرنے دیتے ہو۔"

"غزالہ نہ میری ماں تھی، نہ بہن، نہ بیٹی۔ حد تو یہ ہے کہ وہ میری بیوی تک نہیں بنی تھی۔" اسے سمجھانے کے لیے مجھے مجبوراً اسی کا لب و لہجہ اختیار کرنا پڑا۔ "تم جن خونریزیوں کی بات کر رہے ہو وہ ان ہی چار رشتوں کی خاطر ہوتی ہیں اور شہروں میں بھی ہوتی رہتی ہیں لیکن غزالہ پر میرا کیا زور تھا۔ عشق و محبت تو ویسے بھی ہمارے پورے معاشرے میں شجرِ ممنوعہ ہیں۔ تمھارے فلسفے پر جاؤں تو مجھے خود کو محبت کا مجرم قرار دینا پڑے گا۔ اس لیے ایسے فیصلے بہت دشوار ہوتے ہیں۔ انسانی خون بہا کر پچھتانے سے بہتر ہے کہ اپنے اس اقدام پر پہلے اچھی طرح غور کر لیا جائے۔ ایسی عداوتوں سے نسل در نسل نجانے کتنے لوگ موت کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں۔ صلح اسی وقت ہوتی ہے جب ایک حریف اپنی غلطی یا کمزوری مان کر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو عزت اور غیرت کا مسئلہ بنانے سے بات نہیں بنتی۔ غزالہ اب مجھ سے زیادہ دلدار کی غیرت کا معاملہ ہے۔ میں بغیر سوچے سمجھے اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔"

"پھر مجھے کام بتاؤ!" وہ زچ آ کر مطالبہ کر بیٹھا۔

"دلدار کوئی معزز آدمی نہیں ہے۔ ہمیں جو کچھ معلوم ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شی کی بیرونی منڈیوں کے لیے یہاں سے ہیروئن باہر اسمگل کر رہا ہے۔ تم یہ بھی خبر لائے تھے کہ وہ دوائیں بنانے والے ایک کارخانے کا مالک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بدمعاش اس کارخانے کی آڑ میں بھی کوئی مذموم دھندا کر رہا ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کسی بھی طرح اس کے کارخانے میں ملازمت حاصل کر و تاکہ ہمیں اندر کی خبریں مل سکیں۔ اس کے کچھوں سے واقف ہو کر ہی ہم اسے بے نقاب کر سکیں گے۔ جب تک اس کا کارخانے داری کا بھرم برقرار رہے گا وہ معزز بنا رہے گا اور اسے مجرم ثابت کرنے کی کوششیں رائیگاں جائیں گی۔"

"یہ تو واقعی قرینے کا کام نکالا ہے تم نے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "لیکن وہ چھان بین کیے بغیر کسی کو ملازم نہیں رکھتا ہو گا۔ ایسے لوگ آنکھیں بند کر کے کسی پر اعتماد نہیں کرتے۔"

"میں نہیں چاہتا کہ چھان بین کے نتیجے میں تمھارا مجھ سے کوئی تعلق ثابت ہو۔ اس کے لیے تمھیں کہیں اور ٹھکانا تلاش کرنا پڑے گا۔"

"یہی سب سے آسان صورت ہے۔ میں آج ہی پرانی بستی میں منتقل ہو جاتا ہوں جہاں سے تم نے مجھے نکالا تھا۔ وہاں سب میرے جاننے والے ہیں اور کھل کر میرے حق میں ہر وہ گواہی دیں گے جو میں چاہوں گا۔"

"خیال اچھا ہے لیکن اتنی عجلت مناسب نہیں۔ کم از کم کل تک تمھیں میرے ساتھ ہی رہنا ہو گا اس کے بعد تم باہر اپنا بندوبست کر لینا۔ اس دوران میں میں بھی باہر نکلنے کے قابل ہو جاؤں گا۔"

"میرا تو خیال ہے کہ تم اپنے کام کی ابتدا امیر داد سے کرو۔ اگر وہ ہاتھ آ جائے تو اس سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کے کسی آدمی پر براہِ راست ہاتھ ڈالے بغیر ہم کچھوے کی رفتار سے آگے بڑھتے رہیں گے۔"

حقیقت یہ تھی کہ میں خود بھی ان ہی خطوط پر سوچ رہا تھا کیونکہ ڈی ڈی کے آدمیوں میں اس وقت صرف امیر داد ہی ہمارے سامنے تھا۔ لیکن دقت یہ تھی کہ وہ ہالیڈے اِن میں مجھے غزالہ کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ ایک بار ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ علیحدہ فلیٹ اور فون مل چکا تھا، لہٰذا اخبار میں گمبی گمبی والا اشتہار دے کر مافیا کا سہارا لیا جائے۔ ان سے تعاون کی راہ نکل آنے کے بعد میں ان کے مفادات کے تحفظ کے نام پر ان کے وسائل ڈی ڈی کے خلاف حرکت میں لا سکتا تھا لیکن قباحت یہ تھی کہ پھر مجھے زندگی بھر کے لیے مافیا کی غلامی قبول کرنی پڑ جاتی جو مجھے کسی بھی قیمت پر قبول نہیں تھی۔

دوپہر کے قریب جہانگیر فیکٹری کے اہم کاموں سے فارغ ہو کر ہیں فلیٹ پر چلا آیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ سلطان شاہ شاید موقع کی تلاش میں تھا۔ جوں ہی اسے یہ اندازہ ہوا کہ جہانگیر طویل بیٹھک کے ارادے سے آیا تھا اس نے فوراً ہی مجھ سے باہر جانے کی اجازت طلب کر لی۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ فلیٹ میں آ کر وہ زیادہ خوش نہیں تھا۔

"چلے جاؤ لیکن یہ خیال رکھنا کہ مجھے چھ بجے واپس لوٹنا ہے۔" میرے بجائے جہانگیر نے اسے اجازت دے دی اور وہ خوشی کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہوئے فوراً ہی فلیٹ سے چلا گیا۔

"سلمٰی کو بڑی شدت سے تمھاری تلاش ہے۔" جہانگیر نے بریف کیس کھول کر بلیک لیبل کی سربمہر بوتل نکالتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "رات کو میں نے اسے منع کر دیا تھا کہ تمھارا موڈ خراب ہے اس لیے غزالہ کے بارے میں تم سے کوئی بات نہ کرے کیونکہ تم نے مجھے بھی اپنی ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا پھر صبح تم نے ناشتے کی میز پر اچانک ہی اپنی منتقلی کا اعلان کر کے اس بے چاری کے سارے تجسس کا ستیاناس مار دیا۔ وہ دو مرتبہ فیکٹری فون کر چکی تھی کہ میں نے تم کو کہاں چھوڑا تھا۔"

"تم نے یہاں کا نمبر تو نہیں دیا اسے؟" میں نے بوکھلا کر سوال کیا۔

"ابھی تو اتنا ہی کہا ہے کہ تم ایک اسٹیٹ بروکر کے پاس اترے تھے لیکن اسے نمبر دیے بغیر میری گلو خلاصی نہیں ہوگی۔ اس کی تسلی کے لیے کوئی بھی من گھڑت کہانی بنا لینا۔"

غزالہ سے جب تک میری ملاقات نہیں ہوئی تھی میں نے اس یادگار دن کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ابتدا گلے شکووں سے ہوگی۔ پھر اس کے والدین کے مرگِ ناگہانی کا المناک موضوع آئے گا۔ وہ اپنی بپتا سنائے گی، میں اسے قائل کرنے کے لیے اپنے مصائب کا ذکر کروں گا لیکن اس ملاقات میں کچھ بھی نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے یوں تیور بدلے تھے کہ ہم دونوں کے درمیان ایک خلیج سی حائل ہو گئی تھی جس نے زبانوں پر بھی گویا مہر لگا دی تھی۔ اس نے اپنی مہینوں کی کہانی چند فقروں میں سمو دی اور میں تو اسے اپنے بارے میں کچھ بھی نہ بتا سکا۔ نہ ہی اس نے میرے گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ شاید مجھے اپنے روبرو زندہ سلامت دیکھ کر اس نے یہ فرض کر لیا تھا کہ سب خیریت ہی رہی ہوگی۔

میں نے سوچ لیا کہ جو کچھ میں نے سوچا تھا اور جو سرے سے نہیں ہو سکا تھا اسے ایک کہانی بنا کر سلمٰی کو سنا دوں گا۔ نہ وہ غزالہ کو پسند کرتی تھی نہ غزالہ اسے پسند کرتی تھی اس لیے میں سلمٰی سے جو کچھ بھی کہہ دیتا اس کی کہیں سے تردید ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس طرح سلمٰی کی نظروں میں میرا بھرم بھی قائم رہتا اور جہانگیر کی گلو خلاصی بھی ہو جاتی۔

"چلو یہ جھوٹ بھی بول لوں گا۔" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "یہ بتاؤ کہ کیسی گزر رہی ہے؟"

"اب اچھی گزرنے لگی ہے۔" وہ دو گلاس بناتے ہوئے ہنس کر بولا۔ "بیوی کے لیے شوہر کے معمولات غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ تنظیم کے دنوں میں جب وقت بے وقت کام سے جانا پڑتا تھا تو وہ بھڑکتی تھی اب اپنے مقررہ اوقات میں عیاشی کے لیے غائب ہوتا ہوں تو وہ سمجھتی ہے کہ میں دن بھر گدھے کی طرح کام میں جُتا رہتا ہوں۔"

"اس موضوع پر اب میں خود کو نااہل تصور کرنے لگا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اہلیت بڑھانے کے لیے چاہو تو ایک سیکریٹری دلوا دوں۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "سیلون سے نوجوان اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی ایک کھیپ آئی ہوئی ہے اور سب ہی ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔"

فضا میں ہولے سے گلاس ٹکراتے ہوئے اس نے میرا جام صحت تجویز کیا۔ ہم نے لب تر کیے، میں نے معدہ سیراب کیا اور بولا۔ "ہر چیز سے دل اچاٹ ہو رہا ہے جب تک دلدار سے بدلہ نہ لے لوں چین نہیں آئے گا۔"

"یار ایسی باتیں نہ کرو۔" وہ اپنائیت کے ساتھ بولا۔ "تمھاری اداسی میرے دل پر بھی اثر انداز ہونے لگے گی۔ ویسے میں بھی ایک آدھ دن میں تمھارے لیے کچھ کر دوں گا۔ پرانے لوگوں کی تلاش کا کام تو میں نے آج سے ہی شروع کر دیا ہے۔ بھروسے اور ہمت والا آدمی مل گیا تو امیر داد اکو اس کے گھر سے اٹھوا ہی لوں گا۔"

"ہم دونوں بھی یہی سوچ رہے تھے لیکن اس کا اغوا اسے مروانے سے زیادہ مشکل ثابت ہوگا۔ اسے یہاں تو لایا نہیں جا سکتا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اسے رکھا کہاں جائے گا؟ تشدد کے بغیر شاید وہ زبان نہیں کھولے گا۔"

"یہ میرا کام ہے۔ فیکٹری میں شام کا چوکیدار میرا اپنا آدمی ہے۔ دھندے کے زمانے میں دو خون کر چکا ہے لیکن ریکارڈ بالکل صاف ہے۔ جو کچھ کرنا ہو شام سات بجے سے صبح سات بجے کے درمیان کرنا۔ کسی کے فرشتوں کو بھی ہوا نہ لگ سکے گی۔ ویسے تم اس چکر میں نہ پڑو، یہ کام میں بہتر طریقے سے سر انجام دے سکتا ہوں۔"

"شاید میں تمھیں یہ بتانا بھول گیا کہ دلدار نے بظاہر ایک دوا ساز کارخانہ قائم کیا ہوا ہے!"

"اوہ! یہ میں پہلی بار سن رہا ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ آڑ کے لیے کوئی کاروبار سامنے نہ ہو تو کھل کر عیش و عشرت کی زندگی گزارنی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔"

"مجھے تو شبہ ہے کہ وہ وہاں بھی کوئی گھپلا کر رہا ہوگا ورنہ اس کا کام اتنی خاموشی سے نہ چل رہا ہوتا۔ مجھے حیرت ہے کہ تمھیں یہاں شی کی کسی سرگرمی کا علم ہی نہیں تھا۔"

"ایسا کوئی گھپلا معلوم ہو جائے تو فیکٹری پر چھاپا ڈلوا کر اسے فوری طور پر اسی بہانے سے اندر کرایا جا سکتا ہے۔ فیکٹری میں نے ایک بڑے پولیس افسر سے خریدی ہے جو اس نے اپنے بھتیجے کے نام سے قائم کی ہوئی تھی اس سودے کی وجہ سے ہم دونوں کے درمیان گہری دوستی استوار ہو گئی ہے۔ میں چاہوں تو وہ حیلے بہانوں سے دلدار کو ہراساں بھی کر سکتا ہے لیکن ایسے اوچھے ہتھکنڈوں سے وہ چوکنا ہو جائے گا اور ہم اس پر کبھی ہاتھ نہ ڈال سکیں گے۔"

"اس سے پہلے کہ ہم موڈ میں آئیں اپنی فیکٹری کا پتا اور چوکیدار کو زیر کرنے کا طلسم سمجھا دو، نہ جانے کس وقت ادھر کا رُخ کرنے کی ضرورت پیش آجائے آج کل تو ستارے بھی یاور نہیں رہے ہیں۔"

اس نے بریف کیس سے اپنا بزنس کارڈ نکال کر اس کی پشت پر اردو میں رحیم خان کا نام لکھ کر نیچے اپنے دستخط ثبت کیے اور وہ کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔ "پتا بہت آسان ہے۔ چوکیدار کو صرف کارڈ دے دو گے تو مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ رات کو فیکٹری میں وہ بالکل تنہا ہوتا ہے۔"

"تمھارے کام کرنے کے پرانے انداز اب بھی نہیں بدلے۔" میں نے کارڈ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "تم تو کپڑوں کی آڑ میں کوئی چکر نہیں چلا رہے؟"

"اس قدر کمایا اور اڑایا ہے کہ اب دل میں کوئی حسرت باقی نہیں رہی۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "اب تو کروڑوں کا فائدہ سامنے ہو تو پھر بھی کالے دھندوں کو لات مار دوں گا مجھے اسی کاروبار میں بہت کچھ مل رہا ہے۔ ایمانداری سے کام چل رہا ہو تو بے ایمانی کرنے والے پر ہر طرف سے لعنت برستی ہے۔"

وہ میرا دوست اور مونس و غم خوار تھا اس لیے میں نے اس کی بات پر تنقید کیے بغیر اس کی نیک نفسی کو سراہا لیکن دل میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ہم نے اپنی عملی زندگی میں ایمان کو کتنی سستی جنس بنا لیا تھا کہ جہاں دل چاہا، ایمانداری اور بے ایمانی کی ایک لکیر کھینچ دی جبکہ چوری اور بے ایمانی سے رکھی ہوئی بنیادوں سے کبھی ایمان کی رمق بھی نہیں مل سکتی۔ اس نے میرے ساتھ ہی چرس فروشی کے ابتدائی دور میں تنظیم میں شرکت کی تھی پھر ہیروئن کا دور آیا تو چرس کی جگہ اسے شہر میں متعارف کرانے میں میرے ساتھ جہانگیر کی بھی سر توڑ کوششیں شامل تھیں اس لیے اس کی آمدنی یا بچت کسی بھی طرح ایمانداری کے زمرے میں نہیں آتی تھی لیکن وہ کسی اور کے نہیں بلکہ میرے ہی سامنے ڈنکے کی چوٹ پر خود کو اللہ کی لعنت سے بری قرار دیے جانے والوں میں شمار کر رہا تھا اور یہی حال کم و بیش ہمارے معاشرے میں ہر فرد کا تھا کہ وہ اپنے مفادات کے لیے اخلاق اور مذہب کے ہر ضابطے کو اپنی ضرورت کے مطابق توڑ مروڑ لیتا تھا اور اسے ٹوکنے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔

ہم دونوں تبادلۂ خیال کرتے ہوئے اپنے شغل میں معروف رہے۔ اس دوران میں جہانگیر نے میرے مستقبل کا ذکر بھی چھیڑا جس میں کاروبار اور مستقل آمدنی کے مسائل شامل تھے۔ اس نے مجھے پیشکش کی تھی کہ مجھے اپنے کاروبار میں شریک کرے گا لیکن میں دوستی اور کاروبار کی یکجائی کا قائل نہیں تھا اس لیے اس وقت بھی میں نے اسے صاف بتا دیا کہ فوری طور پر میرا کوئی کام کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اپنی لائی ہوئی رقم کسی بھی بینک میں جمع کرا کے میں اتنا سود حاصل کر سکتا تھا کہ اپنے سارے اخراجات پورے کر کے بھی کافی رقم پس انداز کر سکتا تھا۔

پھر ہماری گفتگو کا رخ باہر کی دنیا میں شی کی تنظیم کی طرف ہو گیا اور میں اسے اپنے ساتھ پیش آنے والے ان چیدہ چیدہ واقعات سے آگاہ کرنے لگا جو خود میرے لیے ناقابل فراموش ثابت ہوئے تھے۔ اسے ابتدا سے ہی زیادہ اُبھرنے کا موقع نہیں ملا تھا اس لیے وہ ساری تفصیلات اس کے لیے ناقابل یقین حد تک سنسنی خیز ثابت ہوئیں۔ اس کی معلومات میں اضافے کی خاطر میں نے پاکستان میں شی کے خفیہ عزائم کا بھی ہلکا سا ذکر کیا جس میں لائیڈز کاٹیج کے زبردست اسلحے خانے کی تباہی کا واقعہ بھی شامل تھا تو وہ حیرت سے اُچھل پڑا کیونکہ لاہور کا وہ ہولناک حادثہ اس کی یادداشت میں تازہ تھا جس کے بارے میں چند روز تک اخبارات میں بہت سا سنسنی خیز مواد چھپتا رہا پھر کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ تحقیقات کا کیا انجام ہوا تھا۔ خود میرا اندازہ تھا کہ لائیڈز کاٹیج کی تباہی شی کے لیے بدترین دھچکا ثابت ہوئی تھی جس کے اثرات سے وہ سنبھل ہی نہ سکی تھی کیونکہ لاہور کا لائیڈز کاٹیج شی کے حقیقی سربراہ جمی لائیڈ کی ملکیت تھا۔ اس عمارت کو عملی طور پر ایک اہم اور ناقابلِ رسائی مقام کا درجہ دے دیا گیا تھا جہاں کے انتظامات میں مقامی انتظامیہ کا کوئی عمل دخل نہیں تھا اور وہ لوگ اس احاطے کے اندر ہر اس لفظ کو قانون بنا دیتے تھے جو اوپر والوں کی طرف سے آتا تھا۔

لیکن اس عمارت کے زیر زمین اسلحہ خانوں کی ہولناک تباہی کے بعد اس امر سے انکار کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی کہ ملک میں غیر قانونی طور پر درآمد کیا جانے والا اسلحہ مذموم مقاصد کے لیے اس ذخیرہ گاہ میں چھپایا گیا تھا۔ ملبے سے ہر قسم کے ٹھوس شواہد دریافت کیے گئے تھے جن کے ذریعے باسانی ان ذرائع کا سراغ لگایا جا سکتا تھا جو ملک میں اسلحے کی ترسیل اور ذخیرہ اندوزی کے ذمے دار تھے۔

شاید یہی سبب تھا کہ اس کے بعد پاکستان میں

شی کی نفری میں قابلِ ذکر کمی کر کے اس کی سرگرمیاں صرف ہیروئن کی برآمد تک محدود کر دی گئی تھیں تاکہ ان کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ موقوف نہ ہونے پائے۔

"لیکن یہاں رہتے ہوئے تو تم نے مجھے ہوا بھی نہ لگنے دی کہ شی کی مخالفت میں تم اس حد تک آگے جاچکے تھے۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"تم تنظیم سے خوفزدہ تھے اس لیے میں تم سے دور ہی رہتا تھا۔ شاید تمہارے لیے یہ انکشاف بھی حیرت ناک ہو کہ جمی لائیڈ کی اکلوتی بیٹی اپنے باپ سے باغی ہو کر میرے ساتھ مل گئی تھی اور وہ اب بھی باغی ہی ہے۔"

"ویرا لائیڈ!" اس نے حیرت سے دُہرایا۔ "تم تیز پی رہے ہو اس لیے آج عالمِ بالا کی خبریں لا رہے ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے جمی لائیڈ نے بذاتِ خود تمھیں اپنے بیوی بچوں سے متعارف کرایا ہو۔"

اور یوں مجھے ویرا کی کہانی دہرانی پڑی جسے سلطان شاہ فرانس اور اٹلی کی سرحد پر چھوڑ آیا تھا۔

ہماری محفل چل ہی رہی تھی کہ پانچ بجے ڈور بیل بجی۔ جہانگیر نے اُٹھ کر احتیاط سے دروازہ کھولا تو باہر سلطان شاہ موجود تھا۔

"میں کچھ کام کر کے آیا ہوں۔" اس نے اندر آکر سنجیدگی کے ساتھ انکشاف کیا۔ "شاید امیر داد کو اسی وقت اٹھوا لیا جاتا لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہ پیدا ہوگا کہ اسے کہاں رکھا جائے گا؟"

"جہانگیر کی فیکٹری سے بہتر جگہ پورے شہر میں نہیں مل سکے گی۔" میں نے کہا۔

"بس تو پھر میں ابھی واپس جاتا ہوں، فیکٹری کا پتا مجھے سمجھا دو۔"

"یہ کام تم تنہا کر لو گے؟" جہانگیر نے بے اعتباری کے ساتھ سوال کیا۔ "یا ہمیں بھی ساتھ چلنا ہوگا؟"

"زیادہ بھیڑ بھاڑ سے کام خراب ہو جائے گا۔ ہمارا اسے دھوکے سے اٹھوانے کا پروگرام ہے لیکن شرط یہی ہے کہ اغوا کے بعد وہ شہر میں زندہ نظر نہیں آنا چاہیے ورنہ میرے مراسم پر خراب اثر پڑے گا۔" سلطان شاہ بولا۔

"تمہارے اس سے کہاں کے مراسم نکل آئے؟" میں نے تحیّر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"میرا ایک گہرا دوست ہے جس کے امیر داد سے بھی مراسم ہیں۔ میں اسی سے ملنے گیا تھا۔ میں نے اسے راضی کر لیا ہے کہ وہ تفریح کے بہانے امیر داد کو گھر سے بلا[ئے] گا پھر ہم دونوں ٹیکسی میں کلوروفارم سنگھا کر اسے بے ہوش [کر] دیں گے مگر امیر داد بہت خطرناک آدمی ہے، اس کارروائی کے بعد اگر اسے زندہ چھوڑا گیا تو وہ میرے دوست کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالے گا۔ اس کی شرط یہی ہے کہ کام ہو جانے کے بعد امیر داد کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔"

"اور اس کام کا معاوضہ کیا دینا ہوگا؟" میں نے سوال کیا۔

"کچھ بھی نہیں!" سلطان شاہ نے وہ انکشاف کر کے ہم دونوں کو حیران کر دیا۔

"دراصل میرے دوست کا علاقہ بھی وہی ہے۔" سلطان شاہ نے وضاحت کی۔ "امیر داد کی موجودگی میں اس کی دال نہیں گلتی۔ اس کا پتا صاف ہو جائے گا تو میرے دوست کو اس علاقے میں بالادستی حاصل ہو جائے گی۔ بس یوں سمجھو کہ ان کی آپس کی مخاصمت سے ہمیں فائدہ ہو رہا ہے ویسے میں اسے کچھ رقم دوں گا تو وہ انکار بھی نہیں کرے گا۔"

"جب ان میں دشمنی ہے تو امیر داد جیسا چالاک آدمی اس کی چال میں کیسے آجائے گا؟"

"بظاہر میرا دوست امیر داد کا مطیع ہے۔ وہ شاید اسے اپنے ہاتھ سے مارنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا اسی لیے اسے ہمارے حوالے کر رہا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ دو طرفہ معاہدہ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" جہانگیر نے کہا۔ "میں پتا سمجھائے دیتا ہوں لیکن یہ خیال رکھنا کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ پروگرام ایسا ہونا چاہیے کہ تم اندھیرا پھیلنے کے بعد فیکٹری پہنچو۔ میں خود وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"ساڑھے سات اور آٹھ بجے کے درمیان شکار وہاں موجود ہوگا۔" سلطان شاہ نے اعتماد سے کہا اور جہانگیر اسے فیکٹری کا محلِ وقوع سمجھانے لگا۔

سلطان شاہ تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر واپس چلا گیا کیونکہ اسے موقع کے لیے کچھ تیاریاں بھی کرنی تھیں۔

"یہ شخص کچھ شیخی خور اور غبی نظر آتا ہے۔" سلطان شاہ کے چلے جانے کے بعد جہانگیر نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "امیر ایک جہاندیدہ اور مکار غنڈا ہے، مجھے یقین نہیں یہ لڑکا اسے اُلّو بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔"

"یہ تمھیں وقت آنے پر پتا چلے گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سلطان شاہ کی لائی ہوئی امید افزا خبر نے میرا دل خوش کر دیا تھا اور مجھے ولدار کا انجام قریب نظر آنے لگا تھا۔

"پتا نہیں، واپسی میں کتنی دیر ہو جائے اس لیے میں ایک گھر کا چکر لگا لیتا ہوں۔ بلکہ تم بھی یہاں پڑے پڑے کیا کرو گے میرے ساتھ ہی چلو۔ گھر سے ہم سیدھے فیکٹری کی طرف نکل جائیں گے۔"

اس وقت میرا سلمیٰ کا سامنا کرنے کا موڈ نہیں تھا لیکن جہانگیر کے اصرار کے سامنے مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے اور پھر میں اس کے ہمراہ اس کے گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

دورانِ سفر میرا ذہن برق رفتاری کے ساتھ امیر داد سے کی جانے والی بازپرس کا خاکہ تیار کرنے میں مصروف تھا۔

سلمیٰ مجھے دیکھتے ہی بھڑک اُٹھی، اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس نے جہانگیر کی موجودگی کی بھی پروا نہیں کی اور تیوریاں چڑھا کر مجھ پر برس پڑی۔

"رات کو ڈیڑھ من کا مُنہ سجا کر واپس آئے اور صبح ناشتے کے بعد اچانک واپس چل دیے تمھیں یہ توفیق بھی نہیں ہوئی کہ کم از کم فون پر ہی مجھے یہ بتا دیتے کہ اب کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

جہانگیر کے لیے سلمیٰ کا وہ طرزِ تخاطب حیران کن ثابت ہوا وہ خجالت آمیز انداز میں یوں میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے میرے بُرا مان جانے سے خائف ہو۔ اس بے چارے کو کیا پتا کہ اس کی غیر حاضری میں سلمیٰ مجھ پر اس سے بھی زیادہ حق جتانے کی کوشش کرتی تھی اور اسی وجہ سے میں بوکھلا کر جہانگیر کے گھر سے فلیٹ کی طرف بھاگا تھا۔

جہانگیر کی توقع کے خلاف میں نے بُرا مانے بغیر مسکرا کر سلمیٰ سے کہا۔ "یہ فہرست مختصر سی ہے۔ تمہاری اطلاع کے لیے اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ اگر تمھیں نہیں تو میں نے جہانگیر کو فون کر کے فیکٹری میں بتا دیا تھا کہ میں کہاں ٹھہرا ہوں۔ یہ اس کا قصور ہے کہ اس نے یہ اطلاع تم تک نہیں پہنچائی۔ اس شہر میں تم لوگوں کے علاوہ میرا اور کون رہ گیا ہے جس پر میں ناز کر سکتا ہوں۔"

"ناز کر سکتا ہوں۔" وہ غصے سے بڑبڑائی۔ "جب تمہاری چہیتی تمھیں اپنا دشمن سمجھتی ہے تو تم کب اپنا دوست سمجھتے ہو گے؟ یہ دوستی ہی کے طریقے ہیں کہ اس سے مل ملا کر ایک لفظ بھی بتائے بغیر مُنہ چھپا کر بھاگ گئے۔"

"غصہ تھوک دو ڈارلنگ!" جہانگیر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "مکان کا بندوبست ہوتے ہی ڈینی نے مجھے فون کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت ہم دونوں ساتھ نظر آرہے ہیں۔ اب اس سے جو چاہو پوچھ سکتی ہو۔"

"تم ٹھیک سمجھی ہو۔" میں نے سلمیٰ سے کہا۔ "میں مُنہ چھپا کر ہی بھاگا تھا۔ اس وقت غصے اور مایوسی کے عالم میں میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اپنی زبان سے کسی کو کیا بتا سکوں گا۔"

"تم لوگ اپنا جھگڑا نمٹاؤ، میں لباس بدل کر آتا ہوں۔" جہانگیر ہم دونوں کو وہاں چھوڑ کر اندر چلا گیا۔

"میں سب سمجھتی ہوں، تم مجھ سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہو۔" تخلیہ ہوتے ہی وہ دھیمے لیکن تلخ لہجے میں بولی۔ "اگر یہیں رک کے رہتے تو میں تمھیں اُبال کر تو نہ کھا جاتی۔ میرے سامنے تم اتنے پارسا بنتے ہو۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہارے گُنوں سے بے خبر ہوں۔"

"میں نے کبھی پارسائی کا دعویٰ نہیں کیا سلمیٰ! اور شاید غزالہ نے مجھے اسی کی سزا دی ہے۔ سارا قصہ یہ ہے کہ جہانگیر اندھی کھوپڑی کا مالک ہے۔ ہماری نیک نیتی کے باوجود اگر اسے ہمارے میل جول پر کسی قسم کا شبہ ہو گیا تو وہ بلا سوچے سمجھے ہم دونوں کو گولی مار دے گا، چاہے بعد میں دس دن تک ہماری لاشوں سے لپٹ کر روتا رہے میں بس ایسی بُری گھڑی سے بھاگتا ہوں، ورنہ تم جیسی خوب صورت اور ذہین عورت کے ساتھ رہ کر تو ذہن سے زنگ صاف ہونے لگتا ہے۔"

حسبِ توقع وہ وار کارگر رہا اور اس کے تیور نرم پڑ گئے۔ "تم اوّل درجے کے جھوٹے اور مکار ہو۔ تمہاری سچی باتوں پر بھی مشکل ہی سے اعتبار آتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ میں اس پرکٹی غزالہ سے کم تر تو نہیں ہوں؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور وہ بے اختیار مسکرا دی اور میں ایک بار پھر اس آفاقی حقیقت کا قائل ہو گیا کہ دنیا کی حسین ترین عورت کے سامنے بھی اس کے حسن اور ذہانت کی فراخ دلی سے تعریف کی جائے تو وہ لمحہ بھر میں احمق اور بے وقوف بن کر رہ جاتی ہے۔ اسے رام کر لینے کی خوشی میں میں نے فوراً ہی سگریٹ سلگا لی۔

"تمہارے سانسوں سے اسکاچ کی بُو آرہی ہے۔" وہ شوخ لہجے میں بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے زیرِ اثر اس وقت سچی سچی باتیں کر رہے ہو۔ یہ بتاؤ کہ تم دونوں اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟"

"جہانگیر میرے فلیٹ پر پہنچا تھا، وہاں سے سیدھے اِدھر آئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور تمہارا ہم زاد کہاں رہ گیا؟" اس نے سلطان شاہ کے بارے میں سوال کیا۔

"ہم دونوں نے الگ الگ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" میں نے وہ بات کہی جو سلمیٰ کو خوش کر سکتی تھی۔ "ایک ساتھ رہ کر وہ بہت تیزی کے ساتھ مجھ پر حاوی ہوتا جارہا تھا۔ میرے بہتیرے معاملات ایسے ہیں جن میں میں کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کر سکتا لیکن وہ ہر بات میں غیر ضروری طور پر ٹانگ اڑانے کا عادی ہوتا جارہا تھا۔"

"خدا کا شکر ہے کہ یہ بات تمہاری سمجھ میں آ گئی۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ "نوکر کتنا ہی عقل مند اور وفادار کیوں نہ ہو، اسے اس کے ٹھکانے پر ہی رکھنا چاہیے۔ زیادہ مُنہ لگانے سے نوکر سر پر سوار ہونے لگتے ہیں۔" لمحہ بھر کے لیے وہ خاموش ہوئی پھر سوال کر بیٹھی۔ "وہ مُنہ چھپا کے بھاگنے والی کیا بات بتا رہے تھے تم؟"

"کل رات میرا موڈ بہت خراب تھا۔ غزالہ سے ملنے کے بعد خود کو بری طرح شکست خوردہ سمجھ رہا تھا اس لیے میں نے جہانگیر سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ اپنے حالات سے بہت پریشان تھی۔ جب کہیں سے میرا سراغ ملنے کی امید باقی نہ رہی تو مجبور ہو کر اس نے ایک شریف آدمی سے شادی کر لی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہیں۔ غزالہ نے مجھے آئندہ ملنے سے بھی منع کر دیا ہے۔"

"اور وہ وعدے، وہ سپنے کیا ہوئے جو تم دونوں نے ایک ساتھ کیے اور دیکھے تھے؟ اس کی آنکھوں میں تو ذرا بھی لحاظ معلوم نہیں ہوتا۔ اگر اس نے کسی مجبوری کے تحت شادی کر ہی لی تھی تو اپنی برسوں پرانی محبت کو تو فراموش نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ چاہتی تو تمہارا دل رکھ سکتی تھی۔ شوہر کے علم میں لائے بغیر تم سے ملتے رہنے کے ہزار طریقے پیدا ہو سکتے تھے۔"

میں خاموش ہی رہا کیونکہ سلمیٰ اور غزالہ میں بنیادی فرق صرف یہی تھا۔ سلمیٰ ساری دنیا کو خوش رکھنے کی قائل تھی اور غزالہ کسی ایک کی ہو کر صرف اسی کو خوش رکھنے والی لڑکی تھی خواہ اس مقصد کی خاطر اسے پوری دنیا سے مخاصمت ہی کیوں نہ مول لینی پڑتی۔

"وہ بہت گھٹیا اور احسان فراموش لڑکی ہے۔" مجھے خاموش پا کر سلمیٰ کو مزید ہرزہ سرائی کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ "میں نے تو جب پہلی بار اسے دیکھا تھا، اسی وقت سے اس کی صورت سے نفرت ہو گئی تھی۔ اب بال کٹوا کر تو وہ بالکل ہی بازاری عورت معلوم ہونے لگی ہے۔ اس دن جہانگیر کو یوں گھور کر دیکھ رہی تھی جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائے گی۔"

وہ شاید کچھ اور بھی کہتی لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ جیسی بھی ہے، اپنے لیے ہے۔ تم اس کی برائیاں گنوا کر خود کو کیوں گناہ گار کر رہی ہو۔ تمہارے کڑھنے سے وہ اپنی اصلاح تو نہیں کر لے گی؟"

"اب وہ ادھر آئی تو دھکے دے کر نکلوا دوں گی۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔ "بڑی ہرجائی عورت ہے۔ تم نے اس کی خاطر نہ جانے کیسی کیسی لڑکیوں کے دل توڑے کہ اس کا دل میلا نہ ہو اور وہ نیا یار ملتے ہی تمہیں بھلا بیٹھی ہے۔"

اس کے الفاظ زہر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے مزید ڈھیل دی گئی تو وہ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اپنی یا غزالہ کی طرف سے اتنا مشتعل کر دے گی کہ سارا موڈ غارت ہو کر رہ جائے گا۔

"تم کھانے اچھے بناتی ہو، اس وقت کیا تیار ہے؟" میں نے اچانک ہی موضوع بدل دیا۔

"بھوک لگ رہی ہو تو دس منٹ میں کھانا تیار کر لوں گی۔ ڈیپ فریزر میں ہر وقت بہت کچھ تیار رہتا ہے۔"

"معدے میں اُتری ہوئی شراب کچھ مانگ رہی ہے۔" میں نے کہا اور وہ 'ابھی آئی' کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔ وہ خود بھی ایک شرابی کی بیوی تھی اس لیے آداب مے نوشی اور اس کے بعد کے لوازمات سے پوری طرح واقف تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ اس طرح غزالہ کو گالیاں دینے کا سلسلہ ترک کر کے وہ وہاں سے چلی گئی تھی اور میرا بھی صرف اتنا ہی مقصد تھا ورنہ مجھے کسی چیز کی ذرا بھی خواہش نہیں تھی۔

وہ خلافِ توقع بہت جلد واپس آ گئی۔ چھوٹی ٹرے میں وہ چند گرم گرم شامی کباب، پنیر کے ٹکڑے اور سنڈوچ کے پارچے لے کر آئی تھی۔ اس کی مستعدی کو سراہتے ہوئے میں نے ایک کباب کچھ پنیر کے ساتھ لے لیا اسی وقت جہانگیر لباس تبدیل کر کے ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے وہاں آ پہنچا۔

"ویری گڈ۔" وہ دور ہی سے مسرت آمیز آواز میں چیخا۔ "تم لوگ تو لڑنے کے بجائے کھانے میں مصروف ہو۔ یہ مصالحت کی بہت اچھی علامت ہے۔ اس خوشی میں مجھے بھی تمہارا ساتھ دینا پڑے گا۔" اس نے براہِ راست پلیٹ سے چٹکی میں پورا کباب اٹھا لیا۔

"لیکن یہ تیاری کدھر کی ہے؟" سلمیٰ نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ ڈینی کے واپس لوٹتے ہی اب تمہارے معمولات پھر بگڑنے لگیں گے۔ تم دونوں یہاں گھر میں کیوں نہیں بیٹھتے؟"

"بتاؤ! اب تم ہی بتاؤ۔" جہانگیر نے مجھ پر آنکھیں نکالیں۔ "میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ ہوٹل کے بجائے شیرا کو میرے گھر یا فلیٹ پر بلا لو لیکن تمہیں ہر بات میں اپنی من مانی کرنے کی عادت ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ سلمیٰ آج رات میرا گھر سے باہر جانا پسند نہیں کرے گی۔"

"شیرا بہت بدنظر آدمی ہے۔ سلمیٰ کی وجہ سے میں نے اسے یہاں نہیں بلایا۔ میرے فلیٹ پر کھانے پکانے کا بندوبست ہونا مشکل تھا کیوں کہ میں بیمار ہوں اور سلطان

اس لیے ہوٹل کی تجویز رکھی تھی۔ سلمیٰ ناراض ہوتی
جا چکا ہے تو تم رک جاؤ، میں شیرا سے کوئی بہانہ کر لوں گا۔ تم سے
وہ پھر کبھی مل لے گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "میں
بلاوجہ اپنا نام بدنام نہیں کرانا چاہتا۔"
اس نے بے خبری میں مجھے اس تنازعے میں پھنسایا
تھا لیکن میرے جواب سے وہ خوش ہو گیا۔ سلمیٰ کی نظریں بچا کر
اس نے اپنی داہنی آنکھ دبا کر پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

"تم دونوں مل جاؤ تو سفید جھوٹ کو بھی سچ ثابت کر سکتے ہو۔" سلمیٰ جہانگیر سے ہی مخاطب تھی۔ "پروگرام پہلے سے طے کر لیا ہے تو چلے جاؤ لیکن یہ خیال رکھنا کہ اپنے قدموں پر چل کر اپنے ہی گھر واپس آؤ۔ بارہ بجے کے بعد میں دروازے اندر سے لاک کر لوں گی جو صبح سے پہلے کسی قیمت نہیں کھلیں گے۔"

جہانگیر کھسیائے ہوئے انداز میں مسکرا کے رہ گیا۔

ہم دونوں ٹشو پیپرز سے تیزی سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے تیزی کے ساتھ باہر نکلتے چلے گئے۔

"یار! تمہاری بیوی تو تم پر بُری طرح حاوی ہو گئی ہے۔" گھر سے نکلنے کے بعد میں نے حیرت سے کہا۔ "میرے جانے سے پہلے تو یہ ایسی نہیں تھی۔ اب تو تم بھی اس سے ڈرنے لگے ہو۔"

"کبھی دن بڑے ہوتے ہیں، کبھی راتیں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "تمہارے سامنے اتنا بول رہی تھی۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو دم بھی نہ مار سکتی تھی۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ جب میں بدمعاشی کرتا تھا تو وہ مجھ سے ڈرتی رہتی تھی۔ جب سے شریفانہ کاروبار شروع ہوا ہے کبھی کبھی وہ داداگیری پر اُتر آتی ہے لیکن گھر میں یہ سب چلتا ہی رہتا ہے۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ "دوسروں کے دانت توڑنے والا بیوی کی دھونس سے ڈرتا ہے۔ یہ رشتہ بھی کس قدر عجیب ہوتا ہے۔ عورت یا لڑکی جب تک دوست رہے کچھ اور ہوتی ہے، بیوی بن کر تو ہر عورت بدل جاتی ہے اور سلمیٰ تو جب چاہتی ہے مجھے بھی بُری طرح رگڑ ڈالتی ہے حالانکہ میں ہمیشہ اس کا لحاظ کرتا ہوں۔"

"اس کی باتوں کا بُرا نہ مانا کرو۔" وہ احمق میری بات کی گہرائی میں جانے کے بجائے میرا بازو سہلاتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "وہ دل کی بُری نہیں ہے۔ تمہیں میرے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتی ہے۔ کبھی کوئی اونگی بات کہہ بھی جائے تو ہنس کر ٹال دیا کرو۔ دراصل وہ بھرے گھر کی بیٹی ہے اور یہاں آ کر میرے ساتھ بالکل تنہا رہ گئی ہے۔ ملازموں میں گھلنے ملنے میں ہتک سمجھتی ہے۔ تم نظر آ جاتے ہو تو اسے بھی دل کی بھڑاس نکال لینے کا موقع مل جاتا ہے۔ غزالہ کے بارے میں کیا پوچھ رہی تھی تم سے؟"

میں نے اس موضوع پر ہونے والی گفتگو اس کے سامنے دُہرا دی۔

"ویسے تمہارا کام خاصا مشکل ہو گیا ہے۔" قدرے توقف کے بعد اُس نے کہا۔ "دلدار کو راہ سے ہٹانے کے ساتھ ہی تمہیں غزالہ کو بھی یہ دکھانا ہے کہ اُس نے عجلت میں ایک مکار اور سازشی شخص کو اپنا شریکِ حیات بنا لیا ہے۔"

"کام بہت آسان ہے۔ ایک بار سرا مل جائے تو پھر میں تم کو تماشا دکھاؤں گا۔ شہر کے کسی پُل سے لٹکی ہوئی امیر دادا کی حسرت زدہ کھوپڑی دلدار کے اوسان خطا کر دے گی۔ یہ اچھا ہوا کہ تم نے اس موذی کو پہچان لیا جو میرے مینیجر اور اس کی فیملی کے قتل میں شریک تھا۔ اب میں نہایت سکون سے اسے ذبح کر دوں گا۔"

"تم نے جمی لائیڈ کی بیٹی ویرا کا ذکر کیا تھا، آج کل وہ کہاں ہے؟" جہانگیر نے چونک کر سوال کیا۔

"فرانس تک ہمارے ساتھ تھی لیکن کسی وجہ سے اٹلی میں داخل نہیں ہو سکی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اب تک میلان پہنچ گئی ہو۔ وہ اس وقت کیوں یاد آ گئی تم کو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تم نے غزالہ کو اپنی اَنا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ کبھی کبھی محبت میں انسان ناکام بھی ہو جاتا ہے۔ اس کے بجائے تم ویرا پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ وہ بھی کافی خوب صورت اور نوجوان ہو گی!"

"ایسی خوب صورت کہ جو دیکھے دیکھتا ہی رہ جائے۔ وہ تو دل سے چاہتی ہے کہ میں غزالہ کو چھوڑ کر اسے اپنا لوں لیکن میں نے ہمیشہ ہی اس سے انکار کیا ہے۔ دراصل وہ بہت آزاد خیال لڑکی ہے۔ عزت اور عصمت کے تصور سے بالکل بے بہرہ ہے۔ لوگوں کو دوست بناتی ہے، ان سے ملتی رہتی ہے اور جب دل بھر جاتا ہے تو اُکتا کر انھیں یکلخت بھول جاتی ہے۔ اس سے دوستی تو رکھی جا سکتی ہے لیکن اسے بیوی کے روپ میں تسلیم کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ جہاں تک غزالہ کا معاملہ ہے، وہ بات ہی کچھ اور ہے۔ اگر وہ اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ کرتی تو میں ٹھنڈے دل سے اسے تسلیم کر لیتا لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اسے ایک منظم سازش کے تحت بدترین صورت حال میں پھنسایا گیا اور پھر ایک فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا گیا جب کہ وہ اب بھی پوری نیک نیتی سے یہی سمجھ رہی ہے کہ اس نے آزادانہ طور پر وہ فیصلہ کیا تھا۔ ایک بار وہ

اپنے فیصلے کی حقیقت جان لے، پھر میں آزاد ہو جاؤں گا۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ وہ مکمل تباہی کے راستے پر چل پڑی ہے۔ اسے بچانا میں اپنا فرض سمجھ رہا ہوں۔ ہوش میں آ کر بھی وہ دلدار سے اپنا رشتہ قائم رکھنا چاہے تو مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ اسے بھی معلوم ہوگا کہ وہ ایک چور، اسمگلر، سازشی اور قاتل کی بیوی ہے۔"

"اسے معلوم ہے کہ تم عزالہ کو چاہتے ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"بہت اچھی طرح۔" میں نے الفاظ پر زور دے کر کہا... "بلکہ دوستی ہونے سے پہلے مجھے زیر کرنے کے لیے شی کی طرف سے اسی نے عزالہ کو اغوا کرا کے انگلینڈ بھیجا تھا۔ اگر دیا نے وہ حرکت نہ کی ہوتی تو شاید اس کے والدین کی موت کے بعد ہی ہم یکجا ہو گئے ہوتے۔"

"اور اس کی دھونس سہ رہے ہوتے۔" اس نے ٹکڑا لگایا۔ "جیسے سلمیٰ موقع پاتے ہی مجھے آنکھیں دکھاتی رہتی ہے۔"

"لیکن وہ تمھیں برداشت کر رہی ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "کوئی بھی نئی دلہن یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے پہلو میں لیٹا ہوا شوہر ایک کال سنتے ہی سر کے بل کسی نامعلوم منزل کی طرف دوڑا چلا جائے اور صبح سویرے واپس لوٹے تو اس قدر تھکا ہارا ہو کہ بستر پر گرتے ہی بیوی کی طرف کروٹ لے کر سو جائے۔"

"یہ تمھیں یقیناً سلمیٰ نے بتایا ہوگا۔" وہ اشتباہ آمیز لہجے میں بولا۔

"نہیں بابا۔" میں بُری طرح بوکھلا گیا۔ "وہ اپنی خواب گاہ کے موضوع پر مجھ سے کوئی بات نہیں کرتی۔ یہ تو میرا قیاس ہے۔"

"تم کنوارے ہو لیکن ایک شادی شدہ جوڑے کے بارے میں تمھارا یہ قیاس سو فیصد درست ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔ "سلمیٰ میری ہر بے اعتدالی برداشت کر لیتی تھی لیکن ایسے معاملات میں کئی کئی دن تک مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی۔"

"قیاس آرائیوں کی بنا پر مجھ میں ایک کامیاب شوہر بننے کے جراثیم موجود ہیں۔" میں نے قہقہہ لگایا۔

ہنستے بولتے ہم سوا سات بجے فیکٹری پہنچ گئے۔ نیشنل ریفائنری کے نواح میں جہانگیر کی گارمنٹ فیکٹری پانچ ایکڑ پر محیط ایک وسیع پلاٹ کے ابتدائی گوشے میں قائم تھی۔ چار دیواری میں آہنی گیٹ پر جے ایس گارمنٹ کا بہت خوب صورت بورڈ لگا ہوا تھا۔ ہارن پہچان کر گیٹ کھولنے والا چھ فٹ سے بھی نکلتے ہوئے قد کا ایک مضبوط پٹھان تھا جس کے کندھے سے لٹکی ہوئی رائفل ایک کھلونا معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے [illegible] فاضل کارتوسوں کی بیلٹ بھی کسی زیور کی طرح سجائی ہوئی تھی۔

"یہی ریشم خان ہے۔" جہانگیر نے میری طرف جھک کر سرگوشی کی جو ان حالات میں قطعی غیر ضروری تھی لیکن مجھے اس بات پہ حیرت ضرور ہوئی کہ اس شخص کا نام اس کے سراپا، جسامت، طاقت اور شاید مزاج سے بالکل متضاد تھا۔ [illegible] نظر دیکھنے کے بعد ہیبت خان ہی مناسب نام نظر آتا تھا، بدقسمتی سے وہ ریشم خان تھا۔

جیسے ہی کار کھلے ہوئے پھاٹک میں سے اندر داخل [illegible] ریشم خان نے کسی مفتوح فوجی کی طرح ہاتھ پیشانی تک لے جا کر [illegible] کیا اور احاطے کی دیوار پر مناسب فاصلوں سے روشن ٹیوب لائٹوں کی روشنی میں مجھے یہ دیکھ کر کوفت ہوئی کہ [illegible] پلاٹ پر پھاٹک کے قریب دس، پندرہ ہزار مربع فٹ پر آر سی سی کا ایک ہال بنا ہوا تھا۔ اسی سے ملحق نیچی چھت والی عمارت تھی اور باقی پلاٹ یوں ہی ویران پڑا ہوا تھا۔

"بس اسی ہال پر گزارہ کر رہے ہو؟ زمین تو بہت بڑی ہے۔" [illegible] نے کار سے اترتے ہوئے کہہ ہی ڈالا۔

"فی الحال یہی کافی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "کام کے اعتبار سے یہ ہال بھی بہت بڑا ہے۔ زمین تو میں نے انوسٹمنٹ کے ارادے سے لے لی تھی۔ [illegible] سکتا ہے کہ میں یہاں ایک آدھ ویونگ اور اسپننگ یونٹ بھی لگا لوں۔ کام میں بالادستی قائم رکھنے کے لیے چھ آٹھ [illegible] پرنٹنگ [illegible] تو ہر حال میں لگانا ہی ہے تاکہ میری فرم اپنے منفرد [illegible] ایکسپورٹ کر سکے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ کپڑے کے تو پیسے ہی نہیں ملتے، ڈیزائن خریدتے ہیں۔"

وہ دفتر کی عمارت میں داخل ہوتے ہی حیرت سے [illegible] پڑا۔ "تمھارے قیاسات اتنے درست ہیں کہ تمھیں [illegible] میں مقدر آزمانا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ گاہک کپڑا بعد [illegible] دیکھتے ہیں، نرم گرم بھی قبول کر لیتے ہیں لیکن ڈیزائن اپنی پسند کا چاہتے ہیں۔ باہر پرنٹنگ کرانے میں ہر وقت یہ دھڑکا [illegible] ہے کہ پارٹی زیادہ معاوضے کے لالچ میں وہی ڈیزائن [illegible] کو نہ چھاپ دے۔"

دفتر کی عمارت میں ذرا بھی شان و شوکت نہیں تھی۔ [illegible] ہال میں نیم چوبی پارٹیشن بنا کر ان پر شفاف شیشے لگا دیے گئے تھے تاکہ کہیں سے بھی بیک وقت سارے عملے کی مصروفیات کا جائزہ لیا جا سکے۔ جہانگیر کا دفتر مضبوط دیواروں کے [illegible] میں تھا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی اس کے سیکریٹری کا کمرا تھا جس سے گزر کر جہانگیر کے دفتر میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ اس کے دفتر کے ایک گوشے میں کوئی سیٹلائٹ اسٹیشن نظر آ رہا تھا۔ جہانگیر نے بتایا کہ اس طرف اس کی اسٹینو بیٹھتی ہے۔ کرسی کے گرد نیم دائرے کی صورت میں بنی ہوئی میز پر الیکٹرانک ٹائپ رائٹر، ٹیلکس مشین، فیکس مشین، فوٹو کاپی مشین سمیت کئی رنگ برنگے فون بھی موجود تھے۔

"تم نے تو بڑے بکھیڑے پھیلائے ہوئے ہیں۔" میں نے اس کی اسٹینو کے مقامِ خاص کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "وڈیو فون ابھی عام نہیں ہوا، اس لیے یہاں نظر نہیں آ رہا۔ کیا کپڑا بیچنے کے لیے واقعی ان چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے؟"

"یہ جدید کاروبار کے لیے ناگزیر ہیں۔ متوقع گاہک خوبصورت اسٹیشنری اور ان لوازمات سے مرعوب ہونے کے بعد نمونے دیکھتے ہیں۔ سلے سلائے کپڑے تو بوہری بازار میں بھی بکتے ہیں لیکن وہ بیچارے پورے سال میں اتنا نہیں کماتے ہوں گے جو میں ایک دن یا محض ایک سودے میں غیر ملکی گاہکوں سے کما لیتا ہوں۔ وہ ہمیں تیسری دنیا کا ایک مفلوک الحال بھکاری سمجھ کر یہاں آتے ہیں اور اُلو کے پٹھے بن کر چلے جاتے ہیں۔ میری اسٹینو اتنی چالاک ہو گئی ہے کہ جب دفتر میں میری کوئی میٹنگ ہو رہی ہو تو ساری مشینیں بیک وقت مصروف ہو جاتی ہیں۔ وہ اتنی ذہین ہو گئی ہے کہ ہماری گفتگو سن کر بعض ایسے فرضی پیغامات بنا لاتی ہے جن کے سہارے میں اپنے حریف کو چاروں شانے چت کر دیتا ہوں۔ آج کاروبار ایک مکمل فن بن گیا ہے۔ اس میں کپڑا یا پرنٹ نہیں بیچا جا سکتا۔"

"سمجھ رہا ہوں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "تمھارے کاروبار کا زیادہ زور اسٹینو پر معلوم ہوتا ہے۔ وہ کون ہے؟ مرد یا عورت؟"

"ایک لڑکی ہے۔" وہ بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ "مردوں کو کسی جگہ اپنی اہمیت کا ذرا بھی احساس ہو جائے تو وقت ناوقت بانگ دینے لگتے ہیں، لڑکیاں پھر بھی کچھ دن چل جاتی ہیں۔"

"وہ کب سے چل رہی ہے؟" میں نے اس کی میز کے مقابل نشست سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

"کئی مہینوں سے!" اس نے بے ساختہ جواب دیا... "سیلونیز ہے۔ شناختی کارڈ بنوا لیا ہے مگر پھر بھی خوف زدہ رہتی ہے۔ وہ بیچاری تو ماما یا آیا کے کام تک کے لیے آمادہ تھی۔ میرے پاس بہت خوش ہے۔"

"اور شاید تم بھی اس سے بہت خوش ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے۔ جب تک توجہ سے کام کرتی رہے گی، میں بھی اس کا خیال رکھوں گا۔"

"وہ تمھارے ساتھ فیصل آباد تو نہیں گئی تھی؟" میں اچانک سوال کر بیٹھا۔

اس کی تیوریاں چڑھ گئیں اور وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ "یہ کمینگی کی انتہا ہے کہ تم میرے ساتھ رہ کر میری ہی ٹوہ میں لگے ہوئے ہو۔ ہاں، وہ میرے ساتھ گئی تھی۔ اسٹینو ہمیشہ اپنے باس کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ چلی گئی تو کون سی قیامت آ گئی؟"

"تم بلاوجہ بھڑک رہے ہو۔" میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ "مجھے خوشی تو یہ ہے کہ تم سلمیٰ سے بُری طرح خوف زدہ نہیں ہو۔ موقع نکال کر اپنا دل بہلانے کی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتے ہو۔"

"کاروبار، کاروبار ہوتا ہے۔" وہ میرے اوپر آنکھیں نکال کر غرّایا۔ "تمھارا مطلب ہے کہ میں اپنی اسٹینو کے ساتھ عیاشی کرتا ہوں؟"

"لو! یہ دیکھ لو۔" میں نے اس کی اسٹینو کی میز سے رائٹنگ پیڈ کا سب سے اوپر والا صفحہ اس کے سامنے رکھ دیا جو تحریروں سے کالا ہو رہا تھا اور جا بجا فیصل آباد کے شب و روز کے بارے میں حقیقی لیکن مہذبانہ شاعری کی گئی تھی۔

"یہ سب بکواس ہے۔" ایک صفحے کے جرم میں جہانگیر نے پورا پیڈ پھاڑتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "یہ لڑکی ملازمت کے قابل نہیں ہے۔ اپنے خوابوں کو لکھنے کے مرض میں مبتلا معلوم ہوتی ہے۔ یہ تو مجھے پورے دفتر میں بدنام کر دے گی۔"

"تو کیا اب نیک نام ہو؟" میں نے آہستگی سے کہا۔

"تم نے میرا موڈ غارت کر دیا ہے۔" وہ چڑچڑے لہجے میں بولا۔ "جانے سے پہلے سلمیٰ کو فکر تھی کہ میں اکیلا فیصل آباد جا رہا تھا یا کسی اور کو بھی ساتھ لے جا رہا تھا۔ اسے جھوٹ سچ بول کر مطمئن کیا تو اب تم تھانے دار بن گئے ہو۔ تمھیں ضرورت کیا تھی پیڈ دیکھنے کی؟"

میں اس کے احمقانہ سوال پر ہنس کر رہ گیا۔ "میں تو اس کی میز اور اس پر سجی ہوئی جدید مواصلاتی مشینوں کو دیکھنے کے لیے ادھر گیا تھا، وہاں یہ پیڈ سامنے ہی پڑا ہوا تھا۔ میں نہ دیکھتا تو صبح دفتر کی صفائی کرنے والا مزے لے کر ان فقروں سے اَن گنت کہانیاں بنانے بیٹھ جاتا۔ تم کسی بھی بات کے اچھے پہلو پر غور نہیں کرتے، بس جذباتی ہو جاتے ہو۔"

"اس دفتر کی دو چابیاں ہیں۔ ایک میرے پاس اور

دوسری جولیا کے پاس ہوتی ہے۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی موجودگی کے بغیر یہ کمرا مقفل ہی رہتا ہے۔ صبح کمرے کی صفائی بھی وہ اپنی نگرانی میں کراتی ہے۔"

"یہ اچھی بات ہے کہ تم معاملے کے ہر پہلو پر نظر رکھتے ہو۔" میں نے شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن بہت شکی مزاج ہو گئے ہو میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ تمھاری بیوی کو تمھارے فیصل آباد کے دورے پر کسی قسم کا کوئی شبہ تھا۔ میں نے پیڈ کا صفحہ دیکھ کر اپنے طور پر مذاق کیا اور تم نے اس کی کڑیاں گھریلو مسائل سے ملا لیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ گرمجوشی کے ساتھ میرا ہاتھ دباتے ہوئے قدرے شرمندگی کے ساتھ بولا۔ "لیکن سلمٰی بہت تیز ہے مجھے شبہ ہوا تھا کہ سیکرٹری کے بارے میں اسی نے تمھارے کان بھرے ہیں۔ مجھے کیا معلوم کہ وہ اُلو کی چرخی یہاں رف پیڈ پر اپنی ڈائری لکھ کر یوں ہی چھوڑ گئی ہو گی۔ تم دیکھنا کہ صبح میں اس کی کیسی خبر لیتا ہوں۔ ابھی تک دفتر میں کسی کو بھنک بھی نہیں ملی ہے کہ دفتری معاملات کے علاوہ بھی جولیا سے میرے کچھ مراسم ہیں مگر تم ابھی میرے ساتھ آئے اور چند ہی منٹ میں سارا معاملہ تمھارے سامنے آ گیا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں اتفاقاً پیڈ نہ دیکھ لیتا تو تم میرے سامنے پارسا ہی بنے رہتے؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"بالکل۔" اس نے خفت آمیز ہنسی کے ساتھ کہا۔ "پچھلے دنوں میں نے اخبار میں ایک خیال انگیز مضمون پڑھا تھا۔ اللّٰہ تعالٰی کو انسان کی فطرت کا اچھی طرح علم ہے اس لیے احکام میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ گناہ کو حق سمجھ کر کیا جائے تو کفر کا ارتکاب ہو جاتا ہے لیکن گناہ کو گناہ سمجھ کر کیا جائے تو بندہ کفر سے بچا رہتا ہے پھر اپنے گناہوں کا فخریہ ڈھنڈورا پیٹنے کی بھی ممانعت ہے کیونکہ اس طرح دوسروں کے دل میں گناہ کی رغبت پیدا ہوتی ہے اس لیے میں اپنی برائیوں کو اپنے دل اور اپنی ذات تک ہی محدود رکھتا ہوں۔ فرصت کے اوقات میں میں نے بہت غور کیا ہے کہ میرے مذہب میں فرد سے زیادہ معاشرے کی اصلاح پر زور دیا گیا ہے۔ جو لوگ بدی اور گناہ کی تبلیغ کرتے ہیں ان کی معافی بہت مشکل نظر آتی ہے کیونکہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی خراب کرتے ہیں لیکن ڈر ڈر کر کسی گناہ کی لذت سے استفادہ کرنے والے...."

"بس، بس، زبان بند رکھو۔" میں نے ترش لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "اپنی بدمعاشیوں کے جواز کے لیے بے سروپا باتیں نہ بناؤ۔ عذرِ گناہ گناہ سے بھی کہیں زیادہ ہو[...] تم جیسے پرانے پاپی کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ [...] تمھارے دل میں مذہب کا صحیح تصور پیدا ہو گیا [...] تم جولیا اور اس کی سہیلیوں کو بھول کر ایک نیک نفس [...] بن جاؤ گے۔"

"میں تم سے بحث نہیں کرتا لیکن یہ بات سوچتا [...] ہوں کہ جس طرح ہم پیدا ہونے سے پہلے کچھ نہ کچھ تھے [...] مرنے کے بعد بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوں گے۔ اس ہونے [...] ہو گا، اس کا تعلق ہمارے موجودہ کردار اور افعال سے ضرور [...]"

"مجھے حیرت ہے کہ تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔ چرس [...] ہیروئن بیچنے والے کی زبان سے ایسی باتیں عجیب لگتی ہیں۔"

"اس بات کے تو تم بھی گواہ ہو کہ چرس ہم نے خوشی [...] نہیں بیچی تھی۔ روٹیوں کے لالے پڑ گئے تو مجبوراً اس جال [...] گلے لگانا پڑ گیا۔ رہی ہیروئن کی تو وہ اپنی مرضی سے نہیں [...] اور دباؤ کے تحت بیچنی شروع کی تھی۔"

وہ ہماری زندگی کا بدترین باب تھا جسے بھلا دینا [...] حق میں بہتر تھا لیکن حقائق کو بھلانا اتنا آسان نہیں ہوتا جس [...] کا جہانگیر ذکر کر رہا تھا اس دور میں ہم چرس نہ بیچ کر اور بھی بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن ہمارا ماضی داغ دار تھا، ہمارا رجحان جرا[ئم] کی طرف تھا اس لیے ہم شی کے اس بھیانک جنگل میں پھنس گئے جو برسوں سے ہماری جانوں کا آزار بنا ہوا تھا۔ جہانگیر از خود ان جرائم کے ارتکاب سے بچ گیا تھا کیونکہ پاک[ستان] میں پے در پے شکستوں کے بعد شی والوں نے اپنی سرگرمیاں محدود کر لی تھیں اور درمیانی سطح کے لوگوں سے یکلخت [رابطہ] ختم کر لیا گیا تھا لیکن میں اپنی پوری کوشش کے باوجود [اس] جنگل سے آزاد ہونے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ لوگ موت کے سائے کی طرح میرے تعاقب میں لگے ہوئے تھے۔ اوّل تو میں خود ان کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے کے درپے تھا [...] اگر کہیں میں ان سے بچنا چاہتا تھا تو وہ پل بھر کے لیے بھی [...] اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہ [...] موقع تھا کہ وہ اٹلی کے شہر میلان اور وینس کے درمیان [...] مجھے تلاش کر رہے تھے اور میں انھیں جُل دے کر پاکستان [...] میں کامیاب ہو گیا تھا مگر شی والے میرے پاکستان پہنچنے سے پہلے مجھ پر اپنا کاری وار کر چکے تھے گھر بار اور کاروبار تباہ کرا[نے] کے بعد ان کے ایک اہم آدمی نے اپنا بھیڑیے کا اصلی روپ معصوم سی بھیڑ کی کھال میں چھپا کر میری غزالہ کو رام کر لیا تھا [...] یوں ڈی ڈی اس کا شوہر بن بیٹھا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے

طرح سے کھوکھلا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ دوسری خرابی یہ ہوئی تھی کہ شی کے مقابلے میں اپنی پے درپے کامیابیوں کی وجہ سے میں ان کی سب سے بڑی حریف تنظیم، مافیا کے ذمے داروں کی نگاہوں میں آ گیا تھا۔ میلان میں شی والوں کو میری موجودگی کا علم تو ہو گیا تھا لیکن وہ میری نقل و حرکت کی بھنک بھی نہ پا سکے تھے جب کہ مافیا والوں نے میری نظروں سے اوجھل رہ کر ہر لمحے میرے ایک ایک قدم کی نگرانی کی تھی۔

جرم و گناہ اور قتل و غارت کی وہ راہیں میرے لیے روز بروز دلدلی صورت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ میں اس دلدل سے نکلنے کے لیے جتنے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اسی قدر اس کے اندر دھنستا جا رہا تھا اور انجام کا کچھ علم نہیں تھا۔

"یہ مایوسی کی لہر کا نتیجہ ہے جو تم اس طرح منفی انداز میں سوچ رہے ہو۔" جہانگیر میری کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "حقیقت یہ ہے کہ اپنی بدمعاشیوں کی وجہ سے تم دُنیا کے چھٹے ہوئے مجرموں کی ضرورت بن گئے ہو۔ تمھیں تو اب روایتی گاڈ فادر کا روپ دھار لینا چاہیے۔ تمھارے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ دن رات کے لیے دو چار قاتلوں کو ملازم رکھ لو اور خود ایک بڑی سی حویلی میں نوکروں کے لشکر کے ساتھ باغ بانی کر کے دل بہلاتے رہو۔ جو بھی مشتبہ شخص تمھاری طرف آنے کی کوشش کرے اسے وہ قاتل بے خوف و خطر ہو کر ٹھکانے لگا دیں۔ ایسے دس پانچ واقعات ہو گئے تو لوگ تمھارے بارے میں سوچتے ہوئے لرزنے لگیں گے۔"

بے ساختہ میری زبان سے روایتی الفاظ میں ایک غیر روایتی گالی آزاد ہو گئی۔ "کھلے بندوں ایسا حصار بنا کر بیٹھنا چاہا تو سب ہی میرے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ ابھی تک کم از کم مافیا والے تو میرے ہمدرد ہی ہیں۔ میں نے سب سے آنکھیں بدل لیں تو یہی سمجھا جائے گا کہ میں ان سب کو زک پہنچانے کے لیے اپنا کام پھیلا رہا ہوں۔ جس دن زندگی سے مرنے کی حد تک اُکتا گیا تو بلا سوچے سمجھے تمھارے مشورے پر عمل کروں گا۔ تمھارا پیٹ بھرا ہوا ہے، گھر میں بیوی پل رہی ہے، دفتر میں اسٹینو سے خرمستیاں ہو رہی ہیں، تمھیں تو ہری ہری ہی سوجھے گی...."

"پھر اسٹینو کا نام لیا؟" وہ میرا فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی بدک گیا۔

"ابھی کہاں نام لیا ہے؟ موقع محل سے نام لوں گا تاکہ تمھیں کھایا پیا یاد آ جائے۔ یہ...."

میری بات ادھوری رہ گئی اور ہم دونوں ہی چونک کنے انداز میں اپنی کرسیاں چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

دفتر بلکہ پوری فیکٹری میں سنّاٹا ہونے کے باعث اس بلاک کی راہداری میں ابھرنے والی قدموں کی چاپ واضح طور پر گونج رہی تھی۔ آنے والے تعداد میں کسی طرح دو سے کم نہیں تھے۔

بے اختیار میری نگاہیں اپنی رسٹ واچ پر گئیں جو ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی جب کہ سلطان شاہ نے آٹھ بجے تک پہنچنے کا وعدہ کیا تھا مگر ہم اپنی باتوں میں ایسے محو ہوئے کہ وقت کا دھیان ہی نہیں رہا۔

آنے والے دو تھے لیکن مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ سلطان شاہ کی مکاری کے باوجود امیر دادا اپنے قدموں پر چل کر اپنے مقتل تک آ پہنچے گا اس لیے تجسّس کے تحت میں غیر ارادی طور پر دفتر سے باہر نکل گیا۔ جہانگیر کو بھی مجبوراً میرا ساتھ دینا پڑا اور آنے والوں پر نگاہ پڑتے ہی اس کا پستول واپس جیب میں چلا گیا کیونکہ سامنے سے سلطان شاہ منہ لٹکائے چوکیدار کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔

جہانگیر نے اپنے چوکیدار کو ہاتھ کے اشارے سے دور سے ہی واپس کر دیا اور غصیلی نظروں سے سلطان شاہ کو گھورنے لگا۔

"امیر دادا کہاں ہے؟" سلطان شاہ کے قریب آنے پر جہانگیر نے راہداری میں ہی کھڑے کھڑے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

"بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی، وہ مارا گیا، میرا خیال ہے کہ اب تک اس علاقے میں کرفیو لگ چکا ہو گا۔" وہ پست لہجے میں بولا۔

"اسے دم لینے دو، دفتر میں چلو۔" میں نے جہانگیر کا شانہ دباتے ہوئے اسے ٹوکا۔ سلطان شاہ کے ساتھ اس کا لہجہ توہین آمیز ہو گیا تھا جسے صرف ذاتی ملازمین ہی ڈھٹائی کے ساتھ برداشت کر سکتے تھے۔

سلطان شاہ کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے ندامت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "آج میرا دل رو رہا ہے۔ ہماری وجہ سے اس علاقے میں بہت بڑے پیمانے پر پٹھان، مہاجر فساد کرا دیا گیا ہے۔ امیر دادا کے حامیوں نے افواہ پھیلا دی ہے کہ مہاجروں نے ایک شریف پٹھان کو گھر سے باہر گھسیٹ کر گولی مار دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں زبردست فساد برپا ہو گیا۔ گولیوں پتھروں اور فسادیوں سے بچنے کے لیے ہمیں ندی میں پناہ لینی پڑی ورنہ آج ہمارا بھی کام ہو گیا ہوتا۔ میرے دوست کے حامی بھی اسلحہ لے کر نکل آئے ہیں۔ اپنے اور پرائے کی تمیز کیے بغیر دونوں طرف سے اندھا دھند پتھراؤ اور فائرنگ کی جا رہی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم لوگ دیکھ لیے گئے تھے؟" میں نے ہونٹ بھینچ کر سوال کیا۔

"یہ سب امیر دادا کے چمچوں کی قیاس آرائی اور شرارت

ہے۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔" میں قسم نہیں کھاتا لیکن اس وقت کلام پاک کی قسم کھا رہا ہوں کہ ہمیں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ امیر دادا ہمیں راستے میں ہی مل گیا تھا۔ قدرت شاہ نے ٹیکسی روک کر امیر دادا کو ایک زوردار مجرا دیکھنے کی دعوت دی اور وہ ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ پائپ فیکٹری کے ویران گیٹ کے سامنے میں نے رومال تر کرنے کے لیے جیسے ہی کلوروفام کی شیشی کھولی، امیر دادا نے چشم زدن میں اس کی بو سے خطرہ بھانپ لیا وہ شاید مسلح نہیں تھا اس لیے اس نے چلتی ٹیکسی کا دروازہ کھول کر باہر کودنا چاہا اور میں نے اس کی کھوپڑی میں گولی اُتار دی۔ میرا خیال ہے کہ وہ سڑک پر گرتے ہی مر گیا ہوگا۔"

"پھر بلوا کیسے ہوگیا؟" میں نے حیرت اور بے یقینی کے ساتھ سوال کیا۔ سلطان شاہ کی قسم نے مجھے متاثر کیا تھا۔

"ادھر قرب وجوار میں کافی بڑی کچی آبادی ہے۔ وہ سارا علاقہ امیر دادا کا ہی تھا۔ اس کی چیخ اور فائر کا دھماکا سنتے ہی چاروں طرف سے لوگ اُبل پڑے۔ ہم بھی ٹیکسی سینما کے قریب روک کر بھیڑ مل گئے تاکہ امیر دادا کا انجام دیکھ سکیں لیکن ہم جائے واردات پر پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ امیر دادا کے چمچوں نے افواہ پھیلا دی۔ لوگ یک بیک اتنے مشتعل ہوگئے کہ ہمیں بچنا مشکل ہوگیا۔ ان حرام زادوں نے آپس کے جھگڑے کو ایک بلوے میں بدل دیا حالانکہ نہ امیر دادا شریف آدمی تھا اور نہ قدرت شاہ پارسا ہے۔ ان دونوں میں مدت سے سرد جنگ چل رہی تھی۔ جاننے والے جانتے تھے کہ جس دن بھی ان میں سے کسی ایک کو موقع مل گیا، وہ خاموشی سے اپنے حریف کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ عام بلوائیوں کو تو شاید ابھی تک مرنے والے نام کا بھی پتا نہیں چل سکا ہوگا۔"

"اور پولیس کہاں سو رہی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ بھی آگئی ہوگی لیکن وہ جسے روکیں گے وہی ان کو مخالف پارٹی کا ساتھی سمجھ کر مزاحمت کریں گے۔ قدرت شاہ بہت تندخو اور منتقم مزاج آدمی ہے۔ چرس، افیم اور ہیروئن سے لے کر خون خرابے تک سے نہیں ڈرتا۔ میرے سمجھانے کے باوجود نہیں رُکا۔ وہ بس امیر دادا سے ڈرتا تھا جو میرے ہاتھوں مارا گیا۔ اب وہ اس کے حامیوں کے ٹھکانے پر حملہ کرنے کے ارادے سے گیا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ پوری قوت سے اپنے ان مخالفوں کو کچل دینا چاہتا ہے تاکہ علاقے میں دھاک بیٹھ جائے۔"

"پولیس نے لوگوں کو نہیں بتایا کہ مقتول کوئی شریف شہری نہیں تھا بلکہ چھٹا ہوا بدمعاش تھا؟"

"وہ کیسے بتا سکتے ہیں؟" سلطان شاہ نے میری نا سمجھی پر بےچارگی سے کہا۔ "تم کچھ دن ضرور باہر رہے ہو لیکن یہاں کا ماحول اچھی طرح جانتے ہو۔ امیر دادا کا تھانے میں سرے کوئی ریکارڈ ہی نہیں ہوگا پھر کون اسے بدمعاش قرار دے سکتا ہے۔"

"اور بلوائیوں کو یہ بتانے والا بھی کوئی نہیں ہے کہ مرنے اور مارنے والے، دونوں ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اس واقعے دور دور تک نسلی منافرت کا عنصر کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔" جہانگیر نے اضطراری لہجے میں کہا۔

"فساد شروع کرانا بہت آسان ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا سا بچہ بھی کسی افواہ کا سہارا لے کر ہنگامے شروع کرا سکتا ہے۔ ایک بار توڑ پھوڑ، پتھراؤ اور خون ریز فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو جائے تو اُسے روکنا آسان نہیں ہوتا۔ بڑے بڑوں کو دانتوں پسینے آجاتے ہیں، ایک بار سینہ گزٹ چل پڑے تو لوگ افواہوں کے علاوہ کسی خبر پر یقین نہیں کرتے۔ خون ریزی اپنے زور پر چلتی رہتی ہے اور یہ سلسلہ بس اسی وقت رُکتا ہے جب خون کی ہولی کھیلنے والے تھک جاتے ہیں یا اپنے شغل سے اُکتا جاتے ہیں۔ . . ."

"یہ بات نہیں مانی جاسکتی۔" جہانگیر نے سخت لہجے میں اس کے تجربے کو مسترد کر دیا۔ "کرفیو اور اسی نوعیت کی دوسری انتظامی سختیوں کے بڑے مثبت اثرات ہوتے ہیں۔ تم لوگ تو ابھی باہر سے لوٹے ہو لیکن کراچی میں یہ نسلی فسادات کی لہر کافی دنوں سے چل رہی ہے۔ وجہ نسلی ہو یا علاقائی اور لسانی، ہر بار انتظامی سختیاں ہی کارگر ثابت ہوئی ہیں۔"

سلطان شاہ کے لبوں پر مغموم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"انتظامی سختیوں سے فسادیوں میں اُکتاہٹ پیدا کی جاتی ہے۔ اُن کا جلاؤ گھیراؤ اور خون ریزی کا موڈ ہوتا ہے لیکن کرفیو وغیرہ کی وجہ سے وہ اپنے گھروں میں بند رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور چند روز کی بے کاری اُن کے دلوں میں اُکتاہٹ پیدا کر دیتی۔ اس طرح ہنگامے دم توڑ دیتے ہیں۔ شکاری گھات میں لگے رہیں لیکن شکار اپنی پناہ گاہ سے کئی کئی دنوں تک باہر نہ نکلے تو بڑے سے بڑا متحمل مزاج شکاری بھی اپنی رائفل سمیٹ کر گھر واپس چل دیتا ہے۔ تدبیر کوئی بھی ہو، مقصد وہی ہوتا ہے جو میں بتا چکا ہوں مجھے زندگی بھر اس بات کا دکھ رہے گا کہ ایک شرمناک فساد کے آغاز میں میرا بھی کردار پیدا کر لیا گیا۔ پتا نہیں کیا تباہی ہوئی ہوگی، کتنے لوگ مرے ہوں گے، زخمی ہونے والوں کی تعداد تو یقیناً بہت زیادہ ہوگی۔"

"یہ ساری ریسرچ بعد میں ہوتی رہے گی۔ فی الحال جو مسئلہ سامنے ہے اس کو کون سلجھائے گا؟" جہانگیر نے سلطان شاہ کے جوابی تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "امیر دادا کا

پتا صاف ہوگیا۔ میری نگاہوں میں وہی ایک جانا پہچانا آدمی تھا جو ڈی ڈی اور اُس کے عزائم پر روشنی ڈال سکتا تھا۔ اب ہم پھر اندھیرے میں ہیں۔"

"شاید اتنے اندھیرے میں بھی نہیں ہیں۔" سلطان شاہ نے خلا میں کسی نامعلوم نقطے پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "غزالہ کی نگرانی کرنے والوں کو میں نے بھی دیکھا تھا۔ انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی ہیلمٹ نہیں اُتارے تھے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ دوسرا آدمی سامنے آئے تو میں آسانی کے ساتھ اسے پہچان لوں گا۔ مجھے ان میں سے کسی کا نام نہیں معلوم تھا لیکن امیر دادا کو دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا تھا کہ وہ ان دونوں میں سے ایک تھا۔"

"امیر دادا کی موت نے اُسے چوکنا کر دیا ہوگا۔ ویسے بھی اتنے بڑے شہر میں کسی کو نام پتے کے بغیر ڈھونڈ نکالنا آسان کام نہیں ہوتا۔ وہ خود سے تو تمھارے سامنے آنے سے رہا۔" جہانگیر نے کہا۔

"مجھے بھی معلوم ہے۔" سلطان شاہ کا لہجہ قدرے تلخ ہوگیا۔ "ریگستان میں مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کا انجام میں بھی سمجھتا ہوں۔ اس وقت ہمارے لیے وقت ہی سب سے زیادہ اہم ہے۔ غزالہ کی ڈینی سے ملاقات کے بعد امیر دادا کی موت سے ڈی ڈی چوکنا ہو جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس ملاقات کے بارے میں غزالہ سے بھی باز پرس کرے۔ اس کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا ورنہ ہمارے لیے کام کرنا دشوار ہو جائے گا۔"

ان دونوں کے تیوروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ابتدا ہی سے وہ ایک دوسرے کے لیے مفاہمانہ خیالات پیدا نہیں کر سکے تھے۔ سلمیٰ کی طرح جہانگیر کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی کہ میں نے ایک ملازم کو عملاً برابری کا درجہ دیا ہوا تھا۔ اس لیے ارادی یا غیر ارادی طور پر وہ سلطان شاہ کی ہر بات پر تنقید کرنا اپنا حق سمجھ رہا تھا جس کے ردِعمل میں سلطان شاہ کا تلخ ہو جانا فطری اَمر تھا جبکہ میں ان دونوں کے درمیان کسی تصادم کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ کراچی میں دوبارہ پاؤں جمانے کے لیے مجھے سلطان شاہ کی بےخوف حمایت کے ساتھ ہی جہانگیر کے وسائل کی بھی ضرورت تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ میں نے پہلے ہی یہ طے کر لیا تھا کہ سلطان شاہ، جہانگیر کے فلیٹ میں میرے ساتھ رہنے کے بجائے اُسی پرانی آبادی میں منتقل ہو جائے گا جہاں وہ مجھ سے ملاقات سے پہلے رہا کرتا تھا۔ اِس بندوبست کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ سلطان شاہ کو ہر قسم کے شک وشبے سے بالاتر رہتے ہوئے دلدار کی دولساز کمپنی میں ملازمت حاصل کرنی تھی تاکہ وہ وہاں ہونے والی کسی گڑبڑ کے بارے میں ٹھوس شہادتیں جمع کر سکے۔

"تمھارا ارادہ کیا ہے؟" میں نے سلطان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ "امیر دادا کی موت کے بعد اگر اس کا ساتھی ہمارے ہاتھ آجائے تو ہم ایک بڑی جدوجہد سے بچ سکتے ہیں۔"

"خدا کرے کہ اس علاقے میں حالات اس حد تک خراب نہ ہوں کہ واقعی کرفیو لگ جائے۔ اگر وہ علاقہ کھلا رہا تو میرا ارادہ امیر دادا کے جنازے میں شرکت کرنے کا ہے۔ اس کے تقریباً سارے ہی ساتھی اس جلوس میں ضرور موجود ہوں گے۔"

"وہاں تم پر کوئی شبہ تو نہیں کیا جائے گا؟" میں نے متجسس لہجے میں سوال کیا۔

"ایسے مواقع پر کوئی کسی پر دھیان نہیں دیتا۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں میرے دس پانچ شناسا بھی نکل آئیں کیونکہ ہماری تحصیلیں الگ ہونے کے باوجود ضلع ایک ہی ہے۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ میری کوشش بارآور ثابت ہوگی۔"

"پھر تم ضرور کوشش کرو۔" میں نے جہانگیر کو دخل اندازی ہونے کا موقع دیے بغیر کہا۔ "بہتر ہوگا کہ تم جلد از جلد اپنے پرانے علاقے میں ٹھکانا حاصل کر لو تاکہ ایک دو روز میں دواساز فیکٹری میں بھی طبع آزمائی کر سکو۔"

"وہاں ٹھکانا حاصل کرنا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے جب چاہوں، کسی کے بھی ساتھ رہ سکتا ہوں۔"

وہ معاملہ جہانگیر کے لیے نیا تھا اس لیے اس کے استفسار پر مجھے وضاحت کرنی پڑ گئی۔

مزید چند منٹ کی گفتگو کے بعد پہلے سلطان شاہ وہاں سے روانہ ہوا پھر ہم دونوں بھی نکل کھڑے ہوئے۔

اس وقت میں مکمل طور پر ایک شکست خوردہ انسان تھا۔ اس اَمر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ پاکستان میں اور پاکستان سے باہر میں نے شی کے مفادات پر کاری وار کیے تھے اور جمی لائیڈ کو ناقابلِ تصور نقصانات پہنچائے تھے لیکن اس کے باوجود شی کا وجود بھی برقرار تھا اور اُن کے آپریشنز بھی جاری تھے وہ افیم سے ہیروئن کا زہر کشید کر کے دنیا بھر کی منڈیوں میں موت کی سوداگری کر رہے تھے۔ اور اندھی آمدنی سے اسلحے کی غیر قانونی تجارت کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے کام کر رہے تھے جن کے ذریعے وہ جب چاہتے چھوٹے موٹے ملکوں میں انتشار اور افراتفری پیدا کر کے ایسی محبِ وطن قوتوں کو کچل سکتے تھے جو اُن کی راہ

میں مزاحمت پیدا کرنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن اپنی ان کامیابیوں کے لیے جو میرے لیے بہت بڑی تھیں مگر شی کے لیے شاید اتنی اہم نہ رہی ہوں، میں نے ذاتی سطح پر بہت بڑی قیمت ادا کی تھی۔ گھربار اور کاروبار کے ساتھ ہی میں نے غزالہ سے بھی ہاتھ دھو لیے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے نہ مکان جانے کا اتنا قلق تھا نہ کاروبار بک جانے کا جتنا غزالہ کی بے وفائی کا تھا۔

زندگی کے بدترین لمحات میں بھی میں کبھی نہیں سوچ سکا تھا کہ ایک دن غزالہ یوں اچانک میرے لیے اجنبی ہو جائے گی کہ میرے لیے اُس کو چھونا بھی ایک گناہ بن جائے گا۔ مگر عملاً ایسا ہو چکا تھا۔ میرے لیے اب وہ غزالہ سے مسز دلدار بن چکی تھی۔ اُس نے اپنی جان اور آبرو کے دشمنوں سے ایک طویل جنگ لڑنے کے بعد جن دل گداز حالات میں وہ فیصلہ کیا تھا ان کی روشنی میں غزالہ پر بے وفائی کا ننگ دلانہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اُس سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنی ہمت اور بے مثال جرأت کے باوجود اندر سے ایک خالص مشرقی لڑکی تھی۔ بظاہر اپنی مرضی سے ایک شخص کو اپنی زندگی میں قبول کر چکی تھی اس لیے اپنے ماضی کے حوالے سے ایسے ہر رشتے کو بھول جانا چاہتی تھی جو اُس کی ازدواجی زندگی سے متصادم ہوتا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں میرا نام زندہ تھا جس کی پرچھائیاں اس کی نمناک آنکھوں میں دیکھی اور دل گرفتہ آواز میں محسوس کی جا سکتی تھیں لیکن ایک مشرقی لڑکی ہونے کی وجہ سے وہ کھل کر اپنے اندرونی کرب کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ پھر بھی مجھے اُس سے کیے ہوئے وعدے کا پاس کرنا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ دلدار اوّل درجے کا بدمعاش اور مکار تھا لیکن میرے پاس اُس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا جس کی بنیاد پر میں غزالہ کو یقین دلا سکتا کہ وہ ناسمجھی میں بہت بُری طرح دلدار کی ایک گھناؤنی سازش کا شکار ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جس دن بھی میں دلدار کے مکروہ چہرے سے معصومیت اور شرافت کی نقاب نوچنے میں کامیاب ہو گیا، غزالہ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔

فوری طور پر دلدار کے خلاف چند محاذ کھولے جا سکتے تھے۔ امیر دادا کے اغوا میں ناکامی اور اس کے اتفاقی قتل کے بعد اُس کے دوسرے ساتھی پر ہاتھ ڈالا جا سکتا تھا۔ وہ ذمے داری سلطان شاہ نے اپنے سر لے لی تھی۔ دوسرا نکتہ دلدار کی دوا ساز فیکٹری سے متعلق تھا۔ میں خود ادھر نہیں جا سکتا تھا اس لیے وہاں گھسنے کا کام بھی سلطان شاہ کے ذمے پڑ گیا تھا۔ اس طرح میرے سامنے بس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ میں ملیر کے مضافاتی علاقے میں راجا فروٹ فارمز کا جائزہ لوں۔ مجھے یقین تھا کہ دلدار نے ان ہی اطراف میں غزالہ کے ساتھ اپنا مکروہ اور ڈراؤنا ڈراما رچا کر اُسے مغلوب کیا تھا گو اُس نے غزالہ کو یہی بتایا تھا کہ وہ باغات چالیس برس پہلے اس کے بزرگوں نے قائم کیے تھے لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ باغات کسی کی ملکیت تھے اور عملاً اس شخص کے تصرف میں رہتے تھے جو کراچی میں غنی کا سربراہ ہوا کرتا تھا۔ اگر میرے اس اندازے کی تصدیق ہو جاتی تو میں راجا فروٹ فارمز میں دلدار کے خلاف کوئی جال پھیلا سکتا تھا۔

لیکن میرے پاس کوئی سواری نہیں تھی جس کی مدد سے میں شہر میں آزادانہ نقل و حرکت کر سکتا۔ مشتبہ مقامات تک چوری چھپے رسائی کے لیے کرائے کی سواریوں پر انحصار خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اس لیے جب جہانگیر نے میری مسلسل خاموشی پر مجھے ٹوکا تو میں نے بے ساختہ اپنا وہی مسئلہ اُس کے سامنے رکھ دیا۔

"چاہو تو ابھی میرے ساتھ چلو۔" اُس نے فراخ دلی کے ساتھ پیش کش کی۔ "اس کار کے علاوہ بھی گھر پر دو گاڑیاں موجود رہتی ہیں۔ کرولا اور شیراڈ میں سے جو چاہو، ساتھ لے جانا۔"

اس کی تجویز معقول تھی۔ غزالہ کے بارے میں سلمیٰ سے تنہائی میں میری بات ہو چکی تھی۔ اس لیے اس کی طرف سے کسی جواب طلبی کا خطرہ نہیں تھا۔ اُس وقت پہلی بار میں ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ کسی خوش شکل اور باذوق خاتون کے ساتھ باتوں میں کچھ وقت گزارا جائے اور سلمیٰ ضرورت کے تحت اس معیار پر پوری اترتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"چلو اُدھر ہی چلتے ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سلمیٰ نے روانگی کے وقت ہمیں دو دھمکیاں دی تھیں اور ہم نے دونوں ہی کا پاس رکھا ہے۔ اچھے قدموں پر چلنے کے قابل ہیں اور بارہ بجے سے پہلے واپس لوٹ رہے ہیں۔"

"عجیب عورت ہے۔" جہانگیر کار فیکٹری کے گیٹ سے باہر نکالتے ہوئے سر جھٹک کر بولا۔ "سارا قصور میرا اپنا ہے۔ اپنی پیشانی سے ماضی کے جرائم کے داغ دھونے کے لیے ایک معزز خاندان کا داماد کہلانے کا شوق نہ ہوتا تو ہرگز یہ شادی نہ کرتا اور وہ لوگ بھی شاید سلمیٰ سے جان چھڑانے کے لیے ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ میرا گھر، شان و شوکت اور پیسے کی فراوانی دیکھ کر ایسے ریجھے کہ میرے بارے میں ذرا بھی دیکھ بھال کی ضرورت نہیں سمجھی اور جھٹ پٹ میری شادی ہو گئی۔"

"یہ بڑی بدقسمتی ہے۔" میں نے کہا پھر اُسے اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر جلدی سے تصحیح کی۔ "میں تمھاری نہیں، اُن لوگوں کی بات کر رہا تھا جو پیسے کو ہر دُکھ کا علاج سمجھتے ہیں۔ پیسے سے دنیا کی ہر خوشی نہیں خریدی جا سکتی، بلکہ میرا تو تجربہ ہے کہ ظاہری ملنے گلنے اور سُکھ کے پیچھے جتنے عجیب اور ناقابلِ فہم دکھ پیسے والوں میں پائے جاتے ہیں، اُن کا عشرِ عشیر بھی مفلسوں کے جھونپڑوں میں نہیں ملتا۔"

وہ تلخ انداز میں ہنس پڑا۔ "تم درست کہہ رہے ہو۔ اس بات کو ہم لوگوں سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے۔ جیب تراشی اور چھوٹی موٹی چوریوں کے بعد راتیں فٹ پاتھ پر گزارنے کے بعد ہی آج ہم اس منزل پر پہنچے ہیں۔ مفلس کو تو اِن عیاشیوں کی ہوا بھی نہیں لگتی جو ہمارے لیے ضرورت کا درجہ رکھتی ہیں۔ وہ روٹی یا بھوک کے سوا تیسری چیز سے واقف نہیں ہوتا۔ ہمارے لیے بھوک اجنبی بن جاتی ہیں لیکن روٹی کے بہانے ہزاروں انتخاب سامنے ہوتے ہیں۔ پسند، لذت اور ذائقے کے ساتھ کبھی کیلوریز کا چکر ہوتا ہے کبھی نشاستے کا، کبھی ڈائٹنگ ہوتی ہے کبھی وزن بڑھانا پڑتا ہے۔ ایک روٹی سے ہزاروں مسئلے وابستہ ہو جاتے ہیں۔"

"اب وہ دَور نہیں رہا بیٹے!" میں نے اُسے پچکار کر کہا۔ "فلم اور ٹیلی وژن نے ہر شخص کی معلومات میں تکلیف دہ اضافہ کر دیا ہے۔ جوتوں سے محروم دہقانی بھی جانتے ہیں کہ جہاز کے سفر میں کیا آرام ملتا ہے! عدنان خشوگی کی خواب گاہ میں کیسے کیسے لوازمات موجود ہیں! اسی وجہ سے آج کل احساسِ محرومی بڑھ گیا ہے۔ اجتماعی رویّہ تلخ تر ہوتا جا رہا ہے۔ جسے کریدو گے اُسے ہی اپنے ماحول اور معاشرے کا باغی پاؤ گے۔ لیکن پھر بھی اُونچے طبقے کے مقابلے میں درمیانی اور نچلے طبقے میں کسی حد تک ذہنی آسودگی پائی جاتی ہے۔"

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہوس کیوں بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر ایک دو نہیں تو چار روٹیاں کھا لیتا ہوگا، پہننے کو صاف کپڑے اور سونے کے لیے آرام دہ بستر میسر ہو تو لالچ کیوں پیدا ہوتی ہے، دنیا سے تو ہر ایک کو خالی ہاتھ ہی جانا ہوتا ہے۔"

"شاباش!" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "ہیروئن بیچ بیچ کر اپنی تجوریاں مُنہ تک بھر چکے ہو۔ اپنے تو سوچ ہے پورے کر کے اب تلقین شاہ بن رہے ہو۔ پہلے کبھی یہ خیال نہیں آیا تم کو؟"

وہ ڈھٹائی کے ساتھ ہنس پڑا۔ "یار، سچی بات یہ ہے کہ پہلے بھی کبھی کبھی یہ خیال آتا تھا لیکن بہت کمزور ہوا کرتا تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ مال و دولت ہے وہ اُسے دوسروں کو کیوں نہیں دے دیتے؟ لیکن اب اپنا مال کسی کو دینے کا خیال ہی تکلیف دہ ہوتا ہے البتہ مزاج میں قناعت ضرور آ گئی ہے کہ اللہ نے جو کچھ دیا ہے وہ بہت کافی ہے۔ اسے سلیقے سے استعمال کرتے رہے تو زندگی سکھ سے گزر جائے گی۔"

"اللہ نے تمھیں کچھ نہیں دیا، جہانگیر۔" اُس کی ریاکاری پر مجھے یک بیک غصہ آ گیا۔ "یہ سب تم نے انسانوں سے چھینا ہے۔ ان میں موت کا زہر پھیلا کر آسودگی کے تناور درخت اُگائے ہیں جو بالکل بے ثمر ہیں۔ . . !"

"بس! اولاد کا طعنہ نہ دو۔" وہ میری بات کاٹ کر غرایا حالانکہ میرے وہم و خیال میں بھی اس کی محرومی کا وہ نکتہ نہیں آیا تھا لیکن ثمر کا خود ساختہ مفہوم اخذ کر کے وہ ایک دم ہی بپھر گیا۔ "اپنے ذاتی معاملات میں میں کسی کو اس حد تک دخیل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ . ."

"تم خواہ مخواہ بدک رہے ہو، میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ میرے کون سے دس بچے ہیں جو میں تمھیں طعنہ دوں گا بلکہ میری تو محبوبہ بھی مجھے چھوڑ کر کسی اور کا ہاتھ تھام چکی ہے۔ میں کیسے اتنی گھٹیا بات سوچ سکتا ہوں۔" میں نے اِس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے فی الفور ایک جاندار موازنہ پیش کیا اور وہ بس مجھے گھور کر رہ گیا، بات کو طول نہ دے سکا۔

اس کے بعد جہانگیر کے گھر تک کا سفر گہری خاموشی میں طے ہوا تھا۔

سلمیٰ نے اپنے تحیّر آمیز استقبال سے ہمارے درمیان قائم جمود کو ختم کیا تھا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم دونوں واقعی اپنے مشاغل سے تائب ہو گئے ہو۔" وہ آہنی گیٹ کھلنے کی آواز سن کر حسبِ معمول برآمدے میں آ گئی تھی۔ "آج صحیح معنوں میں ہماری بیٹھک جم سکے گی۔" اُس نے وہ فقرے مشترکہ طور پر ہم دونوں کے لیے کہے تھے لیکن ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کا اصل مخاطب میں ہی تھا ورنہ جہانگیر کے ساتھ تو وہ ہر روز ہی ہوا کرتی تھی۔ جہانگیر نے اُس پر اپنے حق کے اظہار کے لیے کار سے اُترتے ہی اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر اُسے خود سے قریب کر لیا اور سلمیٰ کا چہرہ اندرونی خوشی سے تمتما اُٹھا۔

"میں تھکا ہوا ہوں ڈارلنگ! اور ڈینی کار لے کر واپس جائے گا اس لیے آج ہم سیدھے خواب گاہ میں جائیں گے۔ اب تو بیٹھکیں روز ہی ہوا کریں گی اور تم جلد ہی ان سے اُکتا جاؤ گی۔"

"میری خاطر، تھوڑی دیر تو بیٹھو نا!" وہ ٹھنک کر جہانگیر

سے بولی "تم دونوں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔ کم ازکم ٹیبل پہ ہی تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔ مجھے خوشی ہے کہ تم حسبِ وعدہ جلدی واپس لوٹ آئے۔"

"کھانا کھاؤ گے؟" جہانگیر نے مجھ سے سوال کیا۔ اُس کے لہجے میں سرد مہری پائی جاتی تھی۔

"قطعی بھوک نہیں ہے۔" میں نے سفید جھوٹ بولا "گھر لانے کے بجائے اگر تم مجھے راستے میں ہی ڈراپ کر دیتے تو بہتر ہوتا۔ گاڑی تو کل دن میں بھی لی جا سکتی تھی۔ میں بھی سونا چاہتا ہوں۔"

اچانک سلمیٰ جہانگیر کی گرفت سے نکل کر ہمارے سامنے آکھڑی ہوئی اور آنکھیں نکال کر بولی "ارے! کیا بات ہے؟ تم دونوں کے ہی منہ سوجے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ کیا باہر سے لڑ کر آ رہے ہو؟"

"ہر وقت مذاق اچھا نہیں ہوتا، سلمیٰ!" جہانگیر زچ ہو جانے والے انداز میں بولا "مجھے بھوک نہیں ہے، نیند آ رہی ہے میں اندر جا رہا ہوں۔ تمھارا دل چاہے تو تھوڑی دیر ڈینی کے ساتھ بیٹھ لو۔"

وہ مجھ سے نظریں چرا رہا تھا اور اُس کی آواز بھی قدرے بھرّائی ہوئی تھی۔ معاملے کی نزاکت بھانپ کر میں نے اُس کی نگاہ بچاتے ہوئے سلمیٰ کو اشارہ کیا اور اُس نے کسی بھی حماقت کا مظاہرہ کیے بغیر محبت کے ساتھ جہانگیر کا ہاتھ تھام لیا۔ "جب تک ہم تینوں ساتھ نہ ہوں، باتوں میں مزہ نہیں آئے گا۔ چلو پھر کبھی محفل جمائیں گے۔"

ڈرائنگ روم میں کی بورڈ سے دو چابیاں اُتار کر جہانگیر نے میری طرف بڑھا دیں "کون سی گاڑی لے جا رہے ہو؟"

"شکریہ جہانگیر!" میں نے اپنی جگہ سے ملے بغیر سرد لہجے میں کہا "میں نے اپنا پروگرام بدل دیا ہے، کل میں آرام کروں گا۔ میں خود بھی بہت زیادہ تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ تم آرام کرو، میں ٹیکسی سے واپس چلا جاؤں گا۔"

وہ مجھے گھورنے لگا۔ اُس کی نگاہوں میں غصّے اور بے بسی کے ملے جلے آثار نظر آ رہے تھے۔ اور چابیوں والا ہاتھ بدستور میری طرف بڑھا ہوا تھا۔ میں بھی اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اگر وہ خود ہی بات بڑھانے پر تُلا ہوا تھا تو وہ میرے لیے ناگزیر نہیں تھا۔ اُس کے بغیر بھی میں اپنے مسائل کے حل کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال سکتا تھا۔

اس وقت سلمیٰ کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ ہمارے مابین صورتحال سنگین ہو چکی تھی اور اُس کے چہرے پہ یک بیک ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اُس کے دل میں میری طرف سے چور تھا۔ اس لیے اغلب یہی تھا کہ اس تنازعے کا سبب وہ اپنی ذات سے منسوب کر رہی ہو لیکن اس وقت میرے پاس اُس کی غلط فہمی دور... کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔

"چلو!" اچانک جہانگیر نے میری طرف پلٹ کر فیصلے لہجے میں کہا "پھر میں تمھیں چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں — میں اس شہر کے راستوں سے اچھی طرح واقف ہو، خود چلا جاؤں گا — تم آرام کرو۔" میں نے سرد اور فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ میں نے اُسی لمحے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اسی وقت جہانگیر کے فلیٹ کو خیرباد کہہ کر کسی ہوٹل میں منتقل ہو جاؤں گا۔ اگر وہ بد دماغ تھا تو میں اس سے بھی بڑا بد دماغ تھا۔

"چلو... میرے ساتھ چلو!" وہ ہذیانی انداز میں چلّاتا ہوا میری طرف جھپٹا اور دونوں ہاتھوں سے میرا گریبان تھام کر مجھے باہر برآمدے کی طرف گھسیٹنے لگا۔

میرے گریبان پر اُس کی گرفت مضبوط تھی لیکن میں نے اُس کے ہاتھوں کو ایک جھٹکا دیا تو میرا گریبان پھٹ کر اُس کی بند مٹھیوں میں جھولتا رہ گیا اور وہ خود لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔

"اب قریب آئے تو میں تمھارے جبڑے توڑ دوں گا!" میں نے اُسے گھورتے ہوئے خونخوار لہجے میں کہا "بہت کم ظرف ہو تم۔ میں تمھیں ایسا کینہ پرور نہیں سمجھتا تھا۔"

"کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو؟" سلمیٰ روہانسی آواز میں بلبلاتی ہوئی ہم دونوں کے درمیان میں آگئی "تھوڑی دیر پہلے یہاں سے اچھے خاصے گئے تھے اور اب ایک دوسرے کے لیے وحشی بنے جا رہے ہو۔"

اِن ڈرامائی لمحات میں ہم تینوں کی آوازیں غیر ارادی طور پر کافی اونچی ہو گئی تھیں لیکن ملازمین میں سے کسی کو جرأت نہیں ہو سکی تھی کہ وہ اپنے مالکان کے نجی معاملات میں دخل اندازی کی کوشش کرتا۔ جہانگیر مشتعل تھا اور میرا دورانِ خون بھی کنپٹیوں میں حرارت پیدا کر رہا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا اگر جہانگیر نے ذرا بھی تیزی دکھانے کی کوشش کی تو اُسے اچھی طرح سبق دیے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ اس وقت ہم دونوں ہی اپنی ظاہری حیثیت اور خول کو بھلا کر تیسرے درجے کے غنڈے بن کر رہ گئے تھے جو ذرا ذرا سی بات پر آپس میں دست و گریباں ہو جاتے ہیں اور پھر نظریہ ضرورت کے تحت بعد میں باہم شیر و شکر نظر آنے لگتے ہیں لیکن سلمیٰ ہمارے ماضی اور شرمناک پس منظر سے واقف نہیں تھی اس لیے ہمارے تیوروں نے اُسے بُری طرح خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ جہانگیر کو اس کی دست درازی پہ ملامت کرے یا مجھے میری سخت کلامی پہ بُرا بھلا کہے۔

"تم ہٹو — بیچ سے ہٹ جاؤ۔" جہانگیر نے غصّے سے ہانپتے ہوئے سلمیٰ کو بے دردی سے ایک طرف دھکیل دیا۔ "یہ اگر میرے جبڑے توڑنا چاہتا ہے تو اسے میری چھت کے نیچے یہ شوق بھی پورا کرنے دو، معلوم ہوتا ہے کہ غزالہ کی حرکت نے اُس کا دماغ ہی اُلٹ دیا ہے...!"

اُس کے لہجے اور الفاظ سے مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ وہ لڑانے کے لیے قطعی آمادہ نہیں تھا۔ شاید اُس نے غصّے اور جنون کے عالم میں میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا تھا لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ میری کس بات پر اتنا جذباتی ہوا جا رہا تھا۔ اولاد نہ ہونے کے معاملے میں میں نے اپنی دانست میں وضاحت کر کے قصہ ختم کر دیا تھا۔

"تم اسے اندر لے جاؤ ورنہ میں واقعی اس کے دو چار دانت گرا دوں گا۔" میں نے جہانگیر کو گھورتے ہوئے سلمیٰ سے کہا "اس سے پوچھو کہ میں نے اس کی شان میں کون سی ایسی گستاخی کی ہے جو اس نے اپنے گھر میں میرا گریبان تار تار کر ڈالا؟"

"بکواس مت کرو۔ گریبان تم نے خود پھاڑا ہے!" غصّے میں غراتے غراتے اچانک اس کی آواز رندھ گئی اور وہ سر جھکا کر بہت تیزی کے ساتھ اندر جانے والی راہداری میں گھستا چلا گیا۔

"تم نے یقیناً ان کی دل آزاری کی ہے۔" سلمیٰ میرے چہرے پر نظریں جما کر بولی "وہ بلاوجہ اتنے مشتعل نہیں ہو سکتے۔"

"وہ اُلّو کا پٹھا بالکل پاگل ہے۔" میں نے اپنی جھونک میں کہا "میں کسی اور موضوع پہ بول رہا تھا اور وہ یہ سمجھ بیٹھا کہ میں اولاد نہ ہونے پر اُسے طعنہ دے رہا ہوں۔ میں نے اُس کی وہ غلط فہمی بھی دور کر دی مگر وہ ابھی تک ماش کے آٹے کی طرح اینٹھا ہوا ہے۔"

"اوہ!" سلمیٰ کے منہ سے بے اختیار ایک گہری سانس آزاد ہو گئی "یہ اُن کی ذات کا دُکھتا ہوا پہلو ہے۔ اب میں سمجھی کہ وہ کیوں اس قدر پراگندہ ہو رہے تھے۔ تمھیں اُن کے ساتھ رعایت سے کام لینا چاہیے تھا۔ بلاوجہ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا بیٹھے۔ تم تھوڑی دیر یہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھو، میں انھیں سمجھا کر واپس لاتی ہوں۔"

"اس وقت نہ روکو، پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ میرے منہ سے غصے میں پھر کوئی بات نکل جائے گی۔"

"تمھیں میری جان کی قسم!" سلمیٰ نے میری طرف جھک کر سرگوشیانہ لہجے میں کہا پھر عام لہجے میں بولی "میری واپسی تک تم یہیں رکو گے۔ ان پھٹے ہوئے چیتھڑوں میں تم ویسے بھی باہر نہیں جا سکتے۔ واپسی پر میں تمھارے لیے جہانگیر کی ایک قمیص بھی لیتی آؤں گی۔ ابھی تازہ تازہ بات ہے، فوراً ختم ہو جائے گی وقت گزر گیا تو پھر تم دونوں کے دل ایک دوسرے کی طرف سے صاف نہیں ہو سکیں گے۔ غضب خدا کا! کیسے دشمنوں کی طرح تم ایک دوسرے سے اُلجھے تھے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم دونوں کبھی اس طرح ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہو سکتے ہو۔"

جہانگیر کے آخری لمحات کے رویّے نے میرے دل میں اُس کے لیے ذرا سا نرم گوشہ پیدا کر دیا تھا لیکن پھر بھی اس کی طرف سے میرا دل کھٹّا ہو رہا تھا۔ میں فی الفور واپس چلا جانا چاہتا تھا لیکن سلمیٰ مجھ سے وہاں رُکے رہنے کا وعدہ لیے بغیر ٹلنے پر آمادہ نہیں ہوئی اور میں نے اُس کے جانے کے بعد کیبنٹ سے اپنے لیے نیٹ اسکاچ کا گلاس لبریز کر کے سگریٹ سلگا لی۔ اپنے جلتے ہوئے ذہن کو تھوڑا سا سکون پہنچانے کے لیے اس وقت یہی تدبیر کچھ کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔

اس تلخ اور آتشیں سیال کے چند گھونٹ معدے میں اُترنے کے بعد میرے اعصاب قدرے سکون آور ہوئے تو مجھے احساس ہوا کہ اس وقت زیادتی جہانگیر کی نہیں تھی۔ غلط فہمی کی بنا پر وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں نے دانستہ اس کی محرومی کا ذکر چھیڑا تھا۔ میری وضاحت نے شاید اُسے مطمئن کر دیا تھا لیکن وہ اپنی ذہنی حالت کو فوری طور پر اعتدال پر نہ لا سکا۔ اُس کے اُکھڑے اُکھڑے رویّے کی بنا پر جب میں نے اُس کی کار لے جانے سے انکار کیا تو وہ زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر تُل گیا اور وہیں میرے جارحانہ تیوروں نے تصادم کا ماحول پیدا کر دیا۔ آخر میں اس کی آواز گلوگیر اور انداز مظلومانہ ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے اپنے رویّے کی معافی مانگے بغیر شاید یہ توقع کر رہا تھا کہ میں اُسے رعایت دوں گا۔ جہاں قریبی اور جذباتی تعلق ہو وہاں ایک دوسرے سے ایسی توقعات کچھ بے جا بھی نہیں ہوتیں۔ دلوں میں ایک دوسرے کے لیے لامحدود گنجائش ہونے کے باوجود لوگ اَنا کی خاطر ایک دوسرے کے مقابل اُڑ جاتے ہیں۔ ایسی ضد کا انجام عموماً افسوسناک ہوتا ہے۔ اس وقت بھی وہی ہوا تھا۔ آدھا گلاس خالی ہونے تک میری روایتی فراخ دلی اور دوست نوازی پوری قوت سے بیدار ہو چکی تھی اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ

اگر جہانگیر سلمیٰ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں نہ آیا تو مَیں خود ہی اُس کی خواب گاہ میں جا کر اُسے اپنے گلے سے لگا لوں گا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے بیک وقت کئی محاورے یاد آ گئے۔ "تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے"۔ وہ اینٹھا ہوا تھا تو مَیں بھی مرنے مارنے پر تُل گیا تھا اور جب مجھ پر مصالحت کی رَو طاری ہوئی تو دل کو دل سے راہ ملی۔ دوسری طرف جہانگیر بھی غالباً اپنے احمقانہ طرزِ عمل پر پشیمان ہو رہا تھا وہ کچھ دیر بعد سلمیٰ کے ساتھ واپس آیا تو اُس کے چہرے سے زلزلے کے آثار ہویدا تھے۔ یُوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ دیو ہیکل اور توانا شخص اپنی خواب گاہ کی تنہائی میں کسی بچّے کی طرح روتا رہا ہو۔

سلمیٰ شاید ہمارے درمیان اپنے مصالحانہ کردار کی ادائیگی کے لیے خاصی تیاری کر کے آئی تھی لیکن اُسے زبان ہلانے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور شاید نظروں ہی نظروں میں ہمیں ایک دوسرے کے دل کا حال معلوم ہو گیا۔ جہانگیر میری طرف لپکا اور مَیں نے بڑھ کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

مَیں کئی منٹ تک جہانگیر کو اپنے بازوؤں میں بھینچے کھڑا رہا۔ اُس کا پورا وجود آندھی کی زد میں آئے ہوئے کسی تناور درخت کی طرح ہولے ہولے لرزتا رہا اور جب وہ مجھ سے الگ ہوا تو اس کی نم آلود نگاہیں نیچے جھکی ہوئی تھیں۔

"دوسری قمیص دو تاکہ مَیں واپس جا سکوں"، چند ثانیوں بعد مَیں نے جہانگیر سے کہا۔

"سلمیٰ قمیص لا دے گی مگر اب تم یہیں رہو گے، صبح واپس چلے جانا"، جہانگیر یہ کہتے ہوئے واپس مڑ گیا۔ "مَیں منہ ہاتھ دھو کر، کپڑے بدل کر واپس آتا ہوں"۔ وہ چلا گیا اور سلمیٰ وہیں ٹھہری رہی۔

"آج تم سے واقعی حماقت سرزد ہوئی ہے"، تخلیہ ہوتے ہی وہ ملامت آمیز لہجے میں بولی۔ "طبّی معائنے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جہانگیر کبھی بھی باپ نہیں بن سکیں گے۔ اس انکشاف پر وہ بلک بلک کر روئے تھے۔ انھوں نے مجھے کھلی چھوٹ دینے کی بھی پیش کش کی تھی مگر مَیں نے اس بات کو مقدر سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ وہ اکثر کڑھتے رہتے ہیں کہ اللہ نے نہ جانے کن گناہوں کی پاداش میں اس محرومی کو اُن کی پیشانی کا داغ بنا دیا ہے۔ پتا نہیں، تم نے کیا کہہ دیا تھا کہ بس وہ اندر سے ہل کر رہ گئے"۔

سلمیٰ کی وضاحت نے میری بہت بڑی اُلجھن دُور کر دی۔ نادانستگی میں مَیں وہی بات کہہ گیا تھا جو جہانگیر کے ذہن میں چبھتی رہتی تھی اس لیے وہ میری نگاہوں میں قابلِ معافی تھا لیکن اسی کے ساتھ میری نگاہوں میں سلمیٰ کی وقعت بھی بڑھ گئی تھی کہ اس نے اپنے شوہر کی ایک محرومی کو مقدر سمجھ کر قبول کر لیا تھا اور ماں بننے کی اس شہ زور خواہش کا گلا گھونٹ دیا تھا جو کسی بھی شادی شدہ عورت کی زندگی کا سب سے بڑا ارمان ہوتا ہے جہاں تک میری ذات میں اُس کی دلچسپی کا تعلق تھا تو وہ شاید اُس کے مزاج کا ایک حصہ تھا۔ وہ اُس وقت بھی مجھ پر مہربان ہونے کی کوشش کیا کرتی تھی جب شاید خود جہانگیر کو اپنے لاولد رہنے کا علم نہیں تھا۔ اس کے مرض کی نوعیت بہت عجیب اور نازک تھی کہ وہ ایک مکمل شوہر ہوتے ہوئے بھی صاحبِ اولاد نہیں ہو سکتا تھا۔

مجھے بے اختیار عزالسکی بدنصیب ماں، شمع یاد آ گئی جو خود کوکین کی عادی تھی اور اُس کا اکلوتا بیٹا، کامران ناسمجھی میں اس زہر کی بڑی مقدار کھا کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔ شاید جہانگیر کو ایسی ہی کسی دُکھیاری ماں کی بددُعا لگی تھی جس کا اکلوتا لختِ جگر ہماری متعارف کرائی ہوئی ہیروئن کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔

وہ خیال آتے ہی مَیں لرز گیا۔ اس گناہ کے ارتکاب میں جہانگیر تنہا نہیں تھا۔ تنظیم کے ایک ذمّے دار شخص کی حیثیت سے مَیں پسِ پردہ رہ کر اُسے انوکھی ہدایات جاری کرتا تھا جن پر عمل کر کے کراچی کے گلی کوچوں میں ایک منظم سازش کے تحت چرس کے عادی لوگوں کو ہیروئن کے نئے نشے کا عادی بنایا گیا تھا۔ ایک بار ہوش آ جانے کے بعد میرے لیے وہ خیال ہی روح فرسا تھا کہ کراچی کی حد تک میرا نام ہیروئن کے بانیوں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔

وہ کس قدر بھیانک دن تھے جب کراچی کے چور بازاروں اور منشیات فروشوں کو اچانک چرس کی سپلائی روک دی گئی صرف یہی نہیں بلکہ بازار میں موجود سارا مال سمیٹ لیا گیا اور جب چرس کے عادی اپنے مقررہ اڈوں کے چکّر لگاتے لگاتے مایوس ہونے لگے تو ان ہی اڈوں سے انھیں تجربے کے لیے ہیروئن کی مفت پڑیاں تقسیم کی گئیں اور چند روز کی محنت کے بعد اچانک ہی پورے شہر میں اس ہولناک سفوف کی حیرت ناک مانگ پیدا ہو گئی کیونکہ معاشرے کے محروم اور ناآسودہ لوگوں کو سدا سے تیز تر نشے کی لاشعوری تلاش رہتی ہے تاکہ دن بھر زندگی کے سنگین حقائق سے مقابلے میں اپنی اَنا اور اپنی معصوم آرزوؤں کو لہولہان کرنے کے بعد وہ چند کش یا چند گھونٹ لے کر کچھ دیر کے لیے اپنے خوابوں کی جنّت کھڑی کر سکیں جہاں سب کچھ اُن کی مرضی اور اشاروں کے مطابق ہوتا ہو، اُن پر کوئی قدغن نہ ہو، کوئی اُن کی خواہشوں کے برعکس اُن کے گلوں میں غلامی کے طوق نہ ڈالتا ہو۔ اپنی بدنصیبی کے اتھاہ اندھیروں میں اپنی پُرنور بشارتوں کی دمک تلاش کرنے کے لیے معاشرے کے وہ مفرور اور باغی لوگ چرس چھوڑ کر والہانہ عقیدت کے ساتھ ہیروئن کی طرف راغب ہوئے تھے اور یُوں سرد اور بھیانک موت کا وہ سمندر خود بخود اپنی جگہ پیدا کرنے لگا۔ پانی کو نشیب تلاش کرنے میں کوئی دقّت نہیں ہوتی، اسی طرح ہیروئن بھی خود بخود ہر اُس گلی، محلّے، نکڑ اور اڈے پر پہنچنے لگی جہاں اس کی ضرورت تھی۔

نشہ طاقت کا ہو یا شراب کا — چرس کا ہو یا ہیروئن کا — کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ نیکی اور بدی کے ہر امتیاز کو مٹا کر انسان کو انسان نہیں بلکہ آدمی کو نفس کا غلام بنا دیتا ہے لیکن پھر بھی اگر موازنہ کیا جائے تو شراب، چرس یا بھنگ انسان کو اپنا غلام نہیں بناتی۔ یہ امکان ہر وقت باقی رہتا ہے کہ آدمی اپنی دیگر ضروریات پوری کرنے کے بعد اس شوق میں پیسہ برباد کرے گا لیکن ہیروئن ایک لرزہ خیز نشہ تھا جس کی ابتدا شوق یا فیشن کے طور پر کی جا سکتی تھی لیکن ایک بار اس کے اثرات خون اور اعصاب میں سرایت کر جائیں تو یہ نشہ اس طرح رگوں میں پیوست ہو جاتا ہے کہ مقررہ وقت پر مطلوبہ مقدار نہ ملے تو آدمی ہولناک اعصابی اور دماغی اختلال، اضطراب اور اذیّت سے دوچار ہو جاتا ہے وہ چاہے بھی تو اسے ترک نہیں کر سکتا۔ بھوکا رہ سکتا، بستر کے بجائے کوڑے کے ڈھیر پر چادر اوڑھ کر بیٹھ سکتا ہے، چوری یا قتل بھی کر سکتا ہے لیکن ہیروئن نہیں چھوڑ سکتا اور اس ہیروئن کے فروغ میں ہمارا کردار کلیدی نوعیت کا تھا۔

میرے لیے صرف یہی ایک احساس سکون کا باعث تھا کہ شی والوں نے مجھے اپنا آلۂ کار بنا کر میرے ہاتھوں پاکستان میں جتنے مالی مفادات حاصل کیے تھے اُن سے کئی گنا زیادہ نقصانات مَیں اُن کو پاکستان اور یورپ میں پہنچا چکا تھا۔ پاکستان میں وقت کا پہیّہ اُلٹا چلانا میرے بس سے باہر تھا۔ بفرضِ محال مَیں شی کو نیست و نابود کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو بھی ہیروئن کی وہ طلب برقرار رہتی جو پاکستان میں پیدا ہو چکی تھی۔ مقامی ضروریات کے لیے یہ براؤن شوگر باہر سے درآمد نہیں کی جاتی تھی بلکہ ہماری اپنی سرحدوں میں دشوار گزار پہاڑی وادیوں میں افیم کی فصلیں لہلہاتی تھیں اور ان سے ہیروئن کشید کرنے کے کارخانے ناقابلِ شکست سرحدی پٹّی میں بکھرے ہوئے تھے۔ ان تجربہ گاہوں اور کارخانوں کی حفاظت پر سفّاک، پیشہ ور محافظ دن رات مامور رہتے تھے۔ جہاں لوگوں کو رہنے کے لیے پختہ مکان اور استعمال کے لیے بجلی جیسی بنیادی سہولتیں میسّر نہیں تھیں وہاں جنریٹر ان کارخانوں کو دن رات بجلی فراہم کرتے تھے۔ بعض کارخانوں کے گرد ریڈار سے منسلک حسّاس مانیٹرنگ آلات نصب تھے جو قرب و جوار میں اجنبی پرندوں تک پر نگاہ رکھتے تھے۔ ایسے ناقابلِ شکست حصار میں کشید ہونے والی ہیروئن ہر حال میں بکتی رہتی۔ شی نہ ہوتی تو دولت کے رسیا، بہتیرے مقامی بھیڑیے اس کمی کو پورا کر دیتے کیونکہ ہیروئن میں دوہری کشش تھی۔ مقامی منڈی کے سہارے روابط قائم کیے جا سکتے تھے، پھر موقع میسّر آتے ہی اس کی چھوٹی چھوٹی کھیپیں دساور اسمگل کی جا سکتی تھیں۔ اس وقت دنیا میں ہیروئن وہ واحد جنس تھی جس کے سَودوں پر سو گنا سے زیادہ منافع حاصل کیا جا سکتا تھا۔ لاکھ کے کروڑ بنانا بس ایک ذرا سے رسک پر منحصر تھا۔ منزل پر مامور افسر سے ذرا سی چوک ہوتے ہی سو گنا منافع خیرات کی طرح حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح سونے سے زیادہ مہنگی یہ جنس جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ ہی ساتھ ہی عام جو کاروباری طبقوں میں بھی مقبولیت حاصل کرتی جا رہی تھی جو ہیروئن کی اسمگلنگ سے سرمایہ حاصل کر کے راتوں رات ایسے بڑے کاروبار جما سکتے تھے جن کا پوری زندگی تصوّر بھی محال تھا۔ خاندانی دھندوں میں دیوالیا ہونے والے بھی تھوڑی سی ہمّت کر کے اور کچھ خطرہ مول لے کر اپنے باپ دادا کی ڈوبتی ہوئی ساکھ بچا سکتے تھے۔ ان سب طبقوں میں آپس میں کوئی مطابقت نہیں تھی لیکن پڑیاں بیچنے والے خوردہ فروشوں سے واحد کھیپ لے جانے والے سیٹھ اور ساہوکاروں تک، سب کی کوششیں ہیروئن کو شب و روز فروغ دے رہی تھیں اور گہرائی میں سوچنے پر یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے آنے والے چند برسوں میں مشرق سے مغرب تک ہر طرف ہیروئن چھا جائے گی اور براؤن شوگر کی اس چمکتی ہوئی دُھند میں پوری انسانیت سسکاریاں لیتی اور لڑکھڑاتی ہوئی اخلاقی تباہی کی اس بھیانک وادی میں گم ہو جائے گی جہاں سے تاریخ دانوں کو بھی کسی کی کوئی خبر نہیں ملتی۔

مشرق میں تضاد تھا۔ ترکی سے جاپان تک ہر ملک اور شہر کے رواج مختلف تھے لیکن پھر بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ تھوڑی بہت مادّی ترقی کے باوجود مشرق میں کسی نہ کسی حد تک اخلاقی اور روحانی اقدار زندہ تھیں جن کے سہارے اس عفریت کا بڑی حد تک مقابلہ کیا جا رہا تھا لیکن مغربی معاشرے مادّی ترقی کی اس معراج کو چھو رہے تھے جہاں رُوح، اخلاق اور مذہب کو مُردہ تہذیبی ورثہ قرار دے کر موٹی موٹی علمی کتابوں میں دفن کر دیا گیا تھا، نہ رشتوں کی عزّت باقی رہی تھی نہ دانش کا احترام۔ کامیابی، ترقی اور خوشی کے ہر پیمانے کو سکّوں کی جھنکار میں بدل دیا گیا تھا۔ مال و دولت کی اس روح فرسا دوڑ میں احساسات کچلے جا رہے تھے کیونکہ وہ انسان کے خمیر کا ایک حصّہ ہیں۔ انھوں نے ہر معیار کو سکّوں میں ڈھال لیا تھا لیکن انسان کا خمیر نہیں بدل سکے

تھے۔ پھر انسانوں نے انجوہ دراصل اسی مادّی خول کو اپنے اوپر مسلّط کر لیا تھا جس کی وجہ سے ذات اور روح کے زخموں میں اضافہ ہو رہا تھا جس کے درماں کے لیے ہر شام پب، ریستوران اور شراب خانے سجائے جاتے تھے جہاں پیسے کے زور سے نشہ خرید کر انسان اپنے دکھوں کو اس میں گھول کر پی جاتا تھا۔ مسائل جتنے بڑھتے جا رہے تھے اسی قدر تیز نشوں کی منڈی زرخیز ہو رہی تھی جن میں ہیروئن سرِفہرست تھی۔ گھر بار، کار، کاروبار، گرل فرینڈ اور اس کے دوسرے بوائے فرینڈ کی طرح مغرب میں بے شمار لوگوں نے ہیروئن کو بھی اپنے روزمرّہ کے لوازمات میں شامل کر لیا تھا۔ وہ اس کی ہلاکت سے خوفزدہ نہیں تھے۔ ان کی منطق تھی کہ کھائے بغیر موت آسکتی ہے تو ہیروئن کے بغیر بھی آیا کرے۔ نہ خوراک کے روزمرّہ معمولات کو ایڈکشن کے خوف سے ترک کیا جا سکتا ہے نہ ہیروئن کو۔

اسی لیے مغرب کے فرزانے ہیروئن سے خوف زدہ تھے۔ اُن کے شہروں میں ترقی کا سفر اتنا تیز تھا کہ انفرادی مسئلوں پر سوچنے کی کسی کو مہلت نہیں تھی۔ نظامِ شمسی کے تسخیر کے پروگرام چل رہے تھے، خلا میں سواریاں تیر رہی تھیں، ایسے میں ہر ایک دل کے آبگینوں کا کہاں تک خیال رکھا جا سکتا تھا۔ آبگینے ٹوٹتے تھے، اور خاموشی سے ہیروئن کی ایک اور پڑیا کھل جاتی تھی۔ رواداری اور انفرادی آزادی کے نام پر وہاں بھیانک ناسور پروان چڑھ رہے تھے۔ بالغ بیٹیاں رات رات بھر بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈسکو ناچ گھروں میں ناچتی تھیں، بیویاں دوسرے مردوں سے بغل گیر ہوتی تھیں تو اُن کے مرد انتقاماً دوسری عورتوں پر زور آزمائی کرنے لگتے تھے۔ یہ کمزوریاں رسوم بن گئی تھیں، قانون اُن کا پشت پناہ تھا۔ رشتوں کے حوالے سے ایک دوسرے سے باز پُرس کا واجبی سا حق باقی رہ گیا تھا جس کا جواز ہو تو جواب مِل سکتا تھا ورنہ "سوری" کا ایک ننھا سا لفظ جُرم و گناہ، حق تلفی، بے وفائی اور بے مہری کی لاتعداد لہو رنگ کہانیوں کو چپکے سے نگل جاتا تھا۔ ان سب کو بدلنا ان فرزانوں کے بس سے باہر تھا مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انھوں نے اپنا بہت کچھ کھو کر، اَنا کے سمجھوتوں کی بنیاد پر جو معاشرے کاشت کیے ہیں ان میں فرد کی محرومیوں کا سلسلہ روز بروز دراز ہوتا چلا جائے گا اور اسی کے ساتھ ذہن کو معطل اور اعصاب کو ماؤف کر دینے والے زہریلے نشوں کی طلب بھی بڑھتی چلی جائے گی اس لیے انھوں نے طلب ختم کرنے کے بجائے رسد تباہ کرنے پر اپنی ساری توجہ مرکوز کی ہوئی تھی۔ امریکا سے یورپ تک، ہر ملک انسدادِ منشیات کے نام پر لاطینی امریکا اور مشرقی ملکوں کو فراخ دلی سے امداد دے رہا تھا کہ وہ اپنی زمینوں پر افیم کا ایک پودا بھی نہ پنپنے دیں، افیم کے کاشت کار مزاحم ہوں تو طاقت کے زور پر اُن کی زمینوں کو بانجھ کر دیا جائے تاکہ اُن کے محروم اور ناآسودہ لوگوں تک ہیروئن کی ایک چٹکی بھی نہ پہنچ سکے۔

ہر جنس کی تجارت میں .... معاشیات کا طلب اور رسد کا اصول پوری قوت سے کارفرما تھا۔ اس کی آڑ میں مہاشوں نے ہتھیاروں سے دانۂ گندم تک کی کوٹا بندی کی ہوئی تھی لیکن ہیروئن کے معاملے میں وہی ماہرین اُلٹی گنگا بہا رہے تھے۔ طلب ختم کرنے کے بجائے اس کی رسد تباہ کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ یہ بھول گئے تھے کہ اس طرح وہ ہیروئن کبھی ختم نہ کر سکیں گے۔ ہاں اس کے بھاؤ ضرور او پر لے جائیں گے۔ شاید اسی وجہ سے روز بروز اور سال بہ سال ہیروئن میں عالمی دلچسپی بڑھتی ہی جا رہی تھی اور اسمگلنگ فروغ پا رہی تھی۔

مَیں نے آخری گھونٹ لیا اور میرے ہاتھ میں شفّاف گلاس چمکتا رہ گیا۔ کُندن کا سا جھلملاتا ہوا انعکاس میرے حلق سے معدے تک آگ کی ایک لکیر پیدا کرتا ہوا اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

اس وقت میرے دل میں ایک بڑا چھچھورا اور شرمناک سا خیال پیدا ہوا۔ مجھے شی اور اس کی عالمی سرگرمیوں سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اگر جمی لائیڈ مجھے یقین دلا دیتا کہ وہ ایک گرام ہیروئن بھی پاکستان میں بیچے بغیر سرحدی کارخانوں کی ساری پیداوار مغربی منڈیوں میں لے جائے گا تو شاید میں بھی اُس کا دعاگو بن جاتا۔ مشرق اور مغرب اس کرّے کے دو مختلف حصّے تھے جن کی نہ اقدار مشترک تھیں نہ مفادات۔ اس لیے میری ساری ہمدردیاں میرے اپنے مشرق، اپنے پاکستان تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں بلکہ نشے کی جھونک میں مَیں نے اس وقت یہاں تک سوچا کہ اگر دو کوڑی کی افیم سے کروڑوں کی مالیت رکھنے والی ہیروئن کشید کر کے سرکاری سطح پر مغربی ممالک کو برآمد کی جائے یا بالواسطہ طریقوں سے شی اور مافیا سے سودے کیے جائیں تو اس طرح حاصل ہونے والے خطیر زرِمبادلہ سے ملک کی قسمت ہی بدلی جا سکتی تھی۔ اگر دو چار سال گندم، چاول، کپاس اور گنّے کو بھول کر ہر زرخیز زمین کے سینے میں افیم بو دی جائے تو دیکھتے ہی دیکھتے ہم اپنے بھاری قرضے ادا کر کے دوسروں کو قرضے دینے کی پوزیشن میں آ سکتے تھے۔

لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ مغربی اجارہ داروں نے ہیروئن اور افیم کو عالمی سطح کا جرم قرار دیا ہوا تھا۔ ملٹی نیشنل دوا ساز اداروں میں مسکّن ادویہ کے نام پر ایل ایس ڈی اور اس جیسے لاتعداد دوسرے سینتھیٹک نشے سرکاری سرپرستی میں باقاعدہ لائسنسوں پر تیار ہو رہے تھے۔ ہر سال ٹنوں کی مقدار میں بھاری داموں پر برآمد ہو رہے تھے اور طبّی استعمال کے علاوہ نشے بازوں میں ان کی مقبولیت

کوئی چھپا ہوا راز نہیں تھی لیکن ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس کے برعکس اکادکا نئے کارخانوں کو اجازت نامے ملتے رہتے تھے مگر مشرق کی زرخیز زمین سے قدرتی طور پر پھوٹنے والے افیم کے ہر پودے سے مغرب خوف زدہ تھا اور انھوں نے عملاً نہ سہی تو کم از کم قانونی طور پر پوری دنیا میں پوست یا افیم کو شجرِ ممنوعہ بنا ڈالا تھا۔

اس وقت میرے دماغ کی پرواز بہت بلند تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے عالمی سیاست اور معاشی اجارہ داری کا نیا نوآبادیاتی تصوّر اس دور میں صرف افیم اور ہیروئن تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ مغرب والے ہماری ضرورت کی چیزیں ہمیں مہنگے داموں فراہم کرتے ہیں اور ہمیں سستی زرعی پیداوار میں مصروف رکھ کر اس بیش قیمت فصل سے محروم رکھنا چاہتے ہیں جس کی قیمت وہ اپنا سب کچھ بیچ کر بھی ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے ہمارے معصوم سیانوں کے ذریعے ٹیکنوکریسی کے ایسے بے لچک قوانین بنوائے کہ ہیروئن سے حاصل ہونے کا لا دھن کسی بھی طرح ہماری معیشت میں شامل ہو کر اپنا بھرپور ترقیاتی کردار ادا نہ کر سکے۔ جب تک اس خطیر سرمائے کو تجوریوں، ذاتی تعیّشات اور غیر پیداواری مدوں تک روکا گیا اس وقت تک دوسروں میں اس طرف سرمایہ کاری کا رجحان بھی رُکا رہے گا اور مغرب کو اس کے طے کردہ مفادات حاصل رہیں گے۔ اس معاملے میں میرے ذہن میں ایک اہم نکتہ یہ بھی پیدا ہوا کہ جب شی والوں کو ہیروئن ملک سے باہر لے جانے میں ناقابلِ تصوّر منافع حاصل ہوتا تھا تو وہ اس کی کچھ مقدار انتہائی حقیر داموں پر مقامی منڈی میں کیوں پھینکتے تھے؟ اسی مقدار کو باہر لے جا کر وہ زیادہ منافع حاصل کر سکتے تھے۔ چند ثانیوں کے پُرسرور سنّاٹے کے بعد میرے ذہن نے اس سوال کا جواب بھی تلاش کر لیا۔ جس طرح حکومتوں میں شامل بہت سے مخلص لوگ نادانستگی میں بڑی طاقتوں کے آلۂ کار بنا لیے جاتے ہیں، ایسا ہی شاید شی کے ساتھ بھی ہوا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ پاکستان میں بیچی جانے والی ہیروئن پر شی کو کسی عالمی طاقت سے زرِ تلافی ادا کیا جا رہا ہو۔ ان کے لیے مقامی آبادی میں ہیروئن پھیلانا اس لیے ضروری تھا تاکہ پاکستان کے لوگ اپنی آنکھوں سے اپنی گلیوں اور گھروں میں ہیروئن کی تباہ کاری دیکھ سکیں اور ان کے دلوں میں افیم سے اس حد تک اجتماعی نفرت پیدا کر دی جائے کہ وہ کسی بھی قیمت پر افیم کی کاشت کے حق میں چلائی جانے والی کسی مہم کی حمایت نہ کریں۔ بلکہ ایسی مہم چلانے والوں کے اپنے ہاتھوں سے چیتھڑے اُڑا دیں۔

مَیں چند ایکڑ پر اپنے افیم کے کھیت قائم کر کے مغرب کی عالمی غنڈہ گردی اور بالادستی کے خلاف احتجاج کرنے کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ جہانگیر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ مَیں نے سر اٹھایا تو وہ سلمیٰ کے ساتھ ہولے ہولے، دائیں بائیں جھولتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ وہ رقص کا اتنا شوقین نہیں تھا۔ اس لیے میں نے آنکھیں پھاڑ کر اُن دونوں کو دیکھا اور جب اُن کے چہرے دھندلاتے ہوئے محسوس ہوئے تو میں نے سمجھ لیا کہ نیٹ وسکی کا پورا گلاس اپنا کام دکھانے لگا تھا۔ مَیں نے بے اختیار اپنی آنکھیں موند لیں۔

صبح مَیں دیر سے اٹھا تو سر خاصا بھاری ہو رہا تھا۔ ہولے ہولے کھوپڑی سہلاتے ہوئے اس کا سبب بھی سمجھ میں آ گیا۔ کثرتِ مے نوشی کے بعد ہونے والی اس گرانی کو انگریزی میں ہینگ اوور کہا جاتا ہے لیکن اُردو میں اس کے لیے کوئی ایسا جامع لفظ موجود نہیں ہے۔ شاید اُردو والے ظرف سے زیادہ پیتے ہی نہیں تھے یا پھر ان کے ظرف بلند تھے کہ بوتلیں لنڈھا کر بھی ہینگ اوور کا شکار نہیں ہوتے تھے۔

مَیں اس وقت خواب گاہ میں صاف ستھرے بستر پر موجود تھا۔ مَیں نے سگریٹ سُلگا کر ذہن پر خاصا زور دیا لیکن افیم کے ذاتی کھیتوں سے آگے کچھ یاد نہ آ سکا۔ مجھے دل ہی دل ندامت ہونے لگی کہ جہانگیر سے جھڑپ کے بعد مجھے اتنی زیادہ نہیں چڑھانی چاہیے تھی۔ اس حالت میں اگر مجھ سے کوئی ناشائستہ حرکت سرزد ہو گئی ہوتی تو شاید اس وقت بستر کے بجائے پھاٹک کے باہر فٹ پاتھ پر پڑا ہوا ہوتا۔

مَیں نے غسل خانے میں جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر جہانگیر اندر آ گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ رقصاں تھی اور چہرے پر پچھلی رات کی تلخی کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"مَیں سوچ رہا تھا کہ تیار ہوتے تو ساتھ ہی نکل جاتے لیکن تمھارے اوپر نیستی سوار ہو رہی ہے۔ جب آرام سے دل بھر جائے تو سلمیٰ سے گاڑی کی چابی لے لینا۔ مَیں شام کو فیکٹری سے واپسی پر تمھیں فون کر لوں گا۔" اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ذرا بیٹھ جاؤ۔" مَیں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "یہ سب تو ہوتا رہے گا مگر مجھے یہ بتاؤ کہ رات کو میں ڈرائنگ روم سے یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"کیسے پہنچتے؟" اُس نے تحیّر آمیز لہجے میں کہا۔ "تم تھوڑے سے ڈرنک ضرور نظر آ رہے تھے لیکن گفتگو ختم ہونے کے بعد میرے ساتھ اپنے قدموں پر چل کر یہاں آئے تھے۔ کیا واقعی

تمھیں کچھ یاد نہیں رہا؟"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ "رات کو تمھاری احمقانہ حرکتوں کو بھلانے کے لیے مجھے نیٹ اسکاچ کا پورا گلاس معدے میں اُنڈیلنا پڑ گیا تھا۔ یہ شاید پہلا موقع ہے کہ میرا حافظہ میرا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ گفتگو کیا ہوئی تھی ہمارے درمیان؟"

"اوہ! تو تم واقعی آف تھے۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ "لیکن ساری بحث میں کہیں بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ تم اتنی پیے ہوئے تھے۔ پاکستان میں افیم کی کاشت کے حق میں تمھارے سارے دلائل مربوط اور مضبوط تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ تم جس رائے پر اَڑ جاؤ اس کے حق میں کہیں نہ کہیں سے ناقابلِ تردید دلائل جمع کر ہی لیتے ہو۔ یہ بتاؤ کہ اب ٹھیک ہو یا اب بھی کچھ گڑبڑ ہے؟"

"غنیمت ہے کہ میں بالکل ہی آف نہیں ہوا تھا۔" میں نے اطمینان محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "میں ڈر رہا تھا کہ کہیں اس حالت میں کوئی بداخلاقی نہ کر بیٹھا ہوں۔ تمھارے غصے سے اب ڈر لگنے لگا ہے۔"

"سچ پوچھو تو میں تمھاری خوش اخلاقی سے پریشان ہو گیا تھا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "سلمیٰ سے سلیپنگ سوٹ اور نئی قمیص لینے کے بعد تم اچانک ہی اس پر مہربان ہو گئے تھے اور اُس کی تعریفیں شروع کر دی تھیں۔ تمھارے خیالات سن کر وہ بہت خوش ہوئی تھی لیکن میں نے بلیک لیبل کی خالی بوتل دیکھتے ہی اُسے واپس خواب گاہ میں بھیج دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم خوشی کے عالم میں اُس کے ساتھ ناچنا نہ شروع کر دو۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اُس کے جاتے ہی تم نارمل نظر آنے لگے تھے اور بعد میں میرے ساتھ بھی برف ڈال کر ایک ڈبل پیگ لیا تھا۔ ایک بجے کے بعد ہم وہاں سے اُٹھے تھے۔ اپنے کمرے میں بھی میں دیر تک تمھارے نظریات پر غور کرتا رہا تھا۔"

"بس میں یہی جاننا چاہ رہا تھا۔ اب تم چاہو تو فیکٹری جا سکتے ہو۔ میں بھی ایک گھنٹے میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ اس بارے میں اب شام کو ہی گفتگو ہو گی۔" میں نے بستر سے اتر کر اپنے بدن پر موجود دھاری دار سلیپنگ سوٹ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا اور وہ فوراً ہی میرے کمرے سے چلا گیا۔ اُس سے بات ہونے کے بعد میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا تھا۔

میں تیار ہو کر کچن میں پہنچا تو سلمیٰ وہاں ناشتے کی مختصر سی میز کے گرد بیٹھی ایک باتصویر رسالے کی ورق گردانی میں محو تھی۔ خوش دلی سے میرا استقبال کرتے ہوئے اُس نے فوراً ہی ناشتے کی تیاری شروع کر دی۔

"رات کو تم بہت ترنگ میں تھے۔" اُس نے شوخ لہجے میں کہا۔ "میرے ساتھ تمھاری عقیدت دیکھ کر جہانگیر بوکھلا گئے تھے۔ ان کی ہدایت پر مجھے مجبوراً کمرے میں جانا پڑ گیا۔ سچ بتاؤ کہ تم مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہے تھے؟"

"اس کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ دراصل یاری دوستی کے بارے میں میں بہت پُرخلوص اور سادہ دل واقع ہوا ہوں۔ ہمارے جھگڑے میں تم نے جو رول ادا کیا، اُس نے میرے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ تم اپنی ذہانت سے کام نہ لیتیں تو ہم میں سے کوئی بھی دوسرے پر ہاتھ اٹھا سکتا تھا۔ ایسا ہو جاتا تو شاید زندگی بھر کے لیے ہماری دوستی ختم ہو جاتی۔"

"جہانگیر کو ذرا دیر سے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دراصل کل رات مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ تم دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے کیسی محبت موجود ہے۔ میرے چھیڑنے پر جہانگیر کمرے میں بلک کر رو پڑے تھے اسی وجہ سے ہمیں واپسی میں دیر ہو گئی تھی۔"

جہانگیر کے کہنے پر وہ پچھلی رات ڈرائنگ روم سے خوابگاہ تک واپس ضرور چلی گئی تھی لیکن بہرحال وہ ایک عورت ہی تھی۔ میرے پچھلی رات کے رویے نے اس کے دل میں ایسی گدگدی پیدا کی کہ وہ بے چاری نشے کی جھونک میں کہے ہوئے الفاظ کی بنا پر دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ جب جہانگیر خواب گاہ میں واپس لوٹا تو سلمیٰ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی اس لیے جہانگیر کو افیم کے بارے میں میرے 'جدید نظریات' پر اس سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے ذہن پر گہری دھند چھا جانے سے پہلے جو کچھ سوچا تھا، اس پر غالباً بہت مدلل انداز میں جہانگیر سے گفتگو کی تھی کیوں کہ سلمیٰ کو میرے فرمودات کی صحت پر ذرا بھی شبہ نہیں ہوا تھا بلکہ وہ تصدیق طلب لہجے میں یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ کیا واقعی اس علاقے میں طاقت اور سیاست کے سارے کھیل افیم سے وابستہ ہو کر رہ گئے تھے؟

اگر جہانگیر اور اس کے بعد سلمیٰ اس موضوع پر مجھ سے بات نہ کرتی تو شاید میں ان تمام باتوں کو اپنے بہکے ہوئے ذہن کی تخلیق سمجھ کر بھول گیا ہوتا لیکن ان کے حوصلہ افزا ردِعمل نے مجھے ناشتے کے دوران میں اس بارے میں دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

شی اگر پاکستان میں ہیروئن کو فروغ دے کر مقامی آبادی میں کسی بڑی طاقت کی شہ پر نفرت کی فضا پیدا کر رہی تھی تو یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ وہ قبائلی اور سرحدی علاقوں سے بڑے پیمانے پر ہیروئن خرید کر باہر بھی اسمگل کر رہے تھے۔ بلکہ اس عمل سے شی والے ہیروئن تیار کرنے والوں اور افیم کاشت کرنے والوں کی براہِ راست حوصلہ افزائی کر رہے تھے بلکہ میری معلومات کے مطابق ویرا لائیڈ کی کوششوں سے جرمن کیمسٹ ڈاکٹر بی۔ جے۔ ڈالٹن نے براہِ راست اپنی نگرانی میں پہاڑوں میں مومن خان کی پہلی لیبارٹری میں بہترین قسم کی ہیروئن تیار کرنے کا آغاز کیا تھا۔

وہ ایک ایسا پیچیدہ سوال تھا جس کا جواب شاید جمی لائیڈ کے سوا کسی کے پاس نہیں تھا۔ صرف اسی جواب کی روشنی میں شی کے صحیح کردار کے بارے میں کوئی یقینی رائے قائم کی جا سکتی تھی۔

جرائم کی عالمی برادری میں شی کا نام جس قدر ہولناک اور لرزہ خیز تھا اس کے مقابلے میں اس کی عام لوگوں میں ذرا بھی شہرت نہیں تھی۔ وہ جہاں بھی سرگرم تھے، اپنی منڈی پر پوری طرح قابض تھے۔ حد تو یہ تھی کہ شہرہ آفاق مافیا والے بھی ان کے سائے سے بچنے کی کوشش کرتے تھے مگر شی غیر معروف تھی اور مافیا کا نام دنیا کے پسماندہ ملکوں میں بھی اچھی طرح جانا جاتا تھا۔

معاً مجھے لینا تے ایئرپورٹ پر ملنے والا شخص فرانکو لومبارڈی یاد آیا جو ہماری نگاہوں سے اوجھل رہ کر غالباً پوری رات میلان میں ہماری نگرانی کرتا رہا تھا۔ وہ یقیناً ایک قابلِ اعتماد لیکن نچلے درجے کا آدمی تھا۔ اس نے خود کو مافیا کے ایک رکن کی حیثیت سے متعارف کرا کے بہت سی ایسی باتیں بتا کر مجھے حیران کر دیا تھا جن سے میرے اور سلطان شاہ کے علاوہ کسی تیسرے شخص کو واقف نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اُس نے اپنے بڑوں کی طرف سے مجھے مافیا کے لیے دلکش شرائط پر کام کرنے کی پیش کش کی تھی۔ میری طرف سے مہلت طلب کیے جانے پر اُس نے گمبی گمبی والے اشتہار کے ذریعے پاکستان میں مافیا کے مقامی سربراہ سے رابطہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی جسے میں نے نظرانداز کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر نئے حالات میں مافیا والوں سے میرا رابطہ اس اعتبار سے سودمند ہو سکتا تھا کہ ان کے ذریعے مجھے ان کی سب سے بڑی حریف تنظیم 'شی' کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔

سلمیٰ کا رویّہ میرے ساتھ بہت والہانہ اور محبت آمیز تھا لیکن اس دن مجھے قدرت کے اس نظام کا اندازہ ہوا کہ خواب و خمار کے لیے راہوارِ مشرق کا اندھیروں میں ڈوب جانا بہت ضروری ہوتا ہے ورنہ دن کے اُجالے میں رومان پسند طبیعتوں پر اتنی جولانی نہیں آتی کہ من و تو کے فرق کو فراموش کر کے دھول دھپّا یا پیش قدمی کر سکیں۔

تھوڑی دیر بعد میں جہانگیر کی سیاہ شیراڈ لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

سلطان شاہ سے پچھلی رات یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ امیر دادا کے جنازے میں شریک ہو کر اس کے ساتھی کو پہچاننے کی کوشش کرتا۔ اِس کے بعد اُسے بنارس کالونی کی اُسی پرانی آبادی میں لوٹ جانا تھا جہاں وہ مجھ سے ملاقات سے پہلے تک رہا کرتا تھا۔ پھر اُسے دلدار کے دواساز کارخانے میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرنی تھی۔

وہ سب طے تھا لیکن پھر بھی میں نے شرف آباد میں جہانگیر کے فلیٹ کا چکر لگانا ضروری سمجھا۔ حالات میں کسی غیر متوقع تبدیلی کی بنا پر سلطان شاہ کسی وجہ سے وہاں واپس بھی پہنچ سکتا تھا کیوں کہ فلیٹ کی ایک فاضل چابی اس کے پاس بھی موجود تھی۔ میں کار پارک کر کے اوپر پہنچا تو کی ہول میں چابی لگاتے ہی دروازہ خود بخود کھل گیا۔ میں بوکھلا کر مدافعانہ انداز میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور اسی لمحے کھلے ہوئے دروازے کی اوٹ سے سلطان شاہ کا گمبھیر چہرہ سامنے آ گیا۔

"تو میرا اندازہ درست ہی نکلا۔" میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے خفت آمیز لہجے میں کہا اور فلیٹ میں داخل ہو گیا۔

خلافِ معمول اس وقت سلطان شاہ کا موڈ شگفتہ نہیں تھا۔ شاید پچھلی شام امیر دادا کے علاقے میں برپا ہونے والے فساد کے اثرات اس کے ذہن سے زائل نہیں ہو سکے تھے۔

"تمھارے اندازے ہمیشہ درست ثابت ہوتے ہیں مگر میں ہمیشہ مار کھا جاتا ہوں۔ اخبار تو دیکھ ہی لیا ہو گا تم نے؟" اس نے میرے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اداس لہجے میں کہا۔

"اخبار دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ تم خلاصہ سنا دو۔" میں نے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"اُس علاقے میں ایک گھنٹے تک گھمسان کا رن پڑا۔" اُس کی آواز پر تاسف کے سائے گہرے ہو گئے۔ "قدرت شاہ کے مسلح آدمیوں نے تاک تاک کر نشانے لگائے۔ امیر دادا کے تین قریبی ساتھی مارے گئے۔ بارہ بے گناہ زخمی ہو کر اسپتالوں میں پہنچ گئے۔ کرفیو کی نوبت تو نہیں آئی لیکن مسلح پولیس کی بھاری نفری کی کارروائی کے بعد ہی محاذ آرائی ختم ہو سکی۔"

"یہ نئی بات نہیں ہے۔ بدمعاشوں کے تصادم میں اکثر راہ گیر مارے جاتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ مرنے والے ایک فریق سے تعلق رکھتے تھے۔ بے گناہ شہری نہیں تھے۔ یہ بتاؤ کہ امیر دادا کی تدفین کا کیا رہا؟" میں نے دانستہ موضوع

تبدیل کیا کیوں کہ اس ساکھے پر زیادہ دیر تک گفتگو کرنے کے نتیجے میں سلطان شاہ زیادہ جذباتی ہو سکتا تھا۔

"اس کے حامیوں نے پولیس کو لاش کے قریب تک نہیں پھٹکنے دیا۔ وہ لوگ ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے پوسٹ مارٹم کرانا چاہتے تھے لیکن امیر دادا کے آدمی اسے لاش کی بے حرمتی تصوّر کرتے ہیں۔ حالات پر قابو رکھنے کے لیے پولیس والوں کو رات گئے اپنے مطالبے سے دست بردار ہونا پڑا اور فجر کے بعد لاش دفن کر دی گئی۔"

وہ چند ثانیوں کے لیے خاموش ہوا تو اس کا انداز خیال انگیز تھا۔ میں اسے چھیڑے بغیر اس کے دوبارہ بولنے کا منتظر رہا۔ "میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ امیر دادا کا ساتھی اس کے جنازے کے جلوس میں شریک تھا لیکن حیرت ناک بات یہ ہے کہ وہ ایک سرکاری محکمے میں ملازم ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ دوہری زندگی کیسے گزار رہا ہے۔" آخر کار اس کے تردد کی وجہ بھی سامنے آ گئی۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تمھیں دھوکا ہوا ہو؟" میں نے رائے زنی کی۔

اس کے ہونٹوں پر مغموم سی مسکراہٹ پھیل گئی "مجھے معلوم تھا کہ تم یہی کہو گے۔ میں اسے ہزاروں کی بھیڑ میں بھی پہچان سکتا ہوں۔ اس بارے میں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میں نے دھوکا نہیں کھایا۔ وہ دوسرے غنڈوں بدمعاشوں سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ براہِ راست امیر دادا کا معاون نہیں تھا بلکہ ڈی ڈی کے ذریعے وہ دونوں اکٹھے ہوئے ہوں گے۔ اب یہ محض اتفاق ہے کہ وہ پائپ فیکٹری سے ذرا دور پٹیل پاڑے میں کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔"

"تمھیں یہ ساری معلومات بہت جلد حاصل ہو گئیں!" میں نے حیرت سے کہا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ میت میں مجھے دو چار شناسا ضرور مل جائیں گے۔ دراصل روزی کمانے کے لیے یہاں پردیس میں آ کر کنبے، برادری اور قبیلے کے رشتے خود بخود مضبوط ہو جاتے ہیں۔ جس جس کو خبر ملی، وہ برادری اور تحصیل کا خیال کیے بغیر میت میں آ گیا۔ وہاں میرے بھی چار چھے دوست مل گئے۔ ان ہی میں سے ایک کے ذریعے بخت آور کے بارے میں معلومات مل گئیں۔ راز کی بات یہ ہے کہ بخت آور علاقہ غیر میں ایک آدمی کا قتل کر کے کراچی بھاگ آیا تھا اور اس نے یہیں شادی کر لی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اسے اسی سلسلے میں بلیک میل کر کے ڈی ڈی نے اپنے لیے کام کرنے پر مجبور کیا ہو۔"

"شی والے غیر اہم کاموں کے لیے کسی کو بلیک میل نہیں کرتے۔ وہ پیسہ پھینک کر کام لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بخت آور کسی وجہ سے ڈی ڈی کی نظروں میں آ گیا ہو۔ اب اس کے بارے میں کیا ارادہ ہے تمھارا؟"

"وہ بنیادی طور پر دوسری لائن کا آدمی ہے اس لیے پہلے اس کے معمولات کا جائزہ لینا ہو گا۔ یہ کام شاید مجھے خود ہی کرنا ہو گا کیوں کہ امیر دادا کو راستے سے ہٹانے کے بعد اب قدرت شاہ اس علاقے کا کنٹرول حاصل کرنے کے لیے جوڑ توڑ میں مصروف ہو گیا ہے۔ اس پر انحصار کیا تو یہ کام کافی طول پکڑ جائے گا..."

"اگر تم بخت آور کے پیچھے لگے رہے تو دلدار کے دواساز کارخانے والا معاملہ رُکا رہے گا۔"

"جیسا تم کہو۔" وہ مضطربانہ انداز میں پہلو بدل کر بولا۔ "اسی مشورے کے لیے تو میں تدفین سے فارغ ہو کر ادھر آیا تھا۔"

"بخت آور کا پتا ٹھکانا مجھے بتا دو، اسے میں دیکھ لوں گا۔ تم اپنی پوری توجہ ملازمت حاصل کرنے پر مرکوز کر دو۔"

"پولیس کے آنے سے اس علاقے میں سکون تو ہو گیا ہے لیکن کشیدگی برقرار ہے۔ ذرا دیکھ بھال کر اس علاقے میں جانا۔ پتا نہیں اس شہر کے بسنے والوں کو کیا ہو گیا ہے کہ آدمی، آدمی کو کھانے پر تُل گیا ہے۔" اپنے ہمدردانہ مشوروں کے ساتھ اس نے مجھے بخت آور کا ستا ہوا پتا سمجھا دیا جو شاید زیادہ دشوار نہیں تھا۔

میں نے اسی وقت گمبی گمبی کے نام سے بچوں کے لیے ربڑ کے کھلونوں کا ایک اشتہار بنا کر دیا جس میں ضرورت مندوں کو اسی فلیٹ کے فون نمبروں پر صبح نو بجے تا پانچ بجے شام رجوع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

"اشتہار تو تم دے رہے ہو لیکن تم نے اپنے اس اقدام کے نتائج پر غور کر لیا ہے؟" اس نے اشتہار پڑھتے ہوئے سوال کیا۔

"جب ہم شی سے ٹکرا کر زندہ رہ سکتے ہیں تو مافیا والے ہمارے لیے اتنے خطرناک ثابت نہیں ہوں گے۔ تم دیکھتے جاؤ کہ اب کیا ہوتا ہے۔ میں انھیں شی کے خلاف استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

سلطان شا[illegible] پہنچ[illegible] پہلے ہی نہا دھو کر تازہ دم ہو چکا تھ[illegible] کچھ دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرنے [illegible] ہم دونوں وہاں سے ایک ساتھ ہی روانہ ہو گئے۔

"تم شاید رات جہانگیر کے ساتھ ہی رہے تھے؟" راستے میں اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں! مجبوراً رُکنا پڑ گیا اور اب تمھیں ڈراپ کرنے کے بعد میرا ارادہ راجا فروٹ فارمز کا چکر لگانے کا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ ملیر کے مضافات میں دلدار نے اپنے جن آبائی باغات کا غزالہ سے ذکر کیا ہے وہ تنظیم کی ملکیت ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دلدار نے اب راجا فروٹ فارمز کا نام بھی بدل دیا ہو۔"

"لیکن اس طرح تو تمھارا دلدار سے براہِ راست تصادم بھی ہو سکتا ہے جب کہ غزالہ سے کیے ہوئے وعدے کی بنا پر فی الحال تم اس سے ٹکرانا نہیں چاہتے۔" اس نے رائے ظاہر کی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجبوری کی اور بات ہے، ورنہ میں اس سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں لیکن اسی کے ساتھ دلدار کی شخصیت کا گھناؤنا روپ غزالہ کے سامنے بے نقاب کرنا چاہتا ہوں۔ تمھیں معلوم ہے کہ راجا سکندر علی ان فارمز کو اپنی عیاشیوں کے مرکز کے طور پر استعمال کرتا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ دلدار نے بھی وہاں اپنا اڈا جمایا ہوا ہو۔"

"چاہو تو میں بھی تمھارے ساتھ چل سکتا ہوں۔" اس نے پیشکش کی۔ "آج کا دن تو گزر ہی گیا ہے۔ میں شام کو اپنے کام کی ابتدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ درمیانی وقت تمھارے ساتھ گزار لیا جائے تو کیا بُرا ہے؟"

میں نے چند ثانیوں تک اس کی تجویز پر غور کیا اور اس کی افادیت کا قائل ہو گیا۔ اگر میرا دلدار سے بھڑ جانے کا ارادہ ہوتا تو بات مختلف ہوتی لیکن وہاں دیکھ بھال کے لیے ایک کے بجائے دو افراد کا ساتھ ہونا ہر لحاظ سے مناسب تھا۔

میں نے راستے میں شیراڈ کی ٹنکی میں پیٹرول بھروایا اور پھر ہم چندریگر روڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے وہاں اخبار کے دفتر کے نیچے گاڑی روک کر سلطان شاہ کو اشتہار بک کرانے کے لیے اوپر بھیجا تو اس وقت یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ کچھ عرصے بعد اس سے اگلی گلی میں واقع سسپنس کے دفاتر سے مجھے اپنی کہانی کی اشاعت کے لیے رجوع کرنا ہو گا۔

سلطان شاہ زائد معاوضے پر اگلے روز کی اشاعت کے آخری صفحے پر اشتہار چھپوانے کا بندوبست کر کے آیا تو ہم وہاں سے واپس ملیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمارا تصادم کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن احتیاطاً بھرے ہوئے پستول ہم دونوں کے پاس موجود تھے اور کسی آڑے وقت کے لیے میرے پاس ٹیم گن بھی تیار تھی۔

شاہراہِ فیصل پر آبادیوں اور ایئرپورٹ سے گزر کر ہم نے ملیر کا پل عبور کیا پھر میں نے کار بائیں جانب والے اس راستے پر ڈال دی جو راجا فروٹ فارمز کی طرف جاتا تھا۔

شہر کے برعکس اس علاقے کی فضا صاف ستھری اور پُر سکون تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد لہلہاتے ہوئے سرسبز باغات کے درمیان اس روایتی سناٹے کا آغاز ہو گیا جو زرعی زمینوں پر عام طور پر مشاہدے میں آتا ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے کار اس کچے راستے پر ڈال دی جو راجا فروٹ فارمز کے گیٹ پر ختم ہوتا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں راستوں کے بارے میں سلطان شاہ کو بتاتا بھی جا رہا تھا تاکہ ضرورت کے وقت اسے براہِ راست اس ٹھکانے پر پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اس نے اضطراری طور پر مجھے اس کچے راستے پر سفر سے روکنا چاہا لیکن میں ان باغات کی ساخت سے بخوبی واقف تھا۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ پھاٹک پر دلدار بذاتِ خود موجود ہوتا۔ اس کی کاٹیج میں موجودگی کے بارے میں چوکیدار سے معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم بآسانی اپنے اگلے اقدام کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتے تھے۔

وہ بورڈ میں نے دُور ہی سے پہچان لیا جس پر اب راجا فروٹ فارمز کے بجائے شاہ باغ لکھا ہوا تھا۔ وہ سب کچھ حتیٰ کہ بورڈ تک میرا جانا پہچانا تھا، بس اس پر صرف نام بدل دیا گیا تھا اس لیے مجھے پورا یقین تھا کہ دلدار نے اسی کے بارے میں اپنی ملکیت کا دعویٰ کیا تھا۔ اگر اس کا پرانا نام بدستور برقرار رہتا تو اس بارے میں شبہ کیا جا سکتا تھا۔

کچے راستے پر اُڑتے ہوئے غبار اور شیراڈ کے انجن کی ہلکی سی گونج سن کر باغ کے پھاٹک پر ایک شخص مستعد نظر آنے لگا تھا۔ میں نے شیراڈ روک کر ریورس گیئر میں ذرا سی دُور چلائی اس طرح ہم کار سمیت دھول کے بادل میں چھپ کر رہ گئے۔

"جلدی سے اُتر جاؤ اور یہیں چھپ کر میرے اشارے کا انتظار کرنا ورنہ واپسی میں ساتھ لے لوں گا۔" میں نے سلطان شاہ سے کہا اور وہ غبار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ باغ کے چوکیدار کی نظروں سے بچ کر کار سے اُتر گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی میں نے کار آگے بڑھا دی۔

مجھے امید تھی کہ کار الٹی چلائے جانے پر شاہ باغ کے چوکیدار کو کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا ہو گا کیوں کہ ان کچے اور ناہموار راستوں پر جا بجا گڑھے اور پتھر موجود تھے جن سے بچنے کے لیے ایک نیا آدمی ہر سمت میں کار چلانے پر مجبور ہو سکتا تھا لیکن اس تدبیر سے سلطان شاہ کو غائب ہونے کا سنہرا موقع مل گیا تھا۔

میں نے شیراڈ بند پھاٹک کے مقابل روک دی۔ چوکیدار دلیرانہ انداز میں باہر آچکا تھا۔ اس کے کندھے سے قیمتی رائفل جھول رہی تھی۔

"کس سے ملنا ہے صاب؟" اس نے میرے قریب آکر مشینی انداز میں سوال کیا تھا۔

"عبدالمنان صاحب دہلوی کا باغ یہی ہے؟" میں نے معصومانہ سادگی کے ساتھ سوال کیا۔

"نہیں صاب!" اُس نے پُر وثوق لہجے میں میرا سوال مسترد کر دیا۔ "یہ تو دلدار آغا صاب کا باغ ہے۔ پتا نہیں کہ وہ دہلوی ہے یا نہیں مگر ہم کسی عبدالمنان کو نہیں جانتا۔" اُس کے جواب میں طنز کا دور تک شائبہ بھی نہیں تھا۔

"بڑی مشکل ہے۔" میں نے ذہنی اُلجھن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں کل ہی لاہور سے یہاں آیا ہوں، وہاں ایک دوست نے بتایا تھا کہ ملیر کے علاقے میں عبدالمنان صاحب اپنا باغ بیچ رہے ہیں مگر میں باغ کا نام بھول گیا۔ ایسا تو نہیں کہ دلدار آغا نے عبدالمنان ہی سے یہ باغ خریدا ہو؟"

"پتا نہیں صاب!" اُس نے ایمانداری کے ساتھ اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیا۔ "میں چھ مہینے سے یہاں نوکری کر رہا ہوں۔ سنا ہے پہلے اس کا نام راجا فروٹ فارمز تھا۔ اب پتا نہیں کہ یہ کس نے کس سے خریدا ہے۔ ہم تو بس اسی مالک کا نوکری کرتا ہے جو ہمیں تنخواہ دیتا ہے۔ ویسے ہمارا صاب یہ باغ بیچنے والا نہیں معلوم ہوتا۔"

"تم یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟" میں دروازہ کھول کر کار سے نیچے اُتر آیا۔ شاید وہ بھی اس ویرانے میں ڈیوٹی دیتے دیتے اُکتا گیا تھا۔ اس لیے بات آگے بڑھانے میں مجھ سے زیادہ سرگرمی کا مظاہرہ کر رہا تھا اور میرے لیے دلدار کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا سنہرا موقع فراہم کر رہا تھا جسے میں پوری طرح استعمال کرنا چاہتا تھا۔

"یہاں سیکڑوں ایکڑ زمین پر گنتی کے لوگ رہتے ہیں جو موقع نکال کر ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ اس لیے ہم کو بھی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ ہمارا صاب تو خود اِدھر اور زمین خریدنے کے چکر میں ہے، وہ اپنا باغ کیوں بیچے گا؟ اور پھر اِدھر تو کوئی اور بھی اپنی زمین بیچنے کے لیے تیار نہیں کیونکہ یہاں زمین میں تھوڑی سی گہرائی پر میٹھا پانی نکل آتا ہے جس کی وجہ سے یہ زمینیں سونا بن گئی ہیں۔"

"اس وقت شاید تم ہی یہاں سب سے زیادہ ذمّے دار آدمی ہو؟" میں نے اُسے ہوا دینے کی کوشش کی۔

میرا وار کارگر رہا اور اس کی باچھیں پھیل گئیں۔ "ویسے تو صاب زمین اور فصل کی حفاظت کی ساری ذمّے داری ہمارے سر ہے۔ ہم دن رات چوبیس گھنٹے ڈیوٹی کرتا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ آدمی یا پلید جانور تو دُور کی بات ہے ہم کُتے کو بھی اندر نہیں آنے دیتا۔ ویسے اوپر کے کاموں کے لیے صاب کا منشی اِدھر رہتا ہے۔ ہم اپنا ڈیوٹی کرتا ہے، وہ اپنا کام کرتا ہے۔"

وہ کنجشک فرومایہ کا شاہین سے موازنہ کر رہا تھا۔ پھر اُس سے یہ سوال بھی کیا جا سکتا تھا کہ چوبیس گھنٹے چوکیداری کرنے اور مہینوں سے مسلسل بیدار رہنے کے باوجود اس کا دماغ خراب کیوں نہیں ہوا تھا مگر مصلحت کا تقاضا تھا کہ اس کی یاوہ گوئی کو فراموش کر کے اس کی خودی کو اتنی بلندی پر پہنچا دیا جائے کہ وہ کوشش کے باوجود اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکے۔

"تمہارا صاحب شاید اِدھر نہیں آتا جو اُسے تمہاری بھاری ذمّے داری کا علم ہو سکے؟"

"بس کیا بولے صاب! سب سیٹھ لوگ ایک جیسا ہوتا ہے۔ صاب مستی کے لیے شہر سے ہر دوسرے تیسرے ہفتے اِدھر آتا ہے۔ منشی چھوکری لوگ لاتا ہے اس لیے منشی ہے۔ ہم غیرت والا آدمی ہے اس لیے آنکھ بند کر کے اِدھر بیٹھا رہتا ہے۔"

میں نے غیرت کے اس شاہکار کو غور سے دیکھا پھر خواہ مخواہ جمائی لیتے ہوئے بولا۔ "یار! میرا تو دن ہی خراب ہو گیا۔ یہ بتاؤ کہ ملیر کے کنویں کا ٹھنڈا پانی بھی پلا سکو گے یا کہ نہیں؟"

"وہ منشی کا بچہ چغل خور ہے۔" چوکیدار کو جوش آگیا۔ "تم ہمارا مہمان ہے۔ ہم تم کو اندر لے جا کر تمہارا خاطر کرتا لیکن وہ سیٹھ سے شکایت کر دے گا۔ آغا صاحب کا حکم ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر کسی کو باغ میں نہ گھسنے دیا جائے۔ تم اِدھر ٹھہرو، ہم تمہارے لیے ٹھنڈا پانی لے کر آتا ہے۔"

"منشی تو پھر بھی پوچھے گا کہ تمہارے پاس گاڑی میں کون آیا تھا؟"

"ہم بول دے گا کہ ہمارا بھائی تھا۔" اُس نے میرا دل خوش کر دیا۔ "ہمارا گاؤں کا بہت آدمی دوبئی مسقط سے پیسہ کما کر لایا ہے اور کراچی میں پرائیویٹ ٹیکسی چلا رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم پانی لاؤ۔ تمہارے پیچھے منشی اِدھر آگیا تو میں بھی اس کو یہی بتاؤں گا تاکہ تمہاری بات جھوٹی نہ ہو۔" اس کا احسان مند ہونے کے بجائے میں نے اس پر احسان جتایا اور وہ سرہلاتا ہوا اندر چلا گیا۔

"میری تو ضرورت نہیں ہے؟" میدان صاف ہوتے ہی داہنی طرف کی گنجان اور خود رَو جھاڑیوں میں سے سلطان شاہ کی دھیمی آواز اُبھری جو اتنی بلند ضرور تھی کہ میرے کانوں تک پہنچ گئی۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" میں غصیلے لہجے میں غرّایا۔ "جہاں اُتارا تھا، وہیں چھپ کر میرا انتظار کرو، میں پانی پی کر واپس آتا ہوں۔"

"میں جا رہا ہوں۔" جھاڑیوں میں سے آواز اُبھری۔ "لیکن نظر یہ آرہا ہے کہ تمہاری پیاس بجھانے کے چکّر میں وہ بے چارہ اپنی نوکری سے جاتا رہے گا۔ میں ساری باتیں سُن چکا ہوں۔"

میں اس مَردُود کو دل ہی دل میں بُرا بھلا کہہ کر رہ گیا۔ وہ ہر جگہ خطرے کے وقت میرے قریب رہنے کے چکّر میں لگا رہتا تھا۔ بعض اوقات تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ بزرگانہ انداز میں میری سرپرستی کی فکر میں لگا ہوا ہے لیکن مجھے اس کے خلوص اور نیت کا اندازہ تھا اس لیے میں ہمیشہ ہی اس کی بچکانہ حرکتوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ بے شمار خطرات کا سامنا کیا تھا اور ہر جگہ قسمت نے ہمارا ساتھ دیا تھا لیکن کم از کم دو مواقع ایسے درپیش آئے تھے جب میں پوری طرح آزاد اور خطرے سے محفوظ تھا جب کہ سلطان شاہ تقریباً موت کے جنگل میں جا چکا تھا۔ ایک بار اُسے شی کی گن بوٹ پر زندہ منجمد کرنے کی کوشش کی گئی تھی جس سے وہ صرف اس بنا پر بچ سکا کہ میں نے اچانک ہی آئی مین کا سوانگ رچا کر گن بوٹ کا کنٹرول حاصل کر لیا تھا اور دوسری بار تو مارسیلز میں مادام فلورا کے گیسٹ ہاؤس میں جمی لائیڈ سے براہِ راست ٹکراؤ کے نتیجے میں میں نے سلطان شاہ کی فاتحہ ہی پڑھ لی تھی لیکن جمی لائیڈ نے اس کی نقل و حرکت سے پوری طرح باخبر ہوتے کے باوجود اُسے چارا بنانے کے لیے زندہ رکھا اور سلطان شاہ موت کے منہ میں جاتے جاتے بال بال بچ گیا۔

چند منٹ کے اس خالی وقت میں میں ماضی کے ان واقعات پر غور کرتا رہا۔ میرے خیالات کا سلسلہ اسی وقت موقوف ہوا جب چوکیدار میرے لیے ایک جگ میں ٹھنڈا پانی اور اسٹیل کا گلاس لے آیا۔

"تم ٹھیک کہتا تھا۔" اُس نے گلاس پانی سے لبریز کر کے میرے حوالے کرتے ہوئے جلے بھُنے لہجے میں کہا۔ "منشی نے دُور سے تمہاری گاڑی دیکھ لی ہے۔ اُس نے مجھ سے سوال کیا اور میں نے وہی کہہ دیا جو تم کو بتا کر گیا تھا۔"

"تم بہت سعادت مند بچے ہو۔" میں نے دل میں سوچا اور ٹھنڈے پانی کا ایک گھونٹ لے کر بلند آواز میں کہا۔ "مزہ آگیا، یہاں کا پانی واقعی بہت اچھا ہے . . . تم یہ بتاؤ کہ آغا صاحب اب کب اِدھر آئے گا؟ میں اس سے مل کر منشی کا دماغ درست کراؤں گا۔"

"بے کار ہے ۔۔۔ منشی لوگ کام کی نہیں، دلّالی کی تنخواہ لیتے ہیں۔ پھر ویسے بھی موت کی طرح سیٹھ لوگ کے مزاج کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ دل چاہے تو کل ہی آجائے، دل چاہے تو ہفتوں نہیں آئے گا۔ تم ہمارے چکّر میں مت پڑو۔ کام جیسا بھی ہوتا ہے، ہو ہی جاتا ہے لیکن سیٹھ ہم کو تنخواہ اچھی دیتا ہے جو اس کام میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔"

اس سے جو کچھ معلوم ہو گیا تھا، وہ اُس کی حیثیت کے پیشِ نظر توقع سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ ساتھ ہی اس کے طرزِ گفتگو سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ وہ دلدار کے رازدارانہ کاموں سے لاعلم تھا۔ ایسے معاملات میں شاید پہلی کڑی منشی کی ذات تھی جس سے اُلجھنے کا مقصد دلدار کو خطرے سے ہوشیار کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔ لہٰذا میں نے چوکیدار کا شکریہ ادا کر کے اس طویل ملاقات کو ختم کیا اور فوری طور پر وہاں سے واپس روانہ ہو گیا۔ واپسی میں گاڑی کے پیچھے گرد و غبار کے بادل اُمڈ رہے تھے اس لیے مجھے کسی ہیر پھیر کی ضرورت نہیں پڑی اور میں راستے سے سلطان شاہ کو ساتھ لیتا ہوا شہر کی طرف ہو لیا۔

راستے میں اس گفتگو پر سلطان شاہ سے تبادلۂ خیال ہوا۔ نتائج بالکل سامنے تھے کہ دلدار نے اپنی جو بھی حیثیت بنائی یا ظاہر کی ہوئی تھی وہ اس کی اپنی نہیں تھی بلکہ اس کی ساری بنیاد وہ اختیارات تھے جو شی کا مقامی سربراہ ہونے کی وجہ سے اُسے حاصل تھے۔ راجا فروٹ فارمز کو شاہ باغ کا نام دے کر بھی وہ خاندانی جاگیرداروں کی صف میں شامل نہیں ہو سکا تھا۔

میری دانست میں وہ دلدار کے خلاف پہلا ٹھوس ثبوت تھا۔ اس نے غزالہ کو بتایا تھا کہ ملیر کے باغات اس کے بزرگوں نے چالیس برس پہلے قائم کیے تھے جب کہ اس کا وہ

دعویٰ کسی بھی وقت جھوٹا ثابت کیا جا سکتا تھا مگر عزالہ کو دلدار کے مکروہ کردار سے باخبر بلکہ ہوشیار کرنے کے لیے وہ واحد ثبوت زیادہ وزنی نہیں تھا۔

واپسی پر سلطان شاہ نے جنیسر ہالٹ کے مقام پر میرا ساتھ چھوڑ دیا کیونکہ اپنے کام کے آغاز کے لیے وہ اپنے قابلِ اعتماد دوستوں اور ہمدردوں سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا جو ضرورت کے وقت اسے نہ صرف افرادی قوت بلکہ ہر قسم کا آتشیں اسلحہ بھی فراہم کر سکتے تھے جس کے بغیر ڈی ڈی کے خلاف کسی معرکے میں سرخرو ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ ان لوگوں سے ملاقات کے بعد وہ بنارس کالونی والے ٹھکانے پر اپنی رہائش کا بندوبست کر کے دلدار کی دوا ساز فیکٹری میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دیتا جب کہ مجھے اس شام بخت آور کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد اگلے دن فلیٹ پر رہ کر گمبی گمبی والے اشتہار کے جواب میں آنے والی فون کال کا انتظار کرنا تھا جو یقینی طور پر اس معاملے میں ایک نیا موڑ پیدا کر سکتی تھی۔

بخت آور محکمۂ اوزان میں انسپکٹر تھا اور اپنے اختیارات کے ذریعے ہر ماہ خاصی معقول بالائی آمدنی پیدا کر لیتا تھا اپنی ملازمت کے اعتبار سے اس کا معیارِ زندگی اتنا بلند تھا کہ محلے میں وہ شریف کہلانے کے باوجود راشی بھی کہا جاتا تھا لیکن اپنی پوری تحقیقات میں مجھے کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہو سکی جو شی یا ڈی ڈی سے اس کے تعلق پر روشنی ڈال سکتی۔ افسرانہ اختیارات اور فیلڈ ورک کی وجہ سے اس کے معمولات میں بہت بے ترتیبی پائی جاتی تھی جس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرتا ہو۔

اس کے بارے میں وہ تمام باتیں معلوم کرنے میں اندھیرا پھیل گیا تھا اس لیے اس بارے میں مزید پیش رفت نہ ہو سکی اور میں نے فوری طور پر ہر مسئلے کو بھول کر گمبی گمبی والے فون کے بارے میں ذہنی تیاریاں شروع کر دیں۔

اگلے دن کے اخبار میں میرا دیا ہوا اشتہار آخری صفحے پر نمایاں طور پر شائع ہوا تھا۔ میں نے کئی بار اس کا متن غور سے پڑھا لیکن اس میں کہیں کوئی مشتبہ نکتہ نوٹ نہ کر سکا۔ صبح اس کے بارے میں دو فون کالز ایسے افراد کی تھیں جو واقعی بچوں کے کھلونوں کی تھوک خریداری میں دلچسپی رکھتے تھے لیکن جب میں نے ان سے نقد سودوں کا ذکر چھیڑا تو گمبی گمبی کھلونوں میں ان کی دلچسپی یک لخت ختم ہو گئی۔ کمیشن اور داموں سے زیادہ انھیں دو سے تین ماہ تک کے ادھار میں دلچسپی تھی تاکہ وہ اس میں اپنا سرمایہ پھنسائے بغیر کما کر ادھار کی رقم دیتے رہیں اور یوں ہر وقت ان کے پاس کم از کم ایک کھیپ کا پیسہ پھنسا رہے۔

لیکن تیسری کال وہی تھی جس کا مجھے بے چینی سے ساتھ انتظار تھا۔

میرے ریسیور اٹھاتے ہی اُس نے کسی تمہید کے بغیر اپنا کوڈ دہرایا تھا۔ آواز بھاری اور تحکم آمیز تھی جس سے بولنے والے کی سخت گیر طبیعت کی غمازی ہوتی تھی۔ جواب میں میں نے سرد لہجے میں اپنا کوڈ اُسے سُنا دیا۔

"کیا فیصلہ ہے تمھارا؟" کوڈ کا تبادلہ مکمل ہوتے ہی اُس نے براہِ راست سوال کر ڈالا۔

"صرف پیغام ملنے پر تو کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا میلان والے سے میری ملاقات تفصیلی نہیں تھی. . ."

"میلان اور لندن کی گفتگو مجھ سے مت کرو۔" کٹکھنے کتے کی سی غراہٹ سنائی دی۔" مختصر اور سیدھی بات کرو کہ کیا چاہتے ہو؟"

"رابطے کا ذریعہ اور ملاقات کی صورت جاننا چاہتا ہوں" میں نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

اور پھر اس سے اس بارے میں گفتگو چل پڑی جو بہت سنسنی خیز اور ایک اعتبار سے فیصلہ کن تھی۔

"رابطہ ہو چکا ہے، ملاقات فی الحال ناممکن ہے۔" اُس کا لہجہ اس بار سپاٹ تھا۔ "جب تک تمھارے فیصلے کا علم نہ ہو جائے یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ طریقۂ کار کیا ہے گا۔"

"شاید تمھیں علم ہو کہ مجھے کسی معمولی کام کی آفر نہیں ملی تھی" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔" ایک سینئر پوزیشن کے لیے مذاکرات کرتے ہوئے بہت سی رعایتوں کو مدِنظر رکھنا پڑتا ہے کیونکہ اسی سے مستقبل کے بارے میں کوئی اندازہ ہو سکتا ہے۔"

"پوزیشن سینئر ضرور ہے لیکن تم میری جگہ نہیں آ رہے ہو جو اس طرح مشورے دے رہے ہو، میں اپنا کام اچھی طرح جانتا ہوں، میری ساری عمر بھانت بھانت کے لوگوں سے کام لیتے ہوئے گزری ہے۔"

"یعنی مجھے براہِ راست تمھاری ماتحتی میں کام کرنا ہو گا؟" میں نے سوال کیا۔

"اتنی جلدی نتائج اخذ مت کرو۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔" ضروری نہیں کہ تم براہِ راست مجھ کو جواب دہ ہو تمھاری صلاحیتوں کو دیکھ کر میں اپنی صوابدید کے مطابق کوئی فیصلہ کروں گا۔ بہت سے لوگ لیڈر کے طور پر بڑی طرح ناکام ہوتے ہیں لیکن کسی کی ماتحتی میں رہ کر بہترین کارگزاری کا مظاہرہ کرتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ تمھیں کسی اور کے سپرد کرنا پڑ جائے۔"

"پھر شاید میرے بارے میں تمھاری معلومات ناقص اور نامکمل ہیں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔" تم سے زیادہ تو فرانکو لومبارڈی باخبر تھا اور جانتا تھا کہ کس شخص سے کس طرح بات کرنی چاہیے۔ میرا اندازہ ہے کہ تم سے نہ میرا براہِ راست رابطہ کامیاب رہے گا اور نہ میں بالواسطہ طور پر تمھارے ساتھ کام کر سکوں گا۔ یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔"

پہلی بار اُس نے میرا سخت لہجہ اور تیکھے الفاظ نظر انداز کیے کیونکہ جواب میں اُس کا لہجہ پُرسکون رہا تھا۔" تمھیں شاید ضرورت سے زیادہ توقعات پیدا ہو گئی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں فرانکو کا قصور رہا ہو لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں سب سے پہلے تمھارا عندیہ معلوم ہونا چاہیے۔ اگر تم اصولی طور پر رضامند ہو تو معاملات آگے بڑھ سکتے ہیں ورنہ یہ باب یہیں ختم ہو جائے گا۔"

"اصولی رضامندی نہ ہوتی تو گمبی گمبی والے اشتہار کی نوبت ہی نہ آتی۔ یہ سیدھی سی بات تمھیں بھی سمجھ لینی چاہیے تھی۔" میں نے اُس سے ذرا بھی مرعوب ہوئے بغیر مساویانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے بلاوجہ اپنا وقت اور پیسہ برباد کرنے کا شوق نہیں ہے۔" وہ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جو پہلی ہی ملاقات یا گفتگو میں اپنے مخاطب کو جارحانہ طرزِ گفتگو سے زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اس کی مدافعانہ قوت کا اندازہ لگا کر اُسے تھوڑی بہت ڈھیل دینے پر آمادہ ہوتے ہیں ورنہ ہمیشہ دوسروں کے سر پر سوار رہنا پسند کرتے ہیں۔

"شی میں تم غالباً کسی بہت اعلیٰ سطح پر کام نہیں کر رہے تھے؟" اُس کی چبھتی ہوئی لیکن قدرے نرم آواز اُبھری۔" مقامی سطح پر ضرور تم کچھ لوگوں سے کام لینے پر مامور تھے لیکن اب تمھاری توقعات بہت بڑھی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔"

"تمھارے لب و لہجے سے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم بھی کوئی بین الاقوامی شخصیت نہیں ہو۔" میں نے بھی. . . . نرم لہجے میں اُسے رگیدنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔" مجھے اگر بتایا نہ گیا ہوتا تو شاید اس خطے میں تمھارے وجود کا بھی پتا نہ چلتا۔ شی کا اور تمھارا موازنہ ہاتھی اور چیونٹی کی مثال سے کیا جا سکتا ہے لیکن میں نے مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے ہاتھی سے ٹکراؤ مول لیا ہوا ہے۔ تم اگر ایک عدد بین الاقوامی پاسپورٹ بنوا کر لندن، پیرس، مارسیلز اور میلان کا چکر لگا آؤ تو ہمارے مذاکرات سود مند ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"کیا بک رہے ہو؟" اس بار وہ بُری طرح بھڑک اُٹھا۔ پاسپورٹ بنوانے کا مشورہ دے کر میں نے اسے کنویں کا مینڈک قرار دینا چاہا تھا اور وہ میرا مقصد سمجھ گیا تھا اس لیے غصیلے لہجے میں بولا۔" میں نے بھی دنیا دیکھی ہوئی ہے! ایک بار نہیں، دس بار دنیا گھوم چکا ہوں۔ جب سے تم نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا ہے، میرے آدمی ہر لمحے سائے کی طرح تمھارے پیچھے لگے رہے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ دلدار آغا کی بیوی کسی زمانے میں تمھاری محبوبہ رہ چکی ہے اور وہ کل رات تم سے ملنے ہالی ڈے اِن میں آئی تھی۔ اس لیے باخبری اور بے خبری کی باتیں نہ کرو، تمھیں پرکھ کر میں جو کچھ جاننا چاہتا تھا، وہ میں نے معلوم کر لیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ اب مجھ سے کب اور کہاں ملنا چاہتے ہو؟ میں اس پر غور کر کے تمھیں دوبارہ رِنگ کروں گا۔"

آخر میں اس کا لہجہ حیرت ناک حد تک نرم اور دوستانہ ہو گیا۔ جس کا سبب اس نے خود ہی بتا دیا تھا کہ وہ مجھے بھڑکا کر میرے مزاج کے بارے میں کچھ اندازے قائم کرنا چاہتا تھا۔ جس میں وہ کامیاب رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس مردود کے طریقۂ کار کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا پھر دلدار، عزالہ اور ہالی ڈے اِن کے بارے میں اس کے انکشافات بھی حیران کن تھے جب اُس نے وہ کلیدی نکتے بتا دیے تھے تو اس اَمر میں شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ میری باقاعدہ نگرانی کی گئی تھی جو اس وقت فلیٹ میں محبوس ہونے کے باوجود بھی شاید جاری تھی مگر میں اس سے یکسر لاعلم تھا۔

"فرض کرو کہ اب میں تمھارے ساتھ کام نہ کرنا چاہوں تو کیا ہو گا؟" چند ثانیوں کے تفکر آمیز سکوت کے بعد میں نے اچانک قلابازی کھانے کا فیصلہ کر لیا پہلے وہ ایک کھلونے کی طرح ٹٹول رہا تھا تو اب میں اس کا ذہن پڑھنا چاہ رہا تھا۔

"ہونا کیا ہے، ہم تمھیں بھول جائیں گے اور تم بے یار و مددگار رہ جاؤ گے۔ ہمارا کام پہلے بھی چل رہا تھا، اب بھی اسی طرح چلتا رہے گا۔ ہمیں ایک دلیر اور بے خوف آدمی کی تلاش ہے لیکن سرکشی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ تمھاری طبیعت میں سرکشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ایسا آدمی ڈسپلن کی کم ہی پروا کرتا ہے۔"

"اس رائے کے باوجود تم مجھ سے ملاقات پر آمادہ ہو؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"یہ عارضی رائے ہے، ہو سکتا ہے کہ دُو بہ دُو ملاقات میں تم اس تاثر کو زائل کرنے میں کامیاب ہو سکو۔ تم میں جو بھی خرابیاں ہوں لیکن مجھے ایک بات پسند آئی ہے کہ تم تیزی سے کام کرنے کے عادی ہو۔ . . شاید آج تم شاہ باغ میں بھی گئے تھے؟"

اُس کے انکشاف نے میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ اس وقت مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ کوئی عام سا، تند خُو اور بد مزاج بدمعاش نہیں تھا بلکہ بہت گھاگ آدمی تھا جو دوسروں کے مزاج اور تحمل سے کھیلنا اچھی طرح جانتا تھا۔ شاہ باغ کی طرف جاتے ہوئے یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ مافیا والے میرا تعاقب کر رہے ہوں گے لیکن میں شی کی طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ میں نے سارے راستے کسی مشتبہ کار یا موٹر سائیکل پر نگاہ رکھنے کی کوشش کی تھی جو میرا تعاقب کر رہی ہو لیکن ناکام رہا تھا۔ پھر شہر سے باغات کی طرف لمبے لمبے ویران راستوں پر مُڑنے کے بعد تو امکان ہی نہیں رہا تھا کہ کوئی میری کار کے عقب نما شیشے میں نظر آئے بغیر تعاقب جاری رکھ سکتا لیکن اُس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میرا تعاقب کیا گیا تھا۔

"تو تم مسلسل میری نگرانی کرا رہے ہو؟" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"تمھیں ایک ذمّے دار شخص کے طور پر اپنی صفوں میں قبول کرنے سے پہلے یہ سب بہت ضروری ہے۔ آدمی چھوٹی موٹی سرکاری نوکری کرے تو بھی اس کی پولیس انکوائری ہوتی ہے، ہمیں نسبتاً زیادہ احتیاط کرنی پڑتی ہے۔"

"شاید شاہ باغ کا چوکیدار تمھارا آدمی ہے؟" بے ساختہ میرے مُنہ سے نکل گیا۔

اُس کی ہنسی پُر غرور تھی۔ "تمھارا باقاعدہ تعاقب کیا گیا تھا اور پل پل کی خبر رکھی گئی تھی، کہو تو تمھارا روٹ بھی دُہرا دوں؟"

"تم مجھے مرعوب کرنا چاہ رہے ہو، میرے پیچھے کوئی نہیں تھا۔" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"تمھارے پیچھے ہی تھا لیکن سڑک پر نہیں، تمھاری کالی شیراڈ کی مختصر سی ڈگی میں تھا۔ ایسے کاموں کے لیے وہ کار بہت تکلیف دہ اور خطرناک ہے، میرے آدمی کی کمر دُہری ہو گئی لیکن غنیمت ہے کہ وہ تمھاری نظروں سے بچا رہا، پکڑا جاتا تو گمبھی گمبھی کے علاوہ تمھیں ایک لفظ بھی نہ بتاتا خواہ تم اُسے ذبح ہی کر ڈالتے۔"

مَیں نے محسوس کیا کہ اس سے گفتگو خاصی طویل ہو چکی تھی۔ شاید وہ وقفے وقفے سے حیران کُن انکشافات کر کے [illegible] سے پہلے ہی مجھے ذہنی طور پر خائف کرنا چاہ رہا تھا۔ مَیں نے وہ سلسلہ ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"آج شام چار بجے میرے فلیٹ میں ملاقات کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"چار بجے اجالا ہوتا ہے، ایسے کاموں کے لیے رات کا اندھیرا مناسب رہتا ہے، آٹھ بجے کا انتظار کر لو۔" اس کی آواز دھیمی اور لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

"میں انتظار کروں گا۔" میں نے بلا توقف آمادگی [illegible] مندی کا اظہار کر دیا۔ "لیکن تم میرے لیے اجنبی ہو، [illegible] کیسے پہچان سکوں گا؟"

"آدمی وہی ہیں، شناخت بھی وہی رہے گی، [illegible] ہوں اور تم شوٹر رہو گے۔"

اس کے بعد سلسلہ منقطع ہو گیا اور میں نے تھکن کے احساس کے ساتھ ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

مافیا کے کراچی بیورو کے چیف کی اس فون کال نے میرے اعصاب پر خاصا بوجھ ڈال دیا تھا۔ میلان میں [illegible] لومبارڈی سے ملاقات کے بعد میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ [illegible] کا قصہ میلان میں ہی رہ گیا تھا اور پاکستان میں مافیا والوں سے رابطہ قائم کرنا یا نہ کرنا میرے اپنے اختیار میں تھا۔ اس فون کال نے میری وہ غلط فہمی دور کر دی تھی۔

میلان میں شروع ہونے والی میری نگرانی دوران [illegible] جاری رہی تھی یا نہیں اس بارے میں میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ مافیا والوں کے عالمی مواصلاتی رابطے قابلِ رشک حد تک مستعد تھے۔ فرانکو لومبارڈی سے ملاقات کے بعد پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی میری نقل و حرکت پر نگاہ رکھی گئی تھی۔ اس امر کا قوی امکان نظر آنے لگا تھا کہ اگر ایک [illegible] مدت تک میری طرف سے کسی قومی اخبار میں گمبھی گمبھی [illegible] اشتہار شائع نہ کرایا جاتا تو شاید وہ لوگ خود ہی مجھ سے رجوع کر بیٹھتے۔

ایک طرف ہالی ڈے اِن میں میری اور غزالہ کی [illegible] کی وجہ سے دلدار کو شہر میں میری موجودگی کا پتا چل سکتا تھا کیوں کہ غزالہ اس کی لاعلمی میں مجھ سے ملنے آئی تھی مگر دلدار کے دو آدمی اس کی نگرانی کر رہے تھے جن میں سے ایک اتفاقی طور پر سلطان شاہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا، اگر دوسرا واقعی شی کا آدمی تھا، جس کا مجھے یقینِ قوی تھا . . . تو غزالہ کے زبان بند رکھنے کے باوجود وہ اپنے آدمیوں سے ملی ہوئی رپورٹ کی بنا پر بآسانی اندازہ لگا سکتا تھا کہ غزالہ کس سے ملنے گئی ہو گی۔ اس واقعے کے اگلے ہی دن امیر داد کے قتل کی واردات سے میرے بارے میں ڈمی ڈی یا دلدار کے شبہات کو تقویت مل سکتی تھی۔ دوسری طرف مافیا والے سائے کی طرح میرے پیچھے لگے ہوئے تھے اور گھر سے باہر میری پل پل کی نقل و حرکت سے پوری طرح باخبر تھے۔ زیرِ زمین دنیا میں رائج اخلاقیات کی رُو سے یہ امکان تو نہیں تھا کہ مافیا سے میرے تعاون سے انکار کی صورت میں وہ لوگ میرے بارے میں ساری معلومات کسی طرح دلدار کو پہنچا دیں اور شی اپنی پوری قوّت کے ساتھ ایک بار پھر میرے خلاف سرگرمِ عمل ہو جائے لیکن گریز کی صورت میں دوسرے بہت سے ناگزیر خطرات پوشیدہ تھے جن سے محفوظ رہنے کی واحد صورت یہی تھی کہ مَیں مافیا والوں سے دوستی کر کے ان کے لیے کام شروع کر دوں۔

کامٹ کے کوڈ سے پہچانے جانے والے نے یہ انکشاف کر کے مجھے ششدر کر دیا تھا کہ اس کا آدمی میرے سر پر پیاز کتر کر چلا گیا تھا اور میرے فرشتوں کو بھی اس کی موجودگی کی ہوا نہ لگ سکی۔ وہ شخص یقینی طور پر میرے فلیٹ پر پہنچتے ہی موقع پا کر کار میں چُھپا ہو گا۔ اگر میں سلطان شاہ کے ساتھ اتفاقاً شاہ باغ جانے کا پروگرام نہ بنا لیتا تو وہ شاید سارا دن ہی کار کی مختصر سی ڈگی میں بھوکا پیاسا سڑتا رہتا۔ میں یہ سوچنے لگا کہ دورانِ سفر سلطان شاہ سے میری کیا گفتگو ہوئی تھی کیوں کہ وہ تمام باتیں یقینی طور پر مافیا کے آدمی نے سُن لی تھیں اور مجھے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرتے ہوئے اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا تھا۔

بہت غور و فکر کے بعد مجھے صرف ایک ہی ایسی بات یاد آ سکی جو مافیا والوں کے کسی کام آ سکتی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ سلطان شاہ نے سفر کے دوران میں ایک بار مجھے یاد دلایا تھا کہ غزالہ سے کیے ہوئے وعدے کی بنا پر میں دلدار سے کسی تصادم میں ملوث نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن وہ کوئی ایسی خطرناک بات نہیں تھی جس کی بنا پر مافیا والے مجھے کوئی نقصان پہنچا سکتے۔

مَیں ان ہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ دوسری گھنٹی بجنے پر میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے سلمیٰ کی شوخ آواز سُن کر میرے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

"تم کہاں غائب ہو؟ کل صبح سے گئے ہو تو پلٹ کر اِدھر کی خبر بھی نہیں لی!"

"بس فلیٹ پر آرام کر رہا ہوں۔" مَیں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "تم اخبارات میں پڑھ رہی ہو گی کہ شہر میں ایک بار پھر مار دھاڑ اور ہنگاموں کا سلسلہ چل پڑا ہے اس لیے گھر میں محدود رہنے میں ہی عافیت ہے۔ مجھے اس خیال ہی سے نفرت ہے کہ میں راستہ چلتے ہوئے اچانک کسی ایسی گولی کا نشانہ بن جاؤں جو خاص طور پر میرے لیے نہ چلائی گئی ہو۔"

"اوہ خدا!" ریسیور پر اس کی تحیّر آمیز آواز سنائی دی۔ "تم نے خوب یاد دلایا۔ مَیں تو وہ واقعہ بھول ہی گئی تھی۔ تم اسی قتل کا ذکر کر رہے ہو نا جس کے مقتول کے بارے میں تنازعہ کھڑا ہو گیا ہے؟ علاقے کے لوگ کہتے ہیں کہ مرنے والا چھٹا ہوا غنڈا تھا اور پولیس مصر ہے کہ وہ ایک شریف شہری تھا کیوں کہ تھانے میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک سمجھی ہو۔" مَیں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "لیکن تمھارے لیے اس واقعے میں اچانک اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی؟"

"سچ سچ بتانا کہ اسے تم نے تو نہیں مارا تھا؟" اس کی سرگوشیانہ آواز میں خوف و ہراس سمٹ آیا۔

"پاگل ہو گئی ہو۔ میں کیوں کسی کو مارنے لگا؟" مَیں نے ہنستے ہوئے کہا لیکن اس کے بے ساختہ سوال پر میری ریڑھ کی ہڈی میں کروڑوں چیونٹیاں سی سرسرانے لگی تھیں۔ "یہ بے ہودہ خیال کیسے آیا تمھارے ذہن میں؟"

"ابھی تمھاری بی جمالو کا فون آیا تھا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی، اس کے شوہر نے اسے بتایا ہے کہ کل کسی نے اس کی حفاظت کرنے والے شخص کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ انتقامی کارروائی تمھاری رہی ہو گی، اس نے رو رو کر التجا کی ہے کہ تمھیں روکا جائے، اگر تم غزالہ کو خوش اور آباد دیکھنا چاہتے ہو تو اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ ورنہ وہ اپنے شوہر کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی اور خودکشی کر لے گی۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اس آدمی نے بی جمالو سے تمھارے ساتھ ہونے والی ملاقات کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پوچھا۔"

"یہ بکواس ہے، مَیں کیوں کسی کے خون سے ہاتھ رنگنے لگا . . .!" مَیں نے کہنا چاہا لیکن سلمیٰ نے میری بات کاٹ دی۔

"اس وقت مجھے خیال نہیں آیا تھا لیکن اب تمہارے کہنے سے یاد آیا کہ تمہاری اور غزالہ کی ملاقات کے بعد سے اب تک شہر میں صرف ایک ہی قتل کی خبر چھپی ہے جس کے بعد اس علاقے میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ اگر غزالہ کا پیچھا کرنے والا کوئی اور تھا تو اس کے قتل کی خبر کہاں سنسر ہو گئی؟ اخبار والے تو کھود کھود کر دنیا جہان کی خبریں نکال لیتے ہیں!"

"یہ وہم اپنے ذہن سے نکال دو ورنہ تم میرے ساتھ جہانگیر کے لیے بھی دشواریاں کھڑی کر دو گی۔" میں نے سخت تادیبی لہجے میں کہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کے شوہر نے اسے خوف زدہ کرنے کے لیے وہ شوشا چھوڑا ہو، مجھ سے ملاقات کا ذکر کیے بغیر محافظ کے قتل کی خبر سنا کر وہ بالواسطہ طور پر غزالہ کو دھمکا رہا ہو گا کہ وہ اس کے علم میں لائے بغیر کوئی قدم اٹھانے سے باز رہے ورنہ اس کو سخت سزا سے دوچار ہونا پڑے گا اور پھر اخبار میں چھپنے والی خبر کا غزالہ کے معاملے سے کیا تعلق؟ اس کے بارے میں تو صاف طور پر لکھا گیا ہے کہ وہ دو لسانی گروہوں کا باہمی تصادم تھا جس کی ابتدا ایک بدنصیب کے خون سے ہوئی۔"

"چلو! جو تم کہتے ہو، مانے لیتی ہوں۔ اب ادھر کب آ رہے ہو؟"

"غزالہ نے تم کو فون کیوں کیا تھا؟" میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے دوستوں میں وہ صرف جہانگیر سے واقف ہے، مجھ سے وہ تمہارا پتا معلوم کر رہی تھی۔ جب میں مسلسل لاعلمی کے اظہار پر اڑی رہی تو مجبوراً اس نے وہ پیغام دیا جو میں تمھیں سنا چکی ہوں۔ ویسے تمہاری بی جمالو بڑی چالاک اور مکار ہے۔ فون پر رونے اور گڑگڑانے کی ایسی اداکاری کر رہی تھی کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اسے مظلوم سمجھ کر موم ہو جاتا۔"

"اس نے فون اپنے گھر سے ہی کیا تھا؟" میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔ جب ڈی ڈی حفاظت کے بہانے گھر سے باہر اس کی نگرانی کرا سکتا تھا تو اس سے بعید نہیں تھا کہ وہ غزالہ کی فون کالز بھی سننے کی کوشش کرتا۔

"پتا نہیں، جب وہ تمھیں چھوڑ کر دوسرے کی گود میں جا بیٹھی ہے تو تمھیں اس کی آتنی فکر کیوں ہے؟" اس نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ "تم کو تو اب اس کے نام پر جوتی الٹی کر دینی چاہیے۔ پتا نہیں تم کس امید پر ابھی تک اس کے نام کی مالا جپ رہے ہو؟"

"امید کچھ نہیں ہے سلمیٰ! بس گزرے ہوئے دلوں کے تعلق کا پاس ہے۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "میں کبھی پارسا نہیں رہا۔ میں نے ایک دور ایسا بھی گزارا ہے جب خوبرو لڑکیوں سے بس لمحوں کی شناسائی ہوا کرتی تھی۔ رات کو سب کچھ قرار دیتا تھا، صبح ہوتے ہی اسے بھول جایا کرتا تھا لیکن محبت میں نے پہلی بار صرف غزالہ سے کی تھی۔ اس کی بے وفائی کو میں رفتہ رفتہ ہی قبول کر سکوں گا۔"

"چلو حساب برابر ہوا۔ پہلے تم لڑکیوں سے آنکھیں بدل لیتے تھے، اب ایک لڑکی نے تم سے آنکھیں بدل لی ہیں۔" بات کرتے کرتے ہی ایک دم وہ چونک پڑی۔ "ہاں! تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ غزالہ نے نامساعد حالات سے گھبرا کر ایک شریف آدمی سے شادی کر لی ہے۔ پھر اب وہ شریف آدمی اسے سخت سزا کی دھمکی کیوں دے رہا ہے؟ اسے خوف زدہ کیوں کرنا چاہتا ہے؟"

"جہانگیر کو تم شریف سمجھتی ہو یا بدمعاش؟" میں نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔ مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا کہ میں اس موضوع کو ختم کرنا چاہ رہا تھا اور وہ بات آگے بڑھائے جا رہی تھی۔

"سچ پوچھو تو شریف بدمعاش!" اس کے بے ساختہ جواب نے مجھے بھونچکا کر دیا۔ "لیکن یہ ان کو نہ بتا دینا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مجھے ان کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے مگر میں پہلے بھی تمہیں بتا چکی ہوں کہ گارمنٹ فیکٹری خریدنے سے پہلے وہ جو کچھ کرتے رہے، اس کے بارے میں مجھے کبھی بھی پوری طرح مطمئن نہیں کر سکے تھے۔ زیادہ سوال جواب کرتی تو غصے میں آپے سے باہر ہونے لگتے تھے، اس لیے میرا خیال ہے کہ پہلے وہ پکے بدمعاش تھے، لیکن اب شریف ہو گئے ہیں، البتہ تم پر مجھے اب بھی شبہ ہے۔"

"مجھے گولی مارو اور صرف جہانگیر کی بات کرو۔" میں غصے سے بولا۔

"ہائے! ایسا نہ کہو پیٹر!" غنیمت تھا کہ اس نے جذباتی ہونے کے باوجود میرا اصل نام نہیں لیا تھا۔ "میں گولی تو درکنار، تمہیں گلاب کے پھول بھی نہیں مار سکتی، یہ توقع تو تمہیں اپنی بی جمالو سے کرنی چاہیے۔ وہ گولی تو کیا، گولا بھی مار سکتی ہے۔"

"اب اگر تم نے غزالہ کا ذکر نکالا تو میں فون بند کر دوں گا۔" میں نے غرا کر کہا۔

"اچھا! اس منحوس پر مٹی ڈالو! اب بتاؤ کہ تم کیا کہہ رہے تھے؟"

لمحے بھر کے لیے میں چکرا کر رہ گیا۔ یاد ہی نہ آ سکا کہ اس سے کیا بات ہو رہی تھی۔

"شاید میرے سوال کا جواب سوچ رہے ہو؟" لائن پر سکوت پا کر وہ بولی۔ "ہو سکتا ہے کہ بی جمالو کی حرکتوں کی وجہ سے اس کا شریف شوہر بھی اب کھلی کھلی بدمعاشیوں پر اتر آیا ہو؟"

مجھے یاد آ گیا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ "اگر آج تم جہانگیر سے چھپ کر کسی غیر مرد سے ملنے لگو تو لازمی بات ہے کہ وہ اپنی ساری شرافت بھول کر مرنے مارنے پر تل جائے گا۔ یہی کچھ غزالہ کے شوہر کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے مجھ سے کیا کہا اور کس طرح میری حوصلہ شکنی کی، یہ ایک دیگر بات ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے اعتماد کو فریب دے کر مجھ سے ملی تھی۔ اس لیے اگر وہ شریف آدمی اب اسے ڈرا دھمکا کر راہِ راست پر لانا چاہ رہا ہے تو اسے ایسی ہر کارروائی کا پورا اخلاقی حق حاصل ہے۔"

"تمھیں اسی لیے تو کبھی کبھی ٹوٹ کر چاہنے کو دل چاہتا ہے کہ جب، جو کہہ دیتے ہو اس کے حق میں زبردستی ہزار تاویلیں گھڑ لیتے ہو۔" اس کی آواز میں والہانہ پن عود کر آیا۔ "لعنت بھیجو اس بی جمالو اور اس کے شوہر پر۔ یہ بتاؤ کہ گھر کب آؤ گے؟"

اس وقت میرے ذہن پر غصے کے ساتھ ہی جھلاہٹ بھی سوار تھی لیکن سلمیٰ کے سوال نے میرے دماغ میں ناامیدی کی ایک آگ سی بھڑکا دی اور ذہن میں بے اختیار ایک شعر کی گونج ابھر آئی۔

ع شام ہونے کو ہے، کدھر جائیں
اپنا گھر ہو تو اپنے گھر جائیں

"گھر ہو گا تو ضرور گھر جاؤں گا۔" میں نے اداس لہجے میں کہا۔ "ابھی تو نہ در ہے نہ گھر۔ شام ہو گی تو شاید جہانگیر یہاں آئے گا، میں غم غلط کروں گا، وہ موڈ بنائے گا، وہ گھر چلا جائے گا اور میں گھر کی جستجو میں رہ جاؤں گا۔ تم ایک گھر دار عورت ہو سلمیٰ! میرا نہیں، جہانگیر کا انتظار کیا کرو۔ مانا کہ وہ باپ نہیں بن سکتا مگر وہ ایک مکمل شوہر ہے اور قدرت کے دیے ہوئے اس آزار پر اندر سے دکھی بھی ہے۔ اسے خوش رکھ کر تم ایسی عظیم عبادت کرو گی جس کا صلہ ربِ ذوالجلال ہی دے سکے گا۔"

"مجھے وعظ کی ضرورت نہیں۔" وہ ایک دم بپھر گئی۔ "میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ اب میرے گھر ہرگز نہ آنا ورنہ اپنے ناخنوں سے تمہارا منہ نوچ لوں گی، جسے وہ چڑیل بھی نہ پہچان سکے گی۔"

"تم اپنی مرضی اور اپنے گھر کی مالک ہو۔ اچھا ہوا کہ تم نے مجھے پیشگی وارننگ دے دی ورنہ تم بتائے بغیر بھی اچانک میرا منہ نوچ سکتی تھیں۔ اس وارننگ کے لیے میں تمہارا شکر گزار رہوں گا۔"

"تم مجھ سے نہیں، میرے شوہر سے بھی نہیں ملو گے۔" غصے کی زیادتی کے باعث اس کی آواز کانپنے لگی۔

"نہیں ملوں گا۔" میں نے سعادت مندانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن وہ ملنے آیا تو اس سے انکار بھی نہیں کر سکوں گا۔"

"میں تمہیں دیکھ لوں گی۔" سلمیٰ اس وقت غصے میں شاید آپے سے باہر ہی ہو گئی تھی۔ "اور اب میں دیکھوں گی کہ جہانگیر کیسے تم سے ملنے آتے ہیں۔ اگر تم تنہا رہنا چاہتے ہو تو اب تمہیں تنہا ہی رہنا ہو گا۔"

"اجازت ہو تو اب فون بند کر دوں؟" میں نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد بھی لائن کو فعال پا کر کہا۔

"تم کیا بند کرو گے! میں خود ہی بند کر رہی ہوں۔" غصے سے ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی اور اچانک لائن بے جان ہو گئی۔ ریسیور کریڈل پر ڈالتے ہوئے غیر ارادی طور پر میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

کھیل آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ دلدار ایک چھٹا ہوا بدمعاش، شی کا ہرکارہ اور ڈی ڈی تھا لیکن غزالہ کے سامنے وہ معصوم اور مسکین بنا ہوا تھا تاکہ اسے جل دے کر اپنا اخلاقی قیدی بنا سکے۔ غزالہ نے باہر سے مسلط کی ہوئی لاعلاج مجبوریوں سے مجبور ہو کر دلدار کو اپنا مجازی خدا بنا لیا تھا لیکن اس کے دل کے نہاں خانوں میں میرا نام بھی زندہ تھا۔ اپنی دانست میں وہ دلدار سے چھپ کر مجھ سے ملی لیکن دلدار کو دھوکا نہ دے سکی۔ دلدار کو غزالہ کی نظروں میں اپنی معصومیت عزیز تھی، اس لیے اس نے غزالہ کی خفیہ ملاقات کا ذکر کیے بغیر اسے اس کے محافظ یا نگران کی ہلاکت کی اطلاع دی تاکہ اسے اس کھیل کی سنگینی سے آگاہ کر سکے۔ دوسری طرف سلمیٰ تھی جو اپنے دل کی گہرائیوں میں غزالہ کے لہو کی پیاسی تھی لیکن مجھے پسند کرتی تھی جب کہ وہ غزالہ کے لیے میری پسند سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جہانگیر کی بیوی تھی اور اسے چھوڑے بغیر اپنی پسند پر تصرف حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے جہانگیر کی دوستی زیادہ عزیز تھی۔ سلمیٰ کے مطالبات کے سلسلے میں میں ایک حد سے آگے جانے پر تیار نہیں تھا اور سلمیٰ مجھے ایک کھلونا بنا لینا چاہتی تھی۔ ان تضادات سے کہانی کے اندر ایک اور کہانی پروان چڑھ رہی تھی جو وقتی طور پر مجھے شی اور مافیا جیسے بھاری بھرکم ناموں پر بھی حاوی ہوتی نظر آ رہی تھی۔

پھر وہی ہوا جس کی مجھے امید تھی۔ پہلی گھنٹی پر میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف جہانگیر تھا۔

"یار تم نے سلمیٰ کو ناراض کیوں کر دیا؟" اس کی آواز پر بوکھلاہٹ طاری تھی۔ "وہ تمہاری طرف سے ایک دم ہی متنفر ہو گئی ہے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ اس نے کوئی سبب بھی تو بتایا ہوگا۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ مجھے علم ہی نہیں تھا کہ سلمیٰ نے کس بہانے کی آڑ لے کر جہانگیر سے شکایت کی ہوگی۔ اس بات کا تو دُور دُور تک کوئی امکان نہیں تھا کہ اس نے جہانگیر کو حقیقت سے آگاہ کیا ہو کہ وہ مجھے پسند کرتی تھی اور میں اس سے مسلسل گریز کر رہا تھا۔

"عزالہ کے معاملے میں اب تم کو جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔" جہانگیر نے شکایتی لہجے میں وہی بات کہی جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ "اس نے تم کو دغا دے دی۔ اب وہ پرائی ہوگئی ہے۔ نہ تم سے ملنا چاہتی ہے، نہ اپنے شوہر کے خلاف کچھ سننے پر آمادہ ہے پھر تم کیوں سلمیٰ پر چراغ پا ہوتے ہو۔ اگر وہ اس کو بُرا بھلا کہتی ہے تو کہنے دو۔ تم ایک خود غرض اور ہرجائی عورت کے لیے اپنے جگری دوست کی بیوی کو کیوں ناراض کرتے ہو۔ تم نے اسے ضد دلا دی اور اب وہ مجھے قسمیں دے رہی تھی کہ میں تم سے نہ ملوں۔"

"اپنا گھر آباد رکھو جہانگیر!" میں نے بے کیف لہجے میں کہا۔ "بیوی قسمت سے صرف ایک بار ملتی ہے، دوست تو ہر روز ملتے اور بچھڑتے رہتے ہیں۔ تم وہی کرو جو سلمیٰ کہہ رہی ہے۔ میں اپنا کوئی اور بندوبست کیے لیتا ہوں۔"

"اوہ! تو تم بھی بھرے ہوئے بیٹھے ہو۔" وہ سنبھل کر بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ عزالہ کے معاملے میں تم دونوں میں خاصی تلخ کلامی ہوئی ہے۔ یہ بات فون پر حل نہیں ہوگی۔ میں ابھی فلیٹ پر آرہا ہوں۔" میری کسی متوقع مزاحمت کے پیشِ نظر اس نے میرا جواب سُنے بغیر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنا دفتر چھوڑ چھاڑ کر فلیٹ پر آ پہنچا۔ سلمیٰ کا مجھ سے بھڑکنے کا سبب بہت زیادہ ذاتی تھا لیکن اس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے اپنے شوہر کو ایک بالکل ہی مختلف کہانی سنائی تھی جس کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ جہانگیر اپنی دانست میں مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے اس وقت بھی سلمیٰ سے کوئی پرخاش نہیں تھی۔ اس لیے میں بحث برائے بحث کے طور پر اسے جواب دیتا رہا۔ آخر کار جب اس نے اپنی دانست میں محسوس کیا کہ وہ مجھے اپنا ہم نوا بنانے میں کامیاب ہو چکا ہے تو اس نے وہیں سے گھر فون کر ڈالا۔

فون پر اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ سلمیٰ اپنی توہین کے احساس سے بُری طرح بھڑکی ہوئی تھی لیکن کافی دیر تک دلائل اور خوشامد کا سہارا لے کر آخر کار وہ اسے بھی ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے سلمیٰ پر ظاہر کیا کہ وہ فیکٹری سے اٹھ کر میری طرف آئے گا اور وہاں سے مجھے اپنے ساتھ لے کر گھر پہنچے گا تاکہ سلمیٰ سے میری صلح کرا سکے۔

میں دل ہی دل میں اس بات پر ندامت محسوس کر رہا تھا۔ میرے بارے میں وہ دونوں میاں بیوی اپنے اپنے انداز میں ضرورت سے زیادہ جذباتی ہوئے جا رہے تھے۔ چند روز قلیل عرصے میں پہلے جہانگیر سے تصادم ہوا اور نوبت تلخی تک پہنچ گئی اور اب سلمیٰ ناراض تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ وہ دونوں ایک ہی وقت میں ناراض نہیں ہوئے تھے ورنہ مفاہمت کی کوئی صورت باقی نہ رہ جاتی۔

جہانگیر کے لیے کم از کم اتنا وقت گزارنا ضروری تھا کہ وہ سلمیٰ کو باور کرا سکے کہ اُس نے اُسے فیکٹری سے ہی فون کیا تھا اور اس کی اجازت حاصل ہونے کے بعد میرے پاس آیا۔ اس لیے اُس نے بوتل کھول لی جو وہ ہر وقت اپنے بریف کیس میں ساتھ لیے پھرتا تھا تاکہ امتناع کے اس دَور میں حسبِ ضرورت جب اور جہاں چاہے، محفلِ ناؤ و نوش سجا سکے۔

وقت دھیمے دھیمے گزرتا رہا۔ اس دوران میں جہانگیر نے کبھی وہی بات چھیڑ دی جو میرے دل میں کسک پیدا کر رہی تھی۔ وہ شرمسار تھا کہ پہلے وہ مجھ سے اُلجھا اور اب اُس کی بیوی مجھ سے لڑ پڑی تھی۔

اس وقت تک میں نے جہانگیر کو مافیا سے اپنے رابطے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا اور نہ ہی میں اُسے اس بکھیڑے میں اُلجھانا چاہتا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ اُس کی نظر میرے دیے ہوئے اشتہار پر بھی نہیں پڑی تھی ورنہ اس میں درج ہوا فون نمبر پڑھ کر وہ ضرور چونکتا اور شاید دفتر ہی سے فون کر کے حقیقت کُریدنے کی کوشش کرتا۔ تناؤ دور کرنے کے لیے میں نے اضطراری طور پر وی سی آر پر ایک فلم لگا دی۔ لیکن اس وقت وہ آ ہی گیا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ اُسے بھی اعتماد میں لے لیا جائے تاکہ آنے والے لوگوں سے مذاکرات کے وقت مجھے اس کی مدد حاصل رہ سکے لیکن میرے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی شام چھ بجے فون کا بزر چیخ اٹھا۔

"کامٹ!" ریسیور اٹھاتے ہی دوسری طرف سے شناسا آواز میں کہا گیا۔

"شوٹر۔۔۔ کیا بات ہے؟ اس وقت فون کرنے کی ضرورت پیش آگئی؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔ جہانگیر میری طرف دھیان دیے بغیر بیئر کے پارچے سے انصاف کرتے ہوئے وی سی آر پر فلم دیکھنے میں منہمک تھا۔

"تمھارے پاس پچھلے سوا دو گھنٹے سے ایک ملاقاتی آیا ہوا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ مقررہ وقت سے پہلے ہی واپس چلا جائے گا کیونکہ ہماری ملاقات کے وقت اس کی موجودگی غیر ضروری بلکہ ناپسندیدہ ہوگی۔"

وہ لوگ واقعی بہت گھاگ اور منظم تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس وقت بھی فلیٹ کی نگرانی ہو رہی تھی۔ وہ لوگ میرے معاملے میں کوئی بھی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ غنیمت یہی تھا کہ اس وقت تک میں نے جہانگیر سے مافیا والے معاملے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا ورنہ اس کے تجسس کو ہوا دے کر اسے وہاں سے ٹالنا مشکل ہو جاتا۔

"یہ طے نہیں ہوا تھا۔" میں نے کن انکھیوں سے جہانگیر کی طرف دیکھتے ہوئے دبے لہجے میں احتجاج کیا۔ "گھر آئے ہوئے مہمان کو نکالنا میرے لیے بہت دشوار ہوگا۔ میری گزارش ہے کہ کسی سمجھوتے سے پہلے خود کو میرے اوپر مسلط کرنے کی کوشش نہ کرو۔"

"سمجھوتے سے پہلے یہ احتیاط ضروری ہے۔" اس نے اصرار کیا۔ "معاہدہ ہو جانے کے بعد تو تم کو خود بخود اپنی ذمّے داریوں کا علم ہو جائے گا۔ فی الحال جو کچھ کہا جا رہا ہے اس پر عمل کرو۔ ملاقات ہونے پر اس احتیاط کی افادیت تمھاری سمجھ میں آجائے گی۔"

"یہ سراسر زیادتی۔۔۔" میں نے احتجاج جاری رکھنا چاہا لیکن اس نے میری بات کاٹ دی۔

"کوئی زیادتی نہیں ہے۔ اگر تم نے خود اسے بُلایا ہے اور ملاقات کے بارے میں اسے آگاہ کر چکے ہو تو اور بات ہے ورنہ تم اسے آسانی کے ساتھ واپس کر سکتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ تمھارا پُرانا اور بے تکلّف دوست جہانگیر ہے۔ ہم لوگ کسی جواز اور ضرورت کے بغیر انہونے مطالبے نہیں کرتے۔ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کب کیا کہنا اور کرنا چاہیے۔ اگر سات بجے تک جہانگیر تمھارے فلیٹ سے واپس نہ گیا تو سمجھ لینا کہ مجوزہ ملاقات منسوخ ہو جائے گی۔"

"پھر اگلا پروگرام کس طرح طے ہوگا؟" میں نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"وہ سات بجے تک نہیں گیا تو اگلا کوئی پروگرام نہیں ہوگا۔ تم نے میرے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ میں نے ملاقات کے لیے ملتوی نہیں، منسوخ کا لفظ استعمال کیا ہے۔" چبھتے ہوئے لہجے میں جواب دیا گیا۔

"میں کوشش کرتا ہوں۔" میں نے دل شکستہ لہجے میں کہا اور دوسری طرف سے کلک کی آواز سن کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

"تم نے فلم کا ایک زبردست حصّہ مس کر دیا۔" جہانگیر متاسفانہ لہجے میں بولا۔ "کہو تو ری وائنڈ کر کے دوبارہ چلا دوں؟"

"یقیناً کوئی کلب ڈانس رہا ہوگا۔ مجھے ان ہندوستانی فلموں سے خدا واسطے کا بَیر ہے۔ کہانی خواہ کیسی ہی سنجیدہ اور کچھ بھی ہو، ہر فلم میں دو چار نیم برہنہ ناچ ضرور شامل کیے جاتے ہیں تاکہ فلم باکس آفس پر ہٹ ہو سکے۔ ان چیزوں کا ایسا ہی شوق ہو تو آدمی مہینے، پندرہ دن میں ولایت کا چکر کیوں نہ لگا آئے جہاں تصویروں کے بجائے یہ سب اسٹیج پر تازہ اور زندہ دکھایا جاتا ہے۔"

"گڈ! تو اب مولوی بھی ہوگئے ہو؟" وہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولا۔ پھر اُس نے وی سی آر اور ٹیلیوژن آف کر دیا۔ "تو پھر چلو۔ اب وقت ہو گیا ہے۔ سلمیٰ کو سمجھانے میں بھی کچھ وقت لگے گا۔"

"یہ پروگرام کل پر ملتوی کر دو تو کیسا رہے گا؟" میں نے بیچارگی کے احساس کے ساتھ سوال کیا۔

"میں سلمیٰ سے کہہ چکا ہوں کہ تمھیں ساتھ لیتا ہوا گھر آؤں گا۔"

"لیکن میرے پاس کچھ لوگ آرہے ہیں۔ ان سے اسلحے کی کچھ بات کرنی ہے۔"

"تم نے پہلے تو کچھ نہیں بتایا تھا۔" وہ اشتباہ آمیز لہجے میں بولا۔

"دن اور وقت طے نہیں ہوا تھا۔ ابھی اسی شخص کا فون آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"تو پھر ان سے مل کر ہی چلیں گے۔" اُس نے صوفے پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بلاوجہ تمھیں دیر ہوگی اور سلمیٰ کا پارا چڑھ جائے گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "پتا نہیں ان سے مذاکرات کتنی دیر تک جاری رہیں۔ اب تو میرے پاس بھی گاڑی ہے۔ جلدی فارغ ہوگیا تو تمھیں فون کر کے خود ہی پہنچ جاؤں گا۔"

اتفاق سے بات بن گئی تھی۔ تھوڑی سی بحث کے بعد جہانگیر مجھ سے متفق ہو گیا اور روانگی کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں اُسے رخصت کرنے کے لیے میزنائین فلور تک آیا تھا جہاں اس نے اپنی گاڑی پارک کی ہوئی تھی۔ اُس کے چلے جانے کے بعد میں نے اچھی طرح شیراڈ کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس وقت تک اس کی ڈِکی بالکل خالی پڑی ہوئی تھی۔ میں اوپر پہنچا تو ایک بار پھر فون کی گھنٹی پوری قوت کے ساتھ چیخ رہی تھی۔

میں تیزی سے تالا کھول کر اندر داخل ہوا تو گھنٹی خاموش

ہو چکی تھی لیکن چند ثانیوں کے توقف کے بعد وہ دوبارہ بول پڑی۔ میں نے ریسیور اُٹھایا تو دوسری طرف سے سلطان شاہ بول رہا تھا۔

پتا چلا کہ وہ تیسری کوشش تھی۔ اس کے پاس بھی ایک کام کی خبر موجود تھی۔ اس نے لدار کی دوا ساز فیکٹری کا سراغ لگایا تھا جو کورنگی کے انڈسٹریل ایریا میں جاز فارماسیوٹیکل انڈسٹری کے نام سے چل رہی تھی۔ اتفاقاً وہاں لیبر کی کچھ اسامیاں بھی خالی تھیں اور سلطان شاہ خود کو جاہلِ مطلق ظاہر کرتے ہوئے وہاں انٹرویو بھی دے آیا تھا جس کا نتیجہ معلوم کرنے کے لیے اسے اگلی صبح فیکٹری مینیجر سے ملاقات کرنی تھی۔

اس سے گفتگو سے فارغ ہوا تو میں نے مُنہ ہاتھ دھو کر اپنی شکم پُری کی پھر وقت گزاری کے لیے ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہو گیا جیسے جیسے مافیا والوں سے ملاقات کا وقت قریب آتا جا رہا تھا میرے اعصاب پر تناؤ بڑھتا جا رہا تھا سچی بات یہ تھی کہ ان کے طریقِ کار نے مجھے پوری طرح مرعوب کر دیا تھا۔

ٹھیک آٹھ بجے ڈور بیل بجی تو میں اضطراری طور پر دروازے تک پہنچ گیا۔

”کون ہے“؟ میں نے دروازہ کھولنے کے بجائے قدرے دھیمی آواز میں سوال کیا تھا۔

”کامٹ“! دوسری طرف سے جانی پہچانی آواز میں مختصر ترین جواب دیا گیا اور میں نے دروازہ کھول دیا۔

یہ دیکھ کر مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا کہ آنے والے تعداد میں دو تھے اور دونوں ہی کے چہروں پر سیاہ نقابیں منڈھی ہوئی تھیں۔ انھیں اس بات کا کوئی خوف نہیں تھا کہ زینوں پر آنے جانے والا کوئی شخص انھیں دیکھ کر کیا سوچے گا۔

وہ دونوں دراز قامت میری دعوت کا انتظار کیے بغیر دروازہ کھلتے ہی فلیٹ میں گھس آئے۔ میں دروازہ بند کر کے ان کے پیچھے پلٹا تو وہ سکون سے صوفوں پر دراز ہو چکے تھے۔

”ہم انگریزی میں گفتگو کریں تو تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا“؟ نسبتاً بھاری جسم والے نے مجھ سے انگریزی میں سوال کیا اور میں نے اس کی آواز پہچان لی کیونکہ اُسی نے مجھ سے فون پر بات کی تھی۔

”تم جس زبان میں چاہو بات کر سکتے ہو بشرطیکہ وہ زبان میرے لیے قابلِ فہم ہو“۔ میں نے باری باری ان دونوں نقاب پوشوں کا جائزہ لیتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ ”لیکن بہتر یہ ہو گا کہ پہلے ہمارا تعارف ہو جائے۔ مجھے ڈینی کہتے ہیں“۔

”میں کامٹ اور یہ ڈان تھری ہے“۔ اسی شخص [illegible] کہا۔ نہ انھوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے [illegible] میں نے ان کے رویے کے پیشِ نظر ایسی کسی پیش [illegible] ضرورت محسوس کی۔

”یہ دونوں اگر واقعی نام ہیں تو بڑے عجیب اور [illegible] ہیں“۔ میں نے خشک لہجے میں تبصرہ کیا۔

”یہ نام نہیں شناخت کی علامتیں ہیں مسٹر ڈینی“۔ اچھے [illegible] بدن والے نے اطالوی لہجے اور انگریزی زبان میں جواب [دیا] اور میں چونک پڑا کیونکہ وہ آواز سماعت کو کچھ شناسا سی محسوس ہوئی تھی۔

”اگر ناموں سے ہی تعارف کرانا مقصود ہوتا تو ہم [اپنے] چہروں پر نقاب لگا کر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی“؟ [کامٹ] اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”تم اس دُنیا میں [نئے] نہیں ہو اس لیے مجبوریوں اور ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھتے [ہو]۔ میں یہ بتا تا چلوں کہ میں تم سے ملاقات کے لیے خصوصی اختیار[ات] کے ساتھ اپنے ہیڈ کوارٹرز سے آیا ہوں اس لیے بہتر ہو گا [کہ] فروعات میں اُلجھنے کے بجائے براہِ راست کام کی گفتگو شروع کر دیں۔ اس علاقے میں مافیا کے مفادات کی دیکھ بھال اور اس کے آپریشنز کی نگرانی براہِ راست میرے ذمّے ہے۔ [اس] کام میں مسٹر کامٹ مقامی طور پر میرے دستِ راست [ہیں]۔ یہ کراچی بیورو کے چیف ہونے کے ساتھ ساتھ پورے پاکستان کے معاملات بھی دیکھتے ہیں اور اگر ہمارے درمیان کوئی قابلِ عمل صورت طے پا گئی تو فی الحال تمھارا براہِ راست [رابطہ] مسٹر کامٹ کے ساتھ ہی رہے گا جو بہت ماہر اور تجربے کار آدمی [ہیں]۔

”مسٹر کامٹ“! میں استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا۔ ”ہر شخص [اور] گروہ کی اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں [رہ] سکتا کہ مسٹر کامٹ کہنے کے بعد بے اختیار کسی کو مسٹر چھوہا [اور] مس چھپکلی کہنے کو بھی دل چاہتا ہے“۔

کامٹ نے غصّے اور بے چینی کے ساتھ اپنی نشست پر پہلو بدلا لیکن اس سے پہلے ہی ڈان تھری بول پڑا۔ ”یہ اچھا ابتدا نہیں ہے ڈینی! ہم یہاں ایک دوسرے کا مضحکہ اڑانے کے لیے نہیں بلکہ کچھ اہم امور طے کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں“۔

”مجھے افسوس ہے ڈان کہ میں اپنے بے ساختہ ردِّ عمل پر قابو نہیں پا سکا! میری طبیعت ناقابلِ فہم سمجھوتوں کی عادی نہیں ہے اور شاید اسی وجہ سے میں آج شی کے مخالفین کی صفوں میں شمار کیا جاتا ہوں“۔

”ہم اس علاقے میں اپنی سرگرمیاں بڑھانا چاہتے ہیں جس [illegible]

کے لیے ہمیں فعال اور متحرک قیادت کی ضرورت ہے۔ اس خلا کو پورا کرنے کے لیے ہماری نگاہیں تمھاری طرف اُٹھی ہیں کیونکہ تم شی کے لیے یہاں قابلِ ذکر خدمات انجام دیتے رہے ہو“۔

”شی سے میرے تصادم کے بعد یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ اب میں مافیا کے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گا“؟ میں نے بے خوفی کے ساتھ براہِ راست ڈان تھری سے سوال کیا۔

”تم جس پیشے میں رہ چکے ہو اس میں گھسنا آسان ہوتا ہے لیکن اس کو ترک کرنے کا مطلب صرف اور صرف خودکشی ہوتا ہے۔ موت کسی بھی لمحے، کہیں سے نازل ہو سکتی ہے۔ شی سے تمھارے اختلافات ان حدود تک پہنچ چکے ہیں کہ اب ان میں تمھاری واپسی ناممکن ہے اس لیے تم کو زندہ رہنے کے لیے ایک سہارے کی ضرورت ہے جو مافیا تم کو فراہم کر سکتی ہے“۔

”لیکن شی کو چھوڑ کر مافیا میں جانے کا جواز کیا ہو گا“؟ میں نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

”اوّل زندہ رہنے کی خواہش، طبعی عمر گزار لینے کی آرزو اور دوم سازشیوں کو چھوڑ کر صاف ستھرے پیشہ ور لوگوں سے لین دین جن کی اپنی تاریخ ہے جو کسی فرد کے نہیں بلکہ ایک مشن کے ملازم ہوتے ہیں“۔

”میں سمجھ نہیں سکا، دوسری بات واضح نہیں ہے“۔ میں نے اُلجھن آمیز لہجے میں کہا۔

”بہت واضح ہے“۔ ڈان تھری نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ”مافیا کی سالہا سال پرانی ایک تاریخ ہے۔ زیرِ زمین دُنیا میں یہ ایک طاقتور تحریک بن چکی ہے جس پر افراد کے زندہ رہنے یا مرنے سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ گاڈ فادر ہمارا طاقتور روایتی سربراہ ہوتا ہے جو مافیا کے مشن کو اپنی پوری قوّت اور صلاحیتوں کے ساتھ زندہ رکھتا ہے لیکن شی مفاد پرستوں کی ایک مضبوط ٹولی ہے جو کسی مشن اور نظریے کے بغیر دونوں ہاتھوں سے دولت بٹور رہی ہے۔ انھوں نے جرائم کی دنیا میں مختصر ترین عرصے میں مضبوطی سے اپنے قدم جمائے ہیں اور ان کی سرگرمیوں سے سب سے زیادہ نقصان مافیا کو پہنچا ہے لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ شی کا اپنا کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ یہ تنظیم سو فی صد سی آئی اے کے سرمائے کے بل پر چل رہی ہے۔ اس کے سربراہ کو براہِ راست وہائٹ ہاؤس تک رسائی حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہے شی ہم پر غالب آجاتی ہے۔

”یہ تو ناقابلِ یقین ہے“۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ”کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ سی آئی اے شی کے ذریعے دنیا میں ہیروئن کے فروغ کے لیے دن رات کوششیں کر رہی ہے“؟

”فروغ نہیں، انسداد کہو ڈینی!“ ڈان تھری تلخ لہجے میں بولا۔ ”پہلے ہم بھی انھیں اپنا حریف تصور کرتے تھے لیکن جمی لائیڈ سی آئی اے کا لاڈلا ہے۔ امریکا ہیروئن کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ شی والے دُنیا بھر کے مراکز سے اعلا درجے کی ہیروئن خرید کر سی آئی اے کے مقررہ مراکز کو بھیج دیتے ہیں جہاں اس کی بڑی مقداریں تلف کر دی جاتی ہیں اور تھوڑی بہت مقدار بھاری ملاوٹ کے بعد بازار میں بھیج دی جاتی ہے۔ ہم لوگ مدتوں حیران رہے کہ منڈی میں طلب اور بھاؤ مسلسل کیوں بڑھ رہا ہے؟ شی والوں کا مال کہاں جاتا ہے؟ لیکن ہمیں کچھ علم نہ ہو سکا۔ ہم نے شی کے مقابلے میں اپنی سرگرمیاں محدود کر لیں کیونکہ بھاؤ بڑھنے کی وجہ سے ہمیں کم مقداروں پر پہلے سے زیادہ منافع مل رہا تھا لیکن اب شی کو مدافعت کا راستہ اختیار کرنا ہو گا۔ ہم نے ہیروئن پیدا کرنے والے ممالک میں اپنی سرگرمیوں کا دائرہ بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے“۔

”میں یہ بات نہیں مان سکتا اگر شی انسدادِ منشیات کے مشن میں سی آئی اے کی اعانت کر رہی ہے تو پھر جمی لائیڈ کی بیٹی، ویرا کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ ہمارے سرحدی علاقوں میں جرمن کیمسٹ کی سربراہی میں ہیروئن سازی کے پہلے کارخانے کا آغاز کراتی؟“

”وہ سب پروپیگنڈا ہے“۔ ڈان تھری تلخ لہجے میں بولا۔ ”اس سے ہم بھی مدتوں گمراہ رہے ہیں۔ اس علاقے کے لیے ہیروئن نئی چیز نہیں تھی۔ افیم پیدا کرنے والے قبائل پہلے بھی ہیروئن بناتے تھے جو خاموشی سے باہر چلی جاتی تھی۔ ویرا نے مومن خان اور ڈاکٹر ڈالٹن کے ذریعے اس دُشوار گزار علاقے میں رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جہاں دشوار ترین پہاڑی راستوں کی وجہ سے جدید ترین طیارے بھی بمباری نہیں کر سکتے۔ اس نے اس بہانے سے علاقے میں اپنے قدم جمائے، قبائلی سرداروں اور ملوک سے ذاتی حسن اور اداؤں کی وجہ سے مراسم قائم کیے اور پھر اپنی تفصیلی سروے رپورٹ سی آئی اے کو ارسال کر دی کچھ پتا نہیں کہ وہ لوگ اس علاقے میں کیا کرنے والے ہیں۔ وہ ان سنگلاخ پہاڑوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ انھوں نے حال ہی میں ایک ایسا مواصلاتی سیارہ خلا میں بھیجا ہے جو خیبر کے پہاڑوں پر ٹھہرا ہوا ہے اور دن رات وہاں کی تصویریں لیتا رہتا ہے۔ اس اسکینڈل کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ایک دن تمھارے شمالی پہاڑوں پر آسمانوں سے آگ برسے گی اور ہیروئن بنانے والے کارخانوں کے ساتھ افیم کی فصلوں اور اس کے کاشتکاروں کو بھی جلا کر راکھ کر دے گی۔ چند روز ان کا ماتم ہو گا اور پھر تمھاری آنے والی نسلیں بھی ہیروئن یا افیم کے نام سے کانپا کریں گی... یہ ایک بہت بڑی سازش اور ناقابلِ یقین اسکینڈل

ہے مگر حقیقت . . . !"

وہ یکلخت خاموش ہوگیا کیونکہ اچانک ہی ڈور بیل بج اٹھی تھی۔ کامٹے نے وحشیانہ انداز میں اُچھل کر اپنی نشست چھوڑ دی اور ہولسٹر سے پستول نکال کر میرے سینے پر تان لیا جب کہ خود مجھے علم نہیں تھا کہ آنے والا کون تھا اور اس وقت میرے پاس کیوں آیا تھا۔ ڈان تھری نے بھی بیٹھے ہی بیٹھے پستول نکال لیا تھا۔

گھنٹی قدرے توقف کے بعد دوبارہ بجی لیکن میں اپنی جگہ جم کر رہ گیا تھا کیونکہ میرے حرکت کرتے ہی بیک وقت دو پستولوں کے دہانے میرے سینے پر جہنم کی آگ برسانے کے لیے تیار تھے۔

"کون آیا ہے؟" اطالوی نژاد نے سرسراتی ہوئی دھیمی مگر سرد آواز میں سوال کیا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے بے خوفی کے ساتھ دھیمی آواز میں کہا۔ "آنے والا میرے لیے بھی اتنا ہی غیر متوقع ہے جتنا تمھارے لیے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ تمھاری طرف سے مامور کیے گئے نگرانوں میں سے ہی کوئی ہو۔"

"تم باتھ روم میں جاؤ، ہم اسے دیکھ لیں گے۔" غیر ملکی نے اپنی نشست چھوڑ دی۔ اُس کا لہجہ سرد اور بے رحمانہ تھا جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ضرورت پیش آنے پر وہ خونریزی سے بھی ہاتھ نہیں روکے گا۔

ان دو مسلح حریفوں کے مقابلے میں اس وقت میں بالکل بے بس تھا اس لیے لمحہ بھر کے توقف کے بعد ہی ڈرائنگ روم سے ملحقہ غسل خانے میں گھس گیا اور دروازہ اندر سے بولٹ کر کے دوسری طرف مُڑ گیا۔

اس وقت میری سعادت مندی میں ان کی عددی برتری یا اسلحے کی موجودگی کا زیادہ اثر نہیں تھا بلکہ مجھے یہ یاد آگیا تھا کہ ڈرائنگ روم سے ملحقہ باتھ روم کے دو دروازے تھے جن میں سے ایک ڈرائنگ روم میں کُھلتا تھا اور دوسرا ایک خواب گاہ سے ملحق تھا۔ اس طرح فلیٹ کی محدود جگہ میں مکینوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

لیکن اس وقت میرے پاس فلیٹ کی تعمیراتی خوبیوں پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا اس لیے میں باتھ روم کا دوسرا بے آواز دروازہ کھول کر تاریک خواب گاہ میں داخل ہوگیا اور میں نے بند دروازے کے کی ہول میں آنکھ لگا دی۔

وہ دونوں کی ہول سے خاصی دور تھے اور فلیٹ میں داخلے کا دروازہ ان سے بھی دور تھا اس لیے ذرا سی کوشش سے اندر کا کم و بیش تمام منظر میرے سامنے واضح ہوگیا۔

اپنی دانست میں وہ دونوں مجھے باتھ روم میں قید کر کے پوری طرح مطمئن ہوچکے تھے اس لیے انھوں نے اپنے چہرے پر منڈھی ہوئی جھلی جیسی سیاہ نقابیں اتار لی تھیں۔ مقامی کا چہرہ میرے لیے اجنبی تھا لیکن دراز قامت اطالوی کو میں نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ اسے میں میلان کے ہوٹل وینیٹی میں بہت قریب سے دیکھ چکا تھا کیونکہ وہ زوتی کے پاس آنے والے ان اوباش رئیس زادوں کی بھیڑ میں شامل تھا جو زوتی کی محبوبہ کے ایک شب کے مشاہدے، تجزیے اور تجربے کے بعد اسے بی ایم ڈبلیو کی طرف سے اسپانسر کیے جانے والے مقابلے میں مس اٹلی کے لیے نامزد کرنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کے سامنا کرنے کا وہ تجربہ میرے لیے بہت سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کیونکہ نادیا بنگالا اپنے محبوب، زوتی کی اجازت سے اس شام میرے ساتھ تفریح کے لیے باہر گئی تھی لیکن گیمبلرز نائٹ کلب میں ہونے والی ہڑبونگ کے نتیجے میں میری طرف سے شبہات کا شکار ہوگئی اور مجھے مجبوراً اس حسین و نازک دوشیزہ کو اپنے ہاتھوں سے بے ہوش کر کے ڈوم کے علاقے کی ایک سنگلاخ فٹ پاتھ پر چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ زوتی کے لیے وہ مقابلۂ حسن کامیابی کا ایک سہانا سپنا بنا ہوا تھا اس لیے نادیا کو میرے ساتھ نہ پاکر وہ بُری طرح بھڑکا تھا مگر میں کسی نہ کسی طرح اسے جُل دے کر سلطان شاہ سمیت ہوٹل وینیٹی سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

میں نے اسے چہرے سے پہچان ضرور لیا تھا اور پھر اس کی آواز میں شناسائی کی جھلک کا سبب بھی واضح ہوگیا تھا لیکن بدنصیبی یہ تھی کہ میں اس کے نام سے واقف نہیں تھا۔

جرائم کی دنیا میں اندر کے کھیل کس قدر ناقابلِ یقین اور لرزہ خیز تھے، اس کا اندازہ مجھے ملک سے باہر نکل کر ہی ہوسکا تھا۔ شی مافیا کی سب سے بڑی اور مضبوط حریف تھی لیکن مافیا والوں نے میلان میں ہوٹل وینیٹی کو اس قدر کامیابی کے ساتھ اپنا خفیہ اڈّا بنایا ہوا تھا کہ متوسط درجے کے اس ہوٹل پر کوئی شک تک نہیں کرسکتا تھا بلکہ شی کے سربراہ، جمی لائیڈ کی بیٹی، ویرا لائیڈ میلان آکر اسی ہوٹل میں قیام کرتی تھی۔ وہ ایک اوباش فطرت اور فراخ دل لڑکی تھی جو چند لمحوں کی آسودگی سمیٹنے کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتی تھی کیونکہ اس کے باپ نے ڈان مرسیالو کے روپ میں اس کی تربیت کر کے اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے عزت اور عزتِ نفس کا موہوم سا احساس تک کھرچ کر مٹا دیا تھا اس لیے ہوٹل وینیٹی میں اپنے قیام کے دوران نہ صرف وہ قیام و طعام کے جملہ اخراجات ادا کرتی تھی بلکہ ہوٹل وینیٹی کا ظاہری مالک اُس کی خلوتوں میں بھی شریک ہوتا تھا۔ مافیا والے ویرا کی ایسی ہر تسخیر کو شی کی شکست سمجھ کر اپنے دلوں کو خوش کرتے رہتے تھے لیکن یہ بات صرف میں ہی جانتا تھا کہ ویرا کے نزدیک نام بے حقیقت تھے، وہ تو صرف جسموں اور اداؤں کو پسند کرتی تھی اور جب آگے بڑھتی تھی تو پیچھے والے جمِ غفیر کو یکسر بھلا چکی ہوتی تھی کیونکہ ڈان مرسیالو نے اس کی تربیت ہی کچھ ایسے کی تھی۔

وہ سارے خیالات میرے ذہن میں لمحوں میں گھوم گئے پھر میں نے ان دونوں کو پستول جیبوں میں رکھتے دیکھا۔ مقامی کا خالی ہاتھ جیب سے باہر آگیا لیکن ترش رو اطالوی کا ہاتھ جیب میں ہی غالباً ٹرائیگر پر موجود رہا تاکہ بوقتِ ضرورت وہ جیب کے اندر سے ہی اپنے کسی ممکنہ دشمن پر گولی چلا سکے۔ لمحے بھر کے لیے ان دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور پھر مقامی شخص دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے چوبی پٹ میں نصب ٹیلی اسکوپک لینس سے آنکھ لگا کر باہر کا جائزہ لیا اور پھر اچانک ہی ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا پھر اُس نے غرّاتے ہوئے آنے والے کو گریبان سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔

"ذرا بھی آواز نکالی تو بھیجا اڑا دوں گا۔" مقامی چیف اسے اندر گھسیٹتے ہوئے غرّایا تھا پھر اس نے پھرتی سے دروازہ بند کر دیا۔

اُس کے چنگل میں پھنسا ہوا دس بارہ سال کا وہ کمزور سا بچہ خوف سے بُری طرح لرزنے لگا تھا۔ اس کے حلیے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ نیچے فاسٹ فوڈ کی کسی دکان پر ملازم رہا ہوگا یا پھر وہیں مانگ تانگ کر اپنا گزارا کرتا ہوگا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" مقامی نے اس کے گریبان کو ایک شدید جھٹکا دے کر سوال کیا۔

"یہ... یہ فلیٹ نمبر سات ہی ہے نا؟" لڑکے نے خوفزدہ لہجے میں ہکلاتے ہوئے بمشکل سوال کیا۔

"نمبر سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تم یہاں کیوں آئے ہو؟" مقامی نے غصّے کے عالم میں اسے گریبان کے سہارے تقریباً فرش سے اٹھا ہی لیا اور دورانِ خون تیز ہونے کی وجہ سے لڑکے کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

دوبارہ قدم زمین سے لگتے ہی وہ سسک کر رو پڑا۔ "م... میں شاید غلط فلیٹ میں آگیا ہوں۔" وہ ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان بولا۔ "میں نیچے لوگوں کی گاڑیاں صاف کر کے دن بھر میں دس پندرہ روپے کماتا ہوں۔ ابھی ایک آدمی نے مجھے پچاس روپے دے کر اوپر بھیجا تھا کہ سات نمبر میں رہنے والے کو نیچے بلا لاؤں۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔ چاہو تو میرے ساتھ چل کر نیچے معلوم کرلو۔ پیسے دے کر مجھے بھیجنے والا اب بھی اپنی سفید گاڑی میں میری واپسی کا انتظار کر رہا ہوگا۔"

میرے لیے وہ صورتِ حال بہت دلچسپ اور سنسنی خیز ہوگئی تھی۔ کیونکہ میرے فلیٹ کا نمبر سات نہیں آٹھ تھا جب کہ مافیا والوں کو سرے سے نمبر کا علم نہیں تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ باہر دروازوں پر نمایاں نمبر موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ بدنصیب لڑکا پڑوس کے بجائے، غلطی سے میرے فلیٹ کی ڈور بیل بجا بیٹھا تھا اور ان درندوں کے ہاتھ لگ گیا تھا جو اپنی لاعلمی کی بنا پر صحیح صورتِ حال کا ادراک کرنے سے قاصر تھے اور لامحالہ یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ لڑکا مجھے بُلانے آیا تھا۔

"گاڑی میں وہ اکیلا ہے یا کوئی اور بھی ہے؟" مقامی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اکیلا ہے اور شاید نشے میں ہے کیونکہ اس کے سانسوں سے شراب کی بُو آ رہی ہے ورنہ وہ اتنی بے فکری سے ذرا سے کام کے پچاس روپے نہ دیتا۔" لڑکے نے سہمی سہمی آواز میں جواب دیا۔

"کار کا نمبر اور رنگ کیا ہے؟" مقامی نے اسے گھورتے ہوئے پھاڑ کھانے والے لہجے میں سوال کیا۔

"نمبر تو نہیں معلوم۔ سفید رنگ کی کرولا ہے۔ سامنے ہی کھڑی ہوئی ہے۔"

مقامی نے پوری قوت سے اسے اپنے سفید فام ساتھی کی طرف دھکیل دیا اور اسے انگریزی میں اختصار کے ساتھ صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ "تم اسے روکو میں نیچے جاکر دیکھتا ہوں کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔"

وہ بڑی عجلت میں دروازہ کھول کر باہر نکلا مگر فوراً ہی اندر آگیا جیسے کچھ یاد آگیا ہو پھر خفت آمیز لہجے میں اطالوی سے بولا۔ "مگر یہ تو آٹھ نمبر فلیٹ ہے، شاید لڑکا دھوکے سے اِدھر آگیا ہے۔"

"بات بڑھ ہی گئی ہے تو اب تمھیں نیچے جاکر دیکھنا ہوگا، ورنہ تھوڑی دیر میں محلّے والے ہمارا محاصرہ کرلیں گے۔ یہ بات تمھاری کند کھوپڑی میں پہلے کیوں نہیں آئی!"

سفید فام کے لہجے کی تلخی نے مقامی کو بوکھلا دیا۔ "بس غلطی ہوگئی ڈان۔ میں ابھی دیکھتا ہوں۔"

میرے لیے وہ تماشا دلچسپ تھا۔ پڑوس میں سات نمبر والی سے صرف دو بار میرا سامنا ہوا تھا۔ بہت خوب صورت، نازک اندام اور تیکھے خدّوخال والی دوشیزہ تھی لیکن دونوں بار وہ اکیلی ہی نظر آئی تھی۔ سات نمبر میں کسی مرد کی موجودگی کی کوئی شہادت دونوں مواقع پر سامنے نہیں آسکی تھی۔ لڑکے کی زبان سے کرولا والے کی حالت اور اس کے مطلبے کی تفصیل سن کر میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ کہیں میرے پڑوس میں رہنے والی عورت کوئی مہنگی کال گرل نہ ہو جو پولیس کے بھتّوں

اور سختیوں سے بچنے کے لیے شرفا کے اس علاقے میں پناہ گزین ہوگئی ہو۔ میرا قیاس کہہ رہا تھا کہ سفید کرولا والا اس کا کوئی دلیر خریدار تھا جس نے بہکی ہوئی چال کے مظاہرے کو چھپانے کے لیے لڑکے کو ٹپ دے کر اوپر بھیجا تھا لیکن بدقسمتی سے اس کا نشانہ خطا ہوگیا۔

چند منٹ بعد وہ مقامی غصے میں سر جھٹکتا ہوا واپس آیا اور دروازہ بند کرتے ہی سہمے ہوئے لڑکے پر بُری طرح برس پڑا۔

"میں تم جیسے چور اچکوں کو خوب جانتا ہوں۔ نیچے کوئی بھی نہیں تھا۔ میں چاہوں تو اسی وقت تمھیں پولیس کے حوالے کر سکتا ہوں۔"

پولیس کا نام آتے ہی لڑکے کے اوسان خطا ہوگئے اور وہ گھگھیا کر رونے لگا۔ اس نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر مقامی کی طرف بڑھایا۔ "تم یہ نوٹ دیکھ سکتے ہو، میں تو ایک دن میں اتنی رقم کمانے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ اسی حرامی شرابی نے دیا تھا۔ تم مجھے معاف کر دو، میرے باپ کی توبہ جو اب اس بلڈنگ میں دوبارہ قدم رکھوں۔"

"میں تجھے چھوڑ دوں تاکہ تو نیچے جا کر مجھے بدنام کر دے۔" مقامی آگے بڑھ کر اس کا کان کھینچتے ہوئے غرایا۔

"نہیں، خدا کی قسم! میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔" وہ کرلایا۔

"دفع ہو جا یہاں سے!" مقامی نے حقارت سے دھکا دیا اور وہ پچاس روپے کا نوٹ اپنی مٹھی میں دبائے اتنی تیزی کے ساتھ فلیٹ سے بھاگا جیسے ملک الموت اس کے تعاقب میں ہو۔

میدان صاف ہوتے ہی مقامی کے چہرے پر خوشامدانہ مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اطالوی کی مستفسرانہ نگاہوں کے جواب میں خود بخود بولنے لگا۔ "لڑکا سچ بول رہا تھا۔ برابر والے فلیٹ میں سیما نام کی ایک ایئر ہوسٹس رہتی ہے جو اپنے شوہر کی طویل غیر حاضری میں پروفیشنل بن جاتی ہے۔ کرولا والا اسی کے لیے آیا تھا شاید وہ بھی اس کی منتظر ہوگی لیکن میں اس شرابی پر برس پڑا۔ میں نے بتایا کہ سیما اب میری بیوی بن چکی ہے اور جس نے اس پر بری نگاہ ڈالی، اس کی آنتیں گرا دوں گا۔۔۔ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی کار اسٹارٹ کر کے فرار ہوگیا۔ خواہ مخواہ کی بد مزگی ہوگئی درمیان میں۔ اب اسے بھی باہر بلا لوں؟" لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے باتھ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا جو میرے ہی بارے میں تھا۔

"پہلے ماسک لگالو۔" اطالوی نے خشک لہجے میں کہا اور میں بے آواز قدموں سے لپک کر تاریک خواب گاہ سے روشن باتھ روم میں آگیا۔ خواب گاہ کی سمت والا دروازہ بند کرتے ہی میں نے خواہ مخواہ فلش چلا دیا۔

چند ثانیوں کے بعد باتھ روم کے دروازے پر دستک ہوئی۔ "اب تم باہر آسکتے ہو۔"

"تھوڑی دیر انتظار کرو۔ تم نے میرے معدے کا ستیاناس کر دیا ہے۔ غصے کی حالت میں میرا معدہ بُری طرح اپ سیٹ ہو جاتا ہے۔ میں فارغ ہو کر آتا ہوں۔" میں نے چڑچڑے لہجے میں کہا جس پر دوسری طرف سے کوئی تبصرہ نہیں دیا اور میں تھوڑے سے توقف کے بعد دروازہ کھول کر باتھ روم سے باہر آگیا۔

باہر یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میری غیر حاضری میں کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ ان دونوں کے چہروں پر سیاہ نقابیں چڑھ چکی تھیں، دونوں اپنے ہاتھوں کی نمائش کر رہے تھے۔ اطالوی افسرانہ ٹھاٹ سے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور مقامی اپنے ہاتھ میں پستول لیے ہوئے باتھ روم کے دروازے کے قریب کھڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟ کون آیا تھا؟" میں نے باہر آتے ہی سادگی سے سوال کیا۔ اس بار میں نے ان کے پستولوں اور ان کی پُراسرار تاثر کو یکسر نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"اس قدر انجان نہ بنو۔" مقامی نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "آنے والے سے اردو میں ہی گفتگو ہوئی تھی جو تم نے بھی سنی ہوگی۔"

"جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ اگر وہ تمھارا کوئی آدمی ہوتا تو اس وقت صورتِ حال خاصی ناخوشگوار ہو جاتی۔" اطالوی نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے وہ موضوع ختم کر دیا۔

"تم لوگ جس انداز میں میری نگرانی کراتے رہے ہو، اس کے بعد تو میرے کسی آدمی کے آنے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم نے تو میرے ملاقاتی دوست تک کو اس فلیٹ سے نکلوا دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اعتماد رفتہ رفتہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک بار ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی سمجھوتا ہو جائے تو تم ہمارے ساتھ کام کر کے خوشی محسوس کرو گے۔ ہم دشمنوں کو معاف نہیں کرتے اور دوستوں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔" اطالوی ہی بول رہا تھا۔ مقامی خاموش تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ میرے ساتھ ہونے والے مذاکرات میں اپنے کردار سے دست بردار ہوگیا ہو۔

"تم نے میری کھوپڑی اُلٹ کر رکھ دی ہے۔" اس بار میں نے ایمانداری کے ساتھ کہا۔ "شی سے میری وفاداری اور ہمدردی کی کلید یہی تھی کہ میں شی کو منشیات بلکہ ہیروئن اور اسلحے کی اسمگلنگ میں ملوث سمجھتا رہا لیکن اب تم بتا رہے ہو کہ شی امریکا کی سینٹرل انٹیلی جنس ایجنسی کی ایک طاقت ور اور بڑی حد تک خود مختار شاخ ہے جس کے سربراہ کو براہِ راست صدرِ امریکا تک رسائی حاصل ہے۔ میں نہیں مان سکتا کہ شی ہیروئن کے فروغ کے بجائے انسداد کے لیے کام کر رہی ہے۔"

"تم غلط کہہ رہے ہو۔" اس نے سپاٹ لہجے میں مجھے ٹوکا۔ "میں نے یہ نہیں کہا کہ شی صرف انسدادِ منشیات کے لیے کام کر رہی ہے۔ یہ اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔ وہ پاکستان میں ہیروئن کو فروغ دے رہی ہے تاکہ اس کے عبرت ناک اور روح فرسا اثرات اپنی دہلیزوں، گھروں اور گلیوں میں دیکھ کر یہاں کی رائے عامہ افیون، اس کی کاشت اور تجارت کرنے والوں کے خلاف بھیانک حد تک مشتعل ہو جائے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ملک، امریکا میں ہیروئن کی رسد کو روکنے کی سر توڑ کوشش کر رہی ہے۔ اس طرح ایک طرف فروغ کا مشن جاری ہے تو دوسری طرف انسداد کی مہم پورے زور و شور سے چل رہی ہے۔"

"اور تم ہیروئن کے صرف فروغ کے دعوے دار ہو؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں!" اطالوی نے اپنے سر کو سختی سے نفی میں جنبش دی۔ "ہم صرف تاجر ہیں جہاں ہیروئن کی کھپت ہے، اسے وہاں پہنچانا چاہتے ہیں۔ خریداروں کو ان کی مرضی کا مال دیتے ہیں اور اپنی مرضی کے دام لیتے ہیں۔ ہمارا یہ کاروبار پیشہ ورانہ بنیادوں اور اصولوں پر چل رہا ہے۔ یہ جمی لائیڈ جیسے کسی ایک فرد کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ اس سنڈیکیٹ کے ہر رکن کو اس کی محنت کا پورا صلہ ملتا ہے۔"

"شی والے دوغلے ہیں۔۔۔" میں نے کہنا چاہا لیکن اُس نے میری بات کاٹ دی۔

"سب کچھ کہو لیکن انھیں دوغلا نہ کہو۔" وہ بولا۔ "شی میں ہر قومیت کے لوگ ملازم ہیں لیکن اصل میں وہ ایک امریکی تنظیم ہے جو اپنے ملک کے مفادات کے لیے کام کر رہی ہے اگر جمی لائیڈ آنے والے برسوں میں اپنے مشن میں کامیاب رہا تو ہو سکتا ہے کہ امریکی تاریخ میں اس کا مقام ابراہام لنکن سے بھی اونچا چلا جائے۔۔۔ یہ بالکل جنگ کی سی صورتِ حال ہے۔ شی والے امریکیوں کے ہیرو ہیں اور اس قوم کے غدار جسے شی کی کوششوں سے کسی بھی قسم کا نقصان پہنچ رہا ہے۔ ان کا اپنا ایک ٹارگٹ ہے جسے وہ ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ انھیں دوغلا نہیں کہا جا سکتا۔ مصلحتوں کی خاطر اس سے بھی زیادہ گندے کھیل کھیلنے پڑ جاتے ہیں۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "چند ثانیوں قبل شی میں کیڑے نکال رہے تھے اور اب اس کی حمایت میں الفاظ کے دریا بہانے پر تُلے ہوئے ہو۔"

"دشمن پر غالب آنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کی خامیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خوبیوں پر بھی نگاہ رکھی جائے۔ میں تمھیں صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ شی والے کٹر اور محبِ وطن امریکی ہیں جو ہر قیمت پر اپنے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ان کے نزدیک سب کچھ جائز ہے لیکن خرابی یہ ہے کہ اپنی سرگرمیوں سے انھوں نے مافیا جیسی پیشہ ور اور روایتی تنظیم کی جڑوں پر کاری ضرب لگائی ہے اس لیے ہم ان سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔"

"جمی لائیڈ کو ٹھکانے لگا دو، آج ہی شی کا شیرازہ بکھر جائے گا۔"

وہ شاید زیرِ نقاب تلخ انداز میں ہنسا تھا۔ "ہمیں شی کے طریقِ کار پر عمل کرنے کا مشورہ نہ دو۔ یہ ان کا وتیرہ ہے کہ جو اُن کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے اسے جہنم واصل کرا دیتے ہیں لیکن ہم بے مقصد خوں ریزی سے گریز کرتے ہیں۔ اگر خون گرائے بغیر مقصد حاصل ہونے کی امید ہو تو ہم صبر آزما انتظار بھی کر لیتے ہیں۔ ہم ان کو اپنے طریقوں سے برباد کریں گے۔ پھر تم یہ بھی بھول رہے ہو کہ شاید تم خود تو جمی لائیڈ کی اصلیت سے واقف ہو، اس کی لاش دیکھ کر اس کی موت کا یقین کر سکتے ہو لیکن شی والوں کے لیے وہ محض ایک نام اور ایک آواز ہے۔ وہ مارا بھی گیا تو سی آئی اے اپنے کسی اور ہرکارے کو اس کی جگہ مامور کر دے گی۔ شی میں کسی کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ ان کا سربراہ مارا گیا۔ نیا آدمی جمی لائیڈ کے ہی نام سے پورا دھندا چلاتا رہے گا۔ اسے اس کے لوگوں کے سامنے بے نقاب کیے بغیر ہلاک کرنا بالکل بے سود ہوگا۔"

"لیکن مجھے تمھارا ساتھ دینے کی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے؟" میں نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

"سب سے پہلے تمھاری اپنی بقا کا مسئلہ ہے۔ میں بتا چکا ہوں کہ کالے دھندوں میں اپنی مرضی سے شریک اور شامل ہونا آسان ہوتا ہے لیکن کنارہ کشی آسان نہیں ہوتی۔ تم اکیلے ہو اور شی ایک وسیع تنظیم ہے۔ وہ جلد یا بدیر تمھیں ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اتار دیں گے اگر انھیں معلوم ہو جائے کہ اب تم ہمارے آدمی ہو گئے ہو تو وہ دیدہ و دانستہ مافیا سے براہِ راست ٹکرانے کی حماقت نہیں کریں گے۔ پھر میں نے محسوس کیا ہے کہ تمھیں شی کے عالمی پروگرام سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ تم صرف اتنا چاہتے ہو کہ تمھارے ملک میں ہیروئن کی تجارت روک دی جائے۔ شی امریکی زرِ تلافی کے سہارے چلنے والا بلکہ پلنے والا ادارہ ہے اس لیے وہ تو چاہیں گے کہ پاکستان اور افغانستان کی دشوار گزار سرحدی پٹی میں پیدا ہونے والی ساری ہیروئن کی کھپت یہیں پیدا ہو جائے تاکہ اس زہر سے ان کے لوگ اور ان کا معاشرہ محفوظ ہو جائے

مگر ہم پیشہ ور کاروباری لوگ ہیں۔ ہم ہر جنس کو بہتر سے بہتر منڈی میں اچھے داموں پہ بیچنا چاہتے ہیں اس لیے ہماری پوری کوشش ہوگی کہ پاکستان کی منڈی میں ایک گرام ہیروئن بھی ضائع نہ ہو کیوں کہ یہاں کے لوگ مفلس ہیں۔ ان میں ہیروئن کوڑیوں کے مول بیچنی پڑتی ہے یہی مقداریں امریکا یورپ اور برطانیہ میں بیچی جائیں تو کاروبار کا صحیح لطف آتا ہے۔ ہمارے ہاتھ مضبوط کرکے ایک طرح سے تم اپنے ملک کی خدمت بھی کرسکو گے ہوسکتا ہے کہ قحط کی وجہ سے ہیروئن کے عادی دو چار سو یا ہزار آدمی سسک سسک کر مر جائیں لیکن آنے والے چند سالوں میں یہاں کے لوگ ہیروئن کا نام تک بھول سکتے ہیں۔"

اس کی ہر بات میں وزن تھا۔ شی کے کردار اور طریق کار کے بارے میں اس نے جو منظر کھینچا تھا اُس کے لیے مضبوط دلائل بھی دیے تھے۔ اس جدید دَور میں جب مواصلاتی ترقیوں نے پیچیدہ رازوں کو بھی کھلی کتاب بنا کر رکھ دیا تھا، یہ سمجھنا ناقابل فہم تھا کہ جی لائیڈ ایک طرف بحری مواصلات کی دُنیا کا بے تاج بادشاہ ہوتے ہوئے مغربی معاشرے میں ایک معزز مقام کا حامل تھا تو دوسری طرف شی جیسی خونریز تنظیم کی سربراہی بھی کر رہا تھا اور کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ وہ ایک ہی شخصیت کے دو بہروپ تھے۔ اپنے اس بہروپ کو برقرار رکھنے کے لیے اسے یقیناً سی آئی اے اور دوسرے متعلقہ اداروں کا بھرپور تعاون حاصل تھا تاکہ وہ ہیروئن کے دُشوار گزار پیداواری ٹھکانوں سے بھاری مقداریں براؤن شوگر خرید کر زیادہ سے زیادہ مقدار میں مقامی شہروں اور دیہاتوں میں پھیلاتا رہے، باقی مقدار کا بیشتر حصہ براہِ راست یا کسی نگراں ادارے کے ذریعے ضائع کر دے اور تھوڑی بہت مقداریں بھاری ملاوٹ کرکے اسے امریکا کی زیرِ زمین دنیا میں پہنچاتا رہے تاکہ وہاں اچانک قحط پڑنے کی وجہ سے نشے بازوں کو کسی بڑی تبدیلی کا ادراک نہ ہوسکے اِس دوران نہ صرف اس کے گماشتے بلکہ خود اس کی بیٹی، ویرا لائیڈ بھی سربہ فلک پہاڑوں کے درمیان واقع ہیروئن کشید کرنے والے کارخانوں کے بارے میں ٹھوس اور چشم دید معلومات حاصل کرتی رہی۔ اطالوی نژاد ڈان تھری یہ بھی بتا چکا تھا کہ امریکی معاشرے کے لیے ہیروئن ایک ایسا چیلنج بن چکی ہے کہ اس کے انسداد کے لیے سی آئی اے جیسی رسوائے زمانہ ایجنسی کے علاوہ پینٹاگون اور ناسا کی خدمات بھی حاصل کر لی گئی تھیں جنھوں نے زمین کے گرد مدار پر جاسوسی کے بھرپور آلات سے لیس ایک ایسا مواصلاتی سیارہ بھیجا ہوا تھا جو زمین کے ساتھ اپنے مدار پہ ایک ایسی رفتار سے گھوم رہا تھا کہ عملاً خیبر کے پہاڑوں پر ٹھہرا ہوا تھا۔

امن کے نام پر دُنیا میں مہلک ترین ہتھیاروں کی ایجاد اور ترقی کا کاروبار شرمناک ڈھٹائی کے ساتھ عروج پر تھا، روز بہ روز نت نئی روح فرسا ایجادات کی خبریں چلی آ رہی تھیں وسائل کو ذرا بھی نقصان پہنچائے بغیر سیکڑوں مربع میل کے علاقے میں زندگی کو اچانک موت کی اتھاہ گہرائیوں میں پہنچا دینے والے بم بنالیے گئے تھے تاکہ فاتح قوم اپنے مفتوحین کی لاشیں بلڈوزروں سے سمندر یا اجتماعی قبروں میں دھکیل کر ان کے سجے سجائے گھروں، شہروں، بازاروں اور تفریح گاہوں کو استعمال کرسکیں۔ چلتے ہوئے ٹیلی وژن پر اپنی فتح کے ترانے سن سکیں، گرم چولہوں پر اپنی پسند کے کھانے پکا سکیں۔

ان میں بہتیرے ہتھیار ایسے تھے جن کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا تھا کہ وہ خلا سے زمینی نشانوں کو تہس نہس کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے عملی مظاہرے نہیں کیے گئے تھے لیکن دنیا کو ہر لمحے سہمائے رکھنے والے سورماؤں نے تفریحی ذرائع اور فلموں کا سہارا لے کر پورے کرۂ ارض پر لوگوں کو ان امکانات کی ایک جھلک دکھانے کے سامان پیدا کر لیے تھے جو ان کی کھلی کھلی سرکشی کا لازمی نتیجہ ثابت ہوسکتے تھے اور پھر ان تمام ہتھیاروں سے بڑھ کر لیزر شعاعوں پر مسلسل تحقیق ہو رہی تھی۔ زندگی کو نیست و نابود کرنے کے ہر شیطانی منصوبے پر انعام یافتہ خطاب یافتہ مگر اخلاق یافتہ محقق نے شب و روز اپنی شیطانی کھوپڑیوں کا زہریلا عرق ٹپکا رہے تھے۔

مجھے معلوم تھا کہ کچھ عرصے قبل امریکی حکومت نے انسدادِ منشیات کے ایک ہمہ گیر پروگرام کے تحت صوابی کی زرخیز تحصیل سمیت پورے سرحدی علاقے کے لیے خطیر مالی امداد دی تھی۔ افیم کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو آگ لگا دی گئی، جہاں آگ نہ لگائی جاسکی وہاں ہیلی کاپٹروں سے فصلوں کو برباد کرنے والی دوائیں چھڑکی گئیں، اس نقصان کے ازالے کے لیے ملنے والی امداد جب درجہ بدرجہ سکڑتی ہوئی متاثرین کے ہاتھوں میں پہنچی تو اونٹ کی جگہ خرگوش دیکھ کر وہ مشتعل ہوگئے انھیں احساس ہوا کہ انھیں فریب دے کر ان کے اثاثے برباد کر دیے گئے ہیں لہٰذا وہ بھی ان سرکشوں کے ہم نوا بن گئے جنھوں نے نہ کسی کو اپنی زمین پر قدم رکھنے دیا تھا نہ اپنی فضاؤں میں اُڑنے کی اجازت دی تھی اِس طرح رضاکارانہ تعاون سے افیم کی بیخ کنی کا وہ منصوبہ رحمِ مادر میں ہی موت سے ہمکنار ہوگیا تھا۔

لیکن وہ ایک عارضی ناکامی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وسیع اور زرخیز علاقے نظروں میں آچکے تھے ان کے بارے میں معلومات اکٹھی کی جا رہی تھیں۔ وقتی طور پر شی ہیروئن کی اسمگلنگ کو بہ کی حکمتِ عملی سے کنٹرول کر رہی تھی لیکن وہ سب سدا یوں ہی نہیں چل سکتا تھا۔ خلا میں اُڑنے والے سیارے اور پہاڑوں پر خلا میں میلوں اوپر ٹھہرے ہوئے [illegible]

میں فیاضی سے اپنے حسن کی خیرات بانٹتی پھرنے والی دریا سے ملی ہوئی معلومات کو یکجا کرکے جلد یا بدیر اس ہولناک منصوبے پر کام شروع کیا جانے والا تھا جس کی نشاندہی ڈان تھری کرچکا تھا۔

افیم کے کھیتوں اور بیجوں کو برباد کر دیا جاتا، اس فصل کے فدی کاشتکاروں کو تہس نہس کر دیا جاتا۔ زمینیں بنجر ہوجاتیں اور یوں ہزاروں میل دور اور سات سمندر پار سفاکانہ کارروائی کرکے امریکی معاشرے کو ہیروئن کے عفریت سے بچا لیا جاتا۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے امریکی اس خطۂ زمین کی مراعات یافتہ قوم ہو جس کے مفادات کی بنیادوں کو اپنے لہو سے سینچنا ہر قوم کی پیدائشی ذمّے داری ہو۔ اس ذمّے داری سے انحراف کرنے والوں کو امریکی حکمران اپنے خفیہ اداروں کے سہارے جابجا عبرت ناک نمونے بنا چکے تھے اور نہ جانے اس وقت بھی دُنیا میں کہاں کہاں ان کے پروردہ، لہو کے پیاسے اپنے شکار کی گھات لگائے بیٹھے تھے۔

شمالی پہاڑوں پر خلا میں میلوں اوپر ٹھہرے ہوئے مواصلاتی سیارے کی بات بھی دل کو لگتی تھی کیونکہ افیم کے انسداد سے وابستہ مفادات سے قطعِ نظر امریکا ان دنوں افغانستان کی سرزمین پر روس کے خلاف بالواسطہ ایک بڑی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس کے حمایت یافتہ گوریلا لڑاکوں کی سپلائی لائن کا انحصار ہمارے ان ہی شمالی پہاڑوں پر گزرنے والے راستوں اور دروں پر تھا۔ اس طرف ہونے والی ذرا سی بھی گڑبڑ جنگ کا پانسا پلٹ سکتی تھی۔ اس لیے وہاں کی پل پل کی خبر رکھنے کے لیے بھی خلا سے نگہبانی ناگزیر ہوگئی تھی۔

شاید شی عالمی سیاست اور امریکی مفادات سے لتھڑی ہوئی ایک متعفن تنظیم تھی جو ہر قیمت پر اپنے مفادات حاصل کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ وہ کہیں بھی، اپنے کسی بھی حریف کا گلا کاٹنے کے لیے تیار رہتے تھے بعض جگہ ان کے وسائل مقامی حکومتوں سے بھی برتر تھے۔ میں خود دیکھ چکا تھا کہ وہ ایم ٹی تھری ہنڈرڈ جیسا طاقت ور ٹرانسمیٹر پاکستان میں طویل رابطوں کے لیے استعمال کرتے تھے جب کہ مجھے پورا یقین تھا کہ ایسے طاقت ور لاسلکی آلات پاکستان کے شہری ادارے تو کجا، شاید دفاعی اداروں کے پاس بھی نہیں تھے۔

ان کرائے کے قاتلوں کے مقابلے میں مافیا واقعی ایک مہذب تنظیم نظر آتی تھی جو اپنی قوت کے لیے کہیں کہیں مقامی سیاست میں ضرور ملوث ہوسکتی تھی لیکن بنیادی طور پر سیاست زدہ نہیں تھی۔ انھیں دنیا کے کسی نشے سے نفرت نہیں تھی۔ اگر دوا ساز کارخانوں میں بننے والی منشیات اور شراب کی پیداوار جاری تھی تو ان کے خیال میں ہیروئن کی کشید پر بھی کوئی قدغن نہیں ہونی چاہیے تھی ان کا مفاد اس میں

تھا کہ پاکستان، افغانستان، برما اور بھارت جیسے غریب ملک افیم سے سستے داموں ہیروئن کشید کرتے رہیں جسے مافیا والے آسودہ حال مغربی اور امریکی منڈیوں میں اپنے مُنہ مانگے داموں پر فروخت کرسکیں۔ ڈان تھری نے بتا دیا تھا کہ مافیا بے مقصد خونریزی پر یقین نہیں رکھتی تھی کیونکہ وہ زیرِ زمین دُنیا میں ہمیشہ اپنی برتری قائم رکھنے کے خواہاں تھے، یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ آج جس سے تصادم ہوجائے، کل کسی مصلحت یا ضرورت کے تحت اسے دوست بھی بنانا پڑجاتا ہے۔ مافیا کے ماضی کی ایک تاریخ تھی جس کے سہارے وہ اپنے مفہوم میں ایک تابناک مستقبل کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اس کے برعکس شی کے مفاد قلیل المیعاد تھے۔ ڈان تھری کے بیان کے مطابق ان کا مشن بہت زیادہ محدود تھا۔ جس دن پاکستان کی جغرافیائی حدود میں افیم کا ہر پودا تباہ کر دیا جاتا اور زرخیز زمین کا ہر انچ بانجھ کر دیا جاتا اس دن شی کا مقصد پورا ہوجاتا اور شاید وہ تنظیم توڑ دی جاتی یا شاید سی آئی اے کی کسی شاخ میں مدغم کر دی جاتی تاکہ ان لوگوں کے ہنر، تجربے اور پیشہ ورانہ مہارت سے دوسرے شعبوں میں فائدہ اُٹھایا جاتا۔

میں بہت تیزی کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ قلم بند کرتے ہوئے شاید یہ تقریر بہت زیادہ طویل ہوگئی ہو لیکن اُس وقت یہ سب کچھ میرے طلسمِ خیال میں لمحوں میں آیا اور گزر گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" ڈان تھری نے مجھے خاموش پا کر ٹوکا۔ "تم شی میں لوٹنا چاہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اب تم شی کے کارکن رہ سکتے ہو یا ہمارے۔ اس کے درمیان کی ہر صورت تمھاری زندگی کو جہنم بنا دے گی۔ ہم اپنے حریفوں کو ان کی التجاؤں کے باوجود نہیں مارتے۔ انھیں زندہ رکھ کر اس طرح سسکاتے رہتے ہیں کہ وہ زندگی سے نفرت اور موت سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ہم بے مقصد خونریزی پر یقین نہیں رکھتے۔ جسے مارتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر اور کسی ناگزیر ضرورت کے تحت مارتے ہیں۔ ہمارا شیوہ شی والوں جیسا نہیں ہے جو بس اپنے ہر حریف کو موت کی نیند سلانے پر تُلے رہتے ہیں۔"

"تمھارے دلائل مضبوط اور ارادے مستحکم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے تمھارا ہم نوا بننا پڑے گا۔ مجھے یہ سوچ کر ہی دلی صدمہ ہو رہا ہے کہ ایک طویل مدت تک شی کے لیے کام کرنے کے باوجود میں ان کے حقیقی عزائم کو نہیں سمجھ سکا...!"

"جہاں تنظیم کے بجائے ون مین شو ہو، وہاں یہی ہوتا ہے پالیسی کے بجائے مقتدرِ اعلیٰ کے دماغ میں ابھرنے والا ہر خیال آرڈر آف دی ڈے بن جاتا ہے لیکن مافیا ایک روایتی تنظیم ہے جس کے اپنے اسرار و رموز ہیں لیکن اس کے باوجود ساری دنیا جانتی ہے کہ مافیا جرائم اور منشیات کے فروغ سے اپنے کا کنوں

کو بیش بہا روزی فراہم کرتی ہے۔ جو لوگ مافیا کے لیے کام کرکے شاہوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں، انھیں آج فارغ کر دیا جائے تو وہ اپنے لیے دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے کما سکیں گے۔"

"اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ تم اپنے کارکنوں کو برباد کر رہے ہو۔ تمھیں چھوڑ کر تو وہ زندہ بھی نہ رہ سکیں گے۔۔۔"

اس نے بڑی متانت سے میری بات کاٹ دی۔ "کسی بھی مزدور، ملازم یا ماتحت سے کام لینے کے دو ہی طریقے ہیں۔ اچھی کارکردگی پر جزا اور خراب کارکردگی پر سزا۔ ہم نے اس سے ہٹ کر ایک نیا اصول وضع کیا ہے جو شاید تھوڑے ہی عرصے بعد نصابی کتابوں میں شامل کر لیا جائے گا۔ ہماری صفوں میں نااہل آدمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں، جو اہل ہوتے ہیں، انھیں ہم ان کی اہلیت اور صلاحیت سے بڑھ کر معاوضے اور مراعات دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا فطری جال ہے جس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ ہمارے کارکن ساری عمر ہمارے لیے کام کرتے رہتے ہیں۔ انھیں بھول کر بھی کہیں اور جانے کا خیال نہیں آتا۔ میرا خیال ہے، ہم سے سمجھوتا کرکے تم خسارے میں نہیں رہو گے۔"

"اصولی طور پر میں تم سے متفق ہوں لیکن پھر بھی مجھے فیصلہ کرنے کے لیے کچھ مہلت درکار ہے۔ میں کافی عرصے سے اپنے طور پر من مانی کارروائیاں کرتا رہا ہوں۔ مجھے سوچنا پڑے گا کہ تمھارے ڈسپلن کو میں کس حد تک قبول کر سکوں گا۔ صرف میری وجہ سے تم اپنے ضابطے نہیں بدل سکتے اور نہ ان کی خلاف ورزی برداشت کرنا چاہو گے۔"

"یہ بنیادی بات ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مافیا ڈسپلن کا دوسرا نام ہے اگر مجھے حکم دے دیا جائے تو میں ہر روز بڑی خوشی سے کسی خارش زدہ کتے کو بھی گڈ مارننگ کہنا شروع کر دوں گا۔ یہ نکتہ ذہن میں رکھنا کہ اگر تم ہم میں شامل ہوئے تو تمھیں کامٹ کی بالادستی کو تسلیم کرنا ہوگا اور یہی تمھارا پہلا باس ہوگا۔"

"یہ میں سمجھ چکا ہوں۔" میں نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے اچانک ہی موضوع بدل دیا۔ "کراچی میں آج کل شی کا سربراہ کون ہے؟"

اطالوی نژاد نے اپنا نقاب سے ڈھکا ہوا چہرہ مقامی کی طرف گھمایا جیسے میرے سوال کا جواب اس سے سننا چاہ رہا ہو۔ اس کا عندیہ سمجھتے ہی کامٹ کی زبان چل پڑی۔ "کراچی میں شی کا کام بہت محدود ہو گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ دلدار آغا ہی ان معاملات کی دیکھ بھال کر رہا ہے جہاں نفری کم ہو وہاں اندر کی باتیں معلوم کرنا ذرا دشوار ہی ثابت ہوتا ہے۔"

"لیکن دلدار آغا تو شہر کا ایک معزز آدمی ہے۔ میں نے پہلے کبھی جرائم کے سلسلے میں اس کا نام نہیں سنا تھا۔ ایک نئے آدمی کو براہِ راست اتنی بڑی ذمے داری تو نہیں سونپی جا سکتی!" میں نے بظاہر حیرت سے کہا۔

"اپنی معلومات پر اتنا ناز کرنا اچھا نہیں۔" مقامی کا لہجہ قدرے طنزیہ ہو گیا۔ "تم میرے بارے میں بھی یہ کہہ سکتے ہو کہ تم نے کبھی میری آواز نہیں سنی پھر چہرہ دیکھ کر یہ بھی کہو گے کہ میں اپنی لائن میں نووارد ہونے کے باوجود اپنے کراچی بیورو کا چیف کیسے ہو گیا۔ تم کافی عرصے باہر رہے ہو۔ اس دوران میں یہاں بہت تیزی کے ساتھ تبدیلیاں آئی ہیں پھر ویسے بھی تمھارا واسطہ ایک مخصوص لائن کے لوگوں سے تھا۔ پوری زیرِ زمین دُنیا سے تم کبھی واقف نہیں رہے ہو گے۔"

"شاید تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ دلدار آغا پرانا پاپی ہے۔" میں نے مضحکانہ لہجے میں ترکی بہ ترکی سوال کیا۔

"تم ایک دوسرے کے ساتھ تلخ ہونے کی کوشش مت کرو۔" ڈان تھری نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ وہ گفتگو خاصی توجہ سے سن رہا تھا۔

"دلدار آغا ایک ایئر لائن میں اسٹیورڈ تھا۔" کامٹ نے ذرا ہی سنبھالا لے لیا۔ "اپنی نوکری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ہیر پھیر کے کام شروع کیے جس کے نتیجے میں اس کے پاس اچانک ہی بے تحاشا پیسہ آگیا اور اس نے دوائیں بنانے کی ایک فیکٹری کھول لی۔ وہ کبھی کھل کر میدان میں نہیں آیا تھا لیکن شاید نادانستگی میں وہ شی والوں سے جا ٹکرایا اور ان ہی کی مدد سے اس نے اپنی خطیر دولت حاصل کی تھی اِس لیے جب یہاں شی کے پیر اکھڑنے لگے تو انھوں نے اپنا کام سمیٹ کر دلدار آغا کو اس کا نگراں مقرر کر دیا۔ وہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ان کے لیے کام کرنے پر مجبور ہے اور شی کے معاملات میں کبھی کبھار اسی کا نام سننے میں آتا رہا ہے مگر اس نے اپنی فیکٹری بند نہیں کی ہے۔"

"اور شی میں ہی ڈی ڈی بھی کوئی نام ہے۔" میں نے تائید طلب لہجے میں سوال کیا۔

"یہ نام بھی سنا ہوا ہے۔" چند ثانیوں کے توقف کے بعد وہ پُرخیال آواز میں بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ دلدار کا باس ہو۔"

وہی ایک نکتہ ایسا تھا جس پر اس کی رائے معلوم کرنے کے لیے میں نے اس سے شی کے بارے میں گفتگو شروع کی تھی۔ انھیں شی سے دلدار آغا کی وابستگی کا علم ضرور تھا لیکن وہ تنظیمی ڈھانچے میں اس کی اہمیت سے بے خبر تھے۔ پھر میں نے کامٹ سے وہ اگلا سوال بھی دریافت کر لیا جو میری رائے میں اہم تھا۔ "دلدار آغا اپنی دواساز فیکٹری کی آڑ میں تو ہیروئن کا کوئی چکر نہیں چلا رہا؟"

"اس کا کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ وہ فیکٹری اس نے معاشرے میں اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے قائم کی تھی اس لیے یہ امکان نظر نہیں آتا کہ اس نے فیکٹری کو بھی کسی کالے دھندے میں ملوث کیا ہوگا۔ اس پر کبھی بُرا وقت آیا تو وہ فیکٹری والے کاروبار کے سہارے خود کو بچانے کی کوشش کر سکے گا مگر

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تمھاری سابقہ محبوبہ یک بیک اس کی بیوی کیسے بن بیٹھی؟"

دلدار آغا کے بارے میں اس کی معلومات ادھوری تھیں۔ اسی طرح عزالہ کے بارے میں بھی اسے مکمل معلومات حاصل نہیں تھیں۔ اس لیے میں نے اپنے طور پر اس میں کوئی اضافہ نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"آدمی نجانے کس کس سے ملتا ہے۔ زندگی کے طویل سفر میں بہتیرے حسین چہرے آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کون کہاں آشیانہ بناتا ہے، یہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ عزالہ کے علاوہ بھی اس شہر میں کئی لڑکیاں ہیں جن سے میری گہری شناسائی رہی تھی اور آج وہ اپنے گھر بسائے بیٹھی ہیں۔ اس معاملے میں، میں پیچھے پلٹ کر دیکھنے کا عادی نہیں ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" ڈان تھری سنجیدہ لہجے میں بولا۔ شاید اس معاملے میں وہ بھی کوئی چوٹ کھا چکا تھا۔ "وقت بہت ظالم ہوتا ہے جو گزر جاتا ہے اور پھر لوٹ کر نہیں آتا۔ آج کی خوشیاں اور رنگینیاں کل صرف ایک سہانا خواب بن کر رہ جاتی ہیں۔ اپنا وہی ہوتا ہے جسے پوری طرح اپنا لیا جائے۔ ماضی کے بارے میں زیادہ سوچ کر پچھتاووں کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔"

میں نے اس کی رائے پر کوئی تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور تائیدی انداز میں سر ہلا کر سگریٹ سُلگانے میں مصروف ہو گیا اس بار ان دونوں نے مجھے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے سے نہیں روکا تھا۔ دورانِ گفتگو ڈان تھری نے اپنا پستول واپس جیب میں ڈال لیا تھا جب کہ کامٹ کے پستول کی نال فرش کی طرف جھکی ہوئی تھی۔

"پھر تمھارا کیا فیصلہ ہے؟" آخر کار کامٹ نے ہی کمرے میں چھایا ہوا سکوت توڑا۔

"اصولی طور پر میں تم سے متفق ہوں لیکن ہماری اگلی ملاقات ناگزیر ہے۔ میں عجلت میں کوئی فیصلہ کرکے اس سے پھرنا نہیں چاہتا۔ مجھے ہر پہلو پر غور کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔" میں نے پھر اپنی بات دُہرائی۔

"میرے پاس بہت کم وقت ہے۔" ڈان تھری نے کہا۔۔ "تمھارا معاملہ میں یورپ واپس جانے سے پہلے اپنی موجودگی میں طے کرنا چاہتا ہوں۔ تم کب تک کا وقت لینا چاہتے ہو؟"

سلطان شاہ جاز فارماسیوٹیکل کی راہ پر لگا ہوا تھا۔۔۔ مجھے سکندر بخت کی فکر تھی اور پھر میں جہانگیر سے بھی کچھ مشورے لینا چاہتا تھا جس کے لیے مجھے کم از کم اگلا دن درکار تھا۔ اس لیے میں نے اسے تیسرے روز شام کا وقت بتا دیا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "پرسوں رات آٹھ بجے کامٹ تم سے فون پر رابطہ قائم کرے گا۔"

"یہ نقابیں اور اشاراتی نام کب تک ہمارے درمیان حائل رہیں گے؟" میں نے بے بسی سے سوال کیا۔

ڈان پہلی بار مختصر سی ہنسی ہنسا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بھوکا بھیڑیا اپنے شکار کو اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے غرّایا ہو۔ "یہ پردے فیصلہ ہونے تک قائم رہیں گے لیکن مجھ سے تمھارا جتنا تعارف ہو چکا ہے اس سے زیادہ نہیں ہو سکے گا۔ شاید کچھ عرصے بعد تم مجھ سے دُو بدو ملاقات کر سکو مگر فی الحال یہ ضروری ہے۔"

"جہاں مجبوری ہے۔۔۔۔ وہاں میں اصرار نہیں کر سکتا۔ ویسے یورپ سے تمھاری مُراد شاید سسلی سے تھی؟"

"روایتی طور پر اٹلی کو مافیا کا پیدائشی وطن اور سسلی کو مافیا کا شہر کہا جاتا ہے۔ روایتی طور پر آج بھی سسلی ہی ہمارا ہیڈ کوارٹر ہے لیکن عملاً ہم دنیا کے ہر اہم مرکز میں مقامی سطح پر اہم فیصلے کرنے کے قابل ہیں۔" اس نے اپنی منزل کی نشاندہی کیے بغیر بہت خوب صورتی کے ساتھ میرا سوال ٹال دیا۔

"لیکن شی والوں نے حال ہی میں اپنا ہیڈ کوارٹر روم سے وینس منتقل کر لیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ مافیا کی طرح شی کی پیدائش بھی اٹلی میں ہی ہوئی ہے۔" میں نے شوشا چھوڑا۔

"یہ نئی خبر ہے۔" ڈان تھری کے لہجے میں اشتیاق اُبھر آیا۔ "ویسے تو جی لائیڈ کے تمام دفاتر بدستور روم میں کام کر رہے ہیں۔"

"شی کا ہیڈ کوارٹر وہاں ہوتا ہے جہاں جی لائیڈ موجود ہوتا ہے اور آج کل وہ وینس میں ہے جہاں شاید سمندری نہروں اور راستوں کی وجہ سے وہ خود کو زیادہ محفوظ تصوّر کر رہا ہوگا۔ میلان میں اگر میں کھل کر سامنے نہ آیا ہوتا تو شاید پاکستان واپس لوٹنے کے بجائے وینس ہی کا رُخ کرتا۔ ویسے بھی مجھے سمندر میں آباد وہ شہر دیکھنے کی آرزو ہے۔"

"تم جانتے ہو کہ چھوٹے موٹے لوگوں کے مقابلے میں منظّم طور پر کام کرنے والے بِلا وجہ کسی سے نہیں الجھتے۔ ہم بھی شی سے ٹکرانا نہیں چاہتے۔ اس طرح ہم غیر ضروری طور پر اپنے چند مضبوط حریف پیدا کر لیں گے لیکن ان کے ساتھ تمھارا تجربہ ہمارے لیے کارآمد ثابت ہوگا۔ ہم اپنی حکمتِ عملی سے ہیروئن کی مارکیٹ میں انھیں بالکل مفلوج کر دینا چاہتے ہیں۔" اُس نے اپنی رِسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ میری زبان سے شی کا ذکر سنتے ہی وہ رُک کر مجھ سے زیادہ سے زیادہ معلومات اُگلوانے کے چکّر میں پڑ گیا تھا۔

"مگر یہ سب اسی وقت ہوگا جب ہم میں معاہدہ ہو جائے۔" میں نے مسکراتے ہوئے خندہ پیشانی سے کہا اور وہ میرا مقصد سمجھ کر فوراً اُٹھ گیا اور اس نے پہلی بار میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا جسے اپنے ہاتھ میں لیتے ہی میں چونک پڑا کیونکہ وہ اس کی شخصیت اور پیشے کے برعکس بہت نرم تھا جیسے اس

میں ہڈی ہی نہ ہو۔ میرے لیے وہ ہاتھ عجیب ہی نہیں تھا بلکہ اس کا لمس بھی طبیعت میں ناقابلِ بیان غیر فطری احساس پیدا کرنے کا سبب بن گیا تھا لیکن اس بارے میں مَیں اخلاقاً اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا اور اس نے گرمجوشی سے ہاتھ ملانے کے بعد اپنا ہاتھ نیچے گرا لیا۔

میں فلیٹ کا دروازہ کھول کر ان دونوں کو رخصت کرنا چاہ رہا تھا لیکن ڈان تھری نے مجھے وہیں رکے رہنے کے لیے کہا۔ بند دروازے کے سامنے وہ دونوں چند ثانیوں کے لیے رکے، ان کی پشت میری جانب تھی وہاں انھوں نے چٹکیوں سے اپنے سیاہ نقاب اتار کر اپنی جیبوں میں اُڑسے اور پھر مڑ کر میری طرف دیکھے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ اپنی دانست میں انھوں نے اپنے چہرے مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی کامیاب کوشش کی تھی مگر وہ باتھ روم کے دُہرے دروازے کے راز سے بے خبر تھے جس کے طفیل میں تاریک خواب گاہ میں داخل ہو کر انھیں فلیٹ پر آنے والے لڑکے کے سامنے بے نقاب دیکھ چکا تھا۔

ان دونوں سے میری ملاقات خاصی تسلی بخش رہی تھی۔ میرے بارے میں ان کی معلومات قابلِ رشک اور طریقِ کار بالکل بے داغ تھا جس سے مرعوب نہ ہونا ناممکن تھا لیکن دوسری طرف شی کے بارے میں ان کی معلومات میں دُہرا پیمانہ نظر آیا تھا۔ ایک طرف وہ عالمی پیمانے پر شی کی جڑوں میں اُترے ہوئے تھے، اس کے مقاصد کے بارے میں دلائل کے ساتھ اپنے نظریات بھی رکھتے تھے لیکن کراچی میں شی کی تنظیم کے بارے میں کامٹ کی معلومات سطحی نوعیت کی تھیں۔ دلدار آغا کی ذات سے آگے وہ بالکل بے خبر تھا۔ اگر ان کے آدمی نے شیراڈ کی ڈکی میں چھپ کر میرے ساتھ شاہ باغ تک سفر نہ کیا ہوتا تو شاید کامٹ کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو پاتا کہ ملیر کے مضافات میں واقع شاہ باغ، دلدار کی ملکیت تھا۔ تیسری اہم بات یہ تھی کہ غزالہ سے میری گہری جذباتی وابستگی سے وہ یکسر لاعلم تھا اور یہ تینوں باتیں میرے حق میں جاتی تھیں اگر میں مافیا والوں سے اشتراکِ عمل کا فیصلہ کر لیتا تو بھی اپنے طور پر اپنے رقیب، دلدار آغا کے خلاف اپنا کام جاری رکھ سکتا تھا۔

جسمانی طور پر ان سے ملنے میں مجھے کسی زحمت سے دوچار نہیں ہونا پڑا تھا لیکن وہ مافیا جیسی عالمگیر تنظیم کے نمائندے تھے اس لیے ان مذاکرات نے مجھے ذہنی طور پر تھکا دیا تھا۔ ان سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے ہر لمحے محتاط اور چوکنا رہنا پڑا تھا۔ اس لیے میں کچھ آرام کی ضرورت محسوس کر رہا تھا جس کے لیے بستر سے زیادہ کسی مونس و غم خوار کی رفاقت کی ضرورت تھی۔

غزالہ حالات کے تیز رفتار دھارے میں پھنس کر ایک ایسا فیصلہ کر چکی تھی جس پر شاید وہ اپنے دل میں خود بھی درد کی لہر اٹھتی ہوئی محسوس کر رہی تھی لیکن ایک باوفا مشرقی لڑکی کی طرح اپنے جیون ساتھی کے دل میں کسی شبہے کو جگہ دیے بغیر ساتھ نبھانے کا عزم کیے ہوئے تھی اور اس کا راستہ مجھ سے بالکل ہی جدا ہو گیا تھا۔ ہم متوازی راستوں کے مسافر ہو گئے تھے جو ساتھ ساتھ تو چل سکتے ہیں لیکن قیامت تک بھی ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے۔

جہانگیر کی بیوی سلمیٰ بھی اپنے خطرناک عزائم کے باوجود ایک اچھی دوست تھی لیکن بدقسمتی سے اس روز وہ مجھ سے ناراض تھی اور باقاعدہ صلح ہوئے بغیر اس سے مل بیٹھنا میرے لیے دشوار تھا۔ کراچی جیسے بھرے پُرے شہر میں اس وقت وہی دو عورتیں ایسی تھیں جن کے بارے میں مَیں دوستانہ انداز میں کچھ سوچ سکتا تھا، ورنہ سب اجنبی تھیں جن میں سے کچھ کے ساتھ لمحوں کی سوداگری تو کی جا سکتی تھی لیکن ان سے کسی ذہنی سکون کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

ان کے بعد سلطان شاہ تھا جو اگلی صبح دلدار کی دوا ساز فیکٹری میں ملازمت حاصل کرنے کے سلسلے میں اس کے فیکٹری مینجر سے ملنے والا تھا۔ وہ اپنی ذات کو ہر قسم کے شبہات سے بالا رکھنے کے لیے بنارس چوک کے قریب کچے مکانات اور جھونپڑیوں پر مشتمل ایسی آبادی میں منتقل ہو گیا تھا جہاں رابطے کے لیے فون وغیرہ کی کوئی سہولت موجود نہیں تھی اس لیے لے دے کر بس جہانگیر ہی رہ گیا تھا جسے میں اس وقت کھڑکا سکتا تھا۔

ڈور بیل کے جواب میں دروازہ کھولے جانے پر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میری کھوپڑی پر ڈنڈا رسید کر دیا ہو۔ لڑکی تو وہ واقعی بہت حسین تھی پھر اس نے مزید نکھار کے لیے جو ہلکا پھلکا میک اپ کیا ہوا تھا اس نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ غالباً اس کی وہ ساری تیاری اس مدہوش احمق کے لیے تھی جس نے خود اوپر سات نمبر فلیٹ پر آنے کے بجائے ایک آوارہ گرد لڑکے کو ٹِپ دے کر اوپر بھیج دیا تھا۔

یہ اس کے مقدّر کی خرابی تھی کہ وہ لڑکا سات نمبر کے بجائے میرے فلیٹ کی گھنٹی بجا بیٹھا اور کامٹ کے ہتھے چڑھ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے بے نیل و مرام واپس بھاگنا پڑا اور میری پڑوسن اپنی تمام تیاریوں سمیت اس کے انتظار میں اپنے گھر میں بیٹھی رہ گئی۔

میں نے جہانگیر کو فون کیا تو میں بالکل خالی الذہن تھا اور وقت گزاری کے لیے اسے فلیٹ پر بلانا چاہ رہا تھا لیکن جب اس سے باتیں شروع ہوئیں تو میرے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت اچانک مجھے پڑوسن یاد آئی اور میں نے جہانگیر سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ اسے پوری بلڈنگ میں ایسی کسی خاتون کی رہائش کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ پہلے وہ مجھے اپنے گھر بلانا چاہ رہا تھا تاکہ سلمیٰ سے میری صلح کرا سکے لیکن سیما کے بارے میں میرا انکشاف سنتے ہی وہ بہ ذاتِ خود وہاں آ پہنچا۔

وہ اس بات پر حیران تھا کہ میں نے اتنی قلیل مدت میں سیما کے بارے میں معلومات کیسے حاصل کر لیں۔ میں نے کامٹ اور ڈان تھری کا ذکر حذف کرتے ہوئے اسے بتایا کہ ایک آوارہ گرد لڑکا سیما کو بلانے غلطی سے میرے فلیٹ پر آ گیا تھا۔ میں اسے اس کی غلطی کا احساس دلائے بغیر نیچے پہنچا تو ایک کار نشین سے سیما کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں اور میں نے خود کو سیما کا شوہر ظاہر کر کے کار نشین کو فرار کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

جہانگیر کے اصرار پر مجھے سیما کے دروازے پر جانا پڑا۔ میں پہلے بھی دو بار سرسری نظروں سے اپنی اس پڑوسن کو دیکھ چکا تھا لیکن اس وقت وہ سرتاپا دو آتشہ بنی ہوئی تھی۔ شاید اس نے میرے چہرے سے فوراً ہی میرے دلی تاثرات بھانپ لیے تھے کیونکہ اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”فرمائیے!“ اس کی کھنکتی ہوئی آواز مجھے فوراً ہی عالمِ خیال سے عالمِ وجود میں کھینچ لائی۔ ”آپ کو کس سے ملنا ہے؟“

”آپ کا پڑوسی ہوں۔“ میں نے اپنے فلیٹ کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور آپ ہی سے ملنے آیا ہوں۔ اگر مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تو شاید آپ ہی مس سیما ہیں؟“

اس کے چہرے پر قدرے حیرت ابھر آئی۔ ”میں مس نہیں بلکہ مسز ہوں، لیکن میرا نام آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم دروازے پر کھڑے رہنے کے بجائے کہیں بیٹھ کر گفتگو کریں؟ میری خواہش ہے کہ اس وقت میں آپ کی میزبانی کا شرف حاصل کروں۔“

”اوہ! اندر آ جائیے!“ وہ خجالت آمیز انداز میں میرے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے بولی۔ ”میں اتنی بداخلاق نہیں ہوں لیکن آپ نے مجھے اتنا حیران کر دیا کہ میرا ذہن ہی مفلوج ہو کر رہ گیا۔“

”آپ میرے فلیٹ میں چلیں۔“ میں نے اصرار کیا۔ ”پہلی دعوت میں نے دی ہے۔ بعد میں آپ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔“

چند ثانیوں کے تردّد کے بعد اس نے میری پیشکش قبول کر لی۔ میری دستک کے جواب میں جہانگیر نے دروازہ کھولا اور وہ اندر داخل ہوئی تو لمحہ بھر کے لیے جھجکی تھی مگر پھر اندر بڑھ گئی۔ جہانگیر نے ابتدا ہی سے تکلف کی فضا ختم کرنے کی نیت سے میری غیر موجودگی میں اسکاچ کے دو گلاس بنا لیے تھے۔ غنیمت یہ تھا کہ سیما فضا میں اسکاچ کی بو اور گلاسوں میں طلائی سیال دیکھ کر جھجکی ضرور تھی مگر بھڑکی نہیں تھی۔

”آپ کیا پینا پسند کریں گی؟ ہارڈ یا سوفٹ؟“ رسمی تعارف کے بعد میں نے اس سے سوال کیا۔

”آپ لوگ تو خاصے خوش ذوق معلوم ہوتے ہیں لیکن میں گھر پر ڈرنک نہیں کرتی۔ ویسے بھی اس وقت میں کسی ملاقاتی کا انتظار کر رہی تھی۔“ اس کا جواب حسبِ توقع حوصلہ افزا تھا۔

”اوّل تو آپ اپنے گھر پر نہیں بلکہ میرے گھر پر ہیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ کا ملاقاتی آپ کے بجائے میرے گھر آ کر واپس جا چکا ہے اور شاید اب وہ بدتمیز آدمی واپس نہ آئے۔“ میں نے اس کے لیے تیسرا گلاس بناتے ہوئے کہا۔

”وہ آپ کے فلیٹ پر آ گیا تھا؟“ سیما کی آواز سے حیرت کے ساتھ ہی ہلکا سا خوف بھی جھلک رہا تھا۔

”وہ بری طرح نشے میں تھا۔ اس کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ وہ غلط فلیٹ پر آیا تھا اس لیے میں نے اس پر جرح کی تو اس نے اشتعال کے عالم میں آپ کے بارے میں گستاخی شروع کر دی اور میں نے اس کی رہنمائی کا ارادہ ترک کر کے اسے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ آپ کا نام اسی نے بتایا تھا۔ شاید آپ کسی ایئر لائن میں ملازمت بھی کرتی ہیں؟“ میں نے برف ڈال کر گلاس اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

اس کے شہابی چہرے پر یک بیک اضمحلال طاری ہو گیا۔ میں نے مختصر لیکن منتخب الفاظ استعمال کیے تھے تاکہ وہ اپنے بارے میں میری معلومات کی نوعیت سے واقف ہو سکے۔ میں اس کوشش میں کامیاب رہا تھا لیکن اپنا بھرم کھل جانے کے احساس نے اسے اداس کر دیا تھا۔

”چیئرز!“ جہانگیر نے اپنا گلاس اٹھا کر سیما کی طرف لہرایا۔ فضا میں تینوں گلاس ٹکرائے، سب نے اپنے لب تر کیے اور گلاس واپس میز پر رکھ دیے۔ وہ اس وقفے کا بہترین استعمال ثابت ہوا تھا۔

”میں خلیج کے علاقے کی ایک ایئر لائن میں ملازمت کرتی تھی۔ پچھلے چند ہفتوں سے گھر پر ہی رہتی ہوں۔“ سیما نے آہستگی سے کہا۔ ”مجھے شرمندگی ہے کہ میرے ملاقاتی کی وجہ سے آپ لوگوں کو کوفت ہوئی...!“

”ارے نہیں!“ جہانگیر نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر اس کی بات کاٹ دی۔ ”ہم تو اس بے چارے کے ممنون ہیں کہ اسی کی وجہ سے آپ سے تعارف حاصل کرنے کا موقع مل گیا ورنہ کراچی میں تو لوگ برسوں ایک دوسرے کے پڑوسی رہ کر بھی اجنبی رہتے ہیں۔ ویسے آپ کے شوہر کی کیا مصروفیت ہوا کرتی ہے؟“

جہانگیر کے آخری احمقانہ سوال پر میرا خون کھول اٹھا۔ ہم وہاں دل بہلانے اور کچھ ہلکی پھلکی باتیں کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے اور وہ سیما کو اس کے شوہر کا وجود یاد دلا رہا تھا جسے شاید وہ خود بھی بھلائے رکھنا چاہتی تھی۔

”وہ بھی ایک ایئر لائن میں اسٹیورڈ ہیں۔“ سیما نے اپنے گلاس

سے دوسرا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”دورانِ ملازمت ہی ہماری دوستی ہوئی تھی اب ہماری کمپنیاں مختلف ہو گئی تھیں اس لیے ہماری ملاقات کم ہی ہوتی تھی...“

”لیکن تم نے ملازمت کیوں چھوڑ دی؟“ میں نے بے تکلفانہ طرزِ تخاطب اختیار کرتے ہوئے سوال کر ڈالا۔ ”اس پیشے میں گلیمر بھی ہے اور دنیا گھومنے کی کشش بھی۔ نئے رجحانات رکھنے والی لڑکیاں تو شادی سے پہلے چند برس اس پیشے میں گزارنے کے خواب دیکھا کرتی ہیں۔ معاوضے کے ساتھ سیاحت سے بڑی عیاشی اور کیا ہو سکتی ہے؟“

”گلیمر ہر ایک کے لیے نہیں ہوتا۔“ وہ بولی۔ ”اس میں شبہ نہیں کہ دورانِ پرواز مشہور اور ممتاز لوگوں سے دوستی کرنے کا موقع ملتا ہے۔ نت نئے مقامات کی سیر ہوتی رہتی ہے لیکن ان چیزوں کا خمار ہمارے ذہنوں میں افسانوی فضا تیار کر دیتا ہے۔ ہمارا معیار بڑھ جاتا ہے۔ پسند اور ناپسند کے معاملے میں حساس ہو جاتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ ہمیں مسافروں کو کھانا کھلا کر ان کے جھوٹے برتن سمیٹنے ہوتے ہیں۔ ہمارا بنیادی کام کسی مسکین گھریلو خادمہ سے مختلف نہیں ہوتا۔ بس ہمارا واسطہ کچھ منتخب لوگوں سے پڑتا ہے جو مہنگا فضائی سفر کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ اب تو بعض روٹس پر ہمیں گٹھری اٹھائے ہوئے ان تہ بند پوش جاہلوں کی بھی ناز برداری کرنی پڑتی ہے جو ملازمت کے سلسلے میں مفت کا ٹکٹ لے کر جہازوں پر چڑھ آتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے گھاٹ پر کپڑے دھونے والے کو حقیر سمجھ کر دھوبی کہا جاتا ہے لیکن بڑی لانڈری لگانے والوں کو معزز صنعت کار سمجھا جاتا ہے حالانکہ کام دونوں ایک ہی کرتے ہیں بلکہ دھوبی کے کام میں محنت اور خدمت کا زیادہ گہرا جذبہ شامل ہوتا ہے۔“

اس کی سوچ خاصی تلخ اور کاٹ دار تھی۔ اس نے نیم خواندہ اور ناخواندہ فضائی مسافروں کے بارے میں اپنے تاثرات چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی مگر پھر بھی بات واضح نہیں ہو سکی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

”عملاً ہم زمین کی مخلوق ہوتے ہیں مگر ہمارے ذہن فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں۔“ میرے استفسار پر اس نے تیسرا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”ہم ان دولت مند شہزادوں کے خواب دیکھتے رہتے ہیں جو ہمیں حسن کی ملکہ سمجھ کر ہمیں ساتھ لے جائیں اور پھر زندگی بھر ہماری پوجا کرتے رہیں۔ شاید سب کی سوچ ایسی نہ ہوتی ہو مگر میرے خواب یہی تھے۔ جب کوئی شہزادہ نہیں آیا تو میں نے ایک اسٹیورڈ سے شادی کر لی پھر ہم نے پیسہ کمانے کی تدبیریں سوچنی شروع کر دیں۔ وہیں سے ہم غلط راستوں پر پڑ گئے۔“

”مجبوری میں بہت کچھ ہو جاتا ہے۔“ جہانگیر نے ان الفاظ کو سیما کا اعتراف سمجھتے ہوئے بزرجمہر کے سے انداز میں اپنی کھوپڑی ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہم لوگ کوئی مجبوری نہ ہونے کے باوجود بار رہا نہیں

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ وہ بھی جہانگیر کی بات کاٹ کر بے تکلفی پر اتر آئی۔ ”میرا اپنا ایک فلسفہ ہے۔ دل چاہنے پر اگر اپنی خواہش کے تحت کچھ کر لیا جائے تو میں اسے غلط نہیں سمجھتی جیسے میں اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں اپنے تجسس اور دلچسپی کی وجہ سے یہاں تمہاری مہمان بن گئی ہوں۔ غلط راستہ وہ ہوتا ہے جو انسان کو اپنی مرضی کے خلاف اختیار کرنا پڑ جائے۔ ہم دولت حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس مقصد کے لیے میرا شوہر مجرموں کا آلۂ کار بن جائے گا... اب تم لوگوں سے میں کیا چھپاؤں؟ میرا شوہر ہیروئن کی تیسری کھیپ لے جاتے ہوئے ایمسٹرڈم کے اسکی پول ایئرپورٹ پر پکڑا گیا۔ وہ ہالینڈ کی جیل میں ہے۔ شاید اسی کے جرم کی سزا میں میری ایئرلائن نے اپنی نیک نامی کو کسی بڑے اسکینڈل سے بچانے کے لیے مجھے کوئی وجہ بتائے بغیر اچانک میری ملازمت سے فارغ کر دیا۔“ اس نے پھر گلاس منہ سے لگا لیا۔

ہیروئن کا ذکر آتے ہی جہانگیر نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سیما کی پرواز واقعی اونچی تھی۔ ہم نے بھی شرمندگی کے ساتھ تیزی سے اپنے گلاس خالی کر دیے تاکہ اس طرح پروازِ مہ پارہ کا ساتھ دے سکیں۔ میں نے دوسرا پیمانہ تیار کرتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں سوال کیا۔ ”وہ اپنے طور پر ہیروئن لے گیا تھا یا کسی کا کیریئر تھا؟“

”یہی تو دکھ ہے مجھے۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں خمار کے ہلکے ہلکے سرخ ڈورے تیرنے لگے تھے۔ ”وہ اپنے طور پر لے گیا ہوتا تو پہلی ہی کھیپ میں اتنا مالا مال ہو گیا ہوتا کہ اسے دوسرے پھیرے کا خیال بھی نہ آتا۔ وہ معاوضے پر کسی کے لیے کام کر رہا تھا۔ مجھے اس کا سراغ مل جائے تو میں اپنے ناخنوں سے اس کا چہرہ اس طرح مسخ کر دوں گی کہ وہ زندگی بھر ہر ایک سے اپنا منہ چھپاتا پھرے گا۔“

”کاش ہم تمہاری کچھ مدد کر سکتے!“ جہانگیر مسلسل اسی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ ”اس کا کچھ اتا پتا تو ہوگا؟“

”کوئی منحوس ڈی ڈی ہے۔“ اس کے الفاظ کسی بم کی طرح میری سماعت پر گرے تھے۔ ”میرے میاں نے نہ کبھی اس کی صورت دیکھی نہ ٹھکانا معلوم ہے۔ کبھی وہ فون کرتا تھا اور کبھی ٹائپ کیے ہوئے پیغام پُراسرار طریقے پر ندیم تک پہنچتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ ہیروئن کے پیکٹ بھی تینوں بار کسی ڈسٹ بن یا راستے سے اٹھائے گئے تھے۔ ندیم کو پیغام ملتا تھا کہ فلاں وقت پر فلاں مقام سے مال کا پیکٹ اٹھا لیا جائے جس کی شناخت اسے بتا دی جاتی تھی۔“ ندیم ایئرلائن میں اسٹیورڈ تھا اور دلدار آغا کا بھی سابق پیشہ وہی تھا۔

”اور معاوضہ کیسے ادا کیا جاتا ہے؟“ میں نے پُرتجسس انداز میں سوال کیا۔

”رقم پیشگی پیکٹ کے ساتھ چپکے ہوئے لفافے میں ہوتی ہے۔ ایک پیکٹ کے پچیس ہزار ملتے ہیں۔ تیسری کھیپ پکڑی گئی مگر ندیم اس کے پچیس ہزار پہلے ہی مجھے دے گیا تھا۔“

”جب تمہیں پہلے سے علم تھا تو تم نے اُسے روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلی کھیپ وہ مجھے بتائے بغیر لے گیا تھا۔ اس وقت میں ڈیوٹی پر امریکا میں تھی۔ دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا۔ تیسری مرتبہ اتفاق سے ہم دونوں کراچی میں موجود تھے۔ اس نے پچھلے پچاس ہزار دکھا کر پوری کہانی سنائی تو میں نے اسے گرفتاری اور بدنامی کا خوف دلایا۔ وہ تائب ہونے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس نے ڈی ڈی سے تیسری بار انکار کیا تو اس نے دھمکی دی کہ اگر ندیم انکار پر اڑا رہا تو اس کی پچھلی دو کوششوں کے بارے میں ساری تفصیلات ثبوت کے ساتھ سرکاری حکام اور ایئرلائن کو پہنچا دی جائیں گی۔“

”اور اسی بار وہ پکڑا گیا!“ جہانگیر نے تبصرہ کیا۔ ”بیوی کی رضا شاملِ حال نہ ہو تو اکثر و بیشتر کوئی بدنصیبی ناگہانی طور پر راستہ گھیر لیتی ہے اور آدمی بھونچکارہ جاتا ہے۔“

”ڈی ڈی یقیناً کوئی بارسوخ آدمی ہے۔“ وہ اپنا دوسرا گلاس انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”ندیم نے مجھے بتایا کہ پہلی بار اس کی ڈیوٹی مشرقِ بعید کے روٹ پر تھی اور ڈی ڈی نے ہیروئن کا پیکٹ فرینکفرٹ کے لیے دیا تھا۔ ندیم نے اپنی مجبوری بتائی تو ڈی ڈی نے کہا تھا کہ وہ سب ٹھیک کر دے گا اور یہی ہوا کہ آخری لمحات پر ندیم کو فرینکفرٹ اور لندن والی پرواز کے لیے طلب کر لیا گیا۔“

ایک دَور تھا جب میں بھی شی کے لیے نقتے دارانہ حیثیت میں کام کیا کرتا تھا اس وقت بھی، ہیروئن کی بیرونِ ملک اسمگلنگ کے لیے پیشہ ور کیریئرز کے بجائے سادہ لوح طالب علموں اور خاص طور پر نوجوان لڑکیوں کو مفت سیاحت کا لالچ دے کر ایسے تحائف باہر کسی شخص کو پہنچانے پر آمادہ کیا جاتا تھا جن میں پہلے سے خفیہ طور پر ہیروئن چھپا دی جاتی تھی۔ سادہ لوح اور بے خبر نئے چہروں کے ذریعے ہیروئن باہر اسمگل کرنے کی ان کوششوں میں کامیابی کا اوسط پچانوے فیصد کے آس پاس رہتا تھا۔ جو چار چھ فیصد بیرونِ ملک کسٹم حکام کی گرفت میں آتے تھے ان پر بھی شبہ ہونے کی ابتدائی وجوہ میں ہیروئن کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا بلکہ بعد کی تفصیلی جانچ پڑتال میں ہیروئن برآمد کر لی جاتی تھی۔ وہ طریق کار اس قدر کارآمد تھا کہ ڈی ڈی اب بھی غیر معروف لوگوں کو اس کام کے لیے استعمال کر رہا تھا۔

”جو لوگ غلط کاموں سے کماتے ہیں ان کے پاس اثر و رسوخ اور وسائل کو خریدنے کے لیے سرمائے کی فراوانی ہوتی ہے۔ اس سرمایہ کاری سے ان کے اثاثوں کو فروغ ملتا ہے۔ ندیم کی فرینکفرٹ میں گرفتاری کے بعد ڈی ڈی نے تم سے رابطہ قائم کرنے کی کوئی کوشش تو نہیں کی؟“ میں نے سوال کیا۔

”بالکل نہیں۔ میں تو انتظار میں ہوں کہ رابطہ قائم ہو تو اسے اپنے جال میں پھانس کر سامنے آنے پر مجبور کر دوں اور اسے بتاؤں کہ کوئی عورت جب بدلا لینے پر تُل جاتی ہے تو کس قدر خطرناک ہو جاتی ہے۔“

”تم ویسے بھی کم خطرناک نہیں ہو۔“ جہانگیر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مر مٹنے والے لہجے میں کہا۔ ”وہ جو آیا تھا، فلیٹ نمبر بھولا ہوا تھا مگر تم اس کے ہوش و حواس پر چھائی ہوئی تھیں۔“

”ایسے مردوں سے مجھے چڑ ہے جو کسی خوبصورت اور اکیلی عورت سے ملاقات کرنے سے پہلے پیٹ بھر کر شراب پینی ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ تم نے توڑ پھوڑ کے بغیر اسے جانے دیا۔ اگر تمہاری جگہ کوئی عیال دار شخص ہوتا تو اس کے ہاتھ پیر ہی توڑ دیتا۔ ویسے کیا تم دونوں ہی یہاں رہتے ہو؟“

”میں آتا جاتا رہتا ہوں۔ یہاں رہائش پیٹر واک کی ہے۔“ جہانگیر نے کہا۔

”اور تمہاری بیوی؟“ سیما میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سراپا سوال بن گئی۔

”بیوی ہوتی تو تم کو یہاں مدعو کرنے کی جرأت بھی نہ کرتا۔“ میں نے اسے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔

”مجھ میں کوئی چھوٹی برائی نہیں ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ایک انگریزی محاورہ دہرا کر انکار کر دیا۔

”لیکن لوگوں سے دوستی کا گہرا شوق رکھتی ہو؟“ میرا لہجہ تائید طلب تھا۔

”ہر ایک سے نہیں۔ تم میرے پڑوسی ہو، شکل و صورت سے معقول لگتے ہو۔ جب چاہو میرے گھر آ سکتے ہو۔“

”تمہارے کسی مدہوش مہمان کی موجودگی میں گھنٹی بجا بیٹھا تو الجھن کھڑی ہو جائے گی۔“

وہ یک بیک بہت زیادہ سنجیدہ ہو گئی اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے ہلکا سا نشہ ہو چلا تھا۔ ”مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ میرے پاس آنے والے نے تم سے کیسی گھٹیا بکواس کی ہوگی۔ اصل بات صرف اتنی ہے کہ میں اپنی پسند کے لوگوں سے دوستی کرنے کی شوقین ہوں۔ اپنے گھر کسی کو نہیں بلاتی، دوستوں کے ساتھ شہر کے مہنگے ہوٹلوں اور تفریح گاہوں میں گھومنا اور کھانا پینا میری ہابی ہے۔ خود افورڈ نہیں کر سکتی اس لیے بل دوستوں سے ادا کراتی ہوں۔ ان سے تحفے تحائف بھی خوشی سے قبول کرتی ہوں۔ میرے بہت سے کولیگ میرے سوشل ہونے سے جلتے ہیں اور مجھے پیٹھ پیچھے ایک مہنگی کال گرل قرار دیتے ہیں لیکن میں ایسے الزامات کی ذرا بھی پروا نہیں کرتی۔ انھیں جوتی کی نوک پر رکھتی ہوں۔“

”حالانکہ تم کال گرل نہیں ہو مگر وہ خبیث یہی کہہ رہا تھا۔“ جہانگیر نے اسے اکسانے اور اس سے بے تکلف ہونے کے لیے سفید جھوٹ بولا۔ وہ سیما پر بری طرح لٹو ہوا جا رہا تھا۔

سیما زیرِلب بڑبڑائی، شاید اس نے اپنے ملاقاتی کو کوئی گندی گالی دی تھی پھر ایک چھوٹا سا گھونٹ لے کر بولی۔ ”وہ کئی دن سے میرے ساتھ وقت گزار رہا ہے۔ میں مانتی ہوں کہ وہ خاصی رقم خرچ کر چکا ہے۔ آج بھی فلم میں لے جانے کے لیے آیا تھا لیکن دانت نکال نکال کر بہکی ہوئی باتیں کرنے کے سوا مجھے چھو بھی نہیں سکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی ناکامیوں پر جھلا کر بکواس پر اتر آیا ہو۔ تم بار بار اس کا حوالہ نہ دو۔ مجھے خواہ مخواہ کوفت ہو رہی ہے۔“

”فلم میں چلنا چاہو تو میں اسی وقت حاضر ہوں۔“ جہانگیر نے جھک کر نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

وہ شوخ انداز میں ہنس پڑی۔ ”چلو! اس پیشکش کے بہانے تم نے مجھے چھو تو لیا۔“ جہانگیر کو اس سے اتنی صاف گوئی کی توقع نہیں تھی اس لیے اس نے بھڑک کر یوں اپنا ہاتھ واپس کھینچا جیسے اسے اچانک کرنٹ لگ گیا ہو۔ وہ اس کے ردِعمل سے محفوظ ہوتے ہوئے بولی۔ ”آج کل تو بہکے ہوئے مرد کو بھی دُرّے مارے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں باہر جا کر میں خود کو تماشا نہیں بنانا چاہتی۔ ہم پھر کسی وقت چلیں گے۔ پیٹر واک بھی ہمارے ساتھ ہوگا۔“

جہانگیر کینہ توز نظروں سے مجھے گھور کر رہ گیا پھر زبردستی ہنستے ہوئے اس سے بولا۔ ”لیکن تم نے زیادہ تو نہیں پی۔ باہر کی ہوا لگے گی تو تھوڑی ہی دیر میں نشہ اتر جائے گا۔“

”میں پینے کی عادی نہیں ہوں۔ ہماری ایئرلائن پی آئی اے کی طرح خشک نہیں ہے۔ طویل پروازوں پر مسافروں کی ساقی گری کرتے ہوئے میں بھی لوگوں کی نگاہ بچا کر ایک آدھ منی ایچر لے لیتی ہوں اور وہی کافی ہوتا ہے۔ ہوا کھانے سے میرا نشہ کچھ اور تیز ہو جائے گا۔ اب میں مزید نہیں لوں گی میرے لیے یہ دوسرا گلاس بھی زیادہ ہو جائے گا۔“

”اپنے ساتھ زبردستی نہ کرو۔“ جہانگیر تہِ دل سے اس کی خدمت کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ ”یہ بچا ہوا گلاس مجھے دے دو۔“ میں خاموشی سے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے دلچسپی سے وہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

”میں نہ اپنا جھوٹا کسی کو دیتی ہوں نہ کسی کا جھوٹا کھاتی پیتی ہوں۔ تم اپنے لیے تو تل سے اور انڈیل لینا۔“

جہانگیر مجھ سے نظریں چرا کر کھسیائے ہوئے انداز میں ہنسنے لگا۔ وہ طرار عورت کسی طرح اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے آہستہ آہستہ آگے پیچھے جھول رہی تھی لیکن پورے حوصلے کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر اپنا دوسرا گلاس خالی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں دو ہی باتیں سوچی جا سکتی تھیں، اوّل تو یہ کہ وہ بہت بے خوف تھی یا پھر ہر قسم کی صورتِ حال کو سر جھکا کر تسلیم کر لینے پر آمادہ تھی جب ہی اتنی بے فکری کے ساتھ دو اجنبیوں کے ہمراہ بیٹھی ہوئی مے نوشی کر رہی تھی۔ وہ تین نشستوں والے صوفے پر اکیلی براجمان تھی۔ میں نے ایک دفعہ گہری نظروں سے جہانگیر کی طرف دیکھا اور پھر بے تکلفی کے ساتھ سیما کے برابر میں جا کر بیٹھ گیا۔ جہانگیر بے بس قیدی کی طرح اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

”تفریح اور تحفے تحائف کے چکر میں ہر ایک کے ساتھ نہ گھوما پھرا کرو کسی دن ٹھوکر کھا جاؤ گی۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”میں دیکھ بھال کر دوستوں کا انتخاب کرتی ہوں۔“ وہ اکھڑی اکھڑی نشیلی آواز میں بولی۔ ”ہارون بھی شریف نظر آ رہا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اندر سے وہ اس قدر کمینہ اور خودغرض ہوگا۔“

”یہ ہارون کون ہے؟“ میں سمجھ گیا تھا لیکن اسے اکسانے میں لطف آ رہا تھا۔

اس نے گردن گھما کر مخمور نظروں سے میری طرف دیکھا پھر اپنا بایاں ہاتھ میرے داہنے ہاتھ پر رکھ دیا جسے میں نے فوراً اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”وہی جو میرے دھوکے میں تمہارے پاس آ گیا تھا کسی فارماسیوٹیکل فیکٹری میں منیجر کے عہدے پر فائز ہے اور اعلا تعلیم یافتہ ہے۔“

میں چونک پڑا۔ سیما کا شوہر ڈی ڈی کی سازش کا شکار ہو کر ہالینڈ میں قید ہو گیا تھا اور غالباً ندیم کی گرفتاری کے بعد سے خود اس پر ایک دواساز فیکٹری کا منیجر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ دلدار آغا خود بھی ایسی ہی ایک فیکٹری کا مالک تھا۔

”اس کی فیکٹری کا نام بتا سکو تو شاید میں اسے کچھ سبق دلوا سکوں۔“ میں نے اپنا ہاتھ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہولے ہولے میری ہتھیلی اور انگلیوں سے کھیل رہی تھی میں اسے اپنی کسی غیر معمولی دلچسپی کا احساس دلائے بغیر اب اس سے کام کی مزید چند باتیں اگلوانا چاہ رہا تھا جن کی مدد سے دلدار آغا اور اس کی سرگرمیوں پر مزید کچھ روشنی پڑ سکتی تھی۔

”شاید جاز فارماسیوٹیکل ہے۔ وہ ڈیفنس میں رہتا ہے اور فیکٹری کورنگی میں ہے۔“

میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ یہ بات یقینی نظر آنے لگی تھی کہ ہارون، ندیم کے پکڑے جانے کے بعد اپنے آقا کے اشارے پر کسی خاص مقصد سے سیما کے پیچھے لگا تھا لیکن اس کی آزاد روی کی وجہ سے خود بھی بہک گیا اس نے غالباً کام کے ساتھ ساتھ تفریح کے ارادے سے اس شام شراب پی تھی لیکن بدقسمتی سے اسے بھاگنا پڑ گیا۔

کامٹ نے نیچے جا کر اسے بتایا تھا کہ اس نے سیما سے شادی کر لی تھی اور ہارون اس کے بیان پر یقین کر کے فرار ہو گیا جبکہ میں نے اس بارے میں سیما کو کچھ اور ہی بتایا تھا۔ جب ہارون واپس لوٹ کر ڈی ڈی کو سیما کی دوسری شادی کی خبر سناتا تو صورتِ حال کافی دلچسپ

اور خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ کس قدر عجیب اتفاق تھا کہ میں نے پورے شہر میں اپنے شناساؤں سے روپوش رہنے کے لیے جہانگیر کے فلیٹ کا انتخاب کیا تھا اور وہاں عین میرے پڑوس میں ایک ایسی خوبصورت عورت مقیم تھی جس کی ذات میں ڈی ڈی کا مقامی سربراہ بھرپور دلچسپی لے رہا تھا۔

”ہارون اتنا بودا اور کم ہمت آدمی ہے کہ میں بھی اسے تھپڑ لگا سکتی ہوں۔“ وہ پُرسرور لہجے میں آہستگی سے بولی۔ ”وہ میرے ہاتھوں سے پٹنا بھی اپنی خوش نصیبی سمجھے گا۔“

”تمہارے ہاتھ بھی اس قدر نرم و نازک ہیں کہ اسے پھول ہی کر لگیں گے۔“ میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم اس سے نہیں الجھو گی۔ اس کے معاملے میں تمھیں میرے مشورے پر عمل کرنا ہوگا۔“

”تم اتنے اچھے ہو کہ اب تو ہر معاملے میں تمہارے مشورے پر عمل کرنے کو دل چاہتا ہے۔“ وہ آنکھیں موند کر آہستہ سے بولی۔

جہانگیر وہ سب دیکھ کر سلگ رہا تھا۔ سیما کے آخری فقرے پر بھڑک کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں تمہارے ذاتی معاملات میں دخیل ہو رہا ہوں، میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے۔“ اس نے اونچی آواز میں کہا تھا۔

سیما نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے لکنت آمیز آواز میں بولی۔ ”تم بھی بیٹھو۔ پیٹر بہت اچھا آدمی ہے۔ ایسے لوگوں کی صحبت میں دل کو بہت سکون ملتا ہے۔“ میں نے جہانگیر کو آنکھ ماری۔

”اس کی صحبت تم ہی کو مبارک ہو۔“ وہ جل کر بولا اور ایک جھٹکے سے دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب تم کو نیند آ رہی ہے۔ تم سو ہی جاؤ تو بہتر ہوگا۔“

میرا ارادہ خورد و نوش کے بندوبست کا تھا لیکن گھر میں کچھ موجود نہیں تھا۔ اس وقت جہانگیر سے کہتا تو وہ کسی قیمت پر وہاں سے ٹلنے پر تیار نہ ہوتا اور اگر اسے سیما کے ساتھ تنہا چھوڑ کر خود خریداری کے لیے باہر جاتا تو وہ سیما کے ساتھ دست درازی کی کوشش کر سکتا تھا۔ اس معاملے میں میں اس کی رگ رگ سے واقف تھا اس لیے خاموش ہی رہا۔

”واقعی مجھے نیند آ رہی ہے۔“ سیما اس کی تجویز پر کہہ رہی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ پر سے ہاتھ ہٹا کر ہلکی سی انگڑائی لی اور جہانگیر نے فوراً اپنی جگہ چھوڑ دی۔

”آؤ! میں سہارا دے کر تمھیں تمہارے فلیٹ میں پہنچا دوں۔“ اس نے سیما کے سامنے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

”تم چاہو تو میرے کمرے میں سو سکتی ہو۔“ میں نے صورتِ حال کی نزاکت بھانپتے ہوئے کمزور لہجے میں تجویز پیش کی۔

”نہیں! میں اپنے فلیٹ میں ہی جاؤں گی۔“ وہ جہانگیر کے بڑھے ہوئے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس مردود نے پھرتی سے دوسرے ہاتھ سے بھی اسے تھام لیا۔

”تم بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔“ جہانگیر نے مجھے چڑانے والے انداز میں کہا اور لڑکھڑاتی ہوئی سیما کو اپنے سہارے لے کر فلیٹ سے نکاسی کے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ دونوں چلے گئے اور میں اپنا سر تھام کر رہ گیا۔ چند منٹ تک میں اپنی جگہ بیٹھا جہانگیر کی واپسی کا انتظار کرتا لیکن جب وقت بڑھتا ہی چلا گیا تو مجھے تشویش لاحق ہونے لگی کیونکہ سیما نے ابتدا ہی اس کے لیے کسی واضح پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا جب کہ جہانگیر اسے دیکھ کر ہی دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ جہانگیر کی کسی بدتمیزی پر سیما برہم ہو گئی تو وہ مدہوشی کے عالم میں اودھم مچا کر پوری بلڈنگ کو جمع کر سکتی تھی جب کہ میں خود کو کسی بھی قیمت پر تماشا بنانا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے آدھے گھنٹے تک اس کی واپسی کا انتظار کیا پھر فلیٹ مقفل کر کے سیاہ شیراڈ میں آوارہ گردی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

میں کافی دیر تک شہر کی سڑکوں پر پٹرول پھونکنے اور رونگ مین کے علاقے میں ایک مشہور فاسٹ فوڈ اسٹور سے شکم پُری کرنے کے بعد بارہ بجے کے لگ بھگ فلیٹ پر واپس پہنچا تو جہانگیر کی کار پارکنگ میں موجود تھی لیکن خود اس کا کہیں پتا نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ سیما سے دوستی گانٹھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

فلیٹ میں میرے لیے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ اگلے دن کی ضروریات کے لیے لایا ہوا سامان کچن اور ریفریجریٹر میں محفوظ کرنے کے بعد میں نے بھی خواب گاہ کی راہ لی اور دھیمی روشنی کا بلب جلا کر بستر پر دراز ہو گیا۔

میرے ذہن میں گزرے ہوئے واقعات گھومتے رہے۔ جہانگیر پر ابتدا کے صبر آزما لمحات میں مجھے غصہ آیا تھا لیکن کافی وقت گزر جانے کے بعد مجھے اس طرف سے بھی بے فکری ہو گئی تھی اس لیے تھوڑی دیر میں میری آنکھ لگ گئی۔

میں نہ جانے کتنی دیر سویا ہوں گا کہ اچانک ذہن میں تیز گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ کئی سیکنڈ تک میں آنکھیں کھولے نیم تاریک کمرے میں بستر پر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ میرے دل کی دھڑکنیں ایک دم تیز ہو گئی تھیں اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دور کہیں سے فائر انجن اپنی تیز رواتی گھنٹیاں بجاتے چلے آ رہے ہوں پھر یکایک ہی مجھے احساس ہوا کہ میرے فون کی گھنٹی مسلسل چیخ رہی تھی اور نہ جانے کب سے چیخے جا رہی تھی۔ شاید اسی کا شور میری نیند میں خلل ڈالنے کا سبب ثابت ہوا تھا۔ صورتِ حال کا ادراک ہوتے ہی میں نے بستر سے چھلانگ لگا دی اور خواب گاہ میں رکھے ہوئے انسٹرومنٹ کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

”خدا کا شکر ہے کہ کسی نے تو ریسیور اُٹھایا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ غلطی سے کسی قبرستان کا نمبر ملا بیٹھی ہوں۔“ ریسیور اٹھاتے ہی سلمٰی کی بھنائی ہوئی آواز سُن کر میرے فرشتے کوچ کر گئے۔

”اس وقت رات کے پونے تین بج رہے ہیں سلمٰی!“ میں نے سنبھالا لے کر وال کلاک پر نگاہ ڈالتے ہوئے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔ ”میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ کہو! کیا بات ہے؟“ میں نے خود کو حتی الامکان پُرسکون رکھنے کی کوشش کی تھی مگر میں اس کے متوقع سوال سے خوفزدہ تھا۔

”فون اسی لیے کیا ہے کہ پونے تین بج رہے ہیں اور وہ ابھی تک لاپتا ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟“ وہ آواز سے غصّے میں بپھری ہوئی معلوم ہو رہی تھی اور شاید وہ اپنے اشتعال میں حق بجانب بھی تھی۔ سیما کے چکر میں پڑ کر جہانگیر اپنے گھر اور گھر والی کو یکسر فراموش کر بیٹھا تھا نہ ہی مجھے سلمٰی کا خیال آیا تھا کیونکہ میری اس سے لڑائی ہو چکی تھی اور میرا خیال تھا کہ میرے معافی مانگے بغیر وہ مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرے گی لیکن جہانگیر کے غائب ہونے کی وجہ سے اُس کی ناراضی کا خول خود ہی ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم میں تو سویا ہوا تھا۔“ میں نے معصومانہ لہجے میں کہا۔ ”وہ کب سے گھر سے نکلا ہوا ہے؟“

”جھوٹ مت بولو!“ ریسیور میں اس کی زنانہ غرّاہٹ ابھری۔ ”ساڑھے آٹھ بجے کے قریب تمھارا فون ریسیو کرنے کے بعد ہی وہ مجھے کچھ بتائے بغیر عجلت میں روانہ ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم دونوں نے کوئی پروگرام طے کیا ہے کیونکہ وہ عجلت کے باوجود اپنے بریف کیس میں وھسکی کی نئی بوتل ڈالنا نہیں بھولے تھے۔“

”تم یقین کرو سلمٰی کہ ہمارا کوئی پروگرام نہیں تھا۔“ میں ماؤتھ پیس میں کراہا۔ ”میرے فرشتوں کو بھی اندازہ نہیں کہ وہ کہاں گیا ہو گا۔ اس نے تو تمھارے ساتھ مجھے بھی تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔“

”مجھ سے زیادہ اُڑنے کی کوشش نہ کرو۔“ میرا عذر سُن کر وہ بپھر گئی۔ ”میں تم دونوں کو اچّھی طرح سمجھتی ہوں۔ مجھے تمھارے فلیٹ کا اندازہ ہے میں ابھی وہاں پہنچتی ہوں پھر دیکھوں گی کہ تم کیسے جھوٹ بولتے ہو۔“

وہ دھمکی سُن کر میری روح فنا ہو گئی، میری نیند تو اس کی آواز سنتے ہی کافور ہو گئی تھی۔ میں نے بوکھلا کر کہا۔ ”اتنی رات گئے ایسی حماقت نہ کرنا راستے میں پولیس والے تنگ کریں گے اور جہانگیر بھی واپس آکر ناراض ہو گا۔ رات گئے کسی تنہا عورت کا ویران سڑکوں پر ڈرائیو کرنا ہر ایک کو شبے میں ڈال سکتا ہے۔ تم وہیں ٹھہرو، میں تمھاری طرف آتا ہوں۔“

”فوراً آؤ!“ اس کا پارہ بدستور چڑھا ہوا تھا۔ وہ اپنی رائے پر اتنی مضبوطی کے ساتھ اَڑی ہوئی تھی کہ اسے جہانگیر کے واپس نہ لوٹنے پر تشویش کے بجائے غصّہ تھا۔ ”تم تین بجے تک نہیں پہنچے تو میں ڈرائیور کے ساتھ نکل پڑوں گی۔“

”گیارہ منٹ بہت کم ہیں سلمٰی۔“ میں کراہا۔ ”سوا تین بجے تک انتظار کر لو۔ میں نکلنے سے پہلے اس کے بارے میں دو چار فون بھی کرنا چاہتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بے چارہ کہیں کسی مشکل میں گھر گیا ہو۔“

”ٹھیک ہے، میں سوا تین تک انتظار کروں گی۔“ قدرے توقف کے بعد اس کی آواز ابھری۔ اِس بار میں اپنی صداکاری سے اس کا اعتماد متزلزل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ریسیور رکھ کر میں شدید غصّے کے عالم میں اپنی خواب گاہ سے نکلا ـــــ میں نے جہانگیر کا بریف کیس باتھ روم میں ڈالا۔ اسکاچ کی بوتل، باقی ماندہ شراب سمیت صوفے کے نیچے لڑھکائی اور شب خوابی کے لباس میں ہی اپنے فلیٹ سے نکل پڑا۔

وہ مردود عشق کے نشے میں دھت، سیما کے فلیٹ میں پڑا نشہ کسی سانڈ کی طرح سو رہا تھا اور اس کی تنک مزاج بیوی نے میری نیند حرام کر دی تھی۔ اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ جہانگیر سامنے ہو تو اس کا گریبان پکڑ کر اس کے دو چار تھپّڑ لگاؤں تاکہ اس کا سارا نشہ ہرن ہو جائے۔

میں طیش کے عالم میں سیما کے فلیٹ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ گھنٹی کے بٹن کی طرف بڑھتا ہوا میرا ہاتھ خود بخود رُک گیا کیونکہ دروازے کا ہینڈل گھومتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شاید جہانگیر کو ہوش آ چکا تھا اور وہ کسی بھی لمحے دروازہ کھول کر باہر آنے والا تھا۔ میں نے گھنٹی بجانے کے بجائے اس کا انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

پٹ سرکتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اندر گھُپ اندھیرا تھا، میں لپک کر چوکھٹ کے قریب ہو گیا پھر دروازہ کھلتے ہی مجھے اندھیرے میں جو انسانی ہیولا نظر آیا میں نے پوری تو نہیں، البتہ خاصی طاقت سے اس کے جبڑے پر مُکّا رسید کر دیا۔ میری دانست میں اتنی سزا جہانگیر کے لیے ناگزیر ہو گئی تھی۔

وہ مُکّا کھا کر دبی دبی غرّاہٹ کے ساتھ پیچھے الٹ گیا پھر فوراً ہی اندر سے ایسی آوازیں آئیں جیسے کم از کم دو طاقتور گوریلے اندھیرے میں ایک دوسرے سے لپٹ پڑے ہوں۔

ان دُہری غرّاہٹوں نے چند ساعتوں کے لیے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا پھر میں نتائج کی پروا کیے بغیر اندر گھس پڑا۔ اپنے عقب میں دروازہ بند کر کے میں نے فوراً ہی ٹٹول کر روشنی کر دی تاکہ صورتِ حال کا صحیح مشاہدہ کر سکوں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جہانگیر قالین پر ایک صحت مند شخص سے بری طرح لپٹا ہوا تھا۔ اس شخص کی گردن میں رومال پڑا ہوا تھا جسے جہانگیر پوری قوت سے پیچھے کھینچ کر اپنے حریف کا گلا گھونٹنے پر تُلا ہوا تھا۔ اس کی دونوں پنڈلیاں قینچی کی صورت میں اپنے حریف کے پیٹ پر جکڑی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کی دسترس سے

ذرا دور، قالین پر ایک پستول پڑا ہوا تھا جس کی نال پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا لیکن سیما کا دُور دُور تک کوئی پتا نہیں تھا۔

میرے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ ان دونوں میں سے کون میرے مکّے کی زد میں آیا تھا۔

”کھڑے مُنہ کیا دیکھ رہے ہو؟ اس کا پستول دیکھو!“ جہانگیر نے ہانپتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا اور میں حرکت میں آ گیا۔

مجھے دیکھ کر جہانگیر کے حریف کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ میرے ہاتھ میں پستول آنے کے بعد رہی سہی کسر پوری ہو گئی اور وہ دونوں سیدھے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت مجھے نووارد کی بائیں آنکھ کے نیچے نیل بھی نظر آ گیا جو شاید میرے گھونسے سے وجود میں آیا تھا۔ اس کے گلے میں پڑا ہوا بڑا سا رومال تکون کی صورت میں مڑا ہوا تھا اور پچھلے سروں پر مضبوط گرہ لگی ہوئی ہونے کی وجہ سے وہ رومال اس کے گلے میں پھندے کی طرح جھول رہا تھا۔

”یہ کون ہے اور کہاں سے آیا؟“ میں نے نووارد کو گھورتے ہوئے جہانگیر سے سوال کیا۔

”یہ شاید کسی جعلی چابی سے دروازہ کھول کر اندر گھسا تھا اور بے آواز قدموں سے چلتا ہوا خواب گاہ میں داخل ہوا تھا۔ اس نے اپنی ناک پر رومال کی نقاب باندھی ہوئی تھی۔ اسی وقت چھٹی حس کے تحت میری آنکھ کھلی تھی لیکن جب میں نے نائٹ لیمپ کی روشنی میں اس کے ہاتھ میں سائلنسر چڑھے ہوئے پستول کی جھلک دیکھی تو سوتا ہوا بن گیا۔ یہ کچھ دیر تک ہمارا جائزہ لینے کے بعد خواب گاہ سے نکلا تو میں نے بھی بستر چھوڑ دیا۔ اس سے پہلے کہ میں عقب سے اس پر حملہ آور ہوتا، یہ خود ہی دروازہ کھولتے ہی پیچھے اچھل کر میری آغوش میں آ گرا۔ تم نے اس وقت زبردست کام دکھایا ہے ورنہ اس پر قابو پانا دشوار ہو جاتا۔“ اس نے ایک ہی سانس میں پوری کتھا سُنا ڈالی۔ نووارد ڈھٹائی کے ساتھ خاموش کھڑا رہا۔

”اب تم ہی بھگتو گے اس مردود سے!“ میں نے سلمٰی کا خیال آتے ہی دانت پیس کر کہا۔ ”یہاں آگرا ایسے مرے ہو کہ پلٹ کر خبر تک نہ لی۔ سلمٰی آگ بگولا ہو رہی ہے، اگر میں سوا تین بجے تک تمھارے گھر نہ پہنچا تو وہ ڈرائیور سمیت سیدھی یہیں آکر تمھاری خبر لے گی۔ فون پر بڑی مشکل سے اسے سوا تین بجے تک نکلنے سے روکا ہے۔“

”ارے باپ رے!“ سلمٰی کا نام سُنتے ہی وہ بوکھلا گیا۔ ”شکار کو تم سنبھالو، میں گھر جا رہا ہوں۔ وہ آ گئی تو چیخ چیخ کر پورے شہر کی نیند خراب کر دے گی۔ میں نے تو آتے ہوئے اسے کچھ بھی نہیں بتایا تھا پھر اسے کیسے پتا چلا کہ میں یہاں موجود ہوں؟“

”بیویوں میں ایک چھٹی حس بھی ہوتی ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ ان کے جانور کہاں کہاں مُنہ مارتے پھرتے ہیں۔“ میں نے جلے بھُنے لہجے میں کہا۔ ”میں نے بھی تمھاری آمد سے انکار کیا ہے۔ تم فوراً واپس گئے تو وہ پوری بات سمجھ جائے گی۔ یہ بتاؤ کہ تمھاری دوسری چہیتی کہاں ہے؟ ابھی تو وہ بھی تمھارے سر پر جوتے لگائے گی۔“

”وہ اپنے بستر پر بے خبر سو رہی ہے۔“ اس خطرناک سچویشن میں بھی وہ اپنی خفیف سی آسودہ مسکراہٹ کو مجھ سے پوشیدہ نہ رکھ سکا۔ ”ایسی بات ہے تو تم چلے جاؤ، میں اسے یہیں دیکھ لوں گا۔“

”وہ سوئی ہوئی ہے تو اسے بے خبر ہی رہنے دو، اِسے اپنے فلیٹ میں لے چلتے ہیں۔“

”تم میری مرضی کے خلاف مجھے کہیں نہیں لے جا سکتے۔“ نووارد نے بھرّائی ہوئی آواز میں پہلی بار زبان کھولی۔ ”میں نے تمھارا کچھ نہیں بگاڑا۔ تم خود مجھ سے اُلجھے ہو اور اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔“

اسی لمحے میرا اشارہ پا کر جہانگیر نے اس کی داہنی کنپٹی پر عقب سے کراٹے کا ایک بھرپور ہاتھ رسید کیا اور وہ حلق کے بل خرخراتا ہوا وہیں قالین پر ڈھیر ہو گیا۔

وقت بہت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا ہم دونوں فوراً ہی اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر کسی کی مداخلت کے بغیر اسے سیما کے فلیٹ سے اپنے فلیٹ میں لے آئے۔ وہاں سے مزاحمت کے آثار ختم کر دیے گئے تھے تاکہ سیما بیدار ہونے کے بعد یہ سمجھے کہ جہانگیر رات کو کسی وقت بیدار ہو کر خاموشی سے وہاں سے چلا گیا تھا۔

”کیا واقعی سلمٰی سے تمھاری بات ہوئی ہے؟“ جہانگیر نے تشویش آمیز لہجے میں سوال کیا۔ ”یا اِسے الجھانے کے لیے کہانی بنا رہے تھے؟ سلمٰی تو تمھاری صورت ہی سے بیزار ہوئی جا رہی تھی۔“

”وہ فون کر کے مجھے تاؤ نہ دلاتی تو اس وقت یہ تمھیں سیما کی چوکھٹ پر گولی مار کر اطمینان سے نکل گیا ہوتا۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”میں پہنچا تو وہ دروازہ کھول رہا تھا۔ تم اس پر حملہ بھی کرتے تو اسے ساتھ لے کر باہر آ گرتے یا شاید سیڑھیوں سے ہی نیچے لڑھک جاتے۔ اب اس کے ہاتھ پیر مضبوطی سے باندھ کر مُنہ میں کپڑا ٹھونس دو اور دوسری خواب گاہ میں لے جاؤ، میں واپسی پر اس کے بارے میں سوچوں گا کہ کیا کرنا چاہیے؟“

”میرا بریف کیس کہاں ہے؟“ اس نے چونک کر سوال کیا۔

”باتھ روم میں پھینک دیا ہے۔ اپنی کار کی چابی دو تاکہ اسے بھی کسی تاریک گلی میں پہنچا دوں۔ سلمٰی ادھر آ گئی تو گاڑی دیکھ کر ایک قیامت کھڑی کر دے گی۔“

اس نے بے چون و چرا چابی میرے حوالے کر دی۔ میں نے بے آواز پستول اس کے حوالے کیا اور لباس تبدیل کر کے فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔ جہانگیر کی گاڑی ایک گلی میں پارک کرنے کے بعد واپس آکر شیراڈ کا انجن اسٹارٹ کیا تو تین بج کر دو منٹ ہو چکے تھے۔ مجھے امید تھی کہ ویران سڑکوں پر تیز رفتاری کے ساتھ کار ڈرائیو کرتے ہوئے میں مقررہ وقت سے پہلے سلمٰی کے گھر پہنچ جاؤں گا اور کسی نہ

کسی طرح اسے سمجھا بجھا کر وہاں سے واپس نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

راستے میں میرا ذہن شی، مافیا اور پاکستان کے اپنے مفادات میں اُلجھ گیا۔

میں ایک مدت سے منشیات کی دنیا سے وابستہ چلا آرہا تھا اور یہ حقیقت ہر وقت میرے ذہن میں کچوکے لگاتی رہتی تھی کہ پاکستان اور خاص طور پر کراچی میں ہیروئن کو متعارف کرانے والوں میں میں پیش پیش تھا اور پچھلی بار جہانگیر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر نشے کی جھونک میں میں نے جو کچھ سوچا تھا اس کی روشنی میں پاکستان جیسے غریب ملک میں سستے داموں ہیروئن پھیلانا ایک ناقابلِ معافی جرم تھا جس پر مجھے شی والوں نے مجبور کیا تھا۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا اُس کی تصدیق مافیا والوں نے کر دی تھی بلکہ مجھے اپنے ان سوالات کے جواب بھی مل گئے تھے جو میرے ذہن میں اُلجھ رہے تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر ڈان تھری نے پاکستان اور خاص طور پر اُس کے شمال مشرقی سرحدی پہاڑوں کے بارے میں شی کے عزائم کی جو بھیانک تصویر کھینچی تھی اس نے میرے وجود کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ افیم کی پوری تاریخ میں چین وہ واحد ملک تھا جس نے اس فصل کی پیداوار کو رضاکارانہ طور پر ختم کیا تھا کیونکہ اس دَور میں نہ برق رفتار مواصلاتی رابطے میسر تھے نہ برآمدی تجارت اور اسمگلنگ کو رواج حاصل ہوا تھا۔ لہٰذا یہ سب اس دَور کی باتیں تھیں جب افیم سے ہیروئن کشید نہیں کی گئی تھی۔ چین میں افیم کا استعمال ایک وبا کی صورت اختیار کر گیا تھا اور ان کا معاشرہ مجموعی طور پر سست روی اور بیزاری کا شکار ہو چلا تھا لہٰذا چینیوں نے از خود اس کے انسداد کی مہم چلائی اور اپنی سرزمین کو اس فصل سے پاک کر لیا لیکن ہیروئن کی دریافت کے بعد جنوبی امریکا کے ممالک، ترکی، ایران، افغانستان، پاکستان، بھارت، نیپال اور دوسری ہمالیائی ریاستوں سے لے کر مشرقِ بعید تک جہاں بھی افیم کی کاشت کے خلاف مہم چلائی گئی، اس کی ابتدا مغرب اور بالخصوص امریکا نے کی تھی۔ ان کی اعانت اور سرمائے سے بعض ملکوں میں افیم کی مکمل بیخ کنی کر دی گئی تھی۔ پاکستان کی حساس دفاعی اور جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے یہاں افیم کے سدِّباب کی جبری کوششیں جو تجرباتی طور پر کی گئیں، کبھی کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکی تھیں اس لیے اس خطّے کے لیے سرکاری سطح پر کی جانے والی دوسری کوششوں کے ساتھ ساتھ شی کے ذریعے ایک طویل المیعاد منصوبہ بھی شروع کیا گیا تھا جس کے ذریعے پاکستان کے گلی کوچوں میں ہیروئن کا زہر پھیلا کر رائے عامّہ کو افیم کے خلاف ہموار کیا گیا تھا تاکہ پاکستانی باشندوں کو بھی افیم کے انسداد کے لیے کی جانے والی مغربی کوششوں سے ہمدردی پیدا ہو جائے۔ دوسری طرف دیگر مسکّن ادویہ کے برعکس ہیروئن کو بہت چالاکی کے ساتھ مضرِ صحت قرار دیتے ہوئے برٹش فارماکوپیا اور دیگر عالمی فہرستوں سے خارج کر کے اس کی تیاری، تجارت اور استعمال کو بین الاقوامی جرم قرار دے دیا گیا۔ یہ پورا کھیل مشرق کے سارے ملکوں کے لیے تیار کیا گیا تھا جن کی زمینیں اور آب و ہوا اس فصل کے لیے سازگار تھی لیکن بدقسمتی سے اس پوری مہم کا بدترین نشانہ پاکستان بنا ہوا تھا۔ دوسری طرف مافیا کے مفادات اس خطّے میں سیاسی نہیں بلکہ صرف معاشی تھے۔ وہ اس علاقے میں کشید ہونے والی اوّل درجے کی ساری ہیروئن پر بلا شرکتِ غیرے اپنا تصرّف چاہتے تھے اور اس کا ایک گرام بھی پاکستان میں ضائع کیے بغیر ہر کھیپ کو مغرب کی مہنگی منڈیوں میں مُنہ مانگے داموں پر فروخت کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

کامٹ اور ڈان تھری سے ملاقات کے بعد میں مافیا میں شرکت کے لیے تیار ہو چکا تھا لیکن سیما کے فلیٹ میں کسی چور کی طرح داخل ہونے والے نے میرے ذہن میں ہلچل مچا دی تھی۔ مجھے معلوم تھا بلکہ کامٹ نے خود بتایا تھا کہ ان کے آدمی ہر لمحے میری نگرانی کر رہے تھے اس لیے مجھے شبہ تھا کہ نووارد اُن ہی کا آدمی تھا لیکن فلیٹ میں کامیابی سے داخل ہونے کے بعد خاموشی سے واپس لَوٹ جانا میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ اس راز پر سے وہ شخص خود ہی پردہ ہٹا سکتا تھا۔

معاً میری ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ پکڑا جانے والا جو بھی رہا ہو، اس کے ساتھی بھی ہو سکتے تھے۔ پھر کامٹ کے ایک آدمی نے شیراڈ کی ڈکی میں چھپ کر شاہ باغ تک میرے ساتھ سفر کیا تھا۔ اس کے بعد دن میں کار سے سفر کرتے ہوئے ہر بار میں نے ڈکی کا جائزہ ضرور لیا تھا لیکن اس وقت سلمٰی کا خوف سر پر سوار ہونے کی وجہ سے میں ڈکی کا جائزہ لینا بھول گیا تھا۔ مجھے اچانک ہی خیال آیا تھا کہ اس وقت بھی میرے عقب میں کوئی موجود ہو سکتا ہے۔

میں نے کار سڑک کے کنارے روک کر انجن بند کیا اور چابی جیب میں ڈالتا ہوا تیزی سے کار کے عقب میں پہنچا تو یہ دیکھ کر لرز اٹھا کہ عقبی نشست اور باڈی کے درمیانی حصّے میں ایک شخص دُبکا ہوا تھا۔ شیشے کی شفاف عقبی شیلڈ کے پیچھے اس کی نگاہیں کسی عقاب کے دیدوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ فاصلے پر لگے ہوئے اسٹریٹ لیمپس کی ناکافی روشنی میں، کوئی جنبش کیے بغیر وہ شخص مجھے گھورتا رہا۔ اس کی پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھیں جیسے انھیں سکتہ ہو گیا ہو۔

مجھے نہ اس کے ہاتھ نظر آ رہے، نہ اندر تاریکی کی وجہ سے میں اس کا تفصیلی جائزہ لے سکتا تھا۔ اس کے قریب جانے میں یہ خوف بھی تھا کہ کہیں وہ مجھ پر فائر نہ کر دے لیکن فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ اس وقت تک مافیا والے میرے دشمن نہیں بلکہ نگہبان بنے ہوئے تھے اور میرے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنا اپنا حق سمجھ رہے تھے۔

میں نے اس سے اُلجھنے کا ارادہ ترک کر دیا البتّہ میں اسے

دو چار تھپڑ مار کر اس ویران سڑک پر اپنی کار سے ضرور اتار سکتا تھا اور کامٹ یا ڈان تھری کے لیے میری اس کارروائی پر کسی اعتراض کی گنجائش نہ ہوتی۔

میں نے ہاتھ ہلا کر اسے باہر نکلنے کا اشارہ کیا لیکن وہ اسی حالت میں دُبکا رہا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس وقت بھی خود کو میری نگاہوں سے محفوظ سمجھ رہا ہو۔ میں نے خوف اور جھلاہٹ کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ ڈکی کا ڈھکن کھول دیا۔ اس بار بھی اس نے کوئی جنبش نہ کی تو میں قریب پہنچ گیا اور پھر میرے بدن میں خوف کی پھریریاں دوڑ گئیں۔ وہ یقیناً کوئی زندہ انسان نہیں تھا بلکہ سکڑی ہوئی سرد لاش تھی جس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں ابھی زندگی کی چمک برقرار تھی۔

اس لاش کے ساتھ مَیں زیادہ دیر تک اس ویران سڑک پر نہیں رک سکتا تھا۔ اگر پولیس والوں کی کوئی گشتی کار اس طرف آنکلتی تو میرے لیے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی۔

اس کی موت کا یقین ہوتے ہی مجھے اس کی کُھلی ہوئی چمکدار آنکھیں دہشت ناک نظر آنے لگیں اور میں نے بے اختیار اس کے پپوٹے بند کرنے کے لیے اپنا ہاتھ ڈکی میں ڈال دیا۔

اس کے چہرے کا لمس محسوس کرتے ہی میری کھوپڑی جھنجھنا اٹھی اور میں نے اس کے سخت گھونگریالے بال مٹھی میں جکڑ کر اسے سڑک سے دور کچّے میدان میں اچھال دیا کیونکہ وہ پلاسٹک اور ربر سے بنا ہوا ایک ہلکا پھلکا آدم قدم مجسّمہ تھا جو روشنی میں دور سے بھی بہ آسانی پہچانا جا سکتا تھا۔

مقررہ وقت میں صرف چار منٹ رہ گئے تھے۔ جھلاہٹ اور خفّت کے باعث میں نے رفتار کچھ زیادہ ہی بڑھا دی لیکن میرا ذہن اس پُتلے میں الجھا ہوا تھا۔ وہ کس کی طرف سے کار میں رکھا گیا تھا اور اس کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟ بادی النظر میں تو کسی نے مجھ کو یہ جتانے کی کوشش کی تھی کہ جس طرح وہ پتلا میری کار میں رکھا گیا ہے۔ اسی طرح کوئی مہلک مادّہ بھی پہنچایا جا سکتا تھا جو آنِ واحد میں مجھے زندگی اور اس کے بکھیڑوں سے بہت دور پہنچا سکتا تھا۔

اس واقعے سے میرا ذہن اس قدر پراگندہ تھا کہ مجھے راستے کا بھی احساس نہیں ہوا اور میں اسی برق رفتاری کے ساتھ جہانگیر کے مکان کے سامنے سے گزر گیا۔ مکان پہچان کر میں نے بتدریج بریک لگائے اور یوٹرن لے کر واپس گیٹ پر پہنچ گیا۔ وہاں شاید چوکیدار کو سلمٰی پہلے ہی ہدایت دے چکی تھی۔ اس لیے میرے ہارن بجانے سے پہلے ہی پھاٹک پر روشنیاں دیکھ کر گیٹ کھول دیا گیا۔

اندر برآمدے میں سلمٰی بے چینی کے ساتھ میری منتظر تھی۔ اس سے ذرا دور ایک گھریلو محافظ اپنی رائفل لیے کسی روبوٹ کی طرح مستعد کھڑا ہوا تھا۔ میرے کار سے اترتے ہی سلمٰی تیر کی طرح میری طرف دوڑ پڑی۔

”کیا ہوا؟ جہانگیر کہاں ہیں؟“ اس نے تیز سرگوشیانہ آواز میں سوال کیا۔ اس کی آواز میں اس وقت بھی غصّہ جھلک رہا تھا لیکن اس پر تشویش غالب تھی۔

”میں نے کئی آدمیوں کو دوڑایا ہوا ہے، تھوڑی دیر بعد ان کی طرف سے اطلاعات مل سکیں گی لیکن تمھاری دھمکی کی وجہ سے مجھے مجبوراً ہر کام چھوڑ کر یہاں آنا پڑا ہے۔ اپنے فلیٹ پر رہ کر میں زیادہ مؤثر انداز میں جہانگیر کو تلاش کر سکتا تھا۔“

”بہت عرصے سے ان کے معمولات نارمل ہو گئے تھے اب وہ اچانک ہی غائب ہو گئے ہیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ تمھارے ساتھ بیٹھے ہوں گے۔ اب بتاؤ کہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں؟“ وہ میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگئی۔

”وہ ننھا سا بچّہ نہیں ہے، واپس آجائے گا۔ تمھیں ذرا صبر سے کام لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ زیادہ شراب پی کر کہیں اونگھتا رہ گیا ہو۔ نشے کی حالت میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے پکڑے جانے سے بہتر ہے کہ آدمی نشہ اترنے کا انتظار کر لے۔“ میں نے اس کے تیور دیکھ کر جہانگیر کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”خدا کرے کہ ایسا ہی ہوا ہو... مگر وہ گھر سے باہر کیوں پیتے ہیں جب کہ مَیں گھر میں ان پر پابندی نہیں لگاتی ہوں؟“

”یہ اسی سے پوچھ لینا۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”اس وقت مجھے واپس جانے دو۔“

”مجھے وحشت ہو رہی ہے، میں بھی تمھارے ساتھ چلتی ہوں۔ نوکروں سے تو میں دل کی بات بھی نہیں کر سکتی۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو۔ جہانگیر شکّی مزاج کا آدمی ہے۔ وہ یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ تم اس کی آوارہ گردی کا بدلہ لینے میرے ساتھ گئی ہو۔ اب تو رات گزر ہی گئی ہے، تھوڑی دیر میں اجالا نمودار ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے ہی وہ گھر واپس آجائے۔ تمھیں یہیں رک کر اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ اگر دوسری بار میری اس سے جھڑپ ہو گئی تو ہم زندگی بھر کے لیے ایک دوسرے سے چھوٹ جائیں گے۔ اس بار تم بھی ہماری صلح نہیں کرا سکو گی۔“

وہ میرے ساتھ چلنے پر مصر تھی۔ میں بمشکل تمام اسے اپنی بات سمجھانے میں کامیاب ہو سکا اور آخر کار اس نے میرے اس وعدے پر مجھے واپس جانے کی اجازت دے دی کہ میں اپنے فون پر موجود رہوں گا تاکہ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے مجھ سے تازہ ترین معلومات حاصل کر سکے۔ میرے نزدیک وہ کوئی شرط ہی نہیں تھی کیونکہ مجھے فوری طور پر فلیٹ میں موجود قیدی سے باز پُرس کرنی تھی، اس لیے میں سلمٰی کو مزید نکتہ آفرینی کا موقع دیے بغیر فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا۔

واپسی کے سفر میں مجھے بار بار پلاسٹک کے اس آدم قد گڈے کا خیال آتا رہا جس نے مجھے بہت زیادہ خوفزدہ کر دیا تھا۔ میں نے پچھلے برسوں میں اپنے ہاتھوں سے بھیانک ترین انسانی لاشیں تخلیق کی تھیں اور کبھی بھی مجھ پر خوف طاری ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن اس گڈے نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔ اس سے تو میری جان چھوٹ گئی تھی لیکن آثار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اُجالا پھیلنے سے پہلے مجھے واقعی ایک لاش کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست کرنا ہوگا۔

میرا وہ خیال بے سبب نہیں تھا۔ شاہ باغ کے سفر میں میرے تعاقب کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کامٹ نے بتایا تھا کہ اگر میں اس کے آدمی کو پکڑ بھی لیتا تو وہ میرے ہاتھوں ذبح ہو جانے کے باوجود گمبی گمبی کے علاوہ ایک لفظ بھی مُنہ سے نہ نکالتا جبکہ سیما کے فلیٹ میں پکڑے جانے والے نے وہ مخصوص الفاظ ادا نہیں کیے تھے جو مافیا سے اس کا تعلق ظاہر کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں وہ شی کا ہی کوئی ایجنٹ ہو سکتا تھا جس کا زندہ رہنا میرے حق میں زہر ثابت ہو سکتا تھا۔

واپسی پر بلڈنگ کا چوکیدار جاگتا ہوا ملا۔ میری کار پہچان کر اس نے رکاوٹ دور کی اور میں اپنی کار ریمپ پر چڑھا کر براہِ راست میز نائین فلور پر لیتا چلا گیا جہاں کسی کی مداخلت کا نسبتاً کم امکان تھا۔

اس فلور پر کار گھماتے ہی مجھے کاروں کے درمیان ایک ہیولا نظر آیا جو پھرتی سے دوسری گاڑیوں کے درمیان دُبک گیا۔ وہ اگر مجھ سے چھپنا ہی چاہتا تھا تو ریمپ کے ابتدائی سِرے سے اوپر آنے والی ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی دیکھ کر یا رات کے سناٹے میں کار کے انجن کی گونج سُن کر میرے اوپر پہنچنے سے پہلے ہی بہ آسانی چھپ سکتا تھا لیکن آخری لمحات پر اس کی حرکت کی بنا پر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہ رہا تھا۔

نامعلوم ہیولے کی اس حرکت کا ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا کہ اوپر کوئی گڑبڑ ہو چکی تھی اور وہ مجھے فوری طور پر فلیٹ پر جانے سے روکنے کے لیے اپنے ساتھ آنکھ مچولی میں اُلجھانا چاہ رہا تھا۔

میں اسے نظر انداز کر کے تیزی کے ساتھ اپنے فلیٹ کی طرف جانے والے زینوں پر ہو لیا۔ زینوں پر میرے قدموں کی آہٹ پیدا ہوتے ہی اوپری زینوں پر ہلکی سی دھمک سُنائی دی تھی جیسے کوئی پنجوں کے بل تیزی سے اوپر فرار ہوا ہو۔ میں نے فلیٹ پر پہنچ کر ڈور بیل بجائی اور جہانگیر نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔

فلیٹ میں صورتِ حال بالکل پُرسکون تھی۔ جہانگیر قیدی کو بے بس کر کے اندر پہنچا چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ میری غیر حاضری میں فلیٹ میں کسی نے بھی مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں چکرا کر رہ گیا کیونکہ اس طرح باہر ہونے والی مشتبہ نقل و حرکت بے معنی ہو کر رہ جاتی تھی۔ شاید وہ مافیا والے ہی تھے جو براہِ راست سامنا کیے بغیر دور رہ کر میرے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوششیں کر رہے تھے اور یقیناً ان کی تعداد ایک سے زیادہ تھی۔

قیدی ہوش میں آ چکا تھا۔ اس کے حلق تک کپڑا ٹھونس کر جہانگیر نے اس کے مُنہ میں لگام کی طرح ایک پرانی ٹائی کس دی تھی جس کی وجہ سے اس کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا تھا اور اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر اُبلی پڑ رہی تھیں۔

"اس کا مُنہ کھولا گیا تو یہ فوراً ہی شور مچانا شروع کر دے گا۔" میں نے اس کی پسلیوں میں اپنی ٹھوکر سے ہلکی سی ضرب لگاتے ہوئے کہا اور قیدی بہت تیزی کے ساتھ اپنے سر کو نفی میں جنبش دینے لگا۔

"آواز نکالے تو ذبح کر دینا، میں نے کچن سے چھری نکال لی ہے۔" جہانگیر نے تپائی سے لمبی سی چھری اُٹھا کر اس کی دھار پر اُنگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ "خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ ہم پہلی منزل پر ہیں۔ نیچے والی دُکانیں اور دفاتر، سب بند پڑے ہوتے ہیں۔ کسی کو کانوں کان بھی پتا نہیں چلے گا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔"

ہماری گفتگو سے قیدی واضح طور پر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ دوسری طرف جہانگیر سلمٰی کے بارے میں میری کہانی سُننے کے لیے مرا جا رہا تھا اس لیے میں اسے ساتھ لے کر دروازے پر آ کھڑا ہوا اور دھیمی آواز میں اسے اپنی رپورٹ سُنانے لگا۔ قیدی یہ سمجھ رہا ہوگا کہ ہم اس کی تقدیر کے بارے میں مشورے کر رہے تھے۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ شراب والی بات اس کے کان میں ڈال دی۔" میرے خاموش ہونے پر وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "واپسی پر میں اسے یہی بتاؤں گا کہ زیادہ پی لینے کی وجہ سے ایک دوست کے پاس رُک گیا تھا۔ ایسی شاندار ترکیب تو بھول کر بھی میرے ذہن میں نہیں آ سکتی تھی۔"

"لعنت ہو تم پر۔ عیاشیاں تم کرو اور بہانے میں تلاش کرتا پھروں۔"

اس کی تسلی ہو گئی تھی اس لیے ہم دونوں پھر قیدی کے پاس آ گئے — اس کی رحم طلب نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ شاید زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک نہیں تھا کیونکہ تشدد کے تصور سے ہی خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔

وہ بولنے سے معذور تھا اس لیے میں اس سے جو کچھ پوچھتا رہا وہ سر ہلا کر میری فرماں برداری کا اقرار کرتا رہا اور آخرکار میرے ایما پر جہانگیر نے ٹائی کی گرہ کھول کر اس کے مُنہ سے کپڑا نکالنا شروع کر دیا۔

مُنہ صاف ہوتے ہی اس نے چند گہرے گہرے سانس لیے پھر ہکلاتے ہوئے بدقت تمام پانی طلب کیا جو جہانگیر نے گلاس سے اس کے خشک دہانے میں انڈیل دیا۔

"تت... تم لوگوں نے مجھے بلا وجہ پکڑ لیا ہے، میرا تم کو نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" پانی پی کر اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "تم نے دیکھ ہی لیا تھا کہ میں کوئی بھی کارروائی کیے بغیر واپس جا رہا تھا۔"

"اور بے آواز پستول کس مقصد کے لیے تھاما ہوا تھا تم نے؟"

"محض احتیاطاً۔" وہ بولا۔ "اگر سات نمبر میں اتفاقاً کسی کی آنکھ کُھل جاتی تو میں اسے خوفزدہ کر کے بحفاظت نکل جانے کی نیت سے پستول ساتھ لایا تھا۔ خون کا ایک قطرہ بھی بہانے کا ارادہ نہیں تھا میرا۔"

"پھر آئے کیوں تھے وہاں؟" میں نے درشت لہجے میں سوال کیا۔

"مجھے صرف یہ دیکھنا تھا کہ وہاں کوئی عورت اکیلی رہتی ہے یا اس کے ساتھ کوئی مرد بھی مقیم ہے۔ اس کے علاوہ میرا نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ تھا، نہ چوری کا۔"

"یہ بات تو تم باہر پوچھ گچھ کر کے بھی معلوم کر سکتے تھے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"مجھے خواب گاہ میں داخل ہو کر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا حکم ملا تھا۔"

"حکم دینے والا کون تھا؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر سوال کیا۔

اس نے میرے سوال کا جواب دینے سے بہت گریز کیا لیکن میرے بگڑتے ہوئے تیوروں نے اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔ "میں اس سے واقف نہیں ہوں۔ وہ کبھی کبھی فون پر مجھ سے کام لیتا رہتا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ تم بھی تو کسی طرح اس تک اپنی رپورٹ پہنچاتے ہو گے؟"

"وہ خود فون کر کے رپورٹ لیتا ہے۔ آج بھی صبح دس بجے وہ مجھے فون کرے گا۔ یہ کام مجھے صرف اس لیے سونپا گیا تھا کہ میں ہر قسم کے تالے کھولنے میں ماہر ہوں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عورت کو یہ علم ہو سکے کہ کسی نے فلیٹ میں داخل ہو کر اس کا جائزہ لیا ہے۔ مجھے تالا کھول کر اندر جانا تھا اور کسی بھی چیز کو چھیڑے بغیر واپس لوٹ جانا تھا۔"

"اور اگر فلیٹ میں کوئی بھی نہ ہوتا تو تم کیا کرتے؟" میں نے سوال کیا۔

"مجھے بتا دیا گیا تھا کہ عورت رات کو دیر سے گھر لوٹنے کی عادی ہے، اسی لیے میں دو بجے کے بعد آیا تھا۔ کوئی نہ ملتا تو اگلی رات کو پھر کوشش کرتا۔ اس کے دیے ہوئے کام کو ادھورا چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"فون پر اس کی کوئی شناخت تو ہوگی؟" میں نے چُبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

میرے اس سوال پر وہ خوفزدہ ہو کر خوشامدوں پر اُتر آیا لیکن چند دھمکیوں کے بعد ہی اس نے اُگل دیا کہ خود کو.... ڈی ڈی کہا کرتا ہے۔ اس انکشاف کے بعد سب کچھ واضح ہو گیا۔

دلدار آغا نے اپنے ہم پیشہ، ندیم کو ہیروئن کی اسمگلنگ کے لیے اپنا آلۂ کار بنایا ہوا تھا جب وہ فرینکفرٹ میں گرفتار ہو گیا تو دلدار نے کسی خاص مقصد کے تحت اپنے فیکٹری مینجر، ہارون کو ندیم کی بیوی، سیما کے پیچھے لگا دیا۔ ان لوگوں کے لیے سیما اتنی اہم تھی کہ جب کامٹ نے پیچھے جا کر نشے میں دُھت ہارون کو لتاڑا اور اسے یہ بتایا کہ وہ سیما کا شوہر تھا تو ہارون نے فرار ہونے کے بعد پہلی فرصت میں دلدار آغا کو سیما کی دوسری شادی سے آگاہ کر دیا۔ دلدار بہت گھاگ آدمی تھا اس لیے ہارون سے ملنے والی خبر اس کے دل کو نہ لگ سکی اور اس نے فوراً ہی اپنے ایک آدمی کو تحقیقات پر مامور کر دیا جو چند ہی گھنٹوں کے اندر سیما کے فلیٹ میں پہنچ گیا۔ اگر وہ اپنا جائزہ لے کر خیریت کے ساتھ نکل جانے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو سیما کے ساتھ جہانگیر کو محوِ خواب دیکھ کر دلدار کو وہی کچھ بتاتا جو ہارون نے بتایا تھا لیکن وہ اپنی بدنصیبی کے باعث ہمارے ہاتھ لگ گیا۔

بظاہر وہ ایک درمیانی آدمی تھا اور اسے چھوڑا بھی جا سکتا تھا لیکن اندیشہ اس بات کا تھا کہ وہ ڈی ڈی سے مرعوب ہو کر اسے نہ صرف جہانگیر کی سیما کے فلیٹ میں موجودگی کے بارے میں بتاتا بلکہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہمارے بارے میں بھی سب کچھ اُگل دیتا۔ ایسی صورت میں دلدار کا فوری طور پر میری طرف متوجہ ہونا ناگزیر ہو جاتا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم لوگوں کے بارے میں ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالوں گا۔" شاید وہ میرا ذہن پڑھ کر ہی گڑگڑایا تھا۔ "میں اس کا ملازم نہیں ہوں، اُس نے اس کام کے لیے مجھے پانچ ہزار روپے دیے ہیں۔ میں نے فلیٹ میں جو کچھ دیکھا تھا، اسے وہی بتا دوں گا کہ میری وجہ

سے تم پر کوئی آنچ آئے تو تم ہر وقت مجھ پر ہاتھ ڈال سکتے ہو۔"

"تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ ڈی ڈی نے تمہیں کیسے خطرناک چکر میں ڈال دیا ہے۔" جہانگیر چھری لہراتے ہوئے سفاکانہ لہجے میں بولا۔ "یہ روایت چلی آرہی ہے کہ نہ وہ ہمارے کسی آدمی کو زندہ چھوڑتا ہے، نہ ہم اپنے ہاتھ لگنے والے اس کے کسی آدمی کو زندہ واپس لوٹنے دیتے ہیں۔ تم بیچ کے آدمی ہو لیکن تمہارے ستارے گردش میں آگئے ہیں۔"

اس کا چہرہ خوف سے تاریک پڑگیا اور وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "میں خدا اور رسول کی قسمیں کھاتا ہوں کہ تمہارے بارے میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔ میں ایسے دھندوں سے ہی دور بھاگتا ہوں۔ چھوٹی موٹی نقب زنی سے ہی میرا گزارا ہوتا رہتا ہے۔ اگر ڈی ڈی میری پچھلی وارداتوں کا حوالہ دے کر مجھے دھونس نہ دیتا تو میں کبھی اس کے لیے کام کرنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ وہ سؤر کا بچہ پکا بلیک میلر ہے۔ مجھے اس کے مفاد سے زیادہ اپنی زندگی عزیز ہے۔"

"وہ تمہارا معاوضہ کس طرح ادا کرتا ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"تم یقین نہیں کروگے لیکن ہر بار کام شروع کرنے سے پہلے کسی نہ کسی طرح رقم مجھے مل جاتی ہے۔ آج بھی ایک بار والے نے میرا بائی کے کوٹھے پر رقم کا لفافہ پہنچایا تھا۔"

"یہ شوق بھی رکھتے ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"میں میرا بائی کے کوٹھے پر ہی رہتا ہوں۔" وہ کسی شرمندگی کے بغیر بولا۔ "اس کی ایک لڑکی سے میرا چکر چلا ہوا ہے۔"

"اور ڈی ڈی وہیں تم کو فون کرتا ہے؟"

"ہاں... میرے فون وہیں آتے ہیں۔ تم چاہو تو ابھی تصدیق کرسکتے ہو۔ نیپئر روڈ پر تو اس وقت بھی مجرے چل رہے ہوں گے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا نام اور میرا بائی کا فون نمبر بھی دہرادیا جو جہانگیر نے فوراً نوٹ کرلیا۔

"آج کے بعد اگر تم اِدھر نظر آئے تو زندہ واپس نہ جاسکو گے۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "آج بھی ہم بہت بڑا خطرہ مول لے کر تمہیں زندہ واپس لوٹنے دیں گے۔"

"تم ہمیشہ مجھے اپنا غلام پاؤ گے۔" میری یقین دہانی سنتے ہی فرطِ جذبات سے اس کی آواز بھرّا گئی۔ "اس خبیث بلیک میلر نے مجبور کیا تو شاید مجھے دوبارہ اِدھر آنا پڑے لیکن میں آیا تو سیدھا تمہارے پاس آکر پوری کہانی بتاؤں گا پھر تم جو حکم دوگے اسی کے مطابق عمل کروں گا۔ اس کی کسی ہدایت پر میں نے عمل کرنے سے انکار کیا تو اسے مجھ پر شبہ ہوجائے گا۔"

اس کی بات معقول تھی اس لیے میں نے جہانگیر کو اشارہ کیا اور اس نے چھری سے قیدی کی بندشیں کاٹنی شروع کردیں۔

اس شخص سے کئی کارآمد باتیں معلوم ہوئی تھیں اور دلدار کی دواساز فیکٹری کے بارے میں میرا شبہ یقین میں بدل گیا تھا کہ وہاں کوئی گھپلا ہورہا تھا جس کا ثبوت یہ تھا کہ فیکٹری کا مینیجر بھی دلدار کی سازشوں میں شریک تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ پیسہ پھینک کر کام لینے کے پرانے اصول کے بجائے دلدار لوگوں کو بلیک میل کرکے بھی شی کے لیے کام کرنے پر مجبور کررہا تھا۔ شاید بخت آور کو بھی اس کے کیے ہوئے قتل کے سہارے شی کے جال میں باندھا گیا تھا۔ اس شخص کے زندہ واپس لوٹنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ نظر آرہا تھا کہ سیما کے بارے میں دلدار کا تجسس ختم ہوجاتا اور وہ ہارون کی سنائی ہوئی کہانی پر یقین کرلیتا۔ بصورتِ دیگر وہ زیادہ ہوشیاری اور تیاری کے ساتھ سیما کی طرف متوجہ ہوسکتا تھا۔

قیدی بندشوں سے آزاد ہوتے ہی اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔ "میں اپنی نئی زندگی کے لیے دل کی گہرائیوں سے تمہارا شکرگزار ہوں۔ اب اگر مجھے اجازت ہو تو میں چلا جاؤں؟"

"ضرور چلے جاؤ لیکن یہ یاد رکھنا کہ وعدہ خلافی کی صورت میں موت تمہیں کہیں بھی آدبوچے گی۔" میں نے کہا۔

"میرا پستول؟" اس نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد سوال کیا۔

"وہ نہیں ملے گا۔" میں نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "ہتھیار پاس ہو تو استعمال ہو ہی جاتا ہے۔ اگر تمہاری سرگرمیاں واقعی چوری اور نقب زنی تک محدود ہیں تو میرا مشورہ ہے کہ کوئی آتشیں ہتھیار ساتھ نہ رکھا کرو ورنہ کسی دن سوچے سمجھے بغیر اچانک قاتل بن جاؤ گے اور پھر کچھ بھی نہ ہوسکے گا۔"

وہ سر جھکا کر نکاسی کے راستے کی طرف بڑھ گیا اور جہانگیر بھی اپنے گھر واپسی کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔

ایک مرتبہ پھر گھنٹی کی آواز میری نیند میں خلل انداز ہوئی اور مجھے بستر چھوڑنا پڑ گیا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے اس رات سونا میرے مقدر میں ہی نہ ہو۔ اس بار فون کی گھنٹی خاموش تھی البتہ ڈور بیل بجائی گئی تھی۔

میں نے دروازہ کھولا تو سیما میک اپ سے عاری، دلکش چہرے سمیت میرے سامنے موجود تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفت آمیز مسکراہٹ تھی اور وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔ میں نے اس کے لیے راستہ چھوڑ کر اندر آنے کی دعوت دی جو اس نے بلا پس و پیش قبول کرلی اور مجھ سے پہلے ہی ڈرائنگ روم میں پہنچ کر بے تکلفی کے ساتھ ایک صوفے پر براجمان ہوگئی۔

"تم ابھی تک سو ہی رہے تھے؟" میرے پہنچنے پر اس نے حیرت آمیز آواز میں کہا۔

"رات کو سونا نصیب نہ ہو تو دن چڑھے تک بستر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا، یہ بتاؤ کہ جہانگیر کو کہاں چھوڑ آئیں؟"

اس نے حیرت سے نظریں اُٹھا کر میری طرف دیکھا پھر جھینپ کر سر جھکا لیا۔ "مجھے کیا پتا؟ میری آنکھ کھلی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔"

"نشہ اُترنے پر سیدھا گھر چلا گیا ہوگا اور میں رات گئے تک اس کے انتظار میں جاگتا رہا۔ تھوڑی دیر پہلے آنکھ لگی تھی تو اب تم نے اُٹھا دیا۔ یہ بتاؤ کہ صبح ہی صبح تم نے مجھے کیسے یاد کرلیا؟"

"مرچیں کیوں چبا رہے ہو؟" اس بار وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "رات کو میں نشے میں تھی اور کچھ ہوش نہیں تھا کہ کیا کہہ اور کیا کررہی ہوں۔ اس وقت صبح کے دس بجے ہیں۔ جاکر منہ ہاتھ دھولو۔ کچن میں کچھ موجود ہے تو میں یہیں ناشتا بنادوں گی ورنہ میرے فلیٹ میں چلو۔ وہاں سب تیار ہے۔" اس کے لہجے میں عجیب سی اپنائیت تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے یہ جتانا چاہ رہی ہو کہ تم کیوں دل چھوٹا کرتے ہو، میں تمہیں تو نشہ کیے بغیر بھی پسند کرتی ہوں۔

شب خوابی کے لباس میں، مَیں خود بھی بے آرامی محسوس کررہا تھا اس لیے اسے کچن کی راہ دکھا کر خود باتھ روم کی طرف ہولیا تاکہ ناشتا کرکے خود بھی اپنے دن کا آغاز کرسکوں۔

میں شاور سے کافی دیر تک اپنے بدن پر نیم گرم اور ٹھنڈے پانی کی تیز دھاریں بہاتا رہا پھر تر و تازہ ہوکر کچن میں پہنچا تو ناشتا تیار تھا اور فضا میں تازہ چائے کی بو رچی ہوئی تھی۔ سیما اپنے پیشے کے اعتبار سے ایئر ہوسٹس تھی اور مدارات کے رموز سے اچھی طرح واقف تھی۔ میری فرمائش پر وہ بھی ایک بڑے مگ میں چائے لے کر کچن ٹیبل پر میرے مقابل آبیٹھی۔

"مجھے ہارون کا احسان مند ہونا چاہیے کہ اس کے طفیل میں نے ایک بااخلاق پڑوسن دریافت کرلی، چائے تم اچھی بناتی ہو، کھانے کے معاملے میں کیا حال ہے؟" میں نے سکوت توڑنے کے لیے بات چھیڑ دی۔

"کھانے بھی بنا ہی لیتی ہوں، دوپہر کو کوئی کام نہ ہو تو لنچ میرے ہی گھر کرلینا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دوپہر کو وقت نکالنا مشکل ہے۔" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "پھر کسی وقت پروگرام بنالیں گے۔ اس وقت تو یہ بتاؤ کہ ہارون سے تمہاری دوستی کب سے ہوئی ہے؟"

"پچھلے ہفتے کی بات ہے۔" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تمہیں وہ کیسے یاد آگیا؟"

"یعنی یہ تمہارے شوہر کی گرفتاری کے بعد کا ہی واقعہ ہے؟" میں نے تائید طلب لہجے میں کہا۔

"ظاہر ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن اس طرح تم کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں، فی الحال تو کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کررہا ہوں۔ ہارون تم سے بلاوجہ ہی نہیں ملا تھا۔ اس دوستی کے پردے میں کوئی بہت اہم مقصد پوشیدہ تھا۔"

"وہ کیا تھا؟" وہ یک بیک ہی تشویش میں مبتلا ہوگئی۔

"یہی معلوم ہوجائے تو سارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا فطری تجسس اُبھارنے کی نیت سے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ اس طرح ہم ڈی ڈی کی پُراسرار شخصیت کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔"

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معاملے میں مَیں تمہاری کیا مدد کرسکوں گی۔" وہ اُلجھن آمیز لہجے میں بولی۔ "ندیم کی گرفتاری کی خبر سُن کر میں نے اس کی مدد کے لیے جرمنی جانے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن اگلے ہی دن اس کی ایئرلائن کے ذریعے ٹیلکس پر پیغام ملا کہ اس نے جرمن حکام کے سامنے اعترافِ جُرم کرلیا ہے۔ میں نے ایک مقامی وکیل سے مشورہ کیا تو اس نے بتایا کہ ندیم کے اعتراف نے معاملہ نمٹادیا تھا۔ اسے کسی عدالت میں پیش کرکے فردِ جرم عائد کی جاتی اور پھر سزا سُنادی جاتی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مزاحمت کرنے والوں کے مقابلے میں اقبالی مجرموں کو یورپ میں نسبتاً ہلکی سزائیں دی جاتی ہیں۔ اب سوچتی ہوں کہ اس کی سزایابی کے بعد اس سے جیل ہی میں ملنے جاؤں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ندیم کی گرفتاری کے بعد ان لوگوں نے بھی اس کی کوئی مدد نہیں کی جنھیں وہ ہیروئن پہنچانے والا تھا۔"

"ہوسکتا ہے کہ ندیم نے اقبالِ جُرم کے ساتھ ہی ان کی نشاندہی بھی کردی ہو۔ اب تم ذہن پر زور دے کر بتاؤ کہ ندیم کی ہیروئن کی اسمگلنگ کے بارے میں تم کیا کچھ جانتی ہو؟"

"میں جو کچھ پہلے بتاچکی ہوں، اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی، میں پہلے ہی تم کو بتاچکی ہوں کہ اپنی ڈیوٹیز کی وجہ سے ہماری بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے مشورہ کیے بغیر اس غلیظ کام میں ملوّث ہوا تھا۔ میرے سمجھانے پر اس نے دامن بچانا چاہا تو پچھلے جُرم کے تحت گرفتاری کا خوف دلا کر اسے مجبور کردیا گیا۔"

"کوئی چیز، کوئی دستاویز جو اس نے تمہارے پاس

رکھوائی ہو؟"

اس نے مایوسانہ انداز میں اپنے سر کو نفی میں جنبش دی جس پر میں نے اصرار کیا۔ "ضروری نہیں کہ تم میری بات کا اسی وقت جواب دو، ذہن پر زور دیتی رہو۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت کچھ یاد آجائے۔"

"لیکن یہ رات ہی رات میں تمھیں ہارون پر شبہ کیوں ہونے لگا؟"

"رات نہیں، یہ اس سے پہلے کی بات ہے۔" میں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تمھیں یاد ہوگا کہ فارماسیوٹیکل فیکٹری کا ذکر آنے پر میں نے تم سے کئی سوال کیے تھے۔ جاز فارماسیوٹیکل کے مینجر کے بارے میں میں بہت کچھ سن چکا ہوں۔"

"فیکٹری میں کوئی گڑبڑ کی جا رہی ہے؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"فیکٹری کے بارے میں مجھے معلوم نہیں لیکن وہاں کا مینجر مشتبہ آدمی ہے۔ اس سے ندیم کے بارے میں کوئی گفتگو ہوئی تھی تمھاری؟"

"شاید ایک بار اسی نے ذکر نکالا تھا اور میں نے بات ٹال دی تھی۔"

"وہ دوبارہ تمھارا سامنا کرنے کی جرأت نہیں کرے گا لیکن اگر فون کر بیٹھے اور اس موضوع کو نکال بیٹھے تو اسے بتا دینا کہ پہلے شوہر کی فرینکفرٹ میں گرفتاری کے بعد تم نے خاموشی سے دوسری شادی کر لی ہے۔"

"نہیں!" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ تھام لیا۔ "اتنا سنگین جھوٹ میں نہیں بول سکوں گی۔"

"یہ جھوٹ میں ہارون سے بول چکا ہوں، تمھیں صرف اسے نبھانا ہوگا۔ جب وہ تمھارے بارے میں ہرزہ سرائی کر رہا تھا تو میں نے یہی جھوٹا انکشاف کر کے اس کی کھوپڑی بھک سے اڑا دی تھی کہ میں تمھارا دوسرا شوہر ہوں۔ مجھے بعد میں پیش آنے والے واقعات کا ذرا بھی اندازہ ہوتا تو وہی دعویٰ میں جہانگیر کی زبانی کراتا تاکہ ...."

"اب اگر تم نے اس واقعے کا دوبارہ ذکر کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا!" وہ میری بات کاٹ کر ترش روئی سے بولی۔ غصے سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا تھا جس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ جیسی بھی تھی، اس میں کم از کم شرم و حیا بالکل ہی ختم نہیں ہوئی تھی۔ دراصل وہ آزاد خیال عورتوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتی تھی جو لباس، چال ڈھال اور ناز و انداز سے دور ہی دور سے مردوں کی آتش شوق بھڑکا کر اپنی تفریحات کے لیے ان کی جیبیں خالی کرا کے خوشی محسوس کرتی ہیں لیکن عملی طور پر مہم جو نہیں ہوتیں۔ ہاں اگر اس مشغلے میں کہیں حالات کے جال میں [illegible] کر وہ اپنے غرور سے محروم ہو جائیں تو اپنی انا کی خاطر [illegible] کسی واقعے کا ڈھنڈورا پیٹنے کے بجائے اسے ہمیشہ [illegible] اپنے دل کے نہاں خانوں میں دفن کر لیتی ہیں۔

اس کے بعد وہ اپنا مگ خالی کرنے تک [illegible] غصیلی نگاہوں سے گھورتی رہی جن میں شکوہ بھی تھا [illegible] شاید شکایت بھی لیکن غزالہ سے دل ہارنے کے بعد [illegible] نظروں سے گھائل ہونا ہی بھول گیا تھا۔

اُس وقت اس کی آمد کا مُدعا صرف اتنا تھا کہ [illegible] کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے اس سے [illegible] کرنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ کوئی ایسی [illegible] بات اس کے علم میں تھی جسے وہ اہمیت نہیں دے [illegible] لیکن ڈی ڈی کے لیے وہ بہت اہم تھی جب ہی ہارون [illegible] بھاگنے کے بعد میرا بائی کے ہونے والے داماد، چھٹی کو [illegible] کے فلیٹ کے جائزے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

وہ چلی گئی تو میں فون کے پاس آ بیٹھا۔ کافی دن چڑھ چکا تھا اور میرا خیال تھا کہ جہانگیر سلمیٰ سے مصالحت کے [illegible] اپنی گارمنٹ فیکٹری پہنچ چکا ہوگا اس لیے میں نے وہیں کا [illegible] گھما ڈالا۔ کال جہانگیر کی سیکریٹری نے ریسیو کی جسے میں نے [illegible] نہیں تھا لیکن اپنے مشاہدے کی بنا پر جہانگیر پر اس کی مضبوط گرفت کا اندازہ لگا لیا تھا۔

اس نے بڑی جھجکتی ہوئی اور حوصلہ افزا آواز میں ہیلو کہا تھا۔ میں نے پیٹر کے نام سے اپنا تعارف کرا کے بے تکلفانہ انداز میں اس کی مزاج پرسی کی اور پھر جہانگیر سے لائن ملانے کے لیے کہا۔

وہ اسی وقت دفتر پہنچا تھا اور اپنی کامیابی پر بہت مگن تھا کیونکہ رند خرابات ہو کر بھی وہ جنت سے نوازا گیا تھا۔ سیما کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد اس نے سلمیٰ کو بھی کامیابی کے ساتھ شیشے میں اتار لیا تھا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ سلمیٰ تو خیر ایک عام عورت تھی۔ لیکن بیوی کتنی بھی دبنگ اور خونخوار ہو، اپنے ترکش کے سارے تیر آزما لینے کے بعد آخر کار شوہر کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

جب اس کی کتھا ختم ہو گئی تو میں نے براہ راست مافیا کا نام لیے بغیر شی سے زیادہ بہتر اور منظم گروپ میں شرکت کا ذکر چھیڑا جس پر وہ ایک دم بھڑک گیا۔ برسوں کی غلامی کے بعد شی کے چنگل سے خود بخود نجات مل جانے پر وہ بہت مطمئن تھا۔ اس نے جو اثاثے بنا لیے تھے ان کے سہارے وہ سلمیٰ کے ساتھ اپنی لاولد زندگی اپنی پسند کے مطابق گزار[illegible]

[illegible] تھا۔ اس لیے وہ دوبارہ کسی ایسے کھیل میں اپنی گردن نہیں پھنسانا چاہتا تھا جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہو جاتا۔ اس نے مجھے بھی یہی مشورہ دیا کہ میں شی، دلدار آغا اور غزالہ کو فراموش کر کے آزاد زندگی کی ابتدا کر دوں کیونکہ میرے ریکمر [illegible] کی کمی تھی اور نہ حسین عورتوں کی۔

بے [illegible] کاروبار لیکن وہ احمق درد نا آشنا تھا۔ شاید جانتا ہی نہیں تھا کہ دل کی چوٹ کیسی اور کتنی گہری ہوتی ہے۔ میں نے اس کا مشورہ سُن تو لیا لیکن اسے قبول کرنا میرے امکان سے باہر تھا۔ اسے میری سرگرمیوں کے بارے میں جتنا کچھ معلوم تھا، وہی اس کی دلی ہمدردیاں میرے ساتھ برقرار رکھنے کے لیے کافی تھا اس لیے میں نے مافیا کا نام لیے بغیر وہ موضوع وہیں ختم کر دیا۔

"اور شام کا کیا پروگرام ہے تمھارا؟" اس نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"کوئی کام نہ بھی نکلا تو شہر کی سڑکیں ناپتا پھروں گا۔ اس شہر کو مدت کے بعد دیکھا ہے۔ گلیوں میں چل کر اور سڑکوں پر ڈرائیونگ کر کے اپنائیت اور اپنے وطن کا عجیب سا مسحور کن احساس ہوتا ہے۔"

"تمھارے دماغ میں خشکی ہو گئی ہے۔" اس کی چڑچڑی آواز اُبھری تھی۔ "محبوبہ دغا دے گئی ہے تو اب سڑکوں، پتھروں اور پیڑ پودوں کو چومتے چاٹتے پھرو گے۔ عقل کے ناخن لو اور میری مانو تو چھ بجے فلیٹ پر ہی رہنا، سیما بہت زندہ دل عورت ہے۔ اس کے ساتھ دو چار دن وقت گزارو گے تو زندگی میں نئے رنگ نظر آنے لگیں گے۔"

میں نے اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ سیما پچھلی رات کے واقعے پر سخت شرمندہ تھی اور جہانگیر اسی رو میں اگر اس کے ساتھ دوبارہ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا تو وہ اسے تھپڑ بھی رسید کر سکتی تھی۔ تھپڑ کھا کر میرے بتائے بغیر اسے زندگی کے سارے رنگ خود بخود ہی نظر آ سکتے تھے۔

"آجانا! میں انتظار کروں گا۔ لیکن اب میں سلمیٰ سے کوئی جھوٹ نہیں بول سکوں گا۔"

اس نے میری سمجھداری پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

ریسیور کریڈل پر رکھ کر میں نے سگریٹ ہی سلگائی تھی کہ فون بول پڑا۔ ریسیور اُٹھاتے ہی میں نے کامٹ کی آواز پہچان کر شوٹر کہا اور پھر پوچھا۔ "یہ پروگرام کے بغیر ناوقت کیسے فون کر لیا؟" حقیقت یہ تھی کہ اس کی آواز سُن کر مجھے خوشی ہوئی تھی کیونکہ میری کئی اُلجھنوں کا جواب صرف وہی دے سکتا تھا۔

"تمھاری خیریت دریافت کرنی تھی۔ سُنا ہے پچھلی رات تم نے خاصی بھاگ دوڑ میں گزاری ہے اور پڑوسن والی سیما سے بھی تمھارے مراسم آناً فاناً.... بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں؟"

"میری کار میں پلاسٹک کا گڈا کس نے پہنچایا تھا؟" میں نے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"وہ میری طرف سے خیر سگالی کا پیغام تھا۔ تمھیں شیراڈ کی ڈگی کے بارے میں بتا دیا گیا تھا پھر بھی تم گڈے کو اپنے ساتھ بہت دور لے گئے۔ وہ اس بات کا اظہار تھا کہ میرے آدمی تمھارے قریب موجود تھے۔" [illegible] سی کے ساتھ کہا گیا۔ "اور بلڈنگ میں بھی تمھارے ہی آدمی ساری رات آنکھ مچولی کھیلتے رہے؟"

"ظاہر ہے کہ وہ اوپر تمھارے دروازے تک نہ جاتے تو یہ کیسے معلوم ہوتا کہ اندر کیا ہو رہا تھا۔ ویسے سیما سے ہوشیار ہی رہنا کل جب ہم تم سے ملنے آئے تھے تو تمھاری بلڈنگ عملاً ہمارے آدمیوں کے محاصرے میں تھی۔ سیما کے ملاقاتی کو بھگانے کے بعد میں نے اپنا ایک آدمی اس کے پیچھے روانہ کر دیا تھا جو خبر لایا ہے کہ وہ شخص دلدار کے دواساز کارخانے کا مینجر تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ سیما سے بھی کچھ کام لے رہے ہوں۔"

"انھوں نے سیما کے شوہر پر ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔" میں نے اس کی معلومات کی تصحیح کرنے کی نیت سے کہا۔ "وہ تیسرے پھیرے میں باہر پکڑا گیا اور اب ہارون اس پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ مجھے بھی کوئی چکر معلوم ہوتا ہے اور میں نے سیما کو ہوشیار کر دیا ہے۔"

"رات گئے ایک اور بھی آدمی تمھارے فلیٹ سے نکلتا ہوا دیکھا گیا تھا؟"

"وہ سیما کے فلیٹ میں صرف یہ دیکھنے آیا تھا کہ وہ اکیلی رہتی ہے یا اس نے واقعی دوسری شادی کر لی ہے لیکن وہ میرے ہاتھ لگ گیا۔ اسے ڈی ڈی نے بھیجا تھا۔ میں نے اپنی تسلی کے بعد ہی اسے آزاد کیا تھا۔"

"اوہ! یہ تو کوئی لمبا کھیل معلوم ہوتا ہے۔" اس کی تحیر زدہ آواز اُبھری۔ "ڈی ڈی اگر تمھاری پڑوسن میں دلچسپی لے رہا ہے تو تم کو بھی ہوشیار رہنا ہوگا۔ شاید تم نے اندازہ لگا لیا ہو کہ رات میرے تین چار آدمی تمھارے فلیٹ کے آس پاس موجود تھے۔ وہاں ڈیوٹی دینے والے نے غیر معمولی نقل و حرکت دیکھتے ہی کمک طلب کر لی تھی اور وہ سب اچھی طرح مسلح تھے۔ کوئی برا وقت آیا تو تم خود کو تنہا نہیں پاؤ گے۔ فی الحال ہم یک طرفہ طور پر تمھارا ساتھ دے رہے ہیں۔"

"یہ میرے ساتھ زیادتی ہے۔ تمھارے سب آدمی مجھے پہچانتے ہیں لیکن میں ان کی تعداد تک سے بے خبر رہتا ہوں لہٰ اس بے خبری اور اضطرار میں ان میں سے ایک آدھ میرا نشانہ بھی بن سکتا ہے۔"

وہ پھر ہنس پڑا۔ "تم فکر نہ کرو، تم سامنا ہوتے ہی آسانی سے انھیں پہچان لوگے۔ تمھارے سامنے وہ گمبی گمبی کے علاوہ ایک لفظ بھی نہیں بولیں گے اور وہی ان کی شناخت ہوگی۔"

"اگر ان میں سے کسی کو دل یا دماغ پر گولی کھانے سے پہلے گمبی گمبی کہنے کا موقع نہ مل سکا تو تم کو مجھ سے شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ تم جانتے ہو کہ افراتفری میں اپنے اور پرائے کی تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔"

"تم فکر نہ کرو، ایسا نہیں ہوگا۔ میرے دو بہترین اور گھاگ آدمی دن رات تمھاری نگرانی کر رہے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک بقیہ لوگوں کو کمانڈ کرتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ جب تک ڈی ڈی کا کھیل واضح نہ ہو تم اپنے فلیٹ میں ہی محدود ہو جاؤ اور سیما کو بھی باہر نکلنے سے روک دو۔ ہو سکے تو اس عورت سے کھوج نکالنے کی کوشش کرو کہ ڈی ڈی اس میں کیوں دلچسپی لے رہا ہے۔ شاید آج کل پاکستان میں وہی شی کا نمبر وَن ہے۔"

"پھر دلدار کیا کر رہا ہے؟" میں نے اسے ٹٹولنے کی نیت سے دانستہ وہ ٹیڑھا سوال کیا۔

"ڈی ڈی نے اسے بھی کام سے لگایا ہوا ہے، اس کا منیجر اپنی مرضی سے تو شہر میں نہیں دوڑتا پھر رہا ہوگا۔" وہ اس وقت تک ڈی ڈی کو دلدار سے الگ، کوئی اعلیٰ شخصیت سمجھنے پر تلا ہوا تھا۔

اس کے استفسار پر میں نے مختصر الفاظ میں اسے ندیم کی کہانی سے آگاہ کر دیا کیوں کہ اس کا سارے حالات سے واقف رہنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں شی کے اندر کا آدمی رہ چکا تھا اور وہ باہر کا آدمی تھا اس لیے اس کی کافی معلومات ناقص تھیں جن میں میں دانستہ اضافہ نہیں کر رہا تھا لیکن وہ شہر میں متحرک اور فعال تھا جب کہ میں سنجیدگی کے ساتھ خود کو فلیٹ میں محصور کرنے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ تھا اس لیے اس کی باخبری میرے لیے ضروری ہو گئی تھی۔

"کم از کم ایمرجنسی میں رابطے کے لیے تو کوئی نمبر دے دو۔" ساری بات ہو جانے کے بعد میں نے اصرار کیا۔

"یہ غیر اصولی بات ہے۔ کل رات کی فیصلہ کن ملاقات کے بعد ہی سب کچھ ممکن ہو سکے گا۔ ویسے تم مطمئن رہو، ہم

تمھاری ہر ایمرجنسی سے باخبر رہیں گے۔" وہ میری بار اپنا اصول توڑنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

"ڈان کو میرا سلام کہہ دینا۔" میں نے اسے الوداع کہہ دیا اور اس نے فون بند کر دیا۔

ریسیور رکھتے ہی میرے ذہن پر سناٹا طاری ہو گیا۔ میرے ہر سوال کا جواب مل چکا تھا۔ شی سے مخاصمت اپنی جگہ پر تھی لیکن میری نظر دلدار پر تھی جو غزالہ کو ہتھیار بنا کر رقیبانہ جذبات کو بھڑکا چکا تھا۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اب مجھے امیر دادا یا بخت آور کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے سیاہ کرتوت اپنی تمام کڑیوں کے ساتھ سامنے آ چکے تھے۔ میری دانست میں ڈی ڈی بھی وہی تھا جب کہ کاسٹلے دونوں کو الگ شخصیت تصور کر رہا تھا لیکن اس سے میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ دشمن میرے سامنے تھا اور مجھے بڑھ کر اس پر اپنا وار کرنا تھا۔

اِدھر میں اکیلا تھا اور اُدھر شاید سیما بھی فلیٹ پر اکیلی ہی تھی، خوش شکل اور خوش مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ خوش اخلاق بھی تھی۔ اس کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے بوریت کا کوئی احساس ہونے کا امکان نہیں تھا پھر اسے یہ بھی سمجھانا تھا کہ چند روز تک وہ بھی فلیٹ ہی میں بند رہے کیوں کہ غیر ضروری طور پر باہر نکلنے میں اسے خطرات لاحق ہو سکتے تھے۔

میں اس کے فلیٹ تک جانے یا اسے فون کر کے بلانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ گھنٹی بجی اور میرے دروازہ کھولتے ہی سیما اندر گھس آئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور سانس چڑھا ہوا تھا، میں نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا۔

"کیا بات ہے؟ اس قدر پریشان کیوں ہو؟" میں نے بوکھلائی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"تت... تم بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ مجھے پتا چل گیا کہ ان لوگوں کو میرے پاس کس چیز کی تلاش ہے... یہ دیکھو، وہ اس کے لیے مرے جا رہے ہیں۔" آخری فقرہ ادا کرتے ہوئے اس نے اپنی داہنی مٹھی میرے سامنے کھول دی اور میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے شوہر کی پروا اتنی بند رہی ہوگی۔

اس کی ہتھیلی پر وہ پُراسرار طلائی سکہ چمک رہا تھا جس پر چاندی سے ایک ابھری ہوئی اور نیم وا انسانی آنکھ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ میری طرف نگراں تھی۔ اس سلور آئی کو دیکھ کر شی کے بڑے بڑوں کے سر اطاعت کے اظہار میں جھک جاتے تھے۔ اگر وہ ندیم کے قبضے میں تھی تو وہ یقیناً شی میں آئی مین کے اہم منصب پر فائز تھا۔

میں نے اضطراری طور پر وہ سلور آئی سیما کی ہتھیلی سے اٹھالی اور تیز سرگوشیانہ آواز میں بولا۔ "یہ تمھیں کہاں سے ملی، تم کو کیسے پتا چلا کہ ان لوگوں کو اس کی تلاش ہے؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی، میرے غیر ارادی ردِعمل نے اسے مزید پریشان کر دیا تھا۔ "تمھارے کہنے کے باوجود مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ انھیں میرے پاس کس چیز کی تلاش ہوگی لیکن ابھی ابھی میرے پاس ڈی ڈی کا فون آیا تھا۔ بہت سرد اور خوف ناک لہجہ تھا اس کا۔" ڈی ڈی کی آواز کا تصور کرتے ہی اسے جھرجھری آ گئی۔ "مجھے اس پر بہت غصہ تھا لیکن اس کی آواز سن کر میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ندیم اپنی حماقت کی وجہ سے فرینکفرٹ میں پکڑا گیا کیوں کہ وہ ایک ایسی نشانی ساتھ لے جانا بھول گیا تھا جو کسٹم آفیسر کے لیے اس کی شناخت کا درجہ رکھتی تھی۔ ان کے خریدے ہوئے افسر نے ندیم کو پہچان لیا لیکن نشانی نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ماتھا ٹھنک گیا اور اس نے ندیم کا سامان کھلوا کر اسے گرفتار کر لیا۔ شاید ڈی ڈی کے آدمیوں نے جیل میں ندیم سے ملاقات کی تھی کیوں کہ ڈی ڈی نے مجھ سے کہا کہ میں ندیم کی اس یونیفارم کی تلاشی لوں جو وہ میلی ہونے کی وجہ سے گھر چھوڑ گیا تھا۔ اس یونیفارم کی جیبوں میں مجھے ایک سکہ تلاش کرنا تھا جو سونے کا تھا اور اس پر چاندی سے ایک خوب صورت آنکھ ڈھلی ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ سکہ مل جاتا تو ندیم کی علالت سے بھی گلو خلاصی ہو سکتی تھی، اسے لائن ہولڈ کرا کے میں نے میلی یونیفارم کی جیبوں کی تلاشی لی تو اس میں ریزگاری کے ساتھ یہ منحوس سکہ بھی مل گیا اور میں دہشت زدہ ہو گئی۔ وہ خطرناک لوگ تھے اور تمھاری ہدایت مجھے یاد تھی اس لیے میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے ڈی ڈی سے کہہ دیا کہ یونیفارم کی جیبیں خالی ہیں۔ اس پر وہ برہم ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے پہلے ہی جیبیں خالی کر دی تھیں اور سونے کے لالچ میں اس سے جھوٹ بول رہی تھی۔ میں لرز کر رہ گئی مگر اپنے بیان پر اڑی رہی۔ اس نے مجھے اس حد تک خوف زدہ کیا کہ آنکھ والا سکہ اس کے مالکوں کو واپس نہ ملا تو وہ ندیم کو جان سے مار دیں گے کیوں کہ ہر کھیپ کے ساتھ کسٹم والوں کے لیے اسے وہ سکہ دیا جاتا تھا جو کسٹم کی کلیئرنس کے بعد وہی شخص لے لیتا تھا جو مال وصول کرتا تھا...."

"تم نے بہت اچھا کیا۔" اس کے خاموش ہونے پر میں نے اپنے قبضے میں آئی ہوئی چوتھی سلور آئی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "ندیم کو اب دنیا کی کوئی طاقت بری نہیں کرا سکتی، وہ لوگ ہر قیمت پر یہ سکہ واپس حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مجھے آج ہی پتا چلا کہ اس سکے کو مال لے جانے والے کی شناخت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔"

"پوری بات نہیں سنی تم نے ابھی۔" وہ مجھے جھنجوڑتے ہوئے روہانسی آواز میں بولی۔ "اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ میں اس کی اگلی ہدایت تک اپنے فلیٹ سے باہر نہ نکلوں، ایسا کیا تو اس کے آدمی مجھے اٹھا لے جائیں گے یا گولی مار دیں گے۔ مجھے بتاؤ کہ اب میں کیا کروں اور کہاں جاؤں؟ تمھارے مشورے نے تو مجھے مروا ہی دیا ہے۔"

"اپنے فلیٹ سے ضرورت کی چیزیں لے کر یہاں آجاؤ۔ وہ یہی سمجھتے رہیں گے کہ تم اپنے فلیٹ میں محصور ہو گئی ہو۔" میں نے اپنی تشویش چھپا کر اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہیں گے، اس نے کہا ہے کہ میں گھر میں ہی رہوں، کسی بھی وقت اس کے دو آدمی میرے فلیٹ پر آئیں گے اور خود اپنی مطلوبہ چیز تلاش کر کے لے جائیں گے۔"

"اس کا مقصد ہوا کہ اسے اس سکے کی تمھارے فلیٹ میں موجودگی کا پورا یقین ہے، وہ تمھیں یہ موقع نہیں دینا چاہتا کہ تم اسے نکال کر باہر کہیں محفوظ کر دو۔ اس کے لیے اگر انھیں دس انسانوں کا بھی خون بہانا پڑا تو وہ گریز نہیں کریں گے، یہ سکہ پاکستان میں غالباً حال ہی میں متعارف کرایا گیا ہے۔"

"مجھے خوف زدہ نہ کرو، میرا پہلے ہی دم نکلا جا رہا ہے۔" وہ مضبوطی سے میرا بازو تھام کر کراہی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کہاں جاؤں۔ اب تو مجھے تم سے بھی خوف آنے لگا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی ان ہی میں سے ہو ورنہ تمھیں ان کے بارے میں اتنی معلومات کہاں سے حاصل ہوتیں، سچ بتاؤ کہ تم تو مجھے دغا نہیں دو گے؟"

"پاگل ہو رہی ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "وقت آنے پر تمھیں پتا چل جائے گا کہ میں ان میں سے ہوں یا ان کے لہو کا پیاسا۔ تمھارا مقدر اچھا ہے کہ مجھ سے ٹکرا گئی ہو ورنہ وہ سکہ واپس لینے کے بعد تمھیں ہرگز زندہ نہیں چھوڑتے۔ یہ سکہ ان کا بہت بڑا راز ہے جسے وہ ہر قیمت پر راز رکھے ہوئے ہیں۔ جو اجنبی اسے دیکھ لے یا اس کے وجود سے واقف ہو جائے، وہ سائے کی طرح اس کا پیچھا کرتے ہیں

اور موقع پاتے ہی موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں۔"
"میں اب فلیٹ میں قدم نہیں رکھوں گی۔ اس کے در و دیوار پر مجھے ابھی سے موت کے سائے ناچتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔" دہشت سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"وقت برباد نہ کرو اور میرے ساتھ چل کر وہاں سے اپنی ضرورت کی اشیا نکال لاؤ۔" میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ "جو کچھ ہو رہا ہے بہتر ہی ہو رہا ہے۔ وہ تمھیں تنہا سمجھ رہے ہیں اور میرے وجود سے بے خبر ہیں۔ ان کے آدمیوں کو آنے دو، تم دیکھنا کہ ان میں سے کوئی زندہ واپس نہ جا سکے گا۔"

وہ ایک جھرجھری لے کر مجھ سے دور ہٹ گئی اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "اب تم بھی اپنی کینچلی بدل رہے ہو۔ تمھارے لب و لہجے سے خون کی بو آ رہی ہے، میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ سکّہ مجھے لوٹا دو، میں انھیں دے دوں گی اور ان کے قدموں میں گر کر اپنی زندگی کی بھیک مانگ لوں گی۔ انسانوں کو درندوں کی طرح ایک دوسرے کا خون بہاتے دیکھ کر میرا دماغ پھٹ جائے گا، میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

"میں اتنا بُرا آدمی نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔" میں نے سلور آئی اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "میں آرام سے اپنے بستر پر پڑا چین کی بنسی بجاتا رہوں گا۔ تم یہ سکّہ انھیں لوٹا کر ان کا جذبۂ ترحّم بھی آزما لینا۔ یہ روٹھی نہ جانے کن کن لوگوں کو نگل گئی ہے۔ تم بھی اس کا ایندھن بن جاؤ گی لیکن تمھارا جنازہ دیکھ کر مجھے دُکھ ہوگا کہ ایک انسانی زندگی جو میں بچا سکتا تھا، اپنی پُرخلوص کوششوں کے باوجود نہ بچا سکا۔"

"مجھے بہلانے کے لیے تم ان کے دو آدمیوں کا خون بہانے پر تُل گئے ہو۔"

"مجبوری ہے۔" میں نے شانے اُچکا کر کہا۔ "وہ بُرے لوگ ہیں، انھیں نہ مارا گیا تو وہ تم کو مار دیں گے۔ دو میں سے ایک فریق کا ختم ہونا ضروری ہے۔ یہ نہ بھولو کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔"

"تمھیں محبت تو نہیں ہوئی ہے مجھ سے، انھیں مار کر تم فنا نہیں کر سکو گے، ان کے ساتھی زندہ رہیں گے، ڈی ڈی زندہ رہے گا۔ تم مجھے کب تک اپنے فلیٹ میں چھپائے رکھو گے؟ میں جب بھی منظرِ عام پر آؤں گی، وہ مجھے مار دیں گے اور اُس وقت وہ مجھے ہرگز معاف نہیں کریں گے..."

"تم کو صورتِ حال کی سنگینی کا صحیح اندازہ نہیں ہو رہا ہے۔ بدقسمتی اور اپنے شوہر کی نادانی کے سبب تم موت کے سوداگروں کے چُنگل میں پھنس گئی ہو۔ وہ دن رات دُنیا بھر میں زندہ لاشیں تخلیق کر رہے ہیں، اپنے سانسوں میں زندگی نگلتے ہیں اور روز موت اُگلتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اب بھی نیچے تمھاری گھات لگائے بیٹھے ہوں۔ تم پر صرف آج کا دن بھاری ہے، آج ان سے بچ جاؤ تو خاموشی سے یہ ملک چھوڑ کر کہیں بھی جا سکتی ہو۔ یہ تجربہ تمھارے لیے نیا نہیں ہوگا۔ تم ایئر ہوسٹس ہو اور روز منزلیں اور پڑاؤ بدلنے کی عادی ہو۔ تمھاری سفری دستاویزات بھی مکمل ہوں گی۔ تمھیں بس آج کا دن گزارنا ہے پھر کچھ بھی کر سکتی ہو۔"

"اس کے لیے خونریزی تو ضروری نہیں۔" وہ چند ثانیوں تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے کے بعد ہراساں لہجے میں بولی۔ "میں تمھارے فلیٹ میں آ جاتی ہوں۔ وہ آئیں گے اور کوئی جواب نہ پا کر تالا توڑ کر اندر گھس جائیں گے۔ تمھیں ان کو للکارنے کی ضرورت ہی نہیں۔ تلاشی سے مایوس ہو کر وہ خود واپس لوٹ جائیں گے۔ خون بھی نہیں بہے گا اور میں بھی بچ جاؤں گی۔"

میں نے بظاہر لاجواب ہو کر سر جُھکا لیا۔ اسے چند منٹ کی بحث میں شی کا سرد اور خونیں مزاج سمجھانا میرے بس سے باہر تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہاں ڈی ڈی کے صرف دو آدمی نہ آتے بلکہ ایک دو نیچے بھی مامور رہتے تاکہ سیما اوپر والوں کو جُل دے کر نہ بھاگ سکے۔ اوپر والے تلاشی سے مایوس ہو کر لوٹتے تو انھیں پورا یقین ہوتا کہ سیما سلور آئی سمیت اسی بلڈنگ کے کسی فلیٹ میں روپوش ہے اور وہ وہیں ڈیرے ڈال دیتے۔ ڈی ڈی مشتعل ہو کر سلور آئی حاصل کرنے کے لیے چند گھنٹوں میں ہی پوری قوّت کے ساتھ اس بلڈنگ کے آٹھوں فلیٹوں پر دھاوا بول سکتا تھا۔ اس طرح نہ صرف سیما ماری جاتی بلکہ مجھے بھی کھُل کر ان کے سامنے آنا پڑ جاتا۔ جو میرے اپنے مفاد میں نہیں تھا۔

مجھے شدت سے احساس ہونے لگا کہ کاش کامٹ کا فون ذرا تاخیر سے آیا ہوتا تاکہ میں اسے نئے خطرات سے آگاہ کر سکتا۔ نہ میرے پاس اس کا کوئی پتا ٹھکانا تھا اور نہ ہی اتنی جلدی دوبارہ اس کا فون آنے کی امید تھی۔

معاً مجھے خیال آیا کہ دو سلور آئیز میری تحویل میں موجود تھیں جن کے سہارے میں کسی بھی موقع پر خود کو سپر آئی ظاہر کر سکتا تھا۔ میرے جانے تک پاکستان میں شی کے کارندوں کو سلور آئی کی ہوا بھی نہیں لگی تھی لیکن اس کے رائج ہونے کے بعد میری دونوں سلور آئیز بہت کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ تیسری سلور آئی میں نے ویرا کو دے دی تھی اس لیے وہ چوتھی سلور آئی میرے لیے بے معرف تھی۔ جا ہمیرے فلیٹ میں پناہ گزیں ہونے سے پہلے وہ سکّہ ندیم کی یونیفارم کے بجائے کسی اور لباس کی جیب میں چھوڑ گئی تھی۔ سکّہ مل جانے پر ڈی ڈی کے ہرکارے یہی سمجھتے کہ سیما خوفزدہ ہو کر بلڈنگ میں کہیں چھپ گئی تھی اور سکّے کے وجود سے بے خبر تھی۔ ایسی صورت میں وہ سیما کو بھول کر واپس بھی جا سکتے تھے یا زیادہ سے زیادہ نیچے رہ کر اس کے نمودار ہونے کا انتظار کرتے اور اس سے کڑی بازپرس کے بعد سکّے سے لاعلم سمجھ کر زندہ چھوڑ دیتے۔ تیسرا امکان شی کے مزاج سے اُبھرتا تھا کہ رازداری کے معاملات میں وہ کوئی خطرہ مول نہیں لیتے تھے، صرف شبے کی بنیاد پر کسی کو بھی گولی مار سکتے تھے۔

میں نے جتنا غور کیا اسی نتیجے پر پہنچا کہ سلور آئی کی واپسی فوری تشدد کے کسی بڑے خطرے کو ٹال سکتی تھی۔ وقت مل جاتا تو میری نگرانی پر مامور مافیا والے بھی ڈی ڈی کے گرگوں کی خبر لے سکتے تھے یا پھر میں کامٹ سے رابطہ قائم ہونے پر اسے اس طرف متوجّہ کر سکتا تھا۔

سلور آئی کی واپسی کا میرا فیصلہ سیما کو بہت پسند آیا کیونکہ اس میں تشدد کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے اسے یہی بتایا کہ آنے والے یونیفارم کے بجائے کسی دوسرے لباس سے سلور آئی برآمد ہوتے ہی اسے سکّے کے وجود سے بے خبر سمجھ کر آرام سے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ کر میٹھی نیند سو جائیں گے۔

اس وقت میں سیما کے ساتھ پہلی بار اس کے فلیٹ میں گیا اور اندر کی آرائش و زیبائش دیکھ کر وجودِ زن سے کائنات میں پیدا ہونے والے رنگوں کا قائل ہو گیا۔ پچھلی رات میں جہانگیر کی تلاش میں اس کے دروازے پر آیا تو ابتدا ہی اندھیرے میں مار دھاڑ سے ہوئی تھی جو داخلی دروازے سے منسلک راہداری تک محدود رہی تھی اور روشنی ہونے کے بعد میں شکار کو ساتھ لے کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اندر کا جائزہ لینے کی نوبت ہی نہیں آ سکی تھی۔

سیما نے مردانہ وارڈروب میں ہینگر پر لٹکے ہوئے ایک بلیزر کی جیب میں سلور آئی کے ساتھ ہی مزید کچھ سکّے ڈال دیے تاکہ ان کی کھنک آنے والوں کی توجّہ مبذول کرا سکے۔ اس بلیزر کی دوسری جیبوں میں بھی اس نے ندیم کی کچھ ذاتی اشیا ڈال دیں۔ پھر بہت عجلت میں اپنے کپڑوں کے ساتھ دیگر ضروری اشیا بے دردی کے ساتھ ایک چادر میں لپیٹیں اور میرے ساتھ بحفاظت میرے فلیٹ میں واپس آ گئی۔

یہ دلچسپ بات تھی کہ میں سیما کو اپنے فلیٹ میں رہنے کا جو مشورہ دینے والا تھا، اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی اور وہ خود بخود میری مہمان ہو گئی تھی۔

ذہنی دباؤ کم ہوتے ہی وہ کچن کی طرف متوجّہ ہو گئی۔ میں نے صبح اس کے ساتھ لنچ کی پیشکش کو ٹال دیا تھا لیکن اب لنچ تو کیا ڈنر بھی اسی کے ساتھ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ میں نے فرصت پا کر فون سنبھال لیا تاکہ جہانگیر کو بدلے ہوئے حالات سے آگاہ کر کے شام کو فلیٹ پر آنے سے منع کر سکوں لیکن وہ اس قدر حریص اور بدنیّت شخص تھا کہ سیما کے میرے فلیٹ میں پناہ گزیں ہونے کی خبر سُنتے ہی اپنے سارے کام چھوڑ چھاڑ کر اسی وقت وہاں آنے پر تُل گیا۔

میں نے اسے لاکھ سمجھانا چاہا کہ اس کے وہاں آنے میں کیا خطرات مضمر تھے لیکن اس نے ایک نہ مانی۔ وہ خبیث یہی سمجھ رہا تھا کہ میں اسے سیما سے دور رکھنے کے لیے چال چل رہا تھا جسے بُری طرح ناکام بنانا اس کا حق اور فرض تھا۔

داخلی دروازے کے کی ہول پر ٹیپ چپکا دیا گیا تاکہ کوئی اس میں جھانک کر اندر کا جائزہ نہ لے سکے۔ پھر لنچ سے پہلے ہی جہانگیر خورد و نوش کے سامان سے لدا پھندا وہاں آ پہنچا جیسے پکنک منانے آیا ہو۔

مجھ سے وہ ہلے گلے والے تیوروں کے ساتھ فاتحانہ انداز میں ملا تھا لیکن سیما کا اداس چہرہ اور خوفزدہ لہجہ پہلی بار یہ احساس دلانے میں کامیاب ہوا کہ وہاں واقعی خاصی گڑبڑ ہونے کے امکانات موجود تھے جبکہ سیما کو حقیقی خطرات کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ وہ سلور آئی کی واپسی کو اس کہانی کا آخری باب تصور کر رہی تھی اور اس کے خوف و ہراس کا سبب صرف اتنا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ کچھ اجنبی اس کے فلیٹ میں گھُس کر ہر چیز کو تہس نہس کرنے والے تھے لیکن وہ بے بس تھی۔ نہ صرف یہ کہ انھیں روک نہیں سکتی تھی بلکہ ان کی سہولت کے لیے خود بھی گھر خالی چھوڑ کر میرے فلیٹ میں آ بیٹھی تھی۔

"اب بھی وقت ہے، تم واپس چلے جاؤ، پھنس گئے تو پھر دُشواریاں کھڑی ہو جائیں گی۔" میں نے اسے سلمیٰ کا غصّہ یاد دلانے کی نیت سے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہوا کریں۔ میری طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ دوست کو مشکل میں گھرا ہوا چھوڑ کر اپنے گھر چلا جاؤں۔" وہ ڈھٹائی سے سیما کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے بولا۔

'میری طرف سے جہنّم میں جاؤ۔' میں نے دل ہی دل میں کہا اور بلند آواز میں بولا۔ "رُک رہے ہو تو یہ یاد رکھنا کہ بوتل سورج غروب ہونے سے پہلے نہیں کھُلے گی اور میں تمھیں زیادہ نہیں پینے دوں گا۔"

"رات کی بچی ہوئی بوتل موجود ہے یا اسے بھی چوس گئے تھے؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا اور میں نے غسل خانے میں باہر والے صوفے کے نیچے سے وہ بوتل نکال کر اسے تھمادی جو چوتھائی سے بھی کم باقی رہ گئی تھی۔

جہانگیر نے ماحول کا بوجھل پن دُور کرنے کی کافی کوشش کی لیکن آخر کار اسے بھی سنجیدہ ہونا ہی پڑا۔

میں نے اندر سے ڈور بیل کا سوئچ آف کر دیا اور ان دونوں کو نیچی آواز میں گفتگو کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے یہ بھی سمجھا دیا کہ ہم میں سے کسی کو دروازے پر ہونے والی دستک کا جواب نہیں دینا تھا۔

کھانا نسبتاً خاموشی کے ساتھ کھایا گیا۔ بعد میں میں نے سیما کو علیحدہ خواب گاہ میں آرام کرنے کی پیشکش کی لیکن اس نے بتایا کہ اسے کچن کی تنہائی سے بھی ہول آرہا تھا اس لیے وہ ہمارے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔

وہ مجلسی عورت تھی۔ پینے پلانے کے علاوہ تاش کے ہر کھیل سے بھی واقف تھی اس لیے ہم خواب گاہ میں ہی کٹ تھروٹ کھیلنے بیٹھ گئے جو برج کی ہی سہ فریقی شکل ہوتی ہے۔ چوتھا آدمی ہوتا ہے جو بڈر کا پارٹنر بن جاتا ہے۔

شام ڈھلی اور باہر کی فضا میں دُھندلکا تیرنے لگا تو روشنیاں جلادی گئیں اور جہانگیر کھلی ہوئی بوتل اُٹھا لایا۔ میں اسے گھور کر رہ گیا۔ زبان سے کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ سورج ڈوبنے کی شرط خود میں نے ہی عائد کی تھی۔ سیما کے اعصاب شاید اس وقت تک ڈھیلے ہوئے تھے جنھیں اعتدال پر لانے کے لیے وہ الکحل کے سہارے کی ضرورت محسوس کر رہی تھی اس لیے اس نے بھی انکار نہیں کیا البتّہ اس نے اسکاچ اور برف میں ٹھنڈا پانی ڈال کر اپنا گلاس لبریز کر لیا تھا تاکہ دیر تک ہمارا ساتھ دیتی رہے۔

کھیل، مے نوشی اور باتوں کے درمیانی وقفوں میں جہانگیر نے سیما کی آنکھ بچا کر کئی بار مجھے وہاں سے ٹلنے کا اشارہ کیا تاکہ اسے تنہائی میں سیما سے کچھ بات کرنے کا موقع مل سکے مگر میں نے ہر بار اپنی توجہ یوں دوسری طرف مبذول کر لی جیسے اس کا اشارہ دیکھا ہی نہ ہو۔

آٹھ بجے کے قریب فضا میں پے در پے کئی ایسے ہولناک دھماکے ہوئے کہ ہم تینوں ہی اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔ فضا میں تیز روشنی کے کوندے لپکے تھے جیسے کہیں آسمانی بجلی گری ہو پھر فوراً ہی خواب گاہ کی کھڑکی سے وہ منظر بھی نظر آگیا۔

روشنیاں دھیمی اور تیز ہو کر یکلخت بجھ گئی تھیں اور سامنے والی گلی میں دو کھمبوں پر لگا ہوا بجلی کا ٹرانسفارمر دھماکوں کی زد میں آیا ہوا تھا۔ تانبے کے موٹے موٹے تار، شٹ شٹ کی آوازوں کے

ساتھ رہ رہ کر جل رہے تھے۔ ان کے پگھلے ہوئے ٹکڑے آگ کے شراروں کی طرح ماند ہوتے ہوئے نیچے گر رہے تھے۔ وہ [illegible] بہ مشکل چند ثانیوں تک جاری رہا پھر شاید پیچھے سے بجلی کی سپلائی کسی خودکار بریکر کے ذریعے منقطع ہوگئی لیکن ٹرانسفارمر شعلوں کی زد میں آچکا تھا۔ اس میں سے کثیف دھوئیں کے ساتھ گہرے سُرخ شعلوں کے بادل اُمڈتے چلے آرہے تھے۔

پورا علاقہ گھور اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ ٹرانسفارمر کے شعلوں کی سُرخی دور تک پھیل رہی تھی یا سڑک پر دوڑنے والی گاڑیوں کی ہیڈلائٹس کا انعکاس فضا میں نظر آرہا تھا۔

"شاید شارٹ سرکٹ ہوا ہے۔" جہانگیر نے تشویش آمیز لہجے میں تبصرہ کیا تھا۔

"یہ بھی آج ہی ہونا تھا۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے۔" سیما میرے قریب ہو کر خوفزدہ آواز میں بولی۔

ہم تینوں کھڑکی کے قریب ہو کر باہر کا جائزہ لینے لگے۔ اندھیرے میں ہر طرف سے تماشائیوں کی ٹولیاں نکل آئی تھیں اور دور ہی سے اس آگ کا نظارہ کر رہی تھیں۔ بجلی کے جان لیوا جھٹکوں کے خوف سے کسی نے آگ کے قریب جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ فضا میں فائر انجن کے سائرن کی گونج سنائی دینے لگی جو تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی۔ کسی عقل مند نے بروقت انھیں فون پر اطلاع دے دی تھی۔

فائر انجن کے پہنچنے سے پہلے ہی ٹرانسفارمر کے پیمانہ لبریز ہو گیا۔ بھڑکتی ہوئی آگ کی تپش سے بند حصوں کے تیل میں پیدا ہونے والے گیسوں کے دباؤ نے کام دکھایا اور ٹرانسفارمر ایک خوفناک دھماکے سے پھٹ گیا جس نے پورے علاقے کو لرزا کر رکھ دیا۔ کھمبوں پر ٹرانسفارمر کے باقیات جلتے رہے۔ دھماکے سے اُڑنے والے حصوں نے قُرب و جوار میں آگ پکڑ لی تھی۔ اسی وقت فائر انجنوں نے ہجوم میں راستہ بنانے کے لیے سائرن تیز کر دیے۔ فائر مین تیزی کے ساتھ چرخیوں سے پائپ کھول رہے تھے۔ انھوں نے پوزیشن لے لی تو سائرن بند ہو گئے، پمپ چل پڑے اور پانی یا کیمیکل کی کئی دھاریں مختلف سمتوں میں آگ سے ٹکرانے لگیں۔ فائر انجنوں کے آجانے کے بعد تماشائیوں کا ازدحام بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ خطرہ کم ہو جانے کے بعد ہر شخص سب سے پہلے جائے وقوع کا معائنہ کر کے اپنی رائے قائم کرنے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ کسی کو یہ احساس نہیں تھا کہ اس کی غیر ذمے داری سے فائر مینوں کو اپنے کام میں کتنی دُشواری آرہی تھی۔

وہ ٹرانسفارمر خاصا بڑا تھا اور اس کے تاروں کا خو[illegible] شارٹ ہوجانا ناممکنات میں سے تھا۔ شعلے، شرارے اور دھماکے یہ بتا رہے تھے کہ وہاں تخریب کاری ہوئی تھی۔ کسی بھی دھات کے نرم اور لچکدار تاروں کے لمبے لچھے ٹرانسفارمر کے بالائی سرے پر اچھالے بغیر ایسی خوفناک آتشزدگی ہونی محال تھی۔

پھر اچانک ہی دوسری عقبی سمت سے ایک فائر کی گونج اُبھری اور فضا ایک دلدوز انسانی چیخ سے لرز اُٹھی۔ ہر طرف سے لوگ وہیں سمٹ آئے تھے، فائر اور چیخ سنتے ہی وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ اس قدر شور بلند ہوا کہ کان پڑی آواز نہیں سُنائی دے رہی تھی۔ پھر شاید کسی کلاشنکوف سے برسٹ مارا گیا، کئی ادھوری چیخیں اُبھریں۔ تماشائیوں کی بھیڑ آناً فاناً میں غائب ہوگئی تھی۔ سڑک پر سناٹا ہو گیا تھا۔ فائر مین بھی تذبذب کے عالم میں تھے۔ پانی کے پائپ تھامے اسی طرف دیکھ رہے تھے جدھر موت برس رہی تھی۔

کلاشنکوف چلنے کے بعد تو جیسے وہاں میدانِ جنگ بن گیا۔ بہ یک وقت بہت سے ہتھیار چلنے لگے اور فضا تیزی کے ساتھ بارود کی بُو سے بھرتی چلی گئی۔

فائر مینوں نے تیزی سے پائپ سمیٹے اور دونوں انجن سائرن بجائے بغیر تیزی کے ساتھ آگے گلی میں گھستے چلے گئے۔

آخر کار اس خوفناک تصادم کا آغاز ہو ہی گیا تھا جسے ٹالنے کے لیے میں نے سلور آئی ندیم کے بلیزر میں ڈلوا دی تھی۔ جہانگیر اور سیما پریشان اور خوفزدہ تھے مگر میں جانتا تھا کہ وہ اس شہر میں شی اور مافیا کا پہلا تصادم تھا جس کی داغ بیل شاید میں نے ہی ڈالی تھی۔ لڑنے والے اب سڑک کے رُخ پر بھی آگئے تھے کیونکہ فضا میں گولیاں تیرتی نظر آنے لگی تھیں۔ میں ان دونوں کو لے کر تیزی کے ساتھ کھڑکی سے ہٹ گیا۔ سیما نے دہشت زدہ ہو کر بآوازِ بلند رونا شروع کر دیا تھا۔

آناً فاناً میں ہی اس پورے علاقے میں ایک خوفناک صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی۔ منظم تخریب کاری کے ذریعے ایک وسیع علاقے کو بجلی فراہم کرنے والے پول ماؤنٹیڈ ٹرانسفارمر کو آگ لگا کر تباہ کر دیا گیا تھا جس کے نتیجے میں ہر طرف گھور اندھیرا پھیل گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ قرب و جوار میں رہنے والوں کو وہ پوری رات بجلی کے بغیر ہی ایک عذاب میں گزارنی تھی۔ کیونکہ نیا ٹرانسفارمر لگائے یا لائنوں میں بڑی ردّوبدل کیے بغیر اس علاقے میں ایک قمقمہ بھی روشن کرنا ممکن نہیں تھا اور یہ شہر کی روشنیوں کے نگہ داروں کے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سامان کی فراہمی اور اوور ٹائم [illegible] یقین دہانیوں کے بعد اگلی دوپہر سے پہلے اس منصوبے پر کسی کارروائی کے آغاز کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔

اور شاید تخریب کار بھی یہی چاہتے تھے۔ اندھیرے میں آگ کے بھیانک شعلے بھڑکا کر ایک طرف انھوں نے پوری آبادی کی توجہ جائے حادثہ کی طرف مبذول کرادی تھی اور دوسری طرف اندھیرے کی چادر پھیلا کر ہر ایک کے لیے دوست اور دشمن کی تمیز مٹادی تھی۔ اس افراتفری اور دار و گیر کا فائدہ اٹھا کر وہ اپنی من مانی کرنا چاہ رہے تھے لیکن فضا میں مختلف سمتوں سے جگنوؤں کی طرح اڑنے والی گولیاں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ تخریب کار تباہی اور تاریکی سے فائدہ اٹھانے میں بُری طرح ناکام رہے تھے۔ اس سارے تماشے نے ان لوگوں کے انہماک اور فرض شناسی میں ذرا بھی خلل نہیں ڈالا تھا جو ان کا راستہ روکنے کے لیے اپنی کمین گاہوں میں دبکے ہوئے تھے اور شاید بدترین صورتِ حال سے دوچار ہونے کے لیے بھی تیار تھے۔

ٹرانسفارمر تباہ کرنے والے یقیناً شی کے ہرکارے تھے جن کے اعصاب پر سلور آئی بُری طرح مسلط ہو کر رہ گئی تھی۔ اندھیرا پھیلا کر انھوں نے افراتفری میں میری بلڈنگ پر دھاوا بولنے کا منصوبہ بنایا تھا تاکہ ایک ہی ہلّے میں میرے پڑوس میں واقع سیما کے فلیٹ میں گھس کر وہاں سلور آئی تلاش کر سکیں۔ عام حالات میں کسی قسم کی مزاحمت سے دوچار ہوئے بغیر وہ مرحلہ سر کرنا ممکن نہیں تھا۔ پھر اندھیرے میں کوئی بھی انھیں نہیں پہچان سکتا تھا اس لیے سلور آئی کے حصول کے لیے وہ سارا بکھیڑا پھیلایا گیا تھا۔

لیکن مافیا والے بھی جی دار ثابت ہوئے تھے۔ کامٹ کے جو آدمی میری حفاظت پر مامور تھے انھوں نے دھماکے ہونے اور اندھیرا پھیلنے کے باوجود اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ بلکہ فضا میں سازش کی بو محسوس کر کے وہ شاید کچھ زیادہ ہی مستعد ہو گئے تھے اور جب شی کے آدمی اپنی دانست میں فضا کو سازگار سمجھ کر میری بلڈنگ میں گھسنے کے لیے لپکے ہوں گے تو مافیا والوں نے اندھیرے میں ان پر موت کی برسات کر دی ہوگی۔

ابتدائی کربناک چیخوں کی بنا پر یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ پہلے ہلّے میں مافیا والوں نے ان کے ایک دو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ باہر سے ہونے والے اس شدید حملے کے باوجود اگر شی والے عمارت میں گھسنے کی حماقت کرتے تو وہ عمارت ان کے لیے چوہے دان ثابت ہوتی اور ان میں سے کوئی بھی زندہ باہر نہ نکل پاتا۔

عمارت کے زینوں پر بھگدڑ اور دھما چوکڑی کے آثار نہ ہونے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ابتدائی نقصانات اٹھاتے

ہی شی والے سنبھل گئے تھے اور انھوں نے بھی باہر پوزیشنیں سنبھال کر اپنے حریفوں کا مقابلہ شروع کر دیا تھا۔

عقبی حصے سے شروع ہونے والی فائرنگ سامنے والی سڑک تک پہنچنے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ دونوں حریف بھاری نفری ساتھ لائے تھے اور بہت بڑے کشت و خون کے بغیر ان میں سے کسی ایک کا دوسرے پر غالب آنا ممکن نہیں تھا۔

میں ان خطرناک حالات میں اندھا دھند کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ایسی حماقت کی صورت میں عین ممکن تھا کہ میں بے خبری میں اپنے دشمنوں کے بجائے، ہمدردوں ہی کی کسی گولی کا نشانہ بن جاتا۔ اس لیے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اس اچانک تصادم کا تجزیہ کرنا ضروری تھا، لیکن سیما کے رونے کے ڈوبتے اور ابھرتے ہوئے سُر اس وقت میرے ذہن پر جھلاہٹ طاری کر رہے تھے۔

”خاموش ہو جاؤ، یہ لوگ تمھیں تل کر نہیں کھا جائیں گے۔“ میں نے غرا کر دھیمی آواز میں اسے ڈانٹا۔

”نرمی سے بات کرو پیٹر!“ آگ اور بارود کی اس برسات میں بھی جہانگیر کے دماغ میں عشق کا کیڑا کلبلا رہا تھا۔ ”وہ بے چاری فائرنگ اور اندھیرے سے پہلے ہی ڈری ہوئی ہے، تم بھی اسے دھمکاؤ گے تو آدھی جان رہ جائے گی۔“

”آدھی جان کے بچے! اس پوری جان کو گود میں لے کر چُپ کراؤ۔“ میں نے اندھیرے میں دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”یہ آتش بازی نہیں چل رہی، کچھ لوگ افراتفری پھیلا کر سیما کے فلیٹ سے سلور آئی نکال لے جانا چاہتے ہیں۔ اس وقت ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو بے موت مارے جائیں گے۔“

”یہ... یہ سلور آئی کا چکر ہے!“ جہانگیر میرا انکشاف سُن کر بوکھلا گیا۔ سیما کی رونے کی آواز بھی یکلخت تھم گئی تھی جیسے اس کا دورانِ خون ہی تھم گیا ہو۔

”ہم نے تو خود کھلا میدان چھوڑ کر انھیں سلور آئی نکال لے جانے کا موقع دیا ہے، پھر ان کی راہ روکنے والے کہاں سے پیدا ہو گئے؟“ وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”وہ مجرم ہیں، شہر میں ان کے بہتیرے دشمن ہو سکتے ہیں مگر اس وقت وہ یہی سمجھیں گے کہ سیما نے فون پہ ڈی ڈی کی دھمکی ملنے کے بعد اپنے حامیوں کو یہاں جمع کر لیا ہے۔ اس کی پوزیشن مخدوش ہو گئی ہے...“

”میں اسی خون خرابے سے ڈر رہی تھی۔“ میری بات کاٹتے ہوئے سیما کی روہانسی آواز ابھری۔ ”مگر یہ ہو کر ہی رہا۔ میری عقل ماؤف ہو کر رہ گئی ہے۔ اب کیا ہوگا...؟“

”سنو۔“ میں نے اس کے دونوں بازو مضبوطی سے تھام کر غصے سے اس کے پورے وجود کو جھنجوڑ ڈالا۔ ”تھوڑی ضبط سے کام لے کر مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو ورنہ تو ہم کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ ابھی تک سب کچھ عمارت باہر ہی ہو رہا ہے۔ ہمیں کچھ علم نہیں کہ کس کا پلہ بھاری ڈی ڈی کے آدمیوں کا داؤ چل گیا تو وہ بلڈنگ میں گھس مچا دیں گے۔ تمھارے فلیٹ کے ساتھ دوسرے گھر کی بربریت کا نشانہ بن جائیں گے۔“

”تت... تم سوچو... میں بالکل چُپ رہوں گی۔“ گھٹی گھٹی ہچکیوں کے درمیان بولی۔ اور پھر اس کی آواز وا معدوم ہو گئی۔ اسی اثنا میں جہانگیر دونوں بھرے ہوئے نکال لایا۔

باہر فائرنگ میں تواتر کے ساتھ شدت بھی پیدا ہو تھی معلوم ہو رہا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی میدان چھوڑ آمادہ نہیں تھا اور دونوں فریق اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے جم کر ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے تھے۔ فائرنگ کی ابتدا ہوتے ہی پے در پے کئی دردناک انسانی چیخیں فضا میں ابھری تھیں جو بے خبری میں کیے جانے والے ناگہانی حملے کا نتیجہ معلوم ہوتی تھیں لیکن سنبھالا لینے کے بعد دونوں مکاری سے مقابلہ کر رہے تھے۔ کلاشنکوف اور پستولوں کی جانے والی دھواں دھار فائرنگ کے نتیجے میں فضا ہوئے بارود کی بو سے بوجھل ہوتی جا رہی تھی لیکن ہر فائرنگ ایک دوسرے کو اپنی قوت سے مرعوب کر کے لیے کی جا رہی تھی کیونکہ انسانی چیخیں ان بارودی نغموں خال خال ہی سنائی دے رہی تھیں۔

ٹرانسفارمر میں لگنے والی آگ اس قدر شدید تھی کہ اس کے شعلے یقیناً میلوں دور تک دیکھے گئے ہوں گے۔ پھر اس کے دھماکے کے ساتھ پھٹنے پر پورا علاقہ بُری طرح لرز اٹھا تھا۔ پورے علاقے میں قیامتِ صغریٰ کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ انجن اپنی کارروائی بڑی حد تک نمٹانے کے بعد فائرنگ خوف سے فرار ہو چکے تھے۔ لیکن مجھے حیرت تھی کہ پولیس کا دور دور تک پتا نہیں تھا اور وہ علاقہ اپنے مکینوں سمیت شی اور مافیا کے بے رحم درندوں کے رحم و کرم پر رہ گیا تھا۔

یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے پولیس والے آگ، دھماکے اور فائرنگ سے واقف ہونے کے باوجود انجان بن گئے ہوں کہ کہیں اندھیرے میں وہ خود ہی لڑنے والوں کی بھٹکی ہوئی گولیوں کا نشانہ نہ بن جائیں۔ ٹرانسفارمر جل جانے کے بعد علاقے میں اس وقت تک دوبارہ روشنی بحال نہیں ہو تھی جب تک ٹرانسفارمر نہ بدل دیا جاتا۔ جب پولیس

نے سے گریز کر رہی تھی تو بجلی والے گولیوں کے سائے میں باہر آنے کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح یہ معرکہ آرائی صبح کا اجالا پھیلنے تک جاری رہ سکتی تھی۔ کیونکہ دن نکل آنے کے بعد چھپ کر گولیاں برسانا اتنا آسان نہ رہ جاتا۔ مقابلے میں اختصار کی امید بس اسی ایک حقیقت سے وابستہ تھی کہ دونوں طرف سے دل کھول کر اسلحہ استعمال کیا جا رہا تھا، اس فراخ دلی کے نتیجے میں دونوں میں سے کسی بھی فریق کا میگزین جلد ہی ختم ہو سکتا تھا۔ اجالا پھیلنے سے پہلے تصادم ختم ہونے کی بس وہی ایک امید باقی رہ گئی تھی۔

پھر اچانک ہی سڑک کے وسط سے کسی نے ہماری عمارت پہ کلاشنکوف کا برسٹ مارا اور ہم تینوں ہی غیر ارادی طور پہ بالکونی کے فرش پر گر گئے۔ سیما بری طرح خوفزدہ تھی۔ جہانگیر کے سر پر اس کی دلجوئی کا بھوت سوار تھا۔ اس لیے مجھ ہی کو اس بارے میں اپنے ذہن پر زور دینا پڑا۔ میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ فائرنگ اندھا دھند نہیں کی جا رہی تھی۔ بلکہ حملہ آور نے میرے پڑوس میں واقع سیما کے فلیٹ کی کھڑکیوں، دروازوں اور دیواروں کو اپنا نشانہ بنایا ہوا تھا۔ اس کی کلاشنکوف کی بیرل سے نکلنے والی چمک کے انعکاس میں میں نے دیکھا کہ وہ دو مسلح آدمی تھے جو پیشہ ور گوریلوں کی طرح سڑک کے وسط میں آسیبی سایوں کی طرح جمے ہوئے کھڑے تھے۔ وہ یقینی طور پہ شی کے ہی آدمی تھے کیونکہ انھوں نے سیما کے فلیٹ کو ٹارگٹ بنایا ہوا تھا جہاں ان کی ایک مقدس سلور آئی چھپی ہوئی تھی۔

ان میں سے ایک وقفے وقفے سے سیما کے فلیٹ پر نشانے بازی کی مشق کر کے اپنی دانست میں وہاں رہنے والی کو اپنی قوت سے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرا چوکنے انداز میں چاروں طرف نگرانی کر رہا تھا۔ اسے جدھر بھی ذرا سا شبہ ہوتا، اپنی کلاشنکوف سے ایک ہلکا سا برسٹ چلا دیتا تھا۔

ہم سڑک سے تقریباً ڈیڑھ منزل کی بلندی پر گہری تاریکی میں تھے۔ دشمن کے کم از کم دو آدمی واضح طور پر ہماری نگاہوں میں آ چکے تھے اور خوش نصیبی سے وہ ہمارے نشانوں کی زد میں بھی تھے۔

”اٹھو۔“ میں نے جہانگیر کا کالر پکڑ کر اسے گھسیٹا۔ سیما شاید دہشت سے بے ہوش ہو چکی تھی اور جہانگیر بوکھلاہٹ میں اس کے دل سے اپنا دل ملا کر غالباً تنفس بحال کرنے والی تدبیر آزمانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ اس کی جھلائی ہوئی غراہٹ بھی دھیمی ہی تھی۔ اپنی خدمتِ خلق میں میری مداخلت اسے ضرورت سے زیادہ ہی ناگوار محسوس ہوئی تھی۔

”یہ پکڑو!“ میں نے بھرا ہوا پستول اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے غرا کر کہا۔ ”وہ نیچے سڑک پر ہمارے دو دشمن کھڑے ناچ رہے ہیں۔ میں ایک دو تین کہوں گا۔ تین کہتے ہی ہمیں ان دونوں کو ایک ساتھ گولی مارنی ہے۔ ان میں سے ایک بھی زندہ بچ گیا تو ہماری یہاں موجودگی کا راز فاش ہو جائے گا۔ بچنے والا اپنے ساتھیوں کو ہماری طرف بھی متوجہ کر دے گا۔“

”پھر ایسا خطرہ کیوں مول لے رہے ہو؟“ وہ پستول لیتے ہوئے نیم دلی کے ساتھ بولا۔ ”خاموشی کے ساتھ یہاں دبک کر تماشا دیکھتے رہو۔ وہ دیواروں اور دروازوں پہ گولیاں برباد کر کے خود ہی واپس چلے جائیں گے۔“

”تم احمق ہو!“ میں نے جھلا کر کہا۔ ”یہ نہ بھولو کہ وہ ہمارے دشمنوں کے آدمی ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے والے ہمارے نادیدہ دوست یا ہمدرد ہیں۔ اپنے ہمدردوں کا ساتھ نہ دے کر ہم خود اپنی قبر تیار کر لیں گے۔ جو کہہ رہا ہوں پوری توجہ اور دھیان سے اس پر عمل کرنا، ذرا بھی چوکے تو وہ چھلاووں کی طرح غائب ہو جائیں گے۔“

”چلو! پھر شروع کر دو گنتی۔“ اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

میرے پستول کی نال پر سائلینسر چڑھا ہوا تھا جب کہ جہانگیر کے پستول پہ وہ آلہ موجود نہیں تھا۔ ہم دونوں نے اپنے ہاتھ سیدھے کیے۔ میں نے گنتی شروع کی اور تین کا لفظ ادا ہوتے ہی ایک دھماکے کے ساتھ دو گولیاں سڑک کے وسط میں موجود احمقوں کے جسموں میں پیوست ہو گئیں۔

ان میں سے ایک کی چیخ بہت طویل اور اندوہناک تھی جس میں موت کی دہشت رچی ہوئی تھی۔ گولی کھا کر وہ چیختا ہوا وہیں ڈھیر ہو گیا تھا لیکن دوسرا صرف زخمی ہوا تھا کیونکہ میں نے اس کو چیخ مار کر ایک طرف بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ تاریکی میں اس کا ہیولا بری طرح لنگڑا رہا تھا۔ شاید اس کی ٹانگ زخمی ہوئی تھی۔

وہ دونوں اپنی دانست میں بہت محفوظ تھے اس لیے ہماری فائرنگ نے ان کے اوسان خطا کر دیے۔ شدید زخمی ہونے والا تو شاید سڑک پر سسک سسک کر دم توڑ رہا تھا لیکن زخمی ہونے والا بھی جوابی فائر کرنا بھول کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ دوڑ کر میری زد سے باہر نکل جاتا، میں نے پے در پے تین بے آواز فائر کیے اور آخر کار وہ بھی ڈھیر ہو گیا۔ اس کی ایک ہی دلدوز

چیخ ابھری تھی پھر وہ خاموش ہوگیا۔ شاید کوئی گولی پشت سے اس کے دل میں اتر گئی تھی۔

ادھر میدان صاف ہوگیا تھا لیکن دوسری سمتوں میں ابھی تصادم جاری تھا۔ جہانگیر کو میرے اور مافیا کے معاہدے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا لیکن میں دل ہی دل میں مافیا والوں کی تنظیم اور پیش بینی کی داد دے رہا تھا۔ کامٹ نے فون پر پُراعتماد لہجے میں مجھے یقین دلایا تھا کہ اگر مجھ پر وقت آتا تو میں تنہا نہ ہوتا اور وقت نے کامٹ کے الفاظ کی صداقت ثابت کردی تھی۔ میری ان سے افہام و تفہیم ضرور ہوگئی تھی لیکن میں باقاعدہ ان کی صفوں میں شامل نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ یکطرفہ طور پر مجھے تحفظ فراہم کر رہے تھے جو بہت بڑی بات تھی۔

اس عمارت پر شی والوں کا دھاوا براہِ راست میرے لیے نہیں تھا بلکہ وہ سیما کی تحویل سے وہ سلور آئی نکال لے جانا چاہتے تھے جو اس کے شوہر ندیم کو ہیروئن کی کھیپ فریکفرٹ پہنچانے کے لیے شناخت کے طور پر دی گئی تھی۔ سلور آئی کا راز بعد میں میرے علم میں آیا تھا لیکن اس سے پیشتر میں کامٹ کو بتا چکا تھا کہ ڈی ڈی براہِ راست میری بڑوسن میں دلچسپی لے رہا تھا۔ میں نے اسے ندیم کی سرگرمیوں اور گرفتاری کے بارے میں بھی آگاہ کردیا تھا۔ اس لیے کامٹ کے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ شی والے اگر وہاں اسلحہ بند ہوکر آئے تھے تو ان کا نشانہ میں نہیں بلکہ سیما تھی مگر مافیا کراچی میں شی کا راستہ کاٹنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ اس لیے شی والوں کو اس بلڈنگ میں گھسنے سے روک دیا گیا تھا۔

شی کے دو آدمیوں کو خاموشی سے مار گرانے کے بعد میں خود کو بہت آسودہ محسوس کر رہا تھا۔ اس طرح میں اس مقابلے میں محض خاموش تماشائی نہیں رہا تھا۔ بدلتی ہوئی سمتوں سے تیز فائرنگ کا تبادلہ زور و شور سے جاری تھا۔ سیما بالکونی میں بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ ہم دونوں اسے سہارا دے کر اندر لے آئے اور پھر جہانگیر نے کھڑکیوں پر پردے کھینچ کر ایک بیٹری لیمپ روشن کردیا تھا۔

گھور تاریکی میں وہ روشنی بہت غنیمت تھی۔ سیما کی حالت کا جائزہ لینے کے لیے وہ روشنی بہت ضروری تھی۔ وہ عورت اپنے کردار کے اعتبار سے جیسی بھی رہی ہو لیکن اندر سے ایک ڈرپوک عورت ہی تھی۔ اس کا چہرہ خوف سے زرد پڑا ہوا تھا اور سینہ کسی لوہار کی دھونکنی کی طرح تیزی سے پھول پچک رہا تھا۔

"اسے مصنوعی تنفس کی نہیں، آرام کی ضرورت ہے۔"

میں نے جہانگیر کو انہماک سے سیما کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھ کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ "عورتوں کے بارے میں تم شاید فرسٹ ایڈ کے اسی ایک اصول سے واقف ہو؟"

اس نے قہر بار نظروں سے مجھے گھورا۔ لبوں میں تھرتھراہٹ جنبش بھی ہوئی لیکن وہ کچھ بول نہ سکا۔

اچانک فضا ایک ہولناک دھماکے سے لرز اٹھی۔ یہ دھماکا اتنا شدید تھا کہ سیما بھی صوفے پر اچھل کر رہ گئی اور جہانگیر کی آنکھوں میں تشویش کے سائے گہرے ہوگئے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ مقابلے کو فیصلہ کن بنانے کے لیے کسی نے دستی بموں کا استعمال شروع کردیا ہے۔" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "پتا نہیں پولیس کہاں رہ گئی ہے!"

"میدان خالی ہونے کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس قدر خونیں مقابلے میں کون اپنی جان داؤ پر لگائے گا۔"

"میں پولیس کی بات کر رہا ہوں جسے تنخواہ ہی امن و امان قائم رکھنے کے لیے دی جاتی ہے۔" میرے مضحکانہ لہجے پر وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ "اگر وہ اس وقت سو رہے ہیں تو پھر کب کام آئیں گے؟"

"ٹھنڈے دل سے سوچو، پولیس والے فولادی روبوٹ یا سپرمین نہیں ہوتے، ہمارے تمھارے جیسے آدمی ہوتے ہیں۔ انھیں بھی جان پیاری ہوتی ہے۔ کلاشنکوف اور دستی بم کے سامنے وہ بے چارے اپنی بندوقوں سے کسی کا کیا بگاڑ سکیں گے...؟"

"مجھ سے بلاوجہ نہ الجھو۔" وہ مجھے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "بندوقوں کا زمانہ بدل گیا۔ اب پولیس والوں کو بھی خودکار اسلحہ، تیز رفتار گاڑیاں اور مواصلاتی سہولتیں ملی ہوئی ہیں۔ تم دیکھ لینا کہ آج رات یہاں کم از کم دس پندرہ آدمی مارے جائیں گے اور کوئی ان کا پُرسان حال نہ ہوگا۔"

"آخر پولیس والے اپنی جان کا خطرہ کیوں مول لیں۔ زخمی ہونے پر دو سو روپے اور مرنے پر پانچ ہزار روپے کا نقد انعام اور تعریفی سند ان کے یا ان کے پسماندگان کے کس کام آسکے گی۔ اس سے کئی گنا رقم تو ہر سپاہی ان لوگوں سے وصول کرسکتا ہے جو اس تصادم کے خاتمے پر شُبہے کی بنیاد پر حراست میں لیے جائیں گے۔ ہر زیرِ حراست قیدی اپنی ساری بے گناہی کے باوجود بڑی خوشی سے اتنی رقم ادا کرنے پر آمادہ ہوجائے گا۔"

"تم ہی جیسے لوگوں نے اس ملک کا بیڑا غرق کیا ہوا ہے۔" وہ جھلّا کر بولا۔ "ہر چیز کو پیسے کے ترازو میں تولتے ہو۔ انسانی خون کا احترام، فرائضِ منصبی کا احساس، ملک اور معاشرے سے محبت اور ضمیر کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی ہے۔"

"یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں مائی ڈیئر!" میں نے اسے مزید چڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ بہشتی زیور اور توبۃ النصوح جیسی کتابوں میں ہی باقی رہ گئی ہوں گی۔ اب تو ہر طرف پیسہ چلتا اور بولتا ہے۔ تمھیں بھی یہ سب آج یاد آرہا ہے۔ بارہ سال پہلے تم کیا تھے اور تمھاری سوچ کیا تھی؟"

"یعنی تمھیں یقین ہے کہ پولیس نہیں آئے گی؟" اس نے خفت آمیز ہنسی کے ساتھ اپنی ذات کو موضوع کی زد سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آئے گی، لیکن یہ دھواں دھار برسات ختم ہونے کے بعد۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "ابھی واردات جاری ہے۔ یہ مکمل ہوجائے گی تو قانون کا آہنی ہاتھ حرکت میں آجائے گا۔"

میں مزید کچھ کہنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اچانک ہی فون کی گھنٹی چیخ پڑی تھی۔ باہر ہونے والی زبردست فائرنگ اور دھماکوں کے درمیان فون کی گھنٹی کی آواز مجھے بڑی عجیب سی محسوس ہوئی تھی اور میں نے لپک کر انسٹرومنٹ کا ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی "ہیلو" کامٹ کہا گیا تھا۔

جواب میں میں نے شوٹر کہتے ہوئے محسوس کیا کہ کامٹ کی آواز سرد اور خاصی سنجیدہ تھی۔ "تم کہاں ہو؟ آج تو باہر ہر طرف آگ اور بارود کا راج ہے۔ شاید فون پر بھی تم دھماکوں کی آوازیں سُن رہے ہوگے۔"

"تصادم ہماری توقع سے کہیں زیادہ شدید ہوا ہے۔ تمھیں اس عورت سے کیا معلوم ہوا؟"

"عورت کے پاس سلور آئی موجود ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ لوگ اس کے فلیٹ پر پوری قوت کے ساتھ دھاوا بولیں گے، لیکن میرے پاس تمھیں مطلع کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔"

"یہ سلور آئی کیا بلا ہے؟" اس معاملے میں وہ بالکل کورا معلوم ہو رہا تھا۔

"سونے پر چاندی سے ڈھلی ہوئی ایک خواب ناک انسانی آنکھ جسے یورپ میں شی کے بڑے اپنے منصب کی شناخت کے لیے استعمال کرتے ہیں...!"

"لیکن تم نے تو بتایا تھا کہ سیما کا شوہر شی والوں کا ایک معمولی کیریئر تھا جو تیسری کوشش کرتے ہوئے یورپ میں پکڑا گیا تھا!" اس نے میری بات کاٹ کر تحیّر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"تم نے مجھے اپنی بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا۔" پھر میں نے مختصر ترین الفاظ میں اسے سیما کی تحویل میں پہنچنے والی سلور آئی کی کہانی سنا دی۔ اپنے پاس پہلے سے موجود سکّوں کا ذکر کیے بغیر میں نے اسے یہ بھی بتادیا کہ سلور آئی کی اہمیت کے پیشِ نظر سیما کی گلو خلاصی کے لیے میں نے وہ سکّہ اس کے فلیٹ ہی میں چھوڑ کر اسے اپنے پاس بلا لیا تھا۔

"یہ تم نے بہت بُرا کیا۔" میری بات مکمل ہونے پر وہ متاسفانہ لہجے میں بولا۔ "ڈان کے لیے سلور آئی دلچسپ ثابت ہوسکتی تھی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم اب فلیٹ میں جاکر وہ سکّہ نکال لاؤ؟"

"فی الحال ناممکن ہے۔ سیما دہشت سے بے ہوش ہوگئی ہے۔ مجھے علم نہیں کہ اس نے سلور آئی کہاں رکھی ہے۔ اندھیرے میں میرے لیے اسے تلاش کرنا دشوار ہوگا۔" میں نے صفائی سے جھوٹ بولا۔ حالانکہ سیما مجھے بتا چکی تھی کہ اس نے سلور آئی دوسرے سکّوں اور ندیم کے ذاتی استعمال کے کچھ کاغذات کے ساتھ اس کے ایک بلیزر کی جیب میں ڈال دی تھی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ سلور آئی بازیاب نہ ہونے کی صورت میں شی والے قبر تک بھی سیما کا پیچھا نہ چھوڑتے اور ہر اس ٹھکانے کو تہ و بالا کردیتے جہاں اس کی یا سلور آئی کی موجودگی کا ذرا بھی شُبہ ہوتا۔

"وہ کب تک ہوش میں آجائے گی؟" کامٹ نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

"کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہماری کوششیں جاری ہیں۔ وہ بری طرح دہشت زدہ ہوگئی تھی۔"

"تمھارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

مجھے اپنی بے احتیاطی پر افسوس ہوا کیونکہ میں روانی میں ہماری کوششیں کہہ بیٹھا تھا۔ اس لیے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ "میرا ایک دوست ہے لیکن ان معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس وقت بھی وہ دوسرے کمرے میں سیما کو ہوش میں لانے کی کوششیں کر رہا ہے۔"

"پھر تو وہ جہانگیر ہوگا۔" اس کی پُراعتماد آواز اُبھری۔ میرے بارے میں وہ مردود بہت زیادہ باخبر تھا۔ "کل رات بھی جب پلاسٹک کا گڈا تمھاری کار میں رکھا گیا تو شاید تم اسی کے گھر گئے تھے۔"

"میں انکار نہیں کروں گا لیکن احتجاج ضرور کروں گا کہ تم باقاعدہ میری نگرانی کرا رہے ہو۔"

"نگرانی نہیں، حفاظت کہو۔" وہ آہستگی سے بولا تھا۔ "محافظوں کو اپنے ہتھیار سنبھال کر ہر وقت تمھارے قریب رہنا ہوتا ہے ورنہ تمھارے خون کے پیاسے تمھیں کہیں بھی گھیر سکتے ہیں۔"

"انھوں نے تو اس وقت بھی گھیرا ڈالا ہوا ہے۔ یہ اور

بات ہے کہ وہ اپنے حصار میں میری موجودگی سے بے خبر ہیں جب کہ میں ان کے دو آدمیوں کو موت کی نیند سلا چکا ہوں۔“
”تمھارے پاس کچھ اسلحہ موجود ہے؟“ تحیر آمیز اور تائید طلب لہجے میں سوال کیا گیا۔
”کم از کم اپنا دفاع کر سکتا ہوں۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔
”بس مجھے یہی فکر تھی اور اس وقت فون کرنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ ان لوگوں نے سارا دباؤ بلڈنگ کے داخلی راستے پر ڈالا ہوا ہے۔ میرے آدمیوں کا میگزین تیزی سے ختم ہو رہا ہے مگر وہ مزاحمت کر رہے ہیں۔ میں نے میگزین روانہ کر دیا ہے لیکن انھیں کمک ملنے میں ذرا بھی تاخیر ہوئی تو شی والوں کو تمھاری بلڈنگ میں گھسنے کا موقع مل جائے گا۔ اس کا امکان بہت کم ہے لیکن پھر بھی تمھیں متوقع خطرے سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔“ وہ جلدی جلدی بولتا چلا گیا۔
”اور اتنی اہم بات بتانے میں تم نے اتنی دیر لگا دی؟“ میں نے تعجب سے کہا۔
”دوسری باتیں بھی اسی قدر اہم تھیں۔ تمھیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وقتی طور پر وہ دباؤ ڈال کر اندر گھسنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو زندہ واپس نہ لوٹ سکیں گے۔ اس بار میں نے میگزین کے ساتھ آتش گیر اور دھوئیں کے دستی بم بھی بھیجے ہیں۔ میرے آدمی ان کے چھکے چھڑا دیں گے۔“
”تم فکر نہ کرو، میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی زندگی کے لیے لڑنے کا عادی ہوں۔ تمھارے آدمی کامیاب نہ بھی ہوئے تو میں اپنا دفاع کر لوں گا۔ ویسے ہمدردی اور اطلاع دینے کا شکریہ۔“
دوسری طرف سے کوئی جواب دیے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔
اس فون کال پر جہانگیر تجسس کا شکار ہو گیا اور میں نے اسے اصل معاملے سے آگاہ کیے بغیر صرف اتنا بتایا کہ میں نے اپنی معاونت کے لیے کرائے کے کچھ محافظوں کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ ان ہی کے نگران نے فون کر کے میری خیریت دریافت کی تھی کیونکہ وہ نیچے ہونے والی بے لگام فائرنگ سے میرے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔
”لیکن اس کا سیما اور سلور آئی سے کیا تعلق پیدا ہو گیا؟“ جہانگیر نے اشتباہ آمیز لہجے میں سوال کیا۔
”محافظوں کو جب تک متوقع خطرات کے پورے پس منظر سے واقفیت نہ ہو، وہ اپنا کام پوری تن دہی سے سرانجام نہیں دے سکتے۔ میری بات سن کر ابھی اس نے بتایا ہے کہ

لڑنے والوں میں سے ایک حریف کا پلہ بھاری پڑ رہا ہے
اس دوران میں میرے کان فائرنگ کی آوازوں پر لگے رہے اور میں نے محسوس کیا کہ کسی ایک جانب سے پوری شدومد کے ساتھ گولیاں چلائی جا رہی تھیں لیکن جوابی فائرنگ کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا۔ وہ لوگ اپنے حریفوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے وقفے وقفے سے فائرنگ کر رہے تھے۔
”یہ تو سیدھی سی بات ہے کہ شی والے سیما کے فلیٹ میں گھس کر سلور آئی حاصل کرنے پر تلے ہوئے ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ ان کا راستہ روکنے والے کون ہیں؟“ جہانگیر بولا۔
”یہ واقعی سوچنے والی بات ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”دیکھا جائے تو وہ لوگ ہمارے ہمدرد بھی ہو سکتے ہیں لیکن ان مسائل پر بعد میں غور کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال مجھے خطرہ سر پر منڈلاتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اگر شی والے اس عمارت میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تو وہ جھلاہٹ میں کسی فلیٹ کو نہیں بخشیں گے۔“
”پھر کیا کیا جائے؟ اس وقت تو سیما بھی بے ہوش ہے اور سب سے بڑا خطرہ تو اسی کو لاحق ہے۔“
”اس وقت فلیٹ سے باہر قدم نکالنا موت کے منہ میں جانے کے برابر ہو گا۔ میری رائے ہے کہ ہم تینوں کو [illegible] مسہری کے نیچے چھپ جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ اندھیرے میں اس طرف توجہ نہ دیں۔“
”لیکن سیما کا کیا ہو گا؟“ اس کے دل و دماغ پر وہی سوار [illegible]
”اسے بھی اٹھا کر مسہری کے نیچے لے جائیں گے۔ ہوش میں آ گئی تو اسے خاموش رکھنا تمھاری ذمے داری ہو گی۔ تم ویسے بھی مصنوعی تنفس کے ماہر اعظم ہو۔“ میں نے اس [illegible] بریف کیس بند کر کے صوفے کے نیچے ڈالتے ہوئے کہا۔
وہ مجھے گھور کر رہ گیا۔ پھر ہم دونوں نے بے ہوش سیما کو خواب گاہ میں لے جا کر مسہری کے نیچے دھکیلا۔ پستولوں کے علاوہ بم گن بھی ساتھ لی اور بیٹری لیمپ گل کر کے خود بھی اندھیرے میں مسہری کے نیچے رینگ گئے۔ اس آخری اقدام میں جہانگیر نے عجلت سے کام لیا تھا تاکہ اسے سیما کے قریب رہنے کا موقع مل سکے۔ لیکن میں سب کچھ سمجھنے کے باوجود دانستہ خاموش رہا۔
”یہ تمھارے کرائے کے محافظ کہاں سے پیدا ہو گئے؟“ مسہری کے نیچے گرد آلود قالین پر گھٹن میں کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جہانگیر کی زبان میں خارش شروع ہو گئی۔
”اس شہر میں پیسہ خرچ کر کے کرائے کے قاتل تک حاصل کیے جا سکتے ہیں، پھر محافظوں کا حصول تو بہت آسان ہے۔ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ وہ لوگ اس مقابلے میں شریک نہیں ہیں بلکہ خاموش تماشائی ہیں۔“
”یہ وہی تو نہیں جو اسلحے کی بات کرنے کے لیے کل رات تمھارے پاس آنے والا تھا؟“ اس نے از خود ہی ایک بھولی ہوئی بات مجھے یاد دلا دی۔ مجھے یاد آ گیا کہ پچھلی رات جہانگیر کی موجودگی میں کامسٹ کا فون آیا تھا۔ اس وقت جہانگیر فلم دیکھنے میں محو تھا اور کامسٹ مجھ سے ملنے کے لیے آنے والا تھا۔ اس لیے میں نے جہانگیر کو یہ بہانہ کر کے مشکل ٹالا تھا کہ مجھ سے اسلحے کے سودے کے لیے کوئی ملاقاتی فلیٹ پر آنے والا تھا اس لیے اس کی موجودگی مناسب نہیں تھی۔
”اوہ، تو میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا تھا۔“ میں نے انجانے پن کی اداکاری کرتے ہوئے حیرت سے کہا۔ ”وہی ہے۔ جس سے معاملہ طے ہوتا ہو بس اسی سے ملتا ہے، دوسروں سے غیر ضروری طور پر ملنا پسند نہیں کرتا۔ اسلحے کی سوداگری کے ساتھ اجرت پر بہتیرے کام کرتا ہے۔ فی الحال میں نے اپنی حفاظت پر لگا لیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں دلدار کو ٹھکانے لگانے کا سودا بھی اسی سے کر لوں۔“
”کام کا آدمی مل گیا ہے تو اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔“ وہ سنجیدگی کے ساتھ بولا۔ ”ٹھیکیداری اس دور میں زندگی کو بہت آسان بنا دیتی ہے۔ تمھیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک مقررہ رقم خرچ کر کے کیا نتائج حاصل کر سکو گے۔ آج کل تو ہر سمجھ دار صنعت کار بھی اس راستے پر چل پڑا ہے۔ ورکر رکھو تو ان کے ہزار نخرے ہوتے ہیں۔ بیسیوں سرکاری محکموں کو رشوت دینا پڑتی ہے۔ پھر کبھی اولڈ ایج کا چکر نکل آتا ہے کبھی سوشل سیکورٹی دینا پڑتی ہے۔ یونین بن جائے تو کھایا پایا سب یاد آ جاتا ہے۔ ہر شخص حرام خوری پر تل جاتا ہے اور کام کیے بغیر تنخواہ لینے کی فکر میں رہتا ہے۔ میں فیکٹری میں ٹھیکے پر کام کراتا ہوں۔ یہ لوگ اتنے ہی معاوضے پر ڈیڑھ گنا پروڈکشن دیتے ہیں۔ جب چاہتا ہوں فیکٹری چلاتا ہوں، کام نہ ہو تو کاریگروں کو ہفتوں کے لیے گھر بٹھا دیتا ہوں جس کے لیے مجھے ایک پیسہ نہیں دینا پڑتا۔ میری مانو تو کراچی میں [illegible] کرو اور پیشہ ور قاتلوں کو اور مجرموں کو کام کے ٹھیکے دیتے رہو۔ چاہو تو اسی طرح غزالہ کو بھی اٹھوا سکتے ہو۔“
”تمھارا دماغ چل گیا ہے جہانگیر!“ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”غزالہ تمھاری فیکٹری کے کسی پرزے کا نام نہیں ہے جسے میں ٹھیکے پر چوری یا اغوا کرا لوں۔ میں نے زبردستی اس پر قابض ہونا چاہا تو وہ نفرت اور حقارت سے میرے منہ پر تھوک دے گی۔ اپنی ٹھیکے داری اور منافع خوری اپنی فیکٹری تک محدود رکھو۔ اسے میری ذات تک وسعت دینے کی کوشش نہ کرو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کون سا کام کب اور کیسے کیا جا سکتا ہے۔“
وہ خاموش ہو گیا اور اسی کے ساتھ میں نے محسوس کیا کہ فضا پر بوجھل سا سکوت طاری ہو چلا تھا۔ فائرنگ کی گھن گرج دم توڑ چکی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس طرح اکا دکا فائر ہو رہے تھے جیسے اپنے مورچوں میں قریب المرگ پڑے ہوئے سپاہی کسی امدادی پارٹی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے تھکے تھکے انداز میں بے مقصد فائر کر رہے ہوں۔ میرے لیے وہ تبدیلی بہت خوف آور تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ مافیا والوں کو کمک ملنے سے پہلے ان کا میگزین ختم ہو گیا تھا اور شی والے کسی بھی لمحے دندناتے ہوئے بلڈنگ میں داخل ہو سکتے تھے۔
وہ لمحہ میری توقع سے کہیں زیادہ تیزی سے آ گیا۔ بلڈنگ کے زینوں میں پے در پے کئی فائروں کی گونج ابھری جس سے فلیٹ کے در و دیوار تک جھنجھنا اٹھے۔ ایک دہشت زدہ مردانی چیخ سنائی دی۔ شاید کسی کونے کھانچے میں دبکے ہوئے چوکیدار کو گھسیٹ کر زخمی یا بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ اور پھر زینے متعدد وزنی جوتوں کی وحشیانہ دھمک سے لرزنے لگے۔
”وہ آ گئے!“ جہانگیر کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ ”خطرہ دیکھتے ہی میں بے دریغ گولی چلا دوں گا۔“
”میری مرضی کے بغیر دم بھی نہ ہلانا۔“ میں نے سرد اور سخت لہجے میں کہا۔ ”میں تم سے آگے ہوں۔ خطرہ ہوا تو پہلے مجھے نظر آئے گا۔ اس وقت کی ذرا سی لغزش ہمیں موت کے جہنم میں دھکیل دے گی۔ اور...“
میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ آنے والے آخر کار میرے فلیٹ پر بھی آ پہنچے تھے۔ انھوں نے ڈور بیل کے لیے بجلی کی سپلائی پہلے ہی منقطع کر دی تھی۔ لہٰذا دھمکی آمیز غراہٹوں کے ساتھ وحشیانہ انداز میں دروازہ پیٹا جا رہا تھا۔
”وہ اندر آنا چاہ رہے ہیں۔“ جہانگیر خوف زدہ آواز میں منمنایا۔ ”مسہری کے نیچے تو ہم کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔“
”سانس روکے یونہی پڑے رہو۔“ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صورت حال سے میں خود بھی نروس ہو گیا تھا۔ مجھے شی والوں کا اندازہ ضرور تھا لیکن یہ امید نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی کے ساتھ میرے دروازے پر بھی آ

پہنچیں گے۔ باہر راہداری میں عجیب ملا جلا شور گونج رہا تھا۔ میرے فلیٹ کے ساتھ ہی سیما کا دروازہ بھی پیٹا جا رہا تھا۔ پھر شاید کسی نے قفل پر فائر کیا۔ ایک زوردار دھماکا گونجا جیسے کئی آدمیوں نے اپنے شانے ملا کر دروازے پر ضرب لگائی ہو۔ اسی کے ساتھ تیز چرچراہٹ کے ساتھ وزنی چوبی پٹ اندر گرنے کا دھماکا سنائی دیا جو یقیناً میرے فلیٹ کا نہیں تھا۔ غالباً وہ لوگ سیما کے فلیٹ کا دروازہ توڑ کر اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

وقت کو پر لگ گئے تھے اس تمام کارروائی میں یقیناً چند منٹ صرف ہوئے ہوں گے لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سب پلک جھپکتے میں ہو گیا ہو۔ اوپری منزلوں سے بھی چیخ و پکار اور دھما چوکڑی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید ان لوگوں نے ایک ہی وقت میں اس بلڈنگ کے آٹھوں فلیٹوں میں گھسنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

چند لمحے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ ہمارے دروازے کے قفل پر بے خوفی سے فائر کیا گیا اور اندر جلتے ہوئے بارود کی بو پھیل گئی اور پھر دروازہ اکھڑ کر پُرشور آوازوں کے ساتھ اندر آ گرا۔

میرا حیوانی احساس پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ آنے والوں کے قدموں کی ہلکی سی دھمک سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ تعداد میں دو تھے۔ اندر گھس کر وہ براہِ راست اسی خواب گاہ میں آئے تھے جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔

"یہ فلیٹ تو خالی محسوس ہوتا ہے۔" ایک کھردری اور متوحش آواز سنائی دی۔ لمحہ بھر کے لیے میرے دل میں لالچ آیا کہ برابر کی ٹکر تھی، وہ دو تھے اور ہم بھی دو ہی تھے۔ ان پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ لیکن میں نے فوراً ہی اپنا وہ خیال ترک کر دیا۔ فلیٹ میں وہ دو ہی تھے لیکن عمارت ان کے حامیوں سے بھری ہوئی تھی۔ تصادم کا ذرا بھی اشارہ ملتے ہی وہ سب اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے آ سکتے تھے۔

ان کے پاس ٹارچیں موجود تھیں۔ جن کی روشن لکیریں کمروں میں چکراتی پھر رہی تھیں۔

"الماریاں توڑ دو اور سوٹ کیسوں کے ڈھکنے اکھاڑ دو۔" دوسری آواز نسبتاً پرسکون تھی۔ "اور جو قیمتی چیز نظر آئے وہ ایک کپڑے میں باندھ لو۔ گرین سگنل کسی بھی وقت مل سکتا ہے تم یہ کمرا سنبھالو، میں دوسرے کمرے دیکھتا ہوں۔"

اس خواب گاہ میں فوراً ہی بے رحمانہ توڑ پھوڑ کا آغاز ہو گیا۔ اس وقت پوری بلڈنگ میں عورتوں، بچوں اور مردوں کی آہ و بکا سے ایسا مہیب سماں بندھ گیا تھا جیسے تاریکی کا فائدہ اٹھا کر بھوکے درندوں کا کوئی غول اس بلڈنگ میں گھس آیا ہو۔ اس خواب گاہ کے ساتھ ہی دوسرے کمروں سے بھی توڑ پھوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں جن کا بظاہر کوئی مقصد نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ وہ لوگ جتنی آسانی سے عمارت میں داخل ہوئے تھے، اتنی آسانی کے ساتھ واپس لوٹ سکیں گے کیونکہ اس وقت تک مافیا والوں کو مزید اور گولہ بارود کی کمک مل چکی ہوگی اور وہ بھرے ہوئے ہتھیاروں کے ساتھ شی والوں کے استقبال کے لیے تیار ہوں گے۔

پھر اچانک اسی منزل پر کہیں سے سب مشین گن کا ہلکا سا برسٹ مارا گیا۔ جس کا شور سنتے ہی ہماری خواب گاہ میں موجود شخص دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

شاید اس پوری مہم کی سربراہی وہ ٹیم کر رہی تھی جس نے سیما کے فلیٹ پر حملہ کیا تھا۔ ان لوگوں نے سلور آئی ہاتھ آتے ہی سب مشین گن کا برسٹ مار کر اپنے تمام ساتھیوں کو کام مکمل ہونے کا سگنل دیا اور دوسرے فلیٹوں میں موجود لٹیرے مالِ غنیمت سمیت فوراً ہی فرار ہو گئے۔

ہماری خواب گاہ میں آنے والوں کی گفتگو سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ فلیٹ میں توڑ پھوڑ کر کے کچھ قیمتی چیزیں نکال لے جانا چاہتے تھے تاکہ اس پوری واردات میں سیما کے فلیٹ کو کوئی خصوصی اہمیت حاصل نہ ہو سکے۔ سلور آئی کی تلاش کے دوران وہ ایسے حالات پیدا کر دینے کے خواہاں نظر آتے تھے جن کی بنا پر پولیس اور دوسرے تفتیشی ادارے اسے اجتماعی ڈکیتی کی ایک منظم اور بڑی واردات تصور کر کے بھول بھلیوں میں الجھ جائیں۔

وہ سب دندناتے ہوئے زینوں سے تقریباً ایک ساتھ ہی اترے تھے، میں مسہری کے نیچے دبکا، مافیا کے جیالوں کی ہولناک چاند ماری کا منتظر تھا لیکن اس بار ایک گولی بھی نہ چلی۔ فضا میں ماتم اور نوحوں کی وہ کرب آلود آوازیں گونج رہی تھیں جو لٹنے والوں کے دلوں کو چیر کر بلند ہو رہی تھیں۔

"ابھی ٹھہر جاؤ، ہو سکتا ہے کہ آس پاس کوئی موجود ہو۔" جہانگیر نے مجھے مسہری کے نیچے سے سرکتے ہوئے دیکھ کر میرا بازو تھام کر سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"دِلّی لُٹ گئی جہانگیر صاحب! اب میدان صاف ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ اور دل میں سوچا کہ کامث کی ساری کمک اور شیخی دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ اپنے گھٹیا

ٹیک کر بھی شی والوں کو ان کے عزائم سے باز نہ رکھ سکا۔ دونوں طرف سے ہونے والے جانی نقصان کے موازنے سے ہی اس معرکے میں فتح اور شکست کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکتی تھی۔

ہم دونوں نے باہر نکل کر فلیٹ کا جائزہ لیا تو جہانگیر سر پکڑ کر رہ گیا۔ پورے فلیٹ کی حالت چند منٹ میں تہ و بالا کر دی گئی تھی جیسے وہاں بند دروازوں کے درمیان دیر تک کئی مست سانڈ لڑتے رہے ہوں۔ الماریوں کے پٹ کھلے ہوئے تھے یا قبضوں سے اکھاڑ دیے گئے تھے، سارا سامان قالین، صوفوں اور بستروں پر یوں بکھرا ہوا تھا جیسے عجلت میں تلاشی لی گئی ہے۔ لیکن ڈرائنگ روم میں صوفے کے نیچے رکھا ہوا جہانگیر کا بریف کیس جوں کا توں موجود تھا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ آنے والوں نے تلاشی کے معاملے میں سنجیدگی یا محنت سے کام نہیں لیا تھا۔ بلکہ ساری توجہ تلاشی کا سماں پیدا کرنے میں مرکوز کر دی تھی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے تھے۔

"یہ تو ڈکیتی معلوم ہوتی ہے۔ حرامزادوں نے ہر چیز کو تہس نہس کر دیا ہے۔" جہانگیر غصے اور بے بسی کے عالم میں بولا۔

میں نے اس کی تصحیح کی ضرورت نہیں سمجھی۔ "آؤ ذرا سیما کا فلیٹ بھی دیکھیں۔"

"پہلے اسے مسہری کے نیچے سے تو نکال لو، وہ ابھی تک وہاں بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔" وہ چونک کر بولا۔

"فی الحال وہ وہیں محفوظ ہے۔ جب تک ہم اکھڑے ہوئے قبضوں پر جھولتے ہوئے دروازے کو بند کرنے کا بندوبست نہ کر لیں، اس نامحرم عورت کا پردے سے نکلنا خطرناک ہوگا۔"

"تم مذاق کر رہے ہو؟" وہ وحشت زدہ آواز میں بولا۔ "ایسی اعصاب شکن گھڑیاں گزار کر بھی تم میں مذاق کرنے کی ہمت باقی ہے؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے سنگدل ہو گئے ہو۔"

"یہ لو۔" میں نے بیٹری لیمپ روشن کر کے اسے تھما دیا۔ "میں یہیں رُک کر دروازہ کھڑا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، تم ذرا اوپر کی منزلوں کا جائزہ لے آؤ۔ ان لوگوں کے تجربات کی روشنی میں ہمیں پولیس کے آنے سے پہلے اپنی کوئی کہانی تیار کر لینی ہے تاکہ ہمارا بیان دوسروں سے مختلف نہ ہو۔"

وہ مجھے گھورتا ہوا خاموشی کے ساتھ چلا گیا اور میں اندھیرے میں تنہا رہ گیا۔ جہانگیر کے سامنے میں نے خود کو بے خوف ظاہر کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ گزرے ہوئے خون آشام لمحات نے میرے اعصاب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس پہلے ہی ٹکراؤ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ میں شی کے مقابلے میں ایک پھسڈی گھوڑے پر داؤ لگانے جا رہا تھا جو کسی بھی اہم مرحلے پر مجھے ٹریک پر گرا کر خود اپنے سُموں سے روند سکتا تھا۔

میں نے جہانگیر کے بریف کیس سے اسکاچ کی بوتل نکالی اور ڈھکن کھول کر بوتل سے ہی دو لمبے لمبے گھونٹ معدے میں اتار لیے۔ دہانے سے معدے تک آگ کی سی ایک لکیر اتر گئی لیکن میری کھوپڑی کچھ چمک اٹھی۔

اس فلیٹ کا دروازہ بالکل ہی نہیں اکھڑا تھا۔ بلکہ آخری قبضے کے سہارے چوکھٹ سے جھول رہا تھا۔ اسے چوکھٹ میں کھڑا کرتے ہوئے میری ذہنی رَو ایک مرتبہ پھر کامث کی طرف بہک گئی جس نے بڑے وثوق کے ساتھ اپنے میگزین اور دستی گولہ بارود بھیجنے کا وعدہ کیا تھا اور اسے پورا کرنے میں بُری طرح ناکام رہا تھا۔ اگر خطرہ بھانپ کر میں نے مسہری کے نیچے پناہ لینے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو ہمارا انجام کچھ زیادہ قابلِ رشک نہ ہوتا۔

میرے نقطۂ نظر سے وہ تصادم بالکل بے سود رہا تھا۔ ہاتھی کو گرانے کی کوششوں میں چیونٹی بدحال ہو گئی تھی اور ہاتھی مستانہ وار اپنی راہ پر چلتا رہا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ اس ٹکراؤ میں دونوں طرف کے آدمی ہلاک اور زخمی ہوئے تھے جو لامحالہ پولیس کے ہاتھ لگتے اور یوں شہر میں دو حریف گروہوں کی موجودگی کا راز زیرِ زمین دنیا سے نکل کر قانون کے محافظوں کی کتابوں میں درج ہو جاتا جو نہ شی کے لیے سودمند ہوتا اور نہ مافیا کے لیے۔

کامث نے مافیا کی جانب سے اس رات جس ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا اس کی بنا پر میں یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ اس تصادم کے بعد شاید مافیا کا ایک گروہ کے طور پر وجود ہی باقی نہ رہے۔

دروازہ چوکھٹ میں پھنس گیا۔ تالا فائر کر کے تباہ کر دیا گیا تھا اس لیے میں نے اوپر کا بولٹ لگا کر دروازہ اسی جگہ اٹکا دیا۔ اور فرش پر بکھرے ہوئے وہ پیچ اکھٹے کرنے لگا جو اوپر کے اکھڑے ہوئے قبضوں سے نکلے تھے۔ اندھیرے میں ٹٹولنے کا کام خاصا مشکل تھا اس لیے میں نے دیا سلائی روشن کر لی۔

اسی وقت دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جہانگیر اوپر کی تین منزلوں کے چھ فلیٹوں کا جائزہ لے کر اتنی جلدی کیسے واپس آ گیا مگر میں نے دروازہ کھولا تو راہداری کے گھور اندھیرے میں بیٹری لیمپ کے

بغیر ایک تاریک انسانی ہیولے کو اپنے مقابل دیکھ کر چونک پڑا تھا۔

میرے اعصاب تن گئے تھے اور میں اچھل کر نو وارد کا گلا دبوچنے کے لیے تیار ہو گیا تھا کہ وہ میرے تیور بھانپ کر ایک دم بول پڑا۔ "مجھ پر حملہ نہ کرنا، میں سلطان شاہ ہوں۔"

میرے پھیپھڑوں سے بے اختیار ایک گہرا سانس آزاد ہو گیا اور میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اندر گھسیٹ لیا۔ اس کوشش میں اکھڑا ہوا پٹ میری گرفت سے آزاد ہو کر پرشور آواز کے ساتھ دوبارہ گر گیا۔

"یہ... یہ سب کیا ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟" سلطان شاہ دبی دبی تشویش زدہ آواز میں بولا۔ "میں پچھلے آدھے گھنٹے سے اس علاقے میں پھنسا ہوا تمہارے پاس آنے کا منتظر تھا لیکن اس بلڈنگ کے گرد تو باقاعدہ محاذ کھلے ہوئے تھے اور مورچا بند فائرنگ ہو رہی تھی۔"

"لمبی کہانی ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم اس وقت کیسے آئے؟" میں نے اندھیرے میں اندازے کی بنا پر ڈرائنگ روم کی طرف اس کی رہنمائی کرتے ہوئے سوال کیا۔

"میں تم سے ملنے اور یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ آج سے میں نے جاز فارماسیوٹیکل میں ڈیوٹی دینا شروع کر دی ہے لیکن تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ یہاں تو ہر طرف تباہی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔"

میں نے اختصار کے ساتھ اسے سارے واقعات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "جہانگیر اوپر والے فلیٹوں کا جائزہ لے کر واپس آنے والا ہے۔ اس کے سامنے بھول کر بھی مافیا کا نام نہ لینا۔ اسے بس اتنا ہی معلوم ہے کہ سیما کی تحویل سے سلور آئی نکال لے جانے کے چکر میں شی والوں کا کسی نامعلوم فریق سے تصادم ہو گیا ہے۔"

"اور وہ سیما کہاں ہے؟ اسے تو شاید وہ اٹھا لے گئے ہوں گے؟" اس نے سوال کیا۔

"وہ اپنا فلیٹ خالی چھوڑ کر میرے پاس آ گئی تھی اور اب خوابگاہ میں مسہری کے نیچے بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ وہ سامنے رہتی تو یقیناً مار دی جاتی۔ تمھیں معلوم ہے کہ سلور آئی کے معاملے میں وہ لوگ کتنے حساس ہیں۔"

پھر جہانگیر بھی واپس لوٹ آیا۔ سلطان شاہ کو میرے پاس دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ لیکن یہ اطمینان بھی ہوا کہ ہماری نفری میں ایک کا اضافہ ہو چکا تھا۔

اس نے بتایا کہ آنے والوں کے چہروں پر نقاب چڑھے ہوئے تھے اور انھوں نے اوپر کے فلیٹوں میں اسلحے کے زور پر خاصی لوٹ مار کی تھی۔ عجلت کی وجہ سے انھوں نے مکینوں کے ساتھ تشدد بھی کیا تھا۔ نقدی، زیورات اور دوسری قیمتی اشیا جو ہاتھ لگیں، اٹھا لے گئے تھے۔ لوگوں میں عام تاثر یہی تھا کہ کچھ ڈاکوؤں نے بجلی اڑا کر اس بلڈنگ کو لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ فائرنگ کی وجہ سے باہر کے لوگوں میں اتنی دہشت پھیلی ہوئی تھی کہ میدان صاف ہونے کے باوجود کسی نے اس بلڈنگ میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اوپر والے بعض مکینوں نے پولیس کو ڈکیتی کی اس واردات سے مطلع کر دیا تھا لیکن پوری یقین دہانیوں کے باوجود اس وقت تک پولیس علاقے میں نہیں پہنچی تھی۔

"پولیس لازماً ہم سے بھی بیان لے گی۔" جہانگیر نے کہا۔ "ہماری کہانی کیا ہونی چاہیے؟"

"ہمیں کچھ پتا نہیں، ہم تو سلطان شاہ کے ساتھ ابھی ابھی فیکٹری سے واپس لوٹے تو باہر فائرنگ ہو رہی تھی۔ فائرنگ ختم ہونے پر ہم اوپر آئے تو دروازہ ٹوٹا ہوا تھا اور اندر سارا سامان بکھرا ہوا ملا۔ رقم، انعامی بانڈز اور کئی قیمتی اشیا غائب ہیں۔"

"اور سیما کا کیا ہو گا؟" جہانگیر اسے ایک لمحے کے لیے بھی بھولنے کو تیار نہیں تھا۔

"اسے پولیس والوں کے سامنے لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی وہ ہوش میں آ بھی گئی تو خوفزدہ ہو گی۔ کل کسی وقت وہ پولیس سے رابطہ قائم کر کے بتا دے گی کہ اس نے رات اپنی کسی سہیلی کے ساتھ گزاری تھی، صبح واپس لوٹی تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ سلور آئی، شی یا ڈی ڈی کی فون کال کا ذکر درمیان میں لانا خطرناک ہو سکتا ہے۔"

ان تمام جزئیات پر باہمی تبادلۂ خیال کے بعد جہانگیر سیما کو مسہری کے نیچے سے نکال کر ہوش میں لانے کے لیے چلا گیا اور میں بیٹری لیمپ کی روشنی میں سلطان شاہ کے ساتھ دروازہ مرمت کرنے میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد فضا میں پولیس کاروں کے سائرنوں کی پرشور آواز سنائی دی۔ نیچے موجود بے چین اور خوفزدہ تماشائیوں نے غالباً پولیس کے خلاف نعرے بازی شروع کر دی تھی کیونکہ ہر طرف سے غل غپاڑا سنائی دے رہا تھا۔ سائرنوں کا شور یکلخت موقوف ہو گیا۔ میں نے بالکونی میں جا کر جائزہ لیا تو نیچے بے چینی کے آثار نظر آئے۔ اندھیرے میں لوگ جگہ جگہ ٹولیاں بنائے کھڑے تھے۔ کچھ دور تین پولیس گاڑیاں ایک بڑے ہجوم کے نرغے میں گھری ہوئی تھیں۔ شاید لوگ پولیس کی آمد میں تاخیر پر احتجاج کر رہے تھے اور غنیمت یہ تھا کہ پولیس

والوں نے صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپ کر کسی تادیبی کارروائی کے بجائے صبر و تحمل کا رویہ اپنایا ہوا تھا۔ ورنہ صورتحال افسوس ناک رخ بھی اختیار کر سکتی تھی۔

اندھیرے کی وجہ سے انھوں نے اپنی گاڑیوں کے ہیڈ لیمپس روشن ہی رکھے تھے۔ میں نے اضطراری طور پر اس سمت نگاہ ڈالی جہاں دو کلاشنکوف بردار میرے ہاتھوں ڈھیر ہوئے تھے۔ لیکن وہاں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ مرنے والوں کی لاشیں ان کے ساتھی اٹھا لے گئے تھے یا وہ صرف زخمی ہوئے تھے اور کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھیوں سے جا ملنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اپنا جائزہ مکمل کر کے میں واپس آیا تو جہانگیر اپنی تدبیروں سے سیما کو ہوش میں لا چکا تھا۔ اور وہ بیٹری لیمپ کی ناکافی روشنی میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں گھورے جا رہی تھی۔

"اپنے اوسان بحال کرو۔" جہانگیر اس کے رخساروں پر ہولے ہولے تھپڑ لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "کچھ بھی نہیں ہوا۔ انھیں سلور آئی لے جانی تھی اور وہ لے گئے۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"ہزار، پندرہ سو کے سکے کے لیے اس قدر خونریزی اور بربریت!" وہ جھرجھری لے کر کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ پتا نہیں ان کی اندھا دھند فائرنگ سے کتنے بے گناہ ہلاک اور زخمی ہوئے ہوں گے۔ اور جو بے چارے لوٹے گئے وہ تو کسی گنتی میں ہی نہیں ہیں۔"

پھر ہم تینوں ہی سیما کی دلجوئی میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد بند دروازے پر دستک ہوئی اور اس بار دروازے پر ایک انسپکٹر کی معیت میں دو اے ایس آئی اور چند سپاہی نظر آئے۔

اگر ڈکیتی کی وہ واردات کسی ایک ہی فلیٹ میں ہوئی ہوتی تو پولیس والے وہیں ڈیرے ڈال دیتے، لیکن انھیں اطلاع مل چکی تھی کہ اس بلڈنگ کے سارے ہی فلیٹ ڈکیتی کا نشانہ بنے تھے۔ اس لیے انھوں نے اندر آ کر کمروں کا سرسری جائزہ لیا پھر جہانگیر کو کچھ دیر بعد نیچے پہنچنے کی ہدایت کر کے باہر نکل گئے۔ سیما باتھ روم میں چھپ گئی تھی۔

"اس فلیٹ میں بھی ابتری ہے سر! مگر اندر کوئی نہیں ہے۔" سیما کے فلیٹ کی طرف سے اندھیرے میں کسی پولیس والے کی آواز ابھری۔

انسپکٹر جاتے جاتے ہماری طرف گھوم گیا۔ "آپ کے پڑوس میں کون رہتا ہے؟"

"مسٹر اور مسز ندیم۔" جہانگیر نے بلاتوقف جواب دیا۔

"ہمارے ان سے زیادہ مراسم نہیں ہیں۔ سنا ہے، دونوں میاں بیوی ہوائی کمپنیوں میں ملازمت کرتے ہیں۔"

"تو ان کا فلیٹ ٹوٹے ہوئے دروازے کے ساتھ یونہی لاوارث پڑا رہے گا۔"

"کوئی قانونی دشواری نہ ہو تو ہم دیکھ بھال کر لیں گے۔ بلکہ دروازہ لگا کر اسے بند ہی کر دیں گے۔ پڑوس میں ایک دوسرے کا اتنا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔" جہانگیر سراپا اخلاق بن گیا تھا۔

"آپ لوگ دھیان رکھیں، ویسے ہم کسی بڑھئی کا بھی بندوبست کرتے ہیں۔" انسپکٹر وہ ہدایت جاری کرتے ہوئے اوپر جانے والے زینوں کی طرف بڑھ گیا جہاں پولیس کی آمد کی خبر پا کر کئی غم زدہ متاثرین جمع ہو گئے تھے۔

ہم دونوں اندھیرے میں ہی سیما کے فلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر کی کوششوں کے بعد پٹ کو چوکھٹ میں پھنسا کر کھڑا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

"سلمیٰ کو فون کر لو، ورنہ وہ آج پھر چراغ پا ہو جائے گی۔" فلیٹ کی طرف لوٹتے ہوئے میں نے جہانگیر کو مشورہ دیا جو اس نے فوراً ہی قبول کر لیا۔ ورنہ وہ اس وقت تک سلمیٰ اور اس کے غصے کو یکسر بھولا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں سیما کو سلطان شاہ کے ساتھ فلیٹ میں چھوڑ کر نیچے پہنچے تو وہاں خاصی چہل پہل تھی۔ ایک خالی پلاٹ پر پولیس والوں کے لیے آس پاس کی دکانوں سے کئی کرسیاں ڈال دی گئی تھیں۔ چند پیٹرومکس لیمپ بھی کہیں سے مہیا کر لیے گئے تھے۔ تین گاڑیوں میں پولیس کی بھاری نفری کیل کانٹے سے لیس ہو کر وہاں پہنچی تھی۔ ان میں سے ایک پارٹی ہماری عمارت میں تفتیش کر رہی تھی اور اس وقت تک واپس نہیں لوٹی تھی۔ دوسری ٹولیاں علاقے میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور چلی ہوئی گولیوں کے خول، خالی میگزین اور دوسرے شواہد جمع کر رہی تھیں۔

فضا میں اس وقت بھی بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی جس سے نتھنوں میں جلن ہو رہی تھی۔ روشنی میں زمین پر کئی جگہ خون کے بڑے بڑے دھبے بھی نظر آئے۔ لیکن وہاں موجود تماشائیوں کے ہجوم میں ہونے والے تبصروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ سنگدلانہ خونریزی کے باوجود اس علاقے میں نہ کوئی لاش پڑی ہوئی ملی تھی اور نہ ہی کوئی اجنبی زخمی حالت میں ملا تھا البتہ اس علاقے کے رہنے والے تین افراد جو فائرنگ کی زد میں آ کر زخمی ہو گئے تھے، انھیں علاقے کے رحم دل لوگوں نے فوراً ہی قریبی اسپتالوں میں پہنچا دیا تھا۔

اگلی صبح کے اخبارات کچھ اور ہی کہانی سنا رہے تھے۔

جہاں واردات ہوئی، وہ شہر کا کوئی مرکزی علاقہ نہیں تھا جہاں سے اخباری نمائندے چشم دید کوائف جمع کرتے۔ اس لیے بنیادی طور پر انھیں وہی کچھ شائع کرنا پڑا جو انھیں فراہم کیا گیا تھا۔ انھوں نے بعد میں موقع پر موجود لوگوں سے بھی انٹرویو لیے، لیکن کوئی بھی اس بات پر روشنی نہ ڈال سکا کہ اگر ایک طرف ڈکیتی کی نیت سے آنے والے ڈاکوؤں کا مسلح گروہ تھا تو دوسری طرف ان کی مسلح مزاحمت کرنے والے کون تھے اور پھر مقابلے میں مرنے یا زخمی ہونے والے کہاں گئے تھے؟

اس خلا کو پولیس نے نہایت آسانی کے ساتھ پُر کر دیا تھا اور خبر وہی بنی تھی جو شی والے بنانا چاہتے تھے۔ یعنی اس علاقے میں ڈاکوؤں کا ایک منظم جتھا وسیع پیمانے پر لوٹ مار کرنے کی نیت سے داخل ہوا کے ای ایس سی کے ذرائع نے تصدیق کی تھی کہ علاقے میں ان کے ٹرانسفارمر کو تخریب کاری کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ خبر کے مطابق ڈاکوؤں نے جُوں ہی ٹرانسفارمر تباہ کر کے تاریکی پھیلائی، قانون نافذ کرنے والے ادارے حرکت میں آگئے۔ اور ایک طویل مقابلے کے بعد ڈاکو اپنے جدید ترین اسلحے کے بل بوتے پر صرف ایک عمارت میں گھسنے میں کامیاب ہو سکے۔ قیاس ظاہر کیا گیا تھا کہ قانون ڈاکوؤں کی راہ میں حائل نہ ہوتا تو اس رات علاقے کے ہر آسودہ مکین کو اس کی زندگی بھر کی جمع پونجی سے محروم کرنے کی سازش تیار کر لی گئی تھی۔

رسمی بیانات وغیرہ کے بعد اُس رات دو بجے ہماری گلو خلاصی ہو سکی تھی۔ سلطان شاہ میرے پاس رکنا چاہ رہا تھا، لیکن اس کی نئی ملازمت کی وجہ سے میں نے اسے جہانگیر کے ساتھ ہی واپس روانہ کر دیا تھا۔ اس لیے خبروں پر تبادلۂ خیال کے لیے میرے ساتھ صرف سیما رہ گئی تھی جو خود بھی بہت سی باتوں سے بے خبر تھی۔

"میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ معاملہ اس قدر خطرناک اور خونریز ثابت ہوگا۔ جگہ جگہ پائے جانے والے خون کے دھبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رات کافی آدمی ہلاک اور زخمی ہوئے ہوں گے۔"

"جرائم پیشہ لوگ آپس کے جھگڑوں سے پولیس کو دور ہی رکھتے ہیں۔ اسی لیے نہ اپنی لاشیں چھوڑ کر بھاگتے ہیں، نہ زخمیوں کو پڑا رہنے دیتے ہیں۔"

"ایک سلور آئی کے لیے کیا کچھ ہو گیا۔ سلور آئی کے ساتھ ہی وہ ندیم کا بلیزر بھی لے گئے لیکن پولیس کا تو کل رات دور دور تک پتا نہیں تھا، یہ آج پولیس مقابلے کی خبر کیسے بن گئی؟"

"ظاہر ہے کہ دونوں میں سے کوئی فریق بھی اس دعوے کی تردید نہیں کرے گا اس لیے سہرا پولیس کے سر رہے گا۔"

"یہ تو اخباری باتیں ہیں لیکن پولیس مجرموں کو تلاش تو ضرور کرے گی؟" اس نے تائید طلب لہجے میں سوال کیا۔

"ڈاکوؤں کو تلاش کرنے کی کوشش تو کرنا ہی ہوگی جن کا ان کا اخبار میں بھی ذکر ہے۔" میں نے اخبار کی ورق گردانی کرتے ہوئے سرسری لہجے میں جواب دیا۔ اور اسی لمحے میری نگاہیں ایک خبر کی سُرخی میں الجھ کر رہ گئیں۔

وہ خبر آخری صفحے پر شائع ہوئی تھی جس کے مطابق پچھلی رات کورنگی روڈ پر منظور کالونی کے سامنے ایک تیز رفتار جیپ اگلا پہیہ پھٹنے کی وجہ سے بے قابو ہو کر الٹ گئی اور پھر خوفناک دھماکوں کے ساتھ اس میں آگ لگ گئی۔ عینی شاہدین کے مطابق زخمی ڈرائیور موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ابتدائی جائزے سے اندازہ لگایا گیا تھا کہ جیپ میں غیر قانونی اسلحے کی کئی پیٹیاں ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کی جا رہی تھیں کہ حادثہ رونما ہو گیا۔ پولیس کے ماہرین کا خیال تھا کہ آتش زدگی اور دھماکوں کا سبب وہ دستی بم ابھرے ہوئے میگزین اور کارآمد گولیاں تھیں جو حادثے کے وقت جیپ میں موجود تھیں۔ اس سلسلے میں پولیس جیپ کے نمبروں سے مجرموں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

میرے لیے وہ خبر اہم تھی کیونکہ پچھلی رات فون پر میری کامٹ سے بات ہو چکی تھی۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ وہ جیپ مافیا والوں کی تھی جو اسلحہ لے کر شرف آباد آ رہی تھی کہ بدقسمتی سے حادثے کا شکار ہو گئی اور یوں شی والوں کو ہماری بلڈنگ میں من مانی کر کے صحیح سلامت واپس لوٹنے کا موقع مل گیا۔ اور مافیا کے جیالے اپنے خالی ہتھیاروں کے ساتھ بے بسی سے اپنے دشمنوں کی واپسی کا تماشا دیکھتے رہ گئے۔

اس خبر کا سیما سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اُس سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ یہ غنیمت تھا کہ پچھلی رات پولیس والوں نے کہیں سے ایک بڑھئی کا بندوبست کر دیا تھا کیونکہ حملہ آوروں نے ہر اس فلیٹ کے دروازے کو شدید نقصان پہنچایا تھا جہاں دروازہ کھولنے میں تاخیر کی گئی تھی۔ اس بڑھئی نے مناسب معاوضہ لے کر نہ صرف دروازے ٹھیک کر دیے تھے بلکہ تباہ شدہ ہضمی قفل کی جگہ عارضی طور پر کنڈیاں لگا کر دروازے کو اندر اور باہر سے مقفل کرنے کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ اس طرح سیما کا فلیٹ مقفل ہونے کے بعد ہمیں اس طرف سے اطمینان ہو گیا تھا۔

نیچے پولیس کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ کے ای ایس سی کے عملے نے بھی پچھلی رات کی بڑی واردات سے متاثر ہو کر ہنگامی پیمانے پر تباہ شدہ ٹرانسفارمر کی تبدیلی کا کام شروع کر دیا تھا۔ کرین کے ذریعے اوپر سے جلا ہوا ملبہ ہٹایا جا رہا تھا اور ٹرک پر نیا ٹرانسفارمر لے آیا گیا تھا۔ دن کے اجالے میں بجلی کی کمی زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

ہم دونوں گھر میں بکھرا ہوا سامان الماریوں وغیرہ میں رکھ کر فارغ ہوئے تو بارہ بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ سیما نے فوراً ہی لپک کر باتھ روم میں چھپنا چاہا لیکن میں نے اسے روک لیا۔

میرے استفسار پر باہر سے پولیس کی آواز آئی تو میں نے دروازہ کھول دیا۔

"ہم ایک بار پھر فلیٹ کا معائنہ کرنا چاہتے ہیں۔" سب انسپکٹر نے کہا اور میں نے اسے اس کے دونوں سپاہیوں سمیت اندر بلا لیا۔ سپاہیوں کے تیوروں سے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے کہیں ہاتھ مار کر مجرموں کو دبوچ لیں گے۔

"رات اس فلیٹ میں تین آدمی تھے۔" سب انسپکٹر نے اپنی فائل میں موجود کاغذات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"جہانگیر فیکٹری چلا گیا۔ میں اس کا ملازم ہوں۔" میں نے اس کے مزید کچھ بولنے سے پہلے ہی رات کو دیے گئے بیان کے مطابق کہنا شروع کر دیا۔ "تیسرا مہمان تھا جو رات کو ہی واپس چلا گیا۔ یہ سیمابی بی ہماری پڑوسن ہیں۔ ابھی ابھی واپس آئی ہیں اور اکیلے پن سے ڈر کر یہاں آ گئی ہیں۔"

"تم نے سارا سامان سمیٹ لیا ہے۔" میری زبان سے ملازمت کا اقرار سن کر سب انسپکٹر کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا۔ "گھر میں سے ایسی کوئی چیز تو نہیں ملی جو ڈاکو بھول سے یہاں چھوڑ یا گرا گئے ہوں۔"

"نہیں۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بلکہ میرا تو خیال ہے کہ رات کو لکھوائی گئی نقدی، بانڈز، دستی گھڑی اور ڈیک کے علاوہ بھی کئی اور چیزیں غائب ہیں...."

"جتنا پوچھا جا رہا ہے اس سے زیادہ نہ بولو جوان!" ایک سپاہی نے مجھے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

سب انسپکٹر مجھے نظر انداز کر کے سیما کی طرف بڑھ گیا۔ "آپ رات کہاں تھیں؟" اس سے سوال کرتے ہوئے اس کی نظریں فائل کے اوراق کے بجائے سامنے موجود دلکش چہرے پر مرکوز تھیں۔

"ایک سہیلی کے گھر پر تھی۔" سیما نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہوا۔ وہاں آپ کا وقت گپ شپ میں اچھا گزرا ہوگا۔ یہاں تو ہر طرف گولیاں چل رہی تھیں۔" وہ گفتگو کو ذاتی رُخ پر لے کر بے تکلف ہونا چاہ رہا تھا۔ سیما جواب میں کچھ نہ بولی تو اس نے دوبارہ خود ہی بات چھیڑی۔ "آپ کے فلیٹ سے کیا کیا غائب ہوا ہے؟"

سیما نے وہی فہرست دُہرا دی جو سونے سے قبل اسے رٹائی گئی تھی اور بولی۔ "ہو سکتا ہے کہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی چوری ہوا ہو، لیکن مجھے چوری کی کوئی فکر نہیں۔ میں تو اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ جب وہ بے رحم ڈاکو میرے فلیٹ میں داخل ہوئے تو میں گھر پر نہیں تھی۔"

"جی ہاں!" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "آپ گھر پر ہوتیں تو نہ جانے کیا کچھ ہو جاتا۔ اکیلی عورت کے حق میں چور ڈاکو بہت خوفناک ثابت ہوتے ہیں لیکن ایسی غلطیوں کی وجہ سے پکڑے بھی جاتے ہیں۔" سیما سے بات کرتے کرتے اچانک وہ تیوریوں پر بل ڈال کر میری طرف پلٹا اور غراتے ہوئے بولا۔ "قریب کھڑا دیدے کیا پھاڑ رہا ہے.... چل جلدی سے ہم لوگوں کے لیے فرسٹ کلاس چائے بنا کر لا۔"

"میں بنا کر لاتی ہوں۔" سیما کو اپنی جان بچانے کا موقع مل گیا۔

سب انسپکٹر ارے ارے کرتا رہ گیا۔ مگر سیما کچن کی طرف چل دی اور انسپکٹر کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ میں مسمسی آواز میں بولا۔ "میں خانساماں نہیں ہوں جی! ہمارے گھر کھانے پینے کا سارا سامان ہوٹل سے تیار آتا ہے۔ سیما بی بی جانتی ہیں کہ میں چائے تک بنانا نہیں جانتا۔"

سب انسپکٹر کا بس نہیں چل رہا تھا۔ ورنہ وہ ضرور میرے مُنہ پر تھپڑ رسید کر دیتا۔ وہ چائے کے بہانے مجھے ٹال کر سیما کے ساتھ خلوت میں کچھ بے تکلفانہ گفتگو کرنی چاہ رہا تھا جس کا موقع چھن گیا تھا لہٰذا وہ غصے میں فائل اٹھا کر سیدھا کچن کے دروازے پر پہنچ گیا اور خوشامدانہ لہجے میں سیما سے بولا۔ "آپ ناحق زحمت نہ کریں، وہ تو میں نے نوکر سے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ اس وقت میں ڈیوٹی پر ہوں اور کئی فلیٹوں کا معائنہ بھی کرنا ہے۔ چائے پھر کبھی پی لوں گا۔"

"جیسی آپ کی مرضی، میں سرکاری کام میں رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتی، ورنہ ابھی بیس منٹ میں چائے تیار ہو جاتی۔" سیما نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی اور میں نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔ لائن ملی ہوئی تھی لیکن دوسری طرف سناٹا تھا۔

"ہیلو! کون صاحب ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"کامٹ!" دوسری طرف سے میری آواز پہچان کر کہا گیا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ پولیس کا عملہ واپس جاتے جاتے رُک گیا تھا اور سب انسپکٹر میری طرف متوجہ تھا۔

"انسپکٹر صاحب آئے ہوئے ہیں جی! حکم دیں تو بابا دو لاؤں۔"

میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"گڈ! میں تھوڑی دیر بعد دوبارہ رِنگ کروں گا۔" کامٹ کی آواز ابھری اور لائن کلک کی آواز کے ساتھ بے جان ہو گئی۔

سب انسپکٹر اپنا ترقی زدہ عہدہ سن کر تیزی سے میری طرف لپکا تھا۔ وہ سمجھا ہو گا کہ اس کی کال تھی جب کہ میں کامٹ کو مخدوش صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہ رہا تھا۔ انسپکٹر نے تیزی کے ساتھ میرے ہاتھ سے ریسیور لے لیا اور اسے کان سے چپکا کر ہیلو ہیلو کرنے لگا۔ اس کی آواز بتدریج بلند اور سخت ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار اس نے بھنّا کر ریسیور میرے ہاتھ میں دے دیا۔

"یہ تو ڈیڈ پڑا ہے۔" وہ مجھ پر آنکھیں نکال کر غرّایا۔

"پتا نہیں جی! کوئی معلوم کر رہا تھا کہ تھانیدار صاحب پہنچے یا نہیں؟" میں نے مسکین لہجے میں کہا پھر کریڈل دبا کر ریسیور کان سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "لائن کٹ گئی ہے، ٹون آ رہی ہے۔"

"اوئے تو وہ تھا کون؟ تیرا ماما؟" وہ ہاتھ فضا میں اٹھا کر غرّایا اور میں ریسیور کریڈل پر ڈال کر پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"میرا نہیں جی، وہ آپ کا پوچھ رہا تھا، پتا نہیں فون کیوں بند کر دیا۔"

"ڈی آئی جی صاحب بھی آج جائے واردات کے معائنے کے لیے آنے والے تھے۔" دوسرے سپاہی نے فرشتۂ رحمت کا رول ادا کرتے ہوئے زبان کھولی۔ "ہو سکتا ہے کہ صاحب کے نکلنے سے پہلے ان کے پی اے نے فون کیا ہو۔"

بات اس کی کھوپڑی میں سما گئی کیونکہ معاملہ ماتحت کا نہیں افسرِ بالا کا تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "دوبارہ فون آئے تو بتا دینا کہ میں نو بجے سے ادھر ہی ہوں۔"

میں نے سعادت مندانہ انداز میں اثبات میں سر ہلایا اور وہ تیزی کے ساتھ باہر نکلتا چلا گیا۔

"یہ بھی تم پر عاشق ہونے کے چکر میں تھا۔" میں نے دروازہ بند کر کے ہنستے ہوئے سیما سے کہا۔ "اور مجھے کباب میں ہڈی سمجھ رہا تھا۔ میں ٹل جاتا تو وہ تمھیں دشواری میں ڈال دیتا۔"

"اس معاملے میں دُنیا کے سارے ہی مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔" وہ ڈرائنگ روم کی طرف واپس لوٹتے ہوئے بولی۔ "کچھ ذرا چالاکی اور تحمل سے کام لیتے ہیں ورنہ زیادہ تر جلد باز ہوتے ہیں۔ عورت اور تخلیہ میسر آتے ہی اظہارِ عشق کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھ لیتے ہیں۔ ویسے وہ فون کال کس کی تھی؟"

"رانگ نمبر تھا میری آواز سنتے ہی فون بند کر دیا گیا تھا۔" میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"پھر تم انسپکٹر کا ذکر کہاں سے لے بیٹھے تھے؟"

"تفریحاً۔" میں نے کہا۔ "اس نے ملازم سمجھ کر میری جو تحقیر کی تھی اس کا بدلا لینا چاہ رہا تھا۔"

اس وقت مجھے سیما کی موجودگی کھل رہی تھی کیونکہ اس کے سامنے میں کامٹ سے کھل کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے اس کے فلیٹ میں واپس جانے کا مشورہ دیا لیکن وہ اس تصور سے ہی خوفزدہ تھی۔ میں بمشکل اسے سمجھا سکا کہ عمارت میں اور اس کے آس پاس پولیس موجود ہے اس لیے وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف اپنا فلیٹ سمیٹ سکتی تھی بلکہ فلیٹ سے لے جائی جانے والی اشیا کا صحیح اندازہ بھی لگا سکتی تھی۔

میں اسے اپنے ساتھ لے کر اس کے فلیٹ میں گیا اور چند منٹ بعد اسے وہاں چھوڑ کر اس وعدے کے ساتھ واپس آ گیا کہ اس کے فلیٹ پر کوئی بھی دستک ہوئی تو باہر سے میں اس کا خیال رکھوں گا۔

اسے چھوڑ کر آنے کے بعد مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اور کامٹ کی فون کال دوبارہ آ گئی۔

"فتح مبارک ہو۔" کوڈ ورڈز کے تبادلے کے بعد میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "رات کو شاید ان میں سے ایک بھی زندہ سلامت واپس نہیں جا سکا ہو گا!"

"چبا چبا کر باتیں نہ کرو۔ اخبار تم نے بھی دیکھ لیا ہو گا۔" دوسری طرف سے سرد لہجے میں کہا گیا۔

"تم بھول رہے ہو کہ میں اس فلیٹ میں محصور ہوں۔ باہر نکلے بغیر اخبار کہاں سے لاتا۔ کیا اس میں کوئی راز کی بات شائع ہوئی ہے؟" میں نے اس سے دانستہ جھوٹ بولا۔ اس کی کہانی میں اسی کی زبان سے سننا چاہ رہا تھا۔

"کل رات ان کا مقدّر ساتھ دے رہا تھا کہ کمک لانے والی جیپ راستے میں ہی الٹ گئی ورنہ صورتِ حال کچھ اور ہی ہوتی۔"

"مقدّر اور ستاروں کے سامنے ہر شخص بے بس ہے اب تو ان کے حق میں صرف بددُعا ہی کی جا سکتی ہے۔ ویسے کیا تم نے اپنے آدمیوں کے لیے صرف ایک جیپ ہی بھیجی تھی؟"

"توپ نہیں، انھیں صرف گولیاں اور نیا میگزین درکار تھا۔ وہ جیپ حادثے کا شکار نہ ہوتی تو وہ لوگ ساری رات بھی وہاں ہولڈ اَپ کرائے رکھ سکتے تھے۔ یہ بتاؤ کہ تمھارے پاس پولیس کیوں آئی تھی؟"

"اس واقعے کو ڈکیتی کا روپ دیا گیا تھا اس لیے پولیس تمام لٹنے والوں سے بار بار رجوع کر رہی ہے۔ اسی سلسلے میں وہ میرے پاس بھی آئے تھے کیونکہ ہمارے فلیٹ کا دروازہ توڑ کر اندر ابتری پھیلائی گئی تھی۔"

"اس وقت تم کہاں تھے؟" اس نے تشویش آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"دروازے پر ضربوں کا آغاز ہوتے ہی باتھ روم چلے گئے تھے کیونکہ اس وقت مقابلہ مہنگا پڑ سکتا تھا۔ غنیمت ہوا کہ ان میں سے کسی کو باتھ روم کی حاجت محسوس ہوئی نہ ادھر کا خیال آیا۔ اور وہ اپنی من مانی کارروائی کر کے ٹھنڈے ٹھنڈے واپس لوٹ گئے۔"

"اور سیما کا کیا رہا؟" اس قصّے کی تمام جزئیات اس کے ذہن میں محفوظ تھیں۔

"سیما حسبِ پروگرام میرے ساتھ تھی۔ اس کا فلیٹ مقفل تھا۔ انھیں اصل کارروائی وہیں کرنا تھی اس لیے وہ دروازہ اکھاڑ کر اندر گھسے اور سلور آئی نکال لے گئے۔ سیما ہوش میں آ گئی ہوتی تو شاید میں تمھاری فرمائش کے مطابق وہ سکّہ اس کے فلیٹ سے نکال لے آتا، لیکن اس کا موقع نہیں ملا۔"

"تو کیا تم اسے بے ہوشی کی حالت میں ہی باتھ روم میں لے گئے تھے؟" چبھتا ہوا سوال پوچھا گیا۔

"غیر ضروری جرح مت کرو۔" میں نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ "اسے ایک مسہری کے نیچے ڈال دیا گیا تھا۔ تمھارے آدمیوں کی پچھلی رات کی کارکردگی اور تمھارے رویّے کے پیشِ نظر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ تم سے تعاون کر کے مجھے کیا حاصل ہو سکے گا۔ تم کسی بھی طرح مجھے متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہو۔"

"الٹنے والی جیپ کو تم بھی نہیں روک سکتے تھے۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "اتفاقات کو کسی کی کارکردگی کا معیار نہیں بنایا جا سکتا۔"

"لیکن باہمی اعتماد کے لیے کسی اتفاق کی ضرورت نہیں ہوتی اس کا تعلق نیّت اور دل سے ہوتا ہے۔"

چند ثانیوں کے لیے لائن پر سکوت چھا گیا پھر اس کی سپاٹ آواز ابھری۔ "آج کی ملاقات کا کیا پروگرام رہے گا؟"

"پروگرام تو تم ہی طے کرتے ہو، مجھے حکم کی تعمیل کرنا ہوتی ہے۔ جو بتا دو گے اسی کے مطابق عمل کروں گا۔"

"آج کے لیے تمھارا فلیٹ نامناسب رہے گا۔" اس کی آواز ابھری۔

"پھر کسی ہوٹل میں مل لو۔" میں نے دانستہ وہ تجویز پیش کی۔

"دوسرا آدمی پبلک مقامات پر ملنا جلنا پسند نہیں کرتا۔" اس نے میری تجویز رَد کر دی۔

"اوہ! میں بھول گیا تھا۔" میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ تو پردہ نشین ہو۔ ہوٹل یا کسی اور پبلک مقام پر کیسے مل سکتے ہو!"

"ٹھیک ہے میں کوئی نہ کوئی بندوبست کر ہی لوں گا تم رات کو ٹھیک آٹھ بجے اپنے زینوں کے سامنے سرخ رنگ کی ایک کار دیکھو گے۔ اس کا ڈرائیور تمھیں پہچانتا ہے تمھیں دیکھ کر وہ گمبی گمبی کہے گا تم بے فکری کے ساتھ اس کار میں سوار ہو جانا۔ ڈرائیور خود ہی تمھیں ملاقات کی جگہ پر پہنچا دے گا۔"

"اور میری واپسی کا کیا ہو گا؟" میں نے سوال کیا۔

"تم فکر نہ کرو تمھیں واپس بھجوانے کی ذمّے داری میری ہو گی۔"

"ذرا سرخ کار کے چاروں ٹائر اچھی طرح چیک کرا لینا۔ ایسا نہ ہو کہ آج کوئی دوسرا اتفاق رونما ہو جائے۔"

"تم غیر ضروری طور پر زیادہ بولتے ہو۔ وقت کا خیال رکھنا۔ گاڑی ٹھیک آٹھ بجے پہنچے گی۔"

اس نے میری رسٹ واچ سے اپنی گھڑی کا وقت ملانے کے بعد سلسلہ منقطع کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ میں نے پچھلی رات کے حوالے سے پھر بات چھیڑ دی۔ "مقابلے میں تمھارے آدمیوں کو بھی خاصا نقصان پہنچا ہو گا۔"

"گولیاں چلتی ہیں تو دونوں فریقوں کو ہی نقصان پہنچتا ہے، لیکن میں تمھیں بتا دوں کہ رات کو مخالفوں کے دانت کھٹے کر دیے گئے تھے۔ ہمارے دو کے مقابلے میں ان کے کم از کم سات آدمی مارے گئے۔ تمھارے دوستکار اس کے علاوہ تھے ان کی نفری بہت زیادہ تھی، ابتدائی حملوں میں وہ تیتروں کی طرح مارے گئے تھے۔"

"اور بھاگنے سے پہلے اپنی لاشیں بھی اٹھا لے گئے؟" میں نے تصدیق طلب لہجے میں کہا

"یہی سب سے مشکل اور اہم کام ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ رات والے حملے کی رہنمائی ڈی ڈی بذاتِ خود کر رہا تھا اور اس کی ٹانگ میں بھی خاصا گہرا زخم آیا ہوا ہے کیونکہ وہ لنگڑاتا ہوا دیکھا گیا تھا۔"

"اللہ کرے کہ تمھارا خیال محض خوش فہمی نہ ہو۔ اس کی پنڈلی کا زخم نو لاشوں سے بھاری رہا ہو گا۔"

"وہ لوگ پوری منصوبہ بندی کے ساتھ آئے تھے۔ ان کے سارے آدمی نقابیں لگائے ہوئے تھے لیکن ایک شخص سیاہ پجیرو کے قریب کھڑا ہو کر نہ صرف ہدایات جاری کر رہا تھا بلکہ پجیرو سے فاضل اسلحہ ہر اس پوائنٹ پر بھجوا رہا تھا جہاں اس کے آدمیوں کی فائرنگ کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ ہمارے ایک آدمی نے اسے نشانے پر لے لیا تھا۔ اگر وہ پنڈلی پر پہلی گولی کھاتے ہی زمین پر گر نہ جاتا تو اس کا بدن چھلنی کر دیا جاتا۔"

"غنیمت ہے کہ تمھارے پاس کوئی اچھی خبر بھی ہے لیکن

سوچنے والی بات یہ ہے کہ وہ آدمی اسی قدر اہم نظر آرہا تھا تو اس پر صرف ایک گولی چلائی گئی! اس پر تو سب مشین گن یا کلاشنکوف کا پورا میگزین خالی کیا جانا چاہیے تھا تاکہ اسے دوسرا سانس ملنے کی مہلت بھی نہ ملتی۔"

"ملو گے تو بہت سی باتیں سمجھ میں آجائیں گی۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے کہ تم نے کسی بات کو خوش خبری بھی تسلیم کر لیا ہے۔ بس آٹھ بجے کا وقت نہ بھولنا۔"

اس کے بعد لائن بے جان ہوگئی اور میں نے کسل مندانہ انداز میں اپنے لیے سگریٹ سلگالی۔

مجھے کامٹ پر بہت غصہ تھا لیکن اس نے آخر میں ڈی ڈی کے زخمی ہونے کے بارے میں جو خبر دی تھی، اس نے میرا دل خوش کر دیا تھا۔ اور میں فوری طور پر اس کی تصدیق کرنا چاہ رہا تھا۔ آخر کار مجھے ایک راستہ سوجھ ہی گیا۔ میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری سے دلدار کی فیکٹری کا نمبر تلاش کیا اور اس پر رابطہ قائم کر لیا۔

لائن ملنے پر میں نے پر وقار لب و لہجے میں دلدار کے بارے میں دریافت کیا تو بتایا گیا کہ وہ فیکٹری سے باہر کسی میٹنگ میں مصروف تھا اور صبح سے دفتر نہیں آیا تھا۔ آپریٹر یا پی اے کے استفسار پر میں نے ایک فرضی نام بتا کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ دلدار کی میٹنگ میں مصروفیت محض ایک بہانہ تھی ورنہ درحقیقت وہ گھر پر یا کسی اسپتال میں آرام کر رہا تھا۔

میرے دل میں آئی کہ اس کے گھر پر فون کیا جائے لیکن میں نے وہ ارادہ ترک کر دیا۔ فون پر غزالہ کی آواز سن کر میری طبیعت مضطرب ہو سکتی تھی اور میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا جس کی وجہ سے غزالہ کے لیے کوئی دشواری کھڑی ہو جاتی۔ وہ جب مجھ سے ملی تھی تو اس نے مجھ کو خود سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا تاکہ میری وجہ سے اس کی خوشگوار زندگی میں کوئی دشواریاں پیدا نہ ہوں، کیونکہ وہ دلدار کو ایک شریف النفس اور نیک آدمی سمجھ رہی تھی جس نے برے وقت میں اسے سہارا دے کر ایک نئی اور آبرومند زندگی گزارنے کا حوصلہ دیا تھا۔

دلدار کے بارے میں میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ وہ بذاتِ خود شی کا مقامی سربراہ تھا اور ڈی ڈی کے نام سے پس پردہ رہ کر لوگوں سے کام لیتا تھا۔ میر کے مضافات میں واقع شاہ باغ کو وہ اپنا قدیم خاندانی باغ قرار دیتا تھا لیکن میں خود دیکھ آیا تھا کہ اس باغ کا صرف نام بدلا گیا تھا ورنہ وہ قیمتی باغ راجا فروٹ فارمز کے نام سے کئی برس پہلے شی کے مقامی سربراہ راجا سکندر علی کے تصرف میں تھا اور میں نے اسی باغ میں راجا سکندر کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

دلدار آغا کے ڈی ڈی ہونے کا تازہ ترین ثبوت یہ تھا کہ سیما سے سلور آئی واپس حاصل کرنے کے لیے پہلے دلدار کی دواساز فیکٹری کے مینجر، ہارون نے سیما پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔ اس کی ناکامی کے فوراً بعد ہی ڈی ڈی نے براہِ راست خود فون پر سیما کو دھمکیاں دیں اور آخر کار پچھلی رات کا خون آشام ڈراما رونما ہوا جس کے نتیجے میں، کامٹ کے بیان کے مطابق گیارہ آدمی مر گئے تھے اور زخمی ہونے والوں کا کوئی شمار نہیں تھا۔ حد یہ تھی کہ زخمی ہونے والوں میں دلدار آغا بذاتِ خود بھی شامل تھا۔ وہ فیکٹری سے غائب تھا۔ شاید اس نے اپنی پنڈلی یا ران کے زخم کے بارے میں غزالہ کو کوئی جھوٹی کہانی بھی سنا دی ہو۔ میرے پاس اپنی ان تمام معلومات کے باوجود غزالہ کو دلدار آغا کی اصلیت کا یقین دلانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اگر وہ واقعی زخمی ہوگیا تھا تو اسے جھوٹا ثابت کرنے کی ایک ہی صورت ہو سکتی تھی کہ کسی ماہر ڈاکٹر سے اس کے زخم کا معائنہ کرا کے وہ مستند رپورٹ غزالہ کے سامنے رکھ دی جاتی۔

لیکن دلدار آغا بہت چالاک اور مکار تھا۔ اپنی دُہری شخصیت کا راز برقرار رکھنے کے لیے وہ فیکٹری تو کیا، چند روز کے لیے کاروباری مصروفیات کا عذر کر کے گھر سے بھی غائب ہو سکتا تھا اور جب اس کا زخم مندمل ہو جاتا تو وہ کسی خوف اور خطرے کے بغیر واپس لوٹ سکتا تھا۔

میں اپنے ان ہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ سیما اپنے فلیٹ سے فارغ ہو کر واپس آگئی۔ میں اپنی محرومیوں کی آگ میں جل رہا تھا اور وہ اپنی بدنصیبی پر آزردہ خاطر تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کی زندگی میرے سامنے کھلی ہوئی کتاب کی طرح تھی جب کہ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس وقت وہ اپنے فلیٹ سے نہا دھو کر لباس تبدیل کر کے آئی تھی۔ اس کے بدن سے بھینی بھینی خوشبو کا ایک سیلاب امڈ رہا تھا۔ میں نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بے چین ہوگئی۔

"بولو! تم کچھ بولتے کیوں نہیں ہو؟" وہ میرے قریب آکر تڑپ کر بولی۔ "میں تمھاری زبان سے کچھ سننا چاہتی ہوں لیکن تم کسی گونگے کی طرح مجھے نظر بھر کر دیکھتے ہو اور سر جھکا لیتے ہو۔ آخر تم ایسا کیوں کرتے ہو؟"

"اپنے آپ سے ڈرتا ہوں..." میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے میری بات کاٹ دی۔

"پارسائی انسان کے خمیر میں ہوتی ہے۔ جو لوگ اسے اوپر سے مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ زندگی کانٹوں کی سیج پر گزارتے ہیں۔ تمھیں کیا خوف ہے؟ کس سے ڈرتے ہو؟"

"رہنے دو سیما! مجھے زیادہ نہ کریدو۔ میرے اندر بھی ایک حیوان اور ایک درندہ چھپا ہوا ہے جو کسی کی آبرو کو خاطر میں لاتا ہے نہ کسی کی زندگی کی پروا کرتا ہے۔ اسے میں نے بڑی مشکل سے تھپک تھپک کر سلایا ہے۔ تم کوئی بڑا سمجھوتا کیے بغیر ہنستی کھیلتی زندگی گزارنے کی شوقین ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ میری ذات سے تمھیں کوئی نقصان پہنچے۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو پیٹر۔" اس کی آواز ایک دم نرم اور دھیمی ہوگئی۔ "میں پہلی بار تمھاری دعوت پر اس فلیٹ میں آئی تھی۔ میں نے جہانگیر کو کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ تم نے مجھ سے دوستی کی، میرا موڈ بنایا اور پھر مجھے جہانگیر کے حوالے کر دیا۔ شاید تمھیں میری اور اس کی دوستی ناگوار گزری ہو لیکن میں سچ کہہ رہی ہوں کہ نشے میں مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ جہانگیر کو دیکھ کر میری طبیعت تو ویسے ہی مکدر ہو جاتی ہے۔ تمھاری آواز کی نرماہٹ اور مردانہ بالادستی کی میں دل سے قدر کرتی ہوں..."

وہ مجھے جو کچھ سمجھانا چاہ رہی تھی وہ میں سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھنے پر تلا ہوا تھا۔ میں اس کی انا کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ جہانگیر کو اپنا مہمان بنانے کے بعد وہ میرے لیے ایک عورت نہیں بلکہ صرف ایک دلچسپ ہم نشیں بن کر رہ گئی تھی جس کے ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں تک دنیا بھر کے موضوعات پر گفتگو کی جا سکتی تھی اور اس وقت بھی میں نے اس سے اس کے پسندیدہ موضوع پر کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ اس عمارت میں کرائے دار نہیں بلکہ فلیٹ کی مالکہ تھی۔ اس کا شوہر پردیس میں قید میں تھا۔ جب کہ میرے لیے اس وقت فلیٹ سے بہتر کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ فلیٹ پر اپنے طویل قیام کے دوران میں اس خوش شکل، خوش مزاج، فراخ دل اور تنہا خاتون سے میرا روز کا ساتھ رہنا تھا۔ پھر سلور آئی کے معاملے میں ہمارے درمیان باہمی اعتماد کی فضا پیدا ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں اس نے پولیس والوں کے سامنے اس منحوس سکّے کا نام تک نہیں لیا تھا اس لیے اپنے تمام تر ذہنی تحفظات کے باوجود میں سیما کو ناراض کرنے کا کوئی غیر دانشمندانہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

میرے لب و لہجے کی تبدیلی کو اس نے فتح مندانہ مسکراہٹ کے ساتھ قبول کیا اور پھر ازلی رشتوں کے حوالے سے اس گفتگو کا آغاز ہوگیا جو اس وقت تک ہمارے درمیان شجرِ ممنوعہ بنی ہوئی تھی۔

❊

دن میں دو بار جہانگیر سے فون پر بات ہوئی۔ اس نے پچھلی رات سلمٰی کو بتا دیا تھا کہ میرا فلیٹ بھی اجتماعی ڈکیتی کی واردات کا نشانہ بنا تھا اور سلمٰی مجھ سے ہمدردی کے اظہار کے لیے شام کو فلیٹ پر آنے کے لیے تلی بیٹھی تھی جب کہ مجھے آٹھ بجے اپنے خفیہ مشن پر روانہ ہونا تھا اور میں جہانگیر کو بھی منع کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ اس روز فلیٹ کا رُخ نہ کرے۔ جہانگیر نے اس معاملے میں کوئی ذمے داری قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا کہ سلمٰی اس بہانے سے فلیٹ کا جائزہ لینا چاہتی تھی تاکہ یہ اندازہ لگا سکے کہ ہم وہاں کیا رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ اسے خوف تھا کہ کہیں اس کا سامنا سیما سے ہوگیا اور وہ اس کی کہانی سے واقف ہوگئی تو جہانگیر کے فلیٹ پر آنے پر پابندی ہی عائد نہ کر دے اور مجھے خطرہ تھا کہ اس نے میرا گھر دیکھ لیا تو جہانگیر کی غیر حاضری میں جب بھی دل گھبرائے گا، گاڑی اٹھا کر مجھے بور کرنے کے لیے میرے سر پر مسلط ہو جایا کرے گی۔

جہانگیر سے پہلی بار بات کرنے کے بعد میں نے سلمٰی کو فون کیا۔ اس نے چھوٹتے ہی ڈکیتی پر اظہارِ ہمدردی شروع کر دیا۔ جب اس کی ہیجان آمیز باز پرس کا سلسلہ ختم ہوا تو میں نے انجان بن کر جہانگیر کے بارے میں دریافت کیا اور اسے بتایا کہ میں کہیں باہر سے فون کر رہا تھا لیکن جہانگیر کی فیکٹری کا نمبر نہیں لگ رہا تھا۔ کراچی جیسے شہر میں جہاں ٹیلی فون کا نظام انتہائی ناقص اور ناقابلِ اعتماد تھا، میرا وہ عذر ہر شک و شبہے سے بالاتر تھا۔

"کوئی پیغام ہو تو مجھے بتا دو، میں انھیں فون کر دوں گی۔" اس نے میرے جال میں آتے ہوئے پُرخلوص لہجے میں پیشکش کی تھی۔

"آج شام وہ میرے پاس آنے والا تھا۔ اسے یہ بتانا تھا کہ میں رات گئے گھر واپس پہنچوں گا اس لیے آج کا پروگرام منسوخ کر دے۔ کل صبح میں اس سے فون پر بات کر لوں گا۔"

"اوہ!" ریسیور پر سلمٰی کی مایوسانہ آواز سنائی دی۔ "آج شام کو تو میں بھی ان کے ساتھ آنے والی تھی۔ کم از کم یہ تو دیکھوں کہ تم کہاں اور کس ٹھاٹ سے رہ رہے ہو۔"

"مجھے افسوس ہے سلمٰی! لیکن میری غیر حاضری ناگزیر ہے۔ تم ضد کرو تو تمھاری خاطر ہر نقصان برداشت کرتے ہوئے فلیٹ پر تمھارا انتظار کر لوں گا۔" میں نے مکارانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں! آج تم اپنا کام کرلو، میں جہانگیر کو بتا دوں گی۔ پھر کسی دن پروگرام رکھ لیں گے۔" اس کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا۔ مزید چند رسمی فقروں کے تبادلے کے بعد میں

نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

سیما کی دلجوئی میں شام ہو گئی تھی۔ سلمیٰ سے باتوں میں اندھیرا ہو گیا۔ اس وقت تک نئے ٹرانسفارمر کی تنصیب کے بعد بجلی کی سپلائی بحال ہو چکی تھی۔ میں نے روشنی کر کے جہانگیر کو فون کیا اور پھر کامٹ سے ملاقات کی تیاری میں مصروف ہو گیا جو میرے مستقبل کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔

ٹھیک آٹھ بجے میں فلیٹ سے باہر آ گیا۔ مجھے امید تھی کہ شی والوں کے مقابلے میں پچھلی رات کی ہزیمت کے بعد بھی مافیا والوں نے میری حفاظت یا نگرانی کا سلسلہ ترک نہیں کیا ہو گا اور اگر ان کا ایک آدمی سرخ کار میں میرا منتظر ہو گا تو دو چار آس پاس بھی کھڑے ہوں گے تاکہ کسی ناگہانی خطرے کی صورت میں مدافعانہ کارروائی کر سکیں۔

میں آخری زینے اتر رہا تھا تو سامنے، سڑک کے پار کھڑی ہوئی سرخ کار نظر آ گئی جس کا باوردی شوفر ڈرائیونگ سیٹ کی سمت پر مستعدی سے باہر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں کامٹ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ مجھ کو اچھی طرح پہچانتا تھا کیونکہ مجھے عمارت سے باہر نکلتے دیکھ کر وہ پھرتی سے گھوم کر سڑک کے رُخ والے عقبی دروازے پر آ کھڑا ہوا تھا اور میرے قریب پہنچنے پر اس نے احترام سے کار کا دروازہ کھول دیا تھا۔

میں کار میں سوار ہونے سے قبل ایک لحظے کے لیے جھجکا اور اس نے فوراً ہی سرگوشیانہ لہجے میں گبی گبی کہہ کر میرے رہے سہے شبہات بھی زائل کر دیے اور میں نئے ماڈل کی اس آرام دہ کار میں سوار ہو گیا۔ ڈرائیور نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور کار کے پیچھے سے گھوم کر اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ انجن اسٹارٹ کرتے ہی اس نے ایئر کنڈیشنر بھی چلا دیا اور پھر کار حرکت میں آ گئی۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بہت خوشگوار تھے لیکن جیل روڈ کا کراسنگ آنے سے ذرا پہلے میری ناک میں اور پھر حلق میں ہلکی سی تلخی کا احساس ہوا اور میں بس اتنا سوچ سکا کہ مجھ سے اگلی نشست کی پشت گاہ میں چھپے ہوئے کسی خفیہ نوزل سے کسی گیس کی پتلی سی دھار تیز دباؤ کے ساتھ خارج ہو کر میرے منہ پر پڑ رہی تھی۔ جتنی دیر میں میں صورتِ حال کو سمجھتا وہ گیس اپنا کام دکھا چکی تھی۔ میرے ہاتھ پیر شل ہو کر رہ گئے تھے اور زبان سے ڈرائیور کو مخاطب کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا مگر میں نے سامنے سے آنے والی گاڑیوں کے ہیڈ لیمپس کے انعکاس میں ونڈ شیلڈ پر لگے ہوئے عقب نما آئینے میں اتنا ضرور دیکھا کہ ڈرائیور اس آئینے میں بغور میرا جائزہ لے رہا تھا۔ شاید اسی نے کسی میکانزم کو حرکت دے کر میرے چہرے پر اس موذی گیس کے محدود اخراج کا بندوبست کیا تھا۔ گیس کا اخراج تھم گیا اور میں نے دلدل میں دھندلاتے ہوئے حواس کے ساتھ دیکھا کہ ڈرائیور نے کیبن میں پھیل جانے والی گیس کے مضر اثرات سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے خودکار بٹن سے تمام کھڑکیوں کے شیشے اتار دیے تھے۔

مجھے کچھ علم نہیں کہ وہ سفر کتنا طویل تھا اور میں نے بے ہوشی کی حالت میں کتنا عرصہ گزارا لیکن جب رفتہ رفتہ ہوش آیا تو میرا سر بھاری ہو رہا تھا اور میں ایک بستر پر دراز تھا۔ وہ کمرا خاصا روشن اور وسیع تھا جہاں میرے بستر کے گرد چار قد آور اور جسیم افراد کھڑے ہوئے دلچسپی کے ساتھ میرا جائزہ لے رہے تھے۔

میں نے پہلی چیز یہ محسوس کی کہ وہ چاروں چہرے میرے لیے اجنبی تھے جن پر میرے لیے کسی قسم کے احترام کے بجائے تمسخر اور استہزا کی علامات نمایاں تھیں جس کا مطلب تھا کہ میں دوستوں کے بجائے دشمنوں میں گھر گیا تھا۔

اس مخاصمانہ ماحول کا اندازہ ہوتے ہی میرے اعصاب نے غیر معمولی ردِ عمل کا مظاہرہ کیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد میں نے محسوس کیا کہ میں بستر چھوڑ سکتا ہوں لیکن میں مصلحتاً اسی طرح پڑا رہا۔ بستر پر رہ کر میں زیادہ سکون اور آسانی کے ساتھ نئی صورتِ حال کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

"تم کون ہو اور میں کہاں ہوں؟" میں نے اپنی آواز میں نقاہت سموتے ہوئے ان میں سے کسی خاص فرد سے مخاطب ہوئے بغیر سوال کیا۔

"ہم، ہم ہیں اور تم یہاں ہو۔" ان میں سے ایک خبیث صورت نے فرش پر پیر مار کر استہزائیہ لہجے میں کہا اور بھونڈے انداز میں زور سے ہنس پڑا۔ بقیہ تینوں نے بھی گلے پھاڑ کر اس کا ساتھ دیا تھا۔

ان کے تیوروں سے محاذ آرائی کی خواہش کا اظہار ہو رہا تھا اور پہلے سوال کے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان سے کسی بھی سوال کے سیدھے جواب کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس ماحول نے مجھے چکرا کر رکھ دیا۔ میں کامٹ کی ہدایت کے مطابق ڈرائیور کی شناخت کے بعد سرخ کار میں سوار ہوا تھا اور اسی میں بے ہوش کیا گیا تھا۔ بے ہوشی کا ایک جواز یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ لوگ مجھے راستے سے بے خبر رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ چاروں بدتمیز دیو زاد کامٹ سے ملاقات کے خانے میں کہیں فٹ ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ میں ان سے الجھتا یا نہ الجھتا، وہ مجھ سے زور آزمائی پر تلے ہوئے تھے۔

فلیٹ سے چلتے ہوئے میں نے بیم گن دانستہ ساتھ نہیں لی تھی کیونکہ اس نادر ہتھیار کو میں کسی آڑے وقت کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ البتہ سائلینسر لگے ہوئے پستول کو میں نے میگزین لوڈ کر کے...... ساتھ لے لیا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلائے بغیر پہلو بدل کر اندازہ لگایا کہ پستول میری جیب میں موجود تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جن لوگوں نے چالاکی کے ساتھ مجھے راستے میں ہی بے ہوش کر دیا تھا وہ جامہ تلاشی کو کیسے فراموش کر گئے لیکن اس وقت ان باتوں پر غور کرنے کی مہلت نہیں تھی۔

میرا ذہن تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ وہ چار مسٹنڈے تو میرے سر پر مسلط تھے۔ پتا نہیں اس عمارت کے اندرونی حصوں میں ان کے مزید کتنے ساتھی موجود تھے۔ یہ بات بھی قابلِ غور تھی کہ ان چاروں میں سے کسی کے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر انھوں نے میرے سوال پر جس طرح گلے پھاڑ کر بے فکری سے قہقہے لگائے تھے اس کی بنا پر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ عمارت بہت وسیع تھی جہاں باہر سے کچھ سنا جانا ممکن نہیں تھا یا پھر وہ کسی ویرانے میں واقع تھی۔

"اب اٹھنا بھی ہے یا مسہری توڑتے رہو گے!" خبیث صورت یہ کہتے ہوئے جھکا اور میرے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی اس نے پانی سے بھری ہوئی بالٹی میرے اوپر الٹ دی جو پہلے سے وہاں موجود تھی۔

مجھے پانی میں شرابور کر کے وہ چاروں دیوانہ وار قہقہے لگانے لگے اور میری رگوں میں شرارے کوندنے لگے۔ ان کی حد سے بڑھتی ہوئی جسارت اور اپنی توہین میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔

میں نے بستر پر پڑے پڑے کروٹ بدل کر اچانک ہی ان پر جست لگائی اور ان میں سے تین کو ساتھ لیتا ہوا ننگے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ انھیں مجھ سے اتنے تیز ردِ عمل کی توقع نہیں تھی اس لیے میں نے ایک کے پیٹ کے نچلے حصے میں داہنے گھٹنے سے ضربیں لگاتے ہوئے دوسرے کے چہرے پر پے در پے اتنی شدید ٹکریں رسید کیں کہ دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔ تیسرا میرے نیچے سے پھسل کر نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے تڑپتے ہوئے پہلے شکار کی ٹانگوں کے درمیان اپنا داہنا گھٹنا بلند کر کے پوری بے رحمی کے ساتھ آخری ضرب لگائی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

زخمی ہونے والے دونوں حریف بُری طرح چیخ رہے تھے۔ ایک کا چہرہ لہولہان ہو چکا تھا اور دوسرا اپنے گھٹنے سینے سے جوڑے درد کی شدت سے پھرکی کی طرح فرش پر ناچ رہا تھا۔ بقیہ دونوں خونخوار تیوروں کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔ میرے لیے وہ مہلت غنیمت تھی۔ میں نے تیزی کے ساتھ پستول نکالا، مجھے فوراً ہی اس کے وزن میں کمی کا احساس ہوا مگر پھر بھی میں نے ایک کے سینے کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔

کھٹکے کی ہلکی سی آواز ہوئی لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ انھوں نے میری بے ہوشی کے دوران میگزین خالی کر دیا تھا۔

"ہم نہتے ہیں۔ تمھاری بھی گولیاں نکال دی گئی ہیں۔ برابر کا مقابلہ ہے۔ ابھی دیکھو کہ کس طرح تمھاری ہڈیوں کا سُرمہ بنتا ہے۔" میرے مقابل صف آرا، خبیث صورت حریف دانت پیستے ہوئے بولا۔

اس کی ہرزہ سرائی اپنی جگہ تھی لیکن میں نے ان دونوں کی آنکھوں میں خوف کے ہلکے سے لہریے ناچتے دیکھ لیے تھے اس لیے انھیں پہل کا موقع دیے بغیر اپنی نفسیاتی برتری سے فائدہ اٹھانے کا بہترین موقع تھا۔

میں نے خبیث شکل والے پر ہی جست لگائی۔ وہ مجھے دبوچنے کے لیے تیار تھا لیکن میں نے اس کے قریب فضا میں ہی قلابازی کھا کر اس کے چہرے پر لاتیں رسید کیں اور وہ ڈکراتا ہوا کافی دور جا گرا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا توازن درست کرتا، چوتھے نے کسی جونک کی طرح پیچھے سے میری کمر پکڑ لی اور اس پر دباؤ ڈالنے لگا۔

وہ مجھے گھیر کر مارنا چاہ رہے تھے جب کہ میں اپنی زندگی بچانے کے لیے لڑ رہا تھا اس لیے دونوں فریقوں کے جذبوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ دوسری طرف یہ غنیمت تھا کہ میرے پہلے وحشیانہ وار کا شکار ہونے والے دونوں حریف فرش پر ہی پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کا جسم بے حس و حرکت ہو چکا تھا اور دوسرا اپنا خون میں لتھڑا ہوا چہرہ تھامے ہوئے کراہ رہا تھا۔

میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اپنی پوزیشن کا اندازہ لگایا پھر قدرے آگے جھک کر اپنی گردن کو پوری قوت سے پیچھے کی طرف جھٹکا۔ میری کھوپڑی کا عقبی حصہ کسی گرز کی طرح پیچھے والے کی ناک سے ٹکرایا اور وہ بھی بلبلاتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ پلٹ کر اس کی پسلیوں میں ٹھوکر لگائی۔ اسی اثنا میں خبیث صورت غراتا ہوا مجھ سے لپٹ گیا۔

وہ تعداد میں چار ضرور رہے تھے لیکن غنیمت یہ تھا کہ میرا ایک وقت میں ایک ہی سے مقابلہ ہو رہا تھا۔ اگر میں ان میں سے کسی ایک کو خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا تو میرا کام بہت سہل ہو سکتا تھا۔

...... ناک پر ٹکر کھانے والے کو فرش سے اٹھنے کی تیاری کرتے

دیکھ کر میں نے اپنے بدن سے لپٹے ہوئے حریف کو اتنے شدید جھٹکے دیے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے فرش سے اٹھنے والے پر جا گرے۔ اور اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان آزاد ہو گیا۔ میرے حریف کی کوشش تھی کہ کسی طرح مجھے نیچے گرا کر میرے سینے پر چڑھ بیٹھے تاکہ اسے مکّے مار کر میرا چہرہ بگاڑنے کا موقع مل جائے۔ اور میں سب سے زیادہ اپنا چہرہ ہی چھپا رہا تھا۔

اچانک زخمی ناک والے نے میری گردن پکڑ لی اور اس پر اپنے بازوؤں کا دباؤ بڑھاتے ہوئے میرا سر فرش سے ٹکرانے کی کوشش کرنے لگا جس میں میری مزاحمت کی وجہ سے اسے پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی۔ ادھر میرے دونوں ہاتھ خبیث صورت کی گرفت میں پھنسے ہوئے تھے جس کی وجہ سے میں بڑی مشکل صورت حال سے دوچار ہو گیا تھا۔

لیکن وہ مشکل زیادہ دیر برقرار نہیں رہی۔ میری گردن پھنسی رہی، لیکن بدن کے باقی حصے آزاد ہو گئے۔ آزادی کا وہ جزوی احساس بمشکل چند لمحوں کے لیے قائم رہا پھر میرے پیٹ اور پسلیوں میں بائیں طرف سے طاقتور مکّوں کی یلغار شروع ہو گئی جس نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔ زخمی ناک والے نے مجھے پکڑا ہوا تھا۔ اور اس کا دوسرا ساتھی اپنی شدید ضربات سے مجھے بے حال کر دینے پر تلا ہوا تھا۔ اس وقت میرے ہاتھ آزاد تھے اس لیے میں نے ہڑبڑا کر زخمی ناک والے کے بال دونوں ہاتھوں سے نوچ لیے۔ اس ناگہانی افتاد نے اسے پریشان کر دیا اور میں اپنی گردن آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

گردن آزاد ہوتے ہی میرے جسم کا توازن میرے قبضے میں آ گیا تھا۔ میں نے زخمی ناک والے پر سے ہٹے بغیر پوری قوت سے لات گھمائی۔ جو نشانے پر لگی اور خبیث صورت کے قدم اکھڑنے لگے، لیکن اسی اثنا میں زخمی ناک والے کو ایک بار پھر میرے بدن کے گرد اپنی گرفت مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ اس بار وہ جونک کی طرح ہاتھوں اور پیروں سے ایک ساتھ کام لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ختم کرو یہ سرکس!" اچانک اس کمرے میں کامٹ کی درشت آواز گونجی۔ میں بُری طرح چونکا تھا۔ زخمی ناک والے نے مجھے چھوڑ دیا۔ خبیث صورت جہاں تھا، وہیں جم کر رہ گیا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو کمرے میں نہ کامٹ موجود تھا نہ ہی کوئی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی آواز چھت کے قریب ایک دیوار میں بنی ہوئی تاریک کھڑکی سے آ رہی تھی جو اسی کمرے کے ایک حصے پر نیچی چھت پر بنی ہوئی دو چھتی میں واقع تھی شاید وہ ابتدا سے ہی اس کمین گاہ میں چھپ کر ایک اور چار کے تناسب سے ہونے والی وہ بھیانک مار دھاڑ دیکھ رہا تھا جس کے نتائج نے اس کی آواز میں تلخی اور درشتگی پیدا کر دی تھی۔

"ایک آدمی کو زیر نہیں کر سکے مُفت کی روٹیاں توڑ کر تم سب حرام خور ہو گئے ہو۔" وہ اپنے آدمیوں پر برس رہا تھا۔

"چیف! اس نے دھوکے سے ہمارے دو ساتھیوں کو ناکارہ نہ کر دیا ہوتا تو اب تک ہم اس کی چٹنی بنا چکے ہوتے۔" خبیث صورت والے نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"بے غیرتی کی باتیں مت کرو سینڈو!" کامٹ کی آواز قہر بار ہو گئی تھی "اس اکہرے بدن کے آدمی کے لیے تمہیں چار آدمی درکار تھے؟ اس کے لیے تو صرف تم ہی کو کافی ہونا چاہیے تھا۔ جاؤ! اور غیرت مند ہو تو کہیں ڈوب مرو۔ آج تم نے مجھے بُری طرح نیچا دکھایا ہے۔ ان دونوں بزدلوں کو بھی اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاؤ جو جان بچانے کے لیے بے ہوشی کی اداکاری کر رہے ہیں۔"

"چیف! ہمیں صرف پانچ منٹ اور دے دو۔" سینڈو کینہ توز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے گڑگڑایا۔ "اس کے ہاتھ پیر نہ توڑ دوں تو میرے منہ پر تھوک دینا..... صرف پانچ منٹ مانگ رہا ہوں تم سے۔"

"بکواس مت کر اور جو کہہ چکا ہوں اس پر عمل کر!"

کامٹ کی غراہٹ گونجی۔ "ایسا نہ ہو کہ ان پانچ منٹ میں تو بھی اپنے خون میں لتھڑا ہوا فرش چاٹتا نظر آئے۔ یہ نورا کشتی نہیں تھی۔ تم چاروں کو ہر بات کی کھلی آزادی دی گئی تھی۔"

سینڈو شاید کامٹ کا منہ چڑھا تھا جو اس سے پانچ منٹ کی مہلت بھی مانگ بیٹھا ورنہ کامٹ کی برہمی پر دوسرے کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ اس کی خون آلود ناک پر ورم آنے کی وجہ سے اس کا چہرہ بالکل ہی مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔

کامٹ کی بات پوری ہوتے ہی وہ دونوں فرش پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھے اور میں نے اپنی گیلی آستین سے چہرہ صاف کرتے ہوئے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا۔ غنیمت یہ تھا کہ مجھ پر الٹی جانے والی پانی کی بالٹی سے سگریٹ اور ماچس میں صرف نمی آئی تھی، وہ دونوں چیزیں ناکارہ نہیں ہوئی تھیں۔

"یہ تو شاید مر ہی گیا ہے چیف!" چند سیکنڈ بعد سینڈو کی تشویش آمیز آواز ابھری۔ وہ میرے گھٹنوں کی زد میں آنے والے کے ساکت بدن کے پاس اکڑوں بیٹھا ہوا اس کی نبضیں ٹٹول رہا تھا۔

"مر گیا ہے تو کہیں لے جا کر دفن کر دو۔" کامٹ کی جھلائی ہوئی آواز میں غیر انسانی سرد مہری عود کر آئی تھی۔ "اس کی موت کے ذمے دار صرف اور صرف تم ہو۔ اگر تم چاروں اپنی طاقت کے نشے میں چُور نہ ہوتے تو تمہاری یہ درگت نہ بنتی۔"

وہ دونوں ان دونوں کو اپنے کندھوں پر لاد کر تیزی سے اس کمرے سے نکلتے چلے گئے۔ وہ جس دروازے سے گئے وہ مقفل نہیں تھا، اس لیے میں بھی سگریٹ کا دھواں اڑاتا بے پروایانہ انداز میں اسی طرف ہو لیا۔

"تم ٹھہرو!" فضا میں کامٹ کی تحکمانہ آواز گونجی۔ "تمہیں جانے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔"

"یہ حیوانی مقابلہ جیتنے کے بعد بھی مجھے کسی اجازت کی ضرورت ہے؟" میں نے اپنی پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے دو چھتی کی تاریک کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے مضحکانہ لہجے میں سوال کیا۔

تاریک کھڑکی میں ایک شعلہ لپکا اور کھٹاک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ایک گولی فضا میں تیرتی ہوئی میرے قدموں سے چند انچ آگے تختہ فرش میں پیوست ہو گئی اور میں اپنی جگہ رُک گیا۔ بڑے بور کا بے آواز پستول میرے حق میں ان چاروں سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لیکن میں نے کامٹ پر اپنی بے خوفی ظاہر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ "ڈرتے ہو تو اسلحہ لے کر ہی سامنے آ جاؤ... میں یہاں تم سے ملنے کے لیے آیا تھا، ایسی تذلیل تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی...!"

میں یکلخت خاموش ہو گیا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ اس ملاقات میں ڈان تھری کی شرکت بھی طے تھی۔ اگر وہ آس پاس موجود تھا تو ہماری اردو میں ہونے والی گفتگو سے نابلد رہا ہو گا اس لیے میں نے فوراً انگریزی بولنی شروع کر دی۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ دوستوں اور مہمانوں کے ساتھ ایسا گھٹیا سلوک کرتے ہو۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی تم سے اشتراک کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ سامنے آ کر دو دو ہاتھ کرو کیوں کہ میں فوراً واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"براوو مائی ڈیئر ڈینی!" فضا میں ڈان تھری کی آواز گونجی۔ "ان چاروں کے مقابلے میں تم نے بہت بے جگری دکھائی ہے۔ یہ کامٹ کی نہیں بلکہ میری تجویز تھی۔ میں کچھ لوگوں کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ تم ناگہانی اور بدترین حالات میں بھی بہترین قوتِ فیصلہ اور کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ کامٹ کا ایک باصلاحیت آدمی میرے اس تجربے کی بھینٹ چڑھ گیا اور باقی تین بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے لیکن مذاکرات سے پہلے یہ مظاہرہ ناگزیر تھا۔"

"بڑا شاندار تجربہ تھا تمہارا!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اگر وہ چاروں واقعی میرے ہاتھ پیر توڑ ڈالتے تو شاید کامٹ میرا دم نکلنے کا انتظار کیے بغیر مجھے زندہ دفن کرنے کی ہدایات جاری کر دیتا۔"

"کامٹ کے بارے میں ایسی باتیں نہ سوچو۔" ڈان کا لہجہ بدستور نرم رہا۔ "ہم دونوں دوربینوں سے بغور تمہاری ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہے تھے، تمہیں خطرہ درپیش ہوتا تو مقابلہ اسی لمحے روک دیا جاتا۔"

"مجھے مجبوراً تمہاری بات پر یقین کرنا پڑے گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "لیکن پہلے نقابوں میں سامنا ہو گیا تھا، آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف آوازوں پر ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔ تم دونوں سامنے کیوں نہیں آتے؟"

"تم وہیں ٹھہرو، ہم نیچے آتے ہیں۔" تاریک کھڑکی سے آواز آئی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس تاریک کھڑکی کا جائزہ لینا چاہا مگر وہاں بے داغ اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس تاریکی کی اوٹ میں چھپا ہوا کوئی تیسرا آدمی اس وقت بھی میری نگرانی کر رہا تھا۔ میں نے بڑھ کر فرش پر سے اپنا بے آواز پستول اٹھا لیا اور اس کے میگزین کا جائزہ لینے لگا جو خالی کیا جا چکا تھا۔ میں نے پستول کی نال اس تاریک کھڑکی کی طرف بلند کی ہی تھی کہ ادھر سے ایک نئی سفاکانہ آواز ابھری۔ "پستول پھینک دو ورنہ بدن چھلنی کر دیا جائے گا!" اردو میں کہا گیا تھا۔

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے پستول والا ہاتھ گرا لیا۔ "شاید تمہیں ابھی بلایا گیا ہے، ورنہ تمہیں بھی معلوم ہوتا کہ میرے پستول کا میگزین خالی ہے میں نے تو تمہارا سراغ لگانے کے لیے نال بلند کی تھی۔ اندھیرے میں چمگادڑوں کا سراغ لگانا عموماً آسان نہیں ہوتا اس کے لیے کوئی نہ کوئی تدبیر آزمانی پڑتی ہے۔"

شاید اسے کچھ مخصوص ہدایات کے تحت اس تاریک مچان پر مامور کیا گیا تھا کیوں کہ اس نے میرے اشتعال انگیز تبصرے کا کوئی جواب نہیں دیا اور اسی اثنا میں ایک دیوار کے پیچھے سے ایک نقاب پوش سامنے آ گیا جو میرے اندازے کے مطابق کامٹ کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔

"میرے پیچھے چلے آؤ!" کامسٹ نے دیوار کی اوٹ سے نکل کر مجھ سے کہا اور دوبارہ اسی طرف غائب ہوگیا جہاں سے نمودار ہوا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ گھوما تو اسے ایک طویل اور روشن راہداری میں بڑھتے ہوئے دیکھا جو اس کمرے کا حصہ نہیں تھی۔ میں تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے ساتھ ہولیا۔ کچھ دُور چلنے کے بعد وہ داہنی طرف مڑ گیا۔ وہاں نیچے اور اوپر جانے والے زینے نظر آرہے تھے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ اس وقت ہم کون سی منزل پر تھے۔ کامسٹ نیچے جانے والے زینے اُترنے لگا تو میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ زینے ختم ہونے پر سماں بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہم جدید سہولتوں سے آراستہ کسی پُرتعیش دفتر میں پہنچ گئے ہوں لیکن مجھے شیشے کی اور چوبی دیواروں سے تقسیم کیے ہوئے وسیع ہال کا پوری طرح جائزہ لینے کا موقع نہیں مل سکا کیوں کہ کامسٹ نے اچانک میرے لیے ایک دروازہ کھول دیا تھا۔

میرے اندر داخل ہوتے ہی کامسٹ نے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا، وہ خود باہر رہ گیا تھا۔

کمرے کا فرنیچر اور آرائش کا انداز کسی بڑے کاروباری ادارے کے سربراہ کے دفتر جیسا تھا۔ فرش پر دبیز قالین موجود تھا۔ دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے منقش صوفے اور ان ہی سے ملتی ہوئی آرام دہ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ کمرے کی فضا میں ائیر کنڈیشنر کی فرحت بخش خنکی رچی ہوئی تھی لیکن اس دفتر میں روشنی کا بندوبست بہت پُراسرار تھا۔

فالس سیلنگ میں نصب تمام روشنیاں ایسے زاویے سے لگائی گئی تھیں کہ ملاقاتیوں کی نشست والا حصہ پوری طرح منور تھا۔ بڑی میز کے آگے رکھی ہوئی کرسیاں بھی روشنی میں تھیں لیکن وسیع و عریض آبنوسی میز کا عقبی حصہ، پیچھے رکھی ہوئی کرسی سمیت تاریکی میں تھا۔ روشنی اور اندھیرے کا وہ امتزاج اتنی مہارت کے ساتھ پیدا کیا گیا تھا کہ روشنی میں موجود کسی شخص کے لیے انعکاس کے باعث اپنے میزبان یا اس کی عقبی دیوار کا جائزہ لینا بھی ممکن نہیں تھا۔

"سیدھے چلے آؤ! میں تمھارا منتظر ہوں۔" میرے ٹھٹکتے ہی میز کے عقب سے ڈان کی پُرجوش آواز آئی۔ "آج تم نے اپنی پھرتی اور جنگجویانہ مہارت سے میرا دل خوش کر دیا۔ میں نے بڑی مُدت کے بعد ایسا یادگار مقابلہ دیکھا ہے۔"

"حالاں کہ اس مقابلے میں اس کے علاوہ کوئی بات نہیں تھی کہ ایک آدمی بہت بے بسی کے عالم میں دردناک موت کا شکار ہوگیا۔" میں نے آبنوسی میز کے سامنے پڑی ہوئی ایک کرسی سنبھالتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "شاید تمھیں لوگوں کی اذیت سے تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھ کر کسی قسم کی تسکین حاصل ہوتی ہے۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔" میز کے پیچھے، اندھیرے میں سے آواز اُبھری۔ "میں کامسٹ کو تمھاری صلاحیتوں کے بارے میں قائل کرنا چاہ رہا تھا جب کہ وہ متذبذب تھا۔ اسی وجہ سے ملاقات سے پہلے اچانک تم کو ایک مشکل امتحان میں ڈالنا پڑ گیا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم مقابلے میں سرخرو رہے۔ تمھیں جس ذہنی کوفت اور جسمانی تکلیف سے دوچار ہونا پڑا، اس کے لیے میں ذاتی طور پر معذرت خواہ ہوں کیوں کہ کامسٹ کے چار بہترین آدمیوں کے ساتھ تمھارے دست بہ دست مقابلے کی تجویز میری ہی تھی۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ میں اس وقت مافیا کے کسی ذمے دار شخص کے روبرو بیٹھا ہوا ہوں۔" مقابلے کی تلخی کے بعد ڈان کے رویّے نے مجھے خوشگوار حیرت سے دوچار کر دیا تھا۔

"تمھیں شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے بارے میں ہر طرف گمراہ کُن اور خوف ناک افواہیں پھیلائی جاتی ہیں۔ لیکن دراصل ہم ایسے نہیں ہیں۔ ہم کاروباری لوگ ہیں جو ہر طرح اور ہر قیمت پر ان لوگوں میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کر لیتے ہیں جو سیاست اور حکومت میں اہم ترین فیصلے کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ ان کی مدد سے ہمیں قابلِ رشک کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں اور ان ہی کامیابیوں سے ہمارے حریف حسد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اپنے طریقۂ کار کی بنا پر ہم ہر وقت باعزت مفاہمت اور تصفیے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اس میں نہ عار محسوس کرتے ہیں، نہ سُبکی۔ تمھارے ساتھ زیادتی کی گئی اور میں نے معذرت کر لی۔ اس سے میرے مقام پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

میں اس سے مافیا کی ساخت، اس کے کردار اور اثرات پر مذاکرات کرنے نہیں آیا تھا اس لیے میں نے اس کے دعووں پر کوئی اعتراض کیے بغیر سوال کیا۔ "اگر تم کو مجھ پر اعتماد تھا تو کیا وہ کافی نہیں تھا؟ تم کامسٹ سے بلند منصب پر نظر آتے ہو، تمھارے لیے اس کی تشفی اس قدر اہم اور ضروری کیسے ہوگئی؟"

"مفاہمت، باعزت مفاہمت!" اس کی آواز نرم ہوگئی تھی۔ "میں اس سے اوپر ضرور ہوں لیکن میرا اسٹیشن میلان ہے۔ مجھے سسلی سے خصوصی اختیارات کے ساتھ پاکستان بھیجا گیا ہے۔ میں اپنا کوئی آمرانہ فیصلہ مسلط کر کے چلا جاؤں تو اس کے اثرات کامسٹ کو بھگتنے پڑیں گے۔ اس لیے اس کا اعتماد اور اطمینان میرے لیے بہت اہم ہے۔"

"پھر اس وقت اسے باہر کیوں رکھا گیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔ "تمھارا یہ اقدام باہمی اعتماد کے اصول کے سراسر منافی ہے۔"

"جو باتیں میں اب کر رہا ہوں، اس کے سامنے نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی اَنا کے خیال سے اسے باہر روکا ہے ورنہ معاملے کی بات اسی کی موجودگی میں طے ہوگی۔"

"اور تم میرے سامنے نہیں آؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا انحصار ہمارے سمجھوتے پر ہے۔ میں تو دراصل درمیان کا آدمی ہوں، تمھارا اصل تعارف کامسٹ سے ہوگا۔"

"تم سامنے نہ آؤ، لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

میز کے عقب سے فوراً کوئی جواب نہیں آیا۔ چند ثانیوں کے سکوت کے بعد ڈان کی آواز اُبھری تھی۔ "یہ ناممکن ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ زدتی کے ہمراہ ہوٹل وینس آنے والوں میں تم بھی شامل تھے۔ تم لوگ میلان کے ایک مقابلۂ حسن میں زدتی کی گرل فرینڈ نادیہ بنگالا کو سپورٹ کرنے میں دلچسپی لے رہے تھے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے اعتراف کیا۔ "لیکن اس حد تک پہچان لینا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اٹلی میں میں دس بار بھی تمھارے قریب سے گزر جاؤں تو تم مجھے شناخت نہیں کر سکو گے۔"

"شاید تمھارا خیال درست ہو، اب اگر کام کی باتیں طے کر لی جائیں تو میں ممنون ہوں گا۔"

اس نے انٹرکام پر فوراً ہی کسی کو ہدایت کی اور چند ثانیوں بعد کامسٹ اپنے چہرے پر سیاہ نقاب چڑھائے اس کمرے میں آموجود ہوا۔ اس نے کچھ کہے بغیر میرے برابر والی کرسی سنبھال لی تھی۔

ان دنوں پاکستان میں مافیا کا آپریشن کراچی تک محدود تھا اس لیے کامسٹ نہ صرف کراچی بلکہ پاکستان بورڈ کا چیف بھی کہا جا سکتا تھا۔ ان کی مالی سرگرمیوں کا دائرہ محدود تھا اور تنظیم تجرباتی مراحل سے گزر رہی تھی اس لیے کامسٹ کے عملے کو مافیا کے بھرپور یونٹ کا درجہ مل نہیں سکا تھا لیکن ان لوگوں کو اطالوی مافیا کی رہنمائی ضرور حاصل تھی اور وہ آہستہ آہستہ تعمیرات، صنعتوں اور دوسرے کاروبار میں دخیل ہوتے جا رہے تھے۔ کامسٹ نے اس تعارف کے بعد مجھے اپنے نائب کی حیثیت سے کام کرنے کی پیش کش کی تو میرے پاس اسے قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہ گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے انکار کی صورت میں نرم خو ڈان کے تیور ہی بدل جاتے اور وہ شاید مجھے اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر دیتا۔

"اصولی طور پر میں تیار ہوں لیکن ہمارے درمیان مفاہمت کے لیے ایک دوسرے کا تفصیلی تعارف ضروری ہے۔" میں نے خوش دلی کے ساتھ کہا۔

"یہ بات قابلِ قبول ہے۔" کامسٹ کے کچھ بولنے سے پہلے ڈان نے تسلیم کیا۔ "اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دو۔"

کامسٹ نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ اپنے چہرے سے سیاہ نقاب اُتار دی اور میں اس کے پسینوں میں نہائے ہوئے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی بھونچکا رہ گیا کیوں کہ وہ چہرہ میرے لیے ناآشنا نہیں تھا۔

سیٹھ حبیب جیوانی کا پاکستان کے ایک مشہور کاروباری خانوادے سے تعلق تھا۔ صنعت کاری اور تعمیرات اس خاندان کے دو مرغوب شعبے تھے لیکن کچھ عرصے پہلے دنیا بھر کے اخبارات میں سیٹھ حبیب کی تصاویر کے ساتھ یہ جلی خبریں شائع ہوئی تھیں کہ پاکستان کا ممتاز صنعت کار مغربی جرمنی میں ہیروئن اسمگل کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ جرمنی کی عدالت میں مقدمے کی سماعت کے بعد سیٹھ حبیب کو پندرہ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی تھی جس میں کمی یا معافی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بعض اخبارات نے تو یہاں تک تبصرے کیے تھے کہ معاشرے میں باعزت مقام رکھنے کے باوجود سیٹھ حبیب نے جس گھناؤنے جُرم کا ارتکاب کیا تھا اس کے پیشِ نظر اسے سزائے موت بھی دی جاتی تو کم ہوتی لیکن اس کی خوش قسمتی تھی کہ جرمنی کے قانونِ تعزیرات میں ایسی کسی سزا کا وجود نہیں تھا۔ معاشرے کی اصلاح کے بجائے فرد کی اصلاح اور تربیت کے حامیوں نے قانون کی کتابوں سے سزائے موت کو یکسر خارج کرا دیا تھا۔

مغربی جرمنی میں سزایاب حبیب کو سامنے دیکھ کر میں حیران ہوا جا رہا تھا۔ آخر کار وہ اپنے چہرے سے پسینہ صاف

کرنے کے بعد خود ہی بولا تھا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم نے مجھے پہچان لیا ہے؟"

"تمھیں کون نہیں پہچانے گا؟ جیل سے کب رہا ہوئے ہو؟"

"رہا کیسے ہوتا؟ ابھی تو اپنی سزا کا ایک سال بھی پورا نہیں کیا ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا اور میں اُلجھ کر رہ گیا۔

"مغربی جرمنی کی جیل میں ایک ایسا شخص پہنچا دیا گیا ہے جو تقریباً حبیب کا ہم شکل ہے اور اسے نکال لیا گیا ہے۔" ڈان نے میری حیرت بھانپ کر وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اسی لیے حبیب کو نقاب استعمال کرنی پڑتی ہے یہ اجتماعات سے گریز کرتا ہے اور ہر اس مقام سے دور بھاگتا ہے جہاں اس کے پہچان لیے جانے کا اندیشہ ہو۔"

"یہ تو ظلم ہے کہ تم نے اپنی جگہ ایک بے گناہ انسان کو قیدی بنا دیا۔"

"ظلم نہیں، میرا ڈپلیکیٹ اسے میرا احسان سمجھتا ہے، وہ ایک تعلیم یافتہ مگر بے روزگار نوجوان تھا جس نے اپنے بہن بھائیوں اور بیمار ماں کے لیے خود کو رہن رکھا ہے۔ آزاد رہ کر وہ ان کو ایک وقت کی روٹی بھی فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی شادی کا تصور اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ اس کے گھر والوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ ولایت میں نوکری کر رہا ہے۔ ان لوگوں کو ہر ماہ ایک ہزار ڈالر کا ڈرافٹ اس کے نام سے بھجوا دیا جاتا ہے۔ آج اس کا پورا گھرانا خوشحال ہے جب وہ میری قید بھگت کر واپس آئے گا تو ایک نئی زندگی کی خوشیاں اس کی منتظر ہوں گی۔ وہ میرے آدمیوں سے نہ ٹکرایا ہوتا تو شاید اب تک مایوس ہو کر خودکشی کر چکا ہوتا۔"

"جرمنی جیسے ملک میں حکام اتنے بڑے فراڈ سے بے خبر ہیں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"آزاد اور جمہوری ملکوں میں پیسے میں بڑی قوت ہوتی ہے۔" ڈان کے فسطائی خیالات نے مجھے چونکا دیا۔ "ایک جیل سے دوسری جیل میں تبادلے کے دوران میں ہم نے اپنا کام کر لیا۔ ہمیں صرف اس ماہر کو خریدنا پڑا جو مرکزی ریکارڈ آفس میں کمپیوٹر پر قیدیوں کے فنگر پرنٹس پر رپورٹیں مرتب کرتا رہتا ہے، باقی سب تعلقات کے کرشمے تھے۔"

بات بڑی حد تک واضح ہو گئی تھی۔ سیٹھ حبیب ایک طاقتور اور بارسوخ آدمی تھا۔ اسے سزا سنائے قید ملتے ہی جیل میں اس سے مافیا والوں نے روابط قائم کیے ہوں گے اور انھوں نے اس شرط پر اسے جیل سے رہائی دلانے کی

پیش کش کی ہوگی کہ پاکستان واپس لوٹ کر وہ مافیا کے مفادات کے لیے کام کرے گا۔ اس اعتبار سے پاکستان میں مافیا کی عمر زیادہ نہیں تھی اور اسی وجہ سے اٹلی والے یہاں کے معاملات کی بھرپور سرپرستی اور دیکھ بھال کر رہے تھے تاکہ اس نوخیز پودے کو جلد از جلد ایک ایسے تناور درخت میں تبدیل کر دیں جس کی جڑیں معاشرے کے مضبوط اور مقتدر طبقوں تک پھیلی ہوئی ہوں۔

بادی النظر میں شی اور مافیا میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں میں شورہ پشت عناصر کی بھرمار تھی جو ذرا ذرا سی بات پر خونریزی کے لیے تیار رہتے تھے، دونوں کے روابط جرائم پیشہ عناصر سے تھے اور دونوں ہی پاکستان میں سرحد پار سے آنے اور تیار ہونے والی ہیروئن میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

دونوں میں کوئی فرق تھا تو صرف وہی تھا جو ڈان نے مجھے بتایا تھا اور جس کا میں خاصی حد تک خود چشم دید گواہ تھا کہ شی والوں نے ہیروئن باہر اسمگل کرنے کے ساتھ ہی اسے پاکستان کی بستیوں اور شہروں میں متعارف کرایا تھا تاکہ ڈان کے بقول ہیروئن کے عادی افراد کی حالتِ زار کے ذریعے پاکستان میں افیم کی کاشت اور لین دین کے خلاف رائے عامہ کو حرکت میں لایا جا سکے اسی کے ساتھ وہ پاکستان میں ہیروئن کی تجارت کے ہر منبع پر قابض ہونے کے لیے کوشاں تھے تاکہ مقامی منڈی سے جو فاضل مقدار بچے اسے ملک سے باہر لے جا کر سی آئی اے کے پروردہ اہل کاروں کی نگرانی میں تلف کیا جا سکے۔ اپنے طریقۂ کار کا بھرم برقرار رکھنے کے لیے وہ تھوڑی بہت ہیروئن بھاری ملاوٹ کے ساتھ غیر ملکی منڈیوں میں بھی پھیلاتے رہتے تھے۔ انھیں صرف اس وقت کا انتظار تھا جب پاکستان میں افیم اور ہیروئن سے نفرت اس انتہا کو پہنچا دی جائے جہاں اس کاروبار میں ملوث لوگوں کے خلاف انتہائی اور تشدد آمیز کارروائیوں پر بھی ان کی ہمدردی میں کوئی ردِ عمل نہ ہو۔

جب کہ مافیا ایک خالص تجارتی تنظیم تھی انھیں پاکستان کی کمزور معاشی منڈی سے ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ یہاں سے خالص ترین ہیروئن سستے داموں سمیٹ کر بین الاقوامی منڈیوں میں ایک کے سو بنا سکیں۔ ان کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ ان کا مقامی سربراہ ایک ایسا مقامی تھا جو ہزاروں کے کروڑوں بنانے کے چکر میں مغربی جرمنی کی کسی عدالت سے پندرہ سال سزا کی سند حاصل کر چکا تھا۔

"مافیا میں نقابوں اور مصنوعی چہروں کا کوئی رواج نہیں ہے۔" ڈان مجھے بتا رہا تھا۔ "ان کتابی تدبیروں کے بجائے ہمارا ہر آدمی کھل کر کام کرتا ہے اور اپنی طاقت اور صلاحیت کی بنا پر اپنا وجود منواتا ہے۔ حبیب کی مجبوری ہے کہ اسے پہچان لیا گیا تو اسے گرفتار کر کے مجرموں کے تبادلے کے بین الاقوامی معاہدے کے تحت جرمنی بھجوا دیا جائے گا اور ہمارا کھیل تباہ ہو جائے گا اس لیے حبیب نقاب میں رہ کر فرضی نام استعمال کرتا ہے لیکن تمھیں یہ فائدہ ہے گا کہ تم کھل کر سامنے آسکو گے اور اپنی کارکردگی سے اپنا مقام منوا سکو گے۔"

"کام کرنے کے بنیادی اصول کیا ہوں گے؟" میں نے براہِ راست اسی سے سوال کیا۔

"کبھی بھی، کسی بھی حالت میں اور کسی بھی قیمت پر تم کہیں کے قانون سے تعاون نہیں کرو گے۔ آپس کے اختلافات ہوں یا حریفوں سے معرکہ آرائی، تم کبھی بھی کسی جرم یا اس کا ارتکاب کرنے والوں کی قانون کے محافظوں کو نشان دہی نہیں کرو گے خواہ تمھیں اور مافیا کو اس کی کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے اور اگر کبھی قانون کی گرفت میں آگئے تو اپنی آخری سانس تک سختی کے ساتھ اور مکمل زبان بندی رکھو گے تمھاری زبان سے مر کر بھی کوئی ایسا لفظ نہیں نکلنا چاہیے جس سے مافیا یا وسیع تر مفہوم میں جرائم پیشہ برادری کے کسی بھی رکن کو ذرا بھی نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ یہی ہمارے کام کرنے کے اصول ہیں اور یہی مافیا کا حلفِ وفاداری ہے جسے توڑنے کی سزا صرف اور صرف موت ہوتی ہے۔ ان اصولوں سے انحراف کرنے والے کو روئے زمین پر کہیں امان نہیں ملتی غداروں کو اپنی اوّلین فرصت میں دوسروں کے لیے عبرت کا شاہکار بنانا ہماری کاروباری ترجیحات میں ہمیشہ سرِ فہرست چلا آیا ہے۔ اب تم ہمارے ساتھی بن چکے ہو اس لیے حبیب اسی وقت تم سے تمھارے مذہب اور عقیدے کے مطابق، تمھاری مذہبی کتاب پر وفاداری کا حلف لے گا۔"

اس کی گفتگو سن کر میرے بدن کے تمام مساموں کے دہانے کھلتے چلے گئے اور گیلی قمیص کے نیچے پشت پر پسینے کی لکیریں باریک باریک سانپوں کی طرح رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میں شی کے ساتھ اور اس کے خلاف اَن گنت جرائم کا ارتکاب کرتا چلا آیا تھا لیکن میں نے کبھی اس زاویے سے نہیں سوچا تھا۔ ڈان نے جو کچھ کہا اس کا ایک ایک لفظ قانون کی حکمرانی کے خلاف شیطانی منشور معلوم ہو رہا تھا۔ ان لوگوں سے معاملات طے کرتے ہوئے مجھے اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا کہ ان مذموم سرگرمیوں میں کہیں حلف جیسی کڑی پابندی کا بھی دخل ہو سکتا تھا۔

"تم نے جو کچھ کہا اس سے تو کاروبار کا کوئی تعلق نہیں نکلتا، سارا زور قانون سے بغاوت پر ہے۔" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد جھجکتے ہوئے کہا کیوں کہ اس وقت میں ڈان تھری کا ماتحت ہوں۔

"کون سا قانون؟" اس کے لہجے میں تیزی آگئی۔ "جو آتشِ جہنم سے مجبور ہو کر چوری کرنے والے کو جیل میں سڑا دیتا ہے لیکن کھاتوں میں ہیر پھیر کر کے لاکھوں بلکہ کروڑوں کے سرکاری اور قومی محصولات غبن کرنے والوں کو معزز شہری قرار دے کر ان سے مذاکرات اور سمجھوتے کرتا ہے! تم کس قانون کی بات کر رہے ہو؟ جس قانون کی گہرائی میں جاؤ گے وہ مجبوروں اور محکوموں کو آسودہ اور مقتدر لوگوں کی پناہ گاہوں سے دور روکتا ہوا نظر آئے گا۔ مافیا نے معاشرے کے ایسے ہی پسے ہوئے طبقوں میں اور ان کی حمایت سے جنم لیا تھا پھر ان لوگوں نے اپنے وقت کے قانون سے ٹکرا کر آہستہ آہستہ طاقت پکڑی اور آج نپولین کا پُر آشوب دور گزرنے کے سیکڑوں برس بعد بھی مافیا زندہ ہے۔ سسلی کی سرزمین کا چپہ چپہ تمھیں مافیا کی خدمت اور قربانیوں کی لازوال کہانیاں سنائے گا۔ آج طبقۂ امرا کے لوگ ہوٹلوں، جوئے خانوں، تفریح گاہوں اور نجی قحبہ گھروں کے مالک ہیں۔ دنیا کی ممتاز سیاسی سماجی اور مذہبی شخصیتوں کے گھوڑے عالمی ریسوں میں دوڑتے ہیں۔ ان میں بے ایمانیاں کی جاتی ہیں لیکن جب ہم لوگ ایسے کاموں میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو انھیں کاروبار کے بجائے منظم جرائم کے اڈے تصور کیا جانے لگتا ہے، قانون سایہ بن کر ہمارا تعاقب کرتا ہے۔ وہ ہمیں تہس نہس کر دینا چاہتے ہیں اور ہم قانون کی ہر دستاویز کے چیتھڑے اڑانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ یہ جنگ آج نہیں، بہت پرانی ہے۔ تم مافیا کا مزاج نہیں بدل سکتے۔"

ایک ہلکی سی چٹ کی آواز کے ساتھ آبنوسی میز کے اوپر چھت میں نصب تیز روشنی جل اٹھی اور میری نظریں اونچی پشت گاہ والی، گھومنے والی کرسی میں دھنسے ہوئے اس سفید فام پر مرکوز ہو گئیں جس کے چہرے کے نقوش میرے لیے کچھ کچھ جانے پہچانے تھے، ڈان نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیا تھا۔ اس کی چمک دار آنکھوں

میں کسی سانپ کی آنکھوں جیسی مقناطیسی کشش تھی جو شکار کو مسحور کر دیتی ہے اور سانپ دھیمے دھیمے سرک کر اس کا شکار کر لیتا ہے۔ مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس کی شخصیت بہت بھرپور اور بارعب تھی۔ اس کے چہرے کی تیکھی ساخت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ دیتا تھا اسے کر گزرنے کی طاقت اور اہلیت بھی رکھتا تھا۔

"میں تمھارا ممنون ہوں ڈان! کہ تم نے مجھے اپنی رونمائی کے قابل سمجھا۔" میں نے اس سے مرعوب ہو کر غیر ارادی طور پر کرسی سے قدرے اُٹھتے ہوئے سر کو خم دے کر کہا۔ "تمھاری گفتگو اثر انگیز اور پُرمغز ہے۔ قانون تو ہر ایک سے انصاف کا داعی ہوتا ہے۔ معاشرے کے مراعات یافتہ طبقوں کا تحفظ کرنے والی دستاویز کو کون قانون کہہ سکتا ہے؟"

"زمانہ بدل گیا ہے اَب مافیا صرف کھیتوں، کھلیانوں جاگیروں اور مزارعوں پر حکومت نہیں کرتی۔ ہم وسائل کے مالک ہیں۔ قانون جن کا پشت پناہ ہے ان سے ہماری آویزش چلتی ہے اور ہم اچھے اور بُرے، جائز اور ناجائز، تمام ذرائع استعمال کر کے انھیں زک پہنچاتے ہیں۔ ہمارے اپنے مفادات اور ترجیحات ہیں جنھیں ہر قیمت پر حاصل کیا جاتا ہے لیکن اس صدی کے وسط میں ہیروئن نے کاروبار کے تصور میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔" وہ نپے تلے لہجے میں بول رہا تھا۔ "کاروبار ہیروں کا ہو یا ہیروئن کا، کاروبار ہی کہلاتا ہے۔ آج ہیروئن اس مقام پر ہے کہ تجارت میں دنیا کی کوئی جنس اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس پر بے اندازہ منافع ہے۔ یہ سرمایہ پیدا کرتی ہے اور سرمایہ ہی آج کی دنیا میں ہر طاقت کا منبع ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ ایک ایسی پیداواری منڈی میں بیٹھے ہوئے ہو جو دنیا کی بہترین ہیروئن کی تیاری میں خود کفیل ہے۔ تمھاری زرخیز پہاڑی ڈھلانوں پر ہیروئن کے خام مال کی کاشت سے لے کر سرحدی پٹی میں ہیروئن کشید کرنے والے کارخانوں تک ہر سہولت موجود ہے۔ اس کی خالص مقدار پر جو بھاری منافع ہوتا ہے وہ اپنی جگہ پر ہے لیکن اس میں بھاری مقدار میں بے ضرر کیکٹوز ملا دی جائے تو نفع سیکڑوں گنا بڑھ جاتا ہے۔ تمھیں اپنی ساری توجہ اسی پر مرکوز کرنی ہے۔"

"یہ میرا پہلا کام ہوگا مگر اس کے لیے مجھے شی کے رابطوں کا توڑ کرنا ہوگا۔ وہ ایک عرصۂ دراز سے اس علاقے میں کام کر رہے ہیں اور شاید ابتدا میں ان ہی سے ہماری محاذ آرائی ہوگی۔"

"تمھیں اپنے فیصلے کرنے میں حبیب کا تعاون حاصل رہے گا۔ یہ بھی شی کو اپنے لیے سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتا ہے لیکن میں اتنا ضرور بتا دوں کہ ہیروئن کی بڑی کھیپ باہر نہیں بھیجی جائے گی۔" ڈان نے کہا۔ "ابھی تھوڑی تھوڑی مقدار نئے چہروں کے ذریعے ملک سے باہر بھیجنی ہوگی۔ وہ لوگ منزل پر مال طے شدہ لوگوں کے حوالے کریں گے جو اسے ہمارے تھوک فروشوں تک پہنچانے کے ذمے دار ہوں گے۔ اس کے آگے فروخت اور تقسیم کے لیے ایک مربوط نظام پہلے سے موجود ہے۔" اس نے اشارے سے میز کے اوپر چھت میں جلتی ہوئی روشنی گل کر دی اور یک بیک اندھیرے میں معدوم ہو گیا۔

"میں ان ہدایات کے لیے تمھارا مشکور ہوں۔" آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا اندھیرا دور ہونے پر میں نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ "جو کچھ میری بساط میں ہے وہ میں کر گزروں گا۔"

"کس سے بات کر رہے ہو؟" میرے برابر سے حبیب نے حیرت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"تم سے نہیں، میں ڈان سے مخاطب تھا۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"ڈان جا چکا ہے۔ اب ہمیں آپس میں کچھ باتیں طے کر لینی چاہئیں!" اس نے مجھے مطلع کیا۔

"وہ کہاں چلا گیا؟ ابھی تو یہیں تھا۔" میں نے حیرت اور بے یقینی کے ساتھ کہا کیوں کہ روشنی میں سے گزرے بغیر نکاسی کے راستے تک پہنچنا ناممکن تھا اور جب ڈان نے میز کے اوپر روشنی کی تھی تو میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے پیچھے والی سپاٹ دیوار میں نکاسی کا کوئی راستہ موجود نہیں تھا۔

"یقین نہیں آتا تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو!" اس نے میز کے گرد گھوم کر دوبارہ وہی روشنی جلا دی جو ڈان نے آخر میں گل کر دی تھی اور میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ میز کے پیچھے خالی کرسی پڑی رہ گئی تھی، ڈان لاپتا تھا۔

حبیب نے اس کی چھوڑی ہوئی کرسی سنبھال لی۔ اس پوزیشن میں وہ خاصا باوقار نظر آ رہا تھا۔ معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کا مجرموں کی کسی تنظیم سے کسی قسم کا رابطہ ہوگا۔

"مغربی جرمنی کی جیل سے میرے فرار کا راز ابھی تک فاش نہیں ہوا ہے۔" مجھے حیران دیکھ کر سیٹھ حبیب

نے لگا۔ "لیکن میں جانتا ہوں کہ میں ایک مفرور مجرم ہوں اس لیے میں نے اپنے دفتر سے نکاسی کے لیے بہت سے خفیہ راستے رکھے ہوئے ہیں جن کی مدد سے کسی کی نظروں میں آئے بغیر آناً فاناً میں یہاں سے نکل سکتا ہوں۔ ڈان کو میں نے اپنے بعض انتظامات سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ آمد و رفت کے لیے ایسا ہی ایک راستہ استعمال کرتا ہے۔"

"ایسی آزادی کس کام کی کہ اپنے ملک میں بھی تم چوروں کی طرح رہنے پر مجبور ہو!"

"اس آزادی کی قدر تم نہیں جان سکتے۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ "میں جیل کے بجائے آرام سے اپنے گھر میں سوتا ہوں۔ میری بیوی اور سینڈو کے بعد پاکستان میں تم تیسرے شخص ہو جسے میں نے اپنے راز میں شریک کیا ہے ورنہ میرے والدین اور پورے خاندان والے یہی سمجھتے ہیں کہ میں قید بھگت رہا ہوں۔"

"تمھارا پورا خاندان آسودہ اور خوش حال ہے۔ کیا تمھارے فرار کے بعد ان میں سے کسی نے جرمنی جا کر جیل میں تم سے ملاقات کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"کئی بار کوششیں کی گئیں لیکن میں نے، یعنی میری جگہ قید بھگتنے والے نے جیل کے حکام سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے جرم پر اس قدر شرمسار ہے کہ سزا پوری ہونے تک اپنے خاندان کے کسی فرد کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔" وہ ایک مغموم مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "میرے رشتے دار اس کے لیے تحفے وغیرہ چھوڑ کر مایوس اور بے نیل و مرام واپس لوٹ آتے ہیں۔ اپنی خفیہ آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے مجھے بڑی جدّ و جہد کرنی پڑی ہے۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، گرفتاری کے وقت تم ایک معصوم بچے کے باپ بھی تھے۔"

"لالچ، ہوس اور چڑھتے ہوئے خون کی لغزش نے مجھے بالکل برباد کر دیا ہے۔" اپنے دُکھوں پر بات کرنے کے لیے شاید میں اسے پہلا آدمی میسّر آیا تھا اس لیے وہ کُھل کر بات کر رہا تھا۔ "میری بیوی نے مجھے ساتھ رکھنے کے لیے ساس سسر سے زبردستی لڑائی مول لی ہوئی ہے اور ایک الگ تھلگ فلیٹ میں رہتی ہے تاکہ کسی کو میرے وجود کی ہوا بھی نہ لگ سکے۔ میری خاطر وہ ہر الزام اور طعنہ ہنس کر سہہ رہی ہے۔ اپنے تین سالہ بچے کو اس نے ہمارے خاندانی المیے کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا ہے۔ میں اسے دور سے دیکھ آتا ہوں لیکن اس سے مل نہیں سکتا کیونکہ وہ بچہ ہے باپ سے ملاقات کی خبر آناً فاناً میں ہر طرف پھیلا دے گا۔ وہ اپنی ماں سے سوال کرتا ہے کہ بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے بچّوں کے ماں باپ ان سے ہفتے پندرہ دن میں ملنے آتے ہیں لیکن اس کا باپ نہیں آتا۔ وہ کہاں رہتا ہے؟ اور اس سے ملنے کے لیے کیوں نہیں آتا؟ وہ اسے بہلا بہلا کر تھک گئی ہے۔ مجھے پورے پندرہ سال اسی عذاب میں گزارنے ہیں۔ اس دوران میں میرا بیٹا ہوش سنبھال لے گا اور پھر اسے خود بخود سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ وہ اپنوں میں رہ کر بھی اجنبی بنے رہنے پر مجبور تھا۔ کسی سے دل کی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ ماں باپ تک سے ملنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں ان کا اطمینان اس کے محنت سے بنائے ہوئے منصوبے کا راز نہ فاش کر دے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی آزادی پر ضرور خوش تھا لیکن مافیا کو اس کی قیمت ادا کرنے پر خوش نہیں تھا۔ مافیا کے لیے کام کرنا اس کی مجبوری بن گئی تھی لیکن اس وقت میں حبیب سے اس نازک موضوع پر کوئی سوال کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

"سینڈو تمھارے اس راز میں کیسے شریک ہو گیا؟" میں نے آہستگی سے سوال کیا۔

"میری تباہی کا ذمے دار وہی ہے۔ میں نے ایک زیرِ تعمیر ہوٹل کا سودا کر لیا تھا۔ سینڈو وہیں سوئچ روم کا فورمین تھا۔ نہ جانے اس میں کیا خاص بات تھی کہ وہ میرے مُنہ چڑھے ملازمین میں شامل ہو گیا۔ ہوٹل کی تکمیل کے لیے میں نے بینک میں قرضے کے لیے درخواست دی۔ وہ کروڑوں کا پروجیکٹ تھا، مذاکرات طول پکڑتے گئے لیکن قرضہ ملنے کی کوئی اُمید نظر نہیں آئی۔ دوسری طرف مجھ پر خاندان کے بڑوں کا دباؤ بڑھنے لگا۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ میں نے غلط سودے میں ہاتھ ڈال کر اپنی ساری عمر کی جمع پونجی داؤ پر لگا دی تھی۔ ان تنقیدوں سے دل برداشتہ ہو کر میں نے وہ ادھورا پروجیکٹ اسی حالت میں کسی اور کو بیچنے کی ٹھان لی لیکن کافی کوششوں کے بعد اس کا کوئی خریدار پیدا نہ ہو سکا۔ وہ ہوٹل میرے لیے ایک آزار بنتا جا رہا تھا۔ پھر ان ہی دنوں سینڈو نے میری پریشانی بھانپ کر مجھے ہیروئن اسمگل کرنے کی راہ سجھائی۔ اس کا خیال تھا کہ پاکستان سے باہر حاصل ہونے والے خطیر زرِ مبادلہ کی رقم میں بیرونِ ملک پاکستانیوں کے فرضی نام سے ملک میں واپس لا کر بڑی آسانی کے ساتھ کسی قرض کے بغیر اپنا ہوٹل مکمل کر سکتا تھا۔ ہوٹل میرے لیے انا کا مسئلہ بنتا جا رہا تھا۔ میں نے کچھ لوگوں سے زرِ مبادلہ کی ملک میں آمد کے بارے میں مشورے کیے اور مجھے حکومت کی این آر آئی اسکیم کا علم ہوا جس میں

میں سینڈو کے دلکش مشورے کے جال میں پھنستا چلا گیا۔ دس کلو ہیروئن اسی نے مجھے مہیا کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس مقدار کو اسمگل کر کے میں دس کروڑ روپے کا خطیر زرِ مبادلہ ملک میں لا سکتا تھا۔ ہوٹل مکمل کر کے بھی میرے پاس بہت کچھ بچ رہتا۔ میرا سامان پاکستان سے جہاز پر چیک اِن ہوا تو میں نے سمجھا کہ آدھا مرحلہ طے ہو گیا لیکن فرینکفرٹ ایئرپورٹ پر اس وقت میرے سارے خواب بکھر گئے جب انسدادِ منشیات کے جرمن ماہرین نے تربیت یافتہ کتوں کی نشاندہی پر میرے سامان کی تفصیلی جانچ پڑتال کا فیصلہ کر لیا اور یوں میں پل بھر میں ایک معزز شہری سے بین الاقوامی اسمگلروں کی صف میں جا کھڑا ہوا۔“

”لیکن وہ موذی ابھی تک تمہاری آستین میں پل رہا ہے جو ایک بار تمھیں ڈس چکا ہے تمھیں تو واپس آتے ہی پہلی فرصت میں اسے شوٹ کر دینا چاہیے تھا۔“

”گرفتاری کے وقت میرا فیصلہ یہی تھا لیکن بعد میں وہ میری مجبوری بن گیا۔“ حبیب اتنا کہہ کر خاموش ہوا اور میں اسے ٹوکے بغیر اس کے دوبارہ بولنے کا منتظر رہا۔

”سزا یابی کے بعد جیل میں مافیا والوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا تو یہ شرط رکھی کہ رہائی پا کر میں پاکستان میں ان کے لیے ہیروئن پر کام کروں۔“ چند ثانیوں کے سکوت میں وہ اپنے خیالات کو مربوط کرنے کے بعد بولا۔ ”میرے سامنے کوئی انتخاب نہیں تھا۔ میں جیل سے رہائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا پھر جب پورا منصوبہ سامنے آیا تو میرے سامنے صرف سینڈو کا نام تھا جس پر میں بھروسا کر سکتا تھا۔ مافیا والے اسے اپنے خرچ پر مجھ سے ملوانے کے لیے جرمنی لائے۔ سینڈو میرے انجام پر بہت شرمندہ تھا۔ میں نے وہیں اس سے رازداری کا وعدہ لے کر اسے اپنا ہم شکل تلاش کرنے کا کام سونپا۔ میں نے اسے مافیا والوں کی اصلیت سے آگاہ کیے بغیر ان کا تعارف اپنے مقامی دوستوں کی حیثیت سے کرایا تھا۔ میں قید میں تھا اور سینڈو آزاد۔ وہ چاہتا تو واپس جا کر مجھے اور مجھ سے کیے ہوئے وعدے کو فراموش کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے چند ہفتوں میں ہی میرا ایک مناسب ترین ہم شکل ڈھونڈ لیا جو ضرورت مند بھی تھا۔ اس طرح میری رہائی میں سینڈو کا بہت بڑا دخل تھا۔ پاکستان واپس آنے کے بعد مجھے مافیا کے لیے کام کرنا تھا جس کے لیے میں ڈان تھری سے حلف لے کر آیا تھا لیکن مجھے نہ ہیروئن کے بارے میں معلومات تھیں اور نہ زیرِ زمین دنیا سے کوئی واقفیت تھی۔ اس لیے ایک بار پھر میری نگاہِ انتخاب سینڈو پر گئی۔ اس بار بھی اس نے مجھے مایوس نہیں کیا اور یوں وہ آج تک میرے ساتھ ہے۔ وہ ایک ایسے وفادار کتے کی طرح ہے جو خوشی میں اتفاقاً اپنے مالک کو دانت مار دے تو اور بات ورنہ اس کی حفاظت کے لیے لڑتے ہوئے اپنے ٹکڑے بھی اڑوا لے تو شکایت نہیں کرتا۔ میرا راز اس نے اپنے سینے میں دفن کیا ہوا ہے اور دوسروں کے سامنے اس بات کا ذرا بھی اظہار نہیں ہونے دیتا کہ وہ مجھ سے کتنا قریب ہے۔“

”بڑی عجیب اور ناقابلِ یقین کہانی ہے تمھاری۔“ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ ”کس خاندان کے چشم و چراغ ہو، کیسی گندی دلدل میں آگرے ہو...!“

”بس!“ اس نے فضا میں ہاتھ بلند کر کے میری بات کاٹ دی۔ ”ڈان کے کہنے پر تمھارے سامنے اپنی نقاب اتارنے کی وجہ سے میں نے تم سے اتنی باتیں کر لی ہیں۔ ویسے بھی اب تم میرے دستِ راست بن گئے ہو، لیکن تم کو مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں بہت خوش ہوں اور اب میں نے اپنے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے۔“

وہ مجھ سے اپنا فاصلہ قائم رکھنے کے لیے صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اندر ہی کرب اور گھٹن میں مبتلا تھا لیکن وہ میری اس سے پہلی تفصیلی ملاقات تھی جس میں میرے لیے حد سے تجاوز کرنا مناسب نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ اچانک میرا باس بنا دیا گیا تھا لہٰذا میں صرف ”سوری“ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

سیٹھ حبیب ہیروئن کی تباہ کاریوں کی ایک اور مثال تھا۔ اس کا ایک رُخ وہ تھا جو کراہتے، سسکتے، بلکتے اور ہمکتے ہوئے ہزاروں نشے باز پاکستان کے ہر شہر اور گلی کوچے میں پیش کرتے تھے اور دوسرا رُخ سیٹھ حبیب پیش کر رہا تھا۔ جو مال دار اور عیال دار ہونے کے باوجود مختصر ترین مدت میں کروڑوں کمانے کی ہوس میں مبتلا ہو کر عزت اور آبرو سے محروم ایک ایسا پنچھی بن چکا تھا جو نہ قفس کا قیدی تھا اور نہ اسے اپنی پرواز کی آزادی حاصل تھی۔ اس نے عارضی طور پر اپنا وقت گزارنے کا بندوبست کر لیا تھا۔ بیوی کی ہمدردیاں جیت کر اس کی رفاقت حاصل کی ہوئی تھی کیونکہ اس بیچاری کے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے تین سالہ بچے کو اپنی سیاہ بختی سے بے خبر رکھنے کے لیے ہاسٹل میں ڈال دیا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیٹھ حبیب کی پیشانی کا داغ خود بخود اس بچے کے علم میں آنے والا تھا۔ جب اسے یہ معلوم ہوتا کہ اپنے باپ کے لالچ کی وجہ سے وہ ایک معزز اور آسودہ گھرانے کا نورِ نظر نہیں بلکہ ہیروئن کے ایک اسمگلر کا بیٹا بن چکا تھا تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس کا ناپختہ کار ذہن کن ہولناک راہوں کا انتخاب کرتا۔

”جس سُرخ کار میں تمھیں یہاں لایا گیا ہے، وہ اب تمھارے ہی استعمال میں رہے گی۔“ سیٹھ حبیب کی آواز نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ ”ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ تمھیں شراب نوشی کے علاوہ کوئی اور بڑا شوق نہیں ہے، اس لیے تمھاری کارکردگی سامنے آنے تک تمھارا کوئی باقاعدہ مشاہرہ مقرر نہیں کیا جا رہا، تم اپنی جائز ضروریات کے لیے جو کچھ چاہو لے سکتے ہو۔ تم نے مجھ سے تفصیلی تعارف حاصل کر لیا ہے، میرے نام سے بھی واقف ہو گئے ہو، لیکن یہ نام اب اس وقت تک کے لیے تمھارے دل و دماغ میں دفن ہو جائے گا جب تک جرمنی میں میری سزا کی مدت پوری نہیں ہو جاتی یا میرے ہم شکل کو نیک چال چلن کی وجہ سے قبل از وقت جیل سے رہائی نہیں مل جاتی۔ تم بھول کر بھی کہیں اور کبھی میرا نام نہیں لو گے۔ میرے آدمی مجھے چیف کے نام سے پکارتے اور پہچانتے ہیں۔ یہی لقب تم بھی میرے لیے استعمال کرو گے۔ آج سے ہماری تنظیم میں تم میرے دستِ راست ہو گے۔ تمھارے بعد سینڈو کا درجہ ہو گا۔ اس نے ایک غلط مشورہ دے کر میری زندگی ضرور تباہ کر ڈالی لیکن بعد میں اس نے میرے لیے جو کچھ کیا، اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ اس کو ڈیل کرتے ہوئے یہ حقیقت تمھیں ہر وقت ذہن نشین رکھنا ہو گی۔“

”اس وقت تمھارے پاس کل کتنی نفری ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”سینڈو سمیت کُل پندرہ آدمی تھے۔ دو کل رات تمھارے فلیٹ کے باہر لڑتے ہوئے مارے گئے، ایک آج تمھاری مہم جوئی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اس کے بعد کُل بارہ آدمی بچے ہیں جن میں سے چار زخمی ہو کر زیرِ علاج ہیں۔“

”وہ میری مہم جوئی نہیں تھی۔ تمھارے اور ڈان کے بنائے ہوئے منصوبے نے مجھے اس مقابلے میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔ یہ تمھاری بدقسمتی تھی کہ تمھارا ہی ایک آدمی اس کا اینڈ مین بن گیا۔“

”اب وہ صرف میرا نہیں، تمھارا بھی آدمی تھا۔“ اس نے نادیبی لہجے میں میری تصحیح کی۔ ”میں ابھی اپنے آٹھوں آدمیوں کو بلاتا ہوں تاکہ تمھارا ان سے بھی تفصیلی تعارف ہو جائے۔ دو چار روز میں سارا کام تم ہی کو سنبھالنا ہے، میں پس پردہ رہ کر صرف تم سے رابطہ رکھوں گا۔ روپوشی اور نقاب کے استعمال کی وجہ سے میں آزادانہ نقل و حرکت میں شدید دشواری محسوس کرتا ہوں۔“

”تم بے فکر رہو۔ جیسا چاہو گے، وہی ہو گا لیکن فی الحال تعارف کا معاملہ ملتوی کر دو، مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے، اس کے بعد ہی میں اپنا طریقۂ کار طے کر سکوں گا۔ البتہ اس وقت میں سینڈو سے ضرور ملنا چاہوں گا کیونکہ وہ تمھارا خاص آدمی ہے۔ مقابلے کے دوران ہمارے درمیان خاصی تلخی پیدا ہو گئی تھی، اس کا بھی دور کیا جانا ضروری ہے۔“

”تم فکر نہ کرو، اس کے دل میں تمھاری طرف سے کوئی کدورت باقی نہیں رہے گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے انٹرکام اُٹھا لیا اور دھیمی آواز میں کسی کو کچھ ہدایات دینے کے بعد ریسیور رکھ دیا۔

”یہ دفتر کہاں واقع ہے؟“ میں نے اپنے لیے نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ شہر کی ایک مشہور تجارتی عمارت کا تہ خانہ ہے۔ گراؤنڈ فلور کا کچھ حصہ اور پورا تہ خانہ میرے تصرف میں ہے۔ اسے ایک برآمدی کمپنی کے دفتر کی حیثیت دی گئی ہے۔ دفتری اوقات میں یہاں باقاعدہ عملہ موجود ہوتا ہے۔ مجھے آنا ہوتا ہے تو میں صدر دروازے کے بجائے ٹیلی فون کیبل کی زیرِ زمین سُرنگ استعمال کرتا ہوں جہاں سے ایک راستہ براہِ راست اس کمرے میں نکالا گیا ہے۔ تم جب چاہو گے یہاں آ سکو گے، دفتر کی ایک چابی تمھارے پاس رہے گی۔“

میرے ذہن میں کئی سوال اُبھرے تھے۔ دفتر سے مُراد وہ کمرا تھا یا گراؤنڈ فلور کا وہ حصہ جسے ایک برآمدی کمپنی کے دفتر کا روپ دیا گیا تھا۔ وہ لوگ ایک معروف کاروباری علاقے میں بیٹھے ہوئے تھے اس لیے برآمدی کمپنی کا بھرم برقرار رکھنے کے لیے کچھ کاروبار بھی ضروری تھا، پھر سب سے اہم بات یہ تھی کہ دفتری عملہ الگ سے ملازم رکھا گیا تھا یا مافیا کے ان ہی آدمیوں میں سے کچھ لوگ دن میں دفتری ذمے داریاں انجام دیتے تھے اور ان سب کی رہائش کا بندوبست کہاں تھا؟ لیکن دروازے کی طرف سے ایک بیپ سگنل کی گونج سنتے ہی سیٹھ حبیب ادھر متوجہ ہو گیا اور میں کوئی سوال نہ کر سکا۔

”اس دروازے پر دُہرا الیکٹرانک لاک لگا ہوا ہے۔ ڈان کی موجودگی میں یہ آف تھا لیکن میں ہر وقت محتاط رہتا ہوں۔ یہ سگنل فوٹو سیل کے ذریعے موصول ہوا ہے۔“ مجھ سے یہ کہتے ہوئے وہ میز پر رکھے ہوئے ایک ڈیسک انسٹرومنٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”کون ہے؟“ اس نے بھاری اور تحکم آمیز آواز میں سوال کیا تھا۔

”سینڈو!“ دوسری طرف سے احترام کے ساتھ مختصر جواب دیا گیا اور حبیب نے انسٹرومنٹ پر ”کم اِن“ کہہ کر اسی انسٹرومنٹ پر یکے بعد دیگرے دو بٹن دبائے اور دروازہ کھول کر سینڈو اندر آ گیا۔ دروازہ خود کار نظام کے تحت بند ہو گیا۔

سینڈو کسی گینڈے کی طرح سر جھکا کر اپنی ٹھوڑی سینے سے لگائے ہوئے آگے بڑھا تھا۔ میں پلٹ کر دلچسپی کے ساتھ

اس کا مشاہدہ کر رہا تھا پھر اس نے جوں ہی سر اٹھایا، مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں پھر چند ثانیوں میں ہی ان پھیلی ہوئی آنکھوں میں میرے لیے نفرت اور حقارت اُبھرنے لگی۔

"ہوش میں آؤ سینڈو!" حبیب صورتِ حال کی نزاکت بھانپ کر غرایا۔ "تم کسی سڑک پر نہیں، میرے دفتر میں ہو۔"

سینڈو نے اپنے مالک کی آواز سنتے ہی سر جھٹک کر ایک جھرجھری لی جیسے اس آواز نے اسے نیند سے جگا دیا ہو۔ "سوری چیف! میں گستاخی کی معذرت چاہتا ہوں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا پھر حبیب پر نظر پڑتے ہی اس کا منہ پھاڑ کی طرح کھل گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا چیف ایک ایسے اجنبی کے سامنے نقاب ہٹا کر خود کو ظاہر کر دے گا جسے کچھ دیر قبل چیف خود اپنے چار آدمیوں سے پٹوانے پر تلا ہوا تھا۔

سینڈو آگے آ کر حبیب کی ہدایت پر کرسی پر بیٹھ گیا لیکن وہ دفتر میں نظر آنے والی صورتِ حال کی طرف سے بے چین تھا۔

"وہ حقیقی مقابلہ نہیں بلکہ اس نئے دوست کا امتحان تھا۔" حبیب نے بلاتمہید بات شروع کر دی۔ "تم چاروں کو اسلحہ اسی لیے نہیں دیا گیا تھا کہ مجھے جسمانی طاقت اور صلاحیت کا موازنہ مقصود تھا اور تم نے دیکھ لیا کہ اس نے تم چاروں پر اپنی برتری ثابت کر دی۔" اس نے ایک لحظے کے لیے رُک کر سینڈو کو کوئی تبصرہ کرنے کا موقع دیا لیکن اسے یک بہ یک چُپ لگ گئی تھی۔ حبیب نے پھر اپنی بات شروع کر دی۔ "میری دُشواریاں تمھارے سامنے ہیں۔ ان کے توڑ کے لیے ہم نے ڈینی کو اپنی ٹیم میں شامل کیا ہے۔ اب تمھارا زیادہ تر اسی کے ساتھ رابطہ رہے گا۔ ڈینی براہِ راست مجھے جواب دہ ہوگا۔"

میری توقع کے خلاف سینڈو نے کرسی سے اُٹھ کر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہاتھ ملاتے ہوئے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے بہت شرافت اور نرمی سے ہاتھ ملایا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تمھیں مجھ سے اور میرے ساتھیوں سے پورا تعاون ملے گا چیف!" اس نے حبیب سے کہا تھا۔

حبیب کی بریفنگ کے بعد میں نے سینڈو کو بتایا کہ ابھی وقت تک میں نے صرف اسی سے تعارف حاصل کیا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھیوں سے ایک آدھ روز کے بعد ملاقات ہونی تھی اس لیے اسے میرے بارے میں کسی سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ سینڈو شہ زور اور غصیلا ضرور تھا لیکن کینہ پرور نہیں تھا۔ اس کے ابتدائی ردِعمل اور حبیب کی وضاحت کے بعد اس نے مجھے ایک بار بھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ تھوڑی دیر قبل اس کے ساتھ میرا ایک خونریز مقابلہ ہو چکا تھا۔ اس مقابلے میں اس کا ایک ساتھی تو ہلاک ہو گیا تھا اور دوسرا بھی بُری طرح زخمی ہوا تھا۔

سینڈو چلا گیا تو میں نے بھی رسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر اُٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن حبیب نے مجھے چونکا دیا۔ "سب کچھ تو ہوتا رہے گا۔ ابھی تک تم نے حلفِ وفاداری نہیں لیا ہے۔ اس کے بغیر آج کی ملاقات نامکمل رہے گی۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ باتوں میں وہ اس ناپسندیدہ موضوع کو بھول گیا تھا لیکن وہ اپنے کام کو خوب سمجھتا تھا اسی لیے بازی کے ساتھ اپنے وعدوں کو نباہ رہا تھا۔

"حلف غیر ضروری ہے، ہم کسی نیک کام کا سمجھوتا نہیں کر رہے جو حلف لینا پڑے۔ تم میرے ریکارڈ سے واقف ہو، میں ہمیشہ ہی جرائم کی دُنیا سے وابستہ رہا ہوں اور ویسے بھی میں مذہب سے بہت دور ہوں، جو کچھ پڑھا اور سنا ہے اس پر کبھی عمل کرنے کی نوبت ہی نہیں آ سکی، اس لیے میں حلف نہیں لے سکتا...."

"یہ ناممکن ہے ڈینی!" وہ مجھے گھورتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔ "میری چھت کے نیچے تم مافیا کے ضابطوں کو مسترد نہیں کر سکتے۔ ڈان نے جو کہہ دیا ہے وہ تمھیں ہر حال میں کرنا پڑے گا ورنہ تم خود نتائج کا اندازہ لگا سکتے ہو۔"

طویل دوستانہ گفتگو کے بعد اس معاملے پر حبیب کے لہجے میں اجنبیت پیدا ہو گئی تھی جو میرے لیے تشویشناک تھی لیکن یہ میرا اٹل فیصلہ تھا کہ جب میں نے اپنے مذہب کو کسی اچھے کام کے لیے استعمال نہیں کیا تھا تو مافیا کے ساتھ کھلی کھلی قانون شکنی کے شیطانی معاہدے میں بھی کسی قیمت پر اسے درمیان میں نہیں لانا تھا۔

حبیب میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میرا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں تیزی کے ساتھ اس صورتِ حال کا ادراک کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو میرے دوٹوک انکار کی صورت میں اس تہ خانے میں رونما ہو سکتی تھی۔

ایک بات تو سامنے تھی کہ میں اکیلا تھا اور حبیب کے ایک اشارے پر اس کے کم از کم آٹھ صحت مند اور مسلح آدمی کسی بھی لمحے مجھے اپنے نرغے میں لے سکتے تھے۔

میرا ذہن بہت تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا لیکن اس پیچیدہ صورتِ حال سے نکلنے کی کوئی صورت ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ میرا انکار قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا اور میں حلف نہ اٹھانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

حبیب کی سرد اور کسی بھی قسم کے ہمدردانہ جذبات سے عاری نگاہیں چند ثانیوں تک میرے چہرے پر جمی رہیں۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر میرے اندر کا حال پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا پھر شاید وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا کیونکہ اس نے ڈرامائی انداز میں اپنے چہرے پر وہی سیاہ نقاب منڈھ لیا جسے ڈان نے ٹھری کے اشارے پر اتارا تھا۔

اس کا وہ اقدام میرے نزدیک طبلِ جنگ پر چوٹ پڑنے کے مترادف تھا۔ نقاب اوڑھ کر اس نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اس موڑ پر میری اور اس کی ذات سے آگے بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ میرے کس بل نکلوانے کے لیے اپنے ان آدمیوں کو بھی طلب کر سکتا تھا جو ہمیشہ سے اسے نقاب میں دیکھتے آئے تھے اور صرف اس کی آواز کی اطاعت کر کے اپنی روزی کماتے تھے لیکن میں اس وقت کسی نئے تصادم سے بچنا چاہتا تھا۔

"کیا کچھ عجلت میں ہو؟" میں نے فضا پر چھائے ہوئے جمود کو توڑنے کے لیے سرسری لہجے میں سوال کیا۔ حقیقت میں، میں اسے باتوں میں اُلجھا کر صرف اتنا وقت حاصل کرنا چاہتا تھا کہ میرا ذہن کسی حتمی نتیجے پر پہنچ سکے جس کی روشنی میں اس تصادم کا بھیانک خطرہ ٹل جانے کا امکان پیدا ہو جاتا۔

"عجلت کیسی؟" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "آج تو تم سے دوستی ہوئی ہے۔ جب تک اس کے سارے ضابطے پورے نہ ہو جائیں، ہم دونوں میں سے کوئی بھی واپس نہیں جا سکے گا۔ تم بریفنگ میں ہمارے بارے میں بہت کچھ جان گئے ہو۔ ہمارے ہو گئے تو ہمارے ہو کر رہو گے ورنہ...!" اس نے دانستہ اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"نہیں رہو گے!" میں نے اس کی بات مسکراتے ہوئے پوری کر دی۔ "یہ تو تم مجھے کھلی کھلی دھمکی دے رہے ہو، عجلت میں نہیں۔ ہمارا ایک دوسرے سے تفصیلی تعارف بھی ہو چکا ہے، اس کے باوجود تم نے اپنے چہرے پر نقاب منڈھ لیا ہے۔ آخر بات کیا ہے؟ تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟ اس وقت میں تمھارا نائب ہوں، اس لیے ایک خاص حد تک تمھارا احترام کروں گا۔ اس سے آگے میں صرف اپنی زندگی کے لیے لڑنا جانتا ہوں۔ پیشہ ور ان گنت حریفوں کو میں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک چکا ہوں۔" آخری فقرے ادا کرتے ہوئے میں نے مسکرانا موقوف کر کے دانستہ اپنا لہجہ کرخت کر لیا۔ "دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ میرا رویہ مختلف ہوتا ہے۔"

"ٹھیک، اب ہر قیمت پر مافیا کا حلفِ وفاداری اُٹھانا پڑے گا۔" اس کا لہجہ بھی فیصلہ کن تھا۔ "تم اپنے انکار پر اڑے رہے تو دوستی کی ابتدا ہی خون آشام دشمنی سے ہو گی۔ تیسرے آدمی میرے ایک اشارے پر تمھیں دوبارہ گھیر لیں گے۔"

"ڈان ہوتا تو شاید تمھارا لہجہ اتنا غیر محتاط نہ ہوتا۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"ڈان ہوتا تو میرے بولنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ یہ تمھاری خوش نصیبی ہے کہ وہ جا چکا ہے اور میں تمھیں نتائج سے آگاہ کر کے تمھیں اپنا فیصلہ بدلنے کی مہلت دے رہا ہوں۔ وہ ہوتا تو حلف برداری سے تمھارا انکار سنتے ہی تمھاری پیشانی کے وسط میں پگھلا ہوا سیسہ اُتار دیتا۔ صدیوں سے یہ روایتی حلف، مافیا کی پُرشکوہ تنظیم کا بنیادی پتھر چلا آ رہا ہے، اس سے انحراف کرنے والا کبھی مافیا کا وفادار نہیں ہو سکتا۔"

"میں نے حلف کو غیر ضروری قرار دیا ہے، اس سے انحراف تو نہیں کیا۔" میں نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔ "اتنی سی بات پر میرے ساتھ اتنی تلخ کلامی تمھیں زیب نہیں دیتی، تم تو تصادم پر تلے ہوئے نظر آ رہے ہو۔"

میری اس قلابازی نے اسے چکرا کر رکھ دیا اور وہ فوری طور پر میری بات کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔ چند ثانیوں کے توقف میں سنبھالا لینے کے بعد وہ بولا تھا۔ "تم حلف اٹھانے کے لیے آمادہ ہو؟"

"تمھاری بنیاد کے پہلے پتھر کو کون ہلا سکتا ہے؟ تم بتا ہی چکے ہو کہ حلف نہ اٹھایا تو تمھاری صفوں میں شامل نہیں ہو سکوں گا اور تمھارے ساتھ شامل ہوئے بغیر اب میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایسی صورت میں میرے انکار کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، میں تو تمھاری شرط پوری کرنے کی کوئی قابلِ عمل راہ سوچ رہا تھا۔"

"قابلِ عمل راہ صرف ایک ہی ہے کہ حلف اُٹھا لو...!"

"تم مسلمان ہو اور حلف اُٹھا کر ہی مافیا کے رکن بنے ہو اس لیے میں سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ میں بھی تمھارے ہی مذہب کے تحت حلف لے لوں۔ تم لوگوں کے یہاں شاید جھوٹے سچے حلف چلتے ہی رہتے ہیں۔" میں نے اسے چکر دینے کے لیے مکارانہ لہجے میں کہا۔ اس وقت میرے ذہن میں گلوخلاصی کی یہی ایک راہ آ سکی تھی۔

"تت... تو تم مسلمان نہیں ہو؟" اس کی آواز تحیر آمیز ہو گئی تھی۔

"شاید تم میرا نام بھول گئے ہو!" میں نے براہِ راست انکار یا اقرار کیے بغیر طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اس وقت تم پیٹر واک بنے ہوئے ہو لیکن اس سے پہلے تم ڈینی کے نام سے پہچانے جاتے تھے، اصل نام کیا ہے تمھارا؟" اس نے حیرت سے سوال کیا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اس کی بے خبری سے فائدہ اُٹھا کر میں اپنے لیے درمیانی راہ نکال سکتا تھا۔

"اپنا اصل نام تو میں خود بھول چکا ہوں۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اس سے پیشتر کہ تم میرے بارے میں مزید منفی باتیں سوچو میرے لیے اسلامی طریقے سے حلف لینے کا بندوبست کرو۔"

"یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔" اس نے اپنے نقاب پوش چہرے کو دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے کہا۔ "تم کرسچین ہو تو تمھیں عیسائی طریقے سے ہی حلف اٹھانا ہوگا۔ تم اسلام کو درمیان میں نہیں لا سکتے۔"

میں تلخ انداز میں ہنس پڑا۔ "آ گئے اسی بات پر۔ تمھارا مذہب ہے اس لیے تم اس کے ٹھیکیدار ہو۔ تمھارے جو مزاج میں آئے وہ سلوک کر سکتے ہو، جھوٹی قسمیں اور مجرمانہ حلف لے سکتے ہو لیکن دوسرے کو اس پر ذرا بھی تصرف کی اجازت نہیں دو گے۔ یہی بات میں بھی کہہ رہا تھا کہ میں لاکھ بُرا، بدکار اور مجرم سہی لیکن میرا ضمیر مجھے یہ اجازت نہیں دیتا کہ جب میں عمر بھر اپنے مذہب اور اس کے احکام سے غافل رہا تو اب ایک خونریز اور مجرمانہ معاہدے کے لیے اسے درمیان میں لاؤں۔ تم نے جو بدسلوکی اپنے مذہب سے کی اب وہی مجھ سے میرے مذہب کے خلاف کرانا چاہتے ہو۔ یہ ناگزیر بدسلوکی اب مجھے کرنی ہی ہوگی۔"

میں اس کے ذہن کو سمجھ رہا تھا اس لیے میرا وار بھرپور اور کارگر رہا۔ اپنی زبان سے کچھ کہے بغیر میں اسے یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ مجھ سے انجیل پر حلف لیا جانا ضروری تھا۔ اس طرح میں نے اپنے آبائی مذہب اور اپنی کتابِ مقدس کو مافیا والوں کی دست برد سے بچانے کی راہ نکال لی تھی۔

زندگی کے اس موڑ پر مجھے یہ شرمناک اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں نے اپنی پوری مجرمانہ زندگی میں کبھی مذہب اور اس کی اخلاق پرور تعلیمات پر توجہ نہیں دی اور اسی عدم توجہی کی وجہ سے جرائم اور گناہوں کی اس بھیانک دلدل میں پھنستا چلا گیا جہاں مجھے اپنے بارے میں بھی فیصلے کرنے کا اختیار نہیں رہا تھا۔ میرا مذہب، دین اور دھرم بس ان باتوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا جو میں نے بچپن میں اپنے والدین کے سایۂ عاطفت میں پڑھ لی تھیں اور وہ ذہن میں پیوست ہو کر رہ گئی تھیں انھی میں سے ایک بات وہ بھی تھی جو مولوی عبدالمجید نے بچپن میں زور دے کر مجھے سمجھائی تھی کہ مسلمان اللہ کی نازل کی ہوئی چاروں کتابوں اور سارے نبیوں اور پیغمبروں پر ایمان رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتایا تھا کہ یہ اسلام کا معجزہ تھا کہ اللہ کی آخری کتاب حافظوں کی بدولت صدیوں سے جوں کی توں چلی آ رہی تھی جس میں نہ تحریف کی گئی تھی اور نہ کوئی یہ جسارت کر سکتا تھا۔ جب کہ دوسری تینوں کتابوں میں بار بار پادریوں، پروہتوں، کاہنوں اور ربیوں نے اپنے مفاد اور مذہبی اقتدار کی خاطر ایسی ایسی ترمیمات کی تھیں کہ ان الہامی صحیفوں کی اصلیت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔

بچپن میں ذہن میں پڑی ہوئی اس بات کی وجہ سے مجھے یقین تھا کہ سیٹھ حبیب مجھ سے مافیا کی وفاداری کا حلف لینے کے لیے جو انجیلِ مقدس منگوائے گا وہ انجیل ہرگز ہرگز نہ ہوگی، الفاظ، سطروں، صفحات، متن اور مفہوم میں من مانی تبدیلی کے بعد وہ انجیل کے سوا کچھ بھی کہی جا سکتی تھی اس لیے اس پر لیا ہوا حلف، حلف ہرگز نہ ہوتا۔ ایسے میں جب چاہتا توڑ سکتا تھا۔ مافیا میں شامل ہو کر بھی آزاد رہنے کے لیے یہ واحد صورت تھی جو مولوی عبدالمجید کے بھولے بھٹکے حوالے سے میرے ذہن میں نمودار ہوئی تھی اور یہ میری خوش نصیبی تھی کہ سیٹھ حبیب مجھ سے انجیل پر حلف لینے پر تل گیا تھا۔

سیٹھ حبیب نے ایک مرتبہ پھر اپنے چہرے سے نقاب اتار دی اور چند گہرے سانس لینے کے بعد اس نے اپنی میز کی ایک نچلی دراز سے بائیبل نکال کر میز پر میرے سامنے رکھ دی۔ بائیبل کے ابتدائی صفحات کے درمیان رکھا ہوا کاغذ نکال کر اس نے اپنے سامنے میز پر رکھ لیا تھا۔

"اب تم اپنا داہنا ہاتھ بائیبل پر رکھ کر میرے ساتھ لفظ بہ لفظ وہی کچھ دہراؤ گے جو میں کہتا جاؤں گا۔" اس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے کاغذ پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے جواب میں کچھ کہے بغیر بائیبل کی جلد پر ہاتھ رکھ دیا اور سیٹھ حبیب نے رک رک کر مجھے اس کے ادا کیے ہوئے الفاظ دہرانے کا موقع دیتے ہوئے کاغذ سے حلف کے الفاظ پڑھنا شروع کر دیے جو تثلیث کے عقیدے اور بائیبل کے حوالے سے ہوتے ہوئے مافیا کے مفادات پر مرکوز ہو گئے۔ اس حلف نامے کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ اٹل اور ذو معنی تھا۔ برسوں پہلے جس کسی نے اس عہد نامے کا مسودہ لکھا تھا، بہت سوچ سمجھ کر اس انداز میں لکھا تھا کہ جرم کے خلاف قول، فعل اور عمل کی ہر وہ آزادی سلب کر لی گئی تھی جس کے ذریعے جرم کی خفیف سی بھی نشان دہی ہوتی ہو یا جرم کا ارتکاب کرنے والے کو قانون کے محافظوں یا معاشرے کے امن پرور طبقوں سے کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال پیدا ہو۔ رازداری اور قانون سے عدم تعاون پر اتنا زور دیا گیا تھا کہ اپنی برادری یا مافیا برادرہڈ سے باہر بیوی، بچوں، والدین اور یا محبوبہ تک سے اپنی سرگرمیاں پوشیدہ رکھنے کا عہد لیا گیا تھا۔ اپنی طویل زندگی میں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بیسویں صدی کے اس روشن خیال اور ترقی یافتہ معاشرے میں نامور مجرموں کی کوئی بین الاقوامی تنظیم ایسے قدامت پرستانہ حلف کے ذریعے اپنے کارکنوں کو رازداری کا پابند بناتی ہوگی جس کا ایک ایک لفظ جرم اور گناہ کے شیطانی جذبات سے مغلوب تھا۔

انفرادی جرم کی بات اور تھی۔ اس کا ارتکاب وقتی اشتعال یا کسی مجبوری کے تحت بھی ہو سکتا تھا۔ انفرادی مجرموں میں ایسی مثالیں ایسی ملتی تھیں کہ کسی بڑی واردات میں غیر متوقع طور پر کثیر دولت ہاتھ آنے کے بعد مجرم نے اپنے ماضی کو بھلا دیا ہو اور ڈکیتی میں ہاتھ لگنے والے سرمائے کے سہارے از سرِ نو ایک نیک نام زندگی کا آغاز کیا ہو لیکن مافیا نے اپنے جرائم کا تانا بانا اس طرح بنا ہوا تھا کہ اس کی صفوں میں شامل ہونے کے بعد ماضی یا جرم و گناہ سے تائب ہونے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی تھی۔ جرائم کی منصوبہ بندی، سرپرستی اور ارتکاب کو ایک فن کا درجہ دے دیا گیا تھا جس پر نہ منصب اثر انداز ہو سکتا تھا نہ مالی حیثیت۔ مافیا کا گروہ بند بن جانے کے بعد تائب ہونے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا تھا۔ آدمی جرم کرتے ہوئے اپنی طبعی موت کی آغوش میں جا پہنچتا اور اگر کسی مرحلے پر اپنا دامن آلودگی سے بچانا چاہتا تو خود اس کے ساتھی اسے موت کے گھاٹ اتار دیتے۔

حلف کی تکمیل تک کئی ایسے مقامات آئے جہاں میرے بدن میں خوف سے پھریریاں سی دوڑ گئیں لیکن مجھے اطمینان تھا کہ میں اس کا پابند نہیں تھا کیونکہ میں نہ عیسائی تھا، نہ تحریف شدہ بائیبل میرے نزدیک قابلِ اعتبار تھی۔

حلف مکمل ہوتے ہی سیٹھ حبیب نے کرسی چھوڑ دی اور باہر آ کر گرم جوشی سے میرے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔ "اب تم ہمارے دوست اور رازدار ہو۔ ہمارے مفادات اور دشمن آج کے بعد بلکہ اسی لمحے سے مشترک ہوں گے۔"

"یہ راز میرے لیے آج تک ناقابلِ فہم تھا کہ مافیا اتنی مدت سے کیوں زندہ ہے؟ ارب پتی اور اونچے عہدوں پر فائز لوگ اس کے لیے کیوں کام کرتے رہتے ہیں؟ لیکن آج میری نگاہوں پر سے پردے ہٹ گئے۔ بہت جلد وہ دن ضرور آئے گا جب عملاً دنیا میں ہر طرف مافیا کا راج ہوگا۔ ایسے سخت جانوں کے سامنے تو حکومتیں بھی نہ ٹھہر سکیں گی۔" میں نے اس سے الگ ہوتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"برازیل، چلی اور جنوبی امریکا کی بہتیری ریاستوں میں زمامِ اقتدار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔" اس نے اپنی کرسی پر واپس جاتے ہوئے فخر آمیز لہجے میں کہا۔ "جرنیل اور صفِ اول کے لیڈر ہمارے ہمدرد ہیں۔ شاید تمھیں یہ سن کر حیرت ہو کہ ہماری سرگرمیاں صرف ان ملکوں میں گہری نہیں ہیں جہاں آمر حکمرانی کر رہے ہیں بلکہ جمہوری ممالک بھی ہماری محفوظ ترین پناہ گاہیں ہیں۔ وہاں اسمبلیاں موجود ہیں لیکن وہ لوگ وہی قانون منظور کرتے ہیں جسے مافیا کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔"

"تم ایک ناقابلِ یقین بات کہہ رہے ہو۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "آمریت میں بہت آسانی ہوتی ہے کہ فردِ واحد یا دو تین افراد سے سودا کر لیا جائے لیکن پوری اسمبلیاں کس طرح مجرموں پر مشتمل ہو سکتی ہیں؟"

میرے سوال پر وہ عارفانہ انداز میں ہنسا۔ "رفتہ رفتہ یہ سب باتیں تمھاری سمجھ میں آ جائیں گی۔"

"پھر بھی مجھے کچھ تو بتاؤ۔" میں نے اصرار کیا۔ "مجرموں کے انتخاب جیتنے کے بارے میں آج تک کچھ نہیں سنا گیا۔"

"ہم لوگ تو انتخاب جیت ہی نہیں سکتے۔" اس نے اعتراف کیا۔ "لیکن جو لوگ اپنی مالی مجبوریوں کے باوجود الیکشن جیتنے کے لیے بے چین ہوتے ہیں ہم معاہدہ کر کے کھلے دل سے ان کی مدد کرتے ہیں اور بے دریغ پیسہ لٹا کر ان کے خوابوں کو دلکش حقیقت کا روپ دے دیتے ہیں پھر ہماری دلچسپی کے موضوعات پر زبانیں ان کی چلتی ہیں الفاظ ہمارے ہوتے ہیں، منصوبے وہ بناتے ہیں مفادات ہمارے پروان چڑھتے ہیں۔ بڑی محنت اور ریاضت کے بعد ہم نے چند ایوانوں میں اپنے ہمدردوں کی اکثریت پیدا کی ہے۔ ایسے لوگوں پر ہمیں اخبارات، ٹیلی وژن، جرائد و رسائل اور نجی محفلوں کے ذریعے مستقل سرمایہ کاری کرنی پڑتی ہے تاکہ لوگوں کی نظروں میں ان کے امیج کو بہتر سے بہتر بنایا جا سکے اور اگلے الیکشن میں بھی ان کی کامیابی یقینی ہو۔ ان بے چاروں کو علم بھی نہیں ہوتا لیکن ہم اپنے بنائے ہوئے شیشے کے ان نازک پتلوں کی دن رات حفاظت کرتے ہیں۔ ان کے مخالفین پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ ان میں سے جو سرکش اور زبان دراز نظر آئے اسے ہر قیمت پر سیاسی پیش منظر سے ہٹا دیتے ہیں خواہ اس کے لیے کوئی مالی یا اخلاقی اسکینڈل بنانا پڑے یا حادثے، پرانی دشمنی یا قاتلانہ حملے کے ذریعے اسے ہمیشہ کی نیند سلانا پڑے، ہم اپنا مقصد حاصل کر کے رہتے ہیں۔"

"تم اتنے اعتماد سے یہ سب باتیں بتا رہے ہو جیسے ان فیصلوں میں تمھیں بھی شریک کیا جاتا رہا ہو؟" میں نے قدرے حیرت اور بے یقینی کے ساتھ سوال کیا۔

"میری جیل سے آزادی اس بات کا ثبوت ہے کہ مافیا بہت بارسوخ اور طاقتور ہے۔" اس نے کہا۔ "ان لوگوں کو کیا ضرورت ہے کہ مجھے جھوٹی کہانیاں سنائیں؟ میں نے جو کچھ سنا اس پر یقین کر لیا اور تمھیں شاید یہ معلوم کر کے اور زیادہ حیرت ہوگی کہ مافیا کسی ایک تنظیم کا نام نہیں ہے جس میں فردِ واحد کا حکم چلتا ہو۔"

"تو کیا یہ جمہوری قاتلوں کا ٹولا ہے جہاں کثرت رائے سے فیصلے کیے جاتے ہیں؟" میرے ذہن میں سوال ابھرا جو میں دریافت نہیں کر سکا کیونکہ بہ ظاہر میں خود انہی میں سے ہو چکا تھا اس لیے پوچھا "تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"مافیا کا وطن سسلی ہے۔ ذرا سا اور بڑھ جاؤ تو یہ اٹلی میں کام کرتی ہے۔ اٹلی سے باہر جو لوگ مافیا کے وسائل سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں انھوں نے مدر مافیا سے باقاعدہ الحاق کیا ہوا ہے۔ مدر مافیا کے آپریشن دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں جنھیں اٹلی سے کنٹرول کیا جاتا ہے لیکن جن ملکوں میں الحاقی تنظیمیں موجود ہیں وہاں کے معاملات مقامی قیادت کی صوابدید پر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ ہر چھوٹی یا مقامی مافیا کم و بیش ایک خاندانی تنظیم ہوتی ہے جس میں باپ کی موت پر بیٹا ڈان یا سربراہ بنتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ خاندان سے باہر کا کوئی فرد مافیا کی سربراہی سنبھالے۔ مافیا کے حلف کی پاسداری کرتے ہوئے بہت سے ڈان آپس میں بھی برسرپیکار رہتے ہیں لیکن ان تنازعات میں قانون یا پولیس کو کبھی ملوث نہیں کیا جاتا۔ ان جھگڑوں میں شدت آ جائے تو فیصلہ اٹلی یا سسلی میں موجود سپر ڈان ہی کراتا ہے۔ اس کا فیصلہ آخری اور حتمی ہوتا ہے جس کی پابندی ہر فریق کے لیے لازمی ہوتی ہے۔ سپر ڈان کی اس روایتی بالادستی کے علاوہ ہر خاندان یا مافیا کا ہر یونٹ اپنے معاملات میں خود مختار ہوتا ہے جس کے لیے مقامی ڈان کو جواب دہ نہیں ہوتا۔"

"لیکن تمہارے لیے میلان سے ڈان تھری کو خصوصی اختیارات کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم بھول رہے ہو کہ پاکستان میں ہم ابھی تنظیمی مراحل [illegible] ہیں۔ مدر مافیا والوں نے مجھے فرینکفرٹ کی جیل سے رہا کرا کے یہاں مامور کیا ہے۔ ابھی میں ڈان نہیں بنا ہوں بلکہ مقامی یونٹ کا چیف ہوں۔ میرا اپنے خاندان والوں اور اپنے وسائل سے رابطہ ٹوٹا ہوا ہے۔ میرے تمام ذاتی اور تنظیمی اخراجات اٹلی سے آ رہے ہیں۔ جس دن بھی ہم اپنے مالی اور انتظامی معاملات میں خود کفیل ہو گئے مجھے ڈان کا درجہ مل جائے گا جس کے بعد میں روایتی طور پر صرف سپر ڈان کو جواب دہ رہ جاؤں گا۔ ڈان تھری میرے ساتھ برابری کی بنیاد پر گفتگو کرنے پر مجبور ہوگا۔"

"حلف میں یہ ذکر بہت نمایاں ہے کہ باہمی مناقشات میں نہ قانون کا سہارا لیا جائے گا نہ اس بنا پر کسی بھی مجرم کو بلیک میل کیا جائے گا خواہ مافیا کو اس کی کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے لیکن تمھیں بلیک میل کر کے مافیا کے لیے کام کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ یہ امتیاز کیوں برتا گیا؟"

"حلف لینے کے باوجود تمہارے ذہن سے شکوک و شبہات کی دھند صاف نہیں ہو سکی ہے۔" اس نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں لیکن صرف تمہاری تسلی کے لیے بتا رہا ہوں کہ مجھے ذرا بھی بلیک میل نہیں کیا گیا۔ یہ ایک سیدھا سادا سودا تھا۔ میں فرینکفرٹ میں سزا یاب ہو چکا تھا۔ وہاں جیل میں مافیا والوں نے رہائی کے عوض مجھے اپنے لیے کام کرنے کی پیشکش کی۔ میں انکار کر دیتا تو وہ مجھے بھول جاتے اور میں [illegible] سال تک قید بامشقت جھیلتا رہتا۔ اپنی آزادی کی خاطر میں نے وہ پیشکش قبول کر لی۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کسی بھی وقت میری نیت میں کوئی کھوٹ پیدا ہوا تو پولیس کو میری طرف متوجہ نہیں کیا جائے گا بلکہ کوئی نادیدہ سایہ اچانک میری زندگی کا چراغ گل کر دے گا۔ قانون کا خوف میرا اپنا ہے کیونکہ یہاں کی پولیس کو اگر میرے فرار کی بھنک بھی مل گئی تو وہ سارے وسائل یکجا کر کے مجھے فرینکفرٹ جیل کے جہنم میں دوبارہ جھونک دے گی جہاں قانون کے محافظ تو درکنار، عام قیدی بھی ہیروئن کے اسمگلروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔"

"میرے ذہن کی دھند رفتہ رفتہ ہی صاف ہوگی۔ میں مشین نہیں ہوں کہ ایک بٹن دباتے ہی ذہن کی سلیٹ ایک دم سادہ ہو جائے۔ شبہات کو اپنے ذہن میں پروان چڑھانے کے بجائے میں انھیں ہاتھوں ہاتھ صاف کر لینا بہتر سمجھتا ہوں۔"

"اب ہمارا رابطہ فون پر ہوا کرے گا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد ایک کمرشل وزیٹنگ کارڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کارڈ پر ٹریڈ لائن نامی فرم کے نام اور پتے کے ساتھ دو فون نمبر بھی موجود تھے۔ "یہ دونوں نمبر میرے ہیں۔ میں نہ رہوں تو سینڈو ضرور موجود رہتا ہے۔ تم بے خوف و خطر اسے ہر پیغام دے سکتے ہو لیکن یہ یاد رکھنا کہ میرے لیے صرف چیف کا لقب استعمال کرنا ہوگا۔ سیٹھ حبیب جیوانی تمہارے لیے ایک اجنبی نام بن جائے گا۔"

"اسی طرح فی الحال میں بھی صرف شوٹر کہلانا پسند کروں گا۔ ڈینی کے نام سے شی والے چوکنے ہو جائیں گے۔ میں ان پر بے خبری میں اپنا بھرپور وار کرنا چاہتا ہوں..."

"تم جیسا چاہو کر سکتے ہو لیکن میں تمھیں اتنا ضرور بتا دوں کہ دنیا میں کہیں بھی شی والوں نے مافیا کے کسی رکن سے براہ راست الجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "ہمارے ساتھ آ جانے کے بعد وہ تم پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکیں گے۔ ہمارا تم سے رجوع کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ تمھیں تحفظ فراہم کر سکیں۔"

"تحفظ کی بات [illegible] رہنے دو۔ تم نے دیکھ ہی لیا کہ شی کے [illegible]

بلاواسطہ ٹکرا کر بھی میں ابھی تک زندہ ہوں۔ دوسری بات یہ کہ میں کوئی غیر جانبدار شخص نہیں تھا جسے تم نے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ پہلے میں شی کے لیے سرگرمی سے کام کرتا رہا پھر اس کی قیادت سے باغی ہو گیا۔ مجھ پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ان کے پاس عذر ہے کہ تم نے ان کے باغی کو پناہ دی ہے۔ اس بہانے سے وہ میرے خلاف کوئی بھی کارروائی کر گزریں گے اور پھر سسلی والوں کو قائل کر دیں گے کہ اقدام درست تھا۔"

"یہ اس دفتر کی چابی ہے۔" اس نے شی کے موضوع پر بات بڑھائے بغیر ایک چابی میرے حوالے کر دی۔ "اس چابی کے ذریعے دن یا رات میں کسی بھی وقت تم اس دفتر میں داخل ہو سکتے ہو۔ میرے اس کمرے کے علاوہ ہر حصہ تمہارے تصرف میں ہوگا۔"

"تمہارے آدمیوں کے لیے میری شناخت کیا ہوگی؟" میں نے سوال کیا۔

"چابی کو غور سے دیکھو۔ یہ بہت اہم ہے اور یہی تمہاری شناخت بھی۔ چابی کے سوراخ کے گرد ایک ڈیزائن کی صورت میں پانچ دائرے بنے ہوئے ہیں جن میں مافیا کے پانچوں انگریزی حروف الٹی ترتیب میں نقش ہیں۔"

"یہ تو کسی کلب کی کلید معلوم ہوتی ہے۔" میں نے غور سے چابی کا جائزہ لیتے ہوئے تبصرہ کیا۔

وہ ہولے سے ہنس پڑا۔ "ہمارے کلب بھی ہیں۔ یہاں کراچی میں اپنے قدم جمانے کے لیے اس وقت بھی ہم نے ایک کلب کھولا ہوا ہے جہاں شہر کے بارسوخ افسران بڑے شوق سے آتے ہیں۔ اکثر افسران اپنی بیگمات کے بجائے اپنی جاننے والیوں کو ساتھ لاتے ہیں اور اب یہ سب ہماری مٹھی میں ہیں کیونکہ بند کمروں میں ہونے والی تمام سرگرمیوں کی وڈیو فلمیں بنتی ہیں۔ ان لوگوں سے جب بھی ہمیں کوئی کام لینا ہوگا یہ وڈیو فلمیں اہم رول ادا کریں گی۔"

"اور اس اڈے پر علاقے کی انتظامیہ کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟"

"خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں بے چاری انتظامیہ کیا کر سکتی ہے جب کہ انتظامیہ کے اہم کل پرزے خود وہاں موجود ہوتے ہیں۔ پھر شہر کے اس خوش پوش علاقے میں کسی کو اپنے پڑوس تک سے غرض نہیں ہوتی۔ بڑے بڑے احاطوں کے وسط میں بنا ہوا ہر مکان رازوں کا ایک جزیرہ ہے۔ اندر رات بھر شراب پی کر اودھم بھی مچایا جائے تو پڑوسیوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی پھر وہاں باقاعدہ آنے والی کئی گاڑیوں پر سرکاری نمبر پلیٹیں ہوتی ہیں۔ لوگ سرکاری معاملات میں مداخلت کے الزام سے ویسے ہی گھبراتے ہیں۔"

"چلو کسی مناسب موقع پر تمہارے کلب کی سیر بھی کر لی جائے گی۔" میں نے خوش دلی کے ساتھ کہا۔ "تم نے یہ نہیں بتایا کہ میرے لیے تمہارے آدمیوں کی کیا پہچان ہوگی؟ وہ گمبی گمبی والا احمقانہ قصہ اب ختم ہونا چاہیے۔"

"اسے تو ختم ہی سمجھو۔" اس نے میز کی دراز سے سو سو کے نوٹوں کی ایک سربند گڈی نکال کر میرے آگے ڈالتے ہوئے کہا۔ "اب تمہاری مرضی یا خواہش کے بغیر کوئی تمہاری نگرانی نہیں کرے گا۔ سب آدمیوں سے ابھی سینڈو تمہارا تعارف کرا دے گا۔ ان کے پاس کوئی شناختی نشان نہیں ہوتا۔ انھیں کسی بھی خاص مہم کے لیے ایک پاس ورڈ دیا جاتا ہے۔ اسی سے ان کی شناخت ہوتی ہے۔ یہ چابی میرے اور تمہارے علاوہ صرف سینڈو کے پاس ہے۔ اس کے ذریعے تم دنیا میں کہیں بھی مافیا والوں میں تعارف حاصل کر سکتے ہو۔ عرف عام میں ہم اسے کامیابی کی کلید کہتے ہیں۔"

میں نے نوٹوں کی گڈی بے پروائی سے اپنی جیب میں ڈال لی اور بولا۔ "کم از کم ایک آدمی ہر وقت میرے ساتھ رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ چند روز بعد میں اس کی ضرورت محسوس نہ کروں۔"

"اب سب تمہارے سامنے ہوں گے۔ جسے چاہو اپنی حفاظت پر مامور کر سکتے ہو۔"

"یہاں تک رسائی کے خفیہ راستے نہیں [illegible]" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ میرا نجی راز ہے۔ اس میں میں تمھیں شریک نہیں کر سکتا۔ ڈان کو میں نے صرف احتراماً ان راستوں سے [illegible] کیا تھا بلکہ میں اسے یہ اطمینان دلانا چاہتا تھا کہ میں نے حفاظت کا پورا بندوبست کیا ہوا ہے۔"

اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ معاملات طے ہو جانے کے بعد وہ زیادہ دیر تک وہاں رکنے پر آمادہ نہیں تھا اس لیے میں نے خود ہی روانگی کا [illegible] اور اس نے ڈیسک انسٹرومنٹ استعمال کر کے فوراً ہی سینڈو کو اندر طلب کر لیا جو شاید اپنے مالک کے حکم کے انتظار میں باہر دروازے سے لگا کھڑا تھا۔

"اب تم سب پیٹر واک کی کمان میں رہو گے۔" سیٹھ حبیب نے اسے ہدایات دینی شروع کر دیں۔ "تم بھول جاؤ کہ اس کا اصل نام ڈینی ہے۔ اب اس کا اصل نام پیٹر واک ہوگا لیکن صرف تمہارے لیے۔ آدمیوں میں یہ شوٹر کے نام سے پہچانا جایا کرتا ہے۔ اب اسے لے جاؤ اور ادب و احترام کے ساتھ اپنے آدمیوں سے ملوا دو۔ اس کی طرف سے کسی کے دل میں بغض یا کینہ باقی رہا تو میں اسے دیکھ لوں گا۔"

"تم بے فکر رہو چیف!" وہ سر جھکا کر بولا۔ "میرے ہوتے [illegible]

ہوئے کوئی دم بھی نہیں مار سکے گا۔ شابو کی میت تیار ہے اگر شوٹر اس کی تدفین میں شرکت کرے تو دوسروں کے ذہنوں پر اچھا اثر پڑے گا۔“

”وہ اپنے فیصلے خود کرے گا۔“ سیٹھ حبیب نے درشت لہجے میں اس کا مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ”وہ تم سے بہت سینیئر اور تجربے کار آدمی ہے جو مناسب سمجھے گا، کرے گا۔“

”آؤ شوٹر!“ اسینڈو نے مردہ سی آواز میں کہا اور سر جھکا کر نکاسی کے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے عجلت میں سیٹھ حبیب سے ہاتھ ملایا اور اس کے پیچھے ہو لیا۔ میری دانست میں وہ لڑنے بھڑنے والا ایک وفادار ماتحت ضرور تھا لیکن اس کی ذات میں قائدانہ صلاحیت کا فقدان تھا ورنہ اس کے ہوتے ہوئے سیٹھ حبیب کو مافیا کے قدم جمانے کے لیے مجھ سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

”شابو کی تدفین کہاں ہوگی؟“ میں نے اس کے ہمراہ اوپری منزل کی طرف جاتے ہوئے سوال کیا۔

”میوہ شاہ لے جائیں گے جہاں گھپلے کے کام تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے آسانی سے ہو جاتے ہیں۔“ اس نے بتایا ”ویسے بھی یہ باقاعدہ جنازہ نہیں ہوگا۔ کفن پہنا کر اسے ایک بند پک اپ کے عقبی حصے میں ڈال کر لے جائیں گے۔“

”میت کو غسل دینا آتا ہے تم میں سے کسی کو؟“ میں نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ ”بس اچھی طرح صابن لگا کر نہلا دیا ہے مردے کو۔ غسل دینے کے لیے کسی کو بلاتے تو بات پھیل سکتی تھی، پولیس کیس بھی بن سکتا تھا۔ ایسے کاموں میں خرابی یہی ہوتی ہے کہ انجام بہت برا ہوتا ہے۔ شابو کو تو پھر بھی قبر مل جائے گی۔ شرف آباد کے مقابلے میں ہمارے جو آدمی مارے گئے تھے ان کی لاشیں تو ہم نے بھاری پتھروں سے باندھ کر نیٹی جیٹی کے پل سے گہرے پانی میں گرا دی تھیں۔ مچھلیاں آناً فاناً میں ان کے جسموں کا ایک ایک ریشہ نوچ کر کھا گئی ہوں گی اور اب وہاں ہڈیوں کے ناقابلِ شناخت ڈھانچے باقی رہ گئے ہوں گے۔“

میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔ دوسروں کے بڑے مفادات اور اپنی روزی کی خاطر جو لوگ ساری عمر گناہوں اور جرائم کی فصلوں کو سینچتے رہتے تھے، مرتے ہی کس قدر بے بس اور غیر اہم ہو جاتے تھے کہ انھیں رسمی طور پر بھی اپنے مذہبی عقائد کا سایہ تک میسر نہیں آتا تھا۔ ناپاکی کی حالت میں بے گور و کفن مرتے تھے اور اسی حالت میں اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں سمندر برد کر دیے جاتے تھے یا رشوت سے خریدے ہوئے کسی بے نام گڑھے میں دبا دیے جاتے تھے۔

اوپری منزل کا خاصا رقبہ ان لوگوں کے تصرف میں تھا۔ جس ہال میں میرا اسینڈو اور اس کے ساتھیوں سے دست بدست مقابلہ ہوا تھا، لڑتے ہوئے اس ہال کی جزئیات پر میں ذرا بھی توجہ نہیں دے سکا تھا لیکن شاید پہیوں پر حرکت کرنے والے چوبی پارٹیشن ہٹا کر اسے ہال کی شکل دی گئی تھی۔ اس وقت وہ پارٹیشن اپنی جگہوں پر واپس لائے جا چکے تھے جس کے نتیجے میں وہاں متعدد چھوٹے کیبن وجود میں آ گئے تھے۔ دور افتادہ سرے پر دیوار کی پوری چوڑائی میں چھت کی بلندی تک لا کر زینے ہوئے تھے غالباً وہی ہال ان لوگوں کی رہائش کے لیے استعمال ہوتا تھا کیونکہ کئی کیبنوں سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان کی اونچی آوازوں اور جارحانہ لہجوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان میں سے کسی کو اس بات کی زیادہ پروا نہیں تھی کہ تھوڑی دیر پہلے ان کا ایک ساتھی مارا گیا تھا جس کی صابن سے غسل دی ہوئی لاش اب روانگی کے لیے تیار تھی۔

”ہم سب ان کمروں میں رہتے ہیں۔“ سینڈو مجھے یہ بتاتے ہوئے ایک کیبن میں داخل ہو گیا۔ ”ہر شخص کو علیحدہ کمرا ملا ہوا ہے کچھ دن بعد ہی سب کو یہاں سے شہر کے مختلف علاقوں میں منتقل کر دیا جائے گا۔“

اس کیبن میں داخل ہوتے ہی میں اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گیا کیونکہ سامنے فولڈنگ مسہری پر سفید لٹھے کا ایک پھولا ہوا تھیلا پڑا ہوا تھا جس کے دونوں سرے لٹھے ہی کی دھجیوں سے باندھ دیے گئے تھے۔

”تم نے یہ تھیلا سی کر شابو کی لاش اس میں ڈالی ہے؟“ میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ہمارے کئی ساتھیوں کا خیال تھا کہ کفن سیا نہیں جاتا لیکن وہ بھی کفن پہنانے کی صحیح ترکیب نہ بتا سکے۔ ہر بار اٹھاتے ہوئے شابو کی لاش کفن میں سے باہر لڑھک آتی تھی اس لیے مجبوراً میں نے تھیلا سلوا دیا تاکہ کسی نازک موقع پر لاش اچانک سامنے نہ آ سکے۔ ایک بار اسے قبر میں ڈال کر مٹی دے دی تو پھر کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا۔“

میں خاموش کھڑا دل ہی دل میں شابو کی مغفرت کی دعائیں پڑھتا رہا۔ اس دوران میں پتلی چوبی دیواروں کے درمیان بنی ہوئی راہداری سے آہٹیں سنائی دیتی رہیں پھر کوئی کیبن میں آ گیا۔ میں تیزی سے پلٹا اور میری نگاہیں نو وارد کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ وہ ان چاروں میں شامل تھا جو اسی ہال میں مجھے گھیر کر بے بس کرنے پر مامور کیے گئے تھے۔

مجھے پہچان کر اس کے چہرے پر بھی تلخی ابھر آئی تھی لیکن سینڈو نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے ہم دونوں میں سے کسی کے بولنے سے پہلے ہی بات سنبھال لی۔ ”یہ میرا ساتھی

... گل ہے۔ اپنے بازوؤں کی قوت سے تین بار بپھرے ... سانڈوں کے سینگ جڑ سے اکھاڑ چکا ہے۔ اس کی ... فائٹنگ پر لاکھوں روپے کی شرطیں لگا کرتی تھیں اور ... گل! یہ ہمارے نئے سربراہ مسٹر شوٹر ہیں جن کی بے پناہ ... اور پھرتی کا مظاہرہ تھوڑی دیر پہلے ہم خود دیکھ چکے ... اب ہم براہِ راست ان ہی کی کمان میں کام کریں گے۔ ... راست چیف کو جواب دہ ہوں گے۔“

... سینڈو کی بات کے درمیان ہی عجائب گل کے تیور نرم ... تھے اس لیے میں نے درمیان میں ہی اس سے ہاتھ ملایا ... عجائب گل نے احترام آمیز نرمی کے ساتھ میرا بڑھا ہوا ... قبول کر لیا۔ ”مجھے افسوس ہے عجائب گل!“ میں نے اس ... ہاتھ ملاتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ”کہ ہمارا ابتدائی تعارف ... انداز میں ہوا مگر وہ چیف کا فیصلہ تھا جس سے کوئی ... نہیں کر سکتا۔ شابو تمھارا پرانا ساتھی رہا ہوگا اور اب ... ہوتا تو میرا بھی ساتھی ہوتا۔ مجھے دکھ ہے کہ وہ میرے ... ہاتھوں مارا گیا۔ میں مجبور تھا۔ اگر میں وحشیانہ اور جنونی انداز ... میں نہ لڑتا تو تم چاروں میری تکا بوٹی کر ڈالتے۔“

”شوٹر خان! تم نر آدمی ہے۔“ عجائب گل نے شاید ... سب عادت میرے لقب کے ساتھ خان کا لفظ جوڑ دیا۔ ... ہم کو بھی معاف کر دو۔ ہم نے تم پر ہاتھ اٹھایا اور بدتمیزی کی ... قسم پروردگار کا۔ ہم کو نہیں معلوم تھا کہ تم کون ہے۔ ... سینڈو بابا نے بولا کہ تمھیں مارنا ہے اور ہم مقابلے پر آ گیا۔“

”اب سب کچھ بھول جاؤ، یہ یاد رکھنا کہ شوٹر سے وفاداری ... اب سب کچھ ہے۔“ سینڈو نے دخل اندازی کرتے ہوئے ... ”ہم دفتر میں جا رہے ہیں، سب آدمیوں کو وہیں لے آؤ، ... صاحب اپنے آدمیوں سے ملنا چاہتا ہے۔“

عجائب گل الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ ہم دونوں بھی ... سے نکل آئے۔ میں نے سینڈو کو بتا دیا تھا کہ روانگی سے پہلے میرے لیے بھیگا اور مسلا ہوا لباس تبدیل کرنا ضروری تھا۔

➡

سرخ کار دیکھ کر میز نائن فلور کے ریمپ کی نگرانی پر بیٹھے ہوئے چوکیدار نے رکاوٹ نہیں ہٹائی تو مجھے اس پر غصہ آیا جو فوراً ہی کافور ہو گیا۔ میز نائن فلور عام پارکنگ کی جگہ تھی۔ سرخ کار چوکیدار کے لیے اجنبی تھی اور جب تک ہیڈ لیمپس گل کر کے کیبن لائٹ آن نہ کرتا، وہ مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔

چوکیدار مجھے کچھ بتانے یا مجھ سے کچھ دریافت کرنے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ کر میری طرف آ رہا تھا کہ میں نے اس کی سہولت کے لیے کیبن لائٹ آن کر دی اور اسی لمحے اچانک

میری نگاہ داہنی طرف سڑک کے کنارے پارک کی ہوئی جہانگیر کی کار پر پڑی تو میرے فرشتے کوچ کر گئے کیونکہ اس شام سلمیٰ میرے فلیٹ پر دھاوا بولنے کا تہیہ کیے بیٹھی تھی۔ میں نے اس سے فون پر بات کر کے اپنی دانست میں اسے کامیابی کے ساتھ ٹال دیا تھا۔ دوسری طرف میں جہانگیر کو بھی ادھر آنے سے منع کر چکا تھا۔ ان احتیاطی اقدامات کے باوجود جہانگیر کی گاڑی کی وہاں موجودگی تشویش ناک تھی۔

اسی اثنا میں چوکیدار نے میری نئی کار کے ہیڈ لیمپس کی زد سے باہر آتے ہی کیبن میں پھیلی ہوئی روشنی میں مجھے پہچان لیا تھا اور راستے سے ہی واپس لوٹ کر ریمپ کے داخلے پر سے رکاوٹ ہٹا دی تھی۔ میں کار کو آہستگی کے ساتھ میز نائن فلور پر لیتا چلا گیا جہاں جہانگیر سے مستعار لی ہوئی کالی شیراڈ پہلے سے موجود تھی۔

اس وقت میرے ذہن میں ایک کشمکش برپا ہو چکی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں جہانگیر کے ساتھ سلمیٰ کا سامنا کرنے کا ارادہ کر کے اپنے فلیٹ میں جاؤں یا نیچے اتر کر خاموشی سے کہیں غائب ہو جاؤں۔

کار سے اتر کر دروازہ لاک کرتے ہوئے مجھے یکایک اپنی خوش اخلاق پڑوسن سیما کا خیال آیا۔ اس فلور پر صرف ہم دونوں رہتے تھے۔ اپنی تنہائی کی وجہ سے وہ میری فکر میں لگی رہتی تھی کیونکہ اس طرح اس کی تنہائی دور ہو جاتی تھی۔ ڈی ڈی کی براہِ راست فون کال اور پھر عمارت میں ہونے والی لوٹ مار سے وہ اس قدر خوفزدہ تھی کہ عمارت سے باہر نکلنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتی تھی اس لیے مجھے اس سے اپنے فلیٹ کے بارے میں کچھ خبریں مل سکتی تھیں۔

میں نے میز نائن فلور سے چند زینے طے کیے اور اس کے فلیٹ کی ڈور بیل بجا دی۔ مجھے اس کی ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ تھا اس لیے کئی سیکنڈ گزر جانے کے باوجود میں خاموشی سے انتظار کرتا رہا۔ آخر کار اس نے بند دروازے کے عقب سے سہمی ہوئی آواز میں استفسار کیا اور میری آواز سنتے ہی دروازہ کھول دیا۔ میرے اور اس کے مراسم میں اتنی بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی کہ میں نے اس کی دعوت کا انتظار کیے بغیر اندر داخل ہو کر دروازے کا دہرا لاک لگا دیا۔

”تم اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟“ سیما نے غور سے میرا جائزہ لیتے ہوئے تحیر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

”اپنے ان ہمدردوں سے مل کر آ رہا ہوں جنھوں نے کل رات اپنی جان پر کھیل کر ہمارے دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔“ میں نے اندر صوفے پر دراز ہو کر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ سیما کے گلابی ہونٹ فرطِ حیرت سے دائرے کی صورت

میں نیم وا ہوگئے۔" تو وہ تمھارے دوستوں کی لڑائی تھی جس نے ہر طرف آگ اور خون پھیلا دیا؟"

میں فوراً ہی سنبھل گیا۔" میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم نے خود دیکھ لیا کہ سارا چکر سلور آئی کے حصول کے لیے چلایا گیا تھا۔ اب انہی میں سے ایک فریق میری ہمدردی کا دعویٰ کر بیٹھے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"مجھے تو تم بھی اتنے سیدھے نظر نہیں آتے جتنا بننے کی کوشش کرتے ہو۔" وہ نظریں تیکھی کر کے اٹھلاتے ہوئے بولی۔ "سلور آئی تو اپنی جگہ ہے مجھے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ میری چھٹی حس کہتی ہے کہ کل رات یہاں جو آتش زنی ہوئی اور اندھیرے میں خون خرابے کے بعد لوٹ مار ہوئی اس میں تمھارا بھی کوئی نہ کوئی اہم کردار تھا۔"

"میں صرف اور صرف پیٹرواک ہوں۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔" تنہائی میں جب خوف اور خیالات کی یلغار ہونے لگتی ہے تو چھٹی کیا کبھی کبھار ساتویں حس بھی ہذیان بکنے لگتی ہے اس لیے ان خرافات کو بھول کر مجھے یہ بتاؤ کہ میرے فلیٹ میں اس وقت کیا صورت حال درپیش ہے؟ تم نے ادھر ضرور نگاہ رکھی ہوگی۔"

"ساڑھے آٹھ بجے سے جہانگیر وہاں آیا ہوا ہے۔" اس نے انکشاف کیا۔

"میں نیچے اس کی گاڑی دیکھتا ہوا آیا ہوں' وہ تمھاری طرف بھی آیا تھا؟"

"نہیں۔" وہ اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔" اس کی بیوی اس کے ساتھ ہے۔ یہ سن کر مجھے شدید غصہ آیا تھا کہ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود اس قدر بے راہ روی کا شکار ہے۔"

"زیادہ غصہ کرنے سے سر کے بال جھڑنے لگتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تمھیں اس کی بیوی کی آمد کا علم کیسے ہوا؟" سلمٰی کی موجودگی کی تصدیق ہوتے ہی مجھے اپنے پیٹ میں گرہیں سی پڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔

"پہلی فرصت میسر آتے ہی جہانگیر نے مجھے فون کیا تھا۔ تمھاری کار میز نائین فلور پر موجود تھی اس لیے اس کا خیال تھا کہ تم میرے ساتھ موجود تھے۔ میں بمشکل اسے اپنی سچائی کا یقین دلا سکی پھر اس نے مجھے بتایا کہ اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی آئی ہوئی ہے اس لیے میں تمھارے فلیٹ کا رخ نہ کروں۔ اس کا تو ضمیر مجرم ہے لیکن میرے لیے اس کی ہدایت توہین آمیز تھی۔ اب تو میں کبھی اس کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کروں گی۔"

"کہیں اور تھوک لینا۔ یہ بعض اوقات ناگزیر ہو جاتا ہے۔" میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔" تم جہانگیر کی بیوی سے واقف نہیں ہو۔ اس سے میری بھی روح فنا ہوتی ہے وہ

جب چاہے جہانگیر سے میری من گھڑت شکایت کر کے دوستانہ تعلقات ہمیشہ کے لیے ختم کرا سکتی ہے...."

"تم اس سے اتنا کیوں ڈرتے ہو؟ کیا تمھارے جہانگیر کو تم پر اعتماد نہیں ہے؟" وہ تنک کر بولی۔

"عورت کے معاملے میں مرد اندھا بچار بن جاتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں اس کی عدم موجودگی میں بھی جاتا رہتا ہوں اور کبھی کبھار وسکی بھی لے لیتا ہوں۔ میں آنسو لا کر جہانگیر سے صرف اتنا کہہ دے کہ میں نے اس کے ساتھ دست درازی کرنے کی کوشش کی تھی تو وہ اس الزام کی تصدیق کیے بغیر میرا دشمن ہو جائے گا۔ کو اپنا غلام بنائے رکھنے میں عجیب لذت محسوس کرتی اس معاملے میں بڑی فراست سے کام لیتی ہے۔ اب دونوں سے ملنے جا رہا ہوں میرے حق میں خیر کی دعا کرنا"

اس کے فلیٹ سے نکل کر میں اس وقت تک راہداری میں کھڑا رہا جب تک سیما نے اپنے فلیٹ کا دروازہ مقفل نہ کر لیا پھر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنی چابی سے فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

"آؤ... آؤ!" اندر قدم رکھتے ہی سلمٰی نے چہکتی ہوئی آواز میں میرا خیر مقدم کیا تھا۔" اپنی دانست میں تو تم نے ہم سے جان چھڑا لی تھی؟"

"اوہ! تم لوگ یہاں کب اور کیسے پہنچے؟" میں نے شدید حیرت کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔" میں نے تو تمھیں بتایا تھا کہ آج شام میں گھر پر نہیں رہوں گا۔"

"تمھارا خیال تھا کہ میں تمھارے بہانوں پر یقین کر لوں گی۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔" لیکن میں نے بھی تمھارا جھوٹ پکڑنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ آخر تم ہم لوگوں سے دور کیوں بھاگنے لگے ہو؟"

"تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے سلمٰی!" میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے مفاہمانہ لہجے میں کہا۔" میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ کراچی میں تم دونوں کے علاوہ میرا کون ساتھی اور غم گسار باقی رہ گیا ہے جو میں تم سے دور بھاگتا پھروں گا۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ تم نے میرے بارے میں ایک بات فرض کر لی ہے اور ہر وقت اس کی تصدیق کی کوشش میں رہتی ہو۔ شاید اس بارے میں تم کو جہانگیر بھی میری مجبوری کا احساس دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔"

"مجھے بیچ میں نہ گھسیٹو!" جہانگیر نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے کہا۔" مجھے سلمٰی نے تمھارا پیغام دیا تھا لیکن اس نے ہی یہاں آنے کی ضد بھی کی تھی۔ میرے پاس تمھارے فلیٹ کی چابی موجود تھی اس لیے ہم اندر بیٹھے تمھاری واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ سلمٰی سے اپنا جھگڑا تم خود نمٹاؤ میں اس معاملے میں قطعی غیر جانبدار ہوں۔"

جہانگیر کے اس احمقانہ رویّے پر میرا خون کھول کر رہ گیا۔ اپنی ساری مردانگی کے باوجود وہ پکا زن مرید ثابت ہو رہا تھا۔ شاید اس وجہ کا تعلق اولاد کے نہ ہونے سے رہا ہو۔ میں لاکھ اس کا قریبی دوست اور ساتھی سہی لیکن اس کی بیوی کے لیے ایک غیر مرد تھا مگر جہانگیر اسے یوں میرے سر ڈال رہا تھا جیسے سلمٰی سے اس کے مقابلے میں میرا زیادہ گہرا تعلق ہو اور سلمٰی تو ہمیشہ سے ہی میرے سر پر سوار ہونے کی کوشش کرتی چلی آئی تھی۔ جہانگیر کے تبصرے سے وہ شیر ہو گئی۔

"مجھے اپنی مجبوریوں کا چکر نہ دو اور سچ سچ بتا دو کہ اس وقت کہاں مزے اڑا رہے تھے۔ مجھے پتا ہے کہ تم کہیں نہیں گئے ہو گے اسی بلڈنگ کے کسی فلیٹ میں ڈیرا جما رکھا ہوگا۔"

لمحے بھر کے لیے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں وہ سیما کے وجود سے باخبر نہ ہو گئی ہو۔ اسی لیے میری نگاہیں جہانگیر کی طرف اٹھیں اور اس نے بے بسی کے ساتھ آنکھ سے اشارہ کیا کہ اس نے اس بارے میں سلمٰی کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ گھر کے اس بھیدی کی طرف سے یقین دہانی مل جانے کے بعد میرے لہجے میں اعتماد بحال ہو گیا۔

"اول تو میں باہر گیا ہوا تھا اور اگر اسی بلڈنگ کے کسی فلیٹ میں بھی تھا تو تمھیں ایسے نازک موضوع کو نہیں چھیڑنا چاہیے۔ پھر بھی میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تمھارے شبہے کی بنیاد کیا ہے؟"

وہ ایک لحظے کے لیے چڑھتے ہوئے سانسوں کے ساتھ مجھے گھورتی رہی پھر بولی۔" تمھاری کار میز نائین فلور پر موجود تھی پھر تم باہر کیسے چلے گئے؟" اس کے فاتحانہ لہجے میں پُراعتماد چیلنج پوشیدہ تھا۔

میں بے اختیار ہنس پڑا اور اپنا سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ "جاؤ! ٹھنڈے پانی میں لیمن اسکواش بنا کر ایک گلاس خود پیو اور ہم دونوں کو بھی پلاؤ پھر میں تمھارا یہ وہم بھی دور کر دوں گا۔ میرے پاس ایک اور گاڑی آ گئی ہے۔"

"گاڑی کہاں سے خرید لی تم نے؟ تمھاری ساری رقم تو میرے پاس رکھی ہوئی ہے۔ تمھارے پاس جیب خرچ کے لیے واجبی سی رقم رہ گئی تھی اس سے تو گاڑی نہیں خریدی جا سکتی تھی۔"

"ضروری نہیں کہ گاڑی خریدی ہی جائے۔ آج کل تو ماڈل کی گاڑیاں چرانا بھی فیشن بن گیا ہے۔ تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے چوری نہیں کی بلکہ نوکری کر لی ہے گاڑی کمپنی کی طرف سے ملی ہے۔"

"کیا واقعی؟" جہانگیر تحیّر آمیز لہجے میں بول پڑا۔" کہاں نوکری کر لی تم نے؟"

"یہ ایک اور تحفہ ہے ہمارے لیے۔" سلمٰی ملامت آمیز لہجے میں بولی۔" تمھارے پاس اپنی فیکٹری اور اثاثوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی خطیر رقم زرمبادلہ کی صورت میں موجود ہے۔ تم خود اپنا کوئی کاروبار شروع کر سکتے تھے یا جہانگیر کے ساتھ ہی فیکٹری میں شراکت کر سکتے تھے۔ دوسروں کی غلامی کرنے کی کیا ضرورت تھی تمھیں؟"

اس کی زبان بند کرانے کے لیے ضروری ہو گیا کہ میں گفتگو کو کوئی سنجیدہ موڑ دوں جس کا موقع سلمٰی نے خود ہی فراہم کر دیا تھا۔" غزالہ کو کھو دینے کے بعد زندگی بے کیف ہو گئی ہے۔" میں نے اپنا لہجہ بوجھل ہوتا محسوس کیا۔" مجھے پہلی بار احساس ہوا ہے کہ دوسروں پر صرف حکمرانی کرنا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی کبھار خود کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھی زندگی کا لطف آتا ہے بالکل اسی طرح جیسے شراب تلخ ضرور ہوتی ہے لیکن اس کا نشہ پُرسرور ہوتا ہے۔ اپنے پاس کے دیے ہوئے کاموں کو خوش اسلوبی سے مکمل کر کے شاید میں اپنی وہ خود اعتمادی دوبارہ حاصل کر لوں جو غزالہ کی ذات سے محروم ہو کر میں نے گنوا دی ہے۔"

"غزالہ!" سلمٰی ایک گہرا سانس لے کر بولی۔" کاش! تم اسے اپنے ذہن کی سطح سے کھرچ سکو مگر وہ بھی اتنی معصوم نہیں ہے جتنی بنتی ہے۔ جاتے جاتے بھی تمھارے دل میں امید کی ایک موہوم سی کرن پیدا کر گئی۔ اگر وہ تمھارے ساتھ مخلص اور اپنی نئی زندگی سے خوش ہوتی تو یہ ہرگز نہ کہتی کہ محبت وہ روگ ہے جو ایک بار کسی کو لگ جائے تو پھر قبر کے کیڑے بھی اس روگ کو نہیں مٹا سکتے...."

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے اداس لہجے میں کہا۔ "ہم صدیوں پرانی ایک مثلث کے دو کونے ہیں جن کے درمیان تیسرا کونا دلدار آغا کی ذات ہے۔ غزالہ نے اس سے شادی کر لی ہے لیکن میری محبت کی چنگاریاں آج بھی اس کے دل میں کہیں نہ کہیں سلگ رہی ہیں۔ وہ نہ مکار ہے اور نہ دغاباز۔ جو حقیقت تھی۔ وہ اس نے مجھے بتا دی۔ اب یہ میرے اپنے دل کی بات ہے کہ اسے بھلا دوں یا یہ دستور پوجتا رہوں لیکن میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں کہ میں بے بس ہو کر رہ گیا ہوں جس قدر اسے بھلانے کی کوشش کرتا ہوں اسی قدر شدت سے اس کی یادیں سراپا مجسم ہو کر میرا پیچھا کرتی ہیں۔ میں جب کسی عورت سے قریب ہونے کی کوشش کرتا ہوں اس کا معصوم سوالی چہرہ اچانک سامنے آ جاتا ہے۔"

میرے آخری فقرے کسی حد تک سچے تھے لیکن پوری

طرح نہیں۔ ان کے سہارے میں نے جہانگیر کی موجودگی میں سلمیٰ کو یہ سمجھانا چاہا تھا کہ وہ میری آرزو اپنے دل سے نکال دے کیونکہ میرے دل کی گہرائیوں میں غزالہ کا نام بسا ہوا تھا۔

"ویسے یار مجھے حیرت ہے!" جہانگیر نے گفتگو میں دخل دیتے ہوئے کہا۔ "اس قدر جہاں دیدہ اور روشن خیال ہوتے ہوئے بھی تم اسی ایک نام کی مالا جپ رہے ہو جو تمہارے دل کے لیے ایک ناسور بن گیا ہے۔ زندگی کا ہر وہ لمحہ جو گزر گیا دوبارہ نہیں آئے گا اور زندگی کے کسی موڑ پر جب اچانک تمہیں تکان کا احساس ہوگا تو اپنے ماضی پر نظر ڈال کر تم افسوس کرتے رہ جاؤ گے کہ تمہارا جو دور رفاقت اور محبت کو پروان چڑھانے والا تھا وہ تم نے ایک سائے کا تعاقب کرتے ہوئے گزار دیا اور سایہ بھی وہ جو تمہارا اپنا نہیں کسی اور کا ہے۔"

اس لمحے اچانک فون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ سلمیٰ نے فوراً ریسیور اٹھا لیا کیونکہ وہ فون کے قریب ہی موجود تھی پھر میں نے اس کی پیشانی پر بل نمودار ہوتے دیکھے اسی کے ساتھ وہ معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس صورت حال پر جہانگیر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

"ہولڈ کرو!" سلمیٰ نے چند ثانیوں تک دوسری طرف کی بات سننے کے بعد سخت لہجے میں کہا اور ریسیور تپائی پر ڈالتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "دیکھو! تمہارا منظور نظر معلوم ہوتا ہے۔"

فون پر میں اس کی آواز سن کر حیران رہ گیا۔ اگر اس نے خود سلمیٰ کو اپنا نام نہیں بتایا تھا تو سلمیٰ کے قیاس کی داد دینی پڑتی تھی کیونکہ وہ سلطان شاہ ہی تھا۔

"شاید جہانگیر کی بیوی تم سے ملنے آئی ہوئی ہے؟" میری آواز پہچان کر اس نے کہا تھا۔

"ہاں! تم سناؤ کیا حال ہے؟ اس وقت کیسے فون کیا ہے؟ گیارہ بج رہے ہیں۔"

"اسی وقت فون کرنے کی فرصت ملی ہے۔ میرے پاس تمہارے لیے کچھ گرماگرم خبریں ہیں۔ میں تمہارے پاس آنا چاہ رہا تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ اس وقت میرا پیچھا کیا جا رہا ہے اور تمہارے پاس ایک مہمان آئی ہوئی ہے۔" اس کی آواز دھیمی تھی۔ پس منظر سے ابھرنے والی ملی جلی آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ کسی پبلک کال آفس سے فون کر رہا تھا۔

"تمہیں کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟" میرے لیے یہ انکشاف حیرت انگیز ثابت ہوا تھا۔

"فی الحال تو خطرہ نظر نہیں آ رہا۔ بس وہ میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں دو بار اسے جل دینے کی ناکام کوشش کر چکا ہوں لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ بہت چالاک معلوم ہوتا ہے۔"

"تم جہاں ہو وہاں کا پتا سمجھا کر وہیں ٹھہرو، میں آ کر پہنچتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" اس نے دھیمے مگر سخت لہجے میں کہا۔ "میرا اندازہ ہے کہ وہ مجھے گھر پہنچا کر لوٹ جائے گا۔ اس سے الجھنے کی صورت میں وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں گے۔ ویسے ابھی تک اسے اندازہ نہیں ہو سکا ہے کہ میں اپنے تعاقب سے باخبر ہو چکا ہوں۔ موقع ملا تو رات گئے تمہارے پاس آؤں گا۔ سلمیٰ رات کو تو تمہارے فلیٹ پر نہیں ٹھہرے گی؟"

"نہیں!" میں نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری یک طرفہ گفتگو سن کر وہ دونوں ہی تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ جہانگیر کو تو پھر بھی میری مصروفیات کا اندازہ تھا لیکن سلمیٰ کو اپنے شبہات حقیقی روپ میں نظر آنے لگے تھے۔ اس لیے وہ زیادہ حیران و پریشان نظر آ رہی تھی۔

"تم جس وقت چاہو آ سکتے ہو۔ تم نے مجھے فکرمند کر دیا ہے۔" میں نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے وہ گرماگرم خبریں کیا ہیں؟ ابھی سے مجھے کچھ اندازہ ہو جائے۔"

"فون پر نہیں بتا سکتا، ملوں گا تو بات ہوگی۔" اس کی دھیمی آواز ابھری۔ "میں پبلک کال آفس سے بول رہا ہوں۔ یہاں کچھ اور لوگ بھی میرے بعد اپنی باری کے منتظر ہیں۔ تفصیلی گفتگو نہیں ہو سکتی۔"

"میرا مشورہ ہے کہ رات کو گھر سے نہ نکلنا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں گھر پہنچانے کے بعد بھی نگرانی کا سلسلہ برقرار رہے۔ ایسا ہوا تو تم دشواریوں میں پڑ جاؤ گے۔"

جواب میں اس کی ہلکی سی تلخ ہنسی کی آواز سنائی دی۔ "مجھے معلوم ہے کہ آج کل شہر کے حالات کس قدر مخدوش ہیں۔ ایم... کے قتل پر جو فساد ہوا تھا وہ زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ ساری رات تو کیا وہ چند گھنٹوں کے لیے بھی میرے گھر کے قرب و جوار میں ٹھہرنے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔"

"پتا نہیں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔" میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"سیدھی سی بات ہے۔ شہر میں آج کل زبان کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ اس... سے میرا کام آسان ہو جائے گا۔ میں پٹھان ہوں اور چھوٹے چھوٹے مکانوں والی پٹھان آبادی میں رہتا ہوں جہاں جگہ کی تنگی اور گرمی کی وجہ سے زیادہ تر مرد گھروں سے باہر کھلے آسمان کے نیچے سوتے ہیں۔ میرا پیچھا کرنے والا جو کوئی بھی ہو، سو... ہے پٹھان ہرگز نہیں لگتا۔ سو وہ میرے گھر کے آس پاس منڈلاتا رہا تو علاقے کے لوگ اسے مشتبہ سمجھ کر پکڑ لیں گے اور پھر اس کے ہاتھ پیر توڑ کر اسے ندی میں پھینک دیں گے۔ میری طرح یہ بات وہ بھی جانتا ہوگا اس لیے تم فکر نہ کرو، میں رات گئے گھر سے نکلوں گا تو میدان بالکل صاف ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہارا انتظار کروں گا۔" میں نے اس کے عالمانہ دلائل کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ میں ریسیور رکھ کر پلٹا تو سلمیٰ نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میرے یک طرفہ مکالمات سن کر وہ بے انتہا تجسس میں مبتلا ہو گئی تھی اور ایک ہی سانس میں اپنے ہر سوال کا جواب چاہتی تھی۔

اس کو سلطان شاہ کی مصروفیات کی طرف سے مطمئن کرنے کے لیے مجھے بہت زیادہ جھوٹ نہیں بولنے پڑے کیونکہ اس مدافعانہ بحث میں جہانگیر نے کھل کر میرا ساتھ دیا تھا اور میں سلمیٰ کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ سلطان شاہ بدقسمتی سے اپنے ان دشمنوں کی نگاہ میں آ گیا تھا جن سے بچنے کے لیے وہ میرے ساتھ ملک سے باہر فرار ہوا تھا۔

"تم اپنے لیے چائے بنا لو، اتنی دیر میں ہم دونوں ذرا ہونٹ تر کر لیں گے۔ ابھی گھر بھی واپس جانا ہے۔" جہانگیر نے کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتوں کے بعد سلمیٰ سے کہا۔ میں اس کی بے چینی کو خوب محسوس کر رہا تھا۔ سلمیٰ کی موجودگی میں وہ مجھ سے کھل کر بات نہیں کر سکتا تھا اس لیے بہانے سے کچھ دیر کے لیے اسے ٹالنا چاہ رہا تھا۔

"میں نے تمہیں روکا تو نہیں ہے۔" سلمیٰ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تم اپنا شغل شروع کر دو، میرا جب موڈ ہوگا تو اپنے لیے چائے یا کافی بنا لوں گی۔"

"ذرا کچن سے دو گلاس دھو کر لے آؤ، فریزر میں سے آئس ٹرے بھی لیتی آنا۔" جہانگیر نے خوشامدانہ لہجے میں کہا اور سلمیٰ اٹھلاتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ جہانگیر اسے دیکھ کر کسی احمق کی طرح منہ چلانے لگا۔ وہ بہت چالاک اور عقل مند تھا لیکن بیوی کے معاملے میں اس کی عقل ایسی چوپٹ ہو کر رہ گئی تھی کہ وہ اس کی چالیں نہیں سمجھ پاتا تھا۔ سلمیٰ بظاہر اسے ناز دکھا رہی تھی لیکن دراصل وہ مجھے گھائل کرنے کے چکر میں تھی۔ اس کے شوخ تیوروں میں اس وقت ایسی جارحیت اتر آئی تھی کہ میں اس سے نظریں ملاتے ہوئے بھی گھبرا رہا تھا۔ جہانگیر اپنی بیوی کے معاملے میں بدھو ہو سکتا تھا لیکن میری نگاہوں کی ذرا سی ملائمت پر بھی کسی جنگلی گھوڑے کی طرح بھڑک سکتا تھا۔

"سیما کو میں نے فون پر ادھر آنے سے روک دیا تھا۔" سلمیٰ کے جاتے ہی جہانگیر نے پرشوق، سرگوشیانہ لہجے میں کہا اسی کے ساتھ اس نے اپنے پہلو میں رکھے ہوئے پولی تھین کے بیگ میں سے بوتل نکال لی۔ "میں تمہارے لیے کالے کتے کی میگنم سائز لایا ہوں۔ سلمیٰ آنے کی ضد نہ کرتی تو اس وقت محفل میں مزہ آ جاتا۔"

"سیما تم سے ناراض ہے۔" میں نے شوشہ چھوڑا۔ "اسے توقع نہیں تھی کہ تم نے ایک عدد بیوی بھی پال رکھی ہوگی۔"

"تمہیں کیا پتا؟" اس نے بے اعتباری سے کہا پھر فوری خیال کے تحت وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہ خود کون سی غیر شادی شدہ ہے۔ میاں کو جیل بھجوا کر خود عیش کر رہی ہے۔"

"مجھے سب معلوم ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ "میں نے پیچھے تمہاری کار دیکھ لی تھی۔ اس لیے پہلے سیما کے فلیٹ پر ہی گیا تھا۔ اسے تمہاری بیوی سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔"

"مجھے مروا نہ دینا۔" وہ بوکھلا کر بولا۔ "ان دونوں کی ملاقات میں میری زندگی برباد ہو جائے گی۔"

"کالے کتے کے دو گلاس ساٹھ برس کی بوڑھی ہڈیوں میں بھی کرنٹ دوڑانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ تم تو پھر بھی جوان ہو۔ تھوڑی سی پی لو گے تو خود ہی سلمیٰ کو اٹھا کر اس سے ملانے لے جاؤ گے۔"

اس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن فوراً ہی خاموش ہو گیا کیونکہ باورچی خانے سے گلاسوں کی کھنک ختم ہو چکی تھی اور سلمیٰ کے قدموں کی ہلکی سی دھمک سنائی دے رہی تھی۔

"شروع کرنے سے پہلے اتنا ضرور بتا دوں کہ صرف ہونٹ تر کرنا، حلق تک نہ پی لینا۔" سلمیٰ نے دھلے ہوئے شفاف گلاس اور آئس ٹرے ہمارے سامنے تپائی پر رکھتے ہوئے کسی سے مخاطب ہوئے بغیر کہا۔ "رات گئے پولیس والے ہر گاڑی کو روک کر اچھی طرح دیکھ بھال کرتے ہیں۔"

سلمیٰ ایک عادی شرابی کی بیوی تھی اور مے نوشوں کی میزبانی کے آداب سے بخوبی واقف تھی اس لیے اس نے ہم دونوں کے لیے برابر کی مقدار گلاسوں میں انڈیلی، بوتل بند کی، آتشیں سیال میں برف کے ڈلے ڈالے اور مسکراتی ہوئی دوبارہ کچن کی طرف واپس چلی گئی۔

"دوسری گاڑی کہاں سے مل گئی تم کو؟" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد جہانگیر نے سوال کیا۔

"میں نے واقعی نوکری کر لی ہے۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "اپنی طبیعت کی بڑھتی ہوئی سرکشی کی وجہ سے میرے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ تھوڑے عرصے کے لیے خود کو کسی کی تحویل میں دے دوں۔"

”وہ کوئی اچھے لوگ تو ہرگز نہ ہوں گے؟“ اس کا لہجہ خاصا پُریقین تھا۔

”یہ تو نوکری کرنے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔ ویسے اس فرم کا برآمدی کاروبار ہے۔“ میں نے کہا۔

”برآمدی کاروبار؟“ اس نے حیرت سے دہرایا۔ ”شہر میں ایسی کون سی فرم ہے جس کے دفاتر میں رات کے گیارہ بجے تک نئے ملازمین کی تقرری کے احکام جاری کیے جاتے ہیں؟“

”تم اپنے دور سے بیس برس پیچھے رہ رہے ہو۔ آج کل کاروبار کا تصور دفاتر اور دوکانوں تک محدود نہیں رہا ہے۔ اہم اور بڑے معاملات دفاتر سے باہر پارٹیوں، دعوتوں اور سیر و تفریح کے دوران طے کیے جاتے ہیں۔ دفتر تو بس ڈاک، ٹیلیکس، فیکس اور خوبصورت سیکریٹری کو سجانے کے کام آتے ہیں۔“

”آہستہ بولو۔“ وہ میرا ہاتھ دبا کر مضطربانہ لہجے میں بولا۔ ”گلاس منہ سے لگاتے ہی تم نے بہکنا شروع کر دیا...!“

”چلو پھر کوئی اور بات کرتے ہیں۔“ میں نے اس کی بات اڑا کر وہ موضوع ہی تبدیل کر دیا۔

اسی اثنا میں سلمٰی اپنی چائے کی پیالی لے کر دوبارہ کمرے میں آگئی اور ہماری گفتگو سمٹ کر باہمی دلچسپی کے ان چند موضوعات تک محدود ہو گئی جو میرے لیے قطعی بے ضرر تھے اور میں ان پر بلے تکان گھنٹوں تقریر کر سکتا تھا۔ وقت دھیمے دھیمے گزرتا رہا۔ بہ ظاہر میں ان دونوں کی مہمان داری میں مصروف تھا لیکن میرا ذہن سلطان شاہ کی ذات میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ جانز فارماسیوٹیکل والوں نے اسے ملازمت دینے سے پہلے اس کے بارے میں خاصی چھان بین کرائی تھی۔ اس لیے میری دانست میں اس کی مسلسل نگرانی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی تھی لیکن سلطان شاہ نے جوں ہی کچھ کرا گرم خبریں حاصل کیں اس کا تعاقب شروع ہو گیا جس کے انجام کے بارے میں میرے ذہن میں بہت سے خدشات موجود تھے کیونکہ سلطان شاہ کا پالا شہر کے نئے مقامی سربراہ ڈی ڈی سے پڑا تھا جو اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے ہر رکاوٹ کو تہس نہس کر دینے کی قوت اور صلاحیت رکھتا تھا۔

یہ بہت عجیب و غریب اتفاق تھا کہ ہم دونوں کم و بیش ایک ہی وقت میں دو مخالف دھڑوں میں شامل ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ سلطان شاہ نے دلدار آغا کی دوا ساز فیکٹری میں ملازمت حاصل کر لی تھی اور میرا مافیا کے سیٹھ حبیب سے معاہدہ ہو گیا تھا جس کے بعد ہمارے لیے بہت سی راہیں کھل سکتی تھیں۔

سلمٰی کے اصرار پر رات کے سوا بارہ بجے جہانگیر روانگی پر آمادہ ہوا۔ وہ اکیلا آیا ہوتا تو میں اسے فلیٹ کے دروازے سے رخصت کر دیتا لیکن پچھلی غلط فہمیوں اور تلخیوں کے علاوہ سلمٰی پہلی بار میرے گھر آئی تھی اس لیے اخلاقاً مجھے ان دونوں کو الوداع کہنے کے لیے نیچے جانا پڑا۔ راستے میں میں نے میز نائین فلور پر انھیں اپنی نئی سرخ کار بھی دکھائی جو ہر اعتبار سے شاندار نظر آ رہی تھی اور وہ دونوں اسی پر تبصرے کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

میں دوبارہ فلیٹ میں واپس آیا تو فون کا بزر بول اٹھا۔ میں نے قدرے جھلاہٹ کے ساتھ ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے سیما کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

”تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟“ میں نے حیرت اور قدرے غصے کے ساتھ کہا۔ ”اس وقت رات کے سوا بارہ بج رہے ہیں۔“

”خوف سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔ راہداری میں قدموں کی آہٹوں اور تمھارے فلیٹ کے دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ تمھارے مہمان جا چکے ہیں اس لیے ڈرتے ڈرتے تمھیں فون کیا ہے۔ اگر تم اکیلے رہ گئے ہو تو پلیز! میرے دروازے پر آ کر مجھے ساتھ لے جاؤ!“

اس کی فرمائش پر میری کھوپڑی چٹخ گئی۔ سلمٰی ٹلی تھی تو اب وہ میرے سر پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھی اور نخرا بھی یہ کہ میں اسے اس کے دروازے سے لے کر آؤں۔ پتا نہیں عورتیں کس بنا پر مجھے اس قدر سعادت مند سمجھ لیتی تھیں جیسے میرے والدین نے مجھے انھی کی اطاعت کے لیے پیدا کیا ہو۔

”سوری سیما!“ میں نے اپنے لہجے کی تلخی کو دباتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ ”میرے مہمان ضرور جا چکے ہیں لیکن میں تھکا ہوا ہوں اور اب گدھے گھوڑے بیچ کر سونا چاہتا ہوں۔ تم بھی سو جاؤ۔ صبح ملاقات ہوگی۔“

”پلیز پیٹر!“ اس کی آواز میں التجا ہی التجا تھی۔ ”صبح تک تو میں آہٹوں اور سرسراہٹوں سے دہشت زدہ ہو کر مر جاؤں گی۔ تم یقین کرو کہ پچھلے آدھے گھنٹے سے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔ اپنے سائے سے بھی خوف آ رہا ہے۔ مسز جہانگیر کا معاملہ نہ ہوتا تو میں پہلے ہی تم کو فون کر چکی ہوتی۔“

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا اور میں نے نرم لہجے میں سوال کیا۔ ”کیا بات ہے؟ تم کس بات سے اس قدر دہشت زدہ ہو گئی ہو؟ تھوڑی دیر پہلے تو میں نے تمھیں ہشاش بشاش چھوڑا تھا۔ اتنی سی دیر میں تمھیں کیا ہو گیا؟“

”تمھارے چلے جانے کے چند منٹ بعد ڈی ڈی کا فون آیا تھا۔ اس کی موت سے زیادہ سرد آواز سن کر میں ابھی تک بری طرح کانپ رہی ہوں... اس نے کہا تھا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے مار ڈالے گا۔“

”تم دروازہ کھولو۔ میں آ رہا ہوں۔“ ڈی ڈی کا نام سنتے ہی مجھے معاملے کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا اور میں ریسیور پھینک کر دروازے کی طرف لپکا۔

باہر راہداری میں نکل کر میں نے چند ثانیوں تک سیما کے دروازے پر ٹھہر کر دروازہ کھلنے کا انتظار کیا لیکن جب ادھر مکمل سکوت طاری رہا تو میں نے دروازے پر آہستگی سے کئی بار دستک دی پھر تیز دستکیں بھی دیں لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ادھر مسلسل گہرا سناٹا طاری تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے سیما پر دہشت سے سکتہ طاری ہو گیا ہو اور وہ اپنی جگہ سے ہلنے جلنے یا بولنے سے عارضی طور پر معذور ہو کر رہ گئی ہو۔

وہاں کئی منٹ گزارنے کے بعد میں بے نیل و مرام اپنے فلیٹ پر واپس آ گیا۔ اگر بند فلیٹ میں سیما کی حالت خراب ہو گئی تھی تو یہ معاملہ سنگین تھا کیونکہ دروازہ توڑے بغیر اسے کسی قسم کی مدد نہیں پہنچائی جا سکتی تھی جبکہ پچھلی رات کے واقعے سے بلڈنگ کے مکین بے حد خوفزدہ تھے اور دروازہ توڑنے کی کوئی بھی کوشش وہاں بڑے پیمانے پر ہنگامے کے آغاز کا سبب بن سکتی تھی۔

میں اسی سوچ میں ڈوبا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو میرے فون کا ریسیور میز سے نیچے لٹک رہا تھا جسے میں ڈی ڈی کا نام آنے پر عجلت میں پھینک کر چلا گیا تھا۔

میں نے ریسیور کریڈل پر رکھنے سے پہلے عادتاً کان سے لگایا تو لائن پر گہرے سکوت میں دوسری طرف سے کسی کے گہرے گہرے سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے اضطراری طور پر کریڈل دبا کر انگلی ہٹائی لیکن ریسیور پر لائن ٹون کے بجائے وہی سانسوں کی آواز آتی رہی جس کا مطلب تھا کہ سیما کے فلیٹ سے میری لائن مسلسل ملی ہوئی تھی۔ شاید ریسیور واپس رکھنے یا لائن منقطع کرنے سے پیشتر ہی اس کی حالت اتنی غیر ہو گئی تھی کہ سلسلہ جوں کا توں ملا ہوا تھا۔

”ہیلو ہیلو!“ میں نے کئی بار کریڈل کو کھٹکھٹا کر ماؤتھ پیس میں اضطراری طور پر پکارا۔

”گڈ!“ اچانک میرے کانوں میں ایک سرد اور زہریلی آواز گونجی۔ ”اب تم اپنے چوہے دان سے باہر آنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ مجھے تمھاری ہی تلاش تھی۔ جلد ہی تم کو بھی سیما کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔“

”تت... تم کون ہو؟“ وہ غیر متوقع آواز سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔

”اسے فون صرف خوفزدہ کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔“ دوسری طرف سے وہی آواز ابھرنے لگی۔ ”مقصد یہ تھا کہ وہ خود کو خطرے میں محسوس کر کے اپنے اس آشنا سے رابطہ قائم کرے جس کی شہ پر وہ اچھل رہی تھی۔ موت کی دھمکی ملنے کے بعد وہ گھر سے قدم باہر نکالنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ اتنی رات گئے اس کے پاس فون کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میں اس کی گھات میں تھا۔ سب کچھ ہمارے منصوبے کے مطابق ہوا۔ جب اس نے خود کو ملنے والی دھمکی کے بارے میں فون پر بتایا تو بے آواز پستول کی گولی نے اس کی پیشانی میں سوراخ کر دیا۔ وہ مر چکی ہے۔ اس کا فون تم سے ملا ہوا ہے۔ ہماری اطلاع پر پولیس اس کے فلیٹ میں گھسے گی تو اسے ایکسچینج سے معلوم ہو جائے گا کہ سیما کا فون کس نمبر سے ملا ہوا تھا۔ تم جو بھی ہو اور جہاں بھی ہو پولیس تمھیں کھوج نکالے گی اور پھر ہم تم تک پہنچ جائیں گے اور تم جہنم میں سیما سے جا ملو گے۔ اس کا فلیٹ مقفل ہے۔ تم دروازہ توڑے بغیر اندر نہیں گھس سکتے!“

”تم نے اسے مار دیا!“ میرے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔ ”اب تم میرے ہاتھوں سے نہیں بچ سکو گے۔“

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ شاید اس نے اپنی بات پوری کر کے ریسیور کہیں ڈال دیا تھا اور لائن پر موت کا گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ میں نے اضطراری طور پر کریڈل دبا کر چھوڑا لیکن میرے اسٹرومنٹ پر ڈائل ٹون نہیں آئی۔ وہ کال سیما کی تھی جب تک اس طرف سے سلسلہ منقطع نہ کیا جاتا میرا فون اسی طرح انگیج رہتا۔

سیما جو چند ثانیے قبل مجھ سے فون پر بات کر رہی تھی اس کے ناگہانی قتل کی خبر نے میرے اعصاب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرے اور اس کے فلیٹ کے درمیان صرف ایک پتلی سی دیوار حائل تھی لیکن میں اس کا بے تکلف پڑوسی ہونے کے باوجود اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا۔

میرا ذہن اس صورت حال سے ماؤف ہونے کے بجائے بہت تیزی کے ساتھ کام کرنے لگا تھا کیونکہ سیما کی موت کے ساتھ ہی میں بھی ایک بھیانک خطرے سے دوچار ہو گیا تھا۔

قاتل یقیناً شقی القلب اور کوئی سنگدل ہرکارہ تھا جو اپنے شکار کو ذہنی کرب اور اذیت سے دوچار کر کے کسی قسم کی تسکین حاصل کرتا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھے ہرگز ہوشیار نہ کرتا اور میں بے خبری میں پولیس کا شکار ہو جاتا۔ پولیس میرا سراغ لگا کر بے بس کرتی اور وہی قاتل مجھے بھی ٹھکانے لگا دیتا۔

وہ ساری نحوست اسی سلور آئی کی تھی جو سیما کا شوہر اپنے ساتھ لے جانے کے بجائے غلطی سے اپنے میلے کپڑوں میں چھوڑ گیا تھا۔ وہ منحوس سکہ کئی انسانوں کی بھینٹ لے چکا تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ سلسلہ کہاں رکنے والا تھا۔

مرنے سے پہلے سیما اپنے فلیٹ میں اکیلی تھی۔ وہ بہت ڈرپوک عورت تھی اس سے یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ میرے چلے آنے کے بعد اس نے کسی وجہ سے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا ہوا اور پھر اسے صحیح طریقے سے بند کرنا بھول گئی ہو جس کی وجہ سے قاتل کو خاموشی سے اندر داخل ہونے کا موقع مل گیا ہو۔

نکاسی کے دروازے کے علاوہ ایک طرف میرا فلیٹ تھا دوسری طرف بھی سپاٹ دیوار تھی اس لیے لے دے کر سیما کے فلیٹ میں داخل ہونے کا ایک ہی راستہ رہ جاتا تھا۔ مین روڈ کی طرف بنی ہوئی بالکونی زمین سے بہ مشکل ڈیڑھ منزل کی بلندی پر تھی اور کوئی بھی پھرتیلا آدمی رات کے اندھیرے میں کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر پائپ یا رسی کے سہارے بہ آسانی بالکونی تک پہنچ سکتا تھا۔ وہاں سے کھڑکی کے ذریعے فلیٹ میں داخل ہونا زیادہ دشوار نہیں تھا۔

وہ فون پر مجھ سے بات کر چکا تھا اور اسے میری تلاش بھی تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں سیما کے پڑوس میں اس سے صرف ایک دیوار کے فاصلے پر موجود ہوں وہ مجھے یقینی طور پر وہی شخص سمجھ رہا تھا جسے ڈی ڈی کے بھیجے ہوئے آدمی نے سیما کے بستر پر اس کے ساتھ محوِ خواب دیکھا تھا حالانکہ دہ میں نہیں بلکہ جہانگیر تھا۔

میرا ذہن طوفانی رفتار سے کام کر رہا تھا۔ نامعلوم قاتل اگر بالکونی کے راستے سے سیما کے فلیٹ میں داخل ہوا تھا تو وہ قتل کی واردات کے ارتکاب کے بعد دروازے کی راہ سے واپسی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ واپسی کے لیے اسے لازمی طور پر وہی راہ اختیار کرنی چاہیے تھی جس سے وہ وہاں پہنچا تھا۔

خیالات کی یلغار بڑی بھرپور تھی لیکن مجھے وہ جائزہ مکمل کرنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں لگا اور پھر میں نے دوڑ کر وارڈ روب میں کپڑوں کی تہہ کے نیچے سے بھرا ہوا بے آواز پستول نکالا جس میں سے صرف ایک گولی استعمال کی گئی تھی اور پھر بالکونی میں رینگ گیا۔ میری توقع کے عین مطابق سیما کی بالکونی تاریک پڑی ہوئی تھی۔

میں نے دور سے آنے والے روشنی کے انعکاس میں دیکھا کہ وہاں گہرا سناٹا بھی تھا جیسے وہاں سے کسی ذی روح کا گزر تک نہ ہوا ہو۔ بالکونی سے دیوار پر پھسلتی ہوئی میری نظریں جب نیچے گئیں تو بے اختیار میرا پستول والا ہاتھ اسی سمت میں اٹھ گیا۔ نامعلوم قاتل کا منصوبہ پہلے سے طے شدہ تھا جب کہ مجھے ہاتھوں ہاتھ اپنا طریقِ کار طے کرنا پڑا تھا۔ اس طرح اسے مجھ پر چند لمحوں کی جو سبقت حاصل ہو گئی تھی بس نے اس کا پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا اور فلیٹ سے نیچے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پچھلی رات کے خونیں سانحے کی وجہ سے علاقے میں ویرانی کا راج تھا اس لیے وہاں کوئی اس کی راہ روکنے والا نہیں تھا۔ وہ اپنی سہولت کے مطابق ایک فٹ پاتھ پر ... کر کے تیزی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

وہ مضبوط جسم والا ایک دراز قامت شخص تھا اس کی پشت میری طرف ہونے کی وجہ سے اس کے خدوخال دیکھنے ناممکن تھے لیکن پھر بھی میں نے یہ نوٹ کر لیا تھا کہ اس کے گھونگریالے بال پشت پر شانوں تک بڑھے ہوئے تھے وہ جائے واردات سے بخیر و خوبی نکل بھاگنے پر کامیاب ہو گیا تھا لیکن اس وقت میرے پستول کی زد میں تھا۔ میرا ایک ہی بے خطا فائر اسے خاک و خون کا غسل دلانے کے لیے کافی ہو سکتا تھا۔

لیکن یہ امکان بھی تھا کہ اس کے مقدر کی یاوری سے میرا نشانہ خطا ہو جاتا یا کوئی راہگیر میرے فلیٹ کی بالکونی سے فائر کا شعلہ دیکھ کر مرنے والے کی دردناک چیخ سن لیتا تو میرے لیے بچاؤ کی راہیں مسدود ہو جاتیں اس لیے میں نے فوری فیصلے کے تحت فرار ہوتے ہوئے قاتل پر گولی چلانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

اس کا دور ہوتا ہوا ہیولا کچھ دور جا کر ایک موڑ پر اچانک میری نظروں سے معدوم ہو گیا۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا اور کام خاصا دشوار۔ اگر سیما کے فون کا ریسیور فوری طور پر کریڈل پر نہ رکھا جاتا یا ادھر سے لائن نہ کاٹی جاتی تو میرے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔

سیما کے فلیٹ کا تالا توڑ کر اندر گھسنے کا خیال احمقانہ تھا مگر مفرور قاتل نے مجھے ایک اور راہ سجھا دی تھی میرے اور سیما کے فلیٹ کی بالکونی کے درمیان تقریباً چھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اگر زمین سے پندرہ اٹھارہ فٹ کی بلندی اور بالکونی کی دیوار حائل نہ ہوتی تو میں وہ فاصلہ ایک ہی زقند میں طے کر سکتا تھا لیکن اس وقت چھلانگ لگانے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ میں نے اندر واپس لوٹ کر بے تابانہ انداز میں ایسی کسی چیز کی تلاش شروع کر دی جو اس فاصلے کے لیے مختصر سے پل کا کام دے سکے لیکن فلیٹ کی گنجائش کے اعتبار سے وہاں ہر چیز مختصر اور سمٹی ہوئی تھی۔

وقت دھیمے دھیمے گزر رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ وہ بازی میرے ہاتھ سے نکلتی جا رہی تھی ساتھ ہی مجھ پر اعصابی دباؤ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

معاً مجھے اس ڈبل بیڈ کا خیال آیا جو میری خواب گاہ میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے چھ فٹ چوڑی اس مسہری کا گدا الٹا تو یہ دیکھ کر میرا دل خوش ہو گیا کہ گدے کے نیچے پوری چوڑائی والے لکڑی کے تین فریم موجود تھے۔ میں نے گدا نیچے پھینک کر لکڑی کا ایک فریم نکال لیا جس میں تقریباً چھ فٹ لمبی کئی مضبوط چوبی پٹیاں آڑے تختوں کے ذریعے ایک دوسری سے جڑی ہوئی تھیں۔

میں نے بالکونی میں اس فریم کو توازن برقرار رکھتے ہوئے سیما کی بالکونی کی طرف کھسکایا اور چند ہی ثانیوں میں وہ چوبی فریم ایک پل کی طرح دونوں طرف بالکونی کی نیچی دیواروں پر ٹک گیا۔

میں نے چند ثانیوں تک نیم تاریکی میں قرب و جوار کا جائزہ لیا پھر انتہائی تیزی کے ساتھ اس چوبی فریم پر چڑھ کر آناً فاناً میں سیما کی بالکونی میں اتر گیا۔

بالکونی میں کھلنے والا دروازہ بہ ظاہر بند تھا لیکن ذرا سا دباؤ ڈالتے ہی اندر کی طرف کھل گیا اور فوراً ہی اس کا سبب بھی واضح ہو گیا کیونکہ دروازے سے ملحق کھڑکی کا شیشہ ایسی جگہ سے کٹا ہوا نظر آ رہا تھا جہاں سے ہاتھ اندر ڈال کر مقفل دروازہ کھولنے والے لیور کو گھمایا جا سکتا تھا۔

میں نے تیزی سے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا لیکن اسے مقفل کرنے والے لیور کو چھیڑے بغیر آگے بڑھ گیا۔ مختصر سی لابی سے گزر کر میں سیما کی خواب گاہ میں داخل ہوا تو لمحے بھر کے لیے میرے قدم چوکھٹ پر ہی گڑ کر رہ گئے۔

سیما کے بدن پر وہی لباس موجود تھا جو میں نے آخری بار دیکھا تھا وہ مسہری پر پہلو کے بل بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ اس کی دہشت زدہ اور پتھرائی ہوئی بے نور آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور دروازے ہی کی طرف نگراں تھیں۔ اس کی پیشانی پر بھوؤں کے وسط میں گولی کا سوراخ نظر آ رہا تھا جس پر سیاہی مائل سرخ خون جما ہوا تھا۔ بستر کی گلابی چادر بے داغ تھی۔ قاتل کا نشانہ بے خطا اور قابلِ رشک تھا۔ آثار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ پیشانی سے گزر کر دماغ میں پیوست ہونے والی گولی اس قدر کاری ثابت ہوئی تھی کہ مسلح قاتل کو سامنے دیکھ کر پیدا ہونے والی دہشت مرنے والی کی نگاہوں میں منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ موت کی اذیت ان تاثرات کو مسخ نہیں کر سکی تھی اور نہ ہی گولی کے زخم سے چند بوندوں سے زیادہ خون خارج ہوا تھا۔

فون سیما کی لاش کے قریب بستر پر رکھا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ پیس کریڈل سے نیچے سیما کے پیٹ کی طرف مڑے ہوئے گھٹنوں کے قریب پڑا ہوا تھا۔

سیما کا وہ انجام میرے لیے دردناک ثابت ہوا۔ اس کی بے وقت موت کے لیے کسی حد تک میں خود کو بھی قصوروار گردان رہا تھا کیونکہ موت سے ذرا پہلے اس نے مجھ سے مدد طلب کی تھی۔ وہ شی کی بھیانک تنظیم سے باہر کی ایک عورت تھی جس نے سلور آئی دیکھ لی تھی جس لمحے اس نے مجھے اپنے گھر میں سلور آئی کی موجودگی سے آگاہ کیا تھا میں نے اسی وقت اندازہ لگا لیا تھا کہ شی والے نہ صرف ہر قیمت پر اس سے سلور آئی نکال لے جاتے بلکہ اس کی زندگی کے درپے بھی ہو سکتے تھے اور آخر کار اس کے ساتھ وہی سلوک ہوا تھا۔

میں نے ایک ٹیل میٹ کی مدد سے ریسیور بستر سے اٹھا کر انسٹرومنٹ کے کریڈل پر رکھ دیا۔ اس وقت میں وہاں اپنے فنگر پرنٹ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ پھر میں سیما کی سرد ہوتی ہوئی لاش کو چھیڑے بغیر واپس ہو لیا میں نے ارادہ کیا تھا کہ بدن سرد ہونے سے پہلے اس خوبصورت چہرے کی پھٹی ہوئی ڈراؤنی آنکھوں کے پپوٹے اپنی ہتھیلیوں سے گرا دوں لیکن اس طرح فطری صورت حال میں ایک بنیادی تبدیلی رونما ہو سکتی تھی۔ ویسے بھی مرنے والی مر گئی تھی اور اس احساس سے یکسر بے نیاز ہو چکی تھی کہ اس کے بعد دیکھنے والے اس کی صورت اور آنکھوں پر کیا تبصرے کرتے۔

واپسی کے لیے بھی میں نے بالکونی میں بنایا ہوا اپنا چوبی پل استعمال کیا اور اپنے فلیٹ کی حدود میں داخل ہو کر جب میں نے اس چوبی فریم کو واپس ہٹانا چاہا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس وزنی ڈھانچے کو دو دیواروں کی درمیانی خلا میں سرکانا اتنا آسان نہیں تھا۔ اندازے اور توازن کی ذرا سی غلطی سے وہ فریم ہاتھ سے چھوٹ کر پُرشور دھماکے کے ساتھ نیچے زمین پر پہنچ سکتا تھا۔ اسے لگاتے ہوئے جوش اور ہیجان میں میں نے ان جزئیات پر سرے سے غور ہی نہیں کیا تھا لیکن کام پورا ہو جانے کے بعد اس مرحلے کی اہمیت واضح ہو رہی تھی۔

آخر کار میں نے وہ چوبی فریم واپس اپنے ڈبل بیڈ پر پہنچا کر اس پر فوم کا میٹریس اور گدا ڈال کر چادر برابر کر دی اور تھکے ہوئے انداز میں اپنے لیے اسکاچ کا ایک گلاس تیار کرنے لگا۔

ٹیلی فون کے آسیبی خطرے نے میرے اعصاب کو ہلا کر رکھ دیا تھا لیکن اس کے باوجود میں سیما کے قاتل کی اس نفسیاتی گرہ کا شکر گزار تھا جس سے مجبور ہو کر اس نے فون پر مجھے اپنے پورے منصوبے سے آگاہ کر کے اس کا بروقت تدارک کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

اس وقت رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ کسی بھی لمحے پولیس والوں کی نفری سیما کے فلیٹ پر پہنچ سکتی ہے اور سیما کا واحد پڑوسی ہونے کے باعث تفتیش میں ابتدائی طور پر میرا ملوث کیا جانا یقینی تھا اس لیے میں نے عجلت میں اپنا گلاس خالی کیا اور چند الائچیاں منہ میں ڈال کر بستر پر دراز ہو گیا۔

ایک مصیبت سر پر سوار ہو کر ٹل گئی تھی لیکن میری تشویش کا سلسلہ برقرار تھا۔ میرا ذہن سلطان شاہ کے معاملے میں الجھ گیا تھا۔ اگر وہ اپنا تعاقب کرنے والے سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور ہر طرح خیریت سے تھا تو وہ کسی بھی لمحے میرے پاس پہنچنے والا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ اگر اسے آنا ہی تھا تو پولیس کی آمد سے پہلے آجانا چاہیے تھا ورنہ اتنی رات گئے عمارت میں محض دوستانہ ملاقات کے لیے داخلے کی بنا پر پولیس والے اسے مشتبہ قرار دے کر اپنی تحویل میں لے سکتے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کا دھارا ایک بیک میرے خلاف چل پڑا ہو۔ ایک الجھن دور نہیں ہونے پاتی تھی کہ اس سے پہلے دوسرا مسئلہ تیار ہوتا تھا۔

گھڑی کی سوئیاں اپنی رفتار سے سرکتی رہیں، سوا دو بج گئے لیکن عمارت کے زینوں پر بہ دستور سناٹا راج کرتا رہا۔ نہ سلطان شاہ آیا اور نہ پولیس کی جمعیت وہاں پہنچی۔ مجھے یقین تھا کہ [illegible] وقت کی بہت اہمیت تھی جس سے صفدر وارثی [illegible] واقف تھا۔ اس نے سیما کے فلیٹ سے بحفاظت نکل جانے کے بعد پولیس کو قتل کی اطلاع دینے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی ہو گی۔ بس یہی سوچا جا سکتا تھا کہ پولیس والوں نے ایک گمنام اطلاع کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی یا پھر وہ لوگ ضابطے کی کارروائیاں پوری کرنے کے بعد ہی تفتیش پر نکلنے کے عادی تھے۔ ایک موہوم سا امکان یہ بھی تھا کہ رات گزر جانے کے باعث تھانے میں متعلقہ عملہ موجود نہ رہا ہو۔ سننے میں آیا تھا کہ ان دنوں بیشتر اہل کار دس بارہ بجے کے بعد روزنامچوں میں علاقہ گشت کا اندراج کر کے گھروں میں آرام کرنے چلے جاتے تھے اور صبح سویرے تک تھانے کے معاملات ایک آدھ کانسٹیبل یا اسی عہدے کے چند سنتریوں کی صوابدید پر رہ جاتے تھے۔ اگر کوئی بہت ہی سنگین صورتِ حال درپیش ہوتی تو وہ تھانے میں سوئے ہوئے محرر کو جگا دیتے تھے جو یہ فیصلہ کرنے کا مجاز ہوتا ہے کہ سپاہی بھیج کر یا فون کر کے افسرانِ بالا کی نیند میں خلل ڈالے یا امنِ عامہ کے مفاد میں انھیں صبح تک نہ چھیڑے۔

میرے کان کسی ہلکی سی آہٹ کے بھی منتظر تھے۔ آخر خدا خدا کر کے ڈھائی بجے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی موہوم سی دھمک سنائی دی اور پھر میری ڈور بیل ایک ہلکی سی آواز پیدا کر کے خاموش ہو گئی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے آنے والے نے بٹن کو بس چھو کر فوراً ہی اپنی انگلی ہٹا لی ہو۔

میں نے فوراً دروازے پر پہنچ کر استفسار کیا اور سلطان شاہ کی آواز سن کر دروازہ کھول دیا۔

"تمہارے انتظار میں میری نیند ہی اڑ کر رہ گئی تھی۔" میں نے اسے اندر بلاتے ہوئے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "آج شہر میں قتل، ڈکیتی یا دہشت گردی کی کوئی بہت بڑی واردات ہو گئی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "جگہ جگہ پولیس کی گاڑیاں موجود ہیں۔ راستے میں چار جگہ میری ٹیکسی روک کر تلاشی لی گئی ہے اس لیے یہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی ورنہ میں پہلے آگیا ہوتا۔"

"قتل کی ایک واردات میرے برابر والے فلیٹ میں ہو گئی ہے۔ رشی والوں نے تھوڑی دیر پہلے سیما کو ہلاک کر دیا ہے۔ یہاں بھی پولیس آنے والی ہو گی۔" میں نے اسے مطلع کیا۔

میری بات سن کر وہ چونک پڑا۔ میں نے اسے اختصار کے ساتھ پورے واقعے سے آگاہ کیا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "ایسا تو نہیں کہ خود ڈی ڈی ہی اسے ہلاک کرنے آیا ہو؟"

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔" میں نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "وہ کٹھ پتلیوں کی ڈور ہلانے کا عادی ہے۔ اسے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں چاہتا تو اسے ہلاک یا کم از کم زخمی ضرور کر سکتا تھا لیکن پھر میرا اپنا بچاؤ بہت مشکل ہو جاتا۔ خیر یہ تو ہو گیا۔ تم بتاؤ کہ کون سی گرما گرم خبریں لائے ہو؟"

"سب سے پہلی خبر یہ ہے کہ آج میں دلدار آغا کو دور سے دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ فیکٹری میں اسے منیجر اور پی اے کے علاوہ شاید ہی کسی نے قریب سے دیکھا ہو۔ اس کی چال میں خاصی لنگڑاہٹ موجود تھی۔"

وہ واقعی ایک اچھی خبر تھی۔ دلدار کی لنگڑاہٹ کا ذکر سنتے ہی مجھے بے اختیار سیٹھ حبیب کی وہ قیاس آرائی یاد آگئی جس کے مطابق ڈی ڈی شریف آباد کے معرکے میں بذاتِ خود ایک سیاہ پھیر دے اسلحے کی تقسیم کی نگرانی کرتے ہوئے پنڈلی پر گولی کھا کر زخمی ہو کر گر گیا تھا۔ سلطان شاہ کی لائی ہوئی خبر سیٹھ حبیب کے اندازے کی تائید کر رہی تھی۔ میرے پاس دلدار آغا کی مجرمانہ سرگرمیوں کے اٹل شواہد موجود تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ میں غزالہ کو اپنی کسی بھی بات کا یقین نہیں دلا سکتا تھا وہ اسی بہانے کو سچ سمجھتی جو دلدار آغا نے اس سے تراشا تھا۔

"کس عمر کا آدمی ہے وہ؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔ اس کا ذکر آتے ہی میرے سینے میں دھواں سا بھرنے لگا تھا کیونکہ دلدار نے غزالہ پر ڈورے ڈال کر پوری طرح تصرف حاصل کر لیا تھا۔ اس طرح وہ میرا رقیبِ روسیاہ بن گیا تھا۔ جب اس کے سنگین جرائم کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتارے بغیر میرے دل کو سکون نہیں مل سکتا تھا۔

"دور سے جوان نظر آتا ہے۔ مضبوط جسم اور اچھے قد کا مالک ہے۔" وہ مجھے بتانے لگا۔ "دراصل فیکٹری میں کام کرنے کے قواعد بہت سخت ہیں۔ فیکٹری منیجر، اس کے پی اے اور تین سلح محافظوں کے علاوہ وہاں کل نو کارکن مستقل بنیادوں پر ملازم ہیں اس لیے یونین وغیرہ بھی نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص صبح نو بجے سے شام کے پانچ بجے کے درمیان اپنے کام کرنے کے علاقے سے باہر دیکھ لیا جائے تو اسے اسی وقت ملازمت سے فارغ کر دیا جاتا ہے جب کہ دلدار آغا دس بجے کے بعد آتا ہے اور عموماً چار بجے سے پہلے واپس چلا جاتا ہے۔"

"پھر تم نے اسے کیسے دیکھ لیا؟" میں نے سوال کیا۔ دلدار آغا کی تنظیمی صلاحیتوں کی تعریف مجھے پسند نہیں آئی تھی۔

"فیکٹری کے ہال سے دفاتر والا بلاک خاصی دور واقع ہے جو کھڑکیوں سے نظر آتا ہے۔ اسے دور سے ہر ایک نے ہی دیکھا ہوا ہے لیکن کوئی نقاب وغیرہ استعمال نہ کرنے کے باوجود کوئی اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔"

"تو کیا وہ معائنے وغیرہ کے لیے فیکٹری میں نہیں آتا؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"پتا نہیں۔ ابھی تو میرا دوسرا ہی دن تھا لیکن اس کے نام سے ملازمین کی روح فنا ہوتی ہے۔ اس سے دوبدو واسطہ نہ پڑنے کے باوجود لوگ اس سے دہشت زدہ رہتے ہیں کیونکہ وہ تنخواہیں تو اچھی دیتا ہے لیکن کام اور ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت بلکہ سفاک ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ ایک دن اس نے فیکٹری سے ذرا دور گاڑی روک کر ایک ایسے آوارہ کتے کو غصے میں شوٹ کر دیا تھا جس نے اس کی گاڑی پر بھونکنا شروع کر دیا تھا۔"

"میں نے تمہیں اس کی خوبیاں دریافت کرنے کے لیے وہاں نہیں بھیجا تھا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں تو تمہارے سوالات کے جواب دے رہا تھا، پھر غصہ کیوں ہو رہے ہو؟"

اس کی حیرانی پر میں خفت آمیز انداز میں اپنے لیے سگریٹ سلگانے لگا۔ میرے دل میں دلدار آغا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش موجود تھی مگر میں شاید اس کی تعریف کے بجائے اس کی برائیاں سننے کی لاشعوری توقع کر رہا تھا جو اس وقت سامنے نہیں آئی تھیں۔ سلطان شاہ میری توقعات اور دلی جذبات سے بے خبر مسلسل اس کی شان میں قصیدے الاپے جا رہا تھا جو میرا خون سلگا رہے تھے۔

"تمہیں یہ دیکھنا تھا کہ دواساز فیکٹری کی آڑ میں وہاں کیا گھپلے ہو رہے ہیں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ابھی تک کوئی گھپلا سامنے نہیں آیا۔ وہاں چند گنی چنی جنرل دوائیں تیار کی جاتی ہیں۔ فیکٹری منیجر باقاعدہ سند یافتہ آدمی ہے لیکن شاید فیکٹری سے باہر بھی وہ بہت سے معاملات میں دلدار کا شریک ہے۔ ان کے بنائے ہوئے مردانہ ہارمون کے کیپسول یورپ میں بہت مقبول ہیں۔ وہ مقامی مارکیٹ میں نہیں دیے جاتے بلکہ آرڈر پر بنا کر برآمد کیے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ فیکٹری کو ایمانداری سے چلایا جا رہا ہے، گھپلے باہر ہوتے ہیں۔"

"کیپسول!" میں نے آنکھیں سکیڑ کر پُرخیال انداز میں دہرایا۔ "وہ مقامی مارکیٹ میں کیوں نہیں دیے جاتے؟"

"دلدار آغا سے ملاقات ہو گی تو پوچھ لوں گا۔" وہ جل کر بولا۔ "تم تو مجھ پر ہی جرح کر رہے ہو۔"

"جرح نہیں، میں تمہیں سوچنے کی دعوت دے رہا ہوں۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "جو لوگ اس کے رشی کے ساتھ روابط سے بے خبر ہیں وہ اسے ایماندار سمجھ سکتے ہیں لیکن تم اس کے پس منظر کے ساتھ کیپسولز کے معاملے پر غور کرو گے تو تمہیں اندازہ ہو گا کہ گڑبڑ اسی مقام پر ہو سکتی ہے۔"

میری بات سن کر وہ فوری طور پر کچھ نہ بولا۔ اس کی آنکھیں خیال انگیز انداز میں پھیلتی جا رہی تھیں پھر وہ ایک دم ہی پُرجوش لہجے میں بولا تھا۔ "شاید تم صحیح کہہ رہے ہو۔ اب مجھے پوری بات تم کو بتانی پڑے گی تاکہ تمہاری کھوپڑی کیپسولز کی تیاری میں ہونے والی کسی گڑبڑ کو پکڑ سکے۔"

اس کے بعد ہمارے درمیان اس موضوع پر طویل گفتگو ہوئی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جاز فارماسیوٹیکل ایک چھوٹی لیکن جدید طرز کی فیکٹری تھی جہاں ہالینڈ کی ایک دواساز فرم کے لائسنس کے تحت چار ادویات تیار کر کے مقامی مارکیٹ میں فروخت کی جاتی تھیں البتہ ہارمون کے کیپسول جو صرف آرڈر کے تحت ہارموئیم کے نام سے برآمد کے لیے بنائے جاتے تھے ان کی تیاری کا طریقہ بہ ظاہر بہت زیادہ احتیاط طلب نظر آتا تھا۔

عملے کے تمام افراد کو یہ بتایا گیا تھا کہ ہارموئیم کیپسولز میں بھری جانے والی دوا انسانی [illegible] کے لیے نظامِ ہضم کے ذریعے اگر اکسیر تھی تو جلد کے لیے بہت خوفناک اثرات رکھتی تھی۔ وہ دوا اگر ایک بار جلد سے مس ہو جاتی تو اس مقام کی جلد گلنے کے ساتھ ہی زخم تیزی کے ساتھ بڑھ سکتا تھا۔ گلتی ہوئی انسانی جلد میں پیدا ہونے والے نادیدہ جراثیم اس قدر متعدی ہو سکتے تھے کہ دوسروں سے جسمانی اتصال کے بغیر ہوا میں اڑ کر دوسرے صحت مند افراد کی جلد کو گلانا شروع کر سکتے تھے خوفناک خواص رکھنے والے ان کیپسولز کی تیاری کے لیے فیکٹری کے ایک علیحدہ حصے میں ہوا بند مشین نصب تھی جہاں جانے سے ہر کارکن خوف کھاتا تھا کہ کہیں وہ متعدی جلدی بیماری کا شکار

نہ ہو جائے۔

وہ مشین ہمیشہ فیکٹری کے دو مخصوص ملازمین چلاتے تھے اور مشین والے کمرے میں جانے سے پہلے سر سے پیر تک وہ لباس پہنتے تھے جو گہرے پانیوں میں غوطہ خوری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ احتیاط کی انتہا یہ تھی کہ وہ اس کمرے کی فضا میں سانس بھی نہیں لیتے تھے بلکہ نظامِ تنفس کے لیے انھیں پشت پر لدے ہوئے سلنڈروں سے خالص آکسیجن ملتی تھی۔ وہ مشین خالی کیپسولز میں خطرناک دوا بھر کر خودکار طریقے سے پیک کرتی تھی۔ کیپسولز میں بھری جانے والی دوا یا اس کے اجزا کسی نامعلوم مقام سے درآمد کیے جاتے تھے اور انھیں مشین میں چارج کرنے کے لیے اتنی احتیاط برتی جاتی تھی کہ فیکٹری منیجر اپنے ماتحت عملے میں سے کسی کی زندگی داؤ پر لگانے کے بجائے بذاتِ خود ڈائیونگ کا سیٹوم پہن کر اپنے ہاتھوں سے وہ کام سرانجام دیتا تھا اور یوں تیار مشین فیکٹری کے دو مخصوص کارکنوں کے حوالے کر دی جاتی تھی۔

اس مشین اور اس میں استعمال ہونے والی خطرناک دوا کے بارے میں سپروائزر نے پہلے ہی دن سلطان شاہ کو بتا دیا تھا کہ وہ اس گندی جلدی بیماری کا شکار ہونے سے بچا رہے۔ رہی سہی باتیں اسے دوسرے ورکرز سے معلوم ہوئی تھیں جن میں یہ نکتہ بھی تھا کمپنی بھاری منافع کی وجہ سے ہارمونیم کیپسول بنانے اور برآمد کرنے پر مجبور تھی اور اسی کی وجہ سے اپنے ملازمین کو معقول تنخواہیں دے رہی تھی، ورنہ دوسرے آئٹم مقامی بازار میں سخت مقابلہ بازی کی وجہ سے زیادہ منفعت بخش نہیں رہے تھے۔ شاید دلدار آغا نے وہ بات اپنے مفاد میں خود ہی کسی طرح ورکرز میں پھیلائی تھی۔

ان لوگوں میں اپنے فیکٹری منیجر کے لیے بھی احترام کے جذبات پائے جاتے تھے جو محض اپنے ماتحتوں کی سلامتی کی فکر میں مشین چارج کرنے کا ادنیٰ سا کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیتا تھا جو اس کے منصب کے کسی طرح شایانِ شان نہیں تھا۔ ویسے بھی ہارمونیم پیک کرنے والی وہ مشین کئی کئی دن کے ناغے کے بعد حسبِ ضرورت چلائی جاتی تھی۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ دورانِ کار جمع ہونے والے ناکارہ کیپسول اور دوسرا مشینی کچرا، پیکنگ مکمل ہونے پر خودکار نظام کے تحت مشین کی برقی بھٹی میں جل کر راکھ ہو جاتا تھا۔ اس طرح کسی بھی شخص کے خطرناک دوا سے متاثر ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں چھوڑا گیا تھا۔

”یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے کہ ہارمونیم میں بھرے جانے والے سفوف کا راز برقرار رکھنے کے لیے کارخانے کے ملازمین میں اس کے بارے میں دہشت پھیلائی گئی ہے۔ متعدی جلدی بیماری کے خوف سے ہر ایک اس سفوف سے دور بھاگتا ہے۔“ میں نے پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد کہا۔ ”فیکٹری میں مجھے گمان تک نہیں گزرا تھا۔ اس ماحول میں جو کچھ بتایا گیا تھا وہ درست محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اس میں مجھ سے پرانے ملازمین کے تاثرات نے اہم رول ادا کیا تھا لیکن اب تم سے مل کر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ سب ڈھکوسلا ہے۔ پورے ڈرامے کا اہم ترین عنصر یہ ہے کہ فیکٹری منیجر کے علاوہ دو ملازمین پورے ڈائیونگ کا سیٹوم کے ساتھ اس مشین کو چلاتے ہیں۔ کون سوچ سکتا ہے کہ وہ ڈراما ہوگا؟“

جاز فارماسیوٹیکل سے دلدار آغا کی وابستگی اس بات کی شاہد تھی کہ ہارمونیم کیپسول ہیروئن کے لیے استعمال کیے جاتے تھے اور اس سفوف کی حقیقت سے فیکٹری کے عملے کو بے خبر رکھنے کے لیے جلدی امراض کے ہولناک جراثیم کی کہانی پھیلائی گئی تاکہ تجسس سے مجبور ہو کر کوئی کارکن مشین سے خالص ہیروئن یا اس سے بھرا ہوا کیپسول چرانے کی کوشش نہ کرے۔ اس طرح میرا وہ شبہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا تھا کہ دواساز کارخانے کی آڑ میں ڈی ڈی یا دلدار آغا ہیروئن کی اسمگلنگ کا کاروبار کر رہا تھا۔

”لیکن مافیا والوں کا کہنا ہے کہ شی ہیروئن کے انسداد کے لیے کام کر رہی ہے پھر ہارمونیم کی برآمد تو بے معنی ثابت ہو جاتی ہے۔ شی کی ساری توجہ تو اس بات پر مرکوز ہونا چاہیے کہ ہیروئن کی لعنت رفتہ رفتہ پاکستان کے ان جاگیرداروں اور بارسوخ گھرانوں تک میں پہنچا دیں جو اقتدار کے مالک ہیں۔ جب اس طبقے کے نوجوان لڑکے لڑکیاں ہیروئن کے نشے میں دھت ہونے لگیں گے تو ملک کا قانون اور انتظامیہ پوری قوت کے ساتھ افیم کی کاشت اور ہیروئن کی کشید کے خلاف میدانِ جنگ میں کود پڑے گی۔“ میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ مافیا والوں سے تمھارے مذاکرات کہاں تک پہنچے ہیں اور ان کے نظریات کیا ہیں لیکن تمھاری یہ بات سو فیصد درست ہے کہ ہارمونیم خالص ہیروئن کے کیپسول ہوتے ہیں جنھیں دوا کی آڑ میں بہت کامیابی کے ساتھ ملک کے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر برآمد کیا جا رہا ہے۔“

”مذاکرات آج ختم ہو گئے اور اب میں مافیا کا باقاعدہ حلف بردار رکن ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اُسے آگاہ کیا اور پھر اسے اس تمام پیش رفت سے آگاہ کر دیا جس سے وہ بے خبر تھا۔

”معاملات بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔“ میری پوری کہانی سن کر وہ تشویش آمیز لہجے میں بولا۔ ”تم نے بتایا تھا کہ شی والوں نے جس دور میں کراچی میں چرس کی سپلائی روک کر ایک منظم منصوبے کے تحت عادی نشے بازوں میں مفت اور سستے داموں ہیروئن متعارف کرائی اس زمانے میں تم شی کے بہت سرگرم رکن تھے۔ تم خود غور کرو کہ شی والے اگر ہیروئن کی اسمگلنگ سے کی فکر میں تھے تو انھیں مقامی منڈی میں قدم رکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ پسِ پشت رہ کر سکون سے کروڑوں کا منافع حاصل کرتے رہتے اور پاکستان میں نہ ہیروئن اتنے بڑے پیمانے پر متعارف ہوئی ہوتی اور نہ اس کے خلاف رائے عامہ کے اہم حلقوں میں غلغلہ پیدا ہوتا۔ اس طرح تو انھوں نے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔“

”ایک یہی مضبوط ترین دلیل مافیا والوں کے حق میں جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دو لاکھ کی جو ہیروئن پاکستان کی منڈی میں تین چار لاکھ کی بکتی ہے، غیر ملکی منڈیوں میں اس کے دو ڈھائی کروڑ ملتے ہیں اس لیے دشوار گزار پہاڑی علاقوں سے اعلیٰ درجے کی ہیروئن خرید کر اسے مقامی طور پر کھپانا سراسر بدنیتی پر مبنی ہے۔“

”اگر شی ہیروئن کے خلاف امریکی مفادات کی جنگ لڑ رہی ہے تو پھر سب کچھ ممکن ہے۔ امریکیوں کے خفیہ ادارے دنیا بھر میں بدترین شہرت رکھتے ہیں۔ سی آئی اے بڑے اور وسیع تر عالمی مفادات کے لیے بارہا اپنے ہی لوگوں کو بکرا بنا چکی ہے اس لیے یہ بات ممکن نظر آتی ہے کہ شی ہیروئن کے ذریعے پاکستان کی نئی نسل کو تباہ کرنے کے منصوبے پر عمل کر رہی ہے تاکہ امریکی نئی نسل کو تباہی سے بچایا جا سکے۔ تمھیں معلوم ہے کہ امریکہ کھلے بندوں اور خفیہ طریقوں سے ہیروئن کے خلاف بے دریغ ڈالر لٹاتا رہتا ہے۔ اگر چند برسوں میں شی کے ذریعے چند کروڑ ڈالر کی سرمایہ کاری کر کے پاکستان کی سرزمین سے افیم کو نیست و نابود کیا جا سکے تو ان کے لیے یہ سودا مہنگا نہیں رہے گا لیکن پھر تمھارا سوال آڑے آ جاتا ہے کہ شی کا مقامی سربراہ، جاز فارماسیوٹیکل کی آڑ میں ہیروئن کیوں برآمد کر رہا ہے؟“

”بات سے بات نکلتی ہے تو پھر بہت سی کڑیاں خود بخود ملنے لگتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”جس طرح دلدار آغا نے فیکٹری کے ملازمین کو ہیروئن کی اسمگلنگ کے لیے اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے وہ بے چارے سمجھتے ہیں کہ مردانہ ہارمون کے قوت بخش کیپسول بنا رہے ہیں لیکن درحقیقت ہر کیپسول زہر کی ایک پڑیا کے برابر ہوتا ہے۔ اسی طرح میرا خیال ہے کہ جمی لائیڈ نے شی میں اوپر سے نیچے تک ہر ایک کو احمق بنایا ہوا ہے۔ پاکستان اور نئے گولڈن کریسنٹ کے ملکوں سے باہر جانے والی ہیروئن کی بیشتر مقدار وہ تلف کرا دیتا ہے اور کچھ مقدار میں لیکٹوز کی بھاری ملاوٹ کر کے مغربی منڈیوں میں پھیلا دیتا ہے۔ اس کی حکمتِ عملی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ملاوٹ شدہ ہیروئن نسبتاً کم داموں پر مہیا کرتا ہو۔ اس طرح وہ خالص ہیروئن کی منڈی کو رفتہ رفتہ محدود کرتا جا رہا ہے۔ دوسری طرف باہر موصول ہونے والی ہیروئن کی مقدار سے اسے یہ اندازہ بھی ہوتا رہتا ہے کہ پاکستان میں اس کے آدمی کتنے فعال ہیں...“

”وہ ہیروئن پاکستان میں بھی تباہ کی جا سکتی ہے۔“ سلطان شاہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ”بے شمار خطرات مول لے کر بھاری سرمایہ خرچ کرنے کے بعد اسے یورپ یا امریکا میں تباہ کرنا ناقابلِ فہم ہے۔“

”تم بات پر غور نہیں کر رہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اول تو تم خود کہہ چکے ہو کہ ان کے پاس وسائل اور سرمائے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ اپنے ملک کو ہیروئن کی تباہ کن یلغار سے بچانے کے لیے تجوریوں کے منہ کھول سکتے ہیں۔ دوم یہ کہ یہاں سے ہیروئن باہر اسمگل کرنے والے اور اسے وصول کرنے والے دونوں شی کے گرگے ہوتے ہیں۔ انھیں کسی کو کچھ لینا دینا نہیں پڑتا اس لیے معمولی سے کرائے یا کیریئر کے سفری اخراجات کے علاوہ انھیں یورپ یا امریکا میں بھی ہیروئن انھی داموں پڑتی ہے جن داموں پر وہ خیبر کے اطراف سے خریدی جاتی ہے۔ اگر جمی لائیڈ کو امریکی حکومت کی سرپرستی حاصل ہے تو اس کے پاس ہر فصل اور اس سے کشید ہونے والی ہیروئن کی صحیح مقدار کا تخمینہ ہوتا ہوگا۔ ان کا ملک سراغ رسانی اور مواصلات کے جدید ترین خلائی نظام سے کام لیتا ہے۔ انھیں یہ بات معلوم ہوتی رہتی ہے کہ ان کے آدمیوں نے کل پیداوار کے کتنے فیصد پر کنٹرول حاصل کیا ہے۔ اس کی روشنی میں وہ اپنی حکمتِ عملی میں تبدیلیاں کرتے رہتے ہوں گے۔ پھر جمی لائیڈ بھی کسی نہ کسی کو جواب دہ ہوگا۔ خواہ وہ امریکا کا صدر ہی ہو۔ جمی لائیڈ اس خطے میں اپنی کارگزاریوں کی کاغذی رپورٹ کے بجائے اس اعلیٰ اتھارٹی کو ہیروئن کے وہ انبار دکھا سکتا ہے جو یہاں سے باہر اسمگل کیے گئے ہوں۔ اسی کے ساتھ ان کو اسمگلنگ کے ذریعے پاکستان کے انسدادی اقدامات میں ان دراڑوں کا علم ہوتا رہتا ہے جن سے اسمگلنگ کارساز ہوتا ہے۔ افیم اگانے والے سے لے کر ائیرپورٹ پر مراعات کے عوض بھاری رشوت وصول کرنے والے تک سلسلے کا ہر فرد ان کی نگاہ میں رہتا ہے۔ تمھیں شاید علم نہ ہو کہ پاکستان کو امریکا ہیروئن کے انسداد کے لیے ہر سال بھاری امداد دیتا ہے۔ وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس امداد کو کس حد تک صحیح مدوں میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس طرح شی کے ذریعے سرکاری سطح پر ہونے والے مذاکرات میں بھی بہت مدد ملتی ہوگی۔“

”اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ دلدار آغا بھی جھاڑے کا ٹٹو ہے جسے خود اپنے کالے کرتوتوں کے اثرات کا علم نہیں۔ تم نے واقعی میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ تمھاری ہر بات میں وزن ہے اور اس سے مافیا اور شی کے مفادات کے ٹکراؤ کی بات بھی واضح ہو جاتی ہے لیکن اتنے بڑے کھیل میں ہم دو آدمی کیا

کردار ادا کرسکیں گے؟"

"بس دیکھتے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "ایک صف میں تم گھس گئے ہو، دوسری طرف مجھے کامیابی حاصل ہو گئی ہے۔ یہ جوڑ توڑ ضرور کوئی نہ کوئی رنگ دکھائے گا۔ ان باتوں پر ذرا گہرائی میں جاکر غور کرو تو خوف سے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ ایک طرف ملک میں ہیروئن کا کالا دھن روز بہ روز پھیل رہا ہے۔ یہ چور سرمایہ دار اقتدار اور انتخاب کی جنگ میں اسی فریق کا ساتھ دیں گے جو انہیں ان کے مفادات کے تحفظ کا یقین دلا سکے اور ان کی مدد کے بغیر کامیابی ناممکن ہے کیونکہ خطیر سرمائے کے بغیر آج بھی یہاں کسی کامیابی کا تصور محال ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اقتدار کی باگ ڈور محبِ وطن لوگوں کے ہاتھ سے نکل کر اس طبقے کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی جس کی نکیل شی یا مافیا کے ہاتھ میں ہو گی۔ لاطینی امریکا کے کئی ملک اس وقت اس سیاسی عذاب سے گزر رہے ہیں۔ سکہ بند مجرم اپنی قوموں کی تقدیر کے مالک بن چکے ہیں اور بڑی خونریزیوں کے بغیر وہاں صورتِ حال میں کسی تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے۔ اس پورے المناک کھیل میں شی جیسی تنظیموں کو یہ بالادستی حاصل ہوتی ہے کہ ان کے پاس معاشرے کے بے ضمیر اور رشوت خور لوگوں کے پورے کوائف موجود ہوتے ہیں جس کے ذریعے ان تخریبی قوتوں کو ایک اشارے پر متحد و منظم دیوار کی طرح حرکت میں لایا جاسکتا ہے۔ جو احکام کی تعمیل سے گریز کرے اس کا سیاہ نامۂ اعمال منظرِ عام پر لے آیا جاتا ہے۔"

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ اس قدر گندہ اور گھناؤنا چکر ہو گا۔" وہ اپنے دونوں کان پکڑتے ہوئے بولا۔ "میں اپنے گاؤں سے کراچی آیا تو میرے ذہن میں صرف اتنی بات تھی کہ ہیروئن کے ذریعے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کی جاسکتی ہے لیکن یہ تو پوری قوم کا سودا کرنے کا راستہ ہے۔ یہ خون جس کے منہ کو لگ جائے وہ کب چاہے گا کہ نیک اور دیانت دار لوگ اقتدار کی امانت سنبھال سکیں۔"

"عام طور پر لوگ اپنی ذات سے آگے کچھ نہیں سوچتے اور یہی خود غرضی ایک دن سب کو تباہی کے اندھے غار میں دھکیل دیتی ہے۔ ہیروئن اور کلاشنکوف ایسے ہولناک عناصر ہیں کہ یہ پورے معاشرے کو تہ و بالا کرسکتے ہیں اور ان دونوں کو افغانستان کے حالات سے شہ ملی ہے۔ گوریلا جنگ لڑنے والوں نے اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہر طرح سے ان دونوں کی سرپرستی کی ہے لیکن ان کے لائے ہوئے اس ورثے کی قیمت ہمیں آنے والے برسوں میں ادا کرنی ہو گی۔ لڑنے والوں سے روسیوں کی کھلی دشمنی تھی لیکن ہیروئن اور کلاشنکوف کے فروغ میں روسیوں نے بھی دل کھول کر ان کی اعانت کی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ پہاڑوں اور دروں میں کشید ہونے والی ہیروئن کی بڑی مقدار آخر کار امریکا کی منڈی میں ہی بکیں گی اور کلاشنکوف ہمارے گلے کا ہار بن جائے گی۔ دیکھا جائے تو روسیوں نے ہمیں کلاشنکوف کا تحفہ بھجوایا ہے اور امریکا نے ہیروئن ہمارے گلی کوچوں تک پہنچا دی ہے۔"

"وہ جنگ کچھ دن اور چلتی رہی تو کلاشنکوف واقعی تول کر لوہے کے بھاؤ ملنے لگے گی۔" اس نے پھریری لے کر کہا۔ "لیکن یہ تو بتاؤ کہ جمی لائیڈ کی وھائٹ ہاؤس تک رسائی کی بات تم سے کس نے کہی تھی؟"

"یہ مافیا والوں کا انکشاف تھا۔ میرا خیال ہے کہ انھیں اس معاملے میں مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "شی جس طرح آپریٹ کر رہی ہے اس سے بھی اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ اسے کہیں نہ کہیں سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ ان کے سیٹ اپ میں پاکستان کی کتنی اہمیت ہے اس کا اندازہ تم صرف اس بات سے لگا سکتے ہو کہ لاہور میں لائیڈز کاٹیج نامی قلعہ نما عمارت میں شی کا مقامی ہیڈ کوارٹر قائم تھا جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ تنظیم کے اثاثوں میں وہ واحد عمارت تھی جو جمی لائیڈ کے خاندانی نام سے موسوم تھی۔ اس وقت میری تم سے ملاقات ہو چکی تھی اور میں تنظیم سے باغی ہو چکا تھا۔ میں نے وہیں ایک تہ خانے کے مقفل کمرے میں جمی لائیڈ کی ایک رنگین قدِ آدم تصویر دیکھی تھی جسے ویرانے پہچانا تھا۔ اس وقت وہ اس کے لیے ڈان مرسیانو تھا۔ ہم دونوں نے اس عمارت کو وہاں موجود زیرِ زمین بارودی ذخائر کی مدد سے تباہ کیا تھا۔ اس کے بعد ہی مجھے کھل کر سامنے آنا پڑا۔ اس وقت تک شاید مجھے شی کے نام کا علم بھی نہیں تھا، ہم اسے بس تنظیم کے نام سے جانتے تھے۔"

"نہ جانے تم کس بل بوتے پر اتنے پُرامید نظر آتے ہو، مجھے تو اب اپنی کامیابی کا ذرا بھی امکان نظر نہیں آتا۔" وہ مایوسانہ لہجے میں بولا۔ "تم مافیا کا سہارا لے کر شی کو تباہ کرنے کا خواب دیکھ رہے ہو لیکن یہ بھول رہے ہو کہ ایک بڑی طاقت اپنے پورے اختیار اور وسائل کے ساتھ اس کی پشت پناہ ہے۔"

"تم احمق ہو گئے ہو۔ مافیا مدت سے چلی آ رہی ہے۔ شی بھی نہ جانے کب تک چلتی رہے۔ میری دلچسپی صرف اتنی سی ہے کہ ہیروئن کی تجارت میں پاکستان کی سرزمین کو جس بے رحمی سے اکھاڑا بنا لیا گیا ہے اسے ختم کیا جائے۔ اس سے آگے کچھ سوچنا کسی دیوانے کا خواب تو ہو سکتا ہے، میرا نہیں۔"

"یہ نہ بھولو کہ اٹلی میں تم ہاتھ دھو کر جمی لائیڈ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ اگر میلان میں حالات اچانک ہی ہمارے خلاف رخ اختیار نہ کر لیتے تو تم اس کے پیچھے وینس جانے کا

...وہ کر چکے تھے۔" اس نے یاد دلایا۔

"اس وقت کی بات اور تھی۔ نہ مافیا والوں سے میری ملاقات ہوئی تھی اور نہ مجھے شی کی صحیح طاقت کا اندازہ ہوا تھا۔ وہ تو پاکستان آکر ہی میری آنکھیں کھلی ہیں اور پوری بات سمجھ میں آ رہی ہے ورنہ لائیڈز کاٹیج کے وجود سے تو میں پہلے ہی سے واقف تھا۔"

"جمی لائیڈ ایک فرد ہے اور شی ایک تنظیم۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر کسی طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر جمی لائیڈ کو ہلاک کر دیا جائے تو شی اپنی موت آپ مر جائے گی۔"

"پہلے میرا بھی یہی خیال تھا جو اب غلط ہوتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ اگر شی اس کی ذاتی تنظیم ہوتی اور وہ ایک فری لانس مجرم ہوتا تو اس کی موت سے شی کا شیرازہ بکھر جاتا۔ اب اگر وہ واقعی امریکی حکومت کی سرپرستی میں کام کر رہا ہے تو شی ایک ادارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جمی لائیڈ کے مرتے ہی اسی کے نام سے کسی اور کو شی کا نیا سربراہ مقرر کر دیا جائے گا۔ جمی لائیڈ کو کسی نے نہیں دیکھا اس لیے کوئی بھی چالاک آدمی مناسب بریفنگ کے بعد اس کی جگہ سنبھال سکتا ہے۔ دیکھا جائے تو اب ہمیں پوری حکمتِ عملی پر نظرِ ثانی کرنا پڑے گی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمیں واقعی اب بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہو گا۔" وہ اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ "اب صبح کے چار بج رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ چائے کی ایک پیالی پی کر اب مجھے چلنا چاہیے۔ صبح میں اپنے گھر سے فیکٹری جانا چاہتا ہوں تاکہ کوئی دشواری کھڑی نہ ہو۔"

"اوہ! باتوں میں تمھارے تعاقب کا معاملہ تو رہ ہی گیا۔ وہ کون تھا اور اس سے تم نے کس طرح پیچھا چھڑایا؟" میں نے اس کی روانگی کا ذکر آنے پر چونک کر سوال کیا۔

"وہ کوئی نیا چہرہ تھا۔ اس نے آج فیکٹری سے نکلتے ہی میرا پیچھا شروع کر دیا تھا اور مجھے گھر پہنچا کر خاموشی سے واپس لوٹ گیا۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ آج کل کے حالات کے پیشِ نظر وہ مشتبہ انداز میں میرے علاقے میں ٹھہرنا ہرگز پسند نہیں کرے گا۔"

وہ اپنے لیے چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف بڑھ گیا اور میرا ذہن ایک بار پھر سیما کی لاش کی طرف بھٹک گیا۔ مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اس کے قاتل نے مجھے فون نمبروں کے ذریعے بے نقاب کرانے کے لیے پولیس کو پہلی فرصت میں سیما کے قتل سے آگاہ کر دیا ہو گا۔ اس کے باوجود گھنٹے گزر گئے تھے لیکن پولیس کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اگر قتل کی اطلاع پر سست روی کا یہ عالم تھا تو دوسرے جرائم تو پولیس والوں کی کسی گنتی میں ہی نہیں آسکتے تھے جن کی ان دنوں شہر میں بہتات تھی۔

"جاز فارما سیوٹیکل میں کچھ وقت گزارنے کے بعد تم کس نتیجے پر پہنچے ہو؟" میں نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنے کی نیت سے کچن میں جاکر اس سے سوال کیا۔ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہائش اختیار کرنے کی وجہ سے ہمارے درمیان تبادلۂ خیال کے مواقع بہت کم رہ گئے تھے۔ بدقسمتی سے سلطان شاد سے فون پر رابطے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا اس لیے میں اس بے وقت ملاقات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہ رہا تھا۔

"سچ پوچھو تو میں نے وہاں رہ کر جھاڑ ہی جھونکا ہے۔" وہ خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "مجھے اصل معلومات تو یہاں آکر تم سے حاصل ہوئی ہیں۔ حیرت ہے کہ تم نے دیکھے بغیر کیپسولوں میں گڑبڑ کا اندازہ لگا لیا اور میں فیکٹری میں کام کرتے ہوئے بھی اس کا کوئی سراغ حاصل نہیں کرسکا۔"

"میں فیکٹری میں ہوتا تو شاید میرا اندازہ بھی تم سے مختلف نہ ہوتا۔" میں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "وہاں تم ان لوگوں کے ساتھ جذباتی طور پر ملوث تھے جو اس آسیبی مشین کو چلتے ہوئے دیکھتے رہے ہیں اس لیے حقیقت کی تہ تک نہیں پہنچ سکے جب کہ میں نے جذبات سے عاری لفظوں کے سہارے رائے قائم کی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہر صورتِ حال کے نتائج اور انجام کے بارے میں باہر رہنے والے صحیح اندازہ لگا لیتے ہیں۔"

"پھر اب کیا مشورہ ہے تمھارا؟" اس نے سارا بوجھ مجھ پر ہی ڈال دیا۔

"تم نے اب تک ہر چیز کو طائرانہ نظر سے دیکھا ہے اس لیے میرے دل میں یہ خواہش ابھری ہے کہ تم اپنی فیکٹری سے کسی طرح ہارمونیم کا ایک بھرا ہوا کیپسول چرا لاؤ۔ ہم پی سی ایس آئی آر کی تجربہ گاہ میں اس کا تجزیہ کرائیں گے پھر رپورٹ کی روشنی میں اپنا لائحۂ عمل طے کریں گے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم جاز فارما سیوٹیکل پر اچانک دھاوا بول کر اسے تہس نہس کر دیں۔ تیسری راہ میرے مقصد سے ہم آہنگ ہے۔ ہم انسدادِ منشیات کے اعلیٰ اہلکاروں سے مل کر فیکٹری پر ایک ایسے وقت پر چھاپا ڈلوا سکتے ہیں جب وہاں ساری ڈرامائی تیاریوں کے ساتھ اس آسیبی مشین پر ہیروئن کے کیپسول بھرے اور پیک کیے جا رہے ہوں۔ میرے لیے غزالہ کو دلدار آغا کی سیاہ کاریوں سے آگاہ کرنے کا یہ سنہرا موقع ہو سکتا ہے۔ ایک بار وہ خود اپنی زبان سے دلدار آغا سے اپنی نفرت کا اظہار کر دے تو پھر اسے دلدار کے چنگل سے

نکال کر پناہ فراہم کرنا میرا کام ہوگا۔ میں اس بارے میں صرف مشورے دے سکتا ہوں۔ تم اندر کے آدمی ہو۔ آخری فیصلہ تم ہی کو کرنا ہوگا کہ ہمیں ان تینوں میں سے کون سی راہ اختیار کرنا چاہیے۔ میں خلوصِ دل سے اس پر عمل کروں گا۔"

"تمھارا تجزیہ سو فیصد درست ہے۔" وہ اپنی بنائی ہوئی گرم گرم چائے کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے بولا۔ "میں نے آج تک ایسے کسی ہارمون کے بارے میں نہیں سُنا جو جلد کے لیے مہلک ہو لیکن جسم کے لیے سراپا طاقت بن جاتا ہو۔ ان لوگوں کے ساحرانہ طلسم میں گھر کر میں گمراہ ہو گیا تھا لیکن اب ہارمونیم کیپسول کے کسی تجزیے کے بغیر پورا یقین ہو گیا ہے کہ وہ ہیروئن کے کیپسول ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ غزالہ کو دلدار آغا کے گھناؤنے چہرے سے روشناس کرانے کے لیے تمھیں انسدادِ منشیات کے مقامی حکام سے رجوع کرنا چاہیے۔ جاز فارماسوٹیکل میں ایک بار رنگے ہاتھوں ہیروئن اور اس کے بھرے ہوئے کیپسول پکڑ لیے گئے تو دلدار آغا شہر کے طبقۂ اشراف کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ تم چاہو تو اس معاملے میں مافیا والوں سے بھی کام لے سکتے ہو۔"

"مافیا شی کی طرح نہیں ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ پیشہ ور مجرموں کی تنظیم ہے جو بڑی سختی سے خود ساختہ اخلاقیات کا پاس کرتی ہے۔ گو میں نے عیسائی عقیدے کے تحت جھوٹا حلف اٹھایا ہے لیکن اس میں ایک اہم ترین شق یہ ہے کہ اپنے ہم پیشہ لوگوں کے خلاف کسی بھی حالت میں اور کبھی بھی قانون یا اس کے محافظوں سے مدد نہیں لی جائے گی، خواہ شی کو اس احتراز کی کتنی ہی بھاری قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔"

"یعنی وہ تمھیں حکام سے رجوع کرنے کی اجازت نہیں دیں گے؟" اس نے سوال کیا۔

"اجازت طلب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب ہوگا کہ میں نے مافیا کے لیے اٹھائے ہوئے اپنے حلف سے بغاوت کی ہے۔ یہ کام تو مجھے نہایت راز دارانہ طور پر، انفرادی سطح پر کرنا ہوگا تاکہ مافیا والوں کو کانوں کان بھی میرے عزائم کی بھنک نہ مل سکے ورنہ سیٹھ حبیب مجھ سے بھڑک جائے گا۔"

"اپنا طریقۂ کار تم خود بہتر طور پر طے کر سکتے ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ ایف ون پرسوں چلائی جائے گی یعنی پرسوں فیکٹری میں اور مشین کے باؤل میں ہیروئن کی بھاری مقدار موجود ہونا چاہیے۔"

"یہ ایف ون کیا بلا ہے؟" میں نے اُلجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"ایف ون، فلنگ مشین نمبر ایک کا مخفف ہے۔ وہ مشین فیکٹری کی دوسری مشینوں کے بعد آئی ہے لیکن اسے ایف ون کا نام دیا گیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا لیکن کامیابی کا سارا دارومدار متعلقہ افسر کی مرضی پر منحصر ہوگا۔ فی الحال تو مجھے پولیس کی فکر ہے۔ نہ جانے سیما کی لاش کب تک اس کے فلیٹ پر پڑی سڑتی رہے گی۔ یہ بوجھ ذہن سے اترے تو میں آگے کچھ سوچنے کے قابل ہو سکوں گا۔"

"تھوڑی دیر میں صبح کا اجالا نمودار ہونے والا ہے۔ پولیس افسران اپنے گھروں پر رات گزارنے کے بعد ڈیوٹی پر واپس آئیں گے تو یہاں رونق شروع ہو جائے گی۔ تم نے اعصاب شکن انتظار میں اتنا وقت گزار لیا ہے تو تھوڑا سا انتظار اور کر لو۔ مجھے امید ہے کہ اس معاملے میں وہ تمھارے لیے مشکلات پیدا نہیں کر سکیں گے۔" وہ کچن میں کھڑے کھڑے اپنی چائے کی پیالی خالی کرتے ہوئے بولا۔

ساڑھے چار بجے سلطان شاہ مجھ سے رخصت ہو گیا۔ چلتے چلتے میں نے اسے تاکید کر دی تھی کہ موقع ملنے پر وہ مجھ سے کم از کم فون پر رابطہ برقرار رکھے تاکہ میں اسے اپنے اگلے پروگرام سے باخبر رکھ سکوں۔ میں نے یہ تو طے کر ہی لیا تھا کہ دلدار آغا کی فیکٹری کے لیے مجھے صوبائی محکمۂ ایکسائز کے کسی بڑے افسر سے مل کر وہاں چھاپا ڈلوانے کی پوری کوشش کرنا تھی۔

سلطان شاہ کے چلے جانے پر ایک مرتبہ پھر مجھے تنہائی اور پُرہول خیالات نے آگھیرا اور جوں جوں وقت گزرتا چلا گیا، چھوٹے چھوٹے امکانات نے پُرہول خطرات کا روپ اختیار کرنا شروع کر دیا جن کا تدارک اس سے بھی زیادہ مشکل نظر آ رہا تھا۔

میں نے شبِ خوابی کا لباس تبدیل کیا اور بستر پر دراز ہونے سے پہلے ایک مرتبہ خود مقامی پولیس تھانے سے رجوع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ٹیلی فون ڈائریکٹری سے تھانے کا نمبر تلاش کر کے ڈائل کیا تو دوسری طرف دیر تک گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے ریسیور اٹھانے کی زحمت نہیں کی جس پر میں نے تنگ آ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ دوبارہ نمبر ملایا تو دوسری طرف سے پہلی ہی گھنٹی کے بعد ریسیور پر ایک اکتائی ہوئی خوابناک ہیلو سنائی دی جس کا مطلب تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا، اس وقت صبح صادق کی گہری نیند سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پچھلی بار بجنے والی طویل گھنٹی نے اُسے نیند سے بیدار کر دیا تھا لیکن اس نے فون نہیں اُٹھایا۔ شاید اسے خوف رہا ہو گا کہ کہیں وہ کال کسی افسرِ بالا کی نہ ہو جو تاخیر سے کال اٹینڈ کیے جانے پر برہم ہو سکتا تھا لیکن لائن کاٹ کر جب میں نے دوبارہ نمبر ملایا تو اس نے پہلی ہی گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا۔

"کون بول رہا ہے؟" میں نے بھاری اور بارعب لہجے میں سوال کیا۔

"ہیڈ محرر۔ محمد علی!" وہ نیند کی جھونک میں مشینی انداز میں کہہ گیا لیکن فوراً ہی اس کی افسرانہ رگ پھڑک اٹھی۔ "تم کون بول رہے ہو؟"

"میں ایک واردات کی اطلاع دینا چاہ رہا تھا۔ کافی دیر سے فون کر رہا ہوں لیکن تھانے میں کوئی ریسیور اٹھانے والا بھی نہیں ہے۔" میں نے قدرے بدمزگی کے ساتھ ماؤتھ پیس میں کہا۔

"نمبر غلط ملا ہوگا۔" درشت لہجے میں جواب دیا گیا۔ "یہاں تو مجھے ساری رات فون کے سرہانے بیٹھے گزر گئی۔ ایک دفعہ بھی گھنٹی نہیں سُنائی دی۔ واردات کی خبر سے پہلے اپنا نام پتا لکھواؤ۔"

"میں تھانہ انچارج سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے تحمل کے ساتھ کہا۔

"وہ گشت پر گئے ہوئے ہیں۔ جو کچھ بتانا ہے مجھے بتا دو، انھیں خبر مل جائے گی۔" میری ایک عام شہری کی حیثیت کا اندازہ کر لینے کے بعد اس کا لہجہ بتدریج بگڑتا ہی جا رہا تھا۔

"تمھارے علاوہ تھانے میں کوئی اور موجود نہیں ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"تمھیں اپنی چھوکری کا رشتہ کرنا ہے یا رپورٹ لکھوانا ہے؟" وہ کسی کٹکھنے کُتے کی طرح غرایا تھا۔ "جو بتانا ہے مجھے بتاؤ یا فون بند کر دو۔ میں تمھارے باپ کا نوکر نہیں ہوں جو اتنے سویرے سویرے تمھاری فالتو جرح کا جواب دیتا رہوں۔ رات کو ہمارا سارا عملہ گشت پر نہ نکلے تو چور ڈاکو تمھاری ایسی کی تیسی کر کے رکھ دیں گے۔"

وہ واضح طور پر نیند سے اُٹھائے جانے پر جھلایا ہوا تھا اور شاید تھانے میں اکیلا ہی پھنسا ہوا تھا اس لیے میں نے اس سے اُلجھنے کے بجائے براہِ راست کام کی بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ "علاقے کے ایک فلیٹ میں کئی گھنٹے سے ایک عورت کی لاش تمھارے افسروں کی منتظر ہے...!"

"لاش پڑی ہے تو صبح تک گل نہیں جائے گی۔" وہ میری بات کاٹ کر بھڑکے ہوئے انداز میں بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم خود ہی اس واردات میں ملوث ہو۔ تم اس سے پہلے بھی کسی اور سے گمنام فون کرا چکے ہو۔ نام پتا بولو اپنا!" اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر میں اسے اپنا نام پتا بتا دیتا تو وہ ہلکی نیند خراب کرنے کے الزام میں اسی وقت مجھے پکڑوا کر حوالات میں بند کر دیتا اور شاید مجھے ایسا رگڑا لگواتا کہ میں آئندہ کبھی کسی تھانے سے رجوع کرنے کی ہمت نہ کرتا۔

"نام پتا بتا کر میں تمھارے چکروں میں پھنسنا نہیں چاہتا۔ میں نے تمھیں خبر دے دی ہے۔ اب اس پر اپنے تھانے دار سے کارروائی کرانا تمھارا کام ہے۔ تمھیں پہلی خبر ملے ہوئے تقریباً چار گھنٹے گزر چکے ہیں لیکن تم کسی مست سانڈ کی طرح تھانے میں پڑے سو رہے ہو۔ اب تک تو تم لوگوں کو قاتل کی راہ پر ہونا چاہیے تھا۔"

اس نے بھنا کر فون پر ایک موٹی سی گالی دی تھی پھر بولا۔ "گمنام خبروں پر ہم پاگلوں کی طرح دوڑ لگاتے رہیں تو بس ہم نے چلا لیا اس شہر کا کام... مجھے سبق نہ پڑھاؤ اور فون بند کر دو۔ ہم تمھارا نام پتا جانے بغیر اس خبر پر کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔ تمھارے باپ کے نوکر نہیں ہیں ہم۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ مجھے تمھارے ایس پی یا ڈی آئی جی کو نیند سے اُٹھانا پڑے گا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"جسے جی چاہے اُٹھا لو۔" غراہٹ سُنائی دی۔ "انھیں زیادہ تنخواہ ملتی ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ دوڑتے چلے آئیں۔ یہاں سے کوئی نہیں آئے گا...!"

اس کے خراب رویے کے پیشِ نظر میں نے نرمی سے اسے سمجھانا چاہا لیکن وہ کسی فرعون کی طرح اینٹھ کر اپنے افسرانِ بالا تک کے بارے میں بدکلامی پر اتر آیا۔ اس نے مجھ سے یہ تک پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ واردات کہاں ہوئی تھی اور غصے میں اپنی طرف سے ریسیور رکھ دیا۔

لائن بہ دستور ملی ہوئی تھی لیکن میں اپنی مزید کوئی بات اس بددماغ محرر تک نہیں پہنچا سکتا تھا اس لیے میں نے بھی ایک گہرا سانس لے کر فون بند کر دیا۔

سخت کوفت کے عالم میں میں روشنیاں گُل کر کے بستر پر دراز ہوا تو مجھے یہ امید تھی کہ اصل قاتل نے ضرور اس محرر کو جائے واردات سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ اس نے اپنی دانست میں میری کسی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن یہ غنیمت تھا کہ اس قتل کے بارے میں اسے پہلی فون کال یاد تھی اور اگر اس کے دل میں کوئی نیکی آ جاتی تو وہ قاتل کی فراہم کی ہوئی معلومات کے سہارے اپنے افسران کی رہنمائی کر سکتا تھا۔

میں قاتل کے عزائم سے آگاہ ہونے کے بعد سیما کے فلیٹ میں گھس کر فون کا سلسلہ منقطع کرنے کے لیے یوں بے چین ہو گیا تھا جیسے پولیس فوراً ہی وہاں دھاوا بولنے والی ہو لیکن وہاں کسی کے ٹس سے مس ہونے کے بھی آثار نہیں تھے۔ عوام کے ٹیکسوں پر پلنے والے امن و امان

کے ذمے دار ایک محکمے میں ایسی کالی بھیڑوں کی موجودگی شرمناک تھی۔ یہ محرر جیسے غیر ذمے دار اور نا اہل لوگ ہی تھے جن کی وجہ سے شہر میں ہر طرف قاتل، ڈاکو اور دہشت گرد آزادانہ دندناتے پھر رہے تھے۔ جس کا جہاں جی چاہتا، بے خوفی کے ساتھ واردات کر گزرتا تھا اور اسے کوئی روکنے یا پکڑنے والا نہیں تھا۔ شاید اسی وجہ سے ماحول شی اور مافیا جیسی خون آشام تنظیموں کے لیے سازگار ہوتا جا رہا تھا۔

میری وہ پوری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی تھی لیکن پھر بھی نیند کا کوسوں دور تک پتا نہیں تھا۔ میں بستر پر پڑا اپنے قانون کے محافظوں کی حالت زار پر کڑھ رہا تھا کہ اچانک عمارت کے سنگلاخ زینے کئی وزنی جوتوں کی دھمک سے گونجنے لگے۔ آنے والے آپس میں اونچی آوازوں میں باتیں بھی کر رہے تھے۔

بے اختیار میری نگاہ اپنی رسٹ واچ کے چمکتے ہوئے ڈائل پر چلی گئی جہاں سوئیاں صبح کے ساڑھے پانچ بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ رات کے گہرے سناٹے میں باہر سے آنے والی آوازیں میرے فلیٹ سے باہر راہداری میں مرکوز ہو گئی تھیں اور ساتھ ہی سیما کے فلیٹ کی گھنٹی بجنے کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔

چند منٹ بعد ہی میرے فلیٹ کی ڈور بیل بھی چیخ اٹھی اور میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ بستر چھوڑ دیا۔

میں نے دروازہ کھولا تو باہر تین باوردی پولیس والے موجود تھے جن میں سے ایک اپنے عہدے کے اعتبار سے سب انسپکٹر نظر آ رہا تھا بقیہ دو سپاہی تھے۔ ان کے پیچھے خوفزدہ چوکیدار کھڑا ہوا تھا۔

”اس گھر میں کون رہتا ہے؟“ سب انسپکٹر نے کسی تمہید یا تعارف کے بغیر اپنی چھڑی سے سیما کے فلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

”کوئی خاتون رہتی ہیں۔“ میں نے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے محتاط لہجے میں کہا۔ ”کیا آج پھر یہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟“

”تمہاری آنکھوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تم دیر سے جاگ رہے ہو یا پھر پوری رات ہی نہیں سوئے ہو۔“ سب انسپکٹر گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”یہ بتاؤ کہ تم نے اس عورت کے فلیٹ سے کوئی غیر معمولی آواز تو نہیں سنی تھی؟“

”نہیں!“ میں نے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”میں یہاں اکیلا رہتا ہوں اس لیے اس خاتون سے میرا تعارف نہیں ہے لیکن بات کیا ہے؟ کوئی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔“

”ہم ایک اطلاع پر یہاں آئے ہیں لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں مل رہا۔ کیا یہ خاتون راتوں کو گھر سے باہر رہنے کی بھی عادی ہے؟“ وہ گھما پھرا کر میرے بارے میں کوئی ابتدائی رائے قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں نے عرض کیا نا کہ میرا اس سے تعارف نہیں ہے۔ مجھے اس کی عادتوں کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بارے میں آپ کا اندازہ درست ہو۔“

اس دوران میں ایک سپاہی نے سیما کی ڈور بیل بجانے کے ساتھ ہی بے تابانہ انداز میں دروازے پر دستک بھی دینا شروع کر دی تھی لیکن اندر وہی لامتناہی سکوت چھایا ہوا تھا۔

”وہ عورت فلیٹ میں اکیلی رہتی ہے؟“ سب انسپکٹر نے مجھ سے اگلا سوال کیا۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ویسے میں نے اس فلیٹ سے صرف اسے ہی آتے جاتے دیکھا ہے۔“

”اکیلی عورت ہے صاحب! ہو سکتا ہے کہ نیند کی گولیاں کھا کر سوتی ہو۔“ ایک کانسٹیبل نے خوشامدانہ انداز میں سب انسپکٹر کو اپنی رائے پیش کی۔

”ہوں!“ انسپکٹر نے چھڑی کا سرا اپنی پیشانی پر رگڑتے ہوئے پُرخیال انداز میں ہنکارا بھرا اور پھر سہمے ہوئے چوکیدار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”تمہارے پاس اس فلیٹ کی دوسری چابی تو ضرور رہتی ہو گی۔“

”نہیں سرکار!“ وہ رو دینے والے انداز میں بولا۔ ”چابیاں صرف مالکوں کے پاس ہوتی ہیں۔“

”یہ عورت شروع سے اکیلی ہی رہتی ہے؟“ سب انسپکٹر پوری طرح چوکیدار کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”سیما بی بی اور اس کے میاں دونوں ہوائی جہازوں کی کمپنیوں میں نوکری کرتے ہیں۔ وہ بہت کم ایک ساتھ رہتے ہیں۔ ایک آتا ہے تو دوسرا باہر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو کئی دنوں تک دونوں ہی میاں بیوی غائب رہتے ہیں۔ پچھلے کئی ہفتوں سے سیما بی بی یہاں اکیلی رہ رہی ہیں۔“

”اس سے یہاں مرد بھی ملنے آتے ہوں گے؟“ سب انسپکٹر نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

”مالکوں سے تو کوئی بھی ملنے آ سکتا ہے۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ پھر شاید پولیس افسر کی تند نگاہوں کا سامنا کرتے ہی اس کی زبان کی لکنت دور ہو گئی۔ ”کئی مرد بھی آتے ہیں۔“

”کوئی جواب نہیں ملتا سر!“ ڈور بیل بجانے والے کانسٹیبل نے اعلان کیا۔ ”اجازت ہو تو دروازہ توڑ دیں۔“

”یہاں ہر منزل پر صرف دو فلیٹ ہیں؟“ سب انسپکٹر نے چوکیدار سے پہلا احمقانہ سوال کیا۔

”جی سرکار!“ وہ سعادت مندانہ انداز میں بولا۔ ”چار منزلہ

بلڈنگ میں کل آٹھ فلیٹ ہیں۔ یہ شہر کا سب سے پُرسکون اور صاف ستھرا علاقہ تھا۔ پتا نہیں اسے کس کی نظر لگ گئی۔ خون خرابے اور ڈکیتی کے بعد آج نہ جانے کیا ہوا ہے جو اتنی صبح آپ لوگوں کو یہاں آنا پڑا ہے!“

”اوپر والی منزل سے دونوں فلیٹوں کے مالکوں کو یہاں بلا لاؤ۔“ سب انسپکٹر نے چوکیدار کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے ایک ماتحت کو تحکمانہ لہجے میں ہدایت کی اور وہ تیزی کے ساتھ اوپر جانے والے زینوں پر چڑھتا چلا گیا۔

”اس فلیٹ کے بارے میں ہمیں ایک خبر ملی ہے۔“ چند ثانیوں کے توقف کے بعد سب انسپکٹر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہنا شروع کیا۔ ”اس خبر کی تصدیق یا تردید کے لیے ہمارا فلیٹ میں داخل ہونا ضروری ہے۔ اندر سے جواب نہیں مل رہا اس لیے اب شاید ہمیں زبردستی اندر گھسنا پڑے گا۔ تم اس کے پڑوسی ہو۔ دو گواہ اوپر سے آ جائیں گے۔ تم تینوں کی موجودگی میں ہم اندر جائیں گے۔ اگر کچھ نہ ملا تو دروازہ مرمت کرا دیں گے۔“

”تو کیا دروازہ توڑنا ہو گا؟“ میں نے سادگی سے سوال کیا۔

”اس کے علاوہ کوئی اور صورت ہو تو وہ تم بتا دو۔“ سب انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”میرا مطلب تھا کہ دروازہ توڑنے میں دھماکے ہوں گے۔ اگر بلڈنگ کے سارے مکینوں کو آگاہ کر دیا جائے تو مناسب ہو گا۔ ابھی لوٹ مار اور خونریزی کا قصہ تازہ ہے۔ سوتے ہوئے لوگ دھماکوں سے خوفزدہ ہو جائیں گے۔“ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھ لیں گے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تالا ہی کھل جائے، دروازہ نہ توڑنا پڑے۔“

”چاہیں تو میرا فلیٹ حاضر ہے۔ یہاں کب تک کھڑے رہیں گے؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پیشکش کی۔ خود کو کسی قسم کے شبے سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے اندر بلانا ناگزیر ہو گیا تھا ورنہ وہ سوچ سکتا تھا کہ میں اپنے گھر کو اس کی نگاہوں سے بچائے رکھنا چاہ رہا تھا۔

اس نے فوراً ہی میری پیشکش قبول کر لی۔ چوکیدار کو وہیں چھوڑ کر وہ کانسٹیبل کے ساتھ اندر آ گیا۔

تھوڑی دیر میں اوپر والے بھی وہاں آ گئے۔ نیند سے بیدار کیے جانے کی ساری علامات ان کے چہروں سے ظاہر ہو رہی تھیں لیکن پولیس والوں کو ایک مرتبہ پھر عمارت میں موجود پا کر ان کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔

سب انسپکٹر کا رویہ میرے ساتھ خشک اور سرد مہرانہ رہا تھا لیکن اوپر سے آنے والوں سے اس نے ہاتھ ملانے کے بعد انہیں اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ پھر دونوں سپاہیوں کو نیچی آواز میں کچھ ہدایات دے کر باہر بھیج دیا۔

بہ مشکل ڈیڑھ دو منٹ بعد ایک کانسٹیبل نے سیما کے فلیٹ کا تالا کھل جانے کی اطلاع دے کر مجھے ششدر کر دیا۔ پولیس کے محکمے میں نقب زنی میں مہارت حاصل کرنا شاید ان کی پیشہ ورانہ تربیت کا حصہ تھا تاکہ وہ کہیں بھی اپنے فن کو استعمال کر کے اپنی راہ میں حائل دشواریوں کو دور کر سکیں۔

انسپکٹر کی سربراہی میں وہ مختصر اور عجیب سا جلوس میرے فلیٹ سے برآمد ہوا۔ اوپر والے دونوں افراد بھی میری طرح شب خوابی کے لباس میں تھے اور ان سب لوگوں میں شاید صرف مجھ ہی کو صورتِ حال کی سنگینی کا ادراک تھا ورنہ سب انسپکٹر کا رویہ اس وقت بہت رسمی نظر آ رہا تھا جیسے اسے اطلاع غلط ثابت ہونے کا پورا یقین ہو۔

وہ دونوں کانسٹیبل ڈسپلن کے خاصے پابند معلوم ہوتے تھے کیونکہ انہوں نے اپنی کاوشوں سے سیما کے فلیٹ کا قفل ضرور کھول لیا تھا لیکن اپنے افسر کی اجازت کے بغیر دروازہ نہیں کھولا تھا۔

انسپکٹر کے لیے دروازہ کھولا گیا۔ اندر پورے فلیٹ کی روشنیاں اسی طرح آن تھیں جس طرح میں نے چھوڑی تھیں۔ مختصر سی لابی سے انسپکٹر پہلے اس تاریک کمرے کی طرف گیا جس کا ایک دروازہ بالکونی میں کھلتا تھا۔ شاید اس کی جبلت نے اسے روشن کمروں کو چھوڑ کر تاریک کمرے کا رُخ کرنے پر اکسایا تھا۔ اس نے اس کمرے میں روشنی کی اور پھر اس کی نگاہیں پورے کمرے کا جائزہ لیتی ہوئی کھڑکی کے کٹے ہوئے شیشے پر مرکوز ہو گئیں۔

”سر لاش!“ اچانک فلیٹ کی محدود فضا میں ایک کانسٹیبل کی سرسراتی ہوئی ہیجان آمیز آواز گونجی اور انسپکٹر پھرتی کے ساتھ پلٹ کر واپس دوڑ پڑا جیسے اس نے موقع پر پہنچنے میں ذرا بھی تاخیر کی تو لاش وہاں سے فرار ہو جائے گی۔

سیما کی لاش کی پتھرائی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں نے اسے بہت بھیانک بنا دیا تھا۔ لاش پر نگاہ پڑتے ہی چوکیدار کے حلق سے ایک خوفزدہ چیخ برآمد ہوئی اور وہ تیورا کر وہیں قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ اوپر سے آنے والوں کی حالت بھی ابتر ہو گئی تھی۔ ان کے چہروں پر دہشت سے ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

میرے لیے وہاں کوئی بھی چیز نئی نہیں تھی لیکن میرا دوسروں سے مختلف رویہ اس مرحلے پر میرے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا تھا اس لیے میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر جہاں تھا وہیں بیٹھتا چلا گیا۔

”او خدا! یہ کیا ہو رہا ہے۔“ میں کپکپاتی ہوئی آواز میں کراہا تھا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ بربادی اور موت نے اس بلڈنگ کے

مکینوں کو تاک لیا ہے؟ یہ بے چاری کیسے مر گئی؟"

"شاید ہارٹ اٹیک ہوا ہو گا بے چاری کو۔" اوپر سے آنے والا ایک شخص بڑبڑایا۔ "جس حالت میں تھی' اسی حالت میں پڑی رہ گئی۔ موت بھی کیسی ظالم شے ہے۔ ایک پل کا بھی بھروسا نہیں ہوتا...."

"ہارٹ اٹیک نہیں' یہ قتل ہے۔" سب انسپکٹر اس کی طرف مڑ کر ڈرامائی لہجے میں بولا۔ "اس کی پیشانی کو غور سے دیکھو۔ وہ گولی کا سوراخ ہے جس پر خون جم کر سیاہ ہو گیا ہے۔"

"ہائے۔" کہہ کر وہ شخص بھی اچانک قالین پر لمبا ہو گیا۔

"اس کمرے سے سب کو باہر نکالو۔" سب انسپکٹر نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "کوئی شخص کسی چیز کو نہ چھیڑے۔ برابر والے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ کٹا ہوا ہے۔ سارا سازوسامان بہ ظاہر جوں کا توں نظر آرہا ہے۔ یہ واردات بہت سنگین اور پیچیدہ معلوم ہوتی ہے۔" پھر اس نے مضبوطی سے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور میری روح فنا ہو گئی۔

"میں اس فون کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتا۔" انسپکٹر کہہ رہا تھا۔ "فون جس طرح لاش کے قریب بستر پر رکھا ہوا ہے اس سے اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ میں تمھارے فلیٹ سے تھانے فون کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کا مدعا سُن کر میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور پھر نقاہت زدہ انداز میں اپنے گھٹنوں کو تھام کر آہستہ آہستہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔

میں سب انسپکٹر کے ساتھ مقتولہ کی خواب گاہ سے باہر نکلا تو دونوں کانسٹیبل بے ہوش افراد کو بغلوں میں ہاتھ دے کر باہر گھسیٹ رہے تھے۔ اوپر والا واحد پڑوسی جو ہوش میں تھا' دور کھڑا خوف اور سکتے کے عالم میں مسلسل سیما کو گھورے جا رہا تھا اور سیما کی لاش! اللہ کی پناہ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بستر پر موت کی آغوش میں لیٹی دروازے سے آنے جانے والوں کو حیرت اور دہشت سے گھور رہی ہو۔ کئی گھنٹے گزر جانے کی وجہ سے اس کے چہرے سے زندگی کی ہر رونق معدوم ہو چکی تھی' دمکتے ہوئے گلابی رخساروں پر موت کی زردی نے ڈیرے ڈال دیے تھے اور پتھرائی ہوئی آنکھوں میں سے زندگی کی آخری رمق تک مفقود ہو چکی تھی۔

سب انسپکٹر نے میرے فلیٹ پر آکر عجلت میں اپنا مطلوبہ نمبر ملایا تھا اور پھر مؤدب لب و لہجے میں کسی کو اپنی اس وقت تک کی کارگزاری کی اطلاع دیتے ہوئے محکمانی کارروائیوں کے لیے متعلقہ عملے کو بھیجنے کے لیے کہا تھا۔ اسی وقت مجھے پتا چلا کہ اس کا نام محمود تھا اور وہ اپنے انچارج سے بات کر رہا تھا۔

"مشکوک آدمی سر!" سب انسپکٹر محمود نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ماؤتھ پیس میں وہ الفاظ ادا کیے تو خوف سے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ "ابھی تو کوئی نہیں' لاریب نے دروازہ کھولنے سے پہلے اس کے پڑوسی اور اوپر والے دو فلیٹوں کے مکینوں کو بلا لیا تھا۔ لاش دریافت ہونے کے بعد اب ذرا مقتولہ کے پڑوسی پر محنت کرنے کا ارادہ ہے۔"

وہ سنگین گفتگو میرے بارے میں تھی جسے میں نظر انداز نہ کر سکا۔ اس کے بعد بھی محمود فون پر اپنے افسر سے بات کرتا رہا جس کا ایک لفظ بھی میرے ذہن میں نہیں سما سکا۔ میرے دل و دماغ میں بس ایک بات سما گئی تھی کہ سیما کی لاش دریافت کر لینے کے بعد محمود مجھ پر کچھ "محنت" کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور میں پولیس والوں کی اس خفیہ لغت سے اتنا نا آشنا نہیں تھا کہ اپنے اوپر محنت کا ذکر سن کر میرے بدن پر پسینے کی دھاریاں نہ بہہ نکلتیں۔

گفتگو ختم کرنے کے بعد محمود نے دوستانہ لیکن نہایت جارحانہ انداز میں میرے شانے پر ہاتھ مارا تھا۔ "تم یہیں ٹھیرو۔ میں ہدایات دے کر واپس آتا ہوں۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ فلیٹ سے نکلتا چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے اُٹھا تھا۔ میرے اندازے کے عین مطابق اس نے باہر نکل کر میرے فلیٹ کا دروازہ بند نہیں کیا تھا جسے میں نے آہستگی سے بند کر دیا اور لپک کر فون کے پاس آگیا۔

مجھ پر محنت شروع کی جانے والی تھی جسے سہہ لینا میری اپنی قوتِ برداشت پر منحصر تھا لیکن اسے ٹالنا میرے بس سے باہر تھا۔ پولیس والوں کے مقابلے میں اس وقت میں ایک کمزور ترین حریف تھا جس کی کوئی بھی رگ دبائی جا سکتی تھی۔

میں نے اپنے اصل نام اور عرفیت کا استعمال ترک کیا ہوا تھا۔ بلڈنگ میں اجتماعی ڈکیتی کی نام نہاد واردات کے بعد میں نے پولیس کے ریکارڈ میں اپنا نام پیٹر واک ہی لکھوایا تھا جس کی سند کے لیے اٹالین پاسپورٹ میری تحویل میں تھا جسے میں نے یورپ میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا تھا۔ یورپ کی پولیس اور وہاں کے اہل کار اپنے سائنسی طور طریقوں کی بنا پر ہم سے بہت آگے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ تفتیش کے دیسی طریقوں میں ہماری پولیس کا مدِمقابل دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ میں پیٹر واک ہونے کے ثبوت میں اپنا پاسپورٹ پیش کر سکتا تھا لیکن اسے پھاڑ کر تلف کر دیا جاتا تو میں اپنی دادرسی کے لیے اطالوی قونصل سے بھی رجوع نہیں کر سکتا تھا۔ سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ میں اٹالین بن جانے کے باوجود اطالوی زبان سے ناواقف تھا اور مقامیوں کے لب و لہجے میں اردو بولتا تھا۔ اس بنا پر کوئی بھی دیسی حاکم بہ آسانی مجھ پر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔

پاکستانی شہری چکمہ چلا کر غیر ملکی حکام کو فریب دے سکتے تھے لیکن ملکی اہل کاروں کو اس فریب میں مبتلا کرنا دشوار تھا کیونکہ یہاں ایک حمام میں سب ہی ننگے تھے اور ایک دوسرے کے طریقۂ واردات سے بھرپور واقفیت رکھتے تھے۔

نام اور شہریت کے بعد سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ میرے اور مقتولہ کے فلیٹ کے درمیان صرف ایک دیوار کا فاصلہ تھا اور اس کے قتل کے بارے میں اگر کوئی کچھ جان سکتا تھا تو وہ میں ہی ہو سکتا تھا۔ تیسری خرابی یہ تھی کہ اس وقت بھی میرے فلیٹ میں سائلنسر لگے ہوئے پستول سے بیم گن تک کئی غیر قانونی مہلک ہتھیار موجود تھے اور اگر کسی بنا پر سب انسپکٹر محمود میرے فلیٹ کی تلاشی لینے پر تل جاتا تو میرے لیے اپنی گردن بچانا محال ہو جاتا۔

محمود مجھ پر محنت کرنا چاہ رہا تھا۔ اب مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ روایتی محنت کی بات کر رہا تھا یا پولیس والوں کی اصطلاحی محنت کا آغاز کرنا چاہ رہا تھا۔ اس وجہ سے میرے لیے بچاؤ کی پیشگی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہو گئی تھیں۔

ان دنوں پورے شہر میں میرے صرف دو ہمدرد رہ گئے تھے۔ ایک جہانگیر تھا جو بدمعاشیوں' غنڈہ گردیوں اور منشیات فروشی کے ذریعے بھاری سرمایہ کما کر ان دنوں شریف بن چکا تھا اور اپنی اس نام نہاد شرافت کی وجہ سے وہ کھل کر میری مدد نہیں کر سکتا تھا اور دوسرا مافیا کا بیورو چیف سیٹھ حبیب تھا جو پچھلی رات ہی حلف برداری کے بعد میرا باس بنا تھا۔ وہ شی والوں کے ساتھ میرے تصادم سے بھی واقف تھا اس لیے اس سے خاصی مدد کی امید کی جا سکتی تھی۔

کچھ پتا نہیں تھا کہ محمود کب لوٹ آتا اس لیے میں نے آناً فاناً میں یہ سب سوچ کر ٹریڈ لائن کا نمبر ملایا اور دوسری گھنٹی بجتے ہی میرے کانوں میں سینڈو کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آگئی۔

"میں شوٹر بول رہا ہوں سینڈو! چیف سے کہنا کہ میری خبر رکھے' شاید پولیس کو میرے پیچھے لگا دیا گیا ہے۔" میں نے کسی تمہید کے بغیر براہِ راست کہا۔

"پولیس!" سینڈو کی تحیر آمیز گھٹی گھٹی آواز سنائی دی اور اسی وقت کسی نے وحشیانہ انداز میں میرا دروازہ دھڑ دھڑا کر رکھ دیا۔ اس وقت وہ جسارت صرف سب انسپکٹر محمود ہی کر سکتا تھا اس لیے میں نے مزید کچھ کہے بغیر فون بند کیا اور دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔

باہر محمود کھڑا مجھے قہر بار نظروں سے گھور رہا تھا۔ "جب میں نے دروازہ کھلا چھوڑا تھا تو اسے بند کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ہوا سے بند ہو گیا ہو گا۔ میں نے بند نہیں کیا تھا۔" اپنی پشت پر محسوس ہونے والے ہوا کے ایک جھونکے سے مجھے جواب سوجھ گیا اور اسی وقت ایک سپاہی محمود کے پیچھے آکھڑا ہوا۔

"شاید تم پیٹر واک کہلاتے ہو اور تمھارے پاس اٹالین پاسپورٹ ہے؟" محمود نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"تمھاری اطلاع درست ہے۔" میں نے تھوک نگلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے ابھی ابھی تھانے سے یہی بتایا گیا ہے۔ میں تمھاری سفری اور شناختی دستاویزات دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے میرے ساتھ ہیر پھیر کی کوئی کوشش کی تو میں ذرا بھی رعایت نہیں کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بیلٹ ہولسٹر سے اپنا سروس آٹومیٹک نکال لیا اور مجھے پیچھے دھکیلتے ہوئے اپنے سپاہی کے ساتھ اندر آگیا۔

اس کے پستول کی نال میری طرف اُٹھی ہوئی تھی۔

مجھے ان لوگوں کی طرف سے خطرہ ضرور محسوس ہو رہا تھا لیکن میں اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ سیما کے قتل کی تفتیش کے لیے آنے والے میرے ساتھ اتنی جلدی جارحانہ رویہ اختیار کر لیں گے۔ سب انسپکٹر محمود نے جس طرح میرے اوپر پستول تانا تھا' اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اچانک ہی میرے بارے میں کوئی ایسا خیال آگیا تھا جو میرے حق میں کسی بھی طرح سود مند ثابت نہیں ہو سکتا تھا لیکن غنیمت یہ تھا کہ اس آویزش کے شروع ہونے سے پہلے ہی مجھے اتنی مہلت مل گئی تھی کہ میں نے اپنے فلیٹ سے مافیا والے سینڈو کو فون کر کے اپنے خدشات سے آگاہ کر دیا تھا۔

اس کے بدلے ہوئے تیوروں پر مجھے بجا طور پر حیرت ہوئی تھی لیکن اس کا سبب صرف اتنا تھا کہ اسے جو کچھ چند گھنٹوں بعد کرنا چاہیے تھا وہ فوری طور پر اس پر کاربند ہو گیا تھا۔ میرے دل کا چور اپنی جگہ موجود تھا۔ میں جانتا تھا کہ اپنی شناخت کے بارے میں اس کے شبہات کو دور کرنا میرے لیے زیادہ سہل نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اپنی اندرونی کیفیت کو پوشیدہ رکھتے ہوئے اس کے انداز پر اپنی حیرت کا اظہار برقرار رکھا اور اس کے پستول کی نال کو گھورتے ہوئے کسی سحر زدہ معمول کی طرح اُلٹے قدموں چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

محمود نے جارحانہ انداز میں میرے سامنے نشست سنبھال کر پستول ہولسٹر میں واپس اُڑسنے کے بجائے اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کے ساتھ آنے والا سپاہی ڈرائنگ روم کے دروازے پر رُک گیا۔

"میں سمجھ نہیں سکا کہ تمھیں میرے اوپر اسلحہ نکالنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" میں نے اس کے پستول کے بارے میں پہلی بار معصومانہ انداز میں اپنی زبان کھولی۔ "تم جو کچھ چاہتے ہو وہ میں تمھارے سامنے رکھ دوں گا۔ پاکستان میں کسی کا اطالوی نژاد ہونا ایسا سنگین جرم تو نہیں کہ اس سے اسلحے کے بل پر بات کی جائے؟"

”مجھے قانون پڑھانے کی کوشش مت کرو۔“ وہ تلخ لہجے میں غرایا۔ ”جو کہا جا رہا ہے وہ کرو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

”یہ سلوک تم مقامیوں کے ساتھ کر سکتے ہو۔ میرے بارے میں تمھیں اطالوی کاؤنسلیٹ کو جواب دہ ہونا پڑے گا۔“ میں نے متاسفانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر تم نے قانون کا ذکر چھیڑ ہی دیا ہے تو پھر مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے تمھیں میرے ملک کے سفارتی حکام کو اس کے جواز کے بارے میں مطمئن کرنا ہوگا۔“

جواب میں انسپکٹر محمود کے منہ سے بے ساختہ ایک غلیظ گالی آزاد ہوگئی۔ ”اگر اب مجھ سے کوئی بدتمیزی کی تو ٹھوکریں مار مار کر تمھارا چہرہ بگاڑ دوں گا۔ اپنے ہوش میں رہو! اس وقت تم اٹلی میں نہیں بلکہ پاکستان میں ہو۔ میں چاہوں تو ذرا سی دیر میں تمھیں اس فلیٹ سے ہمیشہ کے لیے اس طرح غائب کر دوں گا کہ پھر انٹرپول والے بھی تمھاری ہڈیوں کا سراغ نہیں لگا سکیں گے۔“

”تم مجھے دھمکیاں دے رہے ہو۔“ میں نے بات الجھانے کی نیت سے احتجاج کیا۔ ”پاکستان میں ہونے کا یہ مقصد نہیں کہ مجھے کسی بھی قانون کا کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے اور میں تمھارے رحم و کرم پر رہ گیا ہوں۔“

غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ اپنی مٹھیاں بھینچ کر چند ثانیوں تک مجھے گھورتا رہا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اسی وقت مجھے کچا چبا جاتا۔ میں تحیر آمیز انداز میں براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ دراصل اس وقت میں فوری طور پر اسے غصہ دلا کر اس کا ذہن ماؤف کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا تاکہ وہ اپنی ساری توجہ مجھ سے ذاتی انتقام لینے پر مرکوز کر کے خانہ تلاشی جیسے اہم کام کو بھول جائے کیونکہ فلیٹ میں اس وقت بھی ایسا اسلحہ موجود تھا جس کے بارے میں میں کوئی بھی معقول اور قابلِ قبول وضاحت پیش نہیں کر سکتا تھا۔ اگر سب انسپکٹر میرے فلیٹ سے وہ غیر قانونی اسلحہ برآمد کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو میرا معاملہ بری طرح الجھ سکتا تھا اور گلو خلاصی دشوار ہو جاتی۔

دوسری طرف میرے مقدر نے اس حد تک میرا ساتھ دیا تھا کہ پولیس کا سامنا کرنے کے بعد بھی میرا ذہن پوری طرح کام کرتا رہا تھا اور میں نے انسپکٹر کے عزائم کا اندازہ لگا کر مختصر سی مہلت کا فائدہ اٹھا لیا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میرا پیغام وصول کرتے ہی سینڈو نے اپنے کام کا آغاز کر دیا ہوگا۔ مافیا والے تو وہ لوگ تھے جو اپنے حریف مجرموں کو بھی پولیس کی گرفت سے بچانے کے مشن پر عمل پیرا رہتے تھے جب کہ میں تو ان کا قریبی حلیف بن چکا تھا۔

”میں نے کہا ہے کہ اپنے شناختی اور سفری کاغذات دکھاؤ!“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر دانت پیستے ہوئے بولا۔ اس وقت اگر میں اس سے محفوظ فاصلے پر اور غیر ملکی ہونے کا دعوےدار نہ ہوتا تو اس نے یقیناً اپنے دعوے کے مطابق مجھے اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا ہوتا اس لیے میں نے اس کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

میرے ڈرائنگ روم سے باہر نکلنے پر اس نے کوئی تعرض نہیں کیا البتہ سپاہی خاموشی سے میرے ساتھ ہو لیا۔ میں نے اپنی خواب گاہ میں ایک دراز سے سفری کاغذات کا لفافہ نکال لیا جو حسنِ اتفاق سے میں نے بیم گن اور پستول وغیرہ سے الگ ہی رکھا ہوا تھا۔ سپاہی نے وہ لفافہ دیکھ میرے ہاتھ سے لے لیا۔

”تم نے صاحب کو ناراض کر دیا ہے۔“ وہ دھیمی مگر ملامت آمیز آواز میں بولا۔ ”ولایت کا قانون ادھر نہیں چلتا۔ یہاں وہی بات ٹھیک مانی جاتی ہے جو افسر کہتا ہے اور پولیس افسر تو قانون کا بادشاہ ہوتا ہے۔ جسے چاہے سزا دے، جسے چاہے بری کرا دے۔ صاحب کا موڈ ٹھیک نہ ہوا تو وہ تمھیں اندر کرا دے گا۔“

”میں تمھارے صاحب کو ناراض کرنا نہیں چاہ رہا تھا وہ خود ہی بھڑک گئے۔ موقع مل گیا تو میں اب بھی معافی مانگنے سے نہیں جھجکوں گا۔“ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے مصالحانہ لہجے میں کہا۔

”تم سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ وہ ہولے سے میرے شانے پر تھپکی دے کر بزرگانہ انداز میں بولا۔ ”عقل مند آدمی وہی ہوتا ہے جو اپنی غلطی فوراً مان لے۔ دیکھو! میں بھی تمھاری مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔“ پھر اس نے رک کر اچانک رازدارانہ لہجے میں سوال کیا تھا۔ ”پینے پلانے کے لیے بھی کچھ ہے تمھارے پاس! صاحب وسکی کا شوقین ہے!“

”شاید تم اسی وقت مجھے حوالات میں دیکھنا چاہتے ہو۔“ میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”اس نے میرے پاس بوتل دیکھ لی تو حدود کا مقدمہ بنا دے گا۔ یہاں آنے سے پہلے لوگوں نے مجھے ڈرا دیا تھا کہ پاکستان میں شراب رکھنے، بیچنے، خریدنے یا پینے پر دُرّے مارے جاتے ہیں۔ کمال کی بات ہے کہ وہ پولیس افسر ہو کر بھی۔“

سپاہی ذو معنی انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”کاغذ پر بنا ہوا قانون کسی کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ آج تک کسی کو شراب پینے پر سزا نہیں ہوئی اسی علاقے میں ہزاروں لوگ شرابی ہوں گے۔ بات بس اتنی سی ہے کہ سرکار کے پاس ہماری تنخواہیں بڑھانے کے لیے مال نہیں تھا تو شاید انھوں نے ہمیں اس قانون کا تحفہ دے دیا۔ اس کی وجہ سے ہماری اوپر کی آمدنی بڑھ گئی ہے اور تم تو شاید مسلمان ہی نہیں ہو۔ تم پر حدود کا کیس بن ہی نہیں سکتا۔ ساتھ بیٹھ کر پینے پلانے سے ذرا تعلقات اچھے ہو جاتے ہیں۔ صاحب خوش ہو جائے گا اور تمھاری جان بچ جائے گی۔“

ڈرائنگ روم میں سپاہی مجھ سے ایک قدم آگے نکل گیا اور کاغذات کا لفافہ اپنے افسر کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ”یہ ملزم کہتا ہے کہ کاغذات نہیں سر! واردات میں اس کا ہاتھ ہو یا نہ ہو

ذی شریف معلوم ہوتا ہے۔ آپ اس کی خطا درگزر کریں تو معافی مانگنی چاہتا ہے۔ آپ کے اختیارات سے واقف ہوتے ہی اس کے دماغ سے اٹلی کا بخار اتر گیا ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ زیادہ اکڑ فوں کی تو اس کے فلیٹ سے اسی وقت ساٹھ گرام ہیروئن برآمد کر کے حوالات میں ڈال دیا جائے گا اور پھر اس کی ضمانت بھی نہیں ہو سکے گی۔“

”اللہ داد!“ انسپکٹر کی آواز میں نشتر کی سی چبھن پیدا ہو گئی تھی۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ ملزم نے تجھے اندر لے جا کر تیری مٹھی گرم کر دی ہے جب ہی اس کی سفارش کر رہا ہے۔“

”نہیں صاحب!“ سپاہی اللہ داد اپنے دونوں کان پکڑ کر خوشامدانہ لہجے میں گڑگڑایا۔ ”افسرانِ بالا کی مرضی اور اجازت کے بغیر میں ایسے لین دین کو حرام سمجھتا ہوں۔ آپ بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ شریف آدمی ہے۔ مجھے تو ویسے ہی اس پر ترس آ گیا تھا۔ نادانی میں یا اپنی کم فہمی کی بنا پر حلال و حرام کے بارے میں ایک ہی بات کہہ گیا تھا جس پر اس کے افسر کی پیشانی پر کوئی بل نہیں آیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے ماتحت کے بیان کیے ہوئے فلسفے سے پوری طرح متفق تھا۔ اللہ داد کی بات پوری ہوتے ہی خود کی استفسار طلب نگاہیں میری طرف اٹھیں تو میں فوراً بول پڑا۔

”میں نے اس بے چارے کو کچھ نہیں دیا۔“ میں نے مصلحت کی بنا پر خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ”میرا تم سے الجھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ دراصل یہاں کا طریقۂ کار میرے لیے نیا ہے جس کی وجہ سے میں گستاخی کر بیٹھا۔ اٹلی میں بھی کم جرائم نہیں ہوتے لیکن وہاں پولیس وارنٹ کے بغیر کسی شہری کے مکان میں داخل ہونے کا حق نہیں رکھتی۔ اسی طرح کسی بھی تفتیش میں شامل کیے جانے والے مشتبہ شخص یا ممکنہ گواہوں کو یہ قانونی حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے وکیل سے مشورہ کیے بغیر پولیس کے کسی بھی سوال کا جواب دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کر سکیں۔“

”تو آ گئی تمھاری کھوپڑی اپنے ٹھکانے پر!“ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ”قانون کچھ نہیں ہوتا۔ موٹی موٹی کتابوں میں لکھا ہوا قانون بے جان، بے بس اور اندھا ہوتا ہے۔ ہم جیسے افسر اسے زندگی دیتے ہیں اور ہم سے ٹکرانے والا پاتال میں بھی سکھ سے نہیں رہ سکتا۔ اس بند کمرے میں کیا ہو رہا ہے؟ کسی کو نہیں معلوم۔ تھوڑی دیر میں تمھارے پڑوس میں ایک جوان اور خوبصورت عورت کی لاش کی موجودگی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح دور دور تک پھیل جائے گی۔ وہ اکیلی رہتی تھی اور تم بھی اکیلے ہو۔ اگر میں ابھی تمھیں پکڑ کر لے جاؤں تو ہمارے کچھ کہے بغیر بیچ کی باتیں اخبار والے اور لوگ خود ہی تیار کر لیں گے اور عدالت میری کہی ہوئی ہر بات پر غور کرنے پر مجبور ہو گی۔“ بتدریج اس کا لہجہ تکبر آمیز ہو گیا تھا۔

”میں اپنے رویے پر ایک بار پھر کھلے دل سے معافی چاہتا ہوں۔“ میں سراپا انکسار بننے پر مجبور ہو گیا تھا۔

”بیٹھ جاؤ!“ اس نے پہلو بدلتے ہوئے اللہ داد کا دیا ہوا لفافہ کھول کر دیکھے بغیر تپائی پر ڈال دیا۔

اپنی جگہ سنبھالتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اس دوران میں اللہ داد موقع پا کر وہاں سے کھسک چکا تھا۔ شاید اس نے اپنے افسر کو تخلیے میں معاملات طے کرنے کی آزادی فراہم کی تھی۔

”لاش دیکھنے کے بعد سے میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ اجازت ہو تو ہونٹ تر کر لوں؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”پانی پیو گے؟“ اس نے ترچھی نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”ویسے الکحل بھی پڑی ہو گی۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ڈیلکس اسکاچ ہے۔“

”لعنت ہے!“ وہ بڑبڑایا۔ ”میری تو ساری صبح غارت ہو گئی۔ تھوڑی دیر میں کوئی نہ کوئی بڑا افسر بھی جائے واردات کا معائنہ کرنے آ جائے گا۔ میرے لیے جلدی سے ایک ڈبل گلاس بنا لاؤ۔ برف کے بجائے تھوڑا سا ٹھنڈا پانی ڈال دینا۔“

میرے لیے وہ جمود ٹوٹنے کا پہلا اشارہ تھا۔ اس لیے میں سعادت مندی کے ساتھ فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر چل دیا۔

ہم دونوں برابری کے ماحول میں نہیں تھے۔ قانون کی پرورش اور پرداخت کے بھرپور احساس نے اس کے حواس کو پہلے ہی سے مخمور کیا ہوا تھا اس لیے اس وقت ٹوسٹ تجویز کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے گلاس لیتے ہی چھلکتے ہوئے کندن کا ایک بڑا سا گھونٹ منہ بناتے ہوئے اپنے معدے میں اتار لیا۔

میرا گلاس ہلکا تھا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی اور اس کے مقابل اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ میں نے خاص طور پر نوٹ کیا تھا کہ اللہ داد کا دیا ہوا لفافہ جوں کا توں تپائی پر پڑا ہوا تھا۔ اس سب انسپکٹر نے میری غیر حاضری میں بھی میری فراہم کی ہوئی دستاویزات کا جائزہ لینے کی زحمت نہیں کی تھی۔

”تم اٹلی سے یہاں کیوں آئے ہو؟“ اس نے میرے بڑھائے ہوئے پیکٹ سے ایک سگریٹ کھینچ کر سوال کیا۔

”سیاحت کے لیے!“ میں نے اس کے ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ کو لائٹر سے شعلہ دکھاتے ہوئے اختصار کے ساتھ جواب دیا۔ ”چند دن بعد لوٹ جاؤں گا۔“

”سیاحت کے لیے یہاں کیا رکھا ہے؟ دیکھنے والی اصل جگہیں تو افغان سرحد پر اور پہاڑی وادیوں میں ہیں۔ باہر سے آنے والے عام طور پر سیدھے اسی طرف جاتے ہیں۔“

”سرحد پار سے داغے جانے والے میزائل آج کل کثرت سے تمھاری سرحدی آبادیوں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ اس لیے اس

طرف جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ شاید بعد میں کبھی اُدھر کی سیر کا موقع بھی مل جائے۔"

"تم نے کہا تھا کہ تم اٹالین ہو؟" اس نے دوسرا نسبتاً چھوٹا گھونٹ لے کر سوال کیا۔

"میری شناختی اور سفری دستاویزات اس لفافے میں موجود ہیں، تم خود دیکھ سکتے ہو۔"

"پیسہ جیب میں ہو تو ہر قسم کی دستاویزات کھڑے کھڑے مل جاتی ہیں۔" اس ظالم نے بے پروایانہ لہجے میں وہی بات کہہ ڈالی جو میرے دل میں کھٹک رہی تھی۔ "مجھ سے سیدھی سیدھی بات کرو۔ اٹلی کا کوئی باشندہ ساری عمر سر کے بل کھڑا ہو کر کوشش کرے تب بھی تمھاری جیسی صاف اور رواں اُردو نہیں بول سکتا۔" اس نے تیسرا گھونٹ لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "یہاں سے بہت سے اشتہاری مجرم دے دلا کر باہر فرار ہو جاتے ہیں اور وہاں سیاسی پناہ لے کر دس بارہ سال بعد نئے نام اور نئی قومیت کے ساتھ یہاں واپس آجاتے ہیں۔ مجھے تو تمھارے نام کی اصلیت پر بھی شبہ ہے۔ یہ بتاؤ کہ یہاں سے کب اور کس جرم میں ملوث ہونے کے بعد فرار ہوئے تھے؟"

اس کی گفتگو کا ایک ایک لفظ بالکل واضح تھا۔ دونوں کا خمیر ایک ہی مٹی سے اُٹھا تھا اس لیے دونوں ایک دوسرے کو خوب سمجھ رہے تھے۔ میں نے اپنی شناخت بدلنے کے سارے جتن تو کر لیے تھے لیکن زبان اور لب و لہجے کے معاملے میں خطرناک چُوک کر بیٹھا تھا اور محمود نے اسی ذرا سی بات کو پکڑ کر میرے لیے جال کا پہلا پھندا تیار کر لیا تھا۔

"میں تمھاری بات نہیں سمجھ سکا۔" میں نے حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ "اُردو اتنی مشکل زبان نہیں ہے کہ کوئی غیر ملکی اسے اہلِ زبان کی طرح نہ بول سکے۔ میرے بزرگ اسی علاقے سے ہجرت کر کے پہلی جنگِ عظیم کے بعد یورپ گئے تھے اور پھر وہیں کے ہو رہے، مگر میرے دل میں ماضی کے کٹے ہوئے رشتوں کا احساس باقی تھا اس لیے میں نے لندن میں اُردو کی تعلیم حاصل کی اور اب موقع ملتے ہی یہاں آگیا لیکن یہاں سب کچھ اجنبی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ تم بھی مجھ پر شبہ کر رہے ہو۔ تم مفرور مجرموں کا دس بیس سال کا ریکارڈ دیکھ سکتے ہو۔ اس میں کہیں بھی میرے نام کا شائبہ تک مل جائے تو بلا تردد تم اپنے ہاتھوں سے مجھے گولی مار دینا۔ آخر مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں اس بیچاری کو ہلاک کرتا۔"

"تم دو مختلف باتوں کو ملا رہے ہو۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مکارانہ لہجے میں بولا۔ "مجھے اندازہ ہے کہ اپنی پڑوسن کے قتل میں تمھارا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ رات کو نامعلوم قاتل نے دو بار تھانے کے محرر کو فون پر اس قتل کی اطلاع دی تھی۔ کوئی بھی قاتل اس قدر احمق یا سادہ لوح نہیں ہو سکتا کہ پولیس کو جائے واردات پر آنے کی دعوت دے کر خود گرفتاری کے انتظار میں وہیں بیٹھا رہے۔ یہ کام باہر کے کسی آدمی کا ہے۔ وہ بھی زیادہ دیر تک ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکے گا۔ ہم بہت جلد اس کا سراغ لگالیں گے۔"

"پھر تم مجھ پر کس بات کا شبہ کر رہے ہو؟" میں نے بے صبری سے سوال کیا۔

اس نے ایک لمبا گھونٹ لے کر اپنا گلاس خالی کر دیا اور زہریلی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "اگر تم نے اُردو بہت شوق سے سیکھی ہے تو تم نے وہ محاورہ بھی پڑھا ہوگا کہ موسیٰ پہاڑ سے آگ لینے گئے تھے لیکن پیغمبری لے کر واپس لوٹے تھے۔ مجھے اپنے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا نظر آرہا ہے۔"

"میری نظر سے ایسا کوئی محاورہ نہیں گزرا۔ کھل کر بتاؤ کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" اس کے انکشاف پر میرے اعصاب تک چٹخنا شروع ہو گئے تھے۔

"میں اس وقت یہاں ایک قتل کی خبر کی تصدیق کے لیے آیا ہوں لیکن میرا اندازہ ہے کہ میں نے تمھاری صورت میں ایک نیا اور زیادہ اہم کیس دریافت کر لیا ہے۔ تم یقیناً وہ نہیں ہو جو خود کو ظاہر کر رہے ہو۔ تم لاکھ چھپاؤ لیکن میں اگلے ایک دو روز میں اپنی تحقیقات کے نتائج سے تم کو حیران کر دوں گا۔"

"اور ان دو روز تک میرا کیا ہوگا؟" میں نے اپنے وجود کی گہرائیوں میں اُٹھنے والی خوف کی لہروں پر قابو پاتے ہوئے تشویش آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"تم غیر ملکی ہو۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنزیہ ہنسی کے ساتھ بولا۔ "میں نے تمھارے ساتھ شراب پی لی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے سپاہی نے تمھاری سفارش کی ہے۔ اس لیے میں فی الحال تمھیں پوچھ گچھ کے لیے اپنے ساتھ تھانے نہیں لے جاؤں گا اور اپنے طور پر تمھارے بارے میں تفتیش کروں گا۔ اس دوران میں تم میری اجازت کے بغیر یہ فلیٹ نہیں چھوڑو گے۔ اگر تم نے ایسی کوئی کوشش کی تو سادہ لباس میں تمھاری نگرانی پر مامور میرے آدمی کسی بھی ایسے الزام میں تمھیں فوراً گرفتار کر لیں گے کہ تمھاری ضمانت بھی نہیں ہو سکے گی۔" اس نے اپنا پستول ہولسٹر میں ڈال لیا۔

"یہ زیادتی ہے۔" میں نے پھریری لے کر کہا پھر فوراً ہی سنبھالا لے کر بولا۔ "لیکن میں اس رعایت کا شکر گزار ہوں کہ تم مجھے شُبہے میں فوراً گرفتار نہیں کر رہے ہو۔ یہ بھی تمھارا احسان ہے کہ تم نے اپنے شُبہے کی نوعیت ظاہر کر کے میرے لیے یہ تسلی دی ہے کہ میں کم از کم قتل جیسے سنگین اور بھیانک جرم میں ملوث نہیں سمجھا جا رہا ہوں۔"

"نہیں، میں نے یہ تسلی نہیں کرائی۔۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اللہ داد اچانک اندر آگیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" محمود مجھے نظر انداز کر کے فوراً اپنے سپاہی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تھانے سے انچارج صاحب کا ڈرائیور آیا ہے۔" سپاہی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"اسے روکو، میں آتا ہوں۔" وہ سپاہی کو ہدایت دیتے ہوئے، تپائی پر سے میری سفری دستاویزات کا لفافہ لے کر کھڑا ہو گیا۔ سپاہی اس سے ہدایت ملتے ہی واپس لوٹ گیا۔

"تم کیا کہہ رہے تھے؟" اسے روانگی پر آمادہ پا کر میں نے اضطراری لہجے میں اسے اس کی ادھوری بات یاد دلاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"میں کہہ رہا تھا کہ یہ تو ائیر ہوسٹس کے قتل کا معاملہ ہے، بظاہر تم اس سے الگ نظر آتے ہو لیکن ہو سکتا ہے کہ میں اپنی محنت کے نتیجے میں یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں کہ آج سے کچھ عرصے پہلے پاکستان سے فرار ہونے تک تم قتل اور ڈکیتی وغیرہ کی متعدد وارداتوں کا ارتکاب کر چکے تھے۔"

وہ بہت تیز و طرار آدمی تھا اور اپنے کارڈ قرینے سے کھیلنے کا عادی نظر آتا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اپنی بدلتی ہوئی گفتگو سے مجھے دہلائے دے رہا تھا اور یہ ظاہر ہونے لگا تھا کہ مجھے متوقع خطرات کا احساس دلا کر وہ میری زبان سے کوئی پیش کش سننے کا منتظر تھا جب کہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس سے مصالحت کا عندیہ ظاہر کر کے میں اس کے ظاہر کیے ہوئے شبہات پر پوری طرح مہرِ تصدیق ثبت کر دیتا جس کے بعد کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا منہ کھولتا اور کس انداز میں مجھ سے بھرپور سودے بازی کرنے کی کوشش کرتا۔

"تمھاری باتیں کسی بھی شریف آدمی کا خون خشک کر دینے کے لیے کافی ہیں۔" میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"ابھی یہ صرف باتیں ہیں۔ ان امکانات پر میں نے تھوڑا سا کام بھی کر لیا تو یہ سب الزامات بلکہ جرائم بن جائیں گے۔" اس نے سگریٹ کا ٹوٹا ایش ٹرے میں رگڑتے ہوئے کہا۔

"تم چاہو تو میں اپنا پروگرام مختصر کر کے کل ہی پاکستان چھوڑ سکتا ہوں۔ میں یہاں کسی بڑی الجھن میں نہیں پڑنا چاہتا۔ کوئی بھی سکینڈل مجھے برباد کر دے گا۔"

"فی الحال تو تم روانگی کا ارادہ ملتوی ہی رکھو کیونکہ تمھاری سفری دستاویزات میں غیر سرکاری طور پر اپنی تحویل میں لے رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اگلے چوبیس گھنٹوں تک میں ائیر ہوسٹس کے قتل کی کارروائیوں میں مصروف رہوں، اس لیے اس مدت کو سوچنے سمجھنے کے لیے استعمال کر سکتے ہو۔ اس دوران میں تمھاری طرف سے کوئی پیغام نہ ملا تو میں اپنا کام شروع کر دوں گا اور پھر وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔" اس کی گفتگو واضح طور پر دھمکی آمیز تھی لیکن بات وہی تھی کہ وہ کوئی مطالبہ پیش کرنے کے بجائے پیشکش سننے کا منتظر تھا۔

"میں کچھ نہیں سوچ سکوں گا۔ تم خود کھل کر بات کیوں نہیں کرتے؟"

"تم ننھے سے بچے نہیں ہو۔ میں اس سے زیادہ کھل کر کیا بات کروں گا؟ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ ایس ایچ او کا ڈرائیور میرے لیے کوئی اہم پیغام لایا ہوگا۔"

"ذرا ایک منٹ ٹھہرو۔" میں نے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ "دو دن تک یہ معاملہ صرف تمھاری ذات تک محدود رہے گا نا؟" میں نے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا۔

"صرف چوبیس گھنٹے تک!" اس کے ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "کل صبح جب میں کام شروع کروں گا تو مجھے اپنے محکمے سے مدد لینا پڑے گی اور یہ معاملہ میری ذات تک محدود نہیں رہے گا۔"

"اس وقت کی کارروائی میں تو میرا نام نہیں آئے گا؟" میں نے اگلا سوال کیا۔

"وہ تو ضروری ہے۔ تمھاری موجودگی میں ہم نے دروازہ کھولا ہے اور تم اس کے واحد پڑوسی ہو۔"

"اوپر سے دو افراد آئے تھے، چوکیدار بھی تھا۔" میں نے ایک موہوم سی امید پر لجلجا کر کہا۔ "میری درخواست ہے کہ مجھے اس قتل کے معاملے سے باہر ہی رکھو۔ اگلے چوبیس گھنٹے گزرنے سے قبل کوئی نہ کوئی ایسی راہ نکل آئے گی کہ ہمارے درمیان سمجھوتا ہو جائے گا۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔ "چلو، یہ بھی ہو جائے گا لیکن یہ یاد رکھنا کہ اب تم مجھ سے اجازت لینے تک اپنے اس فلیٹ میں محصور رہو گے۔"

"تم بے فکر رہو، تم سے رابطہ کیسے ہوگا؟" میں نے اپنے وجود میں اطمینان کی لہر محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"پولیس اسٹیشن فون کر لینا۔ میں موجود نہ ہوا تو تمھارا پیغام ملنے پر خود آجاؤں گا۔" میری ہی طرح وہ بھی خود کو فتح مند سمجھ کر مطمئن نظر آنے لگا تھا۔

"میرا نام ڈکیتی کی واردات کے گواہوں کے ساتھ تمھارے ریکارڈ پر آچکا ہے اس لیے میں اپنا نام ڈیسمنڈ بتاؤں گا۔" اس کی نیت ظاہر ہو جانے کے بعد میں آہستہ آہستہ اس سے برابری کی سطح کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ سر ہلاتا ہوا تیزی کے ساتھ میرے فلیٹ سے نکلتا چلا گیا اور میں دروازہ بند کر کے بے جان انداز میں ایک کرسی پر گر

گیا۔ اس صورتِ حال نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ نہ مجھے پہچان سکا تھا اور نہ ہی اس نے میرے ساتھ کوئی بدسلوکی کی تھی لیکن اس نے اپنے تجربے کی بنیاد پر اپنے جن قیاسات کا اظہار کیا تھا، وہ میرے حق میں مہلک ثابت ہو سکتے تھے۔ میرے پاس رقم کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن وقتی طور پر محمود کی زبان بند رکھنے کے لیے اگر میں اس وقت اس سے کوئی سودا کرنے کی کوشش کرتا تو اسے اپنے الزامات کی صداقت کا پورا یقین ہو جاتا اور وہ بعد میں بھی مجھ سے من ملنے طور پر بڑی رقموں کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ اس کی طرف سے مستقل بلیک میلنگ سے بچنے کی ایک ہی صورت نظر آتی تھی کہ فوری طور پر کوئی سودے بازی ہو جانے کے بعد میں دوبارہ ملک ہی چھوڑ دیتا لیکن وہ میرے مسئلے کا کوئی پائیدار حل نہیں تھا کیونکہ اس وقت میرا محاذ کراچی تک محدود ہو چکا تھا اور میں وہیں رہتے ہوئے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کر سکتا تھا۔

اس نے مجھے کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے بہت کم وقت دیا تھا اور مجھے اپنے فلیٹ میں محصور کر دیا تھا اس لیے میں اپنی نجات کے لیے عملاً کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شی والوں سے میری ٹھنی ہوئی تھی۔ جہانگیر عزت دار بن جانے کے باعث پولیس کے مقابلے میں کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نہیں کر سکتا تھا اس لیے میری امید صرف سیٹھ حبیب جیوانی سے وابستہ رہ گئی تھی۔ وہ میرا نیا چیف تھا اور اپنے رسوخ سے کوئی نئی راہ نکال سکتا تھا۔

اضطراری طور پر میں ایک بار پھر فلیٹ سے نکل آیا تاکہ پڑوس میں ہونے والی پولیس کارروائی کا مشاہدہ کر سکوں۔ ویسے بھی سیما کے قتل کے بعد میرا اپنے فلیٹ میں بند ہو کر بیٹھ جانا مجھے دوسروں کی نظروں میں مشکوک بنا سکتا تھا۔

اس وقت تک وہاں پولیس کا مزید عملہ نہیں پہنچا تھا۔ محمود نے میرے فلیٹ سے نکل کر سیما کے ہی فلیٹ میں اپنا دفتر قائم کر لیا تھا اور سپاہی اللہ داد کے ہمراہ اندر چوکیدار کا بیان قلم بند کر رہا تھا۔ اوپر سے بلائے جانے والے دونوں گواہ تشویش اور بدحواسی کے عالم میں اپنی باری کے منتظر تھے۔ دوسرے سپاہی نے فلیٹ سے نکاسی کے کھلے ہوئے دروازے پر چوکیداری کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی اوپر والوں نے صورتِ حال کے بارے میں اپنے تبصرے شروع کر دیے اور میری پوزیشن کے بارے میں جاننا چاہا۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرا بیان لیا جا چکا ہے۔ وہ دونوں اپنے خوف و ہراس کے باعث میری ذات کا سہارا لینا چاہ رہے تھے لیکن میں نے وہاں اپنی موجودگی غیر ضروری سمجھتے ہوئے اپنی جان چھڑا لی۔

اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کر کے میں نے کچن سے کئی خالی شاپنگ بیگ جمع کیے اور پھر وارڈ روب میں مختلف جگہوں سے بیم گن، پستول، فاضل میگزین اور سائلنسر نکال کر پلاسٹک کے ان تھیلوں میں اس طرح لپیٹے کہ پانی ان پر اثر انداز نہ ہو سکے اور وہ تھیلے ایک باتھ روم میں فلشنگ ٹینک کا ڈھکن اٹھا کر اس میں ڈال دیے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ ہتھیار وہاں بھی محفوظ نہیں تھے اور اگر سب انسپکٹر یا اس کا کوئی افسر میرے فلیٹ کی تلاشی لینے کا فیصلہ کر ہی لیتا تو وہ ٹنکی بھی ان لوگوں کی نظروں سے محفوظ نہیں رہتی۔ میری یہ حرکت اسی طرح اضطراری تھی کہ جس طرح ریت کا طوفان آنے پر شتر مرغ اپنا سر ریت میں دفن کر کے خود کو محفوظ تصور کر لیتا ہے۔

ساڑھے سات بجے میں نے بہت سوچ سمجھ کر جہانگیر کو فون کیا۔ وہ سحر خیزی کا عادی تھا لیکن پچھلی رات وہ دونوں میاں بیوی جتنی دیر سے واپس گئے تھے اس کی وجہ سے مجھے امید نہیں تھی کہ وہ جاگ گیا ہو گا مگر میری کال اسی نے پہلی گھنٹی پر ریسیو کی اور اتنے سویرے میری آواز سن کر حیران رہ گیا۔

"دفتر جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس ہوتے جانا۔" مزاج پرسی کے بعد میں نے کہا۔

"خیریت تو ہے؟ آواز سے تم کچھ پریشان معلوم ہو رہے ہو!" اس نے سوال کیا۔

"خیریت نہیں ہے، آؤ گے تو بتاؤں گا۔ پچھلی رات تمھارے چلے جانے کے بعد کسی نے سیما کو اس کے فلیٹ میں قتل کر دیا۔ اس وقت وہاں پولیس آئی ہوئی ہے۔"

وہ خبر جہانگیر کے لیے دھماکا خیز ثابت ہوئی تھی۔ اس نے فوراً ہی گھر سے نکلنے کا وعدہ کر کے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے کریڈل دبا کر ٹریڈ لائن کا نمبر ملایا تو اُدھر سے ذرا تاخیر سے ریسیور اٹھایا گیا۔

"میں نے اُسی وقت چیف کو تمھارا پیغام پہنچا دیا تھا۔" اس طرف سے سینڈرو نے میری آواز پہچان کر کہا۔ "اس معاملے کو وہ خود دیکھ رہا ہے۔ تم چاہو تو اس نمبر پر اس سے بات کر سکتے ہو۔" بات ختم کر کے اس نے ایک فون نمبر بتایا جو میں نے فون کے پاس پڑے ہوئے پیڈ پر نوٹ لیا۔

پچھلی رات میں نے اپنی حفاظت کے لیے مافیا کے کسی آدمی کو اپنے ساتھ لانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا لیکن اس وقت صورتِ حال بدلی ہوئی تھی اس لیے میں نے سینڈرو سے کہا۔

"عجائب گل کو ادھر بھیج دو، اسے میرا فون نمبر دے دینا تاکہ وہ باہر کا جائزہ لے کر ہر ایک گھنٹے بعد مجھے فون پر رپورٹ دیتا رہے۔ میں آج فلیٹ تک ہی محدود رہوں گا۔ وہ مجھے اپنی رپورٹ دیتے ہوئے چنگیز خان کا نام استعمال کرے گا۔"

"کمال ہے!" اس کی تعجب انگیز آواز ابھری۔ "چیف کے ساتھ

...نگاہِ انتخاب بھی اسی پر پڑی ہے۔ چیف کی ہدایت پر میں ...جائزہ لینے کے لیے پہلے ہی تمھاری طرف روانہ کر چکا ہوں ...ہی اس سے کوئی رابطہ ہو گا۔ میں تمھاری بقیہ ہدایات بھی اس ...پہنچا دوں گا، تم بے فکر رہو۔"

میں نے فون بند کر دیا۔ فلیٹ میں محصور ہو جانے کے بعد ...بیرونی دنیا میں اپنے دوستوں اور ہمدردوں سے میرے رابطے کی ...یہی صورت باقی رہ گئی تھی۔ اس بارے میں بھی مجھے خوف ...تھا کہ کہیں محمود میرے فون پر آبزرویشن لگوا کر ساری کالز ٹیپ ...کرنی شروع نہ کر دے لیکن پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ محکمۂ پولیس کا اتنا ...بڑا افسر نہیں تھا کہ محض فون کر کے میرے نمبر پر آبزرویشن لگوا ...سکتا۔ ایسی کسی کارروائی کے لیے اسے افسرانِ بالا کو اعتماد میں ...لینا ہوتا، تب ہی دفتری کارروائی کے ذریعے وہ بندوبست ہو سکتا ...تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس نے اگلے چوبیس گھنٹوں تک میرا معاملہ ...اپنی ذات تک محدود رکھنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ اس لیے وہ مدت ...میں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔

ڈی ڈی یا دلدار آغا نے سیما کو قتل کرتے ہوئے اس کے ...لیے ہوئے فون کا ریسیور کریڈل پر نہ رکھ کر مجھے اس معاملے میں ...ملوث کرنے کا پورا اہتمام کیا تھا مگر میں اس کے احمقانہ رویّے کی بنا ...پر کامیابی کے ساتھ اس صورتِ حال کا ازالہ کرنے میں کامیاب ...ہو گیا تھا۔ اسے میری حقیقت کا ذرا بھی علم نہیں تھا۔ اس کی ساری ...کارروائی کی بنیاد اس ایک نکتے پر مرکوز تھی کہ سیما رات گئے، اپنے ...قتل کے وقت فون پر جس کسی سے بات کر رہی تھی، وہی اس کا ایسا ...ہمدرد ہو سکتا تھا جس کے ایما پر سیما سلور آئی کی واپسی میں ٹال مٹول ...سے کام لے سکتی تھی۔

اس کا وار ناکام ہو گیا تھا جس کے بارے میں اسے اپنے وسائل ...سے جلد ہی اطلاع مل سکتی تھی۔ مگر میں اس سے پہلے دلدار آغا کو ...زلزلہ زدہ کر سکتا تھا۔

خود کو پولیس کی زد سے بچاتے ہوئے، مافیا والوں کو حکم دے ...کر ان کی مقامی قیادت کو زک پہنچانا اس وقت میرا بنیادی مقصد تھا ...اس لیے میں نے اپنی ڈائری میں سے غزالہ کا نمبر تلاش کیا اور پھر ...فون پر رابطہ قائم کر لیا۔

دوسری گھنٹی پر اس طرف سے غزالہ کی دھیمی اور مسحور کن آواز ...سنتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کی آواز میں نے ایک ...طویل مدت کے بعد سنی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ غزالہ کے وجود کا بال بال ...میرا تھا۔ اس کی دلکش اور گنگناتی ہوئی آواز ہر لمحے میرے کانوں میں ...رس گھولتی رہتی تھی لیکن پھر میری بدنصیبی نے دلدار آغا بن ...کر میری محبت پر بھرپور وار کیا اور غزالہ نہایت چالاکی کے ساتھ ...بچھائے ہوئے جال میں پھنس کر شدید جذباتی بحران کے عالم میں ...آغا کو اپنا مجازی خدا بنانے کا فیصلہ کر بیٹھی۔

پچھلی ملاقات میں اس کے کہے ہوئے الفاظ میرے دل و دماغ پر نقش تھے۔ اس نے ایک حیادار مشرقی لڑکی کی طرح ہمیشہ کے لیے اپنے شوہر کا وفادار رہنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا مگر اسی کے ساتھ اس نے اپنی پہلی محبت کے بارے میں دل گرفتہ لہجے میں اقرار کیا تھا کہ محبت وہ روگ ہوتا ہے جو ایک بار لگ جائے تو پھر قبر کے کیڑے بھی اسے نہیں مٹا سکتے۔ وہ پرائی ہو چکی تھی لیکن اس کے دل کے خاکستر میں کہیں کہیں میری محبت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں جنھیں شعلے کا روپ دھارنے سے روکنے کے لیے اس نے مجھ سے اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر کبھی نہ ملنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"تم کون بول رہی ہو؟" اس سے گفتگو کو طول دینے کی بے ساختہ اور شدید خواہش سے مجبور ہو کر میں نے بدلی ہوئی بھاری آواز میں اس سے سوال کیا تھا۔

"آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟ کس سے بات کرنا چاہتے ہیں؟" میرے بے تکلفانہ بلکہ غیر شائستہ طرزِ تخاطب کے باوجود اس نے ٹھہری ہوئی پُرسکون آواز میں شائستگی سے سوال کیا۔

"میں ڈی ڈی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"شاید غلط نمبر مل گیا ہے۔ یہاں کوئی ڈی ڈی نہیں رہتا۔" غزالہ کی آواز بدستور نرم تھی۔

"نمبر ٹھیک ہے!" میں نے جارحانہ لہجے میں غراتے ہوئے اصرار کیا۔ "پتا نہیں تم کون بدنصیب ہو جو اس کی اصلیت جانے بغیر اس کی چھت کے نیچے رہ رہی ہو؟ ڈی ڈی نہیں تو تم دلدار آغا کو ضرور جانتی ہو گی۔ مجھے اسی سے بات کرنا ہے۔"

"دلدار آغا یہیں رہتے ہیں اور میں ان کی بیوی بول رہی ہوں... آپ کون ہیں؟ آپ کا لب و لہجہ ان کے شناساؤں اور خیر خواہوں جیسا نہیں ہے!" اس بار غزالہ کا لہجہ قدرے ناخوشگوار ہو گیا تھا۔

"خیر خواہی یک طرفہ نہیں ہوا کرتی۔ شام کے پاکل کے اخبارات میں پڑھ لینا کہ اس نے کیسی بے دردی سے میری محبوبہ کو ہلاک کیا ہے اور اب جلد ہی تم بھی بیوہ ہونے والی ہو...!" میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا تھا۔ میں چند ثانیوں تک ریسیور کان سے لگائے دوبارہ رابطہ بحال ہونے کا منتظر رہا لیکن کوئی لائن پر نہیں آیا۔

مجھے خوشی تھی کہ اس وقت میں نے دلدار آغا کے کرتوتوں کے بارے میں، خود سامنے آئے بغیر غزالہ کو اشارہ دے دیا تھا۔ اس کی زبان سے اپنے لیے ڈی ڈی کے الفاظ سن کر دلدار آغا کے اوسان خطا ہو سکتے تھے۔ اسے غزالہ کی نگرانی کرنے والے اپنے آدمیوں کے ذریعے یہ تو پتا چل چکا تھا کہ غزالہ اس کی لاعلمی میں شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں کسی سے ملی تھی لیکن جب تک وہ اس موضوع پر غزالہ سے دو بدو بات نہ کرتا اور وہ میرے نام کا انکشاف نہ...

کرتی، دلدار کو اس کھیل میں میری موجودگی کا شبہ تک نہیں ہوسکتا تھا۔ ایئر ہوسٹس سیما کے حوالے سے وہ یہی سوچتا رہ جاتا کہ سیما کے کسی ایسے عاشق نے اسے فون کیا تھا جو شہر کی زیرِ زمین دنیا سے رابطہ رکھتا تھا۔

سلسلہ منقطع کر کے میں نے دوبارہ وہی نمبر ملایا۔ اس بار بھی شاید غزالہ نے ہی فون اٹھایا تھا لیکن وہ کچھ بولی نہیں تھی۔ شاید اسے شبہ ہوگیا تھا کہ دوبارہ بھی اس کے لیے وہی کال تھی۔

"فون بند نہ کرنا۔ یہ معاملہ سنگین ہوچکا ہے۔" میں نے بدلی ہوئی بھاری آواز میں کہا۔ "اگر تم ڈی ڈی کے کرتوتوں سے بے خبر ہو تو میری اسی سے بات کرادو، یہ بہت ضروری ہے۔"

"وہ نہا رہے ہیں، تم تھوڑی دیر بعد فون کرنا۔" غزالہ کا لہجہ سرد ہوگیا۔

"اسے غسل کی ضرورت پیش نہ آنے دو، ورنہ اس کی پنڈلی کا گولی کا زخم بگڑ جائے گا...."

"وہ گولی کا زخم ہے؟" میری بات کاٹتی ہوئی، غزالہ کی تحیر آمیز آواز ابھری تھی۔ اس انکشاف نے اسے میرا ابتدائی تبصرہ نظر انداز کرنے پر مجبور کردیا تھا۔

"وہ مجھ پر گولیاں برسائے گا تو میں اس پر پھول تو نہیں برسا سکتا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "شاید تمہارا ہی نصیب تھا کہ وہ پنڈلی پر پہلی گولی کھا کر گر گیا، چند سیکنڈ اپنے قدموں پر کھڑا رہتا تو چھلنی ہوجاتا۔"

"مجھے کچھ نہیں معلوم کہ تم کون ہو اور کیا کہہ رہے ہو؟" اس کی آواز یک بیک کمزور اور نقاہت آلود ہوگئی جیسے اسے دلدار آغا کے بارے میں میرے انکشافات سے صدمہ پہنچا ہو۔ "تم کو انھی سے بات کرنا ہوگی.... لو وہ آگئے۔"

چند ثانیوں بعد میرے کانوں میں دلدار آغا کی غراتی ہوئی مرد آواز گونجی۔ شاید غزالہ نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر چند ہی الفاظ میں اسے کال کی نوعیت سے آگاہ کردیا تھا۔

"لنگڑے گھوڑے، میں نے تمہارا سراغ لگالیا ہے۔ سیما کو قتل کر کے تم نے اپنی شامت کو للکارا ہے۔ میں تمہارے لیے ایک بے نام سایہ ہوں، لیکن تم میری نگاہوں میں آگئے ہو۔ میں کسی بھی وقت اور کہیں بھی اچانک تم کو ذبح کر کے سیما کے خون کا انتقام لے لوں گا۔" میں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

"پتا نہیں تم کون ہو اور کیا بک رہے ہو؟ میں کسی سیما کو نہیں جانتا۔" وہ غرایا لیکن اس کی آواز سے خوف اور کھوکھلا پن جھلک رہا تھا۔

"ڈی ڈی! معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری اماں تمہارے سر پر کھڑی ہوئی ہے اس لیے اسے سنانے کے لیے یہ ہذیان بک رہے ہو، ورنہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کون ہوسکتا ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں۔ ابھی میں نے تم کو لنگڑا گھوڑا کہا تھا۔ تم جانتے ہو کہ ریس میں لنگڑے گھوڑے نہیں دوڑائے جاتے۔ ان کی پیشانی میں پگھلا ہوا سیسہ اتار کر انھیں موت کی پُرسکون آغوش میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ میری یہ کال اس بات کا ثبوت ہے کہ میں نے تمہارا سراغ لگالیا ہے جب کہ میرا سراغ لگانے کے لیے تم نے مقتولہ سیما کے فون کے ذریعے جو جال پھیلایا تھا اسے میں نے ناکام بنادیا ہے۔ تم دلدار آغا سے صرف ڈی ڈی بنے ہو لیکن میں تمھیں ڈی ڈی ٹی بنا کر کسی نالی میں بہا دوں گا جہاں تمہارا سراغ بھی نہیں ملے گا۔"

"میرے بارے میں تم کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہورہے ہوتے ہو۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں تاکہ ان غلط فہمیوں کو دور کرسکوں۔ تم اپنی سہولت کے مطابق وقت اور مقام کا تعین کرلو۔" اس کے لہجے میں اعتماد کا فقدان تھا۔ وہ کھل کر مجھ سے بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن اپنے قریب غزالہ کی موجودگی کی وجہ سے بے بس تھا۔

"میں احمق نہیں ہوں ڈی ڈی!" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "یہ میرا پہلا اور آخری فون یا رابطہ ہے۔ میں تم جیسے سفاک آدمی کو موت کی دہشت میں مبتلا کر کے تمہاری نیندیں اڑا دینا چاہتا تھا، یہ کام میں نے کرلیا۔ اب جب بھی تم سے میری ملاقات ہوگی وہ تمہاری زندگی کے آخری لمحات ہوں گے...."

"ٹھہرو، فون بند نہ کرنا۔" وہ میری بات کاٹ کر بے تابانہ لہجے میں بولا۔ "میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تصادم سے تمھیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم دس بار بھی کوشش کرو گے تو میرے قریب نہ پھٹک سکو گے۔ میں محتاط طبیعت اور بے پناہ وسائل کا مالک ہوں۔ لاکھوں کماتا ہوں تو تم جیسے کسی جنونی سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اس سے کہیں زیادہ خرچ کرسکتا ہوں۔" اس کی آواز میں تندی پیدا ہوگئی تھی جو فوراً ہی معدوم ہوگئی۔ "تمہارا خیال ہے کہ میں نے تمہاری محبوبہ کو قتل کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون تھی اور کیسی تھی لیکن اس کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ تم شہر کی جس لڑکی کی طرف اشارہ کردو، میں اسے چند ہی روز میں تمہاری بے دام لونڈی بنا سکتا ہوں، مجھ سے ٹکرا کر تم خسارے میں رہو گے۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم بردہ فروش بھی ہو۔" میں نے چبھتے ہوئے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ "لڑکیاں خریدنے کے لیے مجھے تم جیسے گھٹیا بدمعاش کی مدد لینے کی کوئی ضرورت نہیں، بکنے والیوں کو میں کسی بھی دلال کے ذریعے خرید سکتا ہوں لیکن ایسے کھلونوں سے محبت نہیں کی جاسکتی۔ یہ پاکیزہ جذبہ تو شاید کبھی تمھیں چھو کر بھی نہ گزرا ہو۔ تم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ محبت کیا ہوتی ہے اور کیسے ہوتی ہے، سیما کو مار کر تم نے ناقابلِ معافی جرم کیا ہے۔ تم میری محبت کے قاتل ہو۔ تم سے میرا کوئی سمجھوتا نہیں ہوسکتا۔"

میں اس سے براہِ راست جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ میرے دلی جذبات تھے۔ میں نے آڑ سیما کے نام کی لی تھی تاکہ اپنی ذات کو اس کے سامنے بے نقاب نہ ہونے دوں، لیکن یہ حقیقت تھی کہ دلدار آغا غاصب تھا۔ اس نے غزالہ پر دھوکے سے شب خون مار کر میری مجھ سے چھین لی تھی۔ اس جرم کا داغ دلدار کا لہو ہی دھو سکتا تھا۔ گفتگو کے دوران غصے اور جوش کے عالم میں مجھے خیال آیا کہ اسے شی اور دواساز کارخانے میں گھپلوں کا بھی حوالہ دوں لیکن اس طرح میں کھل کر اس کے سامنے آجاتا اور وہ تاثر جو میں سیما کے حوالے سے ابھار رہا تھا تباہ ہوجاتا۔

مجھے بعد میں خیال آیا کہ مجھے اس کو ڈی ڈی کے لقب سے نہیں پکارنا چاہیے تھا لیکن وہ کوئی فاش غلطی نہیں تھی۔ میں نے اس لقب کا انکشاف غزالہ پر کیا تھا تاکہ اسے معلوم ہوسکے کہ اس کا دلدار نام بدل کر بھی شہر میں گھپلے کرتا پھر رہا تھا اور وہ خود اس کی پارسائی کی پجارن بنی ہوئی تھی۔ اسی تسلسل میں مجھے دلدار آغا کو بھی اسی لقب سے پکارنا پڑا تاکہ اس کو احساس ہوسکے کہ میرے علاوہ غزالہ بھی اس راز سے واقف ہوچکی تھی۔

"تم بہت گھٹیا اور ذلیل انسان معلوم ہوتے ہو۔" جواب میں اس کی جھنجھلائی ہوئی آواز ریسیور پر ابھری تھی۔ "تم اپنی ایسی کی تیسی میں جاؤ، میرا جو کچھ بگاڑ سکتے ہو، وہ بگاڑنے کی کوشش کر کے دیکھ لو، ورنہ تم اسی شہر کے کسی گندے نالے میں اپنا منہ پیٹتے نظر آؤ گے۔" میرے مسلسل جارحانہ رویے کی وجہ سے وہ میری طرف سے بالکل ہی مایوس ہوگیا تھا۔ اس لیے آخر میں تلخ کلامی پر اتر آیا۔

میں نے اس سے مزید کچھ کہے بغیر فون کا سلسلہ منقطع کردیا۔

جہانگیر بہت زیادہ بولائے ہوئے انداز میں میرے پاس پہنچا تھا۔ سیما کے قتل کی خبر اس کے لیے ناقابلِ یقین ثابت ہوئی تھی۔ جب میں نے اس کے استفسار پر سیما کے قتل کی کہانی اختصار کے ساتھ دہرائی تو اسے اپنی بیوی سلمیٰ پر شدت سے غصہ آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر پچھلی رات سلمیٰ اس کے ساتھ میرے فلیٹ پر آنے کی ضد نہ کرتی تو شاید وہ موقع پا کر اکیلا ہی ادھر آنکلتا اور پھر سیما اپنے فلیٹ میں تنہا موجود رہنے کے بجائے میرے فلیٹ میں شمعِ محفل بنی ہوئی ہوتی اور یوں وہ تنہائی میں سفاک قاتل کے وار کا نشانہ بننے سے بچ جاتی۔

لیکن جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا۔ سیما کی موت اسی طرح اٹل تھی جس طرح میری یا جہانگیر کی زندگی کسی کی اگر مگر اس حقیقت کو سرِمو بھی تبدیل نہیں کرسکتی تھی۔

میں نے باتھ روم کی ٹنکی سے ہتھیاروں کی تھیلیاں نکال کر تولیے سے خشک کرنے کے بعد جہانگیر کے حوالے کیں تو واضح طور پر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ "تت.... تمہارا مطلب ہے کہ میں یہ سب اپنے ساتھ لے جاؤں۔ تمہارے پڑوس میں اور بلڈنگ کے سامنے پولیس موجود ہے اور میں یہ ہتھیار نکال لے جاؤں۔"

"ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔" میں نے آنکھیں نکال کر غراتے ہوئے کہا تھا۔ "میں مرنے والی کا پڑوسی ہوں، میں باہر نکلا تو میری تلاشی لی جائے گی۔ تم اجنبی ملاقاتی ہو۔ میں نے تم کو اسی لیے یہاں بلایا تھا۔" میں نے اسے اپنے بارے میں سب انسپکٹر محمود کے خدشات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی، ورنہ وہ کسی اڑیل ٹٹو کی طرح مجھ سے کسی بھی قسم کے تعاون سے انکار کردیتا۔

"عجیب زبردستی ہے۔" وہ ان تھیلیوں کو اپنے بریف کیس میں جماتے ہوئے بے بسی سے بڑبڑایا تھا۔ "اگر میں دھر لیا گیا تو تم میری ضمانت بھی نہیں کرا سکو گے۔ تمہارے لیے میں کم از کم اتنا تو کرہی لوں گا۔"

"تم اپنی صورت پر اسی طرح یتیمی اور پھٹکار طاری کر کے باہر نکلے تو وہ تمھیں ضرور پکڑ لیں گے۔" غصے سے میرا پارا چڑھ گیا تھا۔ "تم سمجھ نہیں رہے ہو کہ میں سیما کا واحد پڑوسی تھا۔ اگر شبے کی بنیاد پر کسی پولیس افسر نے میرے فلیٹ کی تلاشی لینے کا فیصلہ کرلیا تو یہ ہتھیار مجھے پھانسی کے تختے پر پہنچا دیں گے۔"

"بحث اور بکواس میں تم سے جیتنا ناممکن ہے۔" آخر کار اسے ہتھیار ڈالنے پڑ گئے تھے۔ "جہاں قدم لے جاتے ہو کوئی نہ کوئی بڑا ہنگامہ کھڑا ہوجاتا ہے۔ پہلے سولر آئی کے لیے یہاں زبردست خونریزی ہوئی، پھر سیما مار ڈالی گئی اب دیکھو میرا کیا انجام ہوتا ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی رہتی ہے۔"

میں نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی تھی اس طرح وہ محض چند منٹ بعد ہی سارے ہتھیار اپنے بریف کیس میں بند کر کے وہاں سے واپس چلا گیا تھا۔

اسے روانہ کر کے دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ سیما کے فلیٹ میں پولیس والوں کی بھیڑ میں اضافہ ہوچکا تھا اور قتل کی واردات کو کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی فوری طور پر لاش اٹھوائے جانے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ میں دروازہ بند کر کے پلٹا تو فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔

میرا خیال فوری طور پر مافیا چیف، سیٹھ حبیب جیوانی کی طرف گیا تھا لیکن ریسیور اٹھانے پر وہ عجائب خان کا فون ثابت ہوا۔ اس سے پتا چلا کہ باہر کے حالات معمول پر تھے۔ اس وقت تک پولیس پارٹی سیما کے فلیٹ میں موجود تھی اس لیے باہر نگرانی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔

اس سے فارغ ہوتے ہی میں نے مافیا چیف کا نمبر ڈائل کیا جو مجھے سینڈو سے ملا تھا۔

میں نے سینڈو کو صرف اتنا بتایا تھا کہ پولیس کو میرے پیچھے لگادیا گیا تھا لیکن سیٹھ حبیب کو اس معاملے میں کافی کچھ معلوم ہوچکا تھا۔ غالباً سینڈو نے عجائب خاں سے ملنے والی تمام خبریں فوری طور پر اس تک پہنچادی تھیں۔

"مجھے پتا چل گیا ہے کہ سیما ہلاک کردی گئی ہے، اور پولیس وہاں پہنچ چکی ہے۔ کیا اس بارے میں وہ تم پر کسی قسم کا شبہ کر رہے ہیں؟" اس نے رسمی الفاظ کے تبادلے کے بعد براہِ راست سوال کیا۔

"مجھے بھی یہی اندیشہ تھا جو بعد میں غلط ثابت ہوا۔ ایک پولیس افسر کو میرے اطالوی نژاد یا پیٹرواک ہونے پر شبہ ہے۔ اور وہ اس معاملے کو کیش کرنے کے چکر میں نظر آرہا ہے۔۔۔"

"نام کیا ہے اس افسر کا؟ سیما کا معاملہ تو محمود نامی سب انسپکٹر کے حوالے کیا گیا ہے؟" اس نے میری بات کاٹ کر سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"وہی تو ساری مصیبت کی جڑ بنا ہوا ہے۔" میں نے اُسے آگاہ کیا۔

ریسیور پر اس کے ایک گہرے سانس کی آواز سنائی دی پھر وہ بولا۔ "تم یقیناً کسی غلط فہمی کا شکار ہوئے ہو۔ تمھارا پیغام اور پھر عجائب خان کی ابتدائی اطلاعات ملتے ہی میں نے کچھ لوگوں سے رابطہ قائم کیا تھا۔ ان سے پتا چلا کہ محمود راشی نہیں ہے اور کسی کی سفارش قبول نہیں کرتا۔ اس کی بنائی ہوئی رپورٹوں پر پراسیکیوشن برانچ والے بڑی باریکی سے کیس تیار کرتے ہیں، ورنہ محمود عدالت میں ان کی خامیوں کی نشاندہی کر بیٹھتا ہے۔"

"لیکن وہ مجھ سے سودا کرنا چاہ رہا ہے۔" میں نے اضطراری طور پر رازدارانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "اس نے مجھے سوچنے کے لیے آج رات تک کی مہلت دی ہے، ورنہ کل صبح سے وہ میرے خلاف اپنا کام شروع کردے گا۔"

"میرے لیے یہ بات ناقابلِ یقین ہے۔ مجھے ملنے والی اطلاع غلط نہیں ہوسکتی۔" اس کے لہجے میں حیرت اور بے یقینی ابھر آئی تھی۔ "وہ کیا مانگ رہا ہے تم سے؟"

"کسی لمبے چکر میں ہے۔ خود مُنہ نہیں کھولا، میری زبان سے پیشکش سُننا چاہتا ہے شاید لاکھوں کی آس میں ہو۔"

"پھر میری بات لکھ لو کہ وہ تمھیں گھیر رہا ہے۔ تمھاری بولی سے وہ اندازہ لگائے گا کہ تم کتنے پانی میں ہو۔ وہ روایتی پولیس والا نہیں ہے بلکہ اپنے طریقے سے کام کرتا ہے۔"

"مجھے حیرت ہے کہ میں اسے نہیں پہچان سکا۔" میں نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔

"میں تمھیں پوری بات بتاتا ہوں۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ "وہ ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں سے بہت زیادہ متاثر ہے اور عملی طور پر خود کو ابنِ صفی کا افسانوی کردار انسپکٹر احمد کمال فریدی ثابت کرنا چاہتا ہے۔ وہ اکثر ضابطوں کی پروا کیے بغیر اپنی مرضی سے اکیلا کام کرتا ہے اور کامیاب رہتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ اطلاعات مجھے اسی کے محکمے کے ایک بہت سینیئر افسر نے دی ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اس سر پھرے انسپکٹر کے بارے میں وہ کچھ بھی نہ کرسکے گا بدقسمتی سے تم ایک غلط آدمی سے ٹکرا گئے ہو۔ اسے رشوت کی پیشکش ہرگز نہ کرنا۔"

"پھر میں کیا کروں؟ میں تو تم پر انحصار کیے بیٹھا تھا۔" میں اس کی باتوں سے پریشان ہوگیا۔

"کچھ عرصے کے لیے روپوش ہوجاؤ۔" اس نے سپاٹ لہجے میں مشورہ دیا۔

"وہ میرے اس دوست کو تنگ کرے گا جس کے فلیٹ میں میرا قیام ہے۔"

"پھر کچھ دنوں کے لیے ملک سے باہر چلے جاؤ، تمھارا دوست کہہ سکتا ہے کہ تمھیں ایمرجنسی میں ملک چھوڑنا پڑا۔ امیگریشن کا ریکارڈ تمھاری روانگی کی تصدیق کرے گا تو اس کا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔"

"یہ بھی ناممکن ہے۔ اس نے میری تمام سفری دستاویزات اپنی تحویل میں لے لی ہیں، وہ انھیں آگ لگا دے تو میں اپنے بارے میں کچھ بھی ثابت نہیں کرسکوں گا۔"

"اوہ خدا!" سیٹھ حبیب کی تھکی ہوئی آواز سنائی دی۔ "اس نے تمھیں بُری طرح گھیر لیا ہے۔۔۔ مجھے تھوڑا سا وقت دو، میں اس بارے میں سوچنا چاہتا ہوں پھر خود ہی فون کروں گا۔"

میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔ میرے لیے وہ گفتگو اعصاب شکن ثابت ہوئی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے فرسودہ نظام میں نچلی سطح پر کوئی ایسا مقام بھی ہوگا جہاں مافیا جیسے بارسوخ گروہ بھی خود کو بے بس محسوس کرتے ہوں گے۔

میں دُنیا میں نہ جانے کہاں کہاں اور کس کس کی آنکھوں میں دُھول جھونکتا چلا آیا تھا لیکن پاکستان میں ایک فرض شناس پولیس افسر نے محض میری زبان اور لب و لہجے کی بنا پر مجھے بھیانک چنگل میں پھانس لیا تھا جس سے نکاسی کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی حالانکہ اس سے پہلے کشت و خون اور نام نہاد اجتماعی ڈکیتی کے بعد بھی میرا کئی پولیس افسران سے سامنا ہوا تھا۔ میری قومیت لکھی گئی تھی، میرا پاسپورٹ دیکھا گیا تھا لیکن وہ ہولناک نکتہ کسی کو نہیں سوجھا تھا جو محمود نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا تھا۔

اچانک دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکا دیا۔ ڈور بیل کا سوئچ نمایاں جگہ پر ہوتے ہوئے وہ دستک بہت غیر معمولی تھی جب کہ پولیس کی خاصی نفری غالباً اس وقت تک میرے پڑوس میں موجود تھی۔ میرے اس تردد میں چند ثانیے ہی گزرے تھے کہ دوبارہ پھر دستک ہوئی۔ دونوں بار دستک دھیمی تھی اور اس میں جارحانہ رنگ نمایاں نہیں تھا۔ میں نے لپک کر دروازے پر پہنچتے ہوئے سوال کیا۔ "کون ہے؟"

"محمود! جلدی دروازہ کھولو!" باہر سے دھیمے لہجے میں کہا گیا۔

اس دن ساری ہی باتیں عجیب اور غیر متوقع ہورہی تھیں۔ اس تو سر سب انسپکٹر کا یوں رازدارانہ انداز میں میرے دروازے پر دستک دینا خالی از علت نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے خوف اور تشویش کے ملے جُلے تاثرات کے ساتھ دروازہ کھول دیا اور وہاں خلا پیدا ہوتے ہی محمود میری پیشوائی کا انتظار کیے بغیر اندر آگیا۔

"پولیس چلی گئیں!" وہ خود ہی دروازہ بند کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ "اسکاچ ہے تو ایک گلاس اور پلاؤ، بڑی مشکل سے نکل کر آیا ہوں۔۔۔ شاید بلیک ڈاگ ہے تمھارے پاس؟"

میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا اور کچن کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے وہیں مختصر سی لابی میں نشست سنبھال لی۔ میں دو گلاس تیار کرکے باہر لایا تو اس نے اٹھ کر میرے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

"چیئرز!" اس نے میری طرف فضا میں گلاس لہرا کر لبوں سے لگا لیا۔

"میرے بارے میں کس نتیجے پر پہنچے ہو؟" میں نے ایک گھونٹ لینے کے بعد سنجیدگی سے سوال کیا۔

"ابھی تو سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ بڑا اُلجھا ہوا قتل کا کیس ہے اور میں اپنے کام پر پوری طرح توجہ دینے کا عادی ہوں۔ یہ دباؤ ختم ہو تو کچھ غور کروں گا۔" اس وقت اس کا لہجہ سرسری بلکہ خاصی حد تک دوستانہ تھا۔ "ویسے بھی میں نے تمھیں کل صبح تک کی مہلت دی ہوئی ہے۔ اپنے بارے میں تم کو خود ہی غور کرنا ہوگا۔"

"تم کتنی رقم چاہتے ہو؟" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس وقت اس کی وردی اور شخصیت کا خوف یکلخت میرے دل سے کافور ہوگیا تھا۔

وہ اچانک ہی ہولے سے ہنس پڑا، پھر عارفانہ انداز میں بولا۔ "اس دُنیا میں ہر شخص بکاؤ مال کی طرح ہے۔ کچھ بہت سستے بک جاتے ہیں اور راشی اور بے ایمان مشہور ہوجاتے ہیں اور جن کے دام کوئی ادا نہ کرسکے، وہ ایماندار کہلانے لگتے ہیں۔ کسی کو خریدنا تمھاری اپنی بساط پر منحصر ہے۔ بولی لگا کر دیکھو، شاید تم کامیاب ہوجاؤ۔" اس کے الفاظ مجھے دار اور مبہم تھے۔ وہ ابتدا ہی سے مجھے مسلسل اکسا رہا تھا لیکن اس نے خود ایک بار بھی براہِ راست رشوت کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ مجھے سیٹھ حبیب کی فراہم کی ہوئی معلومات میں وزن محسوس ہونے لگا تھا۔

"میں تو ایک پیسہ بھی نہیں دینا چاہتا لیکن میرے بارے میں تمھارا رویہ وحشت ناک ہے، کچھ بھی نہ ہوسکا تو تم اپنی تسلی ہونے تک مجھے یہاں رُکا رہنے پر مجبور کردوگے جبکہ میں آزاد پنچھی کی طرح رہنا چاہتا ہوں۔ تم اس وقت تازہ دم ہونے کے لیے دوستانہ انداز میں میرے پاس شراب پینے آئے ہو تو تمھاری ضرورت کے بارے میں سوال کرلیا ہے۔"

"اچھا کیا!" اس نے کہا۔ "میں کرائے کے مکان میں رہتا ہوں، ذاتی اسکوٹر پر ڈیوٹی انجام دیتا ہوں اور اس پر خوش رہتا ہوں۔ چاہوں تو ہر روز ہزاروں کما سکتا ہوں، لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے تم پر شبہ ہے جو درست ثابت ہوا تو تم سلاخوں کے پیچھے نظر آؤ گے۔ بے گناہ ہوئے تو معذرت کے ساتھ تیسرے دن تمھارے کاغذات تمھیں لوٹا دوں گا۔ آج کا دن تمھارا ہے۔ مجھے صرف دو دن چاہییں۔ تم سچے ہوئے تو یہیں ڈٹے رہو گے اور جھوٹے ہوئے تو مہلت ملتے ہی بھاگ جاؤ گے لیکن تمھاری دُم ہر وقت میرے ہاتھ میں رہے گی۔ صرف پینے کی خواہش اور تمھاری دوستی کے طعنے نے مجھے لب کشائی پر مجبور کیا ہے، ورنہ میں بلی اور چوہے کا کھیل کھیل کر تمھارے اعصاب بکھیر دینا چاہتا تھا۔ اب یہ سیدھا سا مطلب ہے اقبال کرو گے تو سزا ہلکی ملے گی، میں نے تمھیں جھوٹا ثابت کیا تو لمبی قید بامشقت ہوگی۔" اپنی بات مکمل کرکے وہ یوں میری آنکھوں میں دیکھتا رہا جیسے مجھ سے جواب کی توقع کررہا ہو۔

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں خیال آیا کہ اس کے سودا گروں کے خلاف اپنے جہاد کی تفصیلات بتا کر اس کی ہمدردیاں جیتنے کی کوشش کروں اور اسے بتا دوں کہ میں کون ہوں لیکن میں نے اپنے اس خیال کو فوراً مسترد کردیا۔ سیٹھ حبیب بتا چکا تھا اور میں نے خود اعتراف کیا تھا کہ وہ ایماندار تھا اور اس دور میں ایماندار آدمی سے زیادہ خطرناک کوئی نہیں ہوتا۔

"تین دن میں ہنس کھیل کر گزار لوں گا، پچھلے جنم کی بات اور ہے، اس جنم میں تم میرے بارے میں کوئی نئی بات معلوم نہیں کرسکو گے۔ اپنی مرضی سے اتنی عمر گزاری ہے تو تین دن تمھارے نام بھی سہی!" میں نے اعتماد سے کہا۔

"تم فکر نہ کرو، اگر حوالات یا جیل چلے گئے تو میں تمھاری اس میزبانی کا حساب بے باق کردوں گا۔" اس نے جلدی جلدی اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ "جس برانڈ کی اور جتنی چاہو گے تمھیں باقاعدگی سے ملا کرے گی۔"

"اپنی تنخواہ کے سہارے اتنی فیاضانہ میزبانی کرلو گے؟" میں نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

"یہ بوجھ میری جیب پر نہیں آئے گا۔ جس کسی کو تمھاری خدمت پر مامور کردوں گا، وہی بوتلوں کا بھی بندوبست کرے گا۔ چھوٹے موٹے مجرموں کو میں نظرانداز کرتا رہتا ہوں جس کے صلے میں وہ نہ صرف میرے اِنعام مند رہتے ہیں بلکہ میرے بے دام غلام کی طرح اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔ البتہ ہیروئن بیچنے والوں کا میں ازلی دشمن ہوں۔ اس میں چھوٹے بڑے کا امتیاز نہیں کرتا، جو مل جائے اسے جوتے لگوا کر اندر کردیتا ہوں۔"

گلاس خالی کرکے اس نے بے تکلفانہ انداز میں فریج میں سے ٹھنڈے پانی کی ایک بوتل نکالی اور اسی سے مُنہ لگا کر چند بڑے گھونٹ لے کر بوتل واپس رکھ دی۔

"اور کچھ نہ ملے تو سادہ پانی کے چند گھونٹ بُو دبا دیتے ہیں۔"

یہ کہتا ہوا وہ تیزی کے ساتھ میرے فلیٹ سے نکلتا چلا گیا اور میں دل ہی دل میں سپاہی اللہ داد کا شکریہ ادا کرنے لگا جس نے مجھے اپنے افسر کی ایک کمزوری سے آگاہ کر کے اتنا موقع فراہم کر دیا تھا کہ میں اپنے دشمن سے بے تکلف ہو کر اس کے دل کی بات اگلوانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ورنہ اس کی ابتدائی گفتگو کی روشنی میں سیٹھ حبیب کی طرف سے محمود کی پارسائی کا دعویٰ مجھے بے بنیاد معلوم ہو رہا تھا۔

میری ایک الجھن دور ہو گئی تھی۔ رشوت دے کر اس سب انسپکٹر کو تفتیش سے باز رکھنا ممکن نہیں تھا لیکن اسی کے ساتھ دوسری شدید پریشانی ذہن پر مسلط ہو گئی تھی۔ محمود خود بتا گیا تھا کہ وہ چھوٹے مجرموں کو ڈھیل دے کر بڑی مچھلیوں کا شکار کھیلنے کا عادی تھا۔ اگر وہ مجھے محض شبہے میں حراست میں لے کر شہر کے دس بیس جرائم پیشہ افراد کی مدد لینے کا فیصلہ کر لیتا تو ان میں سے کوئی نہ کوئی بہ آسانی مجھے شناخت کر سکتا تھا کیونکہ شی میں اپنی شمولیت کے ابتدائی دور میں اس قماش کے لوگوں سے میرے قریبی رابطے رہے تھے اور یہ بات تو سینہ بہ سینہ شاید ہر ایک کے علم میں تھی کہ جن دنوں ہر طرف چرس کا طوطی بول رہا تھا، ان دنوں میں نے اپنے رفقائے کار کی مدد سے شہر کے چور بازاروں سے چرس سمیٹ کر کامیابی کے ساتھ ہیروئن کو پہلی بار تجارتی پیمانے پر متعارف کرایا تھا ورنہ اس سے پیشتر شہر میں ایک آدھ ہیروئنچی کے وجود کی قسم تو نہیں کھائی جا سکتی تھی البتہ یہ حقیقت ناقابلِ تردید تھی کہ عام نشے باز اور ان کے سپلائر ہیروئن کے وجود تک سے بے خبر تھے۔

تھوڑی دیر بعد چیف کا فون آیا۔ اس دوران میں سب انسپکٹر محمود کے بارے میں اس کی معلومات میں کچھ اضافہ ہو چکا تھا لیکن محمود سے میری براہِ راست گفتگو کے بعد میرے لیے ان میں سے کوئی بات نئی نہیں تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ چیف نے میرے بارے میں شہر میں موجود ڈان تھری سے بھی مشورہ کیا تھا اور میرے معاملے کے حل کی کوئی راہ نکال لی تھی۔

"میرے لیے یہی کافی ہے کہ میری گلو خلاصی ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "میں نے تمھاری فراہم کی ہوئی معلومات کی تصدیق کر لی ہے۔ وہ واقعی بہت خود سر اور ... حت پسند افسر ہے۔"

"فلیٹ میں بیٹھے بیٹھے تم نے کہاں سے یہ تصدیق کر لی؟" اس نے سوال کیا۔

"وہ خود ہی آ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے تین دن کا وعدہ کیا ہے۔ اس دوران وہ مجھے بند کر دے گا یا ہمیشہ کے لیے میرا دوست ہو جائے گا۔ رشوت لینے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"تین دن بہت دور ہیں، آج رات ہی تمھارے کاغذات حاصل کر لیے جائیں گے۔" اس کی سرد اور سپاٹ آواز سنائی دی۔ "تم اسے بالکل بھول جاؤ۔ یہ معاملہ میں خود دیکھوں گا۔ عجائب خان کو فی الحال میں واپس بلا رہا ہوں۔ اپنے منصوبے میں مجھے اس کی ضرورت پیش آئے گی۔ تم چاہو تو اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی مامور کیا جا سکتا ہے۔"

"مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ میں نے باہر کی خیر خبر رکھنے کے لیے اسے بلایا تھا۔ اب یہ ذمے داری تم نے لے لی ہے تو بلاوجہ ایک آدمی لگائے رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

اس گفتگو نے میرے ذہن سے بڑا بوجھ ہٹا دیا۔ نہ میں نے اس کے منصوبے کی تفصیلات پوچھ کر خود کو اس گورکھ دھندے میں الجھانے کی کوشش کی اور نہ ہی اس نے اس بارے میں مجھے بتانے کی ضرورت محسوس کی۔ البتہ اس تلخ اور اعصاب شکن تجربے کی روشنی میں میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ جب تک مجھے ہیروئن بنا رہنا ہے مجھے اپنا تلفظ اور لہجہ بگاڑنا ہو گا یا پھر کوئی نیا مقامی نام اختیار کر کے اپنے لیے نئے شناختی کاغذات کا بندوبست کرنا ہو گا ورنہ وہی صورتِ حال ایک بار پھر پیش آ سکتی تھی۔

دوپہر تک میں اپنے فلیٹ میں ہی رہا۔ اس دوران میں پولیس والوں نے ایک بار بھی مجھے طلب نہیں کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ سب انسپکٹر محمود نے اپنے وعدے کے مطابق مجھے سیما کے قتل کے معاملے سے بالکل الگ رکھا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ سیما کے فلیٹ کی بالکونی میں کھلنے والی ایک کھڑکی کے کٹے ہوئے شیشے کو دیکھ لینے کے باوجود کسی متجسس پولیس افسر کو محض سات آٹھ فٹ کے فاصلے پر موجود میرے فلیٹ کی بالکونی کا جائزہ لینے کا خیال نہیں آیا تھا جہاں سے سیما کی بالکونی تک رسائی بہت زیادہ دشوار نہیں تھی۔

محمود نے مجھے فرار کی کسی کوشش کے بارے میں متنبہ کیا تھا، یہ دھمکی بھی دی تھی اگر میں فلیٹ سے باہر نکلتا تو میری نگرانی پر مامور اس کے سادہ پوش آدمی کوئی نہ کوئی سنگین الزام عائد کر کے مجھے گرفتار کر لیتے پھر بھی میں نے اپنے فلیٹ سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

میزانائین فلور پر میری دو گاڑیاں موجود تھیں لیکن میں نے پیدل ہی باہر نکلنے کا ارادہ کیا اور سیڑھیاں طے کر کے نیچے آ گیا۔ اپنی بلڈنگ سے نکل کر میں چند ثانیے تک رکا رہا، جیب سے پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگاتے ہوئے میں نے قرب و جوار کا جائزہ لے ڈالا لیکن وہاں کسی ایسے فرد کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا جس پر پولیس کا سادہ پوش افسر یا سپاہی ہونے کا گمان کیا جا سکتا۔

اس دوران میں سیما کی لاش لے جائی جا چکی تھی۔ اپنے فلیٹ سے نکلتے ہی میں نے اس کے دروازے پر سیل دیکھ لی تھی۔ پولیس والوں کی نفری غائب ہونے کی وجہ سے اس وقت میرا فلور تو کیا پوری بلڈنگ پر موت کا مہیب سناٹا چھایا ہوا محسوس ہو رہا تھا جب نیچے بھی میدان صاف نظر آیا تو میں سوچ میں پڑ گیا کیونکہ میری محدود معلومات کے مطابق پولیس والے قتل جیسی کسی بھی سنگین واردات کے بعد اگر قانونی ضروریات کے پیشِ نظر جائے واردات کو سیل کرتے

...ں کی نگرانی کے لیے اپنا کوئی آدمی بھی مامور کرتے ہیں تاکہ ...مجرم موقع پا کر جائے واردات سے شہادتیں تلف یا مسخ کرنے ...نہ ہو سکیں، مگر سیما کے فلیٹ کو صرف سیل کرنے پر ...کتفا ...یا گیا تھا۔

...ں اپنے گرد و پیش سے چوکنا رہتے ہوئے چہل قدمی کے ...ین روڈ کی طرف بڑھا تو سامنے سے اپنی عمارت کا چوکیدار ...نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ میں لپٹی ہوئی تندوری روٹیاں ...وہی چند روٹیاں اس دنیا میں ہونے والی تمام بری بھلی ...یوں کا محور تھیں جن کے حصول کے لیے کبھی انسان، انسان کی ...کاٹنے لگتا تھا اور کہیں گلے کاٹ رہا تھا۔ ان سب کارروائیوں ...نتیجے میں تجوریوں کا پیٹ بڑھتا اور بھرتا ہی چلا جاتا تھا لیکن اپنے ...آدمیوں کے ساتھ ہر قسم کی زیادتیاں کرنے والے کے مقدر میں ...یہ چند روٹیاں آتی تھیں جو اس وقت چوکیدار کے ہاتھ میں تھیں۔

چوکیدار نے مجھے پہچان کر اپنا ہاتھ پیشانی تک لے جا کر میرے ...لیے احترام کا اظہار کیا تو میں اس کے پاس رک گیا۔

"پولیس والے لاش کب لے گئے؟" میں نے نرمی کے ساتھ ...سوال کیا۔

"دس پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔" وہ ایک المناک آواز نکالنے ...کے بعد بولا۔ "ہم دونوں کو سیل کا خیال رکھنے کے لیے کہہ گئے ہیں۔ ...ہم کو اپنا سنتری بھیجیں گے۔"

ہم دونوں سے غالباً اس کی مراد دن اور رات والے چوکیداروں ...سے تھی۔

"لیکن اس وقت تو نہ زینوں پر کوئی تھا نہ ریمپ پر۔ تم کو ...ہاں رہنا چاہیے تھا۔"

"ظالموں کو جسے مارنا تھا، اسے مار گئے۔ اب یہاں کوئی کیا لینے ...آئے گا۔ پولیس والوں نے مجھے ہلکان کر کے رکھ دیا۔ میں بارہ بجے کھانا ...کھاتا ہوں، ان کے چکروں میں ڈیڑھ بج گیا۔ ان کے جانے کے بعد ...فرصت ملی تو ذرا دو منٹ کے لیے روٹی لینے چلا گیا تھا۔ اب وہیں ...گیٹ پر بیٹھا رہوں گا۔" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔

میں نے چند تشفی آمیز فقروں کے ساتھ ہی پانچ روپے کا ایک ...نوٹ اس کے حوالے کیا اور وہ مجھے دعائیں دیتا ہوا اپنے راستے پر ...بڑھ گیا۔ مجھے اس سے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ اس لیے ...میں چوراہے کی طرف چل دیا۔ جہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی رکشا یا ...ٹیکسی ضرور رہتی تھی۔

چوراہے پر پہنچ کر میں ایک ٹیکسی کی طرف مڑا ہی تھا کہ اچانک ...پشت سے کسی نے سختی کے ساتھ میرے شانے کو اپنی گرفت میں ...لے کر مجھے رکنے پر مجبور کر دیا۔ اس ناگہانی افتاد پر میں بھڑک کر تیزی ...سے پلٹا تو قمیص شلوار میں ملبوس ایک صحت مند اور دراز قد ...آدمی کو اپنے سامنے موجود پایا جس کے پتلے پتلے ہونٹوں اور چہرے کی ساخت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دوسروں کو اذیت میں مبتلا دیکھ کر سکون حاصل کرتا ہو گا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے کرخت لہجے میں سوال کیا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ محمود کا ہی کوئی آدمی تھا اور چھپ کر میری نگرانی کر رہا تھا۔ مجھے ٹیکسی کے ذریعے کہیں روانگی پر آمادہ پا کر ہی وہ اچانک سامنے آنے پر مجبور ہوا تھا ورنہ غالباً مجھ سے دور رہ کر ہی فلیٹ میں میری واپسی تک نگرانی کرتا رہتا۔

میرا دل چاہا کہ اس سے الجھ پڑوں لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ چیف اسی رات تک میری گلو خلاصی کا بندوبست کر چکا تھا اس لیے بات بڑھانے میں سراسر میرا نقصان تھا۔ میں نے اس سے تعاون کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ "کھانا کھانے جا رہا ہوں۔ تم چاہو تو تمھیں بھی ساتھ لیے چلتا ہوں۔"

"ادھر سے دال روٹی لو اور اپنے کابک میں دفع ہو جاؤ۔" وہ مزدوروں کے لیے بنے ہوئے ایک جھونپڑی نما ہوٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غرایا۔ "ورنہ ابھی اٹھا لے جاؤں گا۔" اس کی آواز میں تحقیر اور تحکم کے علاوہ کسی تیسرے جذبے کی ذرا بھی رمق موجود نہیں تھی۔

اس کے چیلنج کرتے ہوئے لہجے پر مجھے طرارہ آ گیا۔ شاید وہ میرے مصالحانہ رویے کو میری بزدلی پر محمول کر رہا تھا لیکن پھر بھی میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم میرا ساتھ دو تو میں اس ہوٹل کی کرکری دال اور بے مزہ سالن بھی کھانے کے لیے تیار ہوں، ورنہ مجھے طارق روڈ تک جانے دو۔"

اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور پوری قوت سے اپنا داہنا ہاتھ گھما دیا۔ میرے بائیں رخسار پر پڑنے والے اس کے ناگہانی تھپڑ نے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلا دیا اور جتنی دیر میں میں سنبھالا لیتا، وہ سختی سے میرا گریبان اپنی مٹھی میں تھام چکا تھا۔ ہم دونوں میں جھگڑے کا منظر دیکھتے ہی چوراہے پر موجود کئی افراد بیچ بچاؤ کی نیت سے ہماری طرف لپکے۔ وہ گریبان تھام کر مجھے گندی گندی گالیوں سے نواز رہا تھا اور میں تذبذب میں مبتلا تھا کہ اس کی بدتمیزی کا اسی کے انداز میں جواب دوں یا اس توہین کو برداشت کر جاؤں۔

اسی اثنا میں بیچ بچاؤ کے لیے آنے والوں میں سے ایک نے ہم دونوں کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کی تو میرے حریف نے بائیں ہاتھ کے جھٹکے سے اسے نہایت اطمینان سے دور اچھال دیا اور غراتا ہوا بولا۔ "خبردار! جو کوئی ہمارے درمیان آیا، یہ پولیس مقابلہ ہے۔"

اس کے وہ الفاظ سنتے ہی آنے والے تیزی کے ساتھ وہاں سے غائب ہو گئے۔ پچھلے چند ایام سے اس علاقے میں پیش آنے والے واقعات نے لوگوں کو اس قدر خوفزدہ کیا ہوا تھا کہ کوئی بھی پولیس والوں کی گواہی، شہادت کے چکر میں پڑ کر مسائل کا شکار ہونے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ دور اچھالا جانے والا ابھی اپنا توازن سنبھالتے ہی وہاں سے

سرپٹ بھاگ کر ایک گلی میں غائب ہوگیا تھا۔

"گریبان چھوڑو! میں واپس جارہا ہوں" صورتِ حال کو اپنے خلاف جاتا دیکھ کر میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نے بلاوجہ مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے میرا تم سے اُلجھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

اس نے مجھے پیچھے کی طرف جھٹکا دیتے ہوئے میرا گریبان چھوڑ دیا۔ اسی لمحے قریب سے ایک فائر کی پُرشور آواز گونجی۔ میرے ساتھ ہی وہ بھی چونک پڑا پھر اس نے اپنے نیفے میں اُڑسا ہوا پستول نکال کر اس طرف دوڑ لگا دی جدھر سے فائر کی آواز سُنائی دی تھی۔

پتا نہیں وہاں کیا ہورہا تھا یا کیا ہونے والا تھا۔ ہر طرف سناٹا ہوگیا تھا اور میں ایک عدد زنّاٹے دار تھپّڑ کھانے کے بعد وہاں اکیلا کھڑا رہ گیا تھا۔ اس لیے مزید کسی آفت سے محفوظ رہنے کے لیے میں نے بھی تیز قدموں سے اپنے فلیٹ کی طرف بڑھنا شروع کردیا۔ فائر کی آواز سے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ رہائشی علاقے میں سڑک ویران ہوگئی تھی کہیں اکّا دکّا افراد زینوں کی آڑ میں کھڑے ہوئے باہر کا جائزہ لینے کی کوشش کررہے تھے۔

کھلی ہوا میں گھومنے کا سودا سر سے اترنے کے بعد میں فلیٹ میں آتے ہی غسل خانے میں گھُس گیا۔ مجھے اپنی توہین پر رہ رہ کر غصّہ آرہا تھا۔ وہ سادہ پوش لاکھ تندرست اور توانا سہی، میں چاہتا تو چند ہی سیکنڈ میں مکّوں اور تھپّڑوں سے اس کا چہرہ اتنا بگاڑ سکتا تھا کہ وہ خود بھی آئینہ دیکھ کر لرز اُٹھتا مگر محمود میرے عزائم کے لیے ایک مضبوط زنجیر بن گیا تھا۔ میں ذرا بھی جارحانہ انداز اختیار کرتا تو محمود فوری طور پر میری نیت پر شبہ کرتے ہوئے مجھے بند کرا دیتا۔

دن کا اُجالا شام کے دُھندلکے میں معدوم ہوا پھر دن بھر کا تھکا ہارا ہوا مشرق خلا کی بیکراں وسعتوں میں کہیں معدوم ہوگیا۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد بھی میں کافی دیر تک یوں ہی بستر پر بے حس و حرکت پڑا رہا لیکن جب اندھیرے کی وجہ سے ذہن پر پریشان کُن خیالات کی یلغار بھیانک روپ اختیار کرنے لگی تو میں نے اُٹھ کر فلیٹ کی تمام ضروری روشنیاں جلادیں۔ میرے پاس سگریٹ ختم ہورہے تھے، دوبارہ باہر جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا اس لیے چابی جیب میں ڈال کر زینوں سے نیچے پہنچا تو کندھے پر رائفل لٹکائے ایک باوردی سپاہی چوکیدار کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

میں نے چوکیدار کو پچاس روپے کا نوٹ دے کر سگریٹ لانے کے لیے کہا تو سپاہی بول پڑا۔ "اسی نوٹ میں سے میرے لیے بھی کچھ مال پانی لیتے آنا۔"

چوکیدار نے بے بسی کے ساتھ میری طرف دیکھا اور میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی مشکل آسان کردی۔

"دوپہر کو قرب و جوار میں کہیں گولی چلی تھی، اس کے بارے میں کچھ پتا چلا؟" چوکیدار کے چلے جانے کے بعد میں نے دوستانہ لہجے میں کانسٹیبل سے سوال کیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے پر نحوست منڈلا رہی ہے۔" وہ بیزاری کے عالم میں بولا تھا۔ "میں شام کو ڈیوٹی پر آیا ہوں، تھانے میں گولی چلنے کی خبر ملی تھی لیکن کوئی پکڑا نہیں گیا۔ معلوم ہوتا ہے کسی نوجوان چھوکرے نے شرارت میں لوگوں کو ڈرانے کے لیے وہ حرکت کی ہوگی۔ اب کسی نے ایسی شرارت کی تو نہیں بچ سکے گا۔"

"پہلے بچ گیا تو اب کیوں نہیں بچ سکے گا؟" میں نے سادگی سے سوال کیا۔

"وقت وقت کی بات ہوتی ہے، اب انچارج صاحب نے یہاں سادہ لباس والے کئی آدمیوں کی ڈیوٹی لگادی ہے جس نے بھی حرامی پن کیا، رنگے ہاتھوں پکڑا جائے گا..." قدرے توقف کے بعد اس نے اچانک ہی ایک غیر متعلقہ سوال کیا تھا۔ "تم اس بلڈنگ کی کون سی منزل پر رہتے ہو؟"

"پہلی منزل پر، مرنے والی کے پڑوس میں۔" میں نے اس کے مقصد کا اندازہ لگانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ!" اس کی آنکھوں میں دلچسپی کے آثار عود کر آئے۔ "بال بچوں کو تکلیف نہ ہو تو رات کو بستر دے دینا، باہر کے دروازے کے سامنے سوجاؤں گا۔ ڈیوٹی بھی ہوتی رہے گی، ذرا سا آرام بھی مل جائے گا۔"

"تمہارے سوتے ہوئے اگر کوئی مجرم آگیا تو ڈیوٹی کہاں سے پوری ہوگی؟" چوکیدار کے واپسی کے انتظار میں وقت گزارنے کی نیت سے میں نے اسے چھیڑا۔

"واردات نیئے آدمی سے نہیں سرکاری وردی سے ڈرتے ہیں۔ میں جاگتا رہوں یا سوجاؤں، میری وردی تو اپنا کام دکھاتی ہی رہے گی نا!" وہ دانت نکال کر بولا جیسے اس نے کوئی بڑا نکتہ بیان کیا ہو۔

"اور رائفل کہاں لے جاؤ گے؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ تم رکھ لینا، صبح واپس لے لوں گا۔" اس نے معصومانہ سادگی سے کہا پھر اپنائیت بھرے لہجے میں بولا۔ "ہم سے بیس بیس گھنٹے ڈیوٹی لی جاتی ہے۔ نو سو بیس روپلی تنخواہ ملتی ہے، نہ بونس نہ اوورٹائم، یہیں حال بچوں کا پیٹ بھرنا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔ اگر ہم لوگ ڈیوٹی پر نہ سوئیں تو گھر جاکر لڑنا جھگڑنا شروع کردیتے ہیں۔ یہاں میری بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی ہے۔ صبح سات بجے دوسرے سپاہی کے آنے سے پہلے ساری ذمّے داری میری ہے، پھر تھانے میں کارگزاری لکھوا کر دس بجے سے پہلے جان نہیں چھوٹے گی۔"

تنخواہ اور ڈیوٹی کے حوالے سے وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، درست تھا لیکن ذمّے داری کے معاملے میں میں اس کی شیخی کو پی گیا۔ "بستر مل جائے گا، تھوڑی دیر کے لیے اندر بھی بیٹھ سکتے ہو، میں اکیلا رہتا ہوں۔" میری پیشکش سن کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ غالباً محمود نے اسے میرے بارے میں اپنے شبہے سے آگاہ نہیں کیا تھا، ورنہ وہ ڈیوٹی پر آتے ہی میری کسی خواب گاہ پر قابض ہونے کے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کردیتا۔

چوکیدار سے سگریٹ لے کر میں اوپر چلا گیا۔ اس دوران میں ... بار میری نگاہ اس سادہ پوش پر بھی پڑی جس نے دوپہر میں مجھے ... تھپّڑ سے نوازا تھا۔ وہ چیلنج کرنے والے انداز میں ایک کیبن ... اوٹ میں لڑاکا مرغ کی طرح سینہ پھُلائے کھڑا ہوا تھا۔ اپنی ... کھوپڑی ٹھنڈی رکھنے کے لیے میں نے دوبارہ اُدھر دیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے رہ رہ کر جہانگیر پر غصّہ آرہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں ... اپنے فلیٹ میں محصور کردیا گیا تھا۔ اس دوران میں کوئی ناگہانی مشکل ... پیدا ہوسکتی تھی یا مجھے کسی چیز کی ضرورت پیش آسکتی تھی لیکن میری ... اسلحے لے جانے کے بعد اس نے نہ مجھے فون کیا تھا اور ... ہی فیکٹری سے واپسی پر چکّر مارنے کی زحمت کی تھی۔

ساڑھے نو بجے سیما کے فلیٹ کی حفاظت پر مامور باوردی سپاہی مجھے اپنی میزبانی کا شرف بخشنے کے لیے آپہنچا۔ "دس گیارہ بجے میرا سونے کا وقت ہوجاتا ہے اس لیے سوچا کہ سونے سے پہلے تم سے ہی تھوڑی سی گپ شپ کرلی جائے۔ باہر تو ایسا سنّاٹا ہوگیا ہے جیسے موت اب بھی بے پاؤں وہاں منڈلا رہی ہو۔ پڑھے لکھے لوگ بڑے بزدل ہوتے ہیں، ایک مرتا ہے تو سیکڑوں ڈر کر گھروں میں بند ہوجاتے ہیں۔ جاہلوں کا علاقہ ہوتا تو یہاں رات بھر میلہ لگا رہتا۔ اور کچھ نہیں تو لوگوں کو وہ گھر ہی دیکھنے کا شوق ہوتا ہے جہاں واردات ہوئی ہو۔"

وہ ڈرائنگ روم میں جوتوں سمیت قالین پر آیا پھر اپنی رائفل احتیاط سے دیوار کے ساتھ کھڑی کرکے جوتوں کے بند کھولنے لگا تو میں نے اسے ٹوکا کہ وہ جوتے نہ اتارے، وہ قالین جوتوں سے روندے جانے کے لیے ہی بچھایا گیا تھا۔ اس پر وہ ہنس کر بولا تھا۔ "مجھے معلوم ہے جی! کوارٹر میں ضرور رہتا ہوں لیکن بڑی بڑی کوٹھیوں اور بنگلوں میں اپنے افسروں کے ساتھ تفتیش کے لیے جاتا رہتا ہوں، مجھے بھی تو ذرا اپنے پیروں کو آرام دینا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے جوتے اتارے۔ پیر باہر آتے ہی نہ جانے کب سے جوتوں میں اڑسے ہوئے میلے موزوں میں سے بدبو کا ایک تیز بھبکا پیدا ہوا اور وہ موزے جوتوں میں ڈال کر، ایک آرام دہ صوفے پر اس شان سے بیٹھ گیا کہ اس کے دونوں پیر بھی اوپر ہی تھے۔

"سنتری جی! تمہارے جوتوں میں سے بڑی بدبو آرہی ہے۔" کمرے میں مسلسل پھیلتی ہوئی بدبو سے مجبور ہوکر میں اسے جتلائے بغیر نہ رہ سکا۔ میرے لیے وہ بو ناقابلِ برداشت ہورہی تھی۔

"وہ تو آتی ہی رہتی ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "کچے چمڑے کے جوتے بدبو نہیں تو پسینے میں بھیگ کر خوشبو دیں گے؟ یہ تو ہمارا ہی دل گردہ ہے کہ انھیں وردی کے ساتھ ہر وقت پہنے رہتے ہیں۔"

جس وقت زینوں سے نیچے میں نے اسے فلیٹ میں آنے کی دعوت دی تھی تو میرا خیال تھا کہ اس سے سب انسپکٹر محمود کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا لیکن بدبو سے اتنی طبیعت مکدر ہوئی کہ کئی منٹ تک میں اس سے کوئی بات ہی نہ کرسکا۔ بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ میں نے اسے اس کی غلطی کا احساس دلانے کے لیے جو کچھ کہا، اسے وہ اپنی ہمدردی میں کیا جانے والا تبصرہ سمجھ کر گول کرچکا تھا۔ اس کے بعد ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا کہ میں خود اس کے جُوتے اُٹھا کر باہر رکھ دیتا اور وہ عمل میرے بس سے باہر تھا۔

"آؤ، باہر لابی میں بیٹھیں گے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"بسم اللہ۔" وہ اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے پورے خلوص کے ساتھ اپنے جوتوں کی طرف بڑھا تھا۔

"نہیں نہیں۔" میں نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ "رائفل اور جُوتے یہیں رہنے دو، دونوں کو تھوڑی سی تازہ ہوا مل جائے گی۔"

"جیسے تمہاری خوشی!" اس بار اس نے میری رضا کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور میرے ہمراہ لابی میں آبیٹھا۔ وہاں آنے کے بعد فلیٹ کی پوری مکانیت اس کے سامنے آگئی تھی اس لیے کچھ دیر تک چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد اس نے رائے دی کہ وہ فلیٹ ایک آدمی کی ضروریات سے بہت زیادہ تھا۔ اس بار میں نے اس کا تبصرہ سُنا اَن سُنا کردیا اور اس کے پیشہ ورانہ معاملات کی بات چھیڑ دی۔

اس سے گفتگو کے دوران مجھے احساس ہوا کہ ملازمت نئی ہو تو ہر شخص پُرجوش اور خوش نظر آتا ہے لیکن جیسے جیسے نوکری پرانی ہوتی جائے، ساری خوشی ماند پڑجاتی ہے حتیٰ کہ ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جب اپنے ادارے کی مسرت بخش باتوں میں بھی انسان کیڑے نکالنے لگتا ہے۔ وہ خاصا سینئر سپاہی تھا اور اوپر سے نیچے تک کسی ایک بھی افسر یا ساتھی سے خوش نہیں تھا۔

باتوں باتوں میں جب محمود کا ذکر آیا تھا تو اس نے بُرا سا مُنہ بنایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دوسرے افسران چھوٹے بڑے ہر کیس میں سودے بازیوں کی وجہ سے بدنام ہوگئے تھے جب کہ محمود بہت چالاک تھا۔ چھوٹے موٹے مقدمات میں سختی کے ساتھ قانون کے مطابق کام کرتا لیکن بڑے معاملات میں رازداری کے ساتھ سودے کرتا تھا۔ اپنی ایمانداری کا ڈھکوسلا برقرار رکھنے کے لیے کرائے کے مکان اور ذاتی اسکوٹر کا ڈراما رچایا ہوا تھا۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ وہ جب چاہتا نئے ماڈل کی قیمتی کار اور کوئی بھی شاندار مکان خرید سکتا تھا۔

تھوڑی سی محنت کے بعد محمود سے اس کی پرخاش کا سبب بھی سامنے آگیا۔ محمود جب سے اس تھانے میں آیا تھا اس کے ساتھ اللہ داد مستقل طور پر لگا ہوا تھا جس کا انتخاب محمود نے خود کیا تھا۔ وہ سب کے سامنے برملا کہتا تھا کہ اللہ داد اپنے تمام ساتھیوں سے زیادہ ذہین اور فرض شناس تھا یا بالواسطہ طور پر اس نے اپنے تھانے کے تمام سپاہیوں کو غبی اور نکما قرار دے دیا

تھا جس کی وجہ سے کوئی اُسے پسند نہیں کرتا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ محمود لین دین کے سارے معاملے اللہ داد کے ذریعے طے کرتا تھا تا کہ کوئی گڑبڑ ہو جائے تو سارا الزام اسی کے سر دھرا جا سکے اور اس کا دامن صاف رہے جب کہ اللہ داد اس طرح خود کو بہت اہم سمجھتے ہوئے خوش رہتا تھا۔ اسی لیے ان دونوں میں نبھ رہی تھی۔

صاف ظاہر تھا کہ اس کی وہ تمام ہرزہ سرائی اللہ داد سے پیشہ ورانہ رقابت پر مبنی تھی ورنہ اپنے دل میں وہ بھی جانتا تھا کہ محمود بے باک اور ایماندار افسر تھا۔

وہ اپنی رات میرے ہی فلیٹ میں گزارنے کے موڈ میں نظر آ رہا تھا لیکن میرے لیے یہ بات ناقابلِ قبول تھی۔ اسے اپنے سر پر مسلط کر کے میں اپنی اس واحد آزادی سے بھی محروم ہو جاتا جو فون کی صورت میں مجھے میسر تھی۔ خدا خدا کر کے میں ساڑھے دس بجے بستر دے کر اسے باہر نکالنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے اپنی بھری ہوئی رائفل اور کارتوسوں کی پیٹی میرے ہی پاس چھوڑ دی تھی۔ اس وقت وہ دونوں چیزیں میرے لیے نعمتِ بے بہا سے کم نہیں تھیں کیونکہ اپنا تمام غیر قانونی اسلحہ جہانگیر کے حوالے کر دینے کے بعد میں بالکل نہتا رہ گیا تھا۔ کسی بُرے وقت میں وہ سرکاری اسلحہ میرے کام آ سکتا تھا۔

اس سے فرصت پاتے ہی میں نے کچن اور فریج میں موجود اشیا کی مدد سے اپنی آتشِ شکم سرد کی اور اسکاچ کا ایک چھوٹا سا گلاس لے کر بستر پر دراز ہو گیا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی، ذہن محمود، سیٹھ حبیب اور اپنے کاغذات میں اُلجھا ہوا تھا۔ وقت تیزی کے ساتھ گزرتا جا رہا تھا اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ چیف اگر اس رات محمود کی تحویل سے میرے کاغذات خوش اسلوبی کے ساتھ نکال لینے میں کامیاب نہ ہوا تو اگلی صبح میری زندگی کے بدترین دور کا آغاز ثابت ہوگی۔

صبح کے تین بجے تک میں فون کی گھنٹی یا کسی کے قدموں کی چاپ کے انتظار میں بستر پر بے چینی کے ساتھ پہلو بدلتا رہا لیکن اس رات ہر طرف ایک مرگ آسا سکوت چھایا ہوا تھا۔ صبح پے در پے ہر ایک کے فون چلے آ رہے تھے لیکن جب مجھے کسی اچھی خبر کا انتظار تھا تو سب کہیں جا سوئے تھے۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر مجھے سب انسپکٹر محمود کے ہاتھوں ہی کیفرِ کردار کو پہنچنا تھا تو میرے لیے اپنی زندگی کا سب سے بڑا حساب بے باق کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ رات اسی طرح مہیب خاموشی میں گزر جاتی تو اگلی صبح میں نتائج کی پروا کیے بغیر دلدار آغا کو اس کے گھر کی دہلیز پہ جہنم واصل ضرور کر دیتا کیونکہ میری زندگی میں اصل زہر اسی ملعون نے گھولا تھا۔ میری ذاتی پرخاش کے علاوہ وہ شی کا مقامی سربراہ اور موت کا ایک بڑا سوداگر بھی تھا جسے سکتی

ہوئی، کربناک موت سے آشنا کرنا میرے بس سے باہر تھا کیونکہ میں اسے ایک پنجرے میں پال کر ہیروئن کا عادی نہیں بنا سکتا تھا لیکن میں اپنے آہنی ہاتھوں کے ایک ہی وار سے اس کی گردن توڑ دینے کی طاقت ضرور رکھتا تھا۔

نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ اگلی صبح رات کی ڈیوٹی ختم کرنے والے سپاہی کی بجائی ہوئی گھنٹیوں سے ہڑبڑا کر بیدار ہوا تو سر بوجھل تھا، دماغ ماؤف اور اعصاب شکستہ، کیونکہ وہ رات کسی اچھی خبر کے بغیر گزر گئی تھی اور میری حالت کسی ایسے قیدی کی سی ہو گئی تھی جسے موت کی سزا سُنا دی گئی ہو لیکن اسے یہ نہ بتایا گیا ہو کہ اسے کتنے گھنٹوں، دنوں یا سالوں کے بعد سولی چڑھایا جانے والا تھا۔

سپاہی میرا دیا ہوا بستر اپنی بغل میں دبائے، خوابیدہ آنکھوں کے ساتھ دروازے پر میرا منتظر تھا تا کہ بستر لوٹا کر اپنی رائفل کندھے سے لٹکائے اور تھانے لوٹ جائے کیونکہ اس کی جگہ لینے والا دوسرا سپاہی آ چکا تھا۔ اپنے ساتھی کے خوشگوار تجربے کی روشنی میں وہ بھی میرا تعاون حاصل کرنے کی امید میں اس کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

ان دونوں سے قدرے جھلّائے ہوئے انداز میں فارغ ہونے کے بعد میں نے طویل غسل کیا اور اپنے لیے چائے کی پیالی تیار کر کے فون کے قریب جا بیٹھا۔ میرے ذہن پر سنسناہٹ طاری تھی جو کسی بڑے واقعے کے رونما ہونے سے پہلے بعض حسّاس لوگوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

میں نے کئی بار اپنے رات کے فیصلے پر غور کیا لیکن ذہن نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ سیٹھ حبیب کو فون کر کے اس سے دریافت کروں کہ اس کے لمبے چوڑے دعوے کیا ہوئے؟ رات کسی سود و زیاں کے بغیر گزر گئی تھی، اسی کے ساتھ بات بھی گزر گئی تھی اور محمود کو اپنی کارروائی کی آزادی مل چکی تھی۔

آخرکار میں نے مغلوب ہو کر دلدار آغا کے گھر کا نمبر ملا ہی لیا۔ چار مسلسل گھنٹیوں کے بعد جب ریسیور پر غزالہ کی جانی پہچانی ہیلو کی آواز سنائی دی تو میرے دل پر غم ناک سی خوشی طاری ہو گئی۔ غم اس بات کا تھا کہ وہ میری نہیں پرائی ہو چکی تھی، میری دسترس سے باہر تھی اور خوشی اس بات کی کہ میرے کانوں نے ایک بار پھر اس کی آواز سُن لی تھی۔

"تم کیسی ہو خاتون؟ تمھارا نام کیا ہے؟" میں نے اسی بدلی ہوئی بھاری آواز میں سوال کیا جس میں پچھلی صبح اس سے بات کی تھی۔

"تت... تم نے پھر فون کیا؟" وہ فوراً ہی میری آواز پہچان گئی تھی اور اس کے لہجے میں خوف سمٹ آیا تھا۔ "آخر تم کون ہو اور کیوں ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے ہو؟"

"تمھارے ڈی ڈی ٹی یا دلدار آغا کا ڈسا ہوا ایک شکار ہوں" میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ "تم نے اخباروں میں سیما کے قتل کی خبر

پڑھ ہی لی ہو گی، وہ میری محبوبہ تھی اور اسے ڈی ڈی ٹی نے مارا ہے" میری آواز میں غیر ارادی طور پر کرب پیدا ہو گیا۔ "میں نے سوچا کہ وہ قاتل ہے، میں اسے مار ڈالوں گا لیکن اب تمھارا خیال آتا ہے، اسے مارا تو یہ سزا تم کو ملے گی۔ وہ زندگی کے سارے جھمیلوں سے آزاد ہو جائے گا۔ سزا تمھیں نہیں، اسے ملنی چاہیے۔ وہ کسی آرزو کی حسرت میں سسکتا اور تڑپتا رہے لیکن زندہ رہے۔ یہی اس کی سزا ہو سکتی ہے جو میں اسے دینا چاہتا ہوں۔"

"میں نے سب کچھ پڑھ لیا ہے تمھاری پچھلی کال نے انھیں خوفزدہ کر دیا ہے۔ انھوں نے رات گھر سے باہر گزاری ہے اور ابھی تک واپس نہیں لوٹے تمھیں ان پہ رحم نہیں آتا تو کم از کم مجھ پر اور میری گھریلو زندگی پر ہی رحم کرو۔"

"تم سے رشتہ کیا ہے میرا؟" میں نے تڑپ کر بے ساختہ کہا۔ "تمھیں ایک اجنبی سے رحم کی بھیک مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی!"

"سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟" گہرے گہرے سانسوں کے درمیان اس کی اضطراری آواز ابھری۔ "تم میرے اس سوال کا جواب نہیں دو گے تو میں قسم کھاتی ہوں کہ فون بند کر دوں گی۔"

میں چند ثانیے تک خاموش رہا۔ ریسیور پر اس کے چڑھتے ہوئے سانسوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دلدار گھر پہ نہیں تھا اور وہ کسی وجہ سے شدید ہیجان میں مبتلا ہو چکی تھی۔

"میں عاشق ہوں... ایک ناکام اور نامراد عاشق!" میں نے توقف کے بعد اسی بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ "میری محبوبہ کو تمھارے دلدار نے مجھ سے چھین لیا..."

"یہ تم کس کی بات کر رہے ہو؟" میرے ذومعنی فقروں نے اسے تڑپا کر رکھ دیا۔ اس نے میری بات کاٹ کر تیز اور متجسس لہجے میں وہ اہم سوال کیا تھا۔

"اپنی محبوبہ کی۔" غزالہ کے وجود میں کسک پیدا کر کے میرے دل کو خاصا سکون ملا تھا اس لیے میرا لہجہ بھی پُرسکون ہو گیا تھا۔ "کیا اس نے تم کو بتایا نہیں کہ تمھارے ڈی ڈی ٹی نے میری سیما کو مار دیا؟ میں نے تمھیں اتنا کچھ بتا دیا، اب کچھ تم بھی اپنے بارے میں بتاؤ تا کہ میں تم سے گفتگو کو آگے بڑھا سکوں۔"

"تم جھوٹے ہو!" اس کے بے ساختہ الزام پہ میں بھونچکا رہ گیا۔ "میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو!"

"ایک اجنبی سے اس طرح بات کرتے ہوئے تمھیں شرم آنی چاہیے!" میں نے نشتر زنی کی۔ اس وقت اسے تڑپانے میں مجھے لطف آ رہا تھا کیونکہ مجھ سے بے وفائی نہ کر کے بھی وہ میری وفادار نہ رہ سکی تھی۔ "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم دلدار کی بیوی ہو اور یہ بھی تم نے کل خود ہی بتایا تھا۔ اس سے آگے بھی کچھ بتاؤ، تمھارا نام کیا ہے؟ عمر کتنی ہے؟ صورت کیسی ہے؟ ڈی ڈی ٹی تم کو کتنا چاہتا ہے؟ یہ سب بتاؤ گی تب ہی میں فیصلہ کر سکوں گا کہ دلدار کو زندہ رہنا چاہیے یا اس کا مر جانا ہی بہتر ہو گا؟ اس سے کس کس کو فیض پہنچ سکے گا؟"

"تم پہیلیاں کیوں بُجھوا رہے ہو؟ کھُل کر بات کیوں نہیں کرتے؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

"میری ہر بات آئینے کی طرح صاف ہے اگر تم عمر رسیدہ اور بدصورت عورت ہو یا دلدار تم سے محبت نہیں کرتا تو میں اسے مار دوں گا۔ اگر تم دلکش اور جوان ہو، دلدار تمھیں دیوانہ وار چاہتا ہے تو میں اسے زندہ رکھوں گا اور تمھیں اغوا کر لوں گا۔ اس نے میری محبت کا خون کیا، میں اس کی محبت چرا لوں گا۔ اس نے میری خوشیاں چھینیں، میں اس کو ایک چلتا پھرتا مزار بنا کے رکھ دوں گا۔ شرط یہی ہے کہ تم اپنے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ تا کہ اجنبیت دور ہو۔ اب دلدار کی زندگی کا انحصار تم پر ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو تم کہو گی، اس پر یقین کر لوں گا اور اسی کی بنا پر اپنا فیصلہ کر دوں گا۔ تمھاری کہی ہوئی کسی بات کی تصدیق کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

"تم بہت چالاک اور مکار ہو۔" اس کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "تمھاری بتائی ہوئی کوئی بھی صورت مجھے قبول نہیں۔ نہ میں جھوٹ بول کر انھیں مروانے کا تصوّر کر سکتی ہوں، نہ سچ بول کر انھیں زندہ دیکھ سکوں گی..."

"تم سچ بول کر تو دیکھو، وہ زندہ رہے گا۔" اس کی الجھی الجھی لیکن بامقصد بات سن کر خوشی سے میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ لفاظی کیے بغیر اپنے بارے میں حقیقت کا اظہار کیا تھا۔

"ایسی زندگی کا کیا فائدہ کہ میں انھیں دیکھنے کو ترستی رہوں؟ میں تمھاری قید کو قبول کر لوں تو ایسی زندگی کو وہ خود ٹھکرا دیں گے۔ سینے پر زخم لے کر کون زیادہ دن زندہ رہا ہے؟"

"میں زندہ ہوں۔" میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "اپنے دشمن کو اچھی طرح پہچان لینے کے باوجود میں نے ابھی تک اس پر وار نہیں کیا ہے۔ محبت کبھی کبھی قربانی بھی طلب کر لیتی ہے۔ اپنی آزادی کی قربانی دے کر تم دلدار کی زندگی خرید سکتی ہو، یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ اپنے لیے اور اپنی خوشیوں کے لیے ہر ایک جی لیتا ہے لیکن کسی اور کی زندگی کے لیے پابندیوں کے ساتھ، سمجھوتوں کے تحت زندگی گزارنا بہت بڑی بات ہے جو شاید تمھارے بس سے باہر ہے۔ تم اپنے سوا کچھ سوچ ہی نہیں سکتیں۔ بس زندہ رہنا چاہتی ہو۔ خواہ بیوی بن کر رہو یا بیوہ ہو کر!"

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟ خدا کے لیے مجھے بتا دو کہ تم کون ہو؟" اس کی تھکی ہوئی اور دل گرفتہ آواز ابھری۔

"تم بار بار ایک ہی طرح کے سوال دُہرا رہی ہو۔ سیدھی سی بات ہے کہ میں ڈی ڈی ٹی سے انتقام لینا چاہ رہا ہوں۔"

"تمھارا یہی انتقام بہت بڑا ہے کہ تم نے انھیں خوفزدہ کر دیا

ہے اور میرے دل میں وسوسے پیدا کر دیے ہیں۔ اگر تم ہمیں بھول بھی جاؤ تو شاید برسوں تک ہمارا کھویا ہوا سکون واپس نہ لوٹ سکے۔"

"وہ مجرم ہے، اس کا ضمیر مجرم ہے، اسی لیے وہ گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ تمھارے درمیان پیدا ہو جانے والی خلیج کی بنا پر مجھے شبہ ہے کہ اس نے اپنا اصل روپ چھپا کر تمھیں بھی دھوکے سے اپنایا ہے ورنہ ایک اجنبی کی بکواس سے دو چاہنے والوں کے درمیان کبھی کوئی خلیج پیدا نہیں ہوتی وہ ایک دوسرے کو سہارا دینے کے لیے اور قریب آجاتے ہیں۔"

"میرے مالک!" فون پر غزالہ کی دردناک کراہ اُبھری۔"میں کہاں جاؤں؟" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔"تمھارے یہ رمز اور کنائے مجھے اندر سے لہولہان کیے دے رہے ہیں۔ تم کوئی گھر کے بھیدی معلوم ہوتے ہو۔"

"یہ رمز اور کنائے نہیں، سامنے کی باتیں ہیں۔" میں نے مختصر سی بے رحمانہ ہنسی کے ساتھ کہا۔"ہو سکتا ہے کہ کبھی تم نے بھی کسی کو اندر سے زخمی کیا ہو اور یہ اسی جرم کا شاخسانہ ہو . . ."

"میں شرمندہ ہوں . . . میں شرمندہ ہوں ڈینی!" وہ اچانک بلک کر رو پڑی۔ اس کا دلدوز گریہ سُن کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔"تم مجھ سے کیوں کھیل رہے ہو؟ کیوں سِسکا رہے ہو؟ کہہ دو کہ تم کسی سیما کے عاشق نہیں ہو، تم ڈینی ہو!" وہ ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان کہتی رہی اور میں اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر پتھر کی کسی چٹان کی طرح ساکت اور بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

"بولو! تم بولتے کیوں نہیں؟" روتے روتے وہ اچانک بے بسی کے ساتھ بولی۔

"کیا بولوں؟" میں نے اپنی اصلی آواز اور سپاٹ لہجے میں کہا۔"میرے ڈینی ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مسز دلدار! دونوں نام ایک دوسرے کے لیے اجنبی اور راستے جدا ہیں۔ یہ نہ سوچنا کہ میں تمھارا پیچھا کر رہا ہوں۔ دلدار آغا ایک بھیڑیا ہے، میں اس کے پیچھے لگا ہوا ہوں، وہ شی کا مقامی سربراہ ہے۔ میں چاہتا تو نہ جانے کتنی مرتبہ اسے ہلاک کر چکا ہوتا لیکن ہر بار تمھاری التجا آڑے آگئی۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اسے اسی وقت کیفرِ کردار کو پہنچاؤں گا جب وہ تمھارے سامنے پوری طرح بے نقاب ہو جائے گا۔ اس کی زندگی تمھاری خوشنودی سے وابستہ ہو کر رہ گئی ہے۔ مجھے تمھارے الفاظ کا پاس اس لیے ہے کہ کبھی ہم دونوں بھی ایک دوسرے کے شناسا تھے۔ مجھے وہ دن اور لمحے یاد ہیں جب کہ تم انھیں یکسر فراموش کر چکی ہو، اس لیے مجھے ڈینی نہ کہو، بے نام ہی رہنے دو!"

"وہی لمحے تو میری بھی زندگی ہیں ڈینی! ان یادوں کا تصور کرتے ہی دل میں ایسی ہُوک سی اٹھتی ہے جیسے میرا آشیانہ بکھر گیا ہو، میں اپنے ماحول سے گھبرا کر جدھر بھی سر اٹھاتی ہوں، تو مجھے دور دور تک کوئی غم گسار یا ہم نوا نظر نہیں آتا۔ آسمان کی بیکراں وسعتوں میں غول سے بچھڑے ہوئے اُس پنچھی کی طرح اکیلی اور ہراساں رہ گئی ہوں جس کے پَروں میں آسمان کی بلندی تک پرواز کی طاقت ہو نہ نہ زمین پر گرنے کا حوصلہ۔ تم نے مجھ پر احسان کیا جو دوبارہ فون کر لیا۔ آج تمھارے تیور ہی کچھ اور تھے۔ مجھے تم پر کئی بار شبہ ہوا، میں نے اپنے اندر کی آواز پر تمھیں ڈینی کہا اور دیکھ لو کہ تم ڈینی ہی ہو! میری چاہت، محبت اور جذبوں کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت چاہتے ہو؟"

"ایسے افسانوی کلمات مُنہ سے نہ نکالو . . ." میں نے اسے ٹوکنا چاہا لیکن اس نے میری بات اُڑا دی۔

"یہ سچ ہے ڈینی! تم میرا سینہ چیر کر دیکھ سکتے ہو!" اس کی آواز میں بلا کا درد پنہاں تھا۔

"تم میری دسترس سے باہر ہو غزالہ! تم کسی اور کی ہو چکی ہو۔" ریسیور پر اس کی ہلکی سی غم زدہ ہنسی کی آواز ابھری۔"تم جانتے ہو کہ میں کس طرح حالات کا شکار ہوئی لیکن شادی ہی تو محبت کی معراج نہیں ہوتی۔ شادی کے لمحوں میں موت کسی کو آ لے تو کیا محبت مر جاتی ہے؟ یہ تو اور امر ہو جایا کرتی ہے۔ چاہنے والے تو زندگی بھر ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ تم مجھے دلدار کا طعنہ نہ دو۔ وہ غلطی مجھ سے ہوئی تھی اور ہو گئی لیکن تم تو مجھے اکیلا نہ چھوڑو۔"

اس کی زبان سے پہلی بار غلطی کا اعتراف سُن کر میرے سینے میں جلتی ہوئی آگ پر ٹھنڈک کے کچھ چھینٹے پڑے۔"مگر میں کسی کا کھلونا تو نہیں بن سکتا غزالہ!" میں نے آہستہ سے کہا۔"میرا اور تمھارا اب کوئی بھی تو رشتہ نہیں۔ ہم آسمانی روحیں نہیں ہیں جو رشتوں کے بغیر محبت کو پروان چڑھاتی ہیں۔ تمھارا شوہر، تمھارے قریب میرا سایہ تک برداشت نہیں کر سکے گا نہ میں خندہ پیشانی کے ساتھ اس سے مل سکوں گا۔"

"وہ پہلے کی باتیں تھیں جب تم اجنبی دشمن بن کر بول رہے تھے۔" اس کی ہچکیاں بتدریج بند ہو چکی تھیں اور آواز بھی رفتہ رفتہ اعتدال پر آتی جا رہی تھی۔"شادی کے بعد میں نے خود کو بہت بدلا ہے اور ان گنت سمجھوتے کیے ہیں لیکن میں اپنی جبلت کو نہیں بدل سکی جس میں تجسس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ میں نے دلدار کی کچھ مشتبہ حرکتیں دیکھی ہیں۔ اس کے مکان کے گرد ہر وقت ان گنت مسلح افراد بکھرے رہتے ہیں جو گھر کے قریب کسی کار کا ٹائر پھٹنے پر بھی یوں نمودار ہوتے ہیں جیسے زمین سے اُبل پڑے ہوں۔ اس کے پاس نامعلوم لوگوں کے فون آتے ہیں جن سے وہ بدلی ہوئی آواز میں ناقابلِ فہم کوڈ ورڈز میں باتیں کرتا ہے۔ جس رات وہ پنڈلی پر زخم کھا کر آیا، میں نے اس کی سیاہ پجیرو کی باڈی میں گولیوں کے کئی سوراخ دیکھے مگر وہ کہتا رہا کہ اس کی پنڈلی میں ایک سریا گھسا ہے۔ گولی کے زخم کے بارے میں تمھارا انکشاف میرے دل نے فوراً قبول کر لیا تھا پھر کل تم سے بات ہونے کے بعد وہ کافی دیر تک کئی لوگوں سے بات کرتا رہا اور غیر حاضری کی مدت کے بارے میں مجھے کچھ بتائے بغیر گھر سے چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے بازار جانا چاہا تو ڈرائیوروں نے بتایا کہ گھر میں موجود تینوں گاڑیاں خراب کھڑی ہیں۔ ٹیکسی سے جانے کا ارادہ کیا تو چوکیدار نے منع کر دیا کہ شہر کے حالات خراب ہیں، صاحب نے ٹیکسی میں سفر سے منع کیا ہے۔ پتا نہیں فون کا سلسلہ کیسے بحال رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ جاتے جاتے مجھے اس گھر میں قید کر گیا ہے۔"

"پھر یقین رکھو کہ ہماری ساری گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہو گی۔ وہ آکر ٹیپ سُنے گا اور پھر تم پر تشدد کا آغاز ہو جائے گا۔" میں نے اس کے لیے اپنے دل میں رحم کے جذبات اُبھرتے ہوئے محسوس کیے۔

"تشدد سے میں نہیں ڈرتی لیکن اس کا کوئی امکان نہیں۔ انگلینڈ میں اپنی رُوپوشی کے دوران میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں ضرورت کے وقت میں انسٹرومنٹ سے ریکارڈنگ والے تار ہی نکال دیتی ہوں۔"

"تو کیا تم نے پہلے سے تار نکالے ہوئے تھے؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"تمھارا پہلا سوال سنتے ہی آواز پہچان کر تار نکال دیے تھے۔" اس نے بتایا۔"وہ ریکارڈر پر ایک فقرہ سُن کر مجھ سے پوچھے گا تو کہہ دوں گی کہ میں نے بے ہُودہ کال سمجھ کر فون بند کر دیا تھا۔"

"تم اپنے شوہر کے لیے جمع غائب کے بجائے واحد غائب کا صیغہ استعمال کر رہی ہو اور اس کے بہت سے عیب بھی گنوا چکی ہو، اس کا مطلب ہے کہ اب تمھیں اپنی غلطی کا پورا پورا احساس ہو گیا ہے اور شاید تم اس کی تلافی بھی کرنا چاہتی ہو؟" میں نے جذبات سے عاری لہجے میں پوچھا۔

"یہ اسی وقت ممکن ہے جب تم مجھے اپنے لیے گالی تصور نہ کرو۔"

"گالی تو تم میرے لیے آج بلکہ اس لمحے تک بنی ہوئی تھیں مگر اب گلال بن جاؤ گی۔"

"اچھی طرح سوچ لو ڈینی!" اس کی آواز گمبھیر ہو گئی۔"ایسا نہ ہو کہ بعد میں کسی وجہ سے تمھیں اپنے اس جذباتی فیصلے پر پچھتانا پڑے۔ میں تمھیں بہت قریب سے دیکھ چکی ہوں۔ کسی بھی وقت تم نے مجھ سے ذرا بھی نظریں بدلیں تو میں برداشت نہیں کر سکوں گی، زہر کھا کر جان دے دوں گی۔"

"تم مطمئن رہو غزالہ! میں بھول جاؤں گا کہ تم سے کبھی کوئی بھول بھی ہوئی تھی۔" میں نے آنکھیں موند کر جذباتی لہجے میں کہا۔"صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا ہوا نہیں کہتے لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں۔ تم صرف دو دن اور گزار لو، ڈی ڈی کو اپنے اوپر شبہ کرنے کا موقع نہ دو، نہ میرا نام زبان پر لانا۔ میں ایک بکھیڑے میں اُلجھا ہوا ہوں۔ اس سے خیریت سے نمٹ گیا تو پھر سکون سے آئندہ کے لیے کچھ طے کریں گے۔"

"کیسا بکھیڑا؟" میرے سرسری انکشاف پر وہ پریشان ہو گئی۔ وہی ایک ایسی ذات رہ گئی تھی جو میری کسی بھی پریشانی پر پریشان ہو سکتی تھی ورنہ دوسرے سارے ہمدرد اپنے مزاجوں کے قیدی تھے۔

"ابھی مجھ کو خود صحیح اندازہ نہیں۔" میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔"صورتِ حال کچھ واضح ہو گی تو کچھ بتا سکوں گا۔"

"سیما والا چکر تو نہیں ہے؟" اس کا تجسس بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

"ارے نہیں!" میں ہنس پڑا۔"میرے بکھیڑے کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"لیکن تم تو اس کی عاشقی کے دعوے دار بن کر سامنے آئے تھے؟" وہ خود ہی سیما کی طرف بہک گئی۔

"سیما کو میں نے تمھارے لیے ایک استعارہ سمجھ لیا تھا ورنہ بات صرف اتنی تھی کہ سیما میری پڑوسن تھی۔ ڈی ڈی اسے قتل کر کے فرار ہوا تو میں نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھ کر پہچان لیا تھا اس لیے سیما کا عاشق بن کر اس کے سر پر سوار ہو گیا تھا ورنہ اس بیچاری سے تو میری واجبی سی واقفیت تھی۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ویسے اتنا ضرور بتا دوں کہ تمھارے حوالے سے میں اکثر بے چاریوں کا ذکر سنتی رہی ہوں، یہ بھی تو اُن میں سے نہیں تھی!" دل کا غبار نکل جانے کے بعد پہلی بار اس کی آواز میں شوخی کی جھلک آئی تھی۔

"اس کے بارے میں تمھارا لنگڑا گھوڑا زیادہ صحیح معلومات فراہم کر سکے گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ابھی تمھیں وعدہ کیے چند منٹ بھی نہیں ہوئے ہیں لیکن پھر تم اس کا طعنہ دے بیٹھے!" اس کا لہجہ یک بیک شکایتی اور پژمردہ ہو گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے واقعی غلطی سرزد ہوئی تھی۔

"یہ طعنہ نہیں، مذاق کی بات تھی۔ فی الحال تو وہ تمھارا ہی ہے اور لنگڑا بھی میں نے بس گھوڑے کا اضافہ کیا تھا۔ وہ سیما کے بارے میں زیادہ جانتا تھا۔ وہ شادی شدہ عورت تھی۔"

"وہ جو کچھ بھی ہو، کم از کم اب میرا نہیں ہے۔" اس کی مضبوط آواز اُبھری۔"اس کے ساتھ سمجھوتے کا کچھ عرصہ ذرا چالاکی سے گزارنا ہو گا۔ وہ اب مجھے چھو بھی نہ سکے گا۔"

"مدت کے بعد یہ مبارک لمحے محسوس ہوئے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ ہم یونہی باتیں کرتے رہیں لیکن فون بہت دیر سے انگیج ہے۔ میرے پاس ایک اہم کال آنے والی ہے۔"

"دیکھو ڈینی! مجھے ہمیشہ اسی طرح چاہتے رہنا۔" اس کی فرطِ جذبات سے رُندھی ہوئی آواز سُنائی دی۔"میرے لیے تمھاری چاہت میں ذرہ برابر بھی کمی آئی تو میں بے موت مر جاؤں گی۔"

"وقت آیا تو تم دیکھ لو گی کہ ہم نے اکٹھے جو خواب دیکھے تھے

وہ کھوکھلی بنیادوں پر نہیں تھے۔ میں نے تمھیں کھو کر دوبارہ پایا ہے، اس کے بعد میں تمھیں ہرگز بے موت نہ مرنے دوں گا۔۔۔"

"بس بس! زیادہ نہ بولو۔" وہ سامنے ہوتی تو یقیناً میرے ہونٹوں پر اپنا نرم و گداز ہاتھ رکھ دیتی۔ "دل کی بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو دل ہی میں رہیں تو بہتر ہوتی ہیں۔ ان کا زبان پر آنا بعض اوقات کاتبِ تقدیر کو پسند نہیں آتا۔ مجھے تم پر اور تمھاری چاہت پر پورا بھروسا ہے۔ بس اپنا دھیان رکھو، ہم بہتیرے مشکل دن گزار چکے ہیں۔"

چند اور فقروں کا تبادلہ ہوا۔ وہ پتھروں کی ایک بے جان حویلی میں اپنے احساسات کی قیدی تھی اس لیے باتوں کو غیر ارادی طور پر طول دیے جا رہی تھی مگر میں نے نرمی سے سلسلہ منقطع کر دیا۔

وہ وقت پر لگا کر اُڑا تھا۔ میری چائے کی پیالی رکھے رکھے ٹھنڈی یخ ہو چکی تھی۔ ایش ٹرے میں رکھی ہوئی سگریٹ قالین پر گر کر اسے داغدار کرنے کے بعد فلٹر آنے پر خود بخود بجھ گئی تھی اور مجھے محویت میں ان دونوں میں سے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا تھا۔ بے اختیار میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

غزالہ سے دل نشین گفتگو کا وہ خمار چند ثانیوں سے زیادہ برقرار نہیں رہ سکا۔ جلد ہی مجھے یاد آگیا کہ سب انسپکٹر محمود سے مجھے ملنے والی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ چیف مجھے کوئی اچھی خبر دینے میں ناکام رہا تھا اور حالات کسی بھی وقت میرے خلاف کروٹ لے سکتے تھے۔

میں نئی سگریٹ سلگا کر بے خیالی میں ٹہلتا ہوا بالکونی میں چلا گیا۔ وہاں ربر بینڈ میں لپٹا ہوا تازہ اخبار کا بنڈل پڑا ہوا تھا لیکن اس وقت مجھے خبروں سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ایک دو روز میں میں خود ہی شہر والوں کے لیے ایک چنگھاڑتی ہوئی خبر بننے والا تھا۔

میں کچھ دیر بالکونی کی تازہ ہوا میں کھڑا نیچے سڑک پر آنے جانے والوں کا جائزہ لیتا رہا۔ اس وقت میں بالکل دو متضاد کیفیات سے دوچار تھا۔ غزالہ کے والہانہ جذبات اور الفاظ یاد آتے تو دورانِ خون کنپٹیوں پر زور مارنے لگتا اور جب محمود کے عزائم کی طرف دھیان جاتا تو دل دُھواں ہو جاتا۔

واپس لوٹتے ہوئے میں نے اخبار اُٹھا لیا۔ ربر بینڈ کو اتار کر اخبار کو اسی طرح میز پر ڈالا اور اپنے لیے چائے کی دوسری پیالی بنانے کے لیے کچن میں چلا گیا۔

کھولتی ہوئی چائے کی پیالی لے کر میں کچن سے نکلا تو پنکھے کی تیز ہوا سے کھل جانے والے اخبار کے پھڑپھڑاتے ہوئے پہلے صفحے پر شہ سُرخی کے برابر میں ایک خبر کے گرد ماتمی سیاہ حاشیہ دیکھ کر چونک پڑا۔ پیالی تپائی پر رکھ کر میں نے بے تابی سے اخبار اٹھایا تو خبر پر نگاہ پڑتے ہی میرا سر چکرا گیا اور میں نے بے اختیار سختی کے ساتھ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ خبر میرے لیے ناقابلِ تصوّر اور ہولناک تھی۔

جواں سال پولیس سب انسپکٹر محمود کو کراچی کی ایک شاہراہ پر کسی نامعلوم تیز رفتار ٹرک نے رُوند کر ہلاک کر دیا تھا۔ محمود میرے لیے ایک بڑا خطرہ تھا۔ اُس نے میری شناخت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور دو دن میں حقیقت کا سراغ لگا لینے کا دعویٰ کیا تھا لیکن اس کی ہلاکت کی خبر میرے لیے رُوح فرسا ثابت ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ وہ ایک ایماندار اور خودسر افسر تھا جس کا رام کیا جانا ممکن نہیں تھا جب کہ مافیا والے مجھے اپنے ساتھ شامل کر لینے کے بعد مجھے ہر خطرے سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ اُن کا چیف پریشان تھا اور اُس نے شہر میں موجود ڈان نُصرت کو بھی اپنی پریشانی میں شریک کر لیا تھا اس لیے سب سے پہلے مجھے مافیا پر ہی محمود کا قاتل ہونے کا شبہ ہوا تھا۔

صدمے کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھلتے ہی میں نے جلدی جلدی پوری خبر پڑھ ڈالی۔ سب انسپکٹر کو اپنے کسی اہم مقدمے کے سلسلے میں کلفٹن کے علاقے سے اہم مواد ملنے کی اطلاع ملی تھی جس پر وہ اپنی اسکوٹر پر سوار ہو کر رات گئے کلفٹن جا رہا تھا کہ گذری روڈ کو کلفٹن روڈ سے ملانے والی سن سیٹ بلیوارڈ پر ایک تیز رفتار ٹرک نے اسکوٹر کو ٹکر مار کر ایک دھماکے سے سوار اور سواری دونوں کے ٹکڑے اڑا دیے۔ رات گئے سڑک ویران پڑی ہوئی تھی اور علاقے کے مکین مکانوں میں آرام کر رہے تھے۔ باہر موجود بعض چوکیدار بس اتنا دیکھ سکے کہ وہ ریتی بجری کا کوئی خالی ٹرک تھا جو ٹکر مارنے کے بعد تیز رفتاری کے ساتھ فرار ہو گیا۔

نامہ نگار نے اسے اتفاقی حادثہ قرار دیا تھا، ساتھ ہی یہ امکان بھی ظاہر کیا تھا کہ شاید پولیس افسر اپنی اسکوٹر کی بتیاں جلانا بھول گیا ہو اس لیے ٹرک ڈرائیور انتہائی قریب پہنچنے سے پہلے اُسے نہ دیکھ سکا ہو اور تصادم کے بعد خوفزدہ ہو کر رُکے بغیر فرار ہو گیا ہو۔

سیاہ حاشیے میں دو تصاویر بھی تھیں۔ محمود کی لاش ٹرک کے پہیوں میں آنے کے بعد بُری طرح مسخ ہو گئی تھی۔ اسکوٹر کاٹھ کباڑ کے ڈھیر کی صورت میں سڑک پر دور دور تک بکھر گئی تھی۔

میرے ذہن نے جلد ہی میرے ابتدائی قیاس کی نفی کر دی۔ مافیا والے کتنے ہی بڑے مجرم سہی، لیکن انسان تھے۔ ان سے ایسی شقی القلبی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی کو اس کی ایمانداری کی ایسی بھیانک سزا دیں گے۔ پھر اگر وہ اُنھی کی کارروائی ہوتی تو اخبارات بازار میں آنے سے پہلے ہی رات میں اُن کی طرف سے مجھے خبر مل جانی چاہیے تھی۔ محمود کو قتل کر کے

مرنے سے پہلے کاغذات اُسی کی تحویل میں چھوڑ دیے گئے تھے تو حادثے کی تفتیش کرنے والے افسران کا میری طرف متوجہ ہونا قدرتی امر تھا اور اگر کاغذات نکال لیے گئے تھے تو وہ اس وقت تک میری تحویل میں ہونا چاہیے تھے۔

اگر وہ واقعی اتفاقی حادثہ تھا تو یقین کرنا پڑتا تھا کہ مقدر کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ شاید قدرت کو مجھ سے کوئی بڑا کام لینا تھا کہ محمود کو اَجل کے فرشتے نے اپنی آغوش میں لے کر مجھے اس خطرے سے محفوظ کر دیا تھا جو ایک تلوار کی صورت میں میرے سر پر لٹک رہا تھا۔

دس بجے چیف کا فون آیا اور اُس نے فوری طور پر مجھے دفتر پہنچنے کی ہدایت کی تو میرا ماتھا ٹھنکا۔

"اخبار میں۔۔۔!" میں نے اس سے حادثے کے بارے میں بات کرنا چاہی تو اُس نے سخت لہجے میں فوراً ہی میری بات کاٹ دی۔

"ہاں! میں نے بھی اخبار پڑھ لیا ہے۔ جو کہا جا رہا ہے وہ کرو!" بات ختم کرتے ہی فون بند کر دیا گیا۔

مجھے اپنے حلق میں تلخی سی گھلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بہت عرصے بعد کسی نے مجھ سے ایسے خراب لہجے میں بات کرنے کی جسارت کی تھی اور مجبوری یہ تھی کہ میں اس کے حکم کو بجا لانے پر مجبور تھا۔

سب انسپکٹر محمود مر گیا تھا یا راستے سے ہٹا دیا گیا تھا لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ اس نے حادثے سے پہلے میری نگرانی ختم کرا دی ہو۔ سیٹھ حبیب نے مجھے اتنا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ میں فون پر اس سے اس بارے میں کچھ دریافت کرتا۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر کوئی تعاقب کرتا ہے تو کرتا رہے جب مجھے اس بارے میں بریف نہیں کیا گیا تھا تو ٹریڈ لائن کے دفتر کو غیر متعلقہ لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ رکھنا میری ذمے داری نہیں تھی۔ چیف مجھے اپنا ماتحت سمجھ کر حکم دے رہا تھا تو میرا کام اسی قدر رہ جاتا تھا کہ اس کے حکم کی تعمیل کروں خواہ اس میں فائدہ ہوتا یا نقصان!

میرے ذہن پر سیٹھ حبیب کی ہدایت کا اتنا اثر نہیں تھا جتنا محمود کے حادثے کے بارے میں حقائق جاننے کی خواہش کا زور تھا اس لیے چائے کی پیالی ختم کر کے میں جلدی جلدی تیار ہوا اور پھر میز نائین فلور سے مافیا والوں کی سُرخ کار میں منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ریمپ سے آہستہ آہستہ گاڑی باہر نکالتے ہوئے میں نے قرب و جوار میں نظریں دوڑا کر یہ حیرت ناک اندازہ لگا لیا تھا کہ وہاں میری نگرانی کرنے والا کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ ۔۔ سے نکل کر گاڑی مین روڈ پر گھماتے ہوئے میں یہ سوچ کر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ اس بار واقعی پیشہ ور لوگوں سے پالا پڑا تھا جو جرائم کی منصوبہ سازی کے لیے استعمال میں آنے والے اڈّوں کو باقاعدہ دفاتر کے طور پر کامیابی سے چلا رہے تھے۔

راستے میں میری نظریں غیر ارادی طور پر بار بار عقب نما آئینے کی طرف اٹھتی رہیں لیکن پیچھے میدان صاف تھا۔ جیل کے چوراہے سے داؤد انجینئرنگ کالج تک پوری طرح اطمینان کر لینے کے بعد میں نے رفتار تیز کر دی اور مزارِ قائد کے گرد گھوم کر پرانی نمائش سے پُرہجوم ایم اے جناح روڈ پر آگیا۔

کراچی پاکستان کا اقتصادی دل ہے جہاں سندھی، پنجابی، پختون، بلوچ اور مہاجر سب کا خطیر سرمایہ لگا ہوا ہے۔ شہر اور اس کے مضافات میں دھواں اُگلتی چمنیوں کے سائے میں روزگار کی لاکھوں اسامیاں موجود ہیں جن سے فیضیاب ہونے کے لیے دُور دراز کے شہروں اور دیہاتوں تک سے لوگ یہاں آتے ہیں۔ کچھ اپنی قابلِ رشک محنت سے شہر کے ظاہری حُسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ کچھ کا تجربہ اس شہر کے اثاثوں میں شمار ہوتا ہے اور بہتیرے یہاں سے بہت کچھ سیکھ کر دساور یا اپنے شہر واپس چلے جاتے ہیں۔ محبتوں کا یہ شہر سدا سے امن کا گہوارہ تھا لیکن اس کی بڑھتی ہوئی خوش حالی کچھ حاسدوں کو پسند نہ آئی۔ شہر میں تنگ شاہراہوں پر روز بہ روز بڑھتا ہوا گاڑیوں کا ہجوم ایسے لوگوں کی آنکھیں پھاڑے دے رہا تھا۔ جن سڑکوں سے گاڑی دندناتی ہوئی چند منٹ میں پار نکل جاتی تھی اب وہاں ٹریفک کے بے ترتیب اژدحام میں گھنٹے بھی گزر جاتے ہیں۔ میری گاڑی بھی پلازا سینما سے آگے سِسک سِسک کر رینگ رہی تھی اور ذہن میں وہ صورتِ حال گھوم رہی تھی جو سلطان شاہ کے ہاتھوں امیر دادا کے قتل کے بعد شہر میں رونما ہوئی تھی۔ حاسدوں نے اس شہر میں بھائی کو بھائی سے لڑوا دیا تھا۔ جیسے یہ سلجھے ہوئے لوگوں کا شہر نہیں بلکہ جنگلی قبیلوں کا جنگل ہو۔ پھر افواہیں اُڑیں کہ اس شہر میں ہیروئن کا پیسہ برس رہا ہے۔ گاڑیاں، دکانیں، مکان سب ہیروئن کی پڑیوں سے اپنی نمو حاصل کر رہے ہیں۔ ملک بھر کے ڈاکو ان خزانوں کی تلاش میں اپنا اسلحہ سونت کر اس شہر پر پل پڑے۔ جو مارے یا پکڑے گئے اُن کو ان کے لوگ بھول گئے، جو جیبیں بھر کر کامیاب و کامران لوٹے اُن کو مثال بنا کر زندگی میں شارٹ کٹ استعمال کرنے کے عادی، طالع آزماؤں کے غول کے غول پیدا ہو گئے۔ پڑھے لکھے بے روزگار طبقے کے بعض شُہدوں کو بھی یہ مشغلہ نادر روزگار نظر آیا اور شہر میں مجرم اور عام شہری کا امتیاز فنا ہو کر رہ گیا۔ جسے پکڑا جاتا ہے وہ معزز اور امن پسند نکلتا ہے

جسے چھوڑ دیا جاتا ہے وہ گناہوں کی پوٹ ہوتا ہے جبکہ میں خود اس بات کا گواہ ہوں کہ جب میں اس شہر میں منشیات کی تقسیم اور افزائش میں مصروف تھا تو کالے دھندوں میں ملوث ہر بڑے آدمی کا یہ عزم ہوتا تھا کہ جو شریف شہری اس کے راستے میں مزاحم ہونے کی کوشش کرے گا اُسے دوسروں کے لیے عبرت بنا دیا جائے گا۔ ابتدا میں بھتوں کے سہارے ان بحران کی پرورش کی گئی پھر تیغ کر دیے گئے پھر رفتہ رفتہ یہ لوگ اتنے طاقتور ہو گئے کہ قانون ان کے رحم و کرم پر نظر آنے لگا۔ مافیا، شی، دلدار آغا، سیٹھ حبیب اور ڈان تھری سب اسی ماحول کی پیداوار تھے ورنہ ڈان تھری کی مجال نہیں تھی کہ اٹلی سے ہزاروں میل کا سفر طے کر کے جرائم کی آبیاری کے لیے کراچی قیام کرتا۔

مجرموں کا کوئی وطن ہوتا ہے نہ دھرم۔ ان منشیات فروشوں میں ہر علاقے اور صوبے کے لوگ تھے۔ ہر زبان بولنے والا ان میں ملتا تھا حتیٰ کہ بنگالی، سیلونی، تنزانی تک مقامی منڈی میں ہیروئن فروشی میں ملوث تھے۔ ان کے سرغنہ جب جس قسم کا فساد کرانا چاہتے۔ اسی قسم کے مہروں کی ڈوریاں ہلاتے اور شہر بھر میں فلاں فلاں گروہوں میں خونریز تصادم کی خبریں آناً فاناً پھیل جاتیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ شہر میں امن و امان کے مسائل پیدا کر کے قانون کے محافظوں کو اس طرف الجھایا گیا اور پس پردہ ہول سناٹے میں منوں ہیروئن شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا دی گئی۔

شہر میں گاڑیوں کے ٹریفک کی اجتماعی رفتار روز بروز سست ہوتی جارہی تھی اور ڈرگ ٹریفک روز بہ روز ترقی پذیر تھا۔ میری جیپ رینگتا ہوا آخر کار اپنی مطلوبہ عمارت کے سامنے پہنچ گیا جہاں گراؤنڈ فلور کے ایک دروازے پر ٹریڈ لائن کا اسائن بورڈ نمایاں نظر آرہا تھا۔

اس علاقے میں پارکنگ کا مسئلہ بہت سنگین تھا۔ دیر سے آنے والے دکاندار ہاتھ گاڑیوں اور ٹھیلے والے مزدوروں کو اس بات کا بارہا مشاہرہ دیتے ہیں کہ ان کے آنے تک اُن کی دکان یا دفتر کے سامنے پارکنگ کی جگہ روک کر رکھی جائے۔ یہ احتیاط نہ کی جائے تو ہر روز چوری ہونے والی گاڑیوں میں خوفناک اضافہ ہو سکتا ہے لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی کہ عجائب خان ٹریڈ لائن کے دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے مافیا کی گاڑی پہچانی پھر مجھے دیکھ کر پرجوش انداز میں ہاتھ ہلانے لگا کہ میں گاڑی اسی طرف لے جاؤں۔ میں نے گاڑی موڑی تو دفتر کے سامنے رسا باندھ کر پارکنگ کے لیے جگہ روکی گئی تھی جہاں میرے بعد بھی مزید دو کاریں پارک کی جا سکتی تھیں۔

میرے اترنے تک عجائب خان وہیں آگیا۔ اس سے پرتپاک انداز میں ہاتھ ملاتے ہوئے اچانک ہی مجھے خیال آیا۔ "میرا تم سے تعارف عجائب گل کے نام سے ہوا تھا لیکن یہ لوگ تم کو عجائب خان کہتے ہیں۔ تمھارا اصل نام کیا ہے؟"

"عجائب گل خان!" اُس نے مسرت سے کہا۔ "یارا تم اُمر کو بی بولے اُم سُنے گا اور کراچی میں تو بلبل جیسا لوگ بی شیر خان اور اسد اللہ بنا پرتا ہے۔" اس وقت وہ خاصے خوشگوار موڈ میں تھا۔ اس وقت میں دفتر کی نیت سے آیا تھا اس لیے ڈسپلن کے خیال سے عجائب گل خان سے اپنی گفتگو اسی پہلے سوال پر موقوف کر دی۔

اُس نے میرے لیے دروازہ کھولا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی رہنمائی کے لیے لپک کر آگے آگیا۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر کھلتے ہوئے رنگ والی ایک دھان پان سی خوش شکل لڑکی بیٹھی بال پین سے کھیل رہی تھی۔ اس کے سامنے ایک ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر اور دوسری طرف الیکٹرانک فون ایکس چینج رکھا ہوا تھا۔ مجموعی طور پر استقبالیہ پوری طرح ایک کامیاب کاروباری ادارے کا تاثر دے رہا تھا جو میرے خیال میں مافیا کے سخت کاروباری اصولوں کا نتیجہ تھا۔

"میم صاب! یہ اپنا شوٹر خان صاب ہے۔" عجائب گل نے کاؤنٹر پر جھک کر رازدارانہ لہجے میں لڑکی سے کہا۔ اس کے چہرے پر اچانک سراسیمگی کے آثار پھیل گئے اور وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ بال پین اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔

"گڈ مارننگ سر!" اس نے مجھ سے نظریں چار کیے بغیر احترام کے ساتھ کہا۔ "یور آئیڈینٹیٹی پلیز!"

مجھے اس کی وہ ادا پسند آئی کہ نام سُن کر سارا ادب و احترام ظاہر کرنے کے باوجود اس نے مجھ سے میری شناخت طلب کرنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی تھی۔

میں نے جیب سے مافیا کی چابی نکال کر اس کی طرف بڑھائی جو اُس نے ہاتھ میں لیے بغیر میرا شکریہ ادا کیا کیونکہ دائروں میں بنے ہوئے مافیا کے پانچ حروف اس کو نظر آگئے تھے۔

اس نے ٹیلی فون کے سوئچ بورڈ سے ریسیور اُٹھا کر ایک کی دبائی اور دھیمی آواز میں بولی۔ "باس، آگئے ہیں سر!" دوسری طرف کی ہدایت سُن کر اُس نے خاموشی سے ریسیور رکھ دیا اور عجائب گل سے مخاطب ہو گئی۔ "سر کو چیف کے دفتر میں لے جاؤ۔"

اس بار تہ خانے میں اُترنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا گیا وہ استقبالیہ کاؤنٹر کے ایک پارٹیشن کے پیچھے واقع تھا۔ چند سیڑھیاں اُتر کر ہم تہ خانے میں پہنچ گئے۔ وہاں سے میں نے عجائب گل کو رخصت کر دیا کیونکہ میں خود چیف کے دفتر میں پہنچ سکتا تھا۔ سیٹھ حبیب کے دفتر کے دروازے پر پہنچ کر میں نے جوں ہی ہینڈل پر ہاتھ رکھا، مجھے اندازہ ہو گیا کہ دروازہ مقفل ہے۔ اسی کے ساتھ چوڑی چوبی چوکھٹ میں نصب انٹرکام کے کسی خفیہ اسپیکر پر حبیب کی تحکم آمیز آواز اُبھری۔ "کون ہے؟"

"شوٹر!" میں نے انٹرکام سسٹم کی کارکردگی آزمانے کے لیے اپنی پوزیشن میں ذرا بھی تبدیلی لائے بغیر آہستہ سے کہا۔

"کم اِن!" حبیب کی آواز سنائی دی۔ میرا ہاتھ بدستور دروازے کے ہینڈل پر تھا اس بار وہ بڑی آسانی کے ساتھ گھوم گیا اور میں دروازہ کھول کر اس پراسرار کمرے میں داخل ہو گیا جہاں میں نے پچھلی بار حلف اٹھایا تھا۔

سیٹھ حبیب میز کے سامنے، ملاقاتیوں والی سمت میں میری طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔ میرے آگے بڑھتے ہی میز کے عقب میں پھیلے ہوئے اندھیرے میں سے ڈان تھری کی سرد اور رسمی آواز اُبھری۔ "خوش آمدید شوٹر! بیٹھ جاؤ۔"

میں حبیب کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بے تکلفانہ لہجے میں بولا۔ "کیا بات ہے چیف؟ تم میرے آنے سے خوش نظر نہیں آتے حالانکہ میں تمھارے ہی حکم پر یہاں آیا ہوں۔"

"ضروری نہیں کہ یہاں موجود ہر شخص تمھیں خوش آمدید کہے۔" حبیب کی بجائے اندھیرے میں سے ڈان تھری نے میری بات کا جواب دیا۔ "ہر اجلاس میں چیئرپرسن میزبان ہوتا ہے سب کی طرف سے اس کے خیرمقدمی کلمات کافی ہوتے ہیں۔" اُس کا لہجہ خشک اور بڑی حد تک تحکم آمیز تھا۔ جب تک میں نے مافیا سے وفاداری کا حلف نہیں اٹھایا تھا وہ دونوں میرے ساتھ برابری سے پیش آرہے تھے لیکن اُن کی بالادستی تسلیم کرتے ہی اُن کے طور طریقوں میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ شاید وہ ہر طرح سے مجھے اپنی حیثیت کا احساس دلا کر میری انا کو ختم کرنے کی سوچی سمجھی کوشش کر رہے تھے۔

"آہستہ آہستہ میں ان طریقوں کا عادی ہو جاؤں گا۔" میں نے بھی فوراً ہی سرد مہری اختیار کر لی۔

"گڈ!" ڈان تھری کی آواز مشینی تھی۔ "پہلی خوش خبری یہ ہے کہ اب تم ایک آزاد پرندے ہو۔ تمھارے کاغذات میرے منصوبے کے مطابق میری تحویل میں آگئے ہیں۔" اُس نے تاریکی میں سے میرے کاغذات کا لفافہ اسی حالت میں میری طرف بڑھا دیا جس حالت میں وہ سب انسپکٹر محمود کو دیا گیا تھا اور میں سناٹے میں آگیا۔

"یہ۔ . . . یہ۔ . . . تو کیا محمود کو دانستہ مارا گیا ہے؟" میرے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"ہاں، پورا آپریشن میری نگرانی میں ہوا۔" ڈان تھری کی آواز جذبات سے یکسر عاری تھی۔ "ہم بلاسبب خونریزی سے گریز کرتے ہیں۔ اس کے سلسلے میں ہمارے پاس کوئی اور انتخاب نہیں تھا۔ تمھاری نگرانی ختم کرائی گئی۔ پھر اُسے فون پر سیما کے قتل کے سلسلے میں دیر سے ایک کلیو کی اطلاع دی گئی اور جب وہ میرے منصوبے کے مطابق مقررہ وقت پر مقررہ مقام سے گزرا تو اُسے مہلک حادثہ پیش آگیا۔ ٹرک نے اُسے سائیڈ سے پچھلے پہیوں کی زد میں لیا تھا تاکہ اس کی باڈی داغ دار نہ ہو ورنہ وہ پکڑا جا سکتا تھا۔ باقی کام مجھے خود کرنا پڑا۔ تمھارا لفافہ اس کی اسکوٹر کی ڈکی میں مل گیا۔ وہ لے کر میں اس کی موت پر افسوس ظاہر کرتا ہوا لوٹ آیا۔ چیف کو میں نے تھوڑی دیر پہلے تفصیلات سے آگاہ کیا ہے۔ اسی لیے رات بھر اس بارے میں تمھیں کوئی بھی اطلاع نہیں مل سکی۔ یہ ایک بڑی اور ضروری کامیابی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس قیمت پر اپنی گلوخلاصی سے تمھیں خوشی نہیں ہوئی ہے۔ یہ بہت بُری بات ہے۔ تم جیسے سینئر گینگسٹر کو کسی کی موت پر اتنا جذباتی ہونا زیب نہیں دیتا۔ یاد رکھو کہ تم اپنے دشمن کو روندنے میں پہل نہیں کرو گے تو وہ تمھیں کچل ڈالے گا۔ کامیابی اس دنیا میں صرف اسی کے قدم چومتی ہے جو پوری طاقت سے پہل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے تم کو یہ بنیادی سبق سکھانا پڑ رہا ہے۔"

"میں سب کچھ جانتا ہوں۔" میں نے سپاٹ اور دھیمی آواز میں کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ ڈان تھری کی زبان سے محمود کے قتل کی سازش کا انکشاف سُن کر مجھے دلی صدمہ ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ عجائب گل اگر خود قاتل نہیں تھا تو اس سازش میں ضرور ملوث تھا، کیوں کہ حبیب نے اسے خاص طور پر میرے فلیٹ کی ڈیوٹی سے واپس بلایا تھا۔ شاید ڈان تھری نے اپنے شیطانی منصوبے کے لیے کوئی بے خوف آدمی طلب کیا ہو گا اور حبیب نے مقصد سے واقفیت حاصل کیے بغیر عجائب گل کو واپس بلا کر ڈان تھری کے حوالے کر دیا جس نے واردات میں بھرپور طریقے سے اپنا کردار ادا کیا اور اپنے پیچھے کار میں موجود ڈان تھری کے لیے میدان ہموار کر کے رات کے اندھیرے میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

"لیکن کبھی کبھار دوستوں کے مرنے پر خوشی اور دشمن کی موت پر دُکھ ہوتا ہے۔" میں نے قدرے توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "محمود ایسا ہی دشمن تھا۔ میں اس سے مل چکا تھا۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ وہ مر گیا۔ میرے اظہارِ افسوس سے اسے دوسری زندگی نہیں مل سکتی۔ اس لیے میں نے اس کی موت پر اپنے جذبات دبانے یا چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔"

"شاید تم اس کی ایمان داری سے متاثر ہو گئے ہو۔" ڈان تھری کے لہجے میں طنز کی ہلکی سی چبھن تھی۔

"وہ چیف کی اطلاعات تھیں۔ میں اسے اوّل درجے

کا مسکارا اور راشی سمجھ رہا تھا جو مجھے دھونس دے کر کوئی بڑی رقم ہتھیلانے کے چکر میں تھا۔" میں نے بے خوفی کے ساتھ اسی سپاٹ لہجے میں کہا۔

"میں ڈینی کی تائید کرتا ہوں ڈان!" حبیب نے پہلی بار زبان کھولی۔" دشمن کے بارے میں اس کی ابتدائی رائے بہت خراب تھی اور یہ اس کی طرف سے بہت پریشان تھا۔" بات کرتے ہوئے حبیب نے ڈان تھری کا خیال رکھتے ہوئے آہستہ سے میرا پیر دبایا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس موضوع پر مجھے ڈان تھری سے مزید نہیں الجھنا چاہیے تھا۔

"چاہو تو اس کے لیے دس پانچ منٹ کی خاموشی اختیار کی جا سکتی ہے۔" ڈان نے چبھتے ہوئے لہجے میں تلخی سے کہا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اس کا مخاطب میں ہی تھا۔

"مجھے افسوس ہے ڈان! آئندہ محتاط رہوں گا۔" میں نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ اس خبطی سے مجھے خوف آنے لگا تھا۔

"گڈ!" پھر وہی مشینی آواز سنائی دی۔" اور اب دوسری بات! اسے انسپکٹر نے تمھیں بتا دیا تھا کہ تم نے باہر نکلنے کی کوئی بھی کوشش کی تو اس کے آدمی تمھیں گرفتار کر لیں گے۔ اس کے باوجود تم نے باہر نکلنے کا خطرہ مول لیا۔ اگر وہاں موجود ہمارا آدمی ہوائی فائر کر کے علاقے میں خوف و ہراس نہ پھیلاتا تو تم اسی وقت گرفتار کر لیے گئے ہوتے۔"

"میں مانتا ہوں کہ وہ میری غلطی تھی لیکن فائر ہونے سے پہلے ہی اس نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ فائر ہونے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مزید تلخ کلامی کیے بغیر وہ فائر کرنے والے کی تلاش میں دوڑ پڑا۔"

"لیکن، اگر اور مگر!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔" مجھ سے بات کرتے ہوئے ان تین بے ہودہ الفاظ سے گریز کیا کرو۔ تم نے غلطی مان لی، بات ختم ہو گئی۔ میرے ملک مافیا کے بارے میں یہ مثال یاد رکھنا کہ میں نے کسی کی جان لے کر اور اپنی جان پر کھیل کر تمھیں ایک خطرے سے بچا لیا ہے لیکن دیکھو یہ لیکن کس قدر منحوس اور بے ہودہ لفظ ہے ... لیکن ضرورت پیش آئی تو میں خود، جذبات سے عاری رہتے ہوئے، بے ملال تمھاری پیشانی میں پگھلا ہوا سیسہ اتار دوں گا اور بھول جاؤں گا کہ میری کبھی تم سے کوئی ملاقات بھی ہوئی تھی۔"

"تم عظیم اور تجربے کار ہو ڈان۔" میں چند ہی منٹ میں خود کو اس کے سامنے طفلِ مکتب محسوس کرنے لگا تھا۔" میں تمھارا پاسنگ بھی نہیں ہو سکتا۔ تمھارے ساتھ رہ کر ہی کچھ سیکھ سکوں گا۔"

"میرے ساتھ نہیں۔" اس نے پھر مجھے ٹوک دیا۔" چیف کے ساتھ! میں اٹلی چلا جاؤں گا۔ اور ہاں، یہ بھی یاد رکھنا کہ ہم تجربے کار اور پیدائشی مجرموں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ اناڑیوں کو جرائم سکھانے کا سنگین خطرہ مول نہیں لیتے، وہ ڈوبتے ہیں تو اپنے ساتھ کھلاڑیوں اور استادوں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔"

اس بار میں خاموش ہی رہا۔ حلف برداری کے تنازعے میں سیٹھ حبیب مجھے بتا چکا تھا کہ مافیا کی مبادیات کے بارے میں ڈان تھری بہت سخت اور سفاک تھا۔ اپنی رائے قائم کر لینے کے بعد مخاطب کو صفائی کا کوئی موقع دیے بغیر اس کی بے خبری میں اچانک ہی اپنا وار کر گزرتا تھا۔ اس لیے میں ڈر رہا تھا کہ کہیں میری کسی بات سے میز کے پار، اندھیرے میں بیٹھا ہوا وہ سنکی آسیب بھڑک ہی نہ جائے۔ اس سے گلوخلاصی کے بعد چیف کو سنبھالنا مجھے بہت آسان نظر آنے لگا تھا۔

"تیسری بات!" چند ثانیوں کے گمبھیر سکوت کے بعد وہ پھر بولا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا کہ اس نے نجانے کون سی نئی بات پکڑ لی ہو۔" تمھیں پاکستان آئے ہوئے ایک معقول مدت گزر چکی ہے۔ تم اطالوی نژاد ہو، پندرہ دن سے زیادہ قیام کی صورت میں تمھیں محکمۂ پولیس میں اپنی آمد کا اندراج کرانا ضروری ہے۔ یہ کام تم آج ہی کر لو گے۔" پاکستان کے قواعد و ضوابط کے بارے میں اس کی معلومات قابلِ رشک تھیں۔ میں نے سر جھکا کر اس کی ہدایت تسلیم کر لی۔

اپنے مخاطب کو ذہنی طور پر مرعوب اور مفلوج کر کے اس کے اعصاب پر سوار ہو جانے کے فن میں ڈان تھری کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اس سے میری پہلی ملاقات اس حد تک دوستانہ رہی تھی کہ میں نے اُسے بے نقاب ہو کر روشنی میں آنے پر آمادہ کر لیا تھا لیکن اس بار وہ ابتدا ہی سے بُری طرح مجھ پر حاوی ہوتا چلا گیا تھا۔

"میں کل صبح سویرے اٹلی لوٹ جاؤں گا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم کچھ دن اپنا وقت پابندی کے ساتھ اس دفتر میں گزارو تاکہ تم اپنے آدمیوں کو اور آدمی تمھارے مزاج کو سمجھ سکیں۔"

اس ہدایت کو اس نے کوئی نمبر نہیں دیا تھا۔

"میں خود بھی چاہ رہا تھا لیکن پولیس والا معاملہ درمیان میں آ گیا . . . !"

"تم نے پھر لیکن کا لفظ استعمال کیا۔" اس نے میری بات کاٹ کر ناگواری سے کہا۔" اس لفظ سے مجھے چڑ ہے۔ اگر تم کو خود پر اعتماد ہے تو صرف اپنی بات کہو۔ اس کی دا

اور وضاحتیں پیش نہ کرو، لوگ خود مان لیں گے۔"

میں نے سختی سے اپنے ہونٹ بند کر لیے۔ اس کے سامنے زیادہ بولنا شامت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ویسے بھی وہ حاکم تھا اور میں محکوم لیکن اس سے قطع نظر خود اعتمادی کے ساتھ گفتگو کے بارے میں اس کا نظریہ بالکل درست تھا۔ سیٹھ حبیب اس کی عادات سے بخوبی واقف معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ میری مدد کے لیے صرف ایک بار بولا تھا ورنہ مسلسل خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا جیسے اُسے زبردستی پکڑ کر کرسی سے باندھ دیا گیا ہو۔

"اور اب آخری بات کی طرف آ جاؤ جو ان سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔" اُس نے اپنے مخصوص اور سپاٹ لہجے میں کہا۔" شی سے پاکستان میں ہمارے کسی سمجھوتے کے کیا امکانات ہیں؟"

"ناممکن!" میں نے کم گوئی کا مثالی مظاہرہ کرتے ہوئے صرف ایک لفظ میں جواب دیا۔

"کیوں؟" اُس نے ترکی بہ ترکی مجھ سے بھی مختصر لفظ استعمال کر ڈالا۔

"اس لیے کہ ہمارے اور اُن کے مفادات متصادم ہیں۔ وہ ہیروئن کی صنعت کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں اور ہم دن رات اس کے فروغ کے لیے کوششیں کر رہے ہیں۔" میں نے پوری احتیاط کے ساتھ جواب دیا۔

"گڈ!" تعریف و تحسین کے کسی بھی جذبے سے عاری مشینی بانگ سنائی دی۔" تم بات سمجھتے ہو بس تھوڑی سی تربیت کی کمی ہے جو چیف کے ساتھ رہ کر پوری کر لو گے۔ تمھیں اتنا بتا تا چلوں کہ دنیا کے بہتیرے ملکوں میں شی والے ہمارے ساتھ ساتھ کام کر رہے ہیں۔ انھیں سرکاری سرپرستی حاصل رہتی ہے لیکن پھر بھی ہمارا کہیں باہمی تصادم نہیں ہوا تھا۔ جہاں ہم حاوی ہوتے ہیں وہ پسپائی اختیار کر لیتے ہیں۔ جب ہم اُن کا پلّہ بھاری دیکھتے ہیں تو راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ تمھارے معاملے میں پہلی بار اُن سے ہمارا خوں ریز تصادم ہوا ہے اس کی وجہ صرف غلط فہمی تھی۔ وہ ایئر ہوسٹس کے فلیٹ میں گھس کر سلور آئی نکال لے جانا چاہتے تھے، ہم تمھاری حفاظت کر رہے تھے۔ انھوں نے دھاوا بولا تو ہمارے آدمی بھی لوٹ پڑے حالانکہ شی والے ابھی تک شہر میں تمھارے وجود سے بے خبر ہیں البتہ اُن کے سربراہ کو معلوم ہو گیا ہے کہ اُن کا راستہ روکنے والے ہمارے آدمی تھے۔ اسی لیے ڈی ڈی نے ہمیں صلح کا پیغام بھیجا ہے۔ تم چیف کے مشورے سے کوئی راہ نکال لینا۔ یہاں شی سے لڑے بغیر ہمارا جمنا مشکل ہے لیکن ابھی ہماری ابتدا ہے۔ کھُل کر نہ لڑا جائے تو بہتر ہو گا۔

"تو کیا ڈی ڈی سے ہمارا کوئی رابطہ ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اس بار سیٹھ حبیب بولا تھا۔" ڈھکے چھپے لفظوں میں انھوں نے آج کے تمام اخبارات میں اشتہار دیے ہیں۔ پیغام کا جواب بھی اسی طرح ہی دیا جائے گا۔"

"ہو سکا تو میں براہِ راست ڈی ڈی پر ہی ہاتھ ڈالنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے ڈان تھری کی طرف مخاطب ہو کر سعادت مندانہ لہجے میں کہا اور حبیب نے خشک لہجے میں مجھے اردو میں ٹوک دیا۔

"وہ جا چکا، اب مجھ سے بات کرو۔ ڈی ڈی پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہو گا۔ وہ مجھ سے بھی بڑا پردہ نشین ہے۔" اس کے انکشاف سے مجھے سخت مایوسی ہوئی کہ ڈان تھری بات کرتے کرتے اچانک اُٹھ کر چل دیا تھا اور میرے فرشتوں کو بھی ہوا نہیں لگ سکی تھی جب کہ میں حبیب کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔" وہ کب اٹھ کر چلا گیا؟" میں نے ڈی ڈی کے بارے میں حبیب کا تبصرہ نظر انداز کرتے ہوئے متجسّس لہجے میں سوال کیا۔

"تم نے رابطے کے بارے میں پوچھا تو وہ اپنی بات ختم کر کے جا چکا تھا اسی لیے مجھے تمھارے سوال کا جواب دینا پڑا۔" اُس نے کہا۔

"مجھے پتا نہیں چلا تو تمھیں کیسے اندازہ ہو گیا؟" اس بارے میں میری حیرت دُور نہ ہو سکی۔" پچھلی بار بھی یہی ہوا تھا کہ وہ اچانک چلا گیا تھا اور میں اس سے بولتا رہا تھا۔ حبیب کو روشنی کر کے مجھے یقین دلانا پڑا تھا کہ ڈان تھری واقعی جا چکا تھا۔"

"میں اس کمرے کا عادی ہوں اس لیے خفیف سی تبدیلی بھی بھانپ لیتا ہوں۔ تم نئے ہو اور راستوں سے لاعلم ہو اس لیے صحیح سمت میں نظریں جمائے رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ چلا گیا ورنہ آج تم نے اُسے اشتعال دلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ دشمن کی تعریف کو وہ احساسِ کمتری قرار دیتا ہے۔"

"یہ ماننا پڑے گا کہ وہ عظیم ہونے کے ساتھ ساتھ عجیب و غریب بھی ہے۔ دوسروں سے متاثر ہونا نہیں جانتا، ہر ایک پر خود کو مسلط کرنے کا عادی معلوم ہوتا ہے۔" میں نے میز پر سے اپنی دستاویزات کا لفافہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ڈی ڈی کے بارے میں تم کیا کہہ رہے تھے؟" اُس نے مجھے ٹالی ہوئی بات یاد دلا دی۔

"پابندی ختم ہو گئی ہے۔ اب میں جلد ہی اُس تک پہنچ

جاؤں گا۔ اُسے اُکھاڑ دیا تو شاید شی یہاں دوبارہ نہ پنپ سکے۔"
"انھیں جو کام کرنا تھا، وہ کر گزرے ہیں۔ امیر اور غریب، جاہل اور تعلیم یافتہ، چھوٹی اور بڑی، شہری اور دیہی تمام بستیوں میں ہیروئن کا زہر پہنچا چکے ہیں جو ایڈکٹ ہو چکے ہیں وہ ان کے کام کو خود بخود آگے بڑھائیں گے اور دوسروں کو بھی پھانسیں گے۔ رہا کارخانوں سے ہیروئن خریدنے کا معاملہ، تو وہ قبائلی دلالوں کے ذریعے بھی چل سکتا ہے، اسی وجہ سے پہلے کے مقابلے میں انھوں نے خود کو کافی سمیٹ لیا ہے۔"

"چند روز میں یہ ساری باتیں سامنے آجائیں گی۔ اس وقت میں ذرا جلدی جانا چاہوں گا۔" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا اور اُس نے اگلے روز سے دفتر میں میری آمد کے انتظامات سے آگاہ کرتے ہوئے میری گلوخلاصی کر دی۔

دفتر سے نکلنے تک میرا چار افراد سے سامنا ہوا اور وہ سب ہی تعظیماً میرے سامنے جھکتے چلے گئے۔ غالباً پورے دفتر کو خبر مل چکی تھی کہ میں چیف سے ملنے آیا ہوا تھا۔ اوپر والے میرے اوپر مسلط تھے اور نیچے والے رضاکارانہ طور پر میری بالادستی قبول کرنے پر آمادہ تھے اس لیے میں نے اس ملاقات کے دوران اپنے دل میں پیدا ہونے والی تلخیوں کو بھلا دیا لیکن محمود کے سنگدلانہ قتل کا واقعہ بُری طرح میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ میری نظروں میں محمود کا وہ افسر بھی اس سازش میں پوری طرح شریک تھا جس نے حبیب کو محمود کی ایمانداری اور سخت گیری سے آگاہ کر کے بالکل ہی مایوس کر دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس معاملے میں ڈان کو ملوث نہ کیا جاتا تو حبیب مر کر بھی اس قدر سفاکانہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن شاید محمود کی قضا آگئی تھی کہ ڈان جیسا سنگدل اور نامہرباں آدمی تفتیش کے خطرے سے میری گلوخلاصی کے سلسلے میں یکایک اس قدر مہربان ہو گیا کہ کسی کو اعتماد میں لیے بغیر براہِ راست اپنی نگرانی میں اس خونیں ڈرامے کو تکمیل تک پہنچا گیا۔

وہ میری زندگی میں آنے والے اُن گنے چُنے لوگوں میں سے تھا جن کی انتہا درجے کی ذاتی خوبیوں یا خامیوں کی وجہ سے میں انھیں کبھی نہ بُھلا سکوں گا۔

محض اسی وجہ سے اس کی تیسری ہدایت میرے ذہن میں چبھ رہی تھی۔ اُس نے تو دنوں کی تعداد اور ضابطے کا حوالہ تک دے دیا تھا لیکن میں پولیس رجسٹریشن کے طریقہ کار سے پوری طرح باخبر نہیں تھا۔ اتنا ضرور سنا تھا کہ انسدادِ جرائم اور حفظِ ماتقدم کے طور پر رجسٹریشن کرانے والے ہر غیر ملکی کے نشانات انگشت جملہ کوائف کے ساتھ پولیس ریکارڈ

میں محفوظ کر لیے جاتے تھے جو کسی بھی وقت میرے حق میں مہلک ثابت ہو سکتے تھے۔

میرے کاغذات کی بازیابی میں ڈان تھری کی غیر معمولی ذاتی دلچسپی پھر فوری طور پر رجسٹریشن کی ہدایت کے پسِ پشت میری بھلائی کا کوئی جذبہ ہرگز کارفرما نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ڈان تھری فطرت، پیشے اور اپنے اٹھائے ہوئے حلف کے اعتبار سے اوّل درجے کا موذی تھا جس سے فلاح کی اُمید، شیر سے بکری کی نگہداشت کی توقع کے برابر تھی۔

واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے میں مسلسل اسی ایک نکتے پر غور کرتا رہا۔ اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈان تھری نے مجھے وہ مشورہ پھانسنے کے لیے دیا تھا۔ اُس نے مجھے مافیا میں شریک ضرور کر لیا تھا لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں شی سے بغاوت کر کے بھی ایک طویل عرصے تک کامیابی سے اپنا دفاع کر کے انھیں زک پہنچاتا رہا تھا ایسے کسی بُرے وقت کے لیے اس کے پاس زبانی حد تک میرے جرائم کی لمبی چوڑی فہرست موجود تھی لیکن میرے خلاف کوئی ٹھوس قانونی ثبوت نہیں تھا۔ اطالوی پاسپورٹ اور دوسری دستاویزات اگر میں تلف کر دیتا تو یہ ثابت کرنا ناممکن تھا کہ میں نے کبھی پیٹرواک کا فرضی نام اختیار کر کے کوئی سفر کیا ہو گا۔ میری اس جعلسازی کو ریکارڈ پر لانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ محکمۂ پولیس میں میری آمد کا باضابطہ اندراج کرا دیا جائے۔ پھر وہاں سارے کوائف، پاسپورٹ کے مطابق پیٹرواک کے ہوتے لیکن فنگر پرنٹس میرے لیے جاتے اس طرح وقتِ ضرورت پولیس ریکارڈ سے مجھے متعدد جرائم میں ملوث کیا جا سکتا تھا۔

میں نے ڈان تھری کی اس خود غرضانہ خواہش کو مسترد کرنے کا فیصلہ کر کے گاڑی کا رُخ اپنے فلیٹ کی طرف موڑ لیا۔

مجھے غزالہ کی کُھلی کُھلی باتوں سے جس قدر خوشی حاصل ہوئی تھی وہ محمود کے سفاکانہ قتل کے انکشاف سے بڑی حد تک ماند پڑ گئی تھی لیکن پھر بھی میرا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔

تالا کھول کر میں اندر داخل ہوا تو قالین پر پڑا ہوا ایک رقعہ دیکھ کر چونک پڑا۔ میں نے دروازہ بند کر کے وہ رقعہ کھولا تو اس پر عجلت میں بس ایک ہی سطر لکھی گئی تھی۔

'تو نے! آتے ہی مجھے فون کرو۔ سلمیٰ'، سلمیٰ سے میری کبھی کوئی خط و کتابت نہیں رہی تھی اس لیے میں اس کے طرزِ تحریر سے واقف نہیں تھا۔ لیکن وہ فقرہ وہی لکھ سکتی تھی۔ شاید اس کے دماغ کا کیڑا پھر کلبلانے لگا تھا جب ہی وہ اکیلی فلیٹ تک دوڑی چلی آئی۔ میں نے دل ہی دل

میں خدا کا شکر ادا کیا کہ میں فلیٹ پر موجود نہیں تھا ورنہ جہانگیر کو صورت دکھانا مشکل ہو جاتا۔ سلمیٰ کچھ اسی قماش کی خودسر اور خود پسند عورت تھی کہ میں نہ اس کی دوستی سے خوش تھا نہ برہمی سے۔

میں نے رقعہ پھاڑ کر بے پروائی سے ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور لباس تبدیل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ دان میں سیما کے فلیٹ پر ڈیوٹی دینے والا سپاہی مجھے نیچے نظر آیا تھا۔ اگر وہ فلور پر ہوتا تو اُس سے یہ پتا چل سکتا تھا کہ سلمیٰ میرے فلیٹ پر کس وقت آئی تھی اس سے مجھے اس کی آمد کی نوعیت سمجھنے میں مدد مل سکتی تھی۔

پوری طرح تیاری کے بعد میں سگریٹ سُلگا کر فون کے پاس بیٹھ گیا۔

جب سلمیٰ نے خلافِ معمول پہلی گھنٹی ختم ہونے سے پہلے ہی ریسیور اٹھا لیا تو میں چونک پڑا۔ یقیناً کوئی غیر معمولی بات تھی جو وہ فون سے لگی بیٹھی تھی ورنہ انتظار کے بغیر اُدھر سے جواب مشکل سے ہی ملتا تھا۔

"خیریت ہے؟ تم فلیٹ پر کیسے آئی تھیں؟" اُس کی آواز سنتے ہی میں نے براہِ راست سوال کیا۔

"جہانگیر کہاں ہیں؟" اُس کی آواز رُندھی ہوئی تھی جیسے وہ رونے ہی والی ہو۔

"مجھے نہیں معلوم۔ وہ کل صبح آیا تھا اُس کے بعد نہ فون کیا نہ خود آیا۔" میں نے کہا لیکن وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی پھوٹ کر رو پڑی اور میرا دل دہل گیا۔

وہ ریسیور لیے بُری طرح بین کر کے روئے جا رہی تھی۔ میں بڑی دیر کی خوشامد اور کوششوں کے بعد یہ اگلوانے میں کامیاب ہوا کہ جہانگیر کو گھر سے گئے ہوئے تقریباً بائیس گھنٹے ہو چکے تھے اور اس کا شہر میں کہیں پتا نہیں تھا۔

پچھلی صبح گھر سے نکلنے کے بعد وہ فیکٹری پہنچا، چار بجے شام وہاں سے واپسی کے لیے نکلا اس کے بعد سے اس کا کوئی سراغ نہیں تھا۔ سلمیٰ کو معلوم تھا کہ وہ واپسی پر اکثر میرے پاس آجاتا تھا اس لیے بے فکر رہی۔ زیادہ دیر ہو جانے پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لیے مجھے بھی فون نہیں کیا اور خواب آور گولیاں کھا کر گہری نیند سو گئی۔

صبح ساڑھے دس بجے آنکھ کُھلی اور ملازمین سے پتا چلا کہ وہ رات بھر گھر نہیں آیا تو اُس نے پہلے مجھے فون کیا میں گھر سے نکل چکا تھا اس لیے گھنٹیاں بجتی رہیں مگر کوئی جواب نہ ملا۔ فیکٹری فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پچھلی شام ساڑھے چار بجے چلا گیا تھا۔ وہ سمجھی کہ شاید میرا فون خراب ہے، سیما کے چکر میں جہانگیر پہلے بھی ایک رات غائب رہ چکا تھا اس لیے وہ ڈرائیور کے ساتھ میرے فلیٹ پر پہنچی جو مقفل تھا۔ اس وقت تک اس کے ذہن میں کوئی وہم نہیں تھا بلکہ جہانگیر کے ساتھ مجھ پر بھی غصہ تھا وہ سمجھ رہی تھی کہ ہم دونوں کسی بڑی تفریح میں اُلجھ گئے تھے۔ اس لیے وہ رقعہ ڈال کر چلی گئی۔

گھر پہنچ کر اُس نے بے تحاشا کئی جگہ فون کیے لیکن ہر جگہ سے ایک جواب کہ جہانگیر وہاں نہیں پہنچا تھا۔ خوف اور گھبراہٹ میں وہ اسپتالوں اور پولیس اسٹیشنوں سے بھی رابطہ قائم کر چکی تھی لیکن جہانگیر کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

وہ بُری خبر سُن کر بے اختیار میرا دل بھاری ہونے لگا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

سلمیٰ جتنی معلومات حاصل کر چکی تھی اس کے بعد ایک اُمید افزا توقع باقی رہ جاتی تھی کہ اُسے اغوا کر لیا گیا ہو کیونکہ اس سے اگلا امکان میرے تصور اور برداشت سے باہر تھا۔

"تم گھر پر ٹھہرو۔ میں آرہا ہوں۔" میں نے فون بند کیا اور فوراً ہی لباس بدلنے میں مصروف ہو گیا۔

اس سنگین خبر نے میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

میں پوری طرح مافیا کا رکن بن چکا تھا اور اپنے اریہ والوں سے ہونے والے تفصیلی مذاکرات میں یہ طے کر چکا تھا کہ شہر میں شی والوں سے ہمارا کوئی سمجھوتا ہونے کا قطعاً امکان نہیں ہے کیوں کہ شی اور مافیا کے مفادات میں زمین آسمان کا فرق ہے، اس لیے میں نے مافیا سے اپنی وابستگی کا ہر فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اپنے فلیٹ سے سلمیٰ کی طرف روانہ ہونے کے لیے میں نے شیراڈ کے بجائے سیٹھ حبیب کی دی ہوئی سُرخ کار ہی نکالی تھی تاکہ مافیا کے کسی رُکن سے سامنا ہونے کی صورت میں مجھے کچھ بتائے بغیر بہ آسانی پہچانا جا سکے۔

جہانگیر کی طویل گمشدگی کے بارے میں سلمیٰ کے انکشاف نے میرے ذہن میں ہولناک خیالات کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ دن میں بھی کئی بار مجھے جہانگیر کا خیال آیا تھا کہ وہ پچھلی صبح میری تحویل سے ہتھیار لے جانے کے بعد نہ خود ہی پلٹا تھا نہ اس نے مجھے فون کیا تھا۔ اس کی چوبیس گھنٹوں سے زیادہ طویل غیر حاضری کو میں اس کی بزدلی اور کم ہمتی کا نتیجہ سمجھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑنے لگا تھا کہ وہ پولیس کا سامنا کرنے سے خائف تھا اور اسی وجہ سے دور ہو گیا تھا۔ مجھے بھول کر بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ خود کسی ناگہانی مصیبت سے دوچار ہو گیا ہو گا۔

جہانگیر کے گھر میں ویسے بھی خاموشی ہی کا راج رہا کرتا تھا لیکن اس دن اس خاموشی میں بھی ہراس اور سراسیمگی کا عنصر

نمایاں تھا۔ میں نے گیٹ پر ہی چوکیدار سے جہانگیر کی واپسی کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کسی سن رسیدہ بکرے کی طرح مغموم انداز میں اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔

میں کار کا انجن بند کر کے نیچے اُترا تو خلافِ توقع سلمیٰ کہیں سے نمودار نہیں ہوئی۔ میں برآمدے کی سیڑھیاں طے کر کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو میرے قدم دروازے ہی میں گڑ کر رہ گئے کیوں کہ سامنے ہی ایک نادرِ روزگار نسوانی چہرہ نظر آیا جو میرے لیے یکسر اجنبی تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھی میرے لیے شناسائی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

وہ تین نشستوں والے ایک صوفے کے سامنے قالین پر بیٹھی ہوئی تھی اور شاید صوفے پر سلمیٰ شدتِ غم سے نڈھال ہو کر لیٹی ہوئی تھی۔ سلمیٰ کو صوفے کی اونچی پشت گاہ نے میری نظروں سے اوجھل کر دیا تھا لیکن اجنبی خاتون حیرت کے ساتھ مجھے اور میں اُسے دیکھ رہا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ عورت بےحد خوب صورت تھی لیکن اس نے اپنے نرم و نازک چہرے پر بھاری میک اَپ تھوپ کر اپنے چہرے کی قدرتی کشش کو غارت کر دیا تھا۔ لیکن مجھے اس کا زیادہ تفصیلی جائزہ لینے کی مہلت نہیں مل سکی۔ اس کی نظروں کی سمت کا اندازہ لگا کر سلمیٰ اچانک ہی صوفے سے اُٹھی اور مجھے دیکھتے ہی اونچے سروں میں روتی ہوئی میری طرف دوڑ پڑی۔ اس کی متورم آنکھوں اور سوگوار چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میرے پہنچنے سے پہلے بھی دیر تک روتی رہی تھی۔

قریب آ کر وہ بےاختیار میرے سینے سے لپٹ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ اس نے اپنے دونوں بازو مضبوطی کے ساتھ میرے بدن کے گرد کس لیے تھے۔ سلمیٰ میرے عزیز ترین دوست کی بیوی سہی، لیکن اس سے میرے مراسم کی نوعیت ہمیشہ بہت نازک رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ مجھے اپنی اداؤں کا قیدی بنانا چاہا لیکن میں اس سے دور بھاگتا رہا مگر اُس وقت جہانگیر کی گم شدگی کے اضطراری ردِعمل نے شاید اس کے لاشعور میں دبی ہوئی خواہش کو عملی صورت اختیار کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا اور میں بُری طرح بدحواس ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ وہ موم کی مورت تھی اور نہ میں پتھر کا کوئی بےجان پتلا۔ اس کے بھرپور وجود کی یلغار ہوتے ہی جہانگیر کی فکر ذہن سے ایک دم پھسل گئی اور دورانِ خون یک بیک اس طرح تیز ہو گیا جیسے میرے بدن کی دیگچی تلے سلمیٰ نے کوئی الاؤ بھڑکا دیا ہو۔ میں نے تلملا کر اس کی گرفت سے نکلنا چاہا لیکن وہ جونک کی طرح میرے بدن سے لپٹی، میرے سینے سے اپنا چہرہ رگڑ رگڑ کر روتی رہی۔ وہ اس موقع اور دستور سے لاشعوری طور پر فائدہ اُٹھا رہی تھی۔ چند ہی ثانیوں میں میں نے اندازہ لگا لیا کہ زور آزمائی کر کے اس کی گرفت سے نکلنا آسان نہیں تھا، لیے میں نے بوکھلا کر احمقانہ انداز میں اسے پچکارنا شروع کر دیا۔

"صبر کرو سلمیٰ ڈارلنگ!" دوسری خاتون بھی قریب آ کر اسے دلاسا دینے لگی۔ "جانے والے کے لیے اتنا رونے سے تمھاری لائف کا کیا بنے گا؟ تم ابھی ینگ ہو، صبر سے کام لو، پھر ابھی تو کچھ پتا بھی نہیں چلا کہ وہ بےچارہ زندہ ہے یا مر گیا، ہمت سے کام لو، ہو سکتا ہے کہ جلد ہی کوئی اچھی خبر آ جائے۔"

وہ پلکیں جھپکا جھپکا کر اور سر ہلا ہلا کر دانشورانہ انداز میں بول رہی تھی۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ بمشکل ڈیڑھ دو فٹ رہ گیا تھا اور اس کے بدن سے اُٹھنے والی سینٹ کی تیز مہکار براہِ راست میرے نتھنوں پر اثرانداز ہو رہی تھی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی گھنی اور لمبی لمبی پلکوں پر غیرضروری طور پر اتنا گہرا مسکارا لگایا ہوا تھا کہ اس کا قرب حاصل کرنے والا اپنی رُوسیاہی کی بدولت فوراً ہی پہچان لیا جاتا۔ سلمیٰ خوش مزاج اور فراخ دل ضرور تھی لیکن اس قدر فیشن زدہ نہیں تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ وہ اجنبی خاتون اس وقت وہاں کیوں اور کیسے موجود تھی؟ اس سے پہلے میں نے کبھی اسے سلمیٰ کے گھر میں نہیں دیکھا تھا لیکن اس کی بےتکلفی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مدت سے سلمیٰ کو جانتی تھی۔

اس خاتون کے بےتکے اور نحوست آمیز فقروں پر مجھے غصہ آ گیا۔ "سلمیٰ کو پُرسہ نہیں، دلاسا دینے کی ضرورت ہے۔ جہانگیر جلد ہی گھر لوٹ آئے گا۔ تم ایسے بدشگونی کے کلمات مُنہ سے کیوں نکال رہی ہو؟"

اس نے یوں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا جیسے اس لمحے تک میری وہاں موجودگی سے یکسر لاعلم رہی ہو، پھر طنزیہ لہجے میں بولی۔ "ہر شخص کو بہترین حالات کی توقع رکھنے کے ساتھ ہی بدترین صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔" انگریزی محاورہ ولایتی لہجے میں دُہرا کر وہ پھر اُردو پر آ گئی۔ "میں تو اسے یہی سمجھانا چاہ رہی ہوں کہ لوگ مرنے والوں پر اتنا نہیں روتے جتنا یہ اپنے گم شدہ شوہر پر رو رہی ہے۔"

"ہو سکے تو کچھ دیر خاموش رہو، میں اسے سنبھال لوں گا۔" میں نے جھنّا کر تیز لہجے میں کہا اور وہ بےپروائی سے یوں شانے اُچکا کر مڑ گئی جیسے مجھے بھاڑ میں جانے کا مشورہ دے رہی ہو۔

میری تھوڑی سی ہمدردانہ چابک دستی نے سلمیٰ کے لاشعور میں دبے ہوئے خیالات کو ذہن کی سطح پر کھینچ لیا۔

جوں ہی اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی ایک سہیلی کے سامنے اپنے شوہر کے ایک دوست کے سینے سے لگ کر رو رہی ہے، وہ جھرجھری لے کر مجھ سے الگ ہو گئی اور مجھ سے نظریں چار کیے بغیر رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "اُن کا پتا لگاؤ، اُنھیں کہیں سے بھی پیدا کرو۔ پتا نہیں وہ کہاں رہ گئے؟ مجھے فون کیے بغیر وہ کہیں نہیں رُکنے والے تھے۔"

"صبر سے کام لو سلمیٰ!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "وہ گھر آ جائے گا۔ خدانخواستہ، کوئی حادثہ پیش آیا ہوتا تو اب تک پولیس یا کسی اسپتال سے کوئی خبر مل گئی ہوتی۔۔۔"

"اب تم کیوں بدشگونی کر رہے ہو؟" اجنبی خاتون میری بات کاٹ کر چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں نے خدانخواستہ بھی کہا تھا۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے ترش لہجے میں کہا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ بےپروائی سے بولی۔ "تم مسلم ہو، تم نے اپنے مذہب کے لحاظ سے کہا۔ میں کرسچین ہوں، میں نے اپنی فنگرز کراس کر لی تھیں، بات ایک ہی ہے۔"

"اس معزز خاتون کی تعریف کیا ہے؟" میں نے زچ ہو کر سلمیٰ سے سوال کیا جو میرے اور اجنبی خاتون کے درمیان پیدا ہو جانے والی تلخی سے بےخبر معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے رونے دھونے میں اس نے شاید ہم دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو پر کان دھرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

"یہ مسز ڈی سوزا ہیں۔ اسی علاقے میں رہتی ہیں۔" سلمیٰ نے سوگوار لہجے میں ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "اور یہ ڈڈ۔۔۔ پیٹر واک ہیں، میرے شوہر کے پرانے اور بہت ہی گہرے دوست۔"

میرا اصل نام لیتے لیتے وہ اچانک سنبھل گئی تھی اور اسے یاد آ گیا تھا کہ ان دنوں میں اپنے اصل نام سے پکارا جانا بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ مجھ سے مل کر دل کی بھڑاس نکال لینے کے بعد وہ قدرے پُرسکون ہو گئی تھی یا شاید رو رو کر اتنی نڈھال ہو چکی تھی کہ اس میں مزید رونے پیٹنے کی ہمت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

وہ مجھ سے بہت زیادہ بےتکلف اور بےحجاب تھی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ شدتِ الم میں اضطراری طور پر مجھ سے گلے لگنے کے بعد جوں ہی اسے اپنی حرکت کا اندازہ ہوا تھا، وہ پشیمان نظر آنے لگی تھی۔ اس واقعے کے بعد اس نے ایک مرتبہ بھی مجھ سے نظریں چار کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنی تمام تر آزاد خیالی اور فراخ دلی کے باوجود اندر سے ایک مشرقی عورت تھی جو روایتی طور پر اپنی شرم کے حصار کی قیدی ہوتی ہے۔ جب کسی کو چاہتی ہے، اسے اپنے من مندر کی غیرمرئی دیواروں میں اندر ہی اندر پوجتی رہتی ہے۔ محبوب سے سامنا ہوتا ہے تو کبھی پیش قدمی نہیں کرتی بلکہ چاہتی ہے کہ ناز و انداز اور عشوہ و ادا کے تیروں سے اسے ایسا گھائل کرتی ہے کہ وہ خود ہی اپنی خودداری کو خیرباد کہہ کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتا ہے لیکن میرے معاملے میں سلمیٰ غیرارادی طور پر ایک جذباتی غلطی کر بیٹھی تھی۔ مسز ڈی سوزا سے میرا تعارف کراتے ہوئے یہ احساس حیا کی سُرخی بن کر اس کے پژمُردہ چہرے پر بھی جھلک آیا تھا کہ جذبات کی رَو میں بہہ کر وہ چند لمحوں پہلے مجھ سے اپنا ہلکا سا جسمانی تعارف بھی کرا بیٹھی تھی جس سے میں اس وقت تک سراسر ناآشنا تھا۔

"اوہ!" مسز ڈی سوزا میرے تعارف پر قدرے استہزائیہ لہجے میں بولی تھی۔ "مسٹر پیٹر واک بھی میری ہی طرح غیرمسلم معلوم ہوتے ہیں، پھر انھیں خدانخواستہ کی کیا سوجھی تھی؟"

"تم اینگلو پاکستانی معلوم ہوتی ہو!" میں نے طنزیہ لہجے میں براہِ راست اسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں تمھارا پہلا نام کیا ہے؟ لیکن تمھیں اتنا ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ مذہب انسان کی آفاقی شناخت ہوتا ہے جب کہ نام اس علاقے اور معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جہاں کوئی شخص پیدا ہوتا ہے۔ میں غیرملکی ضرور ہوں لیکن اسی کے ساتھ مسلمان بھی ہوں۔ محض نام کی وجہ سے تم کو کسی کی مسلمانی پر تبصرہ کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔"

وہ کرسچین تھی لیکن پاکستانی تھی اور اُردو پر خاصا عبور رکھتی تھی۔ میرے خاموش ہوتے ہی اس کا رنگا ہوا چہرہ مزید سُرخ ہو گیا اور وہ تُنک کر غصیلے لہجے میں بولی۔ "تم بہت مُنہ زور اور گستاخ معلوم ہوتے ہو۔ تمھیں عورتوں سے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔ تم مجھ سے اس چھت کے نیچے نہ ملے ہوتے تو میں بتاتی کہ۔۔۔!"

"پلیز ریٹا!" سلمیٰ نے ہاتھ فضا میں بلند کر کے کمزور لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "میں جہانگیر کے لیے پریشان ہوں اور تم دونوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ ہمیں سر جوڑ کر جہانگیر کے بارے میں کچھ سوچنا چاہیے۔"

"سر جوڑنے سے ریٹا کے بال خراب ہو جائیں گے۔" میں نے اپنی بےساختہ مسکراہٹ کو دباتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن ہمیں غور ضرور کرنا چاہیے۔ تم ذرا جلدی سے کل صبح سے اب تک کے واقعات دُہراتی چلی جاؤ تاکہ میں اس مسئلے پر اپنی کوئی رائے قائم کرنے میں کامیاب ہو سکوں۔"

ریٹا مجھے غصیلی نظروں سے گھور کر رہ گئی لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولی۔

سلمیٰ نے تھکے ہوئے لہجے میں پچھلی صبح جہانگیر کے دفتر روانہ ہونے سے اپنی کہانی شروع کر دی۔

ساری تفصیلات وہی تھیں جو وہ مجھے فون پر بتا چکی تھی۔ اس میں صرف اتنا اضافہ ہوا کہ میرے فلیٹ سے واپس لوٹ کر جب اسے فون پر جہانگیر کے ہر قریبی واقف کار سے ایک ہی جواب ملا تو وہ خوف زدہ ہوگئی۔ اس علاقے میں ریٹا سے اس کی گہری دوستی تھی جس کا شوہر شہر کا ایک کامیاب وکیل تھا۔ سلمیٰ نے اسے فون کیا تو وہ اپنے شوہر کے ساتھ کسی لنچ پارٹی میں جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ سلمیٰ کا سنگین معاملہ سامنے آتے ہی وہ اپنے شوہر سے معذرت کر کے سلمیٰ کے گھر آگئی۔ اس وضاحت سے میرے ذہن سے وہ اُلجھن دور ہوگئی جو ریٹا کے گاڑھے میک اَپ کی وجہ سے بار بار میرے ذہن میں ڈنک مار رہی تھی۔

کراچی ایک مخصوص مزاج کا شہر ہے جہاں ہر قسم کی سماجی تقریبات دن ڈھلے ہی شروع ہوتی ہیں اس لیے دن دہاڑے کسی خوبرو خاتون کو سولہ سنگھار سے لیس دیکھ کر چونکنا قدرتی امر تھا۔ بازاروں میں خریداری اور بچوں کو اسکول سے لانے لے جانے کے لیے ہلکا پھلکا میک اَپ ہی چلتا تھا۔ جس کے ہونے یا نہ ہونے کا پتا بھی نہیں چلتا تھا لیکن ریٹا پوری طرح تیار ہو کر اپنے شوہر کے ساتھ لنچ پارٹی میں جانے والی تھی اس کا مطلب تھا کہ وکیل صاحب کسی تگڑے مؤکل کو پھانسنے کی فکر میں تھے یا بیوی کو ساتھ لے جا کر کسی افسر کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے اور ہر دو صورتوں میں ریٹا کا رول اہم تھا۔ مگر اس نے سلمیٰ کی دوستی کی خاطر اپنے شوہر کی کاروباری مصلحت کو قربان کر دیا تھا۔ اس ایک نکتے نے میرے دل میں ریٹا کے لیے عزت اور احترام کے جذبات پیدا کر دیے۔

"سب سے پہلے میں ماحول کی تلخی کو ختم کرنے کے لیے ریٹا سے اپنی گفتگو پر معذرت خواہ ہوں۔" سلمیٰ کے خاموش ہو جانے پر میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ میرے الفاظ پر ریٹا کی نظروں میں مسرت آمیز چمک کوند گئی۔

"نیور مائنڈ پیٹر!" وہ دوستانہ لہجے میں بولی تھی۔ "یو آر گریٹ...!"

"میں احتیاطاً سول، جناح اور عباسی اسپتال سے ایک بار پھر معلوم کر لیتا ہوں۔ اس کے بعد ہمیں جہانگیر کی گم شدگی کی رپورٹ درج کرانی ہوگی۔" میں نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔

"تینوں اسپتال کے علاوہ بھی میں ہر جگہ فون کر چکی ہوں۔ اُن کا کہیں سراغ نہیں ملا، تم چاہو تو تم بھی کوشش کر کے دیکھ لو، اس معاملے میں پولیس کیا مدد کر سکے گی؟" سلمیٰ نے سوال کیا۔

"پیٹر ٹھیک کہہ رہا ہے۔" ریٹا ناصحانہ انداز میں بولی۔

"آج کل شہر میں کوئی گینگ کام کر رہا ہے، وہ مال دار لوگوں کو اُٹھا کر ان کے رشتے داروں سے تاوان طلب کرتے ہیں۔"

"انھیں اغوا کیا گیا ہے تو میں ہرگز پولیس سے کوئی مدد نہیں لوں گی۔" یہ امکان سامنے آتے ہی سلمیٰ گھبرا کر بول پڑی۔ "تاوان وصول کرنے والے مغوی کے لواحقین کو ہمیشہ پولیس سے دُور رہنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ اپنے سرتاج کی زندگی بچانے کے لیے میں اپنا پورا بینک بیلنس دے سکتی ہوں، ضرورت پڑی تو سارے زیور بھی بیچ دوں گی لیکن انھیں کوئی گزند نہیں پہنچنے دوں گی۔" فرطِ جذبات سے ایک بار پھر اُس کی آواز رُندھنے لگی۔

"پھر ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اغوا کرنے والوں کو تم سے جلد ہی رابطہ قائم کرنا چاہیے۔"

"وہ کل شام کو چار اور ساڑھے چار کے درمیان دفتر سے نکلا تھا۔ تھوڑی دیر میں اسے غائب ہوئے چوبیس گھنٹے پورے ہو جائیں گے لیکن ابھی تک شہر میں اس کی کار کا بھی پتا نہیں چلا۔" ریٹا بولی۔

"کیسے پتا چلے گا؟" میں نے اسی سے سوال کر ڈالا۔ "نہ ہم نے پولیس میں رپورٹ کرائی ہے، نہ پورا شہر چھانا ہے۔ سچ پوچھو تو سلمیٰ کو چند گھنٹے پہلے ہی اس کا خیال آیا ہے اور ابھی ہم گھر میں بیٹھے سوچ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی کار کسی فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی ہو۔ جب تک اسے وہاں کھڑے دو تین دن نہ گزر جائیں، کسی کو کار کے لاوارث ہونے کا شبہ نہیں ہوگا۔ رہائشی علاقے میں لاوارث گاڑی جلد نوٹ کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے تجارتی علاقے کا انتخاب کیا ہو تو یہ مدت زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ ایک امکان یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے گاڑی سمیت اغوا کیا گیا ہو۔ جب تک ان لوگوں کی طرف سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا جاتا ہم اسی طرح اندھیرے میں رہیں گے۔"

"تمھاری باتیں معقول ہیں۔" ریٹا پوری سرگرمی کے ساتھ گفتگو میں حصہ لے رہی تھی۔ "کیوں نہ ہم اپنے طور پر شہر میں جہانگیر کی گاڑی کی تلاش شروع کر دیں۔ اس طرح حادثے کا امکان تو خارج ہو ہی جائے گا۔"

"میری دانست میں وہ اَب بھی خارج از امکان ہے۔ حادثہ ہوا ہوتا تو اب تک خبر مل جاتی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے بجائے گاڑی کی تلاش کا آئیڈیا بہرحال مناسب ہے۔" میں نے کہا۔

"میں ڈرائیور کے ساتھ نکل جاتی ہوں، تم دونوں الگ الگ نکل جاؤ، میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ سورج غروب ہونے سے پہلے ہم کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔" سلمیٰ اضطراری لہجے میں بولی۔

"لیکن میں جہانگیر کی گاڑی نہیں پہچانتی!" ریٹا نے معذوری ظاہر کی۔

"لیکن وقت تو دے سکتی ہو نا؟" میں نے اس سے سوال کیا اور پھر اس کا اثباتی جواب سُن کر بولا۔ "سلمیٰ اس وقت اکیلی نہیں رہ سکتی۔ اسے سہارے کی ضرورت ہے۔ تم اس کے ساتھ یہیں ٹھہرو۔ میں تلاش میں نکلتا ہوں۔ سلمیٰ کی کار ڈرائیور لے جائے گا۔ دو آدمی اس مہم کے لیے کافی ہوں گے۔"

"گیراج میں دوسری کار بھی موجود ہے، میں ریٹا کے ساتھ چلی جاؤں گی۔" سلمیٰ نے کہا۔

"کار کی پروا نہیں ہے۔ میری گاڑی گھر پر کھڑی ہوگی وہ لے لوں گی۔" ریٹا نے پیش کش کی۔

"تمھیں گھر پر رُکنا ہے۔" میں نے سلمیٰ سے کہا۔ وہ اپنے ابتدائی ردِعمل کی ندامت پر غالب آچکی تھی اور میری طرف دیکھ کر بات کر رہی تھی۔ میری ہدایت سُنتے ہی اس نے احتجاج کرنا چاہا لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کر دیا۔ "ہم تینوں میں سے کسی ایک کا گھر پر موجود رہنا ضروری ہے تاکہ اغوا کرنے والے خود فون کریں یا جہانگیر سے فون کرائیں تو اس کال کو پورے ہوش اور ذمے داری سے اٹینڈ کیا جا سکے۔ یہ کام تمھارے ملازمین پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"ہاں ڈارلنگ!" ریٹا نے میری تائید کرتے ہوئے کہا۔ "پیٹر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ فون جہانگیر کا ہوا تو تم ہی صحیح طریقے پر اس کی بات سمجھ سکو گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اشارے کنائے میں کچھ بتانا چاہے۔ کوئی اور ہوا تو میں بات کر لوں گی، ورنہ یہاں بیٹھی تمھارا دل بہلاتی رہوں گی۔ ہمیں اس کے مشورے پر عمل کرنا چاہیے۔"

وہ دونوں آپس میں باتوں میں مصروف ہوگئیں اور میں سگریٹ سُلگا کر اپنے لائحہ عمل کے بارے میں غور کرنے لگا۔ اس وقت مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ کراچی کس بُری طرح پھیلا ہوا شہر تھا۔ ایک کونے پر سینڈز پٹ کی ساحلی تفریح گاہ تھی تو دوسرا کونا نئی کراچی کی دُور اُفتادہ بستی کے سرے پر تھا۔ اس کے متوازی قصبہ کالونی سے آگے پہاڑوں کی اوٹ میں منگھو پیر کا علاقہ تھا۔ کیماڑی، کورنگی، کریک، کورنگی، ملیر، لانڈھی، گلشنِ حدید ایک طرف تھے تو گلشن اقبال سے یونیورسٹی اور پھر ملیر چھاؤنی تک پھیلی ہوئی گنجان آبادیاں دوسری طرف تھیں۔

"پیٹر کے لیے کیبنٹ سے اسکاچ کا ایک گلاس بنا دو ریٹا! اپنے لیے بھی وہیں سے کچھ لے لینا۔" سلمیٰ کی کمزور سی آواز میں کہے گئے اِن الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔

"نہیں ریٹا! تم زحمت نہیں کرو، اس وقت میں کچھ نہیں لوں گا۔" میں نے کہا۔

"تکلف نہ کرو۔" سلمیٰ میری طرف دیکھ کر بولی۔ "مجھے معلوم ہے کہ پی کر تمھارا دماغ زیادہ تیزی سے کام کرنے لگتا ہے۔"

"تم لو یا نہ لو، میں تو برین کا ایک پیگ ضرور لوں گی۔" ریٹا اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے بولی۔ "بے چاری سلمیٰ کی پرابلم نے میرا بھی دماغ ہلا کر رکھ دیا ہے۔"

"تم ساتھ دو گی تو پھر میرے لیے بھی اسکاچ لیتی آنا۔" میں نے کہا اور ریٹا اٹھلاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

قہر کا حال مُردہ ہی جانتا ہے۔ یہ مثال میں بارہا سُن چکا تھا اور اُس وقت وہی مثال سلمیٰ پر صادق آرہی تھی۔ وہ جہانگیر کی گم شدگی پر اپنے وجود کے اندر ہی اندر پگھلی جا رہی تھی۔ موہوم اندیشے، اندھیری رات کے آسیبی سایوں کی طرح اس کے دل و دماغ پر منڈلا رہے تھے، اس کے لیے زندگی سرد، سپاٹ اور بے کیف ہو چکی تھی لیکن میں جہانگیر کا جگری دوست ہوتے ہوئے بھی اس وقت ریٹا کی اٹھلاتی ہوئی چال سے لطف اندوز ہونے کے قابل تھا۔ سلمیٰ کا صدمہ مجھ پر اثر انداز ضرور ہوا تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ میری ساری جمالیاتی حس بے جان ہو کر رہ جاتی اور وہی ہم دونوں کے درمیان کا فرق تھا۔ وہ پوری حد تک اس سانحے میں جذباتی طور پر ملوث تھی جب کہ اُس کے مقابلے میں میری حیثیت ایک ہمدرد تماشائی کی سی تھی۔ مجھے سلمیٰ سے ہمدردی تھی، جہانگیر کی فکر بھی تھی لیکن اسی کے ساتھ ریٹا کی مستانی چال کو نظر انداز کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ وہ کیفیت میں ارادی طور پر اختیار کرنے سے قاصر تھا جو کرب بن کر سلمیٰ کے وجود میں سما گئی تھی۔

ریٹا سلور ٹرے میں دو پیگ لے کر آئی تو اس کے لبوں پر موہوم سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ شاید میری تلخ کلامی کو لحاظ کی لگام دے کر وہ من ہی من میں خوش تھی۔

"جہانگیر کی خیریت اور بازیابی کے نام۔" ریٹا نے برین کا پیمانہ اُٹھا کر کہا اور میں نے اپنا گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں آدھا کر دیا۔ مجھ پر یکا یک ہی ملامت کا احساس طاری ہونے لگا تھا۔

"ارے! یہ کیا کر رہے ہو تم؟" ریٹا اپنے لب تر کر کے حیرت سے بولی۔

"میں وقت ضائع کیے بغیر اپنی مہم پر روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔" میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا اور دوسرے گھونٹ میں گلاس خالی کر کے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "مجھے افسوس ہے ریٹا! کہ میں تمھارا ساتھ نہیں دے

سکا۔ مجھے اُمید ہے کہ تم میری اس بدتمیزی کو معاف کر دو گی۔"

"نیور مائنڈ!" اس نے ہاتھ فضا میں لہرا کر اپنے مخصوص بے پروایانہ انداز میں کہا اور میں سر جھکا کر ڈرائنگ روم سے باہر نکلتا چلا گیا۔ حلق سے تیزی کے ساتھ معدے میں اُترنے والی تلخی کے باعث مجھے اپنی آنکھوں میں نمناک سی سوزش محسوس ہونے لگی تھی۔

باہر سلمیٰ کے گھریلو ملازمین برآمدے سے ذرا دور ٹولی بنائے نیچی آواز لیکن پُرجوش انداز میں شاید جہانگیر کی اچانک گم شدگی پر قیاس آرائیوں میں مصروف تھے۔ میری جھلک دیکھتے ہی وہ تیزی کے ساتھ تتر بتر ہوئے تھے لیکن میں نے ڈرائیور کو آواز دے کر اپنی طرف بُلا لیا۔

وہ اپنے مالک کی گم شدگی پر خاصا اُداس نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے ڈیفنس کی تمام قابلِ ذکر گلیوں، شہر کے مرکزی کاروباری ٹھکانوں، طارق روڈ اور بہادر آباد میں جہانگیر کی کار کی تلاش کی ہدایت کر کے اپنی سُرخ کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اس وقت میں خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہا تھا۔ جہانگیر لاپتا تھا اور سلطان شاہ جاز فارماسیوٹیکل میں بہروپ رچائے اپنی نوکری بھگتا رہا تھا جہاں دواسازی کی آڑ میں ہیروئن کے کیپسول بھرے جاتے تھے۔

اس وقت شام کے چار بجے تھے اس لیے سڑکوں پر بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ پُرسکون انداز میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے اچانک ہی میرے ذہن میں ایک نئے شبہے نے سر اُبھارا۔

پچھلی صبح میں نے دلدار آغا کو فون کر کے اسے لنگڑے گھوڑے کے خطاب سے نوازا تھا اور ساتھ ہی، اُس کے ہاتھوں مرنے والی سیما کا عاشق بن کر اس کے بدترین انجام کے بارے میں دھمکیاں دی تھیں جس کے بعد وہ اپنے گھر سے غائب ہو گیا تھا اور اسی شام سے جہانگیر بھی غائب تھا۔

یہ ایک بہت قوی امکان تھا۔ اپنے اردگرد موت کے بھیانک سائے منڈلاتے ہوئے دیکھ کر دلدار آغا یا ڈی ڈی اپنے بچاؤ کے لیے موہوم ترین امکانات پر بھی کام شروع کر سکتا تھا۔ ان ہی میں یہ امکان بھی اس کے ذہن میں اُبھر سکتا تھا کہ کہیں شی کا باغی، ڈینی خفیہ طور پر شہر میں واپس نہ آ گیا ہو۔

اس کے دو آدمیوں نے شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں غزالہ کو مجھ سے ملتے ہوئے دیکھا تھا لیکن خوش قسمتی سے وہ دونوں ہی مجھے نہیں پہچانتے تھے۔ ان میں سے بھی سرکاری دفتر میں کام کرنے والا صرف ایک شخص باقی رہ گیا تھا جب کہ امیر داد سلطان شاہ کے ہاتھوں جہنم کا ایندھن بن چکا تھا۔ دوسری طرف ڈی ڈی نے اُس پُراسرار ملاقات کے بارے میں غزالہ سے سرے سے کوئی بات نہیں کی تھی اس لیے ان ذرائع سے اُسے میرے بارے میں کوئی سُراغ نہیں مل سکتا تھا۔

وہ کراچی بلکہ پاکستان میں شی کی سُکڑی ہوئی، نئی تنظیم کا سربراہ تھا اور اُسے وراثت میں ملنے والے مواد سے یہ معلوم ہونے کا سو فیصد امکان تھا کہ بہت سے دوسرے سابق کارندوں کے ساتھ جہانگیر بھی ایک زمانے میں سرگرمی سے شی کے لیے کام کرتا رہا تھا۔ اسی طرح یہ بات بھی لازمی طور پر ریکارڈ پر ہوتی کہ میری اور جہانگیر کی اٹوٹ دوستی تھی اس لیے وہ جہانگیر پر ہاتھ ڈال کر تشدد کے ذریعے اس سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر سکتا تھا کہ ان دنوں میں کہاں تھا اور میری کیا مصروفیات تھیں۔

میں نے اس نظریے پر جتنا غور کیا وہ اسی قدر مضبوط ہوتا چلا گیا اور مجھے شدت سے سلطان شاہ کی ضرورت محسوس ہونے لگی کیوں کہ میں اپنے تمام ہتھیار جہانگیر کو سونپ چکا تھا اور اس ہنگامی صورتِ حال میں سلطان شاہ ہی کہیں سے ہر قسم کا اسلحہ فراہم کر سکتا تھا۔

میں نے گاڑی کا رُخ کورنگی انڈسٹریل ایریا کی طرف جانے والے راستوں پر موڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ ڈی ڈی کے دواساز کارخانے سے قریب ترین بس اسٹاپ پر پانچ بجے کے قریب سلطان شاہ آسانی سے ساتھ مجھے مل سکتا تھا۔ اسے ساتھ لے کر میں فوری طور پر اپنی مہم کا آغاز کر سکتا تھا۔

میں جہانگیر کے ساتھ نیشنل ریفائنری کے نواح میں واقع اس کی گارمنٹ فیکٹری کی تو سیر کر چکا تھا لیکن دلدار آغا کے دواساز کارخانے کے لیے مجھے سلطان شاہ کے سمجھائے ہوئے راستے پر انحصار کرنا پڑا اور جب جاز فارماسیوٹیکل کا بورڈ نظر آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ دونوں کارخانوں کے درمیان بمشکل دو ڈھائی میل کا فاصلہ تھا۔ اس فاصلے کے ایک سرے پر میرا جگری دوست تھا اور دوسرے سرے پر بدترین دشمن۔

اس وقت پونے پانچ بجے تھے اس لیے میں تیز رفتاری کے ساتھ ایس جے گارمنٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ پانچ ایکڑ کے وسیع رقبے میں ایک سرے پر بنی ہوئی عمارت کے قریب میں نے احاطے کے پھاٹک پر ہارن بجایا تو فوراً ہی ذیلی کھڑکی سے دراز قامت چوکیدار، ریشم خان نمودار ہوا جس کے شانے پر جدید رائفل کے ساتھ ہی کارتوسوں کی پیٹی بھی جھول رہی تھی۔

میرا خیال تھا کہ مجھے اپنا تعارف کرانا ہو گا لیکن ریشم خان ان پیدائشی چوکیداروں میں سے تھا جو کسی چہرے کو ایک بار دیکھ لیں تو زندگی بھر اُسے نہیں بھولتے۔ اس نے میری جھلک دیکھتے ہی مجھے فوجی انداز میں سلام کیا تھا اور پھاٹک کھولنے کے لیے پھرتی سے ذیلی کھڑکی کی طرف واپس مڑا تھا کہ میں نے اسے بلا لیا۔

"صاحب آیا یا نہیں آیا؟" اس کے قریب آنے پر میں نے سوال کیا۔

"نہیں آیا صاب!" وہ مغموم انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "پتا نہیں وہ کدھر چلا گیا؟"

"کل شام وہ فیکٹری سے اکیلا گیا تھا؟" میں نے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا۔ اس وقت اچانک ہی مجھے جہانگیر کی سیلونی اسٹینو، جولیا، یاد آ گئی جسے ساتھ لے کر وہ کپڑا خریدنے کے بہانے کئی دن فیصل آباد میں گزار کر آیا تھا۔ مجھے پہلی بار شبہ ہوا تھا کہ کہیں جہانگیر اسی کے ساتھ کسی ہوٹل کے کمرے میں محصور نہ ہو گیا ہو۔

"صاب، جولیا بی بی کو ساتھ لے جاتا ہے۔" اس کا جواب سُن کر میرے دل کی دھڑکنیں بے اختیار تیز ہو گئی تھیں لیکن اس کے اگلے فقروں سے سارا جوش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "کل جولیا بی بی چھٹی پر تھا۔ آج وہ دفتر آیا ہے، وہ بھی صاب کے لیے پریشان ہے۔ ٹھیکے والا کاریگر لوگ بھی آج مشینوں پر نہیں گیا۔ سب لوگ صاب سے بہت محبت کرتا ہے۔"

"صاحب جلدی واپس آ جائے گا۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ اس کے سعادت مندانہ رویے سے مجھے گمان ہوا تھا کہ میں اس سے رائفل لے کر فوری طور پر خود کو مسلح کر سکتا تھا۔ فیکٹریوں کی دربانی وغیرہ کے لیے رائفل ویسے بھی صرف نمائشی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا رواج پڑ گیا تھا ورنہ اس کی حقیقی ضرورت برسوں میں شاید ہی کبھی پیش آتی ہو۔

"تمہارے صاحب کی تلاش میں کسی سے جھگڑا بھی ہو سکتا ہے اور میں غیر مسلح ہوں۔" چند ثانیوں تک سوچنے کے بعد میں نے ریشم خان سے کہا۔ "تم اپنی رائفل اور کارتوسوں کی پیٹی مجھے دے دو تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔"

میری بات سنتے ہی ریشم خان کا چہرہ اُتر گیا جیسے میں نے اسے کوئی کڑی سزا سنا دی ہو۔ وہ مجروح لہجے میں بولا تھا۔ "ہم جانتا ہے کہ تم صاب کا بہت پرانا گہرا دوست ہے۔ حکم کرو تو ہم اپنا جان تمہارے پیروں میں قربان کر دے گا لیکن رائفل.....! یہ ہمارا زیور ہے۔ یہ کسی کو نہیں دے سکتی۔ اسے صاحب واپس لے گا یا مرنے کے بعد یہ ہم سے جُدا ہو گا۔"

ہتھیار کے بارے میں اس کا نظریہ بہت مضبوط اور غیر متزلزل تھا۔ اس کے انکار سے مجھے ذہنی جھٹکا تو لگا لیکن اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ بے اعتباری اور بدکرداری کے اس دور میں کچھ ایسے لوگ بھی پائے جاتے تھے جو اپنی صدیوں پرانی روایات پر سچے دل سے عمل پیرا تھے اور اس کے اظہار میں کوئی عیب نہیں سمجھتے تھے۔

"ٹھیک ہے، ریشم خان! تم ڈیوٹی دو، میں جا رہا ہوں۔" میں نے گاڑی ریورس گیئر میں ڈالتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھے کسی قسم کی تواضع کے لیے روکنا چاہا لیکن میں وقت ضائع کیے بغیر وہاں سے جاز فارماسیوٹیکل کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر میں فیکٹری سے چھٹی کے وقت سلطان شاہ کو پکڑنے میں ناکام رہا تو پھر رات گئے تک اسے کہیں بھی تلاش نہیں کر سکوں گا۔ وہ روشنیوں کے اس گہنائے ہوئے شہر میں، ہر قسم کی فکر سے آزاد، ایک لاأبالی نوجوان تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ چھٹی ہونے کے بعد وہ سیدھا اپنے گھر ہی جاتا۔ وہ راستے میں کہیں بھی رُک سکتا تھا۔

جاز فارماسیوٹیکل فیکٹری ایک اندرونی گلی میں دوسرے کارخانوں کے درمیان واقع تھی اور وہاں سے نکلنے والے مزدوروں کے لیے کئی راستے موجود تھے مگر بس اسٹاپ کی طرف آنے والا ایک ہی راستہ تھا۔ میں اسی کے اختتام پر مین روڈ کے کنارے اس طرح رُک گیا کہ فیکٹری سے آنے والا کوئی بھی شخص میری نظروں میں آئے بغیر کسی بس یا ویگن میں سوار نہیں ہو سکتا تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں نے سگریٹ سُلگا لی تھی اور گاڑی کا انجن بند کر دیا تھا۔

پانچ بجتے ہی قرب و جوار کی کئی فیکٹریوں سے چھٹی کا گھنٹا بجائے جانے کی آواز اُبھری۔ ایک دو بڑے کارخانوں میں سائرن بجائے گئے اور چند ہی ثانیوں بعد گلیوں سے مزدوروں اور دفاتر میں کام کرنے والوں کی بھیڑ برآمد ہونے لگی۔ ویرانے راستوں پر کاروں، اسکوٹروں اور پیدل چلنے والوں کا ہجوم دیکھتے ہی دیکھتے چھا گیا تھا۔ ایسے میں ہر فرد پر نگاہ رکھنا میرے اندازے سے کہیں زیادہ دشوار ثابت ہو رہا تھا۔

پھر کسی فیکٹری میں کام کرنے والی لڑکیوں سے بھری ہوئی بس نمودار ہوئی اور مرد کارکنوں کے درمیان سے کسی طوفانِ بدتمیزی کے بغیر نکلتی چلی گئی تو اس ڈسپلن پر مجھے خاصی حیرت ہوئی۔ ہمارے مخصوص معاشرے میں نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھ کر غیر تعلیم یافتہ بلکہ اب تو تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی ہیجان اور شرپسندی کے رجحانات کا پیدا ہونا روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔ بھیڑ بھاڑ میں خواتین سے دست درازی کے واقعات آئے دن سُننے میں آتے ہیں۔ اگر لوگ بہت زیادہ تہذیب کا مظاہرہ کریں تو پھر بھی سیٹیاں اور آوازے ضرور سُنائی دیتے ہیں لیکن صنعتی علاقے کے ان کارکنوں میں مجھے ایسا کوئی

مظاہرہ نظر نہیں آیا شاید اس کا سبب وہ طبقاتی ہمدردی تھی جو ہر مزدور کے دل میں اپنے ساتھیوں کے لیے پائی جاتی ہے۔ آگ، لو ہے، زہریلے کیمیاوی مادوں اور دوسرے بہتیرے مضرِ صحت صنعتی خام مال سے لڑ کر، ایڑی سے چوٹی تک پسینہ بہا کر روزی کمانے والے مردوں کو اندازہ تھا کہ ان کے ساتھ جو لڑکیاں یا عورتیں کارخانوں میں کام کرتی ہیں وہ کسی ناگزیر مجبوری کے تحت اپنے گھروں سے نکلتی ہیں۔ کسی کے سر پر بیوہ ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کا بوجھ ہوتا ہے تو کوئی اپنے بیمار شوہر اور ننھے بچوں کی پرورش کے لیے ان کارخانوں کا ایندھن بننے کا فیصلہ کرتی ہے۔ ان میں سے کوئی عورت یا لڑکی سیما، ویرا یا میرا بائی نہیں ہوتی جو دل بہلانے اور اپنے مراسم بڑھانے کے لیے ان مردوں کی بھیڑ میں گھرے رہنا پسند کرتی ہو۔ ان نام نہاد جاہلوں کو احترامِ باہمی کے اسی جذبے نے فرزانہ بنا دیا تھا اور وہ جنس کے کسی اشتعال آمیز امتیاز کے بغیر صرف صنعتی مزدور بن کر رہ گئے تھے۔ اپنی روز کی روزی روزانہ کمانے والوں میں نہ کوئی مرد تھا، نہ عورت۔ نہ سندھی تھا، نہ مہاجر، نہ پٹھان تھا نہ بلوچ۔ وہ ایک اکائی کی طرح اپنے خون پسینے سے اس شہر اور ملک کو زندہ رکھنے کے لیے اس کی معاشی رگوں کے لیے ہر لمحے تازہ لہو فراہم کر رہے تھے جس کے بغیر نہ کوئی ملک قائم رہ سکتا ہے اور نہ حکومت پنپ سکتی ہے۔

شاید میرے خیالات کی رَو اور دُور نکل جاتی لیکن اسی لمحے مجھے سلطان شاہ نظر آ گیا۔ وہ چھٹی ہونے کی خوشی سے سرشار، کم سن کاریگروں کی ایک ٹولی کے پیچھے سر جھکائے چلا آ رہا تھا۔

اُسے کار میں بیٹھے رہ کر براہِ راست اپنی طرف بلانا اُس کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کے آگے یا پیچھے آنے والا اُسی فیکٹری کا کوئی ساتھی اسے میری کار کی طرف آتا ہوا دیکھ لیتا اور اگلی صبح وہ خبر جاز فارماسیوٹیکل میں بھی گردش کرنے لگتی اس لیے میں نے جلدی سے کار سے اُتر کر دروازہ لاک کیا اور چند ثانیوں تک وہیں رُک کر یہ یقین کر لینے کے بعد کہ کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا، میں سرسری انداز میں اپنا راستہ بناتا ہوا سلطان شاہ کی طرف بڑھ گیا۔

وہ سر جھکائے نہ جانے کس دُھن میں چلا آ رہا تھا کہ میری زبان سے اپنا نام سُن کر بُری طرح چونک پڑا۔

"تم یہاں!" مجھے دیکھتے ہی حیرت سے اس کا مُنہ کھُل گیا۔ "خیریت تو ہے نا؟"

"چلتے رہو!" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا۔ "وہ سامنے میری سُرخ کار کھڑی

ہوئی ہے۔ تم بس اسٹاپ پر رُکنے کے بجائے پیدل آگے بڑھتے جاؤ، میں وہیں سے تم کو اُٹھا لوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ میری اچانک آمد نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

میں مزید چند قدم اس کے ساتھ چلنے کے بعد دانستہ اس سے پیچھے رہ گیا اور پھر کچھ فاصلے سے کترا کر غیر محسوس انداز میں اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس دوران میں کسی نے بھی خاص طور پر ہمیں نوٹ نہیں کیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں کچھ آگے سے سلطان شاہ کو اپنی کار میں لے چکا تھا۔

"تم نے یہاں آ کر بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ آخر ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟" اس نے کار کے دوبارہ حرکت میں آتے ہی ایک گہرا سانس لے کر مجھ سے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔

"کل شام فیکٹری سے روانہ ہونے کے بعد سے جہانگیر لاپتا ہے۔" میں نے اس کو آگاہ کیا۔ "وہ نہ میرے پاس آیا اور نہ ہی اب تک اپنے گھر پہنچا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے کہاں تلاش کیا جائے۔ مجھے تو رہ رہ کر ڈی ڈی پر شبہ ہو رہا ہے۔"

میری رائے سُن کر وہ چونکا تھا۔ "ڈی ڈی پر کیوں شبہ ہوا تم کو؟" اس نے پوچھا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اسے اپنے شبہے کی وجوہ سے آگاہ کر دیا جو وزن رکھتی تھیں۔

"تمھارے وجود میں شاید کسی قیافہ شناس کی روح حلول کر گئی ہے۔ جہانگیر کے غائب ہونے کی خبر سنتے ہی میرا خیال بھی ڈی ڈی کی طرف گیا تھا۔ کل صبح کی تمھاری کال نے غالباً اسے خوف زدہ کر دیا ہے۔ وہ نہ کل فیکٹری آیا تھا نہ آج نظر آیا۔ ہو سکتا ہے کہ گھبراہٹ میں اسی نے جہانگیر کو اٹھوا لیا ہو۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہانگیر کے ساتھ وہ بھی لاپتا ہو گیا ہے۔" میں نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

"وہ کہاں لاپتا ہو گا؟ گھر پر عیش کر رہا ہو گا۔ چاہو تو وہیں دھاوا بول دیں۔"

"یہ کام میں اکیلا بھی کر سکتا تھا اس کے لیے تمھاری ضرورت نہیں تھی۔" میں نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "وہ گھر سے بھی غائب ہے۔ میری غزالہ سے بات ہو چکی ہے۔ اب اسے بھی دلدار آغا کی بدمعاشیوں پر یقین آ گیا ہے اور وہ دلدار کے مقابلے میں پوری طرح میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے۔ ہمیں ڈی ڈی کو کہیں اور ہی تلاش کرنا ہو گا۔"

"اس سلسلے میں شاہ باغ ہی سے کوششوں کی ابتدا کرنی چاہیے۔ وہ جگہ کسی بھی قیدی کو بدترین تشدد کا نشانہ

...نے کے لیے مثالی حیثیت رکھتی ہے۔" سلطان شاہ نے ...ظاہر کی۔

"مجھے شبہ تھا کہ کہیں جہانگیر کو جاز فارماسیوٹیکل میں ...قید نہ کیا گیا ہو لیکن تم بتا رہے ہو کہ ڈی ڈی بھی وہاں سے ...ب ہے تو ہمیں شاہ باغ کا ہی رُخ کرنا ہو گا لیکن اس ...پہلے اسلحے کا بندوبست کرنا ہو گا۔"

"شہر میں داخل ہونے کے بجائے ڈیفنس سے گاڑی ...ہاکس بے لینڈ کی طرف نکال لینا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہاں ہمارا ...کام بن جائے گا۔ ہمیں پوری تیاری کے ساتھ شاہ باغ پر ...حملہ کرنا ہو گا۔ ڈی ڈی کے اردگرد ہر وقت مسلح محافظوں کی ...خاصی تعداد منڈلاتی رہتی ہے۔ وہ شاہ باغ میں موجود ہوا تو ...وہاں سخت مقابلہ ہونے کی توقع ہے۔"

"یہ سلسلہ تو اب چل ہی نکلا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ ہارمونیم کیپسولز کا کیا رہا؟"

"اوہ!" اس نے فوراً ہی جیب میں ہاتھ ڈال کر گتے کا ایک بہت نفیس اور چھوٹا سا ڈبا نکالا اور میری گود میں ڈال دیا۔ "یہ پانچ کیپسولز کی پیکنگ ہے۔ اس ڈبے میں المونیم کی ڈھکن دار ...میں پانچوں کیپسولز موجود ہیں۔ یہ سب سے چھوٹی ایکسپورٹ پیکنگ ہے جو آج ہی مشین پر چلائی گئی ہے۔"

"حیرت ہے کہ تم اتنی آسانی سے یہ ڈبا چرا لانے میں کامیاب ہو گئے!"

"اسے بس اتفاق ہی کہہ لو۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "میں نے فیکٹری ٹوائلٹ میں ہی ایک کیپسول کھول کر دیکھا تھا اور اس میں بھرے ہوئے بھورے رنگ کے سفوف کی ذرا سی چٹکی زبان پر لگائی تھی کہ پوری زبان گھنٹوں کے لیے سُن ہو کر رہ گئی۔ یہ ہیروئن کی بہت تیز اور اعلیٰ قسم معلوم ہوتی ہے۔"

"اہم ترین بات یہی ہے کہ پاکستان سے خالص ترین ہیروئن اسمگل کی جاتی ہے۔ اسے باہر کی منڈیوں میں دس سے بیس گنا تک ہلکا کرنے کے لیے اس میں ملاوٹ کی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اس میں بے اندازہ منافع ہوتا ہے۔ یہ تمھاری بہت بڑی کامیابی ہے۔ جہانگیر کے معاملے سے نمٹتے ہی اب میں اس فیکٹری کو برباد کراؤں گا۔"

"تم نے بالکل درست کہا تھا کہ ان کیپسولوں میں بھرے جانے والے سفوف کے بارے میں بھیانک ترین افسانوی قصے تراشے گئے ہیں تاکہ وہ لوگ کارکنوں سے اپنے مذموم کاروبار کو پوشیدہ رکھ سکیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کیپسول کھولا تھا لیکن میں نے سفوف چکھ بھی لیا اور میری جلد پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑا۔ فیکٹری میں چھٹی ہونے کے

بعد منیجر کیپسولوں کے سارے پیکٹ کار میں اپنے ساتھ لے گیا ہو گا۔ جس دن الیف وَن پر کام ہوتا ہے بس اُسی دن فیکٹری پر ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے ورنہ اس سے پہلے یا بعد میں وہاں کوئی بھی سراغ باقی نہیں رہتا۔ میرا خیال ہے کہ اب وہی فیکٹری پاکستان میں نشے کے کاروبار کا اہم ترین ذریعہ ہے ورنہ انھوں نے اپنی سرگرمیوں کو بڑی حد تک سمیٹ لیا ہے۔"

"اہم ترین نہیں بلکہ واحد ذریعہ کہو۔" میں نے چمکتی ہوئی سڑک پر رواں دواں ٹریفک کے سیلاب پر سے اپنی توجہ ہٹائے بغیر کہا۔ "ڈان تھری سے ملنے والی اطلاعات کی روشنی میں نشے کی ساری دلچسپی پاکستان کے شہروں اور قصبوں میں ہیروئن کو پھیلانے پر مرکوز تھی۔ وہ لوگ یہ مقصد حاصل کر چکے ہیں۔ انھوں نے یہاں ہیروئن بیچنے اور استعمال کرنے والوں کی اتنی بڑی کھیپ تیار کر دی ہے کہ اب وہی لوگ نادانستہ طور پر نشے کے مقاصد کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ہارمونیم کیپسولز کی آڑ میں جو تھوڑی بہت مقدار باہر بھیجی جا رہی ہے، اس سے ایک طرف وہ پاکستانی کسٹم کی خامیوں پر نگاہ رکھ رہے ہیں، دوسری طرف یہ ہیروئن معمولی ملاوٹ کے بعد امریکی مارکیٹ میں پھیلائی جاتی ہو گی تاکہ ان کے نوجوانوں پر اِس کے کم سے کم مضر اثرات ہوں۔"

"لیکن اب بھی ہر دس پندرہ دن میں عالمی ذرائع سے ہیروئن کی اسمگلنگ کی کوئی نہ کوئی بڑی خبر اُچھالی جا رہی ہے جس میں پاکستانیوں کا ذکر سرِ فہرست ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔

"نشے والوں نے پاکستانی معاشرے کو تباہ کرنے کے لیے مقامی منڈی میں موت کے جن سوداگروں کی پشت پناہی کی ہے ان کے مُنہ کو خون لگ چکا ہے۔ وہ ملک میں تو کالا دھن کما ہی رہے ہیں لیکن بھاری نفع کے لالچ میں اسمگلنگ میں بھی مقدر آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ انھی میں سے کچھ پکڑے بھی جاتے ہیں۔ کیا تم کبھی تصور بھی کر سکتے تھے کہ سیٹھ حبیب جیوانی جیسا عالی نسب اور ذی حیثیت شخص بھی اپنی مالی دشواریوں پر قابو پانے کے لیے ہیروئن کی اسمگلنگ میں ملوث ہو سکتا ہے؟ اب دیکھ لو کہ اپنے اس ناکام جُرم کے نتیجے میں وہ یہاں مافیا کا روحِ رواں بن چکا ہے۔"

سلطان شاہ کو اُس کی ذہنی ورزش کے لیے خاصا مواد مِل چکا تھا اس لیے وہ خاموش ہو گیا اور میں نے سفر کی طوالت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اسے اُن واقعات سے آگاہ کرنا شروع کر دیا جو اُس کے علم میں نہیں تھے۔ محمود کے سفاکانہ قتل کا واقعہ سُن کر وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ کسی بھی باضمیر شخص

کے لیے یہ تصور ہی دل خراش تھا کہ کسی محنتی اور ایمان دار افسر کو اس کی فرض شناسی کے جُرم میں اتنی عیاری سے موت کے گھاٹ اتارا جائے کہ قتل کی سوچی سمجھی واردات اتفاقی حادثہ قرار دے کر فراموش کر دی جائے لیکن ڈرگ مافیا کے ڈان تھری نے میرے سامنے خود اُس شرمناک کارنامے کا اعتراف کیا تھا۔ وہ باہر سے آیا ہوا ایک غیر ملکی مُجرم تھا جسے کسی بھی مقامی سے ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ مقامیوں نے خوشی کے ساتھ اُس کے دست و بازو بن کر، اُس شیطانی سازش کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ سسلی اور امریکا میں بیٹھے ہوئے لوگ ان حریص کٹھ پتلیوں کی ڈوریاں ہلاتے تھے اور پاکستان کی دھرتی کا کوئی گوشہ اپنے کسی ہونہار لعل کے لہو سے رنگین ہو جاتا تھا یا کسی سازش کے تحت دوست اور پڑوسی وحشی درندوں کی طرح ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن کر نسلی، لسانی اور علاقائی فسادات میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ لوگوں کو ایک دوسرے کے دُکھ درد سے بیگانہ بنا کر معاشرے کو اتنی چھوٹی اکائیوں میں بانٹ دینے کا عمل تیزی کے ساتھ جاری تھا کہ لوگوں کی کوئی اجتماعی قوت یا آواز باقی نہ رہ سکے کیوں کہ ایسی بے رحمانہ تقسیم کے بعد ہی معاشرے میں جرائم کی فصل کو بھرپور آبیاری مل سکتی تھی۔ مجھے کولمبیا برازیل اور ارجنٹائن کی مثالیں یاد آئیں اور میں اندر سے لرز کر رہ گیا۔

کولمبیا میں حکومت موجود تھی لیکن ملک پر عملاً ڈرگ مافیا اور دہشت گردوں کا راج تھا جو خچروں اور لاریوں کے ذریعے ہیروئن اور کوکین کی بھاری مقدار کو امریکا کے پراگندہ معاشرے میں اسمگل کر کے کروڑوں ڈالر کما رہے تھے۔ مافیا کا سرغنہ جہاں نظر آ جاتا، لوگوں کے ہجوم اس کے لیے نعرہ ہائے تحسین بلند کرنے لگتے۔ قانون کے محافظوں کی مجال نہیں تھی کہ اس پر ہاتھ ڈالتے۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی تنظیم کے کارندے ملک کے چپے چپے میں مفلوک الحال اور پس ماندہ لوگوں کی دل کھول کر مالی امداد کر رہے تھے۔ لوگوں کے دل جیت کر اس نے حکومت کو مفلوج کر دیا تھا اور عملاً اپنے ملک کا حکمراں بن بیٹھا تھا۔ امریکی سی آئی اے اور ایف بی آئی کے بہترین دماغ اسے ہلاک کرنے کی کوششوں میں ناکام ہو چکے تھے۔ اس کے ملک میں رائے عامہ اس لیے اُس کے ساتھ تھی کہ گھنے جنگلات کے درمیان، دشوار گزار علاقوں میں کاشت ہونے والے خام مال سے تیار ہونے والی ساری منشیات باہر اسمگل کی جا رہی تھیں۔ لوگ سمجھتے تھے کہ ان کے خالی خزانے اور دیوالیہ معیشت کو اگر قانونی تجارت سے سہارا نہیں مل رہا تو ان کا ہیرو، منشیات کی اسمگلنگ سے ملک کے لیے خطیر زرِ مبادلہ کما رہا تھا۔ اپنے ملک میں بسنے والوں کو اس نے ان مہلک نشوں کا عادی بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کولمبیا کی حکومت پر مافیا کی سرکوبی کے لیے سخت دباؤ تھا لیکن حکومت رائے عامہ کے سامنے بے بس تھی۔ ہر شہری مافیا والوں کا مخبر تھا۔ قرضے روک لیے گئے تھے، استعمال شدہ قرضوں کی واپسی کی سخت شرائط پر عمل کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ کوشش یہ تھی کہ اقتصادی ناکا بندی کے ذریعے اس سرزمین کو منشیات کے لیے بانجھ کر دیا جائے لیکن کامیابی کا دُور دُور تک امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔

لیکن پاکستان کے حالات مختلف تھے۔ انسدادی تدابیر کے ساتھ ہی دشمنوں نے ملک میں بھی ہیروئن کو بہت قریب پھیلا دیا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نے پورے پاکستانی معاشرے کو اس اونچی چوٹی پر لے جا کر مافیا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہو جہاں سے نشیب میں جانے والا ہر راستہ تباہی، بربادی اور اجتماعی خودکشی کا راستہ تھا۔ ڈرگ مافیا کی کوئی بھی مؤثر کوشش پورے معاشرے کو اس چوٹی سے ہولناک بربادی کی کھائیوں میں لڑھکا سکتی تھی لیکن پورے ملک میں کسی کو آنے والی اس بھیانک تباہی کا احساس نہیں تھا جو ہیروئن کے عادی بن چکے تھے، وہ شب و روز اُس کے نشے میں ڈوب کر دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے اور جو بچے ہوئے تھے، وہ اسی بات پر اپنے رب کے شکر گزار تھے کہ اُس نے انھیں اور ان کے بچوں کو ایک موذی لعنت سے محفوظ رکھا ہوا تھا۔ تباہی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے بند باندھنے کا کسی کو ہوش نہیں تھا۔ لوگ روز بہ روز مختلف بنیادوں پر گروہوں اور ٹولیوں میں تقسیم ہوتے جا رہے تھے۔ کاروبار اور لین دین تک پر زبان اور علاقوں کا تعصب غالب آنے لگا تھا اور ان دراڑوں میں افیم کی کوکھ سے جنم لینے والی ہیروئن کسی مہیب خودرَو بیل کی طرح تیزی سے پروان چڑھ رہی تھی۔

میں دو بار وہاں جا چکا تھا۔ وہ تیسرا موقع تھا جو خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

پہلی بار وہ باغ راجا فروٹ فارمز کے نام سے موسوم تھا اور اس زمانے کے لٹو، راجا سکندر کی عیاشیوں کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ دوسری بار میں دلدار آغا کے تجسس میں وہاں پہنچا تو اس کا نام شاہ باغ رکھا جا چکا تھا۔ شاید وہ بھی شی کی کوئی مقامی روایت تھی کہ ہر نیا آنے والا اس زرعی جاگیر کا نام بھی بدل ڈالتا تھا۔

دلدار آغا نے سلمیٰ کو اپنی شرافت اور نجابت کے جال میں الجھاتے ہوئے اس سے جھوٹ بولا تھا کہ شاہ باغ اُن کی پرانی خاندانی جاگیر تھی اور وہیں سے مجھے اس پر شی کا ہمراہ ڈی ڈی ہونے کا شبہ ہوا تھا۔

وہ وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا ایک گھنا باغ تھا جہاں رات کے اندھیرے میں پوری فوج کی فوج چھپ سکتی تھی۔ عام حالات میں شاید اپنی کار باغ کے دروازے پر ہی لے جا کر روکتا لیکن ڈی ڈی کی وہاں موجودگی کی صورت میں بھاری حفاظتی انتظامات کے خطرے کے پیش نظر میں نے کار دور ہی جھاڑیوں کی اوٹ میں روک کر لاک کر دی تھی اور ہم دونوں سڑک چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں پیدل ہی شاہ باغ کی طرف چل پڑے تھے۔

کار کو چھوڑتے ہوئے میں نے یہ احتیاط مدِنظر رکھی تھی کہ شاہ باغ آنے یا وہاں سے روانہ ہونے والی کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میری کار پر نہ پڑ سکے۔ میری جیب میں اعشاریہ تین آٹھ کے بھرے ہوئے پستول کے علاوہ اس کے چند فاضل میگزین موجود تھے جب کہ سلطان شاہ کی پشت پر لٹکے ہوئے کینوس بیگ میں کئی اقسام کا اسلحہ موجود تھا جس کے سہارے ہم وہاں خاصی تباہی پھیلا سکتے تھے۔

سلطان شاہ کے پاس موجود تھیلے میں اسلحے کے علاوہ ہنگامی ضرورت کی دوسری اشیا بھی رکھ لی گئی تھیں تاکہ اس ویرانے میں ہمیں کسی بڑی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ شہر سے شاہ باغ کے لیے روانہ ہونے سے پہلے میں نے جہانگیر کے گھر فون کیا تو ریٹا سے میری بات ہوئی تھی۔ اس سے پتا چل گیا تھا کہ سلمیٰ کا ڈرائیور سارے شہر کی خاک چھاننے کے بعد ناکام و نامراد واپس لوٹ آیا تھا۔ جہانگیر کے سلسلے میں کوئی فون بھی نہیں آیا تھا۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے سلمیٰ پر رہ رہ کر غشی کے دورے پڑ رہے تھے اور ریٹا مسلسل اس کے پاس موجود تھی۔ اس نے میری کارکردگی کے بارے میں جاننا چاہا تھا لیکن میں نے خوب صورتی کے ساتھ اس کے سوال کو ٹال دیا تھا کیوں کہ اس مرحلے پر میں خود اندھیرے میں تھا۔

ہم دونوں اندھیرے میں جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے شاہ باغ کے پھاٹک کی طرف بڑھتے رہے۔ مسلسل اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے ہم دونوں کی بصارت خاصی دُور تک کام کر رہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ ہمیں تھیلے میں موجود عام یا پنسل ٹارچ سے کام لینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

آخر کار ہمیں کچھ فاصلے سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ تعداد میں کئی معلوم ہوتے تھے اور میرے اندازے کے مطابق شاہ باغ کے پھاٹک پر موجود تھے۔ ہم دونوں مزید محتاط ہو گئے لیکن ہماری پیش قدمی جاری رہی۔

”معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ادھر آ کر بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔“ سلطان شاہ نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ”اس روز گیٹ پر چوکیدار اکیلا تھا، آج کئی آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“

”چونچ بند رکھو۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ اندھیرا پھیل جانے کی وجہ سے اندر کام کرنے والے مالی وغیرہ بھی گیٹ پر آ گئے ہوں۔ ادھر کا جائزہ لے کر ہمیں داہنی طرف سے بڑھنا ہو گا تاکہ کہیں سے باڑ عبور کر کے اندر کاٹیج کے نزدیک پہنچ سکیں۔ جب تک میں پہل نہ کروں، تم گولی نہیں چلاؤ گے۔“

رفتہ رفتہ صورتِ حال زیادہ واضح ہوتی چلی گئی۔ اس وقت شاہ باغ کے اندر جنریٹر چل رہا تھا جس کے انجن کا دھیما دھیما شور ایک تسلسل کے ساتھ فضا میں گونج رہا تھا۔ کاٹیج کی روشن کھڑکیوں کا کچھ حصّہ بھی نظر آنے لگا تھا جس کا مطلب تھا کہ اندر چہل پہل ہو رہی ہے۔ اگر اُس رات کاٹیج آباد تھا تو اندر مسلح افراد کی تعداد بھی قابلِ ذکر ہو سکتی تھی۔

میں نے خود جھاڑیوں کی اوٹ میں رہتے ہوئے زمین سے ایک پتھر بائیں طرف، دُور اچھال دیا۔ چند ثانیوں بعد وہ پتھر گھنے درختوں کے پتوں سے الجھتا ہوا پُرشور آواز کے ساتھ گرا تو فضا درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندوں کے خوف زدہ شور سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ گیٹ کی سمت سے آنے والی آوازیں یکلخت معدوم ہو گئیں۔ ہم دونوں وہیں جھاڑیوں میں دُبکے مزید کسی ردِ عمل کا انتظار کرتے رہے لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ چوکیداروں میں سے کسی نے بھی خلافِ توقع کسی کو نہیں للکارا تھا بلکہ مکارانہ خاموشی اختیار کر کے شاید مختلف سمتوں میں پھیل گئے تھے۔

پتھر سے مضطرب ہونے والے پرندے بتدریج اپنے آشیانوں میں دُبکنے لگے کیوں کہ ان کا شور جلد ہی دم توڑ گیا اور اس بے کراں سناٹے میں جھینگروں یا اکا دُکا مینڈکوں کی آوازیں باقی رہ گئیں۔ ہم دونوں کئی منٹ تک دم سادھے اسی مقام پر جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھے رہے لیکن انجن کے ہلکے مشینی شور میں جھینگروں کے شور یا مینڈکوں کی ٹرّاہٹ کے علاوہ کوئی نئی آواز نہیں سُنائی دی۔ میں نے اس بے مقصد نشست کو ترک کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ کچھ فاصلے سے ایک طاقت ور اور مانوس کھٹکا سنائی دیا اور زمین سے چند فٹ کی بلندی پر ایک شعلہ شاہ باغ کی باڑ کی طرف سے نمودار ہو کر دُور تک تیرتا چلا گیا۔ شاید اندر سے کسی محافظ نے شبہے کی بنیاد پر بے آواز رائفل سے فائر کیا تھا۔

صورتِ حال یک بیک سنگین ہوگئی تھی۔ بے آواز رائفل اور چیتے کی طرح چالاک محافظوں کی موجودگی کسی بھی لمحے ہمارے حق میں مہلک ثابت ہوسکتی تھی۔ میں اٹھتے اٹھتے پھر وہیں بیٹھا رہ گیا۔

ہمیں اسی پوزیشن میں تقریباً پانچ منٹ گزر گئے جو اس وقت صدیوں پر محیط معلوم ہو رہے تھے۔ گشت پر نکلے ہوئے باغ کے محافظوں کے قدموں کی آواز تک دوبارہ نہیں سُنائی دی تھی اس لیے میں نے سلطان شاہ کا ہاتھ دبا کر اسے تقلید کا اشارہ کیا اور کسی چوپائے کی طرح ہتھیلیوں اور گھٹنوں کے بل داہنی طرف بڑھنا شروع کردیا۔ مجھے ڈر تھا کہ قدموں پر کھڑا ہونے کی صورت میں کہیں ہمارا ہیولا نہ دیکھ لیا جائے۔

غنیمت یہ تھا کہ وہ باغات کے زرعی علاقے کی نرم اور بھربھری زمین تھی ورنہ چوپایوں کی طرح چلنے کی اس کوشش میں ہم بُری طرح لہولہان ہوجاتے۔ شاہ باغ کے احاطے کی باڑھ سے مناسب فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے، جب ہم اس کے داہنے پہلو پر واقع، خودرو پودوں اور جھاڑیوں سے گھرے ہوئے میدان میں کافی دُور نکل آئے تو ہم ایک آدم قد جھاڑی کی اوٹ میں اپنے قدموں پر کھڑے ہوگئے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت ہم کاٹیج کی پشت کی بالکل سیدھ میں موجود تھے لیکن گھنے درختوں کی وجہ سے کاٹیج کے روشن حصے ہماری نگاہوں سے اوجھل تھے۔

اپنے چہروں پر نقابیں چڑھا کر ہم نے بھرے ہوئے پستول ہاتھوں میں سنبھالے اور زمین پر گرے ہوئے خشک پتوں سے بچ کر، پنجوں کے بل چلتے ہوئے شاہ باغ کی باڑھ کی طرف بڑھنے لگے۔

اس طرف کوئی محافظ نہیں تھا۔ ہم کسی مزاحمت کے بغیر باڑھ میں جگہ پیدا کرکے اندر داخل ہوگئے۔ چند ثانیوں بعد کاٹیج کی ایک روشن کھڑکی نظر آئی تو ہم اپنی سمت درست کرکے اسی طرف ہولیے۔ شاید کاٹیج کے تمام کمرے زیرِ استعمال نہیں تھے اور یہ ایک اچھی بات تھی۔

آخرکار روشن کھڑکی سے آنے والے انعکاس میں ہمیں وہ محافظ نظر آہی گیا جو کاٹیج سے خاصے فاصلے پر اس سمت کی نگرانی پر مامور تھا۔ وہ ہماری طرف پشت کیے پیال نما ایک اونچے ڈھیر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی پوزیشن سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس طرف وہ اکیلا ہی تھا۔ ان لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں رہا ہوگا کہ کوئی گھنی بغلی باڑھ کو عبور کرکے کاٹیج تک پہنچنے کی کوشش کرسکتا ہے اسی لیے اس طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہوگی۔

سلطان شاہ کو وہیں چھوڑ کر میں ایک مرتبہ پھر چوپائے کے انداز میں چلتا ہوا محافظ کی طرف بڑھ گیا۔ میں مویشیوں کے چارے کے لیے کٹی ہوئی لمبی لمبی گھاس کے اس ڈھیر پر پہنچا تو میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ اس وقت اندازے کی ذرا سی غلطی یا کوئی اور لغزش میرے اوپر جہنم کے ان گنت دہانے کھول سکتی تھی۔

اس مقام پر محافظ سے باز پُرس خطرناک ہوسکتی تھی۔ اسے ہلاک کرنا سب سے آسان کام تھا لیکن میں اسے زندہ پکڑ کر اس سے اندر کے حالات کے بارے میں باز پُرس کرنا چاہ رہا تھا اس لیے میں نے اسے ہوشیار ہونے کا موقع دیے بغیر پشت سے اس کی داہنی کنپٹی پر اپنے پستول کے آہنی دستے سے ضرب لگائی اور وہ ہلکی سی آواز نکال کر وہیں میرے بازوؤں میں ڈھیر ہوگیا کیوں کہ ضرب لگاتے ہی میں نے اپنا بایاں ہاتھ مضبوطی سے اس کے دہانے پر جما دیا تھا۔ اس کے آگے ہی کلاشنکوف رائفل رکھی ہوئی تھی جس میں لمبا میگزین چڑھا ہوا تھا۔ میں نے کلاشنکوف اپنے شانے سے لٹکائی اور بے ہوش قیدی کو کندھے پر لاد کر تیزی سے نیچے اُتر کر واپس چل دیا۔ وہ متوسط قد اور جسامت کا مالک تھا اس لیے مجھے اس کو لاد کر چلنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ راستے میں سلطان شاہ میرے ساتھ ہولیا اور ہم قیدی سمیت ایک مرتبہ پھر باڑھ سے باہر نکل آئے۔ اس سے پوچھ گچھ کے لیے اندر رُکے رہنا ہمارے لیے خطرناک ہوسکتا تھا۔

اس کے مُنہ میں اسی کی قمیص کے ٹکڑے پھاڑ کر ٹھونسنے کے بعد اسے ہوش میں لانے کی کوششیں جلد ہی بارآور ثابت ہوئیں اور میں نے اپنا رول ادا کرنا شروع کردیا۔ ابتدا میں اس نے سخت جانی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن چند شدید ضربات کے بعد اس نے سر ہلاتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔ اسے امید دلائی گئی تھی کہ اس کے ہمارے سوالات کے درست جواب دیے تو وہ زندہ رہ سکے گا ورنہ اس کا بھیجا نکال دیا جائے گا۔

ہم دونوں ہی اس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار تھے لیکن مُنہ سے کپڑا نکالے جانے کے بعد بھی اس نے کوئی شرارت کرنے کی کوشش نہیں کی البتہ وہ اپنے آقاؤں سے بُری طرح خوف زدہ تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کے کیے ہوئے انکشافات کے ذریعے اگر اس کے آقاؤں کو کوئی نقصان پہنچا تو وہ بعد میں اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے لیکن میں نے اسے دلاسا دیا کہ ہمارے کافی آدمی باغ کے گرد موجود تھے اور اگر ایک بار ٹکراؤ شروع ہوجاتا تو کسی کو پتا ہی نہیں چل سکتا تھا کہ حملہ ہونے سے پہلے اسے بے بس کرکے اغوا

کیا گیا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اس کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ ہمارے ساتھ تعاون کرے تاکہ اس کے غائب ہونے کا راز فاش ہونے سے پہلے حملے کا آغاز ہوجائے۔ دوسری صورت میں اس کے سر پر موت کے خطرے کی تلوار ہر لمحے لٹکتی رہتی۔

یہ منطق اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے مشینی انداز میں ہمارے سوالات کے جواب دینے شروع کردیے۔

وہ ایک پیشہ ور مجرم تھا۔ اس کا ڈی ڈی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ جانز فارماسیوٹیکل کے منیجر ہارون کے لیے ماہانہ معاوضے پر کام کرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے سات آدمیوں کے ہمراہ پچھلی شام سے شاہ باغ کی حفاظت کی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ وہاں کے دو چوکیدار اور تین مالی اس کے علاوہ تھے۔ وہ اپنے آدمیوں کے ہمراہ شاہ باغ پہنچا تو وہاں ایک سیاہ پجیرو پہلے سے موجود تھی جو اس وقت بھی وہیں کھڑی ہوئی تھی۔ رات کو ہارون بھی کاٹیج میں پہنچا تھا۔ وہ یہ نہیں بتاسکا کہ اس کے ساتھ کوئی قیدی بھی تھا یا وہ تنہا آیا تھا کیوں کہ ان لوگوں کو کاٹیج سے دور رہ کر حفاظت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

اس کے بیان سے یہ تو ثابت ہو رہا تھا کہ دلدار آغا اپنے نمک خوار ہارون سمیت کاٹیج میں موجود تھا لیکن جہانگیر کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ قیدی کے علاوہ اس وقت شاہ باغ کے احاطے میں کم ازکم نو مسلح آدمی اور تین مالی موجود تھے۔ مسلح آدمیوں اور چوکیداروں کے بارے میں یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ ان کو شاہ باغ کے پھاٹک کے قریب ہی داخلی راستے کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا اور عقبی حصے میں صرف قیدی کے تعین کو کافی سمجھا گیا تھا۔

قیدی کے انجام سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن میں بلاوجہ اپنے ہاتھ اس کے خون سے نہیں رنگنا چاہتا تھا اس لیے ہم نے اس کے احتجاج کے باوجود دوبارہ اسے دبوچ کر اس کے مُنہ میں کپڑا ٹھونسا اور ہاتھ پیر مضبوطی سے باندھ کر اسے وہیں ڈال دیا۔ اس کی کلاشنکوف بدستور میری تحویل میں تھی۔

اس سے نمٹ کر ہم دوبارہ باڑھ عبور کرکے اندر داخل ہوگئے۔ وہ ہمارے اقدام کے اہم ترین حصے کا نقطۂ آغاز تھا اور ہماری کوئی بھی غلطی مکمل تباہی پر منتج ہوسکتی تھی۔ میں نے سلطان شاہ کے تھیلے میں سے کچھ ضروری اشیا اپنی جیبوں میں منتقل کیں اور کلاشنکوف اس کے حوالے کرکے اسے گھاس کے ڈھیر پر چھوڑ دیا۔

اس طرف نسبتاً سناٹا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ نو مسلح خونی ہمارے قرب و جوار میں منڈلا رہے ہیں۔ ان کی ڈیوٹی سامنے والے حصے میں تھی لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنے اکیلے ساتھی سے گپ شپ اڑانے یا اس سے خیریت معلوم کرنے کے لیے اُدھر آسکتا تھا اس لیے میں احتیاط اور تیزی کے ساتھ کاٹیج کی طرف بڑھ گیا۔

ایک تاریک کھڑکی کے نیچے، دیوار سے چپک کر میں چند ثانیوں تک اندر کی سُن گُن لیتا رہا اور پوری طرح اطمینان کرنے کے بعد کھڑکی پر دباؤ ڈالا تو وہ اندر سے بند تھی۔ میں نے جیب میں سے شیشہ کاٹنے کا اوزار نکال کر اندھیرے میں شیشے کا ایک کونا کاٹ کر خفیف سی آواز کے ساتھ الگ کردیا اور اگلے چند ثانیوں میں وہاں سے اندر ہاتھ ڈال کر میں کھڑکی کا بولٹ نکال چکا تھا جو میرے اندازے کے مطابق اسی طرف موجود تھا۔ کھڑکی پر دباؤ ڈالتے ہوئے مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ پٹ صرف نیچے سے ہی بولٹ کیے گئے تھے۔ کھڑکی کھول کر میں فوراً ہی کاٹیج کے اندھیرے کمرے میں کود گیا اور پٹ دوبارہ بند کردیا تاکہ باہر گشت کرنے والے کسی شخص کو صورتِ حال میں تبدیلی کا کوئی اندازہ نہ ہوسکے۔

اچانک اندر سے کسی کے ہذیانی انداز میں ہنسنے کی آواز اُبھری اور میں غیر ارادی طور پر اپنی جگہ پر سمٹ کر رہ گیا۔

اس کمرے سے نکل کر میں ایک تاریک راہداری میں پہنچا اور ایک موڑ گھومتے ہی مجھے روشنی نظر آنے لگی۔ میں روشنی کے انعکاس سے بچتا ہوا دیوار سے چپک کر پنجوں کے بل آگے بڑھنے لگا۔

"یہ شاید پھر بے ہوش ہوگیا سر!" کمرے میں سے ایک نامانوس مردانہ آواز سُنائی دی۔ "اسے کچھ معلوم ہوتا تو اتنے تشدد کے بعد یہ اب تک سب کچھ اُگل چکا ہوتا۔"

"اسے اُلٹا لٹکا کر اس کی کھوپڑی کے نیچے ہیٹر آن کردو۔" دوسری سرد اور تحکمانہ آواز اُبھری جسے سُن کر میرے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگیں کیوں کہ ڈی ڈی کی وہ آواز میں کئی بار فون پر سُن چکا تھا۔ "لیکن یہ خیال رہے کہ ہمیں اس کو زندہ رکھنا ہے۔ یہ ڈینی کے لیے چوہے دان ثابت ہوگا۔ وہ جب بھی یہاں آیا، اس سے ضرور ملنے کی کوشش کرے گا۔"

وہ گفتگو یقیناً جہانگیر کے بارے میں تھی اور ڈی ڈی کا مخاطب ہارون ہی ہوسکتا تھا۔ یہ جان کر مجھے اطمینان ہوا کہ جہانگیر نے تشدد کا نشانہ بننے کے باوجود میرے بارے میں سختی سے اپنی زبان بند رکھی ہوئی تھی اور محض اسی وجہ سے ڈی ڈی اسے زندہ رکھنے پر مجبور ہو رہا تھا ورنہ وہ مطلوبہ

معلومات حاصل کرتے ہی بے رحمی کے ساتھ اسے ٹھکانے لگا سکتا تھا۔

اس راہداری میں مزید آگے بڑھنا خطرناک ہو سکتا تھا اس لیے میں وہیں سے اُلٹے قدموں واپس ہو لیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں کچن کے ذریعے ایک ایسی پوزیشن پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں میں اندھیرے میں محفوظ رہتے ہوئے ایک بند کھڑکی کے ذریعے کمرے کا منظر دیکھ سکتا تھا۔

فرشی قالین سے آراستہ اس کمرے میں ایک چالیس بیالیس سالہ تنومند شخص چھت سے لٹکتے ہوئے بند پنکھے میں رسّی کا پھندا ڈال کر اس کی مضبوطی آزما رہا تھا اور قالین پر جہانگیر بُری حالت میں بے سُدھ پڑا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پُشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اوپری بدن پر نہ قمیص تھی اور نہ بنیان۔ ننگے بدن پر ٹھوکروں اور دوسری ضربات سے پڑے ہوئے نیل اور سوکھے زخم نظر آ رہے تھے، اس کا چہرہ بھی سُوجا ہوا تھا۔ اس نے یقیناً مضبوط قوّتِ ارادی سے کام لے کر وہ تشدّد برداشت کیا ہو گا ورنہ اس حد تک بے دست و پا ہونے کے بعد بڑے بڑے دلیروں کا پِتّا پانی ہو سکتا تھا۔

ڈی ڈی اس کمرے میں کسی ایسی جگہ موجود تھا جہاں وہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔ اس کی موجودگی میں کسی تیسرے آدمی کو اندر نہیں بلایا گیا تھا اس لیے یہ قیاس کرنا دشوار نہیں تھا کہ رسّی کا پھندا تیار کرنے والا ہارون تھا۔

اس وقت میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا کیوں کہ وہ میری مہم کا ایک نازک موڑ تھا۔ ایک طرف میرا بدترین دشمن، غاصب اور رقیبِ رُوسیاہ دیوار کی دوسری جانب میری دسترس میں تھا۔ دوسری طرف جہانگیر کی زندگی کا بھی کا سوال تھا۔ اگر اس وقت کوئی مداخلت نہ ہوتی تو ڈی ڈی اسے خود ہی زندہ چھوڑ دیتا جب کہ میری کسی کارروائی کے نتیجے میں، زخمی اور بے ہوش پڑا ہوا جہانگیر کسی بھی ناگہانی خطرے سے اپنا بچاؤ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ بڑی آسانی کے ساتھ کسی بھی بھٹکی ہوئی گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔ میں یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

قابلِ غور نکتہ یہ بھی تھا کہ اس وقت سلطان شاہ باہر اور میں کاٹیج کے اندر تھا۔ اگر کوئی معرکہ آرائی شروع ہو ہی جاتی تو ہم دونوں کا یکجا ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح نکل بھی جاتا تو سلطان شاہ اس تاریک ویرانے میں اپنے خون کے پیاسوں میں گھر کر رہ جاتا۔

ہارون نے پھندے کی مضبوطی کا اندازہ لگا کر رسّی کا ایک سرا جہانگیر کے ٹخنوں پر پہلے سے بندھی ہوئی رسّی میں گرہ دے کر باندھا اور پھر ایک جھٹکے سے رسّی کا دوسرا سرا کھینچتا چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جہانگیر پنکھے کی موٹر کے سہارے اُلٹا لٹکا دیا گیا۔ اس نئی اذیت نے اس کے شکستہ اعصاب کو اس بُری طرح متاثر کیا کہ اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ مُنہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا ہونے کی وجہ سے اس کی کراہیں مضحکہ خیز آوازوں میں بدل کر رہ گئی تھیں۔

"اس کے مُنہ سے کپڑا نکال دو، اگر یہ چیخنے کی کوشش کرے تو ٹھوکروں سے اس کی کھوپڑی چُورا کر دینا۔" ڈی ڈی کی سرد آواز سُنائی دی۔

ہارون نے بڑھ کر بے دردی سے جہانگیر کے دہانے میں ٹھنسا ہوا کپڑا کھینچ لیا۔

"میں بتا چکا ہوں کہ مجھے کچھ نہیں معلوم!" قدرے توقف کے بعد جہانگیر کی درد و اذیت میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھری۔ "آخری بار ڈینی نے مجھے یورپ کے کسی شہر سے فون کیا تھا۔ اب وہ پتا نہیں کہاں ہو گا۔۔۔"

"یہ بکواس میں رات سے سُن رہا ہوں۔" ڈی ڈی کی غرّاہٹ گونجی۔ "کوئی نئی بات بتاؤ ورنہ ہم بوٹی بوٹی کر کے تمھارے جسم کے ٹکڑے اُڑا دیں گے اور یہی کمرا تمھارا مدفن بن جائے گا۔"

"پھر تم جو کچھ میری زبان سے سُننا چاہتے ہو، وہ بتا دو، میں وہی دُہرا دوں گا۔" جہانگیر کی بے بسی دیکھ کر میرے وجود میں اچانک ہی قہر و انتقام کے ہولناک شرارے کوندنے لگے تھے۔

"اس کے سر کے نیچے ہیٹر روشن کر دو۔ کھوپڑی پر جمی ہوئی برف پگھلے گی تو شاید اس کا حافظہ بھی کام کرنے لگے۔" ڈی ڈی کی زہر میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھری اور ہارون سامنے والے دروازے سے گزر کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کاٹیج کی تعمیر پرانے انداز سے کی گئی تھی اس لیے کمرے الگ الگ ہونے کے بجائے دروازوں اور کھڑکیوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔

تخلیہ ہونے پر ڈی ڈی ایک گوشے سے جہانگیر کی طرف بڑھتے ہوئے میری نظروں میں آیا تو میرا ہاتھ بے اختیار جیب میں پڑے ہوئے پستول کے دستے پر پہنچ گیا۔ وہ دراز قامت اور صحت مند شخص تھا۔ اس کے بدن پر نفیس قسم کا سرمئی قمیص شلوار سوٹ نظر آ رہا تھا لیکن چہرے پر سیاہ نقاب اس طرح چڑھا ہوا تھا کہ گردن بھی اسی میں چُھپ کر رہ گئی تھی۔ اس کے پورے بدن میں صرف ہاتھ کُھلے ہوئے نظر آ رہے تھے جن کی رنگت خاصی سفید تھی

ں بات یہ تھی کہ اس وقت بھی اس کی چال میں ہلکی سی ڑاہٹ باقی تھی، شاید پنڈلی کے زخم کی ٹیسیں اسے ں پر پورا وزن ڈالنے سے روک رہی تھیں۔

"تم کل سے یہاں ہو۔" ڈی ڈی قریب پہنچ کر جہانگیر ے کہہ رہا تھا۔ "تم نے دیکھ لیا کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ ں جب چاہوں، تمھیں شہر کے کسی بھی علاقے سے ننھے چوزے کی طرح پلک جھپکتے اٹھوا سکتا ہوں۔ مجھے شبہ ہے کہ ڈینی کراچی آ چکا ہے۔ میں آج تمھیں اس شرط پر رہا کر رہا ہوں کہ ڈینی تم سے رابطہ قائم کرے تو تم فوراً مجھے طلاع دو گے ورنہ تمھیں شہر کے کسی بھی گوشے میں ذبح کر جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ابھی تک تم سے نہیں ملا ہے۔"

"میں تمھیں مطلع کر دوں گا۔" جہانگیر کا درد میں ڈوبا ہوا نظاری لہجہ بالکل فطری تھا۔ "لیکن پہلے مجھے اس اُلٹی سولی ے اُتارو اور یہ بتاؤ کہ میں تم سے کہاں اور کیسے رابطہ قائم کر ں گا؟"

"رابطہ میں خود قائم کروں گا۔" ڈی ڈی کا لہجہ سرد اور سپاٹ ناؤ یہاں جو کچھ ہوا یا تم نے دیکھا، اسے تم بھول جاؤ گے۔ تمھاری وجہ سے میرے کسی آدمی پر آنچ بھی آئی تو تم بچ نہیں سکو گے۔"

اسی وقت ہارون بغلی کمرے سے الیکٹرک ہیٹر لیے ال آ گیا لیکن ڈی ڈی نے اسے روک دیا۔ "اسے نیچے سے ار دو، میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ اسے بے ہوش کر ے اس کی گاڑی میں ڈالو اور شہر میں کہیں بھی چھوڑ دو۔ ایسا ہو کہ زیادہ تاخیر ہونے کی صورت میں اس کے لواحقین لیس سے رجوع کر بیٹھیں اور اسے بہانہ مل جائے۔"

ہارون نے نہایت سعادت مندانہ انداز میں جہانگیر و نیچے اتار کر اس کی بندشیں کھولنی شروع کر دیں۔ ڈی ڈی واپس لوٹ کر دوبارہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شاید وہ اس کمرے کے کسی اور دروازے سے نکل ہی گیا تھا یوں کہ ہارون کے رویّے میں اچانک تبدیلی آ گئی تھی۔ بندشیں کُھل جانے کے بعد جہانگیر اپنی ابتر حالت کی وجہ سے فوراً اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہو سکا تو ہارون نے اس کا گریبان تھام کر اسے زبردستی کھڑا کر دیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم نے باس کی ہدایت سُن لی ہو گی۔" غیر ضروری طور پر دانت پیستے ہوئے بولا تھا۔ "تم نے مجھے اچھی طرح دیکھ لیا ہے لیکن کہیں سامنا ہو جائے تو مجھ سے بچنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں باس کی طرح رحم دل نہیں ہوں، اپنے شکار کو کوئی بھی موقع دیے بغیر میٹھی نیند سُلا دیتا ہوں۔"

"تم بے فکر رہو۔" جہانگیر گہرے سانس لیتا ہوا بولا۔ "میری ساری زندگی کے لیے یہی ایک ڈراؤنا تجربہ کافی ہے۔ تم جو چاہو گے، وہی ہو گا۔ تم کہیں ٹکرا گئے تو اجنبی بن کر نکل جاؤں گا۔ اب میری روانگی کا بندوبست کر دو۔"

وہ جہانگیر کو لے کر اسی سمت میں غائب ہو گیا جدھر ڈی ڈی گیا تھا۔

جہانگیر کا مسئلہ خیر و خوبی کے ساتھ نمٹتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس وقت میری دخل اندازی بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ یہ بات طے تھی کہ ڈی ڈی صرف جہانگیر کی وجہ سے شاہ باغ میں مقیم نہیں تھا بلکہ میری دھمکیوں سے خوف زدہ ہو کر وہاں روپوش ہوا تھا اور جہانگیر کے ساتھ اس کے چلے جانے کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔

میں کاٹیج میں داخلے کی راہ تیار کر چکا تھا اس لیے وہاں سے فوری طور پر واپس روانہ ہو گیا۔ باہر کے حالات جوں کے توں تھے۔ اس وقت تک مسلح محافظ کی گمشدگی کا علم نہیں ہوا تھا مگر سلطان شاہ گھاس کے ڈھیر کے قریب بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔

"جلدی چلے آؤ۔ اب ہم اندر ہی ٹھہر کر مناسب وقت کا انتظار کریں گے۔" میں نے اسے جہانگیر کی رہائی سے مختصراً آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے دونوں شکار یہیں موجود ہیں۔"

"ہارون بھی آیا ہوا ہے؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"دن میں تو وہ فیکٹری میں تھا۔"

"شاید ڈی ڈی یہاں آرام کر رہا ہے، جہانگیر پر تشدّد کا سلسلہ ہارون کے آنے پر ہی دوبارہ شروع ہوا ہو گا۔ کل رات سے مسلسل مار پڑ رہی ہوتی تو اب تک وہ بولنے کے قابل بھی نہ رہا ہوتا۔"

ہم دونوں فوراً ہی روانہ ہو گئے۔ کھڑکی، جسے میں بند کر آیا تھا، میرے ذرا سے اشارے پر دوبارہ اندر کی طرف کُھل گئی اور ہم دونوں اپنے اسلحے کے وزنی تھیلے سمیت شاہ باغ کے اس کاٹیج میں داخل ہو گئے۔

کھڑکی بند کر کے ہم دونوں اُس کمرے سے نکاسی کے دروازے کے قریب دیوار سے چپک کر اندھیرے میں بیٹھ گئے۔ اس وقت اندر نقل و حرکت جاری تھی اور ہماری کسی سے مڈبھیڑ ہونے کا قوی امکان پایا جاتا تھا اس لیے سرے پر واقع وہ تاریک کمرا ہمارے لیے بہترین پناہ گاہ تھا۔ رات ڈھل جانے پر جب کاٹیج کے مکین غافل ہو جاتے تو ہم اپنی کمین گاہ سے نکل کر انھیں بے خبری کے عالم میں اپنا نشانہ بنا سکتے تھے۔

جن دنوں میں تنظیم کے لیے کام کر رہا تھا اُن دنوں

پاکستان میں شی کے کارندے باہمی رابطے کے لیے جدید ترین مواصلاتی ذرائع استعمال کرتے تھے جن میں کم رینج والے ٹرانسمیٹرز سے لے کر ایم۔ٹی۔ تھری ہنڈرڈ جیسے بیش قیمت ایریٹس شامل تھے جن کی حفاظت کے لیے بھی الیکٹرونکس پر مشتمل... ناقابل شکست انتظام کیا جاتا تھا لیکن اس قلیل سی مدت میں یا تو شی بہت سمٹ کر رہ گئی تھی یا پھر پاکستان کی حد تک ان سہولتوں کو واپس لے لیا گیا تھا کیوں کہ ہمارے ہاتھ لگنے والے مسلح محافظ کے پاس سے کوئی ٹرانسمیٹر برآمد نہیں ہوا تھا پھر اُس کاٹیج میں بھی بیرونی مداخلت کے خلاف الارم وغیرہ موجود نہیں تھا حالانکہ شی کا سربراہ اپنی شہری قیام گاہ کو خیرباد کہہ کر اس مضافاتی کاٹیج میں مقیم تھا۔

شاید پاکستان سے باہر بیٹھے ہوئے شی کے بڑے دماغوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ پاکستان میں کشید کی جانے والی ہیروئن کی مقامی مارکیٹ میں کھپت کے سلسلے میں شی کو جو کردار ادا کرنا تھا، وہ پورا ہو چکا تھا۔ دوسری طرف پاکستان میں انھوں نے میرے ہاتھوں لائیڈز کا ٹیج، اس کے زیرِزمین اسلحہ خانے، ایم ٹی تھری ہنڈرڈ اور دوسری قیمتی تنصیبات کی تباہی کی صورت میں اتنے بھاری نقصانات اُٹھائے تھے کہ بددل ہو کر پاکستان میں وسیع سرمایہ کاری کی پالیسی ترک کر دی گئی تھی اور سارا کام صرف روایتی ذرائع کے سہارے چلایا جا رہا تھا۔

اچانک فضا میں کسی کار کے انجن میں سیلف لگنے کی آواز اُبھری پھر میرے حساس کانوں نے جہانگیر کی مرسڈیز کے انجن کی آواز پہچان لی، شاید اسے بے ہوش کر کے کسی کے ساتھ شاہ باغ سے روانہ کیا جا رہا تھا۔ یہ علامت ہمارے لیے حوصلہ افزا تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد دوسری طرف صرف دشمن کا وجود باقی رہ جاتا جس پر ہم اپنی مرضی اور پسند کے مطابق کوئی بھی مہلک وار کر سکتے تھے۔

کاٹیج اندر سے خاصا وسیع تھا اور اس کے بیشتر کمروں میں فرشی قالین پڑے ہوئے تھے اس لیے اندر سے کوئی آہٹ نہیں سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سرگوشیانہ لہجے میں سلطان شاہ کو ہوشیار رہنے کی ہدایت کی اور خود اندر کی طرف بڑھا لیکن ہڑبڑا کر فوراً ہی اپنی جگہ پر لوٹ آیا کیوں کہ باہر کہیں قریب ہی سے رائفل کے فائر کا ہولناک دھماکا سنائی دیا تھا۔ اس ایک فائر کے بعد کافی دیر تک باہر سے کوئی اور آواز نہیں سُنائی دی تو ہم دونوں نے چند قدم کے فاصلے سے آگے پیچھے پیش قدمی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ راستہ میرا دیکھا ہوا تھا اس لیے میں آگے تھا۔

تاریک کچن سے گزرتے ہوئے اچانک میرے پیچھے ایک چھناکا ہوا اور میں لرز کر رہ گیا۔ اندھیرے میں سلطان شاہ نے غلطی سے کوئی برتن گرا دیا تھا جو پُرشور آواز سے ٹوٹا تھا۔

"کون ہے؟" کاٹیج کے کسی دور افتادہ حصے سے ہارون کی بلند اضطرار آمیز آواز اُبھری پھر فرش پر کسی کے دوڑنے کی بے آواز دھمک محسوس ہوئی۔ میں تیزی کے ساتھ پلٹا لیکن سلطان شاہ میرے اس ردِعمل کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے ہم دونوں بوکھلاہٹ میں ایک دوسرے سے اُلجھ گئے۔

وہ لمحہ بھر کی تاخیر تھی لیکن اسی اثنا میں چٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ کہیں قریب ہی روشنی ہو گئی جس کی ایک کشادہ لکیر کچن میں بھی پڑ رہی تھی۔ ہمارے پلٹنے سے پیشتر ہی آنے والا راہداری میں آ گیا۔ اس وقت ذرا سی تاخیر بھی مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے پلٹ کر راہداری کی طرف اندھا دھند ایک فائر جھونک مارا۔

ایک دبی دبی غضب ناک غراہٹ کے ساتھ اُدھر سے بھی فائر ہوا اور پھر اچانک ہی پورا شاہ باغ ہولناک فائرنگ کے شور سے لرز اُٹھا۔ اعصاب زدہ مسلح محافظوں نے کاٹیج کے اندر فائرنگ کی آواز سنتے ہی شاید اپنا اسلحہ برباد کرنا شروع کر دیا تھا۔

میں جھپٹ کر راہداری میں قدرے آگے بڑھا اور مجھے ہارون کی صرف ایک جھلک نظر آئی۔ اس نے بھی اگلے دروازے کے قریب سے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ یوں سامنا ہونے کے لیے تیار نہیں تھا جب کہ میں تیار تھا اس لیے مجھے پہلے فائر کرنے کا موقع مل گیا۔ گولی اس کے شانے پر لگی اور وہ کراہتا ہوا پیچھے اُلٹ گیا۔

اُسے گرتے دیکھ کر میں نے دوڑ لگائی لیکن اسی لمحے ہر طرف گھور اندھیرا چھا گیا۔ جنریٹر کا شور یکلخت ہی موقوف ہوا تھا۔ شاید ڈی ڈی نے خطرہ بھانپ کر جنریٹر ہی بند کر دیا تھا۔

باہر مسلسل گولیاں چل رہی تھیں، ساتھ ہی وہ لوگ ایک دوسرے کو اونچی آوازوں میں ہدایات بھی دے رہے تھے لیکن کسی نے کاٹیج کے قریب آنے کی ہمت نہیں کی تھی، انھیں باہر رہ کر نگرانی کا حکم ملا ہوا تھا۔ شاید اندر شروع ہونے والی فائرنگ نے ان کے ذہنوں کو ماؤف کر کے رکھ دیا تھا۔

گھور اندھیرے میں میں دروازے سے گزرنے کے بجائے اپنے پورے زور میں دیوار سے ٹکرا گیا۔ لیکن میرے پیچھے آنے والا سلطان شاہ دروازے سے صاف گزرتا ہوا زخمی ہارون پر جا پڑا کیوں کہ فوراً ہی اندر سے دھینگا مشتی کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔

دیوار سے میرے بائیں شانے پر خاصی شدید ضرب لگی تھی لیکن مجھے سلطان شاہ کے تھیلے کی فکر تھی جس میں دستی بموں سمیت خاصا آتش گیر مادہ موجود تھا۔ اگر ہارون سے لڑتے ہوئے ان میں سے کسی ایک کی بھی فیوز پن نکل جاتی تو سلطان شاہ کے ساتھ ہارون کے بھی چیتھڑے اُڑ جاتے۔

"ہینڈز اپ!" میرے حرکت کرتے ہی مخالف سمت سے ڈی ڈی کی سرد، تحکمانہ آواز گونجی تھی۔ شاید وہ جنریٹر بند کر کے سیدھا اُدھر ہی دوڑا چلا آیا تھا۔

وہ کاٹیج کا اندرونی حصہ تھا اس لیے گھور اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔ میں نے ڈی ڈی کی آواز سے اس کی پوزیشن کا اندازہ لگا کر فائر کر دیا۔

"بھاگو باس! یہ سب پچھلی کھڑکی سے اندر آئے ہیں۔" ہارون کی ہانپتی ہوئی آواز اُبھری۔ اس نے ہم دونوں کو تو یقیناً دیکھ لیا تھا لیکن اندھیرے میں زخمی ہونے اور پٹنے کے باعث وہ بوکھلا کر ہماری نفری کے بارے میں غلط اندازہ لگا بیٹھا تھا جس کی وجہ سے ڈی ڈی کے بھی پیر اُکھڑ گئے۔

اس کے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سُن کر میں نے چھت کی طرف ایک فائر کیا پھر اسے مزید خوف زدہ کرنے کے لیے اونچی آواز میں ہانک لگائی "چاروں طرف پھیل جاؤ، کوئی بچ کر نکلنے نہ پائے۔" وہ فرضی ہدایت دیتے ہوئے میں نے ڈی ڈی کے پیچھے دوڑ لگائی۔

دوسرے دروازے سے نکلتے ہی میں نے اندھا دھند آگے دو فائر کیے تھے جو خطا ہو گئے پھر پیچھے کمرے میں ایک دھماکا ہوا اس بارودی دھماکے میں ہارون کی ادھوری دلدوز چیخ بھی شامل تھی۔ سلطان شاہ نے اس پر زیادہ وقت اور قوت ضائع کرنے کے بجائے اس کا کام ہی تمام کر دیا تھا۔

ان مخدوش حالات میں یہی حکمتِ عملی بہترین تھی۔ ہمیں کاٹیج کے اندر اپنی کارروائی مکمل کر کے اتنی سرعت کے ساتھ وہاں سے نکلنا تھا کہ باہر والوں کو صورتِ حال سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ اس کے علاوہ دوسری اہم بات یہ تھی کہ ہم دونوں کو اکٹھا رہنا تھا تاکہ وہاں سے ایک ساتھ فرار ہو سکیں۔

ہم دونوں ڈی ڈی کے تعاقب میں ایک کمرے میں گھسنے ہی والے تھے کہ ہم نے پے در پے تین فائر ہوئے۔ ڈی ڈی نے بھاگتے ہوئے مڑ کر گولیاں چلائی تھیں اس لیے تینوں گولیاں ضائع ہو گئیں مگر اس کے نتیجے میں ہمیں رُک جانا پڑا۔ وہ اگر اچانک ہی کہیں جم کر مورچا سنبھال لیتا اور اندھا دھند گولیاں برسانے لگتا تو ہمارا ڈھیر ہو جانا یقینی تھا لیکن ہارون مرنے سے پہلے ہماری نفری کی طرف سے اسے خوف زدہ کر چکا تھا اس لیے وہ رُکے بغیر آگے نکلتا ہی چلا گیا۔

تھوڑے سے تردد کے بعد ہم نے دوبارہ پیش قدمی کا آغاز کیا تو ڈی ڈی کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح، تاریکی میں کہیں غائب ہو چکا تھا۔ اسی سمت میں چلتے ہوئے ہم باہر نکلے تو کاٹیج کے باہر کھڑی ہوئی جیپ کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ دھول اڑاتی، پھاٹک کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

ڈی ڈی ہمارے ہاتھ آتے آتے کسی چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر نکل گیا تھا اور میری، دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی تھی۔ میں نے جیپ پر فائر کرنے کے لیے اضطراری طور پر پستول والا ہاتھ اوپر اٹھایا تھا لیکن فوراً ہی ارادہ ترک کر دیا۔ باہر آ کر جیپ پر فائر کر کے ہم محافظوں پر یہ ظاہر کر دیتے کہ ہم ان کے آقاؤں کے جانی دشمن تھے اور وہ مسلح درندے ہمیں گولیوں کی باڑھ پر رکھ لیتے جب کہ اس گاڑی پر گولیاں نہ چلانے کی صورت میں ہم محافظوں کو جُل دینے کی کوشش کر سکتے تھے کیوں کہ ہمارے چہرے نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔

"ہینڈز اپ!" اچانک تاریکی میں تناور درختوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے کسی مسلح محافظ کی اعصاب زدہ للکار فضا میں گونجی اور میں جہاں تھا، وہیں سینے کے بل زمین پر گر گیا۔ سلطان شاہ نے میری تقلید کی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں للکارنے والا اضطراری طور پر گولی نہ چلا بیٹھے۔

میرا یہ خدشہ درست ثابت ہوا، نیچے گرتے ہی فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے لرز اُٹھی لیکن غنیمت یہ تھا کہ وہ سب ہوائی فائر تھے۔ گولیاں روشن جگنوؤں کی طرح فضا میں اوپر تیر کر معدوم ہو رہی تھیں۔

"الو کے پٹھو! اپنے لوگوں پر اسلحہ برباد کرنے کے بجائے باہر آ کر دشمن کو گھیرو۔" فائرنگ میں وقفہ آتے ہی میں نے زمین سے اٹھے بغیر غصیلی آواز میں کہا۔ "تم یہاں ہوا سے لڑ رہے ہو اور دشمن کاٹیج میں گھس چکا ہے۔" میرا لہجہ بلند اور تحکم آمیز تھا۔ اُس ماحول میں اُن پیشہ ور لڑاکوں کے لیے سوچنے سمجھنے کا زیادہ موقع نہیں تھا اس لیے وہی ہوا جو میں سوچ رہا تھا۔ چند ثانیوں کے توقف کے بعد ہی قریبی درختوں کی اوٹ سے تین انسانی ہیولے نکل کر تیر کی طرح کاٹیج کی طرف آئے تھے اور دیواروں سے چپک کر داخلی دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔

گھور اندھیرے نے اس وقت اپنے اور پرائے کی تمیز مٹا دی

تھی، میرا اندازہ تھا کہ اس وقت تک کچھ محافظ عقبی کھڑکیوں یا کسی اور راستے سے اندر گھس چکے ہوں گے۔ دروازے سے یلغار کرنے والے اندر ان کی موجودگی بھانپتے ہی اس نتیجے پر پہنچتے کہ وہ دشمن کے آدمی تھے۔ یوں وہ آپس میں ہی لڑ مرتے۔

لیکن ان کی وہ غلط فہمی غیر معینہ مدت کے لیے قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ اپنی حماقت کا احساس ہوتے ہی وہ مل کر صورتِ حال کا جائزہ لیتے اور پھر اُن لوگوں کی بڑے پیمانے پر تلاش شروع ہو جاتی جنھوں نے ہارون کو ٹھکانے لگا کر انھیں آپس میں لڑوا دیا تھا اس لیے ہمیں وہ مختصر سی مہلت ختم ہونے سے پہلے ہی شاہ باغ کی حدود سے اتنی دُور نکل جانا تھا کہ وہ خونخوار درندے ہماری دُھول بھی نہ پا سکیں۔

اس پہلو پر میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اندر جو کچھ ہوا، وہ اچانک ہی ہوا تھا۔ سلطان شاہ کے برتنوں سے ٹکرانے پر ہارون جائزہ لینے کے لیے آیا تھا اور جب وہ ہمارے ہتھے چڑھ گیا تو ڈی ڈی اندھیرا کر کے اضطراری طور پر ہمارے سروں پر آ پہنچا۔ اُس وقت اُسے گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اندر صورتِ حال اتنی بگڑ جائے گی کہ اسے سر پہ پیر رکھ کر یوں شاہ باغ سے فرار ہونا پڑے گا۔

اس کے باوجود جب میں اس کے تعاقب میں لپکا تو وہ براہِ راست اپنی پجیرو میں سوار ہوا اور انجن اسٹارٹ کر کے اسے لے بھاگا جس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ پجیرو کی چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ ویسے بھی شاہ باغ... ڈی ڈی کا ایسا مستحکم قلعہ تھا جہاں وہ غیر متوقع طور پر کسی کی دخل اندازی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس امکان کی روشنی میں اُس وقت کاٹیج کے سامنے موجود دو گاڑیاں میرے دل میں اُمید کی کرن پیدا کر رہی تھیں۔

اُن میں سے ایک ہُڈ والی نیلی پک اَپ تھی جس کا انجن غالباً ڈیزل سے چلتا تھا۔ اُس وقت فرار کے لیے ڈیزل انجن والی گاڑی اپنے کمزور پک اَپ کی وجہ سے ہمارے لیے مناسب نہیں تھی لیکن وہی ہم سے قریب تر تھی۔ میں نے محافظوں کو پوری طرح کاٹیج کی طرف متوجہ پا کر زمین چھوڑ دی اور اندھیرے میں پک اَپ کی طرف رینگ گیا پھر میں نے اس کے اسٹیئرنگ کے نیچے ٹٹول کر اگنیشن سے چابی نکال لی۔ اُس اقدام کا مطلب صرف اسی قدر تھا کہ ڈی ڈی کے آدمی اس ڈیزل پک اَپ میں فوری طور پر ہمارے تعاقب میں روانہ نہ ہو سکیں۔

میں پک اَپ سے ہٹ کر زرد ٹویوٹا کی طرف بڑھا تو وہاں سلطان شاہ پہلے ہی اسٹیئرنگ کے پیچھے براجمان ہو چکا تھا۔ میں گھوم کر پھرتی سے اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

ہمارے لیے مزید وہاں رُکنا بالکل بے سود تھا۔ ہماری جنگ شی اور اس کے سربراہ ڈی ڈی کے خلاف تھی۔ ڈی ڈی خطرہ بھانپ کر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس کا دستِ راست، ہارون، سلطان شاہ کے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکا تھا اس لیے شاہ باغ میں افراتفری ختم ہونے سے پہلے ہی ہمارا وہاں سے نکل بھاگنا ناگزیر ہو گیا تھا جس کے لیے حالات بھی پوری طرح سازگار تھے۔

سلطان شاہ کا کینوس کا تھیلا اگلی دونوں نشستوں کے درمیان رکھا ہوا تھا۔ میں نے اندر بیٹھتے ہی تھیلے میں سے دو دستی بم نکال لیے تھے۔ سلطان شاہ نے جوں ہی سیلف لگایا میں نے ایک دستی بم کی پن دانتوں سے کھینچ کر وہ بم پوری قوت سے، کار کی کھلی ہوئی کھڑکی میں سے کاٹیج کی طرف پھینک دیا۔ بم گرتے ہی ایک ہولناک دھماکے کے ساتھ وہاں شعلے بھڑک اُٹھے۔ ان شعلوں کی روشنی میں میں نے بم کی زد میں آئے ہوئے کم از کم دو محافظوں کو بے بساط تنکوں کی طرح فضا میں اُچھل کر دُور گرتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایک خوشگوار اتفاق تھا کہ اندھیرے میں میرے ہاتھ آنے والا یہ بم آتش گیر ثابت ہوا تھا اور وہاں اسی کی ضرورت تھی۔

دھماکے کے ساتھ ہی کار تیزی کے ساتھ حرکت میں آ چکی تھی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ دوسرا بم بھی استعمال کر ڈالا جس کے دھماکے سے خود میرے اعصاب تک جھنجھنا اُٹھے۔

سلطان شاہ نے بوکھلاہٹ میں یا دانستہ کار کے ہیڈ لیمپس روشن نہیں کیے تھے لیکن کاٹیج میں بھڑک اُٹھنے والی آگ نے رات کے گھور اندھیرے کو خون آشام سُرخی کا غسل دے ڈالا تھا۔ کار کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی کہ اچانک سامنے سے ایک نہتا شخص دوڑتا ہوا کار کے آگے آ گیا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال آیا تھا کہ کہیں وہ شاہ باغ کا کوئی مظلوم مالی نہ ہو۔ سلطان شاہ نے میرے کچھ کہے بغیر اسٹیئرنگ کاٹ کر اسے بچانا چاہا لیکن دو رویہ تناور درختوں کے درمیان کچا راستہ زیادہ وسیع نہیں تھا۔ سامنے سے آنے والا دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے کار کا راستہ روکنے کی کوشش میں رُخ بدلتی ہوئی کار کے سامنے ہی رہا۔ پھر اسٹیئرنگ سمیت پوری کار کو ایک شدید جھٹکا لگا اور فضا اس غیر مسلح شخص کی دلدوز چیخ سے لرز اُٹھی۔ آہنی بمپر کی ہولناک ٹکر نے آنے والے کو تیزی سے پیچھے اچھال دیا تھا، زمین پر گر کر وہ کسی زندہ لوتھڑے کی طرح کلبلایا تھا لیکن چند گز کا وہ فاصلہ کار نے پلک جھپکتے میں طے کر لیا۔

وہ کوئی ٹرک ہوتا تو اسے روندتا ہوا گزر جاتا لیکن وہ نیچی باڈی اور نسبتاً چھوٹے ٹائروں والی ٹویوٹا کار تھی۔ اس لیے وہ بدنصیب اس کے بمپر اور بائیں پہیے میں اس بُری طرح پھنسا کہ اسٹیئرنگ اسی طرف گھومتا چلا گیا۔ اگر سلطان شاہ ہی بریک نہ لگاتا تو وہ کار بائیں طرف کے درختوں سے ٹکرا کر تباہ ہو سکتی تھی۔ پھر بھی کار رُکتے رُکتے اسے راستے کے بائیں سرے تک لے گئی۔

ٹکر لگنے اور پھر کار کے نیچے آنے پر اس کی پے در پے دردناک چیخیں سنائی دی تھیں لیکن کار کے رُکنے تک اس کی ہر آواز یکسر موقوف ہو چکی تھی۔

وہ ایک جاں گسل معرکہ تھا۔ اندھیرے میں نہ جانے کہاں کہاں سفاک نشانچی موجود تھے اس لیے اس وقت رُک کر حادثے کا شکار ہونے والے کا جائزہ لینے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ سلطان شاہ نے اس رکاوٹ سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لیے کار کو تیزی سے ریورس کیا اور اسٹیئرنگ کی جگہ بنا کر پھر بریک لگا دیے۔ لمحہ بھر بعد کار فراٹے بھرتی ہوئی شاہ باغ کے احاطے میں لگے ہوئے اس چوبی پھاٹک سے گزرتی چلی گئی جو چند ثانیوں قبل پجیرو کو گزارنے کے لیے کھولا گیا تھا۔

"ہیڈ لیمپس روشن کر دو، ورنہ گاڑی جھاڑیوں میں گھسیڑ دو گے۔" کاٹیج میں لگی ہوئی آگ سے لمحہ بہ لمحہ دُور ہوتے ہوئے میں نے اندھیرا محسوس کرتے ہوئے بوکھلا کر کہا اور سلطان شاہ نے فوراً ہی ہیڈ لیمپس روشن کر دیے۔

خودرو پودوں، جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان، بل کھاتے ہوئے کچے راستے پر ہمارا سفر زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا کیوں کہ ایک موڑ عبور کرتے ہی ٹویوٹا کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں ڈی ڈی کی پجیرو کچے راستے کے ایک مقام پر ترچھی کھڑی ہوئی نظر آئی تھی۔ کچا راستہ پجیرو نے مسدود کر دیا تھا اور اس کے دائیں بائیں اس قدر گھنی اور اونچی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں کہ راستہ کاٹ کر آگے نکلنا محال ہو رہا تھا۔

ڈی ڈی شاہ باغ میں خطرہ سر پر منڈلاتا ہوا دیکھ کر فرارانہ انداز میں وہاں سے بھاگ نکلا تھا لیکن اس کے ذہن پر وہ تجسس بُری طرح سوار تھا کہ اس کے خون کے پیاسے کون تھے؟ شاید اسی سوال کا جواب پانے کے لیے اس نے شاہ باغ سے کچھ دُور نکل کر کچا راستہ بند کر دیا تھا اور خود غالباً خودرو جنگل میں کہیں چھپ گیا تھا تاکہ موقع ملتے ہی ہمیں ہلاک یا زخمی کر کے اپنا قیدی بنا سکے اور ہماری اصلیت کا سراغ حاصل کر سکے۔

یہ صورتِ حال خاصی نازک تھی۔ ڈی ڈی تاریک جنگل کے کسی نامعلوم کنج میں ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا جب کہ ہماری نقل و حرکت اس کی نگاہ میں تھی۔ پستول میرے ہاتھ میں تیار تھا۔ میں نے راستے میں ہی اس میں نیا، بھرا ہوا میگزین چڑھا لیا تھا۔ اُس صورتِ حال کے پیشِ نظر تھیلے میں سے دو دستی بم بھی نکال لیے۔

سلطان شاہ نے راستے پر رکاوٹ دیکھ کر جوں ہی اپنی کار کی رفتار کم کر کے بریک لگائے، اچانک وہ ویرانہ فائرنگ کے شور سے لرز اُٹھا۔ میں فوراً پائیدان پر جھک گیا اور سلطان شاہ نے اپنا بدن سمیٹ کر، چہرہ اسٹیئرنگ وہیل میں چھپا لیا۔ گولیاں اتنے تواتر کے ساتھ کار کی باڈی کے مختلف آہنی حصوں میں پیوست ہو رہی تھیں جیسے آسمان سے وزنی اولے برس رہے ہوں۔ اس دوران میں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈی ڈی ہماری کار پر داہنی سمت سے فائر کر رہا تھا۔

کار رُکتے ہی میں نے بائیں سمت کا اپنا دروازہ کھولا اور نیچے زمین پر لُڑھک گیا۔ "تم بھی اسی دروازے سے نکل آؤ۔" میں نے اسلحے کا تھیلا سنبھالتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں سلطان شاہ سے کہا۔

اُس نے بھی میری تقلید کی۔ ڈی ڈی کی فائرنگ نے ٹویوٹا کے دونوں ہیڈ لیمپس ناکارہ کر دیے تھے اس لیے وہاں ایک بار پھر اندھیرا اُچھل گیا تھا لیکن اس کے باوجود ڈی ڈی کی چلائی ہوئی گولیاں ہمارے قرب و جوار میں برس رہی تھیں۔ اسے ہم پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ اندھیرا ہونے سے پہلے وہ ہماری پوزیشن دیکھ چکا تھا۔

اس وقت ہم گولیوں کی اندھا دُھند برسات کی وجہ کار کے پیچھے سے نکل کر نہ اپنی پوزیشن بدلنے کا خطرہ مول لے سکتے تھے نہ ڈی ڈی کی پوزیشن کا جائزہ لے سکتے تھے۔ کھڑکیوں تک سر اُبھارنے میں بھی خطرہ موجود تھا کیوں کہ ڈی ڈی اندھیرے میں بھی بہترین نشانہ بازی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی بیشتر گولیاں کار کی باڈی میں پیوست ہو رہی تھیں، یا کھڑکیوں سے آر پار گزر رہی تھیں۔

میں کوئی اور راہ نہ پا کر سینے کے بل کار سے نیچے رینگ گیا۔ وہاں سے میری بصارت کا دائرہ تکلیف دہ حد تک محدود ہو کر رہ گیا تھا مگر پھر بھی میں تھوڑی سی جدّوجہد کے بعد گولیوں کی پشت سے نمودار ہونے والے بارودی شراروں کے اخراج سے یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا کہ ڈی ڈی کچے راستے سے داہنی طرف، ہم سے تقریباً ڈیڑھ، دو سو فٹ دُور چھپا ہوا تھا۔ یہ اندازہ لگاتے ہی میں واپس اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔

اس وقت تک ہماری طرف سے ایک بھی جوابی فائر نہیں کیا گیا تھا اور سلطان شاہ جال میں پھنسے ہوئے کسی درندے کی طرح بپھرا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ڈی ڈی کی فائرنگ کا جواب کیسے دیا جائے۔

"دماغ ٹھنڈا رکھو!" میں نے ایک آتش گیر دستی بم کو

انگلیوں سے ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "یہ مقابلہ طول پکڑ گیا تو شاہ باغ میں بچ جانے والے محافظ بھی اس چاند ماری میں شریک ہو جائیں گے، آگے راستہ مسدود ہے اس لیے یہاں سے ہمیں پیدل ہی آگے بڑھنا ہوگا تاکہ اپنی کار تک پہنچ سکیں۔"

"جب تک اس حرام زادے کی فائرنگ میں وقفہ نہیں آتا، ہم یہاں سے ہل بھی نہیں سکتے۔" وہ اس صورتِ حال سے بُری طرح جھلایا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"مَیں نے اُس کی پوزیشن دیکھ لی ہے۔ مَیں اُدھر بم پھینکنے جا رہا ہوں۔" میں نے کہا اور پھر اُس ہینڈ گرینیڈ کی پن نکال کر اپنا جسم کار کے آہنی ڈھانچے کی اوٹ میں رکھتے ہوئے بازو کی پوری قوت سے وہ بم ڈی ڈی کی طرف اچھال دیا۔

سو سُنار کی ایک لوہار کی والی ضرب المثل اس موقع پر صادق آئی تھی۔ چند ثانیوں بعد بم کا دھماکا ہوتے ہی ڈی ڈی کی فائرنگ یکلخت معدوم ہو گئی تھی لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ اس بارودی دھماکے میں کوئی انسانی چیخ شامل نہیں ہو سکی تھی جس کا مطلب تھا کہ ہمارا اصل شکار دھماکے کی زد میں آنے سے بچ گیا تھا۔

"ایک دو بم اور اسی طرف پھینک دو۔" مَیں نے کار کی اوٹ سے نکل کر جلتی ہوئی خشک جھاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سلطان شاہ سے کہا۔

ہم نے تھیلا اُٹھا کر بائیں سمت سے اپنی پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے ڈی ڈی کی کمین گاہ کی طرف مزید تین دستی بم پھینکے لیکن دھماکوں کے باوجود اس کی کوئی چیخ نہیں سنائی دی۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ دھماکوں نے اس کے قدم اکھاڑ دیے تھے اور ایک بار سمت کا تعین کھو دینے کے بعد وہ جلتی ہوئی خشک جھاڑیوں کی روشنی سے مدد لینے کے بعد ہی کوئی نیا اندازہ قائم کر سکتا تھا اس دوران میں ہم اس کی دسترس سے دُور نکل سکتے تھے۔

کچّے تے سے بائیں جانب پودوں اور جھاڑیوں کے درمیان اپنا ر تہ بناتے ہوئے ہم پجیرو سے آگے نکل گئے تو پیچھے سے دوبارہ فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں اس بار ان آوازوں کا رُخ تیزی سے بدل رہا تھا۔ شاید ڈی ڈی کو اپنی حکمتِ عملی کی ناکامی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ اندھا دُھند چاروں طرف گولیاں برسا رہا تھا۔

خاصا طویل چکر کاٹنے کے بعد ہم دوبارہ کچّے راستے پر آ گئے ورنہ اندھیرے میں موجود جھاڑ جھنکار کا وٹوں کی وجہ سے راستہ بھٹک کر دُور نکل جانے کا خطرہ موجود تھا۔ اُس وقت بھی فضا میں اکا دُکا فائروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

"ہم نے اسے مار لینے کا سنہری موقع گنوا دیا۔" خطرہ ٹل جانے پر سلطان شاہ نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

"اس کا مقدر ساتھ دے رہا تھا جو وہ بچ گیا ورنہ آج اس کے مارے جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ پھر بھی یہ خوشی کی بات ہے کہ وہ نہیں تو اس کا اہم ساتھی ہی مارا گیا۔" مَیں نے اپنی خلش کا اظہار کیے بغیر تشفّی آمیز لہجے میں کہا۔ "اب دیکھنا ہوگا کہ جاز زوار میں ہارون کی جگہ کس کا تقرر کیا جاتا ہے؟"

"سارا کھیل میری وجہ سے بگڑا ہے۔" سلطان شاہ کی آواز میں جھلاہٹ کے ساتھ ہی ندامت بھی نمایاں تھی۔ "نہ باورچی خانے میں میری بے احتیاطی کی وجہ سے شور پیدا ہوا ہوتا اور نہ بازی یوں بے لگام ہو کر ہمارے ہاتھوں سے نکلتی۔ ہم اپنی سہولت کے مطابق وار کر کے بڑی آسانی سے دونوں کو بے بس کر سکتے تھے۔"

"خود کو ملامت نہ کرو!" مَیں نے کہا۔ "یہ واقعہ اِس طرح پیش آنا تھا اور آ کر رہا۔ تم سے غلطی نہ ہوئی ہوتی تو مجھ سے کوئی گڑبڑ ہو جاتی۔ اسے آج رات ہر حالت میں زندہ رہنا تھا۔"

وہ مجھ سے کچھ نہ بولا لیکن اس کی غیر واضح بڑبڑاہٹیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ مَیں نے اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے مزید کوئی بات کیے بغیر جھاڑیوں میں چھُپی ہوئی سُرخ کار تک پہنچ گئے۔

کار روانہ ہوتے ہی سلطان شاہ نے جہانگیر کا ذکر چھیڑ دیا۔ اُس کے بارے میں اُسے میری زبانی تشنہ معلومات ملی ہوئی تھیں اور اس وقت تک ہمیں اس موضوع پر تبادلۂ خیال کا کوئی موقع نہیں مل سکا تھا۔

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی کہ ڈی ڈی نے جہانگیر کو پکڑ وایا تھا تو پھر اتنی آسانی کے ساتھ خود بخود رہا کیوں کر دیا؟" اس نے اُلجھن آمیز لہجے میں سوال کیا تھا۔

"وہ میری گمنام فون کالز سے خوف زدہ ہو گیا ہے۔" مَیں نے کہا۔ "اور کسی طرح اُسے شبہ ہو گیا ہے کہ مَیں پاکستان واپس آ چکا ہوں۔ اسی شبے کے تحت اُس نے جہانگیر کو اغوا کرا لیا۔ اس کا خیال تھا کہ تشدد کے ذریعے وہ جہانگیر کو زبان کھولنے پر مجبور کر دے گا لیکن جہانگیر نے کمال کی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا اور ڈی ڈی کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ اُسے میرے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ ڈی ڈی نے اس اُمید پر اُسے رہا کیا ہے کہ مَیں کبھی واپس آ کر اُس سے رجوع کیا تو وہ اپنی چمڑی محفوظ رکھنے کے لیے فوراً ڈی ڈی کو خبر دے دے گا۔"

"پھر تو تمھیں جہانگیر سے دُور ہی رہنا ہوگا ورنہ تمھاری وجہ سے بے چارہ بھی مارا جائے گا۔"

"مَیں احتیاط کروں گا مگر اس کی ضرورت نہیں ہے۔" مَیں نے بے توجہ ہٹائے بغیر بے پروائی سے کہا۔ "ڈی ڈی کے ذہن میں شبہ پیدا ہوا تھا جو دُور ہو گیا۔ اس وقت کے ٹکراؤ نے اُسے دہشت زدہ کر دیا ہوگا۔ اب تو وہ ہر قیمت پر اس شخص کا سراغ لگانے کی کوشش کرے گا جو ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ ذرا یہ تو دیکھو کہ تھیلے میں اب کیا باقی رہ گیا ہے؟ ایک آدھ وار کی گنجائش ہے یا واپس ہی لَوٹنا پڑے گا؟"

مَیں نے قدرے توقف کے بعد آخری سوال ایک فوری خیال کے تحت کیا تھا جس پر سلطان شاہ چونک پڑا۔ "کیا دوبارہ شاہ باغ کی طرف لَوٹنے کا ارادہ ہے؟"

"مَیں خودکشی کا قائل نہیں ہوں۔" مَیں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "بس ڈی ڈی کو گھیرنے کی ایک کوشش اور کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بچ بھی گیا تو عمر بھر آج کی رات کو نہ بھلا سکے گا۔"

"تھیلے میں چاقو اور ٹارچوں کے علاوہ گولیوں کے پیکٹ اور فاضل میگزین رہ گئے ہیں۔ دستی بم صرف تین باقی ہیں۔ اِن سے کام چل جائے گا؟"

"بہت کافی ہیں۔ شاہ باغ لاکھ دیہی اور مضافاتی علاقہ سہی لیکن وہاں ہونے والی بے تحاشا فائرنگ اور بموں کے دھماکوں کی آوازیں دُور دُور تک سُنی گئی ہوں گی اور آس پاس کا کوئی بھی آدمی تھانے دار پولیس کو خبر کر دے گا۔ یہ بات ڈی ڈی بھی جانتا ہے، وہ رات بھر وہیں رکنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ اس کی واپسی کا ایک ہی راستہ ہے۔ ہم کہیں بھی رُک کر اس کی واپسی کا انتظار کر لیں گے...!"

"اس کے پاس طاقت ور انجن والی جدید ترین جیپ ہے۔" سلطان شاہ نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "ایک بار وہ ہمارا راستہ کاٹ چکا ہے اس لیے ہماری طرف سے ایسے کسی خطرے سے غافل نہیں ہوگا۔ اُس کی پجیرو جیپ جھاڑیوں اور ٹیلوں کو روند کر اپنے لیے دس نئے راستے پیدا کر سکتی ہے۔"

"ہم دو بجے تک انتظار کریں گے۔" مَیں نے اُس کی دلیل کی معقولیت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تک وہ نہ آیا تو ہم شہر روانہ ہو جائیں گے۔"

اس پروگرام پر متفق ہونے کے بعد میں اسی راستے پر ڈرائیو کرتا ہوا کار کو نیشنل ہائی وے تک لے گیا پھر یُو ٹرن لے کر تقریباً ایک فرلانگ اندر واپس آئے اور کار کو کچے راستے سے اُتار کر اونچی جھاڑیوں کے پیچھے پارک کر دیا۔ وہاں کار آنے والوں کی نگاہوں سے محفوظ تھی۔ اسے لاک کر کے ہم نے اپنے ہتھیار سنبھالے اور راستے کے دونوں طرف اپنی کمین گاہوں میں چھُپ گئے۔ کچے راستے کی چوڑائی اتنی کم تھی کہ ہم اپنی جگہوں پر چھُپے رہ کر بھی عام لب و لہجے میں اپنی بات ایک دوسرے تک پہنچا سکتے تھے۔

"وہ اِدھر سے آیا بھی تو اکیلا نہیں ہوگا۔" چند ثانیوں بعد دوسری جانب سے سلطان شاہ کی آواز سنائی دی۔ "اس بار وہ اپنے سارے زندہ، مُردہ اور زخمی ساتھیوں کو لے کر آئے گا تاکہ پولیس کو شاہ باغ سے کسی قسم کی شہادت نہ مل سکے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ اندھیرے میں تمھاری کھوپڑی میں کچھ جگنو چمکنے لگے ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "کاٹیج میں لگنے والی آگ کی وجہ سے وہاں سے ہر سراغ مٹانا ناممکن ہے۔ جو مر گئے ہیں، انھیں آتش زدہ ملبے میں جھونک دیا جائے گا تاکہ شاہ باغ کے پُرامن مکینوں پر نامعلوم لوگوں کے وحشیانہ حملے کا تاثر دیا جا سکے۔ شہر کے مقابلے میں اس کے لیے لاشوں کو وہیں ٹھکانے لگانا آسان ثابت ہوگا۔"

"پھر بھی وہ زندہ اور زخمی آدمیوں کو ضرور ساتھ لائے گا کیونکہ وہاں اُن کی ڈیزل پک اپ بھی موجود ہے۔" وہ آسانی کے ساتھ خاموش ہو جانے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

"دو گاڑیاں ہوئیں تو ہم انھیں گزر جانے دیں گے۔ یہاں لمبا معرکہ چھڑ گیا تو نیشنل ہائی وے پر گشت کرنے والی کوئی بھی پولیس پارٹی آناً فاناً میں یہاں پہنچ جائے گی۔" مَیں نے آہستگی سے کہا۔ "اور اب تم بھی خاموش رہو۔ ضروری نہیں کہ ان اطراف میں ہمارے علاوہ کوئی اور موجود نہ ہو۔"

"مَیں لیٹ رہا ہوں۔ گاڑیوں کی آواز سنو تو ذرا مجھے ہوشیار کر دینا۔" وہاں کی کھُلی اور تازہ ہوا اس پر اثر انداز ہونے لگی تھی اور وہ وقت گزاری کے لیے میرے ساتھ شوخیاں کرنے پر تُلا ہوا نظر آ رہا تھا لہٰذا مَیں اس کے منہ لگنے کے بجائے چپ سادھ کر بیٹھا رہا اور وقت دھیمے دھیمے گزرتا رہا۔

ہم نیشنل ہائی وے سے بہت زیادہ دُور نہیں تھے۔ اس لیے وہاں سے گزرنے والے ٹرکوں، ٹریلروں اور بسوں کا شور بھی ایک مخصوص دھیمے آہنگ میں بار بار اُبھرتا اور ڈوبتا ہوا سنائی دے رہا تھا۔ مَیں ان آوازوں کے ساتھ ساتھ اپنے اگلے لائحۂ عمل پر بھی غور کر رہا تھا کہ سلطان شاہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہوشیار! کوئی گاڑی آ رہی ہے۔" اُس نے ہانک لگائی تھی۔

مَیں نے اضطراری طور پر پہلو بدل کر کان لگائے لیکن کوئی آواز نہ سُن سکا البتہ چند ثانیوں بعد ڈیزل انجن کے ہلکے شور کے ساتھ ہی درختوں سے اوپر، ناہموار زمین پر ہچکولے کھاتی ہوئی کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی بھی نظر آ گئی۔ یہ اتفاق تھا کہ شاہ باغ میں پجیرو اور پک اپ، دونوں ہی ڈیزل والی گاڑیاں تھیں اور محض ان کی آواز سُن کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کون سی گاڑی تھی۔

لیکن یہ غیر یقینی صورتِ حال جلد ہی واضح ہو گئی۔ ہم سے خاصے فاصلے پر آگے پیچھے کم از کم دو گاڑیوں کے ہیڈ لیمپس چمکتے اور معدوم ہوتے نظر آئے تھے۔

"دو گاڑیاں ہیں، جلدی سے اِدھر واپس آجاؤ۔" میں نے فوری طور پر سلطان شاہ سے کہا۔ "ہمیں ان سے اُلجھے بغیر اُن کا پیچھا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

سلطان شاہ فوراً ہی اپنے اسلحے سمیت دوڑتا ہوا میری طرف آگیا۔ ہم دونوں اپنی کار کی طرف ہولیے اور آرام سے اس کی اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ اس بار بھی اپنی سُرخ بی ایم ڈبلیو کی ڈرائیونگ سیٹ میں نے ہی سنبھالی تھی اس طرح میں بار بار سلطان شاہ کو ہدایات دینے کے بجائے ہر لمحے اپنی مرضی کے مطابق سچویشن کو کنٹرول کرسکتا تھا جس میں پجیرو سے ہمارے فاصلے کا تعین اہم ترین تھا۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پہلے نیلے رنگ کی پک اُپ کچے راستے پر دھول اُڑاتی ہوئی ہمارے سامنے سے گزری۔ بادی النظر میں ... وہ ہُڈ کی ساخت کی وجہ سے پولیس پک اُپ معلوم ہو رہی تھی پجیرو اس سے بہ مشکل چند فٹ پیچھے لگی ہوئی تھی پجیرو کے تاریک شیشوں کی وجہ سے یہ نظر نہ آسکا کہ اس میں کتنے افراد موجود تھے لیکن میرے لیے اتنا ہی یقین کافی تھا کہ اس جیپ میں ہمارا شکار ڈی ڈی موجود تھا۔

ان گاڑیوں کے نکل جانے کے بعد میں نے چند ثانیوں تک انتظار کیا۔ پھر بی ایم ڈبلیو کا انجن اسٹارٹ کرکے اسے بھی کچے راستے پر نکال لیا۔ نیشنل ہائی وے سے اتصال کے مقام تک میں نے پارکنگ لائٹس کی روشنی میں احتیاط سے گاڑی ڈرائیو کی پھر شہر کی طرف سڑک پہ رُخ موڑتے ہی ہیڈ لیمپس آن کر دیے۔ اپنے نقاب ہم پہلے ہی اتار چکے تھے۔

اس وقت سڑک پر اندرونِ ملک سے کراچی آنے والے ٹرکوں وغیرہ کی خاصی تعداد سڑک پر موجود تھی۔ اس کے علاوہ مخالف سمت سے آنے والی گاڑیوں کی تیز روشنیاں بھی چکا چوند پیدا کر رہی تھیں۔ اس لیے سڑک پر آتے ہی اندازہ نہ ہوسکا کہ وہ دونوں گاڑیاں کتنی دور نکل چکی ہیں لیکن رفتار بڑھانے اور چند ٹرکوں کو اوورٹیک کرنے کے بعد ہی مجھے سیاہ پجیرو نظر آگئی جو گھاس سے لدے ہوئے ایک ٹرک کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔

شاہ باغ سے نیشنل ہائی وے تک ویرانے میں ڈی ڈی کو بہت سے خطرات لاحق ہوسکتے تھے جن سے ذاتی بچاؤ کے لیے اس نے پک اَپ میں سوار اپنے مسلح محافظوں کو قربانی کا بکرا بنا کر آگے روانہ کیا تھا لیکن قومی شاہراہ پہ آنے کے باوجود پجیرو کا پک اَپ سے پیچھے رہنا پر وٹوکول محسوس ہو رہا تھا لیکن جلد ہی اس کا ایک سبب بھی سامنے آگیا۔

پجیرو سے اگلے ٹرک پر اس کی چوڑائی سے دوگنا چوڑائی تک گھاس لدی ہوئی تھی۔ وہ ٹرک ہموار رفتار سے سڑک کے کنارے چل رہا تھا لیکن اس کی باڈی سے داہنی طرف باہر نکلی ہوئی گھاس نے راستہ اس طرح مسدود کیا ہوا تھا کہ مخالف سمت سے آنے والی گاڑیوں کو بھی اس سے خاص طور پر بچ کر نکلنا پڑ رہا تھا۔

اس ٹرک پہ حد سے زیادہ باہر نکلا ہوا گھاس کا بوجھ رات کے وقت ایک سنگین خطرہ تھا۔ اس اضافی چوڑائی سے وارننگ کے لیے نہ کوئی روشنی لگانے کی زحمت کی گئی تھی اور نہ ہی ریفلیکٹر استعمال کیے گئے تھے۔ کسی بھی سمت سے آنے والی کسی تیز رفتار گاڑی کو اس ٹرک کی وجہ سے کوئی سنگین حادثہ پیش آسکتا تھا۔ وہ ٹرک نہ جانے کہاں سے چلا آ رہا تھا لیکن شاہراہ پر گشت کرنے والی کسی پولیس پارٹی نے ٹریفک کے ضابطوں کی اتنی سنگین خلاف ورزی پر اسے نہیں روکا تھا۔ شاید ٹرک ڈرائیور نے اپنے سفر کا آغاز ہی کسی اہم اہل کار کی مٹھی گرم کرکے کیا تھا اور وہ اتنے اعتماد بلکہ دیدہ دلیری کے ساتھ نیشنل ہائی وے پر قانون کے ضابطوں کا مذاق اڑانے کی جراٴت نہیں کرسکتا تھا۔

اس دوران میں میں اگلی گاڑیوں کو اوورٹیک کرکے پجیرو کے بالکل .... پیچھے پہنچ گیا تھا لیکن اس چوڑی چکلی شاہانہ گاڑی کے شیشوں کی ساخت ایسی بے عیب تھی کہ گزرنے والی گاڑیوں کی روشنیوں اور اپنے تجسس کے باوجود میں اس کے اندر کا جائزہ لینے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

پجیرو نے کئی بار گھاس سے لدے ہوئے ٹرک سے آگے نکلنے کی کوشش کی، لیکن ہر بار مخالف سمت سے آتے ہوئے کسی تیز رفتار ٹرک کے ڈپر نہ یا تیز ہارن نے اسے اپنی جگہ لوٹ آنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد پجیرو قناعت پسندانہ انداز میں یوں گھاس ہوئی باڈی والے اس ٹرک کے پیچھے لگ گئی جیسے اس کا انجن گھاس سونگھ کر کام کر رہا ہو۔

میں نے موقع پاکر اپنی کار کو ایک بار قدرے داہنی جانب نکال کر آگے کا جائزہ لیا تو پجیرو کے ساتھ آنے والی نیلی پک اَپ کا دور دور تک کوئی پتا نہیں تھا۔

ہم دونوں شاہ باغ سے زرد ٹویوٹا میں فرار ہوئے تھے جو راستے میں ہی چھوڑ دی گئی تھی اور سُرخ کار محفوظ فاصلے پہ جھاڑیوں میں پوشیدہ تھی اس لیے اس امر کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ڈی ڈی اس کار کی وجہ سے ہمیں پہچان لیتا۔ میں یوں ہی اس کے پیچھے رہ کر اس کا تعاقب کرنا چاہ رہا تھا لیکن سائیڈ نکال کر آگے کا جائزہ لینے کی کوشش نے میرا کام بگاڑ دیا۔ پجیرو والا سمجھا کہ میں اسے چھوڑ کر گھاس والے ٹرک کو اوورٹیک کرنے کا فیصلہ کر رہا ہوں اس لیے اس نے پجیرو کو بائیں طرف دباتے ہوئے داہنی سمت کا انڈیکیٹر آن کر دیا۔

شاہراہوں پہ چلنے والے ٹریفک کی زبان میں اس اشارے کا مطلب اوورٹیکنگ کی اجازت دینا تھا۔ پجیرو والا اس علامتی زبان میں مجھے اپنے سے آگے نکلنے کا راستہ دے رہا تھا۔ اگر میں وہ دعوت قبول کرلیتا تو پجیرو راستے میں کہیں بھی مڑ کر میری نظروں سے اوجھل ہوسکتی تھی یوں تعاقب کا مقصد سرے سے ختم ہو جاتا اور اگر میں وہ دعوت مسترد کر دیتا تو ڈی ڈی میری طرف سے شبے میں مبتلا ہو جاتا۔ میرے لیے یہ دونوں ہی صورتیں ناخوشگوار تھیں۔

"آگے نکلو ورنہ وہ مشتبہ ہو جائے گا۔" سلطان شاہ نے مجھے ٹہوکا دیا۔ اور میں نے فوراً ہی رفتار قدرے تیز کر دی۔ لوبھر کے لیے دونوں گاڑیاں پہلو بہ پہلو دوڑتی رہیں پھر پجیرو کی رفتار سست ہوگئی میں ٹرک کے پیچھے آگیا اور پجیرو میرے عقب میں دوڑنے لگی۔

"سیٹ میں دھنسے رہو! پیچھے مڑنے کی حماقت نہ کرنا۔" میں نے عقب نما آئینے میں پجیرو کے ہیڈ لیمپس کی چمک محسوس کرکے اضطراری لہجے میں کہا۔ "وہ اپنے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں پوری طرح ہمارا جائزہ لے رہا ہوگا۔" میرا وہ شبہ اپنی جگہ درست تھا، کیونکہ پجیرو کی باڈی اونچی ہونے کی وجہ سے اس کی ڈرائیونگ سیٹ بھی اتنی بلند تھی کہ اس میں اگلی نشستوں پر موجود کوئی بھی شخص اگلی عام گاڑیوں کے اندر تک کے مناظر صاف دیکھ سکتا تھا۔

میرے ذہن پر پجیرو کا اس قدر دباؤ پڑا کہ دو مسلسل ناکام کوششوں کے بعد میں نے تیسری بار سامنے سے آتے ہوئے تیز رفتار ٹرالر کے روح فرسا ہارن کی پروا کیے بغیر کار کی رفتار بڑھا دی اور گھاس سے لدے ہوئے ٹرک کو اوورٹیک کرتا چلا گیا۔ میرا وہ فعل اس قدر اضطراری اور خوف ناک تھا کہ سلطان شاہ اپنی نشست پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

بی ایم ڈبلیو کا چھ سلنڈروں والا انجن اس قدر طاقتور تھا کہ پلک جھپکتے میں ہم ٹرک سے آگے نکل کر اپنی لائن میں آگئے۔ اس عمل میں پل بھر کی بھی تاخیر ہوئی ہوتی تو ہماری گاڑی این ایل سی ٹرالر اور گھاس والے ٹرک کے درمیان بُری طرح پس کر رہ جاتی اور ہماری ہڈیوں تک کا سراغ ملنا محال ہو جاتا۔

"میں نے تو کلمہ پڑھ لیا تھا۔" سلطان شاہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ڈرائیونگ میں اس قدر غیر ذمّے داری کا مظاہرہ کرنے کے اہل بھی ہو۔"

"مجھے معلوم تھا کہ میں کون سی گاڑی چلا رہا ہوں۔" میں نے کھوکھلی ہنسی کے ساتھ جھوٹ بولا۔ "کوئی اور گاڑی ہوتی تو میں ہرگز یہ خطرہ مول نہ لیتا۔" گزرے ہوئے لمحات کا تصور کرکے میرے وجود میں سنسنی دوڑ گئی اور اسی ایک لمحے میں مجھے صحیح طور پر اندازہ ہوا کہ سیکڑوں انسانی جانوں کی بھینٹ لینے والے ہولناک حادثے کیوں اور کیسے رونما ہوتے ہیں۔ اسٹیئرنگ پر بیٹھے ہوئے شخص کے اندازے کی ذرا سی غلطی، معمولی سی گھبراہٹ یا ہلکا سا اشتعال اَن گنت ہنستے کھیلتے انسانوں کی زندگی کے چراغ گُل کرنے کا سبب بن جاتا ہے ورنہ کوئی دیدہ و دانستہ موت کے مُنہ میں چھلانگ لگانے کا شوقین نہیں ہوتا۔

"تم صرف ڈی ڈی کی نگاہوں سے بچنا چاہ رہے تھے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "تم نے بڑا غلط کام کیا ہے۔ ٹریفک کے حادثے کی موت مجھے بڑی حسرت ناک لگتی ہے۔ تصادم کا دھماکا ہوتے ہی ہمارے جسموں کے پرخچے اُڑ جاتے اور ایک جان ہزار ٹکڑوں میں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو جاتی۔ ایسی بھیانک موت ڈی ڈی چاہے تو بھی ہمیں نہیں دے سکتا۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم اسی بہانے اس سے اُلجھ سکتے ہیں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

میرے اس خیال پر وہ چونکا تو مجھے وضاحت کرنی پڑ گئی جسے سن کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ "اور تمھارا خیال ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ اپنے اوپر لگائے جانے والے اس الزام کو قبول کرلے گا؟"

"نہ کرے۔ یہ تو اسے روکنے کا بہانہ ہوگا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "ایک بار وہ سامنے آگیا تو پھر اصل مذاکرات کی ابتدا ہوگی۔"

"کوشش کرکے دیکھ لو لیکن یہ خیال رکھنا کہ اس نے اترتے ہی وار کرنے میں پہل کر دی تو کیا ہوگا۔" سلطان شاہ نے میری بے پروائی سے چڑ کر خشک لہجے میں کہا۔ "جس طرح تم اس کے خون کے پیاسے ہو رہے ہو۔ اسی طرح وہ بھی تم پر ہاتھ ڈالنے کے چکر میں ہوگا۔ مجھ کو تم جو ہدایت دے دو گے، اس پر لفظ بہ لفظ عمل کروں گا۔"

میرے منصوبے پر عمل درآمد کی راہ میں گھاس سے لدا ہوا ٹرک رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ پجیرو والا اس سے آگے نکلنے پر آمادہ نہیں تھا۔ حالانکہ چند منٹ کے تسلسل کے بعد کراچی سے باہر جانے والے ٹریفک کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اس لیے میں نے سڑک کے بائیں طرف ریتلا حصّہ ختم ہوتے ہی کار سڑک سے نیچے اتار کر گھاس والے ٹرک کو آگے نکلنے کا اشارہ دے دیا۔

ٹرک کے ساتھ ہی پجیرو نے بھی ہماری گاڑی کو اوورٹیک کیا۔ مگر میں آناً فاناً میں داہنی سمت سے پجیرو کے برابر میں پہنچ گیا اور سائیڈ دباتے ہوئے اسے سڑک سے نیچے اترنے پر مجبور کر دیا۔ دو تین گاڑیاں ہارن بجاتی ہوئی ہمارے برابر میں سے گزریں۔ ایک ٹرک کے کلینر نے کھڑکی سے سر نکال کر کوئی آوازہ بھی کسا لیکن اس وقت میری پوری توجہ عقب نما آئینوں پر مرکوز تھی۔ تاکہ ڈی ڈی کو فاصلہ بڑھ جانے کی وجہ سے پجیرو دوبارہ سڑک پر چڑھا کر آگے نکال لے جانے کا موقع نہ مل سکے تصادم کے خوف سے ایک دم پورے بریک لگانا میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا البتہ جب دونوں گاڑیوں کی رفتار کافی سست ہوگئی تو میں نے اپنی کار روک دی۔

سلطان شاہ فوراً ہی نیچے اتر کر پیچھے کی طرف رینگ گیا۔ میں جیب میں پستول لیے نیچے اترا تو پجیرو والا بھی باہر آچکا تھا۔ وہ تنومند جسم اور خطرناک چہرے کا مالک تھا۔ سب سے بڑی

بات یہ تھی کہ اس کا رنگ گندمی تھا جب کہ میرے مشاہدے کے مطابق ڈی ڈی کا رنگ سرخ وسفید ہونا چاہیے تھا۔

"کیا بات ہے؟" وہ میری طرف بڑھتے ہوئے سرد لہجے میں غرّایا تو کھلے ہوئے دہانے میں چمکتی ہوئی سفید دانتوں کی قطاروں سے درندگی جھلک رہی تھی۔ "میرا راستہ کیوں روکا ہے؟"

"اوورٹیک کرنے کا غلط اشارہ دے کر مروانے کی پوری کوشش کی اور اب مجھی سے سوال کر رہا ہے؟" میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ اپنے حلیے سے وہ کوئی پیشہ ور بدمعاش یا لڑاکا نظر آ رہا تھا جو کسی طرح بھی اس پجیرو کا مالک نہیں ہو سکتا تھا۔ بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ اس وقت تک میرے پاس ڈی ڈی کی شناخت کے لیے سیاہ پجیرو اور گوری رنگت کے علاوہ کوئی نشانی نہیں تھی۔ کالی پجیرو موجود تھی لیکن گوری چمڑی غائب تھی۔

وہ طاقت ور نظر آ رہا تھا لیکن اس میں عقل کی واضح طور پر قلت تھی کیونکہ اس نے گفتگو کے ذریعے اصل صورتِ حال کو سمجھنے کی کوئی کوشش کرنے کے بجائے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں اسے جھکائی دے کر دوسری طرف نکل گیا۔ اسی وقت پجیرو کے ہیڈ لیمپس گُل کر دیے گئے۔ اپنے عقب میں ڈی ڈی کے نکل آنے کا خدشہ محسوس کرتے ہی میں بجلی کی سی سرعت سے پلٹا اور پارکنگ لائٹس کی روشنی میں سلطان شاہ کا چہرہ دیکھ کر میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

"پجیرو میں اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے اور یہ وہ نہیں ہے۔" سلطان شاہ نے مبہم الفاظ میں مجھے رپورٹ دی۔

مجھے پیچھے پلٹتے دیکھ کر اس ترش رو بدمعاش نے میری بے خبری میں مجھ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن سلطان شاہ کو دیکھ کر درمیان ہی میں رُک گیا۔ میں دوبارہ اس کی طرف پلٹا تو میرے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا۔

"پجیرو والا کہاں گیا؟" میں نے سرد اور سخت لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"تت... تمہارے سامنے ہے۔" ابتدائی ہکلاہٹ کے بعد اس نے اسٹارٹ لے لیا۔ "آخر تم کون ہو؟ اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

اسی وقت پیچھے سے ایک ٹرک آیا اور تیز ہارن بجاتا ہوا ہمارے قریب سے گزر گیا۔ ان دنوں دھند لکے کے بعد شاہراہوں پر بڑے ڈاکوں کا رواج پڑ چکا تھا۔ اس لیے ان غیر محفوظ راستوں پر سفر کرنے والے دوسروں کے پھڈے میں اپنی ٹانگ اڑانے سے گریز کرنے لگے تھے ورنہ اس وقت ہمارے لیے دشواریاں کھڑی ہو سکتی تھیں۔

"وقت برباد نہ کرو۔ اسے گاڑی میں ڈالو اور آگے چل دو پوچھ گچھ راستے میں بھی ہوتی رہے گی۔" سلطان شاہ نے میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا اور اسی لمحے اس کی بے چینی کا سبب بھی میری سمجھ میں آ گیا کیونکہ سامنے سے کئی ٹرکوں کی ایک قطار تیزی سے ہماری طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

وہ ہماری کسی ہدایت کی رضاکارانہ تعمیل پر آمادہ نہیں تھا۔ جب کہ ہم اس شاہراہ پر زیادہ دیر تک رکے رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ اس لیے سلطان شاہ نے پھرتی سے اس کی جیبوں کی تلاشی لے کر ایک خودکار پستول برآمد کیا اور اس کی گردن پر پے در پے کئی زوردار ہاتھ رسید کر کے اسے بی ایم ڈبلیو کی عقبی نشست میں ٹھونس دیا۔ وہ خود بھی اسی کے برابر میں بیٹھنے جا رہا تھا۔ مگر میں نے اسے روک دیا۔

سامنے سے آنے والا ٹرکوں کا قافلہ قریب پہنچنے سے پہلے میں نئے قیدی کے ساتھ اپنی نشست سنبھال چکا تھا اور سلطان شاہ نے کار آگے بڑھا دی تھی۔ سیاہ پجیرو وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔

"تم لوگ ایک بہت بڑا جرم کر رہے ہو۔ کسی شریف شہری کو بھری پُری شاہراہ سے اسلحے کے زور پر اغوا کر کے لے جانا سنگین جرم ہے جس کی ضمانت بھی مشکل سے ہوتی ہے۔" گاڑی حرکت میں آتے ہی قیدی کی زبان بھی چل پڑی تھی۔

"کیسا عجیب لطیفہ ہے کہ جو بھی قانون شکن پکڑا جاتا ہے، چھوٹتے ہی قانون کی دہائی دیتا ہے جیسے قانون نہ ہوا اُمراؤ جان کا عشوہ وغمزہ ہو گیا جو پیسہ دے وہی حاصل کر لے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا اور اپنے پستول کی نوک اس کی پسلیوں میں اُڑا دی تاکہ اس کے ذہن سے چال بازی کا خیال سرے نکال سکوں۔

"تو کیا تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟" اس نے نسبتاً پُرسکون لہجے میں سوال کیا۔ جیسے پولیس کے ہاتھوں میں خود کو ہر سزا سے محفوظ و مامون تصور کرتا ہو۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم کوئی ٹٹ پونجیے ہیں؟" میں نے اس کے اطمینان کا سبب دریافت کرنے کے لیے کہہ ڈالا۔

"پھر تم سمجھ لو کہ تمہاری ساری محنت رائیگاں جائے گی تم نے ایک غلط آدمی پر ہاتھ ڈالا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں تمہاری معطلی کے پروانے جاری ہو جائیں۔ خیریت چاہتے ہو تو گاڑی واپس گھما کر مجھے پجیرو کے پاس اتار دو، میں بھول جاؤں گا کہ میرے ساتھ یہ واقعہ پیش بھی آیا تھا۔" اس کے لہجے میں احساسِ برتری امڈ آیا تھا۔

"تھوڑی دیر پہلے شرافت کے دعوے دار بن رہے تھے۔ اب غلط آدمی ثابت ہو رہے ہو۔ تم کُھل کر کیوں نہیں بتلاتے کہ کون ہو؟"

"ماجے کا نام سنا ہو گا تم نے، میں اسی کا آدمی ہوں۔ وہ اپنے آدمیوں کے قریب پولیس والوں کا سایہ تک برداشت نہیں کرتا۔ جس افسر کو کوئی کام ہو، وہ براہِ راست ماجے سے بات کرتا ہے۔"

ماجے کا نام سنتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ ہیروئن کی مقامی تجارت میں معراج دین ایک تیزی سے اُبھرتا ہوا نام تھا۔ جو عرفِ عام میں ماجا کہلاتا تھا۔ شاید پاکستان سے میری غیر حاضری کے دوران اس نے اتنی طاقت پکڑ لی تھی کہ اس کے آدمی سرِ عام اس کی برتری کے گُن گانے لگے تھے۔

"سایہ کیا، اب تو اسے سالم افسر برداشت کرنے ہوں گے۔ آج رات تمہارے ساتھ اسے بھی نہ رگڑا تو سمجھو کہ ہم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ وہ بھی رسیّوں سے باندھ کر تمہارے سامنے لایا جائے گا۔"

میرے پُراعتماد لہجے نے چند ثانیوں کے لیے اسے فکرمند کر دیا۔ اس کے لیے شاید یہ پہلا موقع تھا کہ کسی پولیس افسر نے اس کے اَن داتا کا نام سن کر اسے کوئی رعایت دینے سے یکسر انکار کر دیا تھا۔ وہ بولا تو پہلے کے مقابلے میں اس کا لہجہ کمزور پڑ چکا تھا۔ "تم مجھے میرا جرم بتاؤ، آخر مجھے کیوں پکڑا گیا ہے؟"

"ویسے تو تمہارا یہی ایک جرم کافی ہے کہ تم نے سیاہ پجیرو میں سوار ہو کر ایک ایسے مجرم کو فرار ہونے کا موقع فراہم کیا جس کے ہاتھ متعدد انسانوں کے خون سے آلودہ ہیں اور دوسرا جرم یہ کہ تم نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اپنے جسموں پر ہتھیار سجا کر شاہ باغ میں کچھ لوگوں کے خون کی ہولی کھیلنے کی پوری تیاریاں کی ہوئی تھیں لیکن تمہاری سازش ناکام ہو گئی۔ اب تم نے زبان نہیں کھولی تو ہم یہیں کہیں تمہیں ذبح کر کے راستے میں پھینک دیں گے۔"

"تم پولیس والے معلوم نہیں ہوتے۔" میرے بدلے ہوئے لہجے اور نئے انکشافات سے وہ خوف زدہ ہو گیا۔

میں نے اس کے پہلو سے پستول ہٹائے بغیر بائیں ہاتھ سے اس کے چہرے پر بھرپور تھپڑ رسید کیا۔ "ہمارا شجرہ دریافت کرنے کے بجائے اپنی کہانی شروع کرو۔ ورنہ ہم تم پر زیادہ وقت برباد نہیں کریں گے۔"

اس نے مزاحمت کی خاصی کوشش کی لیکن میں نے چلتی ہوئی کار میں ہی اس کی خاصی درگت بنا ڈالی۔ پسلیوں میں اَڑی ہوئی پستول کی آہنی نال کی وجہ سے وہ میرے ہاتھوں پٹنے پر مجبور تھا۔ اس لیے آخر کار اسے زبان کھولنی ہی پڑ گئی۔

وہ ہیروئن کی دنیا کے چھٹے ہوئے بدمعاش معراج دین کا منظورِ نظر تھا اور پچھلے روز اسی کی ہدایت پر اپنے ساتھ سات مسلح آدمی لے کر شاہ باغ پہنچا تھا جہاں اس کی ملاقات ہارون سے ہوئی تھی۔ ہارون پہلے بھی معراج دین کے اڈے پر اس سے مل چکا تھا۔ ہارون نے بتایا کہ وہ خود اور اس کا باس چند روز کے لیے شاہ باغ میں مقیم تھا۔ اس دوران میں انھیں نامعلوم دشمنوں کی طرف سے حملے کا خطرہ تھا جس کے سدِّباب کے لیے ان لوگوں کو شاہ باغ بلایا گیا تھا۔

آدمیوں کو کام بانٹے جانے کے بعد ہارون اسے ساتھ لے کر شہر گیا تھا۔ اس نے دور ہی سے اسے ایس جے گارمنٹ فیکٹری دکھائی اور یہ ہدایت دے کر لوٹ آیا کہ وہاں سے مرسڈیز میں نکلنے والے فیکٹری کے مالک کو اغوا کر کے شاہ باغ پہنچانا تھا۔ شہزادہ نامی اس شخص نے کلوروفارم کی مدد سے جہانگیر کو آسانی کے ساتھ بے بس کر کے اس کی گاڑی سمیت اغوا کیا اور اسے شاہ باغ میں ہارون کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد کی کہانی وہی تھی جو ہم نے خود تشکیل دی تھی۔ جہانگیر پر تشدد یا کسی اور کام کے لیے شہزادے یا اس کے کسی ساتھی کو کاٹیج میں نہیں بلایا گیا تھا البتہ پہلے سے وہاں موجود پجیرو کی بنا پر ان لوگوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ شاہ باغ میں ہارون کے علاوہ بھی کچھ لوگ موجود تھے جہانگیر کی واپسی کاٹیج کے ایک باقاعدہ ملازم کے ساتھ ہوئی تھی۔

کاٹیج میں آگ لگنے کی وجہ سے شہزادے کے دو آدمی شعلوں میں گھِر کر جل گئے تھے، ایک ہڑبونگ میں زخمی ہو کر چل بسا اور ایک لاپتا تھا۔ اس لیے بعد میں جب سیاہ نقاب پہنے ہوئے ایک شخص پجیرو میں واپس آیا تو شہزادے کے ساتھ کل تین آدمی رہ گئے تھے۔ ہارون کا کہیں پتا نہیں تھا۔ کاٹیج میں آگ اتنی پھیل چکی تھی کہ اندر کا جائزہ لینے کا تصور ہی خارج از امکان تھا۔ اس لیے نقاب پوش نے خود پک اپ سنبھال لی۔ تینوں آدمیوں کو باقی ماندہ اسلحے سمیت وہ پک اپ کے عقبی حصے میں نکال لے گیا تھا۔ اپنی پجیرو شہزادے کے حوالے کر کے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ پجیرو چابی سمیت شہر میں کہیں بھی چھوڑ کر خاموشی سے اپنے اڈّے کی طرف نکل جائے۔ اسے قطعی علم نہیں تھا کہ نقاب پوش شاہ باغ سے فرار ہو کر شہر میں کہاں گیا ہو گا۔

میرے لیے یہ ایک گہری چوٹ تھی۔ ہم دونوں کے مقابلے میں ڈی ڈی اکیلا رہ گیا تھا اور ہماری بھرپور بالادستی نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا لیکن آخری لمحات تک اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ آخری لمحات میں شاہ باغ سے فرار ہوتے ہوئے اس نے ہماری کسی آخری کوشش کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا جب کہ میرے ذہن میں یہ خیال نیشنل ہائی وے کے قریب پہنچ جانے کے بعد پیدا ہوا تھا۔

میرے لیے یہ حقیقت سوہانِ روح تھی کہ ڈی ڈی ہماری نظروں کے سامنے پک اپ ڈرائیو کرتا ہوا اطمینان سے فرار ہو چکا تھا اور ہم اس کی پجیرو میں موجود ڈمی کے پیچھے اپنا وقت برباد کرتے رہ گئے تھے۔

پھر بھی بھاگتے بھوت کی لنگوٹی کے مصداق شہزادے کا

ہمارے ہاتھ لگنا سود مند رہا تھا۔ وہ بھی نکل گیا ہوتا تو ہم اندھیرے میں قیاس آرائیاں کرتے رہ جاتے۔ اس کی زبان سے کم از کم اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ ان دنوں ڈی ڈی شہر میں ہیروئن کی تقسیم کے لیے کس شخص سے کام لے رہا تھا۔ ہیروئن کے دھندے میں آسانی سے لاکھوں کمانے والا ماجا اپنے آٹھ آدمی اسی شخص کی تحویل میں دے سکتا تھا جس سے اسے اپنے کاروبار میں کوئی بڑا سہارا مل رہا ہو۔

شہزادہ اپنی کہانی سنانے کے بعد ہمارے لیے بوجھ بن گیا تھا۔ اس نے نہ صرف ہمیں اچھی طرح پہچان لیا تھا بلکہ وہ میری کار اور اس کے نمبروں سے بھی آگاہ ہو چکا تھا۔ اس لیے اُسے زندہ چھوڑنا اپنے لیے ایک عذاب پیدا کرنے کے مترادف ہوتا۔ اس کا بہترین علاج یہی تھا کہ طاقت کے گھمنڈ میں مبتلا اس خونی بدمعاش کو گولی مار کر کسی ویرانے میں پھینک دیا جاتا۔

گاڑی ڈرگ روڈ ریلوے اسٹیشن کے قریب سے داہنی طرف گھومی تو شہزادے نے بے چینی سے اپنی جگہ پر پہلو بدلا اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

”بکواس مت کرو۔“ میں نے اس کے مُنہ پر پھر ایک ہاتھ جڑ دیا۔ ”آگے کہیں اتار دیں گے لیکن یہ یاد رکھنا کہ ہمارے بارے میں اپنے کسی ماجے یا کاکے کو کچھ بتایا تو تمھیں ذبح کر کے لاش کسی گٹر میں ڈال دیں گے۔“

”میں کوشش کروں گا۔“ وہ گلا صاف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بمشکل بولا۔ ”لیکن ماجا یہ ضرور جاننا چاہے گا کہ میں بجیرو شہر میں لانے کے بجائے نیشنل ہائی وے پر کیوں چھوڑ آیا؟“

”اسے مطمئن کرنا تمھارا کام ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا اور پھر سلطان شاہ سے مخاطب ہو گیا۔ ”فوجی افسروں کے بنگلے ختم ہونے کے بعد کار بائیں طرف میدان میں اتار لینا۔ اسے یہیں چھوڑ دیں گے۔“

”میدان میں نہیں، مجھے یہیں سڑک کے کنارے اتار دو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ میری وجہ سے تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔“ شہزادے کی آواز میں خوف کی کپکپی پیدا ہو گئی تھی۔ شاید اس کی چھٹی حس نے آخرکار نوشتۂ دیوار پڑھ ہی لیا تھا۔

میں نے کوئی جواب دیے بغیر پستول اس کی پسلیوں سے ہٹایا، اندھیرے میں اپنی گرفت دستے سے اس کی سرد آہنی نال پر منتقل کی اور اس سے قبل کہ شہزادہ کچھ سمجھ پاتا میں نے پستول کا دستہ پوری قوت سے اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا شاید اس نے چیخنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے حلق سے ایک بے معنی سی ہچکی برآمد ہو کر رہ گئی اور وہ ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کر نشست کی پشت گاہ پر ڈھیر ہو گیا۔ سلطان شاہ نے بنگلے ختم ہونے پر کار میدان میں موڑ لی تھی۔

فلیٹ میں پہنچتے ہی سلطان شاہ غسل خانے میں گھس گیا اور میں بے سُدھ ہو کر بستر پر گر گیا۔

شہزادے کو آنجہانی بنا کر اسٹیڈیم روڈ سے واپس لوٹتے ہوئے جب ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری سے ذرا آگے ایک موبائل پولیس وین نے ہمیں روکا تو ان کی اس شاندار کارکردگی پر میرے دل کی گہرائیوں سے ان کے لیے دعائے خیر آزاد ہو گئی۔ جب تک ہماری کار میں ایک واجب القتل قیدی موجود تھا تو سرے سے پولیس سے سامنا ہی نہیں ہوا تھا لیکن وہ ثبوت ضائع ہوتے ہی ہمیں رکنے کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ شہزادے کو ٹھکانے لگانے کے بعد ہم نے سارا اسلحہ کار کے کیبن سے ڈکی میں منتقل کر دیا تھا۔ اس لیے ہم سے اندر روشنی کرنے کے لیے کہا گیا تو بلا حیل وحجت اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ کار بیش قیمت تھی اور میری تیاری اس سے میل کھاتی تھی۔ سلطان شاہ فیکٹری والے لباس میں تھا اور ڈرائیونگ سیٹ کے لیے موزوں نظر آ رہا تھا اس لیے سرسری جائزے کے بعد مزید تلاشی یا کاغذات کی دیکھ بھال کی ضرورت محسوس کیے بغیر ہمیں روانگی کی اجازت مل گئی تھی۔

میرا اندازہ تھا کہ اس وقت تک شہر کی پولیس نے کہیں پارک کی ہوئی جہانگیر کی مرسڈیز کا سراغ لگا کر اسے اُلجھا لیا ہو گا یا وہ خود ہوش میں آ کر اپنے گھر پہنچ چکا ہو گا۔ اس رات کے لیے وہی کافی تھا کہ مَیں بروقت جہانگیر کی مدد کے لیے پہنچ گیا تھا اور اگر ڈی ڈی ازخود اس کی رہائی کا فیصلہ نہ کرتا تو میں یقیناً اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے قابل تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ میرے نقطۂ نگاہ سے بہت اہم تھا لیکن اسے محض ضمنی کامیابی قرار دیا جا سکتا تھا۔

میں نے اٹھ کر جہانگیر کے گھر کا نمبر ملایا تو مسلسل دو گھنٹیاں بجنے پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ جہانگیر گھر پہنچا ہوتا یا نہ پہنچا ہوتا، کسی نہ کسی کو فون کا فوری جواب دینا چاہیے تھا۔ تیسری گھنٹی پر ریسیور اٹھایا گیا تو دوسری طرف سے ایک غنودہ مردانہ آواز سنائی دی تھی۔

”یہ جہانگیر صاحب کے گھر کا نمبر ہے؟“ میں نے تجسّس اور بے چینی کے عالم میں سوال کیا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید کسی فنی خرابی کی وجہ سے غلط نمبر ملایا تھا۔

”جی صاب! کون صاب بول رہے ہیں؟ اس وقت گھر پر کوئی نہیں ہے۔“ دوسری طرف سے بے ربط سے جملے کہے گئے تھے۔

”میں تمھارے صاحب کا دوست پیٹر بول رہا ہوں۔ صاحب کا کچھ پتا چلا یا نہیں؟ سلمیٰ بی بی کہاں ہیں؟“

”میں فضلو مالی بول رہا ہوں صاب۔“ ضعیف مردانہ آواز سے نیند کا خمار فوراً ہی کافور ہو گیا۔ ”صاب کا کچھ پتا نہیں، سلمیٰ بی بی، ریٹا بی بی اور ڈرائیور کے ساتھ تھوڑی دیر پہلے فیکٹری گئی ہیں۔“

”فیکٹری؟“ میں حیرت سے بولا۔ ”وہ اس وقت وہاں کیوں گئی ہے؟“

”پتا نہیں صاب، میں تو ملازم آدمی ہوں...“ وہ میرے لہجے پر ایک دم سہم گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس بارے میں کوئی کام کی بات نہیں بتا سکے گا۔ اس لیے میں نے اس کی پوری بات سنے بغیر ہی کریڈل دبا کر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

اتنی رات گئے سلمیٰ کی فیکٹری روانگی کی خبر سنتے ہی میرے ذہن میں ہولناک اندیشوں نے سر اُبھارا تھا۔ ہم نے واپسی پر راستے میں اور شہزادے کے ساتھ کافی وقت برباد کیا تھا جب کہ ڈی ڈی تیز رفتاری سے براہِ راست شہر پہنچا تھا۔ اس لیے اس کے پاس کوئی نیا کھیل شروع کرنے کے لیے کافی وقت تھا۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ شاہ باغ میں پیش آنے والے واقعات کو جہانگیر کے اغوا کی واردات سے الگ رکھوں لیکن ڈی ڈی جیسے عیّار آدمی کے لیے کڑیاں ملا لینا ناممکن نہیں تھا۔ سلمیٰ کو کسی مضبوط بہانے کے ذریعے گھر سے باہر نکال کر اغوا کیا جانا ناممکنات میں سے نہیں تھا لیکن اس نظریے پر وقت برباد کرنے سے پہلے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ جہانگیر کی فیکٹری فون کر کے اصل صورتِ حال دریافت کی جائے۔

ایس جے گارمنٹ کا نمبر ملاتے ہی پہلی گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا گیا اور میں نے ریٹا کی آواز پہچان لی۔

”خدا کا شکر ہے کہ تم وہاں موجود ہو۔“ میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ”میں پیٹر واک بول رہا ہوں۔ تم دونوں وہاں کیا کر رہی ہو؟ سلمیٰ کا کیا حال ہے؟“

”جہانگیر بہت زخمی ہے۔ کسی نے فون پر فیکٹری کے چوکیدار کو بتایا تھا کہ اس کے صاحب کی گاڑی قریب ہی موجود ہے۔ چوکیدار نے اسے مذاق سمجھا پھر وہ باہر گیا تو اسے برابر والی فیکٹری کے ساتھ مرسڈیز نظر آ گئی۔ جہانگیر پچھلی سیٹ پر بے ہوش پڑا تھا۔ رستم خان اکیلا گاڑی کو دھکیل کر فیکٹری میں لایا پھر اس نے ہمیں فون کر دیا۔“ ریٹا ایک ہی سانس میں بتاتی چلی گئی۔ ”ابھی جہانگیر ہوش میں ہے۔ میں نے ان کے فیملی ڈاکٹر کو فون کر دیا ہے، وہ آتا ہی ہو گا۔“

”گڈ! ذرا سلمیٰ سے میری بات کرا دو۔“ میں نے اپنے وجود میں اطمینان کی لہر محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تم لوگوں کی طرف سے بہت زیادہ فکرمند ہو گیا تھا۔“

”ہولڈ کرو، میں اسے بلاتی ہوں۔“ ریٹا کی آواز سنائی دی پھر سکوت چھا گیا۔

چند ثانیوں بعد ہی لائن پر سلمیٰ کی رُندھی ہوئی غصیلی آواز ابھری تھی۔ ”تم بہت سنگ دل اور مطلبی آدمی ہو۔ جہانگیر زخموں سے چور تھا اور تم پتا نہیں کہاں اپنا مُنہ چھپائے پھر رہے ہو...“ شدتِ جذبات سے اسے اپنے اوپر قابو نہیں رہا تھا۔

”میں اسی کی تلاش میں تھا سلمیٰ!“ میں نے اس کی بات کاٹ کر تحمّل سے کہا۔ ”میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کے چنگل سے رہائی پاتے دیکھا تھا...“

”وہ خود تم سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔“ سلمیٰ کی آواز میں صدمے اور خوشی کا ملا جلا تاثر پیدا ہو گیا۔ ”میں فون ان کے پاس لے جا رہی ہوں۔ کاش تم دیکھتے کہ اس وقت ان کی کیا حالت ہے!“

”اس کی باتوں پر نہ جانا۔“ قدرے توقف کے بعد ریسیور پر جہانگیر کی کرب میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ ”میں ٹھیک ہوں، دو تین روز کی مرہم پٹی سے اور ٹھیک ہو جاؤں گا لیکن تم پر بُرا وقت آنے والا ہے...“

”تم زیادہ نہ بولو، کمزوری بڑھ جائے گی۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں خود ابھی اس کاٹیج سے آ رہا ہوں، جہاں تم قید تھے۔ میں نے وہاں بہت کچھ سنا اور دیکھا ہے میں تمھاری ہمت اور حوصلے کی داد نہیں دے سکتا۔ تم نے اپنی زبان بند رکھ کر مجھ پر زندگی کا سب سے بڑا احسان کیا ہے جس کا میں مر کر بھی بدلہ نہیں چکا سکتا۔“

”تم وہاں موجود تھے؟“ اس کی تحیّر آمیز سرگوشیانہ آواز ابھری۔

”وہ ازخود تمھیں رہا کرنے کا فیصلہ نہ کرتا تو میں حرکت میں آ جاتا۔ تمھارے چلے آنے کے بعد اب وہاں تباہی کا راج ہے، کئی آدمی مرے ہیں۔ وہ قسمت کا دھنی تھا کہ میری آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گیا۔ ورنہ آج میں نے اسے بھی دھر لیا ہوتا۔“

”وہ کون سی جگہ تھی؟“ اس کی آواز پر شدید نقاہت طاری تھی۔ مگر اس کے ذہن میں تجسّس پھر بھی زندہ تھا۔

”شاہ باغ جو ہمارے زمانے میں راجا فروٹ فارمز ہوا کرتا تھا۔ تم بولنے کے بجائے اب میری بات سنتے رہو۔ میں سیما کا عاشق بن کر اس کے پیچھے لگ گیا ہوں اور وہ مجھ سے خوف زدہ ہے۔ اسے مجھ پر ڈینی ہونے کا شبہ تھا۔ اسی لیے تمھارے اغوا کی نوبت آئی۔ اب ہم ایک دوسرے سے دور رہیں گے، میں فون پر تم سے رابطہ قائم کر لیا کروں گا۔ میری طرف سے سلمیٰ کو سمجھا دینا۔ وہ جذبات کی رَو میں آ کر بہت جلد بدظن ہو جاتی ہے۔ ڈی ڈی کو تمھارے ساتھ تشدّد کی بھاری جانی اور مالی قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چند روز میں وہ غزالہ کی رفاقت سے بھی ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے۔“

”تمھارے پاس بڑی خبریں ہیں لیکن میری حالت غیر ہو رہی ہے۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”فون کرتے رہنا، میں سلمیٰ کو سمجھا دوں گا۔“

”اپنا خیال رکھنا جہانگیر! مجھے افسوس ہے کہ میں اسی شہر میں ہوتے ہوئے بھی تم سے دور رہنے پر مجبور ہوں۔“ میں نے دکھی

لہجے میں کہا لیکن اس اثنا میں وہ ریسیور سلمیٰ کو دے چکا تھا۔

"کاش! میں کسی دن تم دونوں کی مجبوریاں سمجھ سکوں۔" سلمیٰ نے میرے خاموش ہونے پر ایک گہرا سانس لے کر کہا تھا۔ "پتا نہیں تم دونوں شہر میں کیا کرتے پھر رہے ہو۔ کاروبار میں تو ایسی خونریز دشمنیاں کبھی میرے دیکھنے اور سننے میں نہیں آئیں..."

"کاروباری رقابتیں اس سے زیادہ بھیانک ہوتی ہیں سلمیٰ! اس بارے میں سوچ کر اپنے ذہن کو زیادہ نہ تھکاؤ اور پوری یکسوئی سے جہانگیر کی دیکھ بھال کرو۔ اسے تمھاری توجہ کی ضرورت ہے۔"

مزید چند فقروں کے تبادلے کے بعد میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے اسے یہ سمجھا دیا تھا کہ جہانگیر کی ذہنی حالت اس وقت اعتدال پر نہیں تھی۔ اس لیے سلمیٰ کو اس امر کی پوری احتیاط کرنی تھی کہ گھر سے باہر کے کسی فرد کو اس واقعے کی بھنک نہ مل سکے۔ فیکٹری کے عملے میں وہ صرف ریشم خان پر اعتماد کر سکتی تھی جو اپنی گردن کٹوا کر بھی اپنے مالک کا حقِ نمک ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

میں نے ریسیور کریڈل پر ڈال کر سر اٹھایا تو سلطان شاہ بدن پر بڑا تولیا لپیٹے میرے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ چھوٹے تولیے سے سر اور بدن خشک کرتے ہوئے وہ معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"جہانگیر اپنی فیکٹری میں پہنچ گیا ہے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔ "اس کی بیوی بھی وہیں پہنچی ہوئی ہے۔"

"جلد یا بدیر اسے تو پہنچنا ہی تھا۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔ "ڈی ڈی شکست کا داغ سینے پر لے کر واپس لوٹا ہے، تمھیں اپنے گھر کی بھی خبر لینی چاہیے۔"

میں الجھی الجھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا آخری فقرہ میرے پلے نہیں پڑا تھا۔

"دلدار آغا کے گھر فون کرو۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "اس کی چھت کے نیچے بھی کوئی تمھاری توجہ اور ہمدردی کا مستحق ہے۔"

مجھے اس کی بات میں کوئی وزن محسوس نہیں ہوا۔ اوّل تو مجھے یقین نہیں تھا کہ ڈی ڈی شاہ باغ میں منہ کی کھانے کے بعد اپنے گھر کا رخ کرنے کی جرأت کر سکے گا اور اگر وہ ادھر چلا ہی جاتا تو مجھے غزالہ پر پورا اعتماد تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں وہ صورتِ حال کو سنبھال کر کسی بھی خطرے سے اپنا بچاؤ کر سکتی تھی لیکن پھر بھی میں نے ریسیور اٹھا کر دلدار آغا کا نمبر ملانا شروع کر دیا۔

دوسری طرف سے فوراً ہی اس خونخوار بھیڑیے کی مانوس آواز سن کر میں چونک پڑا تھا۔ اس رات وہ بار بار میرے اندازوں کو مات دینے پر تلا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"لنگڑے گھوڑے! تم نے دیکھ لیا کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔" میں نے آواز بدل کر سیما کے منروخنہ عاشق کا مخصوص لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "شاہ باغ سے تم نکل بھاگے لیکن بہت جلد میرا ہاتھ تمھارے نرخرے پر ہوگا۔"

"تم میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔" اس کے سرد اور سپاٹ لہجے پر ہذیانی انداز غالب آگیا۔ "شاہ باغ میں جو کچھ ہوا ہے، اس کا انجام میں کل دکھاؤں گا۔ اس خونریزی کے بدلے میں پورے شہر کو خون میں نہلا دوں گا۔ تم تماشا دیکھو گے اور کچھ نہ کر پاؤ گے..."

اس کی دھمکی نے مجھے اندر سے دہلا دیا لیکن میں نے بظاہر بے پروائی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "شہر سے مجھے کیا لینا! میں قاضی شہر تو نہیں ہوں۔ اب یہی دیکھ لو کہ میرے سامنے بے بس ہو کر تم نے پورے شہر سے انتقام لینے کی بکواس شروع کر دی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ناکامی کے صدمے اور جان کے خوف نے تمھارا دماغ الٹ کر رکھ دیا ہے..."

ریسیور پر اس کا زہر میں ڈوبا ہوا ایک ہلکا سا قہقہہ ابھرا۔ "دماغ میرا نہیں تمھارا الٹ جائے گا۔ شہر کے ساتھ ساتھ تمھیں بھی معاف نہیں کروں گا۔ تمھاری دکھتی ہوئی رگ میرے قبضے میں ہے۔ کان کھول کر سن لو کہ میں نے تمھیں آج اچھی طرح پہچان لیا ہے۔"

اپنا فقرہ مکمل کرتے ہی اس نے شاید ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ میں کئی بار ہیلو ہیلو کرتا رہا لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر مایوس ہو کر میں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔

اس کے آخری دو فقروں نے میرا دورانِ خون تیز کر دیا تھا اور ذہن پر اتھاہ سناٹا طاری ہوتا چلا گیا تھا۔ میں نے اس کے دونوں فقروں پر غور کرنا چاہا لیکن ذہن نے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

میں ڈینی تھا اور میری محبت، غزالہ ڈی ڈی کے قبضے میں تھی۔ یہ ایک حقیقت تھی اور ڈی ڈی شاید یہی بات مجھے جتانا چاہ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اُن الفاظ کا کوئی مفہوم میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔

ہم دونوں بہت تیزی کے ساتھ دوبارہ روانگی کے لیے تیار ہوئے تھے کیوں کہ دلدار آغا کے الفاظ سے بس یہی ایک مفہوم سمجھ میں آتا تھا کہ اُس نے مجھے ڈینی کی حیثیت سے پہچان لیا تھا اور میرے ہاتھوں اپنی مسلسل شکست کا بدلہ وہ غزالہ سے لینے پر تل گیا تھا جسے اس نے اپنی شرافت کا فریب دے کر اپنی بیوی بنا لیا تھا۔ دوسری طرف میری غزالہ سے مفاہمت ہو چکی تھی اس لیے دلدار آغا کی کسی بھی زیادتی کی صورت میں وہ پوری قوت مزاحمت کرتی۔ دلدار آغا مجرمانہ مزاج رکھنے والے لوگوں کے ایک ایسے سفاک گروہ کا سرغنہ تھا جو اپنے ہتھیاروں کے بے محابا استعمال سے انسانی لہو کی ہولی کھیلنے کے کسی بھی موقع پر ذرا بھی تردد سے کام نہیں لیتا تھا۔ ان کے مقابلے میں غزالہ تنہا تھی، اس لیے اُس کی ذات کو کسی بھی لمحے ناقابلِ تصور خطرات پیش آسکتے تھے۔ اس کی مدد کے لیے مجھے ہر قیمت پر اس کے پاس پہنچنا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ دلدار آغا کو مغالطہ ہوا ہو۔ اس نے تمھیں ڈینی کے بجائے کسی اور حیثیت سے پہچانا ہو؟" راستے میں سلطان شاہ نے پُرخیال لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ہو سکتا ہے۔" میں نے بحث میں پڑنے کے بجائے مختصراً کہا۔ "لیکن اب میں غزالہ کے بارے میں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"آج کے واقعے نے اس کا دماغ الٹ دیا ہے۔" سلطان شاہ مجھے باتوں میں الجھائے رکھنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ "پتا نہیں، وہ پورے شہر سے کس طرح انتقام لینا چاہ رہا ہے؟"

"تخریبی ذہن رکھنے والے، اس جیسے سنگدل آدمی کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں، شہر کو پانی فراہم کرنے والے کسی بھی ذخیرۂ آب میں آسانی سے زہر ملایا جا سکتا ہے۔ ان کھلے ہوئے تالابوں پر عام حالات میں کڑی نگرانی نہیں رکھی جاتی۔" میں نے کہا۔ "اس کے چند آدمی نقابیں لگا کر شہر کے حساس علاقوں سے گولیاں برساتے ہوئے گزر سکتے ہیں، یا پھر شہر کے کسی حصے میں کسی مخصوص علاقے میں چند بے گناہ لوگوں کی لاشیں ڈال کر فسادات کی آگ بھڑکائی جا سکتی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ایک قدم پورے شہر کی پُرسکون فضا میں تشدد، خوف و ہراس، تشویش اور افراتفری پھیلانے کے لیے کافی ہوگا۔"

"ہمیں اب فوری طور پر ڈی ڈی کے فتنے کا سدِ باب کرنا ہوگا۔" سلطان شاہ فکر مند نظر آنے لگا۔ "تمھیں شاید صحیح اندازہ نہیں لیکن میں شہر کے ایک حساس علاقے میں رہتا ہوں اور ڈی ڈی کی فیکٹری میں بھی میرے ساتھ مختلف زبانیں بولنے والے لوگ کام کرتے ہیں۔ ان کے دلوں کی گہرائیوں میں ہر وقت روزگار اور زندگی کا خوف لہریں لیتا رہتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی خوش یا مطمئن نہیں ہے۔ ہر شخص دوسرے کے خوف میں مبتلا ہے۔ شہر میں واقعات اور افواہوں کا ایک ایسا منظم سلسلہ چل پڑا ہے کہ برسوں سے پڑوس میں رہنے اور بسنے والے ایک دوسرے کی طرف سے بداعتمادی کا شکار ہو گئے ہیں، ہر محلے میں آنے والے اجنبی... ملاقاتیوں پر گہری نظر رکھی جاتی ہے، یہ حالات خود بخود پیدا نہیں ہوئے بلکہ اُن کوششی اور مافیا نے اپنے خاص عزائم اور مفادات کے تحفظ کے لیے پروان چڑھایا ہے..."

"تم تو اس طرح بات کر رہے ہو جیسے ڈی ڈی میری مٹھی میں بند ہو اور میں جب چاہوں اس کی گردن توڑ سکتا ہوں۔" میں نے مغموم لہجے میں کہا۔ "میرا بس چلے تو میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی زندہ نہ رہنے دوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں کسی کی بھی زندگی یا موت پر کوئی اختیار نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ کسی کی اجل آ ہی جاتی ہے تو ہم کٹھ پتلیوں کی طرح بڑھ کر کامیابی کے ساتھ اپنا وار کر گزرتے ہیں اور پھر اس قتل کو اپنا کارنامہ سمجھ لیتے ہیں..."

"او ہو!" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی تحیر آمیز لہجے میں بول پڑا۔ "اس وقت تو تم کسی مولوی کی طرح بات کر رہے ہو، معلوم ہوتا ہے کہ تم نے بھی اپنے نو سو چوہے پورے کر لیے ہیں۔"

"زندگی کی رنگینیوں میں دن رات غرق رہ کر زندگی گزار دو تو ایسی باتیں بھولے سے بھی یاد نہیں آتیں لیکن اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر ہی غور کر لیا جائے تو اندازہ ہونے لگتا ہے کہ ہماری لگام کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ عقل اور حساب کی رُو سے اب تک دلدار آغا کو مر جانا چاہیے تھا لیکن وہ زندہ ہے اور ہارون مارا گیا۔ مجھے جہانگیر کی ہلاکت کا ڈر تھا لیکن ڈی ڈی نے اسے میرے لیے چارا سمجھ کر زندہ چھوڑ دیا۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جس طرح دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے ہیں اسی طرح دوسرے واقعات کے بارے میں ہمارے حساب اور اندازے کیوں درست ثابت نہیں ہوتے؟"

"میں تمھاری بات کو چیلنج نہیں کر رہا تھا۔" میرے موڈ کا اندازہ ہوتے ہی وہ مدافعانہ لہجے میں بولا۔ "ایسی باتیں اونچے لوگ کرتے ہیں۔ جو اپنے نفس کے غلام نہیں ہوتے لیکن تم کو میں نے کبھی اپنے نفس کا مقابلہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا، جو دل چاہتا ہے، کر گزرتے ہو، اس لیے تمھاری زبان سے یہ باتیں عجیب لگ رہی تھیں۔"

"اسی لیے کہا گیا ہے کہ یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے، بلکہ یہ غور کرو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے اُسے لاجواب کر دیا اور وہ منہ بنا کر کھڑکی سے باہر اندھیرے میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

ڈیفنس کے پُرسکون علاقے میں دلدار آغا کا مکان میرا دیکھا بھالا تھا۔ شہر کے خوشحال اور امن پرور باسیوں

کے لیے وہ بستی بڑے ارمانوں اور دعووں کے ساتھ بسائی گئی تھی تاکہ لوگ اپنی چار دیواریوں میں کسی کی مداخلت کے خوف یا خطرے کے بغیر اپنے شب و روز سکھ چین سے گزار سکیں۔ اپنے خول میں مست رہنے کی یہ ریت اس علاقے میں بڑی تیزی کے ساتھ مستحکم ہوتی چلی گئی اور پھر اس کی کوکھ سے اس بیگانگی نے جنم لیا جو جرائم کی پشت پناہ بن جاتی ہے۔ اس علاقے میں رہنے والوں کی بھاری اکثریت شہر کے شرفاء اور معززین کی تھی جنھیں اس بات سے کوئی واسطہ نہیں تھا کہ اُن کی دیوار کے پیچھے کون رہتا تھا اور کیا کرتا تھا۔ سب اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ تھے جو لوگ سحر خیز تھے اور آلودگی سے پاک صبح کی کھلی فضا میں چہل قدمی کے عادی تھے۔ وہ چند روز کی آشنائی کے بعد ایک دوسرے کو چھڑی کے اشارے سے سلام کر لیتے تھے یا رک کر چند بول بول لیتے تھے۔ اس سے آگے اُس بستی میں محلے داری کی روایتی رسوم کبھی نہیں پنپ سکی تھیں جس سے فائدہ اُٹھا کر شہر کے بہت سے جرائم پیشہ مرد اور عورتوں نے پہلے کرائے کے مکانات میں ڈیرے جمائے پھر اُن میں سے بہتوں نے بہتوں کے بغیر سرمایہ جمع کر کے کچھ مکانات بھی خرید لیے تھے۔ کالے من کے یہ لوگ اپنے اُجلے تنوں کے سہارے شہر کے معززین اور شرفاء کے درمیان روپوش تھے جہاں قانون کی اندھی آنکھیں بھی شکار کو لینے آہنی جنگل میں جکڑنے سے پہلے ٹٹولنے لگتیں کئی بار اس کا جائزہ لینے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ لیاقت آباد، محمود آباد، گلبہار، منظور کالونی، اورنگی اور بنارس کے علاقوں سے تو گھر میں سوئے ہوئے کسی بھی شخص کو کسی فردِ جرم کے بغیر محض شاملِ تفتیش کرنے کے لیے اُٹھا کر دو چار روز کے لیے بے فکری سے حوالات میں بند کیا جا سکتا تھا لیکن اہلِ ثروت، معززین اور شرفاء پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں تھا۔ وہ تقریباً سب ہی ٹیکس گزار شہری تھے جن کی دی ہوئی خطیر رقومات سے خزانے کا کاروبار چلتا تھا اس لیے قانون اُن کا پشت پناہ تھا۔ کچھ تو ایسے بارسوخ بھی رہے ہوں گے جن سے قانون پناہ مانگتا ہو گا۔ ان ہی مراعات کی وجہ سے دلدار آغا جیسے مکار اور موذی شخص نے اس بستی میں پناہ لی ہوئی تھی۔ جاذب فارما سیوٹیکل کا مالک ہونے کی وجہ سے کوئی اس پر شک بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اپنے دوسرے روپ میں وہ موت کے سوداگروں کی سرپرستی کر رہا تھا۔

یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ وہ خود کو قانون کے محافظوں کی نگاہوں سے اوجھل رکھنے میں تو کامیاب ہو گیا تھا لیکن میری نظروں سے نہ بچ سکا تھا۔ اس کے گھر کی طرف جانے والی خوابیدہ سڑکوں پر کار ڈرائیو کرتے ہوئے جب مجھے دُور سے گولیاں چلنے کی چند آوازیں آئیں تو میں چونک پڑا اور میں نے مضطرب ہو کر کار کی رفتار میں اضافہ کر دیا۔

شہر کے حالات روز بہ روز خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ امن و امان کی قابلِ رشک صورتحال شرمناک رُخ اختیار کرتی جا رہی تھی، دن دہاڑے ڈاکے پڑ رہے تھے، بھرے پُرے علاقوں میں قتل ہوتے تھے اور قاتل دندناتے ہوئے فرار ہو جاتے تھے۔ مصروف شاہراہوں پر چلتی گاڑیاں روک کر سرِ ملنے دار اغوا کیے جا رہے تھے لیکن میری معلومات کے مطابق ڈیفنس کا علاقہ ان جرائم کی زد میں آنے سے بڑی حد تک محفوظ تھا کیوں کہ ہر بند آہنی پھاٹک کے پیچھے اگر خونخوار کتے موجود نہیں ہوتے تھے تو بھی ایک دو اسلحہ بردار نجی محافظ، چوکیدار یا دربان دشمن کی گھات لگائے ہر وقت تیار بیٹھے رہتے تھے۔ اس لیے فائرنگ کی ان آوازوں کی اہمیت میری نگاہ میں غیر معمولی ہو گئی تھی۔

اس وقت میں دلدار آغا کے مکان سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ کار کی رفتار بڑھانے کے ساتھ ہی فائرنگ کا شور واضح ہونے لگا۔ ان آوازوں میں خاصا تسلسل پایا جاتا تھا جیسے دو فریق باقاعدہ جم کر ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے ہوں۔ اس مقابلے میں پستول بھی چلائے جا رہے تھے اور ہیبت ناک خودکار رائفلیں بھی کانپنے مرگ آسا آواز میں نغمے آلاپ رہی تھیں۔

آخر کار وہی نکلا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ دلدار آغا کے مکان کے قرب و جوار میں گولیاں چل رہی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اِکا دُکا آوازیں اس کے مکان سے بھی آ رہی تھیں۔ فائرنگ میں اتنی شدت تھی کہ اُس قلیل سی مدت میں فضا میں خاصی دُور تک بارود کی بُو پھیل گئی تھی اور کئی مکانوں میں رکھوالی کے کتے پوری قوت سے بھونک رہے تھے۔

گولیاں کئی اطراف سے آ رہی تھیں اور اس وقت دلدار آغا کی گلی میں گھسنا بھٹکی ہوئی گولیوں کو رضا کارانہ نشانہ فراہم کرنے کے مترادف ہوتا اس لیے میں نے گاڑی محفوظ فاصلے پر ہی روک لی۔

کمال کی بات یہ تھی کہ میں پچھلے ڈیڑھ دو منٹ سے فائرنگ کی آوازیں سنتا ہوا دُور سے وہاں پہنچا تھا اور اس آباد علاقے کے مکانات کی روشنیوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی مکان اپنے مکینوں سے خالی نہیں تھا پھر بھی سارے پھاٹک بند پڑے تھے یا پہلی گولی چلتے ہی بند کر لیے گئے

تھے، سڑکیں ویران پڑی ہوئی تھیں اور کسی نے بھی صورتِ حال دریافت کرنے یا کسی انجان مظلوم کو مقتول بننے سے بچانے کے لیے باہر آنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میرے لیے وہ ویرانی حوصلہ افزا تھی۔ میں کسی باز پُرس سے دوچار ہوئے بغیر اس معرکے میں اپنا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کر سکتا تھا۔

"یہ تو پہلے ہی سے کام چل پڑا ہے، ہم سے پہلے کون اِدھر آ گیا؟" سلطان شاہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"فائرنگ اندھا دھند ہو رہی ہے۔" میں نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، پہلے پستول چلائے گئے تھے، بعد میں خودکار رائفلیں بھی گرجنے لگیں...."

"لیکن یہ ہو کیا رہا ہے؟ گولیوں کی اس برسات میں تو ہم کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔"

میرے ذہن میں اس صورتِ حال کا ایک خاکہ بن رہا تھا۔ غزالہ دلدار آغا سے باغی ہو چکی تھی اور اس نے دلدار کے گھر واپس لوٹنے سے پہلے اپنے دفاع کے لیے گھر واپس لوٹنے سے پہلے اپنے دفاع کے لیے گھر میں سے ہی کوئی پستول حاصل کر لیا تھا کیوں کہ ملازمین نے گھما پھرا کر اسے احساس دلا یا تھا کہ دلدار آغا کی اجازت کے بغیر وہ گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتی تھی۔ دوسری طرف دلدار شکست کے زخم چاٹتا ہوا اپنے گھر لوٹا تھا۔ غزالہ اس کی بیوی تھی لیکن اس نے شاید اپنی جھلاہٹ کے زیرِ اثر اس کے ساتھ مالِ غنیمت میں ہاتھ آئی ہوئی لونڈی کا سا سلوک کرنا چاہا اور غزالہ بھڑک گئی۔ میری دانست میں پستول کی پہلی گولی اسی نے چلائی تھی۔ اس نے فائر کرتے ہوئے، دلدار آغا کے مکان سے فرار ہونا چاہا ہو گا لیکن مکان کی حفاظت پر مامور غنڈوں نے اپنے آقا کے مکان میں نامعلوم دشمنوں کے حملے کا خطرہ محسوس کر کے آناً فاناً میں اس علاقے کو میدانِ کارزار میں تبدیل کر دیا۔ دلدار آغا کے مکان کو آنے والے راستوں پر متعین اسس کے مسلح آدمی اصل صورتِ حال کا تصور ہی نہیں کر سکے تھے اور بوکھلاہٹ میں اندھا دھند اپنا اسلحہ ضائع کیے جا رہے تھے۔

اپنے اس مفروضے کی بنیاد پر میں نے اپنی نگاہیں جائے واردات کی سمت میں مرکوز کر دیں۔ میری دانست میں اس صورتِ حال کا زیادہ دیر جاری رہنا غزالہ کے حق میں مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ اندر وہ اکیلی، دلدار آغا اور اس کے ملازمین میں گھری ہوئی تھی اور باہر ہر طرف فولادی نالوں سے موت کے گیت اُبل رہے تھے۔ ذرا سی توجہ کے بعد میں نے فائرنگ کی ہلکی سی چمک کی بنا پر اس ٹولی کی کمین گاہ کا تعین کر لیا جو ہم سے قریب ترین تھی، وہ لوگ آگے فائر کر رہے تھے اور ہم تقریباً ان کی پشت پر تھے۔

"لاؤ!" میں نے سلطان شاہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"وہ نہ اندر ٹھہر سکتی ہے، نہ باہر نکل سکتی ہے، ہمیں اس صورتِ حال کا کچھ نہ کچھ سدِباب کرنا ہی ہو گا۔"

سلطان شاہ میرے ساتھ رہ کر میرا اتنا مزاج آشنا ہو گیا تھا کہ اس نے زبان سے ایک لفظ بھی نکالے بغیر میرا مطلب سمجھ لیا اور ایک دستی بم میرے بڑھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"ٹھہرو!" مجھے کار کا دروازہ کھولتے دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"وہ ٹولی یہاں سے زیادہ دور رہے، میں آگے بڑھ کر ان پر وار کروں گا۔ تم بے فکر رہو، میں چند منٹ میں واپس لوٹ آؤں گا۔ میرے پاس بھرا ہوا پستول بھی موجود ہے۔"

بائیں ہاتھ میں دستی بم اور دائیں ہاتھ میں بھرا ہوا پستول لے کر میں قریبی مکانات کے احاطے کی دیواروں کے سائے میں تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ وہ لوگ دو گاڑیوں کے عقب میں سے فائرنگ کر رہے تھے، میں بے خوفی کے ساتھ پیش قدمی کرتا رہا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ میرا پھینکا ہوا دستی بم ان کو اپنی زد میں لے لے گا تو میں نے پستول جیب میں ڈال کر بم اپنے داہنے ہاتھ میں منتقل کیا اور دانتوں سے اس کی فیوز پن نکال کر ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر وہ دستی بم پوری طاقت سے ان لوگوں کی طرف اچھال دیا۔

بم گرتے ہی پورا علاقہ ہولناک دھماکے سے لرز اٹھا، دھوئیں اور شعلوں کے بادل میں متعدد کربناک انسانی چیخیں اُبھریں اور چند ثانیوں کے لیے ہر طرف سے فائرنگ کا شور تھم گیا لیکن میں بم مارنے کے بعد اپنی جگہ نہیں رُکا بلکہ واپس اپنی کار کی طرف دوڑ پڑا۔

"کار کنارے پر کر کے لاک کر دو۔" میں نے سلطان شاہ کو ہدایت کی۔ "اور تھیلا لے کر باہر آ جاؤ۔ اس طرف سے ہم کو پیش قدمی کا موقع مل جائے گا۔"

اس نے پھرتی کے ساتھ میری ہدایت پر عمل کیا۔ اس وقت تک باہر سے کی جانے والی فائرنگ تھمی ہوئی تھی۔ البتہ اندر سے پستول کے اِکا دُکا فائروں کی آواز بدستور سُنائی دے رہی تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ میرے پھینکے ہوئے بم کے نتیجے میں وہاں کھڑی ہوئی دونوں میں سے کسی کار کی پٹرول کی ٹنکی نے آگ نہیں پکڑی تھی ورنہ نہ صرف قرب و جوار

میں آگ پھیل جاتی بلکہ اس کی روشنی میں ہمارے لیے بھی پیش قدمی کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

کاروں کے تباہ شدہ ڈھانچے کے درمیان سناٹا پھیل چکا تھا۔ اگر ان غنڈوں میں سے کوئی زندہ بچ بھی گیا تھا تو وہ غالباً وہاں سے نکل کر اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرف بھاگ گیا تھا۔ ہم نے دلدار آغا کے مکان کا جائزہ لینے کے لیے ان ہی ڈھانچوں کے درمیان اپنا پہلا مورچہ قائم کر لیا۔ وہاں سے دلدار آغا کے مکان کا بند آہنی پھاٹک نظر آ رہا تھا۔ پھاٹک پر اندھیرا تھا۔ باہر کے راستوں پر معمور اس کے آدمی بم کے دھماکے سے خائف ہو کر اپنی چوکڑی بھول چکے تھے اور دوبارہ فائرنگ کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

"ہیلو ہیلو! ایگل کالنگ پیٹرول فور! " اچانک قریب ہی سے ہلکی سی ریڈیائی آواز سنائی دی اور میں چونک پڑا۔ اس ملبے میں تین مسخ شدہ لاشیں ہم دیکھ چکے تھے لیکن ان کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن وہ ریڈیائی آواز مجھے ان کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

وقفے وقفے سے وہ آواز لاشوں کے قریب پڑے ہوئے ایک مختصر سے لاسلکی ٹرانسمیٹر سے ابھر رہی تھی جو دھماکے سے تباہ ہونے سے بچ گیا تھا۔

تیسری بار اس کال شری پیغام مکمل ہوتے ہی میں نے ٹرانسمیٹر کا بٹن دبایا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "میری مدد کرو... میں بری طرح زخمی ہوں اور اپنے قدموں پر بھی نہیں چل سکتا۔ میرے چاروں طرف سناٹا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ باقی تمام لوگ اپنی زندگیوں سے محروم ہو چکے ہیں... اوور! "

میری پھنسی پھنسی، کراہتی ہوئی آواز نے دوسری طرف والے کو الجھن میں ڈال دیا "تم کون ہو؟ اپنی شناخت و لوکیشن بتاؤ، تو ہم ایک پارٹی تمہاری طرف بھیجتے ہیں... اوور! "

"لعنت ہے ایسی غلامانہ زندگی پر" میں اٹک اٹک کر بے زاری کے عالم میں بولا "مجھے کچھ نہیں پتا کہ میں کہاں ہوں، دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں، میں مر رہا ہوں۔ اور تم میری شناخت پوچھ رہے ہو... اوور! "

"تم ہمیں دھوکا نہیں دے سکتے! " دوسری طرف سے اس بار پُراعتماد، تلخ لہجے میں کہا گیا تھا "دھماکے میں تین آدمی مرے ہیں اور زخمی ہونے والے دونوں ہمارے پاس آ چکے ہیں۔ تم کون ہو اور تمہاری ٹانگیں کس نے توڑی ہیں...؟ اوور! "

"ایگل ہو کر چوہے جیسی باتیں کر رہے ہو! " میں نے صداکاری ترک کر دی لیکن آواز وہی بنا لی جو ڈی ڈی سے بات کرتے ہوئے سیما کے عاشق کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس بار میں نے پہلی دفعہ شی کے ہرکاروں کو ڈی ڈی کا استعمال

کرتے ہوئے دیکھا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ ڈی ڈی بذات خود بھی ایسے ہی ایریٹس پر اپنے آدمیوں کے علاوہ میری آواز بھی سن رہا تھا۔ اس کے شناخت کے دعوے کے باوجود میں اسے اپنی طرف سے مغالطے میں رکھنا چاہ رہا تھا۔

"پیٹرول فور کا مطلب ہے کہ اس علاقے میں تمہاری کم از کم چار پارٹیاں موجود ہیں جن میں سے تین محفوظ ہیں جنھیں ہم کو تباہ کرنا ہو گا۔ مجھے حیرت ہے کہ ایک لنگڑے گھوڑے کو بچانے کے لیے اتنی انسانی زندگیاں داؤ پر لگا دی گئی ہیں لیکن تم یقین رکھو کہ وہ پھر بھی نہ بچ سکے گا... اوور! "

"کیا بک رہے ہو؟ کس لنگڑے گھوڑے کی بات کر رہے ہو تم؟... اوور! " دوسری طرف سے غراہٹ ابھری تھی۔

"تمہارا ڈی ڈی ٹی اپنے بے تکلف دوستوں میں لنگڑے گھوڑے کے نام سے پکارا جانا پسند کرتا ہے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ اس گفتگو سے میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ اگر دلدار آغا اپنے ایریٹس پر وہ گفتگو سن رہا ہو تو مشتعل ہو کر خود ہی لائن پر آ جائے تاکہ میں اس سے کچھ اگلوا سکوں۔

"وہ اپنی پیدائش کے وقت دائی کے ہاتھوں سے پھسل کر فرش پر گر گیا تھا۔ اسی وقت سے اس کی ایک ٹانگ میں نقص پیدا ہو گیا تھا" میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تمہارے باس کو اپنے اس نقص پر فخر ہے۔ ٹانگ کی خرابی کے باوجود وہ بھاگنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ تم لوگ ایک ایک کر کے مار دیے جاؤ گے اور آخر میں وہ اپنے اصطبل سے نکل کر سرپٹ کسی بھی طرف بھاگ لے گا... اوور! "

"آج تمہاری شامت تمہیں ادھر لے آئی ہے۔ تم ان گلیوں سے زندہ واپس نہیں جا سکو گے... اوور! " دانت پیس کر غصیلے لہجے میں کہا گیا تھا۔

"ڈی ڈی کالنگ فار ایگل" آخرکار میری توہین آمیز گفتگو نے دلدار آغا کو لائن پر آنے پر مجبور کر دیا "اس مردود کو گھیر لو، یہ زندہ نہ نکلنے پائے۔ بم اسی نے پھینکا ہو گا۔ یہ بہت چالاک اور مکار ہے تم لوگوں کی بے مقصد، وحشیانہ فائرنگ نے اسے فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کیا ہے۔ تم لوگ کس پر گولیاں چلا رہے تھے؟ اوور! " آخری فقرے پر اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے آدمیوں سے اس رات پہلی بار بات کر رہا تھا۔

"اندر سے فائر کی آواز پر پیٹرول ٹو والوں نے فائر کیا اور غلط فہمی میں سب ہی حرکت میں آ گئے۔ میں سمجھ رہا تھا

ہے... فوری حملہ ہو گیا ہے لیکن بم مارنے والی پارٹی اس وقت خاموشی سے صورت حال کا جائزہ لے رہی تھی۔ ہم ان لوگوں کو بچ کر نہیں نکلنے دیں گے۔ یہ لوگ اس وقت مرنے والوں کے آس پاس ہی موجود ہیں، میرے آدمی ادھر بڑھ رہے ہیں... اوور! "

میں نے سلطان شاہ کا ہاتھ تھاما اور تیزی کے ساتھ تباہ شدہ کاروں کے ڈھانچوں کے درمیان سے نکل کر اپنی کار کی طرف دوڑ لگا دی۔ میرا ایریٹس آن تھا اور اس پر ڈی ڈی ایگل پر برس رہا تھا "اب تمہیں وہاں چڑیا کا بچہ بھی نہیں ملے گا۔ اپنی حکمت عملی مجھے بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ تمہیں معلوم ہے کہ اس وقت ہمارا ایک ایریٹس دشمن کے ہاتھ لگ چکا ہے اور وہ ہماری ہر بات سن رہا ہے۔ تم اسی طرح پے در پے حماقتیں کرتے رہے تو وہ آج رات ایک ایک کر کے تم سب کو ذبح کر دے گا۔ اپنے ہوش و حواس درست رکھو اور اس کے ساتھ مکان کی چار دیواری پر بھی نگاہ رکھو۔ ایک قیدی لڑکی عمارت سے نکل کر باغ میں کہیں چھپ گئی ہے۔ وہ کسی بھی لمحے دیوار پھاند کر فرار ہونے کی کوشش کر سکتی ہے۔ اوور اینڈ آل"

اس نے ایگل کو اس کی بے احتیاطی پر پھٹکارا تھا لیکن خود بھی محتاط نہیں رہ سکا۔ خود سامنے آئے بغیر اپنے مسلح درندوں کو کام سے لگائے رکھنے کے لیے اسے زبان کھولنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ اس کی زبان سے یہ بات سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی کہ غزالہ اس کی مکروہ حرکتوں سے واقف ہونے کے بعد بیوی ہوتے ہوئے بھی اس کے قابو میں نہیں آئی تھی اور اسے جل دے کر اس کی چھت کے سائے سے نکل کر کھلے آسمان تلے آ گئی تھی۔ غزالہ کے ساتھ مقابلے کی وجہ سے ہی دلدار آغا ٹرانسمیٹر پر بروقت اپنے آدمیوں کو فائرنگ روک دینے کا حکم نہیں دے سکا تھا لیکن جب غزالہ کے باغ میں روپوش ہو جانے کے بعد اسے مہلت ملی تو میرا پھینکا ہوا بم اس کے کئی آدمیوں کی زندگی کو بے رحمی سے چاٹ چکا تھا۔

واپس دوڑتے ہوئے میری ہدایت پر سلطان شاہ نے رک کر، ان لوگوں میں دہشت پھیلانے کے لیے ایک اور بم پوری قوت سے فضا میں اچھال دیا۔ اس کا لرزہ خیز دھماکا تباہ شدہ کاروں سے کافی آگے، دلدار آغا کے مکان کے پھاٹک کے قریب ہوا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس اندھا دھند وار نے بھی دشمن کے کم از کم دو آدمیوں کو اپنی زد میں لے لیا تھا ان دونوں کی بے ساختہ جاندار چیخوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ صرف زخمی ہوئے تھے۔

اپنی کار اسٹارٹ کر کے اس کی روشنیاں جلائے بغیر ہم ایک لمبا چکر کاٹ کر دلدار آغا کی رہائش گاہ کے عقب میں پہنچ گئے۔ مجھے یقین تھا کہ اگلے حصے میں بموں کے دھماکوں کے بعد ان لوگوں نے اپنی ساری توجہ اسی سمت میں ہم کو تلاش کرنے پر مرکوز کر دی ہو گی اس لیے ہم ان کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر کسی دوسرے رخ سے ان پر اچانک حملہ کر کے ان کے اوسان خطا کر سکتے تھے۔

ابتدا میں میرے ذہن میں یہ منصوبہ موجود تھا کہ ایک آدھ آتش گیر بم دلدار آغا کے مکان پر بھی پھینکا جائے تاکہ وہ عدم تحفظ کے خوف سے باہر نکل آئے لیکن اس کے اپنے وسیع و عریض مکان کے احاطے یا باغ میں غزالہ کی روپوشی کی خبر ملتے ہی میں نے اپنا منصوبہ ترک کر دیا تھا کیوں کہ اس طرح ہمارے ہاتھوں غزالہ کو بھی نقصان پہنچنے کا امکان تھا۔

اس وقت ہمارا مقابلہ بھاری نفری سے تھا جب کہ ہم صرف دو افراد تھے اس لیے ہم بھاری بارودی اسلحہ استعمال کر کے ان میں دہشت پھیلائے بغیر کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ میں ہلکی سی فائرنگ کر کے دلدار آغا کے آدمیوں کی جوابی فائرنگ سے ان کی پوزیشن کا اندازہ لگا کر کوئی قدم اٹھانا چاہتا تھا لیکن اسی وقت فضا میں کسی پولیس کار کے سائرن کی موہوم سی آواز گونجی جو تیزی کے ساتھ واضح ہوتی چلی گئی۔

یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ دلدار آغا نے پولیس کو ادھر متوجہ کیا ہو گا۔ پولیس یقیناً علاقے کے کسی مکین کی شکایت پر ادھر ہی آ رہی تھی اور اس کی آمد کی شان یہ تھی کہ میلوں دور سے سائرن آن کر دیا گیا تھا تاکہ فساد پھیلانے والے اپنے اسلحے سمیت جائے واردات سے دفع ہو جائیں اور پولیس والے جان کے کسی خوف کے بغیر اپنی کارروائی کر سکیں۔

میں نے ایک بم پن نکال کر دلدار آغا کے احاطے کی دیوار کی جڑ میں اچھال دیا۔ بالکل آخری لمحات پر میں نے اس دھماکے سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دھماکے سے احاطے کی دیوار گرا کر غزالہ کے نکل بھاگنے کے لیے ایک کھلا راستہ بنایا جا سکتا تھا۔

دھماکے کی روشنی میں میں نے دیوار کے پرخچے اڑتے دیکھے اور پھر اپنی کار میں سوار ہو گیا۔

"ڈی ڈی کالنگ ایوری باڈی! " اچانک ٹرانسمیٹر پر مانوس آواز ابھری "سب لوگ جلد از جلد اس علاقے سے نکل جائیں، میں خود سارے معاملات سنبھال لوں گا۔ پولیس آ رہی ہے، کوئی زندہ یا مردہ شخص ان کے ہاتھ نہیں لگنا چاہیے... اوور اینڈ آل! " اس کی آواز دھیمی لیکن لہجہ غضب آلود تھا۔

"لڑکی کہاں ہے ڈارلنگ ڈی ڈی ٹی؟" میں نے اپنے ایپر ٹیس کا بٹن دبا کر مضحکانہ لہجے میں سوال کیا۔ "تم کچھ بوکھلائے ہوئے معلوم ہو رہے ہو... اوور!"

"وہ مجھ سے بچ کر نہیں نکل سکے گی۔" اس کی قہر میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھری۔ "آج اس نے مجھ پر ہتھیار اُٹھا کر خود کو دردناک موت کا سزاوار بنالیا ہے، میں اسے پاتال سے بھی کھود نکالوں گا۔"

اس نے باقاعدہ لائن اوور نہیں کی لیکن سکوت سے میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ اپنی بات پوری کر چکا تھا۔

"کھدائی احتیاط سے کرنا! کوئی سخت چٹان آگئی تو کدال اُچیٹ کر خود تمہارا سر پھاڑ دے گی۔ اوور!" میں نے اس کا مضحکہ اُڑانے والے لہجے میں کہا لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ شاید اس نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی جھنجلا کر اپنا ایپر ٹیس آف کر دیا تھا تاکہ میں اسے مزید مشتعل نہ کر سکوں۔

اس کی آخری گفتگو سے یہ مسرت انگیز اشارہ مل چکا تھا کہ اُس وقت تک غزالہ دوبارہ اس کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ اس لحاظ سے ہماری وہ بھاگ دوڑ بالکل ہی رائگاں نہیں گئی تھی۔ دلدار آغا کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا ہوں۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک ایپر ٹیس میری تحویل میں آ گیا تھا۔

جلے ہوئے بارود کی بُو سے رچے ہوئے ماحول میں غضب ناک کتوں کو غراتا ہوا چھوڑ کر تھوڑی ہی دیر میں ہم اس علاقے سے محفوظ فاصلے پر نکل آئے۔ پولیس کار کا سائرن ہمارے قریب سے گزر کر پیچھے رہ گیا تھا۔ راستے میں ان سے ہمارا سامنا ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

واپسی پر میں نے دلدار آغا کے اہم آدمی معراج دین کے اڈے پر دھاوا بولنے کا ارادہ کیا تھا لیکن سلطان شاہ نے مجھے روک دیا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد اُس وقت میں اس قدر اعصاب زدہ ہو کر رہ گیا تھا کہ خود کو نیند کی حالت میں وہ سارے کام کرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

میں نے دوسری بار کار اپنی عمارت کے پارکنگ فلور پر چڑھائی تو چوکیدار نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی بنا پر اس کے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ اس رات ہماری مصروفیات کی نوعیت بہت زیادہ غیر معمولی تھی۔

میں لباس تبدیل کر کے سونے کے لیے بستر پر دراز ہوا تو میرے ذہن میں غیر ارادی طور پر کئی نام در آئے۔ پہلا نام شی کے سربراہ جمی لائیڈ کی بیٹی ویرا لائیڈ کا تھا جو تفریح کے معاملے میں بے اعتدالی کی عادی تھی اور اپنے کردار کے اس پہلو پر کبھی بھی شرمندگی کا اظہار نہ کرنے کے باوجود میری ذات سے بے پناہ محبت کی دعوے دار تھی، یہ حقیقت تھی کہ اس نے کئی نازک مواقع پر اپنے باپ کے مقابلے میں کھل کر میرا ساتھ دیا تھا اور جمی لائیڈ کی معتوب بن گئی تھی، پروگرام کے مطابق اسے میلان میں مجھ سے ملنا تھا لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے وہ نہ آسکی اور میں سلطان شاہ کے ساتھ پاکستان پہنچ گیا، دوسرا نام میری مقتول پڑوسن سیما کا تھا، وہ بھی آزادروی کی قائل تھی۔ اُس کا شوہر وطن سے ہزاروں میل دور فرینک فرٹ کی کسی جیل میں ہیروئن اسمگل کرنے کے جرم میں قید تھا اور وہ ہجر کے کرب ناک لمحات اجنبی مردوں کی رفاقت میں گزار رہی تھی، اس کا بھی جھکاؤ میری جانب تھا لیکن نشے کی جھونک میں وہ میرے بجائے جہانگیر کی گود میں پکے ہوئے پھل کی طرح آ گری تھی۔ اُس کی زندگی نے اُس کے ساتھ وفا نہیں کی ورنہ وہ رشتوں کے کسی بھی تکلف میں پڑے بغیر اپنے دوستوں کی دلجوئی کرنے کی عادی معلوم ہوتی تھی، وہ مری تو سلمیٰ کے گھر ریٹا سے ملاقات ہوئی جو اپنی قسم کی ایک انوکھی ہی مخلوق تھی۔ سُرخی، غازے اور میک اپ کے دوسرے لوازمات کے سہارے اپنے حُسن کو دوآتشہ بنانے والی وہ خاتون ایک معزز وکیل کی بیوی تھی۔ اس سے میری تفصیلی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن اُس کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہ بھی زیادہ اخلاقی قیود کی عادی نہیں تھی لیکن میں ان ناموں کو عارضی دوستی سے زیادہ کوئی وقعت دینے کے لیے تیار نہیں تھا میرا فلسفہ یہ تھا کہ ایک عورت ایک وقت میں صرف ایک ہی مرد کو خوش رکھ سکتی تھی خواہ وہ اُس کا شوہر ہو یا محبوب۔ شمعِ محفل بن کر آسودگی کی خیرات بانٹنے والیوں سے آخر کار آزار ہی ملا کرتے ہیں جن کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔

ان ہی خیالوں میں میری آنکھ لگ گئی۔ اگلی صبح بیدار ہوا تو کچن سے آنے والی کھٹ پٹ کی آوازوں نے مجھے چونکا دیا۔ میں حیرت اور تجسس کے عالم میں بستر سے کود کر... باورچی خانے کے دروازے پر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سلطان شاہ پوری طرح تیار ہو کر اپنے لیے ناشتا بنا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرانے لگا۔ "نوکری کا معاملہ ہے، اس لیے وقت پر بیدار ہو کر جانا پڑتا ہے۔ دلدار آغا وقت کی پابندی کے معاملے میں فیکٹری کے عملے کے ساتھ بہت سخت ہے، صرف پانچ منٹ کی تاخیر سے آنے والوں کو بھی ڈیوٹی پر نہیں لیا جاتا اور ایک ماہ میں تین غیر حاضریوں پر برطرفی کا پروانہ تھما دیا جاتا ہے۔"

"ملازمت سے برطرفی کے لیے تو کچھ مقررہ ضابطے اور قانون ہیں، کیا وہ ان کی پابندی نہیں کرتا؟"

"وہ لے دے کر کام چلاتا ہوگا، ویسے بھی ورکرز پر اس کی اتنی دہشت ہے کہ جلنے والے بھی انتظامیہ کے فیصلوں کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہیں کر پاتے، تم لعنت بھیجو ان باتوں پر، میرے پاس تمہارے لیے ایک خوش خبری موجود ہے۔" وہ خاموش ہو کر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"بولو، بولو! کیا بات ہے؟" اتنی دیر میں میرا خمار بالکل کافور ہو چکا تھا۔

"رات کو ہاتھ لگنے والا ایپر ٹیس بہت کارآمد ہے، اس کی رینج دس میل یا سولہ کلومیٹر کے دائرے میں ہے، میں نے تھوڑی دیر پہلے اس پر ڈی ڈی اور اینگل کی گفتگو سُنی ہے اور خوش خبری کی بات یہ ہے کہ بھابی کامیابی کے ساتھ دلدار آغا کے گھر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی، وہ پولیس والوں کے ہاتھ لگی اور نہ اینگل کے فرشتوں کو علم ہو سکا کہ وہ کب اور کہاں سے نکل گئی۔"

یہ مستند خبر بہت حوصلہ افزا تھی، پوری رات گزار لینے کے بعد ڈی ڈی نے شاید یہ سوچ کر ایپر ٹیس پر اینگل سے بات کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا کہ ہم دونوں سو چکے ہوں گے اس لیے اس کی گفتگو سُن لیے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

"تم نے درمیان میں مداخلت تو نہیں کی تھی؟" میں نے اسے گھورا۔

وہ ہولے سے ہنس پڑا۔ "اب میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں، میں نے اُٹھتے ہی ایپر ٹیس آن کر دیا تھا، مُنہ دھوتے ہوئے اس پر آوازیں سُنائی دیں اور میں باہر نکل آیا۔"

"مجھے یہی فکر تھی کہ وہ دلدار آغا کے مکان سے نکل کر پولیس کے ہتھے نہ چڑھ جائے لیکن وہ اکیلی رہ کر میری توقع سے زیادہ دلیر اور بے خوف ہو گئی ہے۔" میں نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔

"کراچی اس کے لیے اجنبی شہر نہیں ہے، اب وہ کسی نہ کسی طرح ہم سے آملے گی۔" وہ بہت زیادہ پُرامید تھا۔

لیکن میرے لیے اس معاملے کا ایک نازک پہلو بدستور برقرار تھا۔ غزالہ کو اپنے اکلوتے بھائی کامران سے بہت زیادہ پیار تھا جس نے برسوں دیوانگی کی زندگی بسر کرنے کے بعد کچھ ہی عرصے پہلے ہوش سنبھالا تھا اور بدقسمتی یہ تھی کہ کامران بھی غزالہ کے ساتھ دلدار آغا کے مکان میں رہ رہا تھا۔ غزالہ دلیری سے کام لے کر اس مہیب ترین قید خانے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ کامران وہیں پھنسا رہ گیا ہوگا۔ اسے دلدار آغا یرغمال بنا کر غزالہ کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

"میرے لیے بھی ناشتا تیار کر لو!" سلطان شاہ کو ہدایت دے کر میں غسل خانے میں جا گھسا۔ میں جلدی جلدی مُنہ ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کیے بغیر کچن ٹیبل پر اس کے ساتھ ناشتے میں شریک ہو گیا۔

میری نگاہ میں یہ صورتِ حال بہت زیادہ عجیب و غریب اور غیر حقیقی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اخبارات میں آئے دن خبریں پڑھتا تھا تو یقین نہیں آتا تھا کہ اپنے محبوب کی خاطر کوئی مشرقی عورت اپنے مجازی خدا کی دشمن بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن غزالہ کا معاملہ سامنے آنے کے بعد مجھے یہ مان لینا پڑا تھا کہ حالات کے تحت ایسے ایسے محیّر العقول واقعات رُونما ہو سکتے ہیں جن پر کسی اجنبی کا یقین کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

سلطان شاہ ناشتا کر کے جاز فارماسیوٹیکل کے لیے روانہ ہو گیا اور میں دفتر روانگی کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ فلیٹ سے روانہ ہو کر میں نے بہادر آباد کے چوراہے پر کار روک کر ایک بُک اسٹال سے اخبارات خریدے اور اُن کے پہلے اور آخری صفحات کا سرسری جائزہ لے ڈالا۔ مجھے معلوم تھا کہ صبح کے اخبارات کے وہ اہم ترین صفحات ہی رات گئے سب سے آخر میں چھاپے جاتے تھے۔ اس لیے شہر میں تاخیر سے ہونے والے واقعات کے بارے میں کوئی نامکمل یا سرسری خبر ان ہی صفحات پر مل سکتی تھی۔

اُردو کے صف ایک کثیر الاشاعت روزنامے کے پہلے صفحے پر سب سے نیچے ایک چھوٹی سی جگہ میں ڈیفنس کے رہائشی علاقے میں شدید فائرنگ کی ادھوری خبر موجود تھی جس سے میرا مطلب حل نہیں ہوتا تھا۔

اس اخباری جائزے کے بعد میں دفتر کے لیے روانہ ہو گیا، مافیا کے مقامی بیورو میں میرے پہلے باقاعدہ دن کا آغاز ہونے والا تھا، میرا خیال تھا کہ میں اپنے اختیارات کا جائزہ لینے کے لیے ٹریڈ لائن کے دفتر پہنچتے ہی کسی کو دلدار آغا کے مکان پر پیش آنے والے واقعات کی تفتیش پر مامور کر سکتا تھا۔

میں شہر کے مصروف علاقوں میں ٹریفک کا ہجوم بڑھنے سے ذرا پہلے ہی ٹریڈ لائن کے دفتر پہنچ گیا۔ اس وقت میری رسٹ واچ میں نو بجنے میں دس منٹ باقی

تھے لیکن عجائب گل خان کسی فرض شناس ملازم کی طرح پوری محنت سے چوبی دروازے کو زرد فلالین کے کپڑے سے رگڑ کر چمکا رہا تھا۔

خوش قسمتی سے اس سے کوئی مدد لیے بغیر ہی مجھے گاڑی پارک کرنے کی جگہ مل گئی۔ میں دروازہ لاک کر کے دفتر کے دروازے پر پہنچا تو عجائب گل میرے قدموں کی آہٹ سنتے ہی پدک کر پلٹا اور مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اپنی فطری حیرت کے باوجود وہ اٹین شن ہو کر مجھے سلام کرنا نہیں بھولا تھا۔

اس وقت میں اُس کا اعلیٰ افسر تھا اس لیے میں نے کسی نرماہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ "کیا بات ہے عجائب خان؟ مجھے دیکھ کر تم کچھ بوکھلا سے گئے ہو!"

"ابھی دفتر میں کوئی نہیں آیا صاب۔" وہ میرے لیے احترام کے ساتھ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "آپ بہت سویرے اِدھر آگیا۔ دفتر میں تو سب لوگ دس بجے آتا ہے۔"

اس نے میرے ساتھ اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

اچانک مجھے سب انسپکٹر محمود کی دردناک موت یاد آگئی۔ اسے ایک سازش کے ذریعے اس کی ایمانداری کی سزا اس طرح دی گئی تھی کہ اس کا بھیانک قتل ایک حادثہ قرار دے دیا گیا تھا۔ اس سازش کا سربراہ ڈان تھری تھا اور اسی نے محمود کے قتل کے بعد جائے حادثہ سے میرے کاغذات کا لفافہ اٹھایا تھا لیکن اس ٹرک ڈرائیور کا نام صیغۂ راز میں تھا جس نے بڑی بے رحمی کے ساتھ محمود کو اس کے اسکوٹر سمیت اپنے ٹرک کے ٹائروں تلے رَوند ڈالا تھا۔

"تم بہت محنتی آدمی ہو عجائب گل۔" میں نے تخلیہ پا کر اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں اور اس نے بوکھلا کر سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر میرے لیے احترام موجود تھا۔

"تم ڈرائیونگ بھی کر لیتے ہو، میں تمھارے کام سے بہت خوش ہوں۔" میں نے اپنی بات معنی خیز لہجے میں مکمل کی۔

"جو حکم ملے، اس کو پورا کرنا ہماری زندگی ہے صاب!" اندرونی مسرت سے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"تمھیں معلوم ہے کہ اب سب لوگ صرف مجھ کو جواب دہ ہیں؟"

"مالوم ہے صاب!" وہ اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر بولا۔ "اب سینڈ صاب بھی تمھارا ماتحت ہے۔" اس لیے اس کے بگڑے ہوئے تلفظ سے ماتحت کا لفظ اخذ کرنا دشوار نہیں تھا۔

"ڈان تمھاری تعریف کر رہا تھا۔" میں نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔ "جانتے ہو، کیوں؟"

اس نے چونک کر خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا، پھر سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ "اس نے ہم کو زبان بند رکھنے کا حکم دیا تھا صاب! پولیس افسر کا قتل بہت بڑا جرم ہوتا ہے۔ ہم نے کسی سے ایک لفظ نہیں بولا۔ کام کرنے کے بعد ٹرک مودود خان کے اڈے پر چھوڑا اور واپس آگیا لیکن اُس نے خود تم کو بتا دیا؟"

"مجھ میں اور دوسروں میں فرق ہے عجائب خان!" میں نے اسے گھورتے ہوئے سفاکانہ ہنسی کے ساتھ کہا۔ "اس نے تو یہ بھی کہا تھا کہ انگریزی نہ جاننے کے باوجود تم نے اُس کی ہر بات سمجھ لی۔"

"وہ نقاب میں تھا صاب!" عجائب خان جھرجھری لے کر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "مگر ہم کو معلوم تھا کہ وہ گورا ہے۔ اس نے سارا بات اشاروں سے سمجھایا اور ہم سمجھ گیا کہ ہم کو کیا کرنا ہے۔ قسم پروردگار کا! مالک حکم دے تو ہم ایک کیا پچاس آدمی کو بھی کچل کر مار سکتا ہے۔ ہم نمک حرام نہیں ہے۔"

"اسی لیے میں بھی تم سے کچھ ضروری کام لینا چاہتا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور وہ... ہمہ تن گوش ہو گیا۔ "تم ماجے کو جانتے ہو؟" میں نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

"جانتا ہے صاب! وہ دوسرا پالٹی کا آدمی ہے، کھڈے کا سارا ہیروئن وہ سپلائی کرتا ہے۔" عجائب خان نے نہایت سعادت مندی سے سر جھکا کر اقرار کیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ دو چار روز کے لیے اُسے اتنا معذور کر دیا جائے کہ وہ اپنا کوئی کام خود نہ کر سکے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"حکم دو تو ہم اس کی زندگی کا چراغ ہی گُل کر دیں۔" اس نے مخلصانہ لہجے میں پیش کش کی۔ "بلکہ کسی شکار کو زخمی کرنے سے اسے مارنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔"

"یہ مشکل کام ہے اسی لیے تم سے بات کر رہا ہوں۔" میں نے اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا۔ "آسان کام تو کوئی دوسرا بھی خوشی سے کر گزرے گا۔"

"جو حکم مالک کا۔" اس نے سنگین لہجے میں وہ فقرہ ادا کرتے ہوئے اپنا سر خم کر دیا۔

"میری گاڑی لے جاؤ۔" میں نے چابی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ دھیان رکھنا کہ نہ گاڑی دیکھی جائے اور نہ تم پہچانے جاؤ! اسلحہ ہے تمھارے پاس؟"

"ہم بھوکا رہ سکتا ہے صاب۔ ہتھیار نہیں چھوڑ سکتا۔" اس نے چابی لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اِدھر کون چوکیداری کرے گا؟"

"تم جاؤ! میں یہاں موجود ہوں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا اور وہ تیزی کے ساتھ دفتر سے نکل گیا۔

میں وہیں چھوٹے سے استقبالیہ کاؤنٹر کے قریب جا کھڑا ہوا۔

الیکٹرانک فون ایکسچینج آف تھا۔ میں نے لائن آن کر کے جہانگیر کا نمبر ملایا تو دوسری طرف سے سلمیٰ نے فوراً ہی ریسیور اٹھا لیا۔ اس کی سہمی ہوئی آواز سن کر میں چونک پڑا۔

"میں پیٹر بول رہا ہوں سلمیٰ! جہانگیر کا کیا حال ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ بہتر ہیں، لیکن میں بہت پریشان ہوں۔" وہ... روہانسی آواز میں بولی تھی۔ "تم تھوڑی دیر کے لیے آسکتے ہو؟"

"میں مجبور نہ ہوتا تو فون کرنے کے بجائے خود جہانگیر کی عیادت کے لیے آتا۔ تم جہانگیر سے میری اس بات کی تصدیق کر سکتی ہو۔ بات کیا ہے؟ تم واقعی خوف زدہ معلوم ہو رہی ہو؟"

"ریٹا دو بجے میرے پاس سے اپنے گھر گئی ہے۔ اس کے بعد سے بار بار کسی نامعلوم شخص کا فون آرہا ہے، وہ ہر بار جہانگیر کو پوچھتا ہے۔ وہ خواب آور دوا کے زیرِ اثر سو رہے ہیں اس لیے میں اُن کی بات نہیں کرا سکتی۔ یہ معلوم ہونے کے بعد وہ کمینہ شخص ننگی ننگی گالیوں کے ساتھ خوف ناک دھمکیاں دے کر فون بند کر دیتا ہے۔ دو بار اُس نے یہ بھی کہا کہ جہانگیر نے اگر اس کی ہدایات سے ذرا بھی انحراف کیا تو اس بار وہ اُن کی کھال جسم سے الگ کرا دے گا۔ مجھے تو وہ کوئی جنونی معلوم ہوتا ہے جو ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

میرے لیے یہ خبر روح فرسا تھی۔ غزالہ سے محروم ہو جانے کے بعد میرا نام اُس کے دل کی پھانس بن گیا تھا اور وہ شاید ایک بار پھر جہانگیر پر قابو پا کر اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ جہانگیر اُس درندے کے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد بستر سے لگ گیا تھا۔ اسے اپنے گھریلو ملازمین کے سوا کسی قسم کا کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا۔ نہ ہی میں اس کی کوئی مدد کر سکتا تھا۔ لے دے کر بس ایک ہی بات اس کے حق میں جاتی تھی کہ اس کی نئی افتاد سے باخبر ہونے سے قبل ہی میں عجائب گل خان کو معراج دین عرف ماجا کی طرف بھیج چکا تھا۔ مجھے علم تھا کہ دلدار آغا معاشرے کے ایک معزز فرد کے بہروپ میں رہ رہا تھا اور اپنی تمام مجرمانہ کارروائیاں ماجے کے آدمیوں کے ذریعے کراتا تھا۔ ماجے کی معذوری اسے بالکل بے دست و پا کر سکتی تھی۔ اس طرح وہ جہانگیر کے خلاف فوری طور پر کوئی زیادہ بڑی کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ جہانگیر کے مسئلے کا علم ہونے سے قبل ماجے کو معذور کرانے سے میرا مدعا بھی یہی تھا کہ دلدار آغا بالکل بے دست و پا ہو کر بے بسی سے جھلا تا رہ جائے۔ معراج دین مار دیا جاتا تو دلدار آغا فوری طور پر زیرِ زمین دنیا کے کسی دوسرے فرد سے معاہدہ کر سکتا تھا لیکن اُس کی زندگی میں دلدار آغا کے لیے اس کی دوبارہ صحت یابی کا انتظار کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا چارۂ کار نہیں رہتا۔

حالات اور واقعات سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ دلدار آغا کو کراچی میں میری موجودگی کا یقین نہیں تھا لیکن وہ میری طرف سے شبہات کا شکار ہو چکا تھا۔ دوسری طرف غزالہ کے رویے میں آنے والی باغیانہ تبدیلی نے بھی اس کے شبہات کو ہوا دی ہو گی۔ اسی وجہ سے وہ دوبارہ جہانگیر کو فون کر رہا تھا۔

شہر میں میری موجودگی کے صرف تین گواہ دلدار آغا کی دسترس میں تھے جن میں سے امیر دادا سلطان شاہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ غزالہ دلدار آغا کے مُنہ پر تھوک کر اس کے گھر سے نکل گئی تھی۔ اس طرح صرف تیسرا آدمی باقی رہ جاتا تھا جو میری نگاہوں میں تھا۔ وہ پٹیل پاڑے کی گنجان آبادی میں رہنے والا محکمۂ اوزان کا انسپکٹر بخت آور تھا جو غزالہ سے میری پہلی ملاقات کے موقع پر ہوٹل میں امیر دادا کے ساتھ ہماری نگرانی کر رہا تھا۔

اپنی سرکاری ملازمت کی بنا پر وہ پیشہ ور مجرم نہیں تھا۔ اس لیے یہ امکان بہت کم تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر ڈینی کی حیثیت سے پہچان لیتا البتہ میری تصاویر دکھا کر اس سے شناخت کرائی جا سکتی تھی۔ اس بنا پر نہ میں فوری طور پر اس کے خلاف کوئی سنگ دلانہ فیصلہ کر سکتا تھا اور نہ اسے یکسر فراموش کر سکتا تھا۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ طے ہو جاتا تھا کہ پچھلی رات شاہ باغ سے واپسی کے بعد دلدار آغا نے فون پر میری شناخت کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اس کا تعلق میرے ڈینی ہونے یا نہ ہونے سے نہیں تھا بلکہ وہ کسی اور حوالے سے بات کر رہا تھا جو میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔

اس وقت میرے کھیل کا زیادہ دار و مدار اچانک عجائب گل کی کامیابی پر رہ گیا تھا۔ اس کا مشن کامیاب ہو جاتا

تو نہ صرف دلدار آغا تنہا رہ جاتا بلکہ مجھے بھی ہاتھ پیر پھیلانے کا موقع مل جاتا۔

شاہ باغ میں ہونے والی خون ریزی اور دلدار آغا کے مکان کے باہر بھاری جانی اتلاف کے بعد مافیا کے آدمی اپنے باس کی براہِ راست مداخلت کے بغیر بھاری معاوضے پر بھی ڈی ڈی کے لیے کام کرنے پر آمادہ نہ ہوتے کیوں کہ وہ لوگ عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے ہی ساری بدمعاشیاں کرتے تھے۔ اگر ان کی زندگی ہی چھین لی جاتی تو بھاری معاوضے ان کے لیے مٹی کے ڈھیر کی طرح بے مصرف ہو جاتے۔

"وہ جو کوئی بھی ہے، میری نگاہ میں ہے۔" میں نے سلمٰی کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "وہ کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ رہا ہے۔ اس کی دھمکیوں میں کوئی وزن ہوتا تو وہ فون کرنے کے بجائے تمھارے گھر پہنچ گیا ہوتا۔ میرے کچھ آدمی اس کی راہ پر لگے ہوئے ہیں، تمھارا رُخ کرنے سے پہلے ہی وہ موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔"

"میرے خدا!" وہ فون پر یکلخت رو پڑی۔ "تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ تم بھی اسی کی طرح سفاکی سے قتل اور غارت گری کی باتیں کر رہے ہو۔ اگر وہ جنونی ہے تو پھر تم بھی پاگل ہو گئے ہو۔ ... مجھے کچھ تو بتاؤ کہ وہ کون ہے اور اس سے تمھاری کیسی دشمنی چل رہی ہے؟"

مجھے احساس ہوا کہ جوش اور غصّے میں مجھے واقعی اپنی زبان پر اختیار نہیں رہا تھا۔ مجھے سلمٰی سے اُس وقت قتل اور انتقام کی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ ڈی ڈی کی فون کالز سے پہلے ہی دہشت زدہ تھی، میری باتوں نے اُسے اور خوف زدہ کر دیا تھا۔ سیدھی سی بات تھی کہ میں جس کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا جواب میں وہ مجھ پر یا جہانگیر پر پھولوں کی برسات نہیں کر سکتا تھا۔

"یہ اُونچے درجے کی کاروباری رقابت ہے سلمٰی!" میں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "اجارہ داری برقرار رکھنے کے لیے وہ ہم کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہ رہا ہے...۔"

"تم جھوٹے اور مکار ہو۔" وہ میری بات کاٹ کر رُندھی ہوئی غصیلی آواز میں چیخ پڑی۔ "اس شہر میں ہزاروں لوگوں نے گارمنٹس کے چھوٹے بڑے کارخانے لگائے ہوئے ہیں لیکن کوئی بھیڑیوں کی طرح دوسروں کو چیر پھاڑ کر نہیں پھینک رہا۔ تم مجھے سچ سچ بتاؤ کہ گارمنٹس کی آڑ میں جہانگیر کیا دھندا کر رہا ہے؟"

"تم مصر ہو تو میں بتا دوں گا لیکن تمھیں وعدہ کرنا ہوگا کہ تم جہانگیر کو اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتاؤ گی۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے ذہن میں کہانی مرتب کرتے ہوئے کہا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ اپنی زبان بند رکھوں گی۔" ریسیور پر اس کی اضطراری آواز اُبھری۔ "لیکن میں اس کی شرعی اور قانونی بیوی ہوں۔ مجھے اس کی مصروفیات اور کاروبار کے بارے میں ہر بات جاننے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔"

"میں تمھارے اس حق سے انکار نہیں کرتا لیکن تم اپنے اس حق کے بارے میں ایک غلط آدمی کو مجبور کر رہی ہو۔ بہرحال میں تمھیں تمھارے وعدے پر بتا رہا ہوں کہ یہ کاروباری رقابت ہی کا ایک معاملہ ہے۔ گارمنٹس کا ایک بڑا ایکسپورٹر پاکستان سے اپنے مال کے ساتھ بلکہ اس کی آڑ میں ہیروئن کی بھاری مقدار امریکا اسمگل کرتا رہتا تھا۔ حال ہی میں کسٹم والوں نے چھاپا مار کر اس کا مال جہاز پر لادے جانے سے قبل رنگے ہاتھوں ہیروئن کی کھیپ برآمد کر لی۔ اسے کسی وجہ سے شبہ ہو گیا ہے کہ اس کا مال جہانگیر نے پکڑوایا ہے اس لیے وہ جہانگیر کے پیچھے پڑ گیا ہے اور اب ہر طرح سے اسے برباد کرنا چاہتا ہے لیکن میں بھی اس کے پیچھے لگ گیا ہوں، اگر ثبوت کے ساتھ اسے قانون کی مضبوط گرفت میں نہ لا سکا تو پھر اسی کی طرح مجرمانہ ہتھکنڈوں سے اُسے زیر کروں گا۔"

"ہیروئن برآمد ہونے سے بڑا اور کون سا ثبوت قانون کو درکار ہو سکتا ہے؟" اس کی آواز سے بے اعتباری مترشح تھی۔

"اس نے سارا الزام اپنے منیجر کے سر ڈال دیا ہے کہ وہی اس کی بے خبری میں یہ مذموم کارروائی کر رہا تھا لیکن میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ سارے کرتوت اُسی کے ہیں۔"

"جب تک تم کو کامیابی حاصل نہیں ہوتی، ہم دونوں کی جان سُولی پر ٹنگی رہے گی۔ وہ کسی وقت بھی اشتعال کے عالم میں ہم پر وار کر سکتا ہے۔" اس کی آواز ایک بار پھر رُندھنے لگی۔

"تم بھول رہی ہو کہ وہ آزاد نہیں ہے، میرے آدمی اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میں فوری طور پر تمھارے گھر کی نگرانی کا بندوبست بھی کرتا ہوں...!"

"تمھارے آدمی کہاں سے آ گئے؟ مجھے جھوٹے بہلاوے نہ دو!" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"کراچی میں پیسے کے بل پر سب کچھ ہو جاتا ہے۔ میری باتوں پر بھروسا نہیں کرو گی تو دہشت سے ہلکان ہو جاؤ گی۔ یہ کیوں بھول رہی ہو کہ جہانگیر میرا عزیز ترین دوست ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟" اس کی وہی ایک رٹ تھی۔ خوف نے اس سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لی تھی۔

"اپنے ملازمین کو ہدایت کر دو کہ کسی بھی آنے والے کے لیے داخلی پھاٹک ہرگز نہ کھولیں، اجنبیوں کو باہر ہی سے ...یں اور جاننے والوں کو ذیلی دروازے سے اندر بلائیں ...کے ساتھ گھر میں موجود اسلحہ اپنے قابلِ اعتماد ملازمین میں ...م کر دو تاکہ کوئی بُرا وقت آ ہی جائے تو وہ بے دست و پا ...زدہ جائیں اور مؤثر طریقے پر تمھارے گھر کا اور تمھارا ...ظ کر سکیں۔"

"وہ جہانگیر کا دشمن ہو گیا ہے۔ تمھارا اس کے کاروبار ...کوئی واسطہ نہیں۔ پھر تمھیں کون سی چیز یہاں آنے سے ...رہی ہے؟" اس نے اچانک ہی مجھ سے وہ ٹیڑھا ...ل کر ڈالا۔

"تمھیں سمجھانا بہت مشکل ہے سلمٰی!" میں لمبی ...بولا۔ "اس مردود کو شبہ ہے کہ میں کاروبار میں جہانگیر کا ...ریک ہوں۔ اُس نے تشدّد کر کے جہانگیر کو صرف اسی لیے ...رکھا ہے کہ میں اس کی مزاج پُرسی کے لیے اس کے پاس ...ؤں تو وہ ہم دونوں کو ایک ساتھ پکڑ سکے۔ اسے میری تلاش ہے۔ میں تمھارے پاس آ گیا تو وہ اپنی ساری طاقت ...طرف مرکوز کر دے گا۔ باہر رہ کر میں تمھاری زیادہ مدد کر ...سکتا ہوں۔"

"جیسا تم کہہ رہے ہو، میں ویسا ہی کروں گی۔" اُس ...کی آواز سنائی دی۔ "لیکن خدا کے لیے مجھے فون کرتے ...رہنا۔ مجھے ابھی سے ہَول آنے لگے ہیں۔"

"تم فکر نہ کرو، میں رابطہ رکھوں گا۔" میں نے رابطہ ...منقطع کر دیا۔ اپنی بنائی ہوئی فرضی کہانی کے ذریعے میں اُسے ...مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میری کسی بھی قسم کی... ...مدد کر کے وہ خسارے میں رہتی۔

صورتِ حال پیچیدہ ہوتی جا رہی تھی۔ دلدار آغا زخمی بھیڑیے ...کی طرح پلٹ پلٹ کر وار کر رہا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کس ...وقت جہانگیر کے خلاف کوئی انتہائی کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیتا۔ ...نازک موڑ پر زخمی جہانگیر اور ہراساں سلمٰی کو ناتجربے کار گھریلو ملازم ...کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

میں سگریٹ سلگا کر وہیں ایک طرف بیٹھ گیا۔ جہانگیر کی مدد ...کے لیے مجھے مافیا کے اراکین سے مدد لینا ناگزیر نظر آ رہا تھا۔ اس ...پر مافیا اور رشی کی چپقلش سے فائدہ اُٹھا کر میں مافیا کی بھرپور ...طاقت کو دلدار آغا کے خلاف استعمال کر سکتا تھا۔

میں انھی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اندر سے اچانک سینڈو ...نمودار ہوا۔ وہ سر جھکائے اپنی دُھن میں مست چلا آ رہا تھا۔ ...پر نگاہ پڑتے ہی میں اپنی غائب دماغی پر بھنا کر رہ گیا۔ مجھے ...طرح معلوم تھا کہ سینڈو مافیا کے دوسرے کئی اہم کارندوں کے ...اسی دفتر کے اندرونی حصّے میں قیام پذیر تھا پھر بھی میں نے عجائب گل کی جگہ اس کے کسی آدمی کو طلب کرنے کے بجائے خود ہی چوکیداری کے لیے بیٹھ گیا تھا۔

سینڈو کی نگاہ اچانک ہی مجھ پر پڑی اور وہ مجھے بے تکلفی کے ساتھ وہاں براجمان پا کر بھونچکا رہ گیا۔

"باس، تم کب آئے یہاں؟" اس کے ہونٹوں سے تحیّر زدہ آواز نکلی۔

"کام اور موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا سینڈو!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"تم اکیلے ہی یہاں بیٹھے ہو، عجائب گل کہاں مر گیا؟" اس نے اُلجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"مرا نہیں، وہ کسی کو مارنے کے لیے گیا ہے۔" میں نے چُبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اسے میں نے کام سے بھیجا ہے۔"

"اوہ! پھر تو تم کافی دیر سے آئے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ میں اندر ہی تھا، عجائب گل سے مجھے بلوا لیا ہوتا۔ میں بستر پر پڑا گانے سُن رہا تھا۔" وہ خواہ مخواہ شرمندہ ہوئے جا رہا تھا۔

"پہلے ہی دن میں نے تم میں سے کسی کو بستر سے اُٹھا کر بلوانا مناسب نہیں سمجھا، میرے کام کے لیے عجائب گل ہی کافی تھا۔ اس لیے میں نے اسے بھیج دیا۔ اب تم اس کی جگہ اپنا کوئی آدمی کھڑا کر دو، وہ تھوڑی دیر میں واپس لوٹ آئے گا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں اسے آگاہ کیا اور وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے سے تجسّس جھلک رہا تھا جیسے وہ میری زبان سے عجائب گل کی مہم کی تفصیلات بھی سُننا چاہتا ہو لیکن وہ مجھ سے کوئی سوال کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

"اسی کے ساتھ تم کو مزید دو کام کرانے ہیں۔" قدرے توقف کے بعد میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ڈیفنس سوسائٹی میں دلدار آغا نامی ایک شخص رہتا ہے۔ کل رات اس کے مکان پر کچھ لوگوں نے دھاوا بول دیا تھا۔ خاصا خوف ناک تصادم ہوا تھا جس میں دلدار آغا کے حامیوں کا جانی نقصان بھی ہوا تھا۔ تمھیں اس واقعے کی مکمل تفصیل حاصل کرنی ہے۔ ساتھ ہی یہ سراغ بھی لگانا ہے کہ پولیس کو اس واقعے کے بارے میں کیا بتایا گیا ہے۔ یہ کام جلد از جلد مکمل ہونا ہے۔ دوسرا کام خاصی ہوشیاری کا ہے۔ جہانگیر نامی ایک شخص کو کچھ لوگوں کی طرف سے جان کا خطرہ ہے۔ وہ کسی بھی وقت اسے ہلاک یا اغوا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں جب کہ ہمارے لیے اس کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے۔ اپنے کم از کم دو مسلح آدمی فوراً اس کی حفاظت پر مامور کر دو۔ اگلی ہدایات ملنے تک اس کی چوبیس گھنٹے حفاظت کی جانی بہت ضروری ہے۔ دن اور رات کے لیے آدمیوں میں ردّ و بدل تم اپنی صوابدید کے مطابق کر سکتے ہو۔"

وہ پوری توجہ سے میری ہدایات سُنتا رہا۔ مجھے دلدار آغا کا رہائشی پتا یاد تھا جو میں نے دہرایا لیکن جہانگیر کے مکان کے نمبروں کا علم نہ ہونے کی وجہ سے تفصیل سے اس کا محلِ وقوع بتانا پڑ گیا۔

اسی اثنا میں کاؤنٹر پر کام کرنے والی ٹیلی فون آپریٹر آگئی اور میں سینڈو کے ہمراہ نچلی منزل پر واقع اپنے دفتر کی طرف چل دیا۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ میرا دفتر تہ خانے میں سیٹھ حبیب کے دفتر کے آس پاس ہی واقع تھا لیکن اس دفتر میں داخل ہونے کا وہ میرا پہلا موقع تھا۔

وہ دفتر میرے ذہن میں موجود خاکے کے مطابق آراستہ اور پُرشکوہ تھا۔ بڑے کمرے میں دبیز قالین پر ایک وسیع و عریض میز کے عقب میں گھومنے والی منقش اور آرام دہ کرسی پڑی ہوئی تھی۔ میز کے آگے اسی ساخت کی مگر چار پیروں والی چھ کرسیاں موجود تھیں۔ کمرے میں روشنی ناکافی تھی۔ دو طرف دیواروں کے ساتھ پُرتکلف صوفے وغیرہ اس انداز میں رکھے گئے تھے کہ میز پر ہونے والے مذاکرات میں دخل انداز ہوئے بغیر کم از کم دو پارٹیاں بیک وقت الگ الگ انتظار کر سکتی تھیں۔ اپنی کرسی پر پہنچ کر میں نے میز کا جائزہ لیا تو وہاں ایک سادے پیڈ کے علاوہ کسی کاغذ یا فائل کا کوئی وجود نہیں تھا لیکن میز پر ایک جدید دفتر کے تمام لوازم آراستہ تھے۔ انٹرکام، ڈکٹا فون، فیکس مشین، ورڈ پراسیسر کے علاوہ کئی چیزیں ایسی تھیں جو میرے لیے اجنبی تھیں۔

اس بارے میں سینڈو سے کچھ پوچھنا نامناسب تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ مافیا کے حوالے سے ذہن میں جس قسم کے پُراسرار دفتر کا ذہن میں تصور پیدا ہو سکتا تھا وہ کمرا اس سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔

"تم جا سکتے ہو سینڈو!" میں نے اپنی نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنی ہدایات پر عمل درآمد کی رپورٹ اگلے دو گھنٹے میں مل جانی چاہیے۔"

اس نے احترام سے سر جھکایا اور دفتر سے نکل گیا۔

ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر میرے ذہن میں از خود کچھ رعونت سی ابھرنے لگی۔ اس وقت میں جرائم کی دنیا کا ایک مقتدر شخص بن چکا تھا۔ مافیا کا فلمی تصور ایک حقیقت کا روپ دھار کر میرے سامنے موجود تھا اور میں سیٹھ حبیب جیوانی کے علاوہ مافیا کے ہر رکن اور وفادار کا حاکمِ اعلیٰ بن چکا تھا۔ مافیا میں شرکت اور شی سے بغاوت کرنے سے پہلے میں شی میں کراچی یونٹ کا سربراہ تھا لیکن میری سربراہی صرف انتظامی امور اور ہدایات جاری کرنے تک محدود تھی۔ اس منصب کے ساتھ کوئی پُرشکوہ دفتر یا ٹریڈ لائن جیسی کاروباری آئیڈیسر نہیں تھی جہاں میں ایک کاروباری ادارے کے سربراہ کا دفتر سنبھال کر ڈنکے کی چوٹ پر اپنے آدمیوں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا۔

میری میز پر صرف اتنی روشنی تھی کہ نگاہوں پر زور نہیں پڑ رہا تھا ورنہ لکھنے پڑھنے کے لیے وہ روشنی ناکافی تھی۔ میں دیکھ چکا تھا کہ حبیب کے دفتر میں میز کے نیچے ہی روشنیوں کے سوئچ موجود تھے جن کی مدد سے حسبِ مرضی دفتر میں روشنی گھٹائی اور بڑھائی جا سکتی تھی۔ اس لیے میں نے اپنی میز کے نیچے ٹٹول کر وہ حصہ دریافت کر لیا جسے اس کمرے کا پاور کنٹرول یونٹ قرار دیا جا سکتا تھا۔

اس مقام پر روشنیوں کے چھ سوئچ موجود تھے جن کے ذریعے کمرے کے مخصوص حصوں کو منور کیا جا سکتا تھا۔ اسی مقام سے فون اور فیکس مشین کے تار بھی نکل رہے تھے اور وہیں پر دوسرے برقی آلات کو توانائی فراہم کرنے والے ساکٹ اور سوئچ لگے ہوئے تھے۔ میز پر روشنی میں اضافہ کرنے کے بعد میری نظر اپنے تدبر میں پڑے ہوئے ایک آلے پر پڑی۔ اس کا اوپری حصہ پیر سے چھوتے ہی دب گیا اور پیر ہٹاتے ہی اسپرنگ کے زیرِ اثر دوبارہ اپنی جگہ پر آگیا۔ چند مرتبہ کی کوشش کے بعد میں یہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ سوئچ میز پر رکھے ہوئے حساس ڈکٹا فون سے منسلک تھا جسے دبا کر دورانِ گفتگو کسی بھی لمحے آن کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح مخاطب کی لاعلمی میں اس سے کی جانے والی ساری گفتگو یا اس کے ضروری حصے صفائی سے ریکارڈ کیے جا سکتے تھے۔

میں اپنی میز اور اس کے لوازمات کے معائنے میں مصروف تھا کہ فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔

ریسیور اُٹھایا تو دوسری جانب سیٹھ حبیب موجود تھا۔ "دفتر میں پہلا دن مبارک ہو۔" میری ہیلو کے جواب میں اس کی آواز ابھری۔ "مصروفیت نہ ہو تو میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" وہ شاید خاص انٹرکام تھا۔

"میں تمھارے پاس آجاتا ہوں، تم کہاں سے بول رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"اپنے دفتر میں ہوں۔ یہ سرخ انٹرکام صرف میرے اور تمھارے دفتر کے درمیان رابطے کے لیے ہے۔ ایک طرف سے ریسیور اُٹھاتے ہی دوسری طرف بزر بول اٹھتا ہے۔" اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "تمھیں میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں میں خود تمھارے پاس آرہا ہوں۔"

سیٹھ حبیب کا وہ شائستہ انداز مجھے بہت پسند آیا۔ وہ میرا سربراہ تھا اور چاہتا تو بغیر اطلاع دیے میرے دفتر میں آسکتا تھا یا مجھے اپنے پاس طلب کر سکتا تھا لیکن اس نے اطلاع دے کر مجھ سے میرے ہی دفتر میں ملنے کا فیصلہ کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی عزتِ نفس کا خیال رکھنے کا عادی تھا اور یہ ایک بہت اچھی بات تھی جو جرائم پیشہ گروہوں میں عام طور پر مفقود ہوتی ہے۔

وہ میرے دفتر میں آیا تو میں نے میز کے پیچھے سے نکل کر تپاک سے اس کا استقبال کیا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کے جوابی رویے میں گرم جوشی نہیں تھی۔

"سنا ہے کہ آج تم بہت سویرے دفتر آگئے تھے؟" اس نے میرے مقابل بیٹھتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔ "میرا خیال تھا کہ دفتر نو بجے شروع ہوتا ہوگا لیکن تم کب پہنچے؟ میں ابھی ابھی آیا ہوں اور پتا چلا ہے کہ تم نے کئی آدمیوں کو کام پر لگا دیا ہے۔ خیریت تو ہے؟ تم نے آتے ہی کس مشن پر کام شروع کر دیا ہے؟" اس کا لہجہ تجسس آمیز تھا۔

"شی کے خلاف محاذ کل رات سے کھل گیا ہے۔ اسی بارے میں کارروائیاں کی ہیں۔" اس کا استفسار طلب اندازِ گفتگو مجھے پسند نہیں آیا تھا۔

"ابھی تم نئے ہو۔ ابتدا میں بڑے کام مشورے سے کیے جائیں تو مناسب ہوگا۔" اس کا لہجہ نہ ناصحانہ تھا اور نہ تحکمانہ بلکہ دونوں کے بین بین تھا۔

"میں تمھارے ساتھ ضرور نیا ہوں لیکن یہ کام میرے لیے نئے نہیں ہیں۔ جہاں ضرورت محسوس کروں گا تم سے ضرور مشورہ لیا کروں گا لیکن آج اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔"

اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکنیں نمودار ہو گئیں۔ "تمھیں معلوم ہے کہ میں اپنی مجبوری کی وجہ سے کسی کے سامنے نہیں آسکتا۔ میں خفیہ راستے سے دفتر آیا تھا۔ ابھی تک عملے کا کوئی آدمی نہیں آیا اس لیے نکل کر تمھارے کمرے میں آگیا۔ اب یہاں سے میری واپسی خفیہ راستے سے ہی ہوگی۔" میں چونک کر غیر ارادی طور پر اپنے عقب میں موجود سپاٹ دیوار کی طرف متوجہ ہوا تھا لیکن اس نے فوراً ہی مجھے ٹوک دیا۔ "یہ راستہ بھی اتنی آسانی سے نظر میں نہیں آئے گا۔ یہاں اس کا میکنیزم تمھیں سمجھا دوں گا لیکن اس وقت یہ سب بتانے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ میں اتنا بڑا خطرہ مول لے کر یہاں آیا تو اس کا کوئی اہم سبب بھی تھا۔ آج مال کی ایک کھیپ آرہی ہے اس کی وصولیابی کے لیے استعمال کی جانے والی نشانی میری میز کی دراز میں تھی۔ میں نے دفتر آکر سینڈو کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ اسے تم نے کہیں بھیجا ہوا ہے۔"

"یہ اطلاع تمھیں کس سے ملی؟" میں نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"ٹیلی فون آپریٹر نے بتایا تھا۔ تمھاری آمد کے بارے میں بھی اسی نے بتایا تھا۔"

"تمھیں آپریٹر کے بجائے براہِ راست مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔ اب سینڈو اور اس کے آدمی میرے چارج میں ہیں، ان کے بارے میں فیصلے کرنے کا اختیار بھی مجھی کو ہے۔"

میری وہ کھری بات اسے بری لگ گئی۔ "لیکن تم بہرحال مجھ کو جواب دہ ہو...."

"اس سے مجھے انکار نہیں۔" میں نے اس کی بات درمیان ہی سے اُچک کر پُرخلوص لہجے میں کہا۔ "میں تمھاری بالادستی کا پورا پورا احترام کرتا ہوں لیکن اب اپنے آدمیوں کے بارے میں تمھیں مجھ سے رجوع کرنا چاہیے۔ تم سینڈو کو براہِ راست ہدایات دیتے رہے تو وہ مجھے خاطر میں نہیں لائے گا۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ تمھارے تقرر کے بعد مجھے گھر بیٹھ جانا چاہیے؟" اس نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

"بدقسمتی سے میرا جواب اثبات میں ہے۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ "تم نے اپنی کچھ مجبوریوں کی وجہ سے ہی مجھے اپنی صفوں میں شامل کیا ہے اس لیے تمھیں مجھ پر اعتماد اور انحصار کرنا چاہیے۔"

"یہ ناممکن ہے!" وہ ترش لہجے میں بولا۔ "سینڈو سے براہِ راست بات کرنے کے حق میں دست بردار نہیں ہو سکتا۔ یہ نہ بھولو کہ تم کسی سرکاری ادارے کے ملازم نہیں ہو۔ یہاں کے ضابطے میری مرضی کے مطابق بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ حد ہے کہ آج تمھاری آمد کا پہلا دن ہے اور مجھے جس آدمی کی ضرورت ہے وہ غائب ہے۔"

"میں پورے احترام کے ساتھ کہوں گا کہ پھر تم سے انتخاب کی غلطی ہوئی ہے۔ میں پورے اختیار کے ساتھ کام کروں گا یا اپنا راستہ بدل لوں گا۔ توپ کے سائے میں تلوار پنپ سکتی ہے لیکن ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ آپس کی بے اعتمادی اور پس پردہ کارروائیاں سرکاری اداروں میں رواج پاتی ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کو کسی ڈسپلن کا پابند ہو کر ایک دوسرے پر بھروسا کرنا ہوتا ہے۔ اگر سینڈو اسی حد تک تمھاری عادت بن گیا ہے تو تم اسے اپنا نائب مقرر کر لو۔ میں خوشی کے ساتھ اسی سے اپنی ہدایات لیا کروں گا۔ کٹھ پتلی بننا میرے بس کا کام نہیں ہے۔ تمھیں تو گھر سے فون کر کے مجھے کام بتانا چاہیے تھا۔ یہ میری صوابدید پر ہوتا کہ میں کسے اس کام پر مقرر کرتا ہوں۔"

"آج تک مال کی وصولی اور تقسیم کا کام وہی کرتا رہا ہے...."

"اس لیے کہ میری شمولیت تک وہ تمھارا نمبر دو تھا، اب یہ ذمے داری تم نے مجھے سونپ دی ہے۔ میں نے بھی سینڈو کو کسی ذاتی کام سے نہیں بھیجا، وہ ہمارے مشترکہ مفاد کی مہم پر گیا ہے۔"

"کہاں گیا ہے وہ؟" سیٹھ حبیب میرے اندازِ گفتگو سے ناخوش تھا۔

جواب میں میں نے اسے نہ صرف سینڈو بلکہ عجائب گل خان والے معاملے سے بھی آگاہ کر دیا اور میری بات آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی جسے میں نے نظر انداز کر دیا۔

"میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ دلدار آغا ڈی ڈی نہیں ہے۔ ڈی ڈی مجھ سے بڑا پردہ نشین ہے۔ تم ایک غلط آدمی پر اپنا وقت برباد کر رہے ہو البتہ معراج دین ڈی ڈی کا آدمی ہو سکتا ہے اور یہ جہانگیر تو تمھارا وہی دوست ہے جس کے فلیٹ میں تم رہ رہے ہو۔ اس کا ہم سے یا ہمارے کام سے کیا تعلق ہے؟"

"میں چیلنج نہیں کرتا لیکن تم دیکھ لو گے کہ میری رائے وزن رکھتی ہے۔ شی کی پشت پر اس وقت دلدار آغا کا دماغ ہی کام کر رہا ہے۔ کل رات اس سے دو بار میرا تصادم ہوا ہے۔ جہانگیر کی حفاظت کا انتظام میں نے صرف اس لیے نہیں کیا کہ وہ میرا دوست ہے

بلکہ ڈی ڈی اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ شرف آباد والے واقعے کے زخموں کو وہ نہیں بھول سکا ہے۔ جہانگیر کے ذریعے وہ اس شخص تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے جو اسے زک پر زک دے رہا ہے۔"

"سمجھوتے آسان ہوتے ہیں۔ انھیں ختم کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بحث میں پڑنے کے بجائے میں اس معاملے کو تمھارے لیے ٹیسٹ کیس مقرر کیے دیتا ہوں۔ اب اس کے نتائج پر ہی ہمارے آئندہ تعلقات کا انحصار ہوگا۔ اس کے نتائج برآمد ہونے تک میں تمھارے معاملات میں دخل نہیں دوں گا لیکن تمھیں وقت مقرر کرنا ہوگا کہ تم کب تک اپنی کوششوں کے نتائج حاصل کرنے کی اُمید کر رہے ہو؟"

"زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "حالانکہ تمھارے وسائل میسر آجانے کے بعد مجھے اُمید ہے کہ اب دلدار آغا زیادہ دیر آزاد نہیں رہ سکے گا۔ ویسے اُس کی صلح کی پیش کش کا کیا ہوا؟"

"ارادہ تھا کہ مروجہ طریقے کے مطابق اشتہاری پیغام اخبار میں چھپوا دیتا لیکن کُھلے انکار سے بہتر ہے کہ اس کے پیغام کو سرے سے نظرانداز کر دیا جائے۔" اُس نے کہا۔

"یہی بہتر ہے، مجھے اُمید ہے کہ میری گفتگو کا تم نے بُرا نہیں مانا ہوگا۔ اگر اپنے آدمیوں کو ہم دونوں بیک وقت ہدایات دیتے رہے تو کسی مرحلے پر ہمارے درمیان شدید غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ تمھیں جو کام لینا ہے، مجھے بتاؤ، میں ہر قیمت پر تمھارا کام سرانجام دوں گا۔ اگر سینڈو جلد واپس آگیا تو مال کی وصولیابی کے لیے میں اسی کو بھیج دوں گا ورنہ خود جاؤں گا۔ میرے کسی فیصلے سے تمھیں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

"آج رات اولڈ کلفٹن پر ٹھیک آٹھ بجے ایک کار والے سے رابطہ کرنا ہوگا۔ یہ کاغذ اُسے دو گے تو مال وہ تمھارے حوالے کر دے گا۔" اُس نے جیب سے تہ کیا ہوا کاغذ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے کاغذ کھول کر دیکھا تو اس پر بال پین سے اردو اور انگریزی میں چند مہمل اور بے ربط فقرے لکھے ہوئے تھے۔ وہ کاغذ پورا نہیں تھا بلکہ کسی بڑے کاغذ سے پھاڑا گیا تھا۔ رازدارانہ لین دین کے لیے شناخت کا یہ ذریعہ بہت قدیم اور معتبر تھا۔ میں نے اندازہ لگالیا کہ اس نامکمل تحریر سے پھاڑا ہوا دوسرا ٹکڑا کار والے کی تحویل میں ہوگا۔ وہ دونوں ٹکڑوں کو ملا کر آنے والے کی اصلیت سے واقف ہو سکتا تھا۔ یہ طریقہ اس قدر محفوظ تھا کہ ایک کاغذ کے پھاڑے ہوئے دو ٹکڑوں سے کسی بھی تیسرے کاغذ کو پھاڑ لیا کاٹ کر ملانا ممکن نہیں تھا۔ مزید احتیاط کے طور پر کاغذ کو سادہ رکھنے کے بجائے اس پر بے ربط تحریر لکھ دی گئی تھی جس کا تسلسل جوڑ ملنے کے بعد دوسری شہادت کا درجہ رکھتا تھا۔

"کار کی شناخت کیسے ہوگی؟" میں نے وہ کاغذ تہ کر کے دوبارہ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اس کے پچھلے پہیے کو جیک لگا کر داہنا پہیہ نکال لیا گیا ہوگا۔ اس کے ساتھ اُٹھے ہوئے بونٹ پر کوئی شخص ریڈی ایٹر میں پانی دیکھ رہا ہوگا۔ اسی سے ملنا ہوگا۔"

میں اس طریقۂ کار پر دل ہی دل میں مسکرایا۔ اولڈ کلفٹن پر اتفاقاً پنکچر ہو جانے والی کسی کار سے فرق رکھنے کے لیے بونٹ اٹھا کر ریڈی ایٹر والا کام شامل کیا گیا تھا کیونکہ کسی بھی پنکچر ہونے والی کار کا بونٹ نہیں بلکہ ڈکی کھولی جاتی ہے تاکہ جیک پانا اور فاضل ٹائر وغیرہ نکالا جا سکے۔

"مال کہاں پہنچانا ہے؟" میں نے اگلا سوال کیا۔

"سینڈو جانتا ہے۔ اگر تم کو خود جانا پڑے تو پیکٹ سیدھا اپنے دفتر میں لے آنا۔ جب سینڈو سے رابطہ ہو تو پیکٹ اُس کے حوالے کر دینا۔ وہ اُسے ٹھکانے لگانے کا بندوبست کرے گا۔"

"تم واقعی اس پیکٹ کی آخری منزل سے لاعلم ہو یا مجھے نہیں بتانا چاہتے؟" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا۔

وہ چند ثانیوں تک خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "اصولاً یہ بات غلط ہے لیکن مجھے خود علم نہیں، تم میری مجبوری سے واقف ہو چکے ہو۔ میں جب بھی کہیں دیکھا یا پہچانا گیا، وہی میری آزادی کا آخری لمحہ ہوگا۔ جرمنی کی جیل میں میرے ہم شکل کی زندگی عذاب بنادی جائے گی اور مجھے انٹرپول کے ذریعے جرمن پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اسی وجہ سے میں آزادانہ نقل و حرکت سے گریز کرتا ہوں۔ مال کی تقسیم سینڈو کے ذمے ہے۔ مال دے کر رقم بھی وہی وصول کرتا ہے۔ مجھے اُس پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔"

"یہ اچھی بات ہے کہ تمھیں خود اس طریقۂ کار کی خامی کا احساس ہے۔ اب میں خوب صورتی کے ساتھ اس معاملے کو بھی سنبھال لوں گا ۔ ۔ ۔ یہ بتاؤ کہ تمھارے کی کلب کی رکنیت حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟" میں نے اسے ندامت سے بچانے کے لیے خود ہی اچانک موضوع تبدیل کر دیا۔

اس وقت تک میرے اور اُس کے درمیان ایسی ذہنی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی تھی جس کے تحت اس کے ساتھ کھلے دل سے ہر موضوع پر بات کی جا سکے۔ اس لیے ذہن میں فوری طور پر کی کلب کا نام ہی آسکا تھا جو نہ صرف ایک دلچسپ موضوع تھا بلکہ اس کے بارے میں میرے دل میں تجسس بھی موجود تھا۔

"رکنیت کے طریقے تو اب تم ہی وضع کرو گے!" پہلی بار اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "میں آج تک وہاں نہیں گیا۔ وہاں کا عملہ ابھی تک سینڈو کو جواب دہ تھا، تم اُن کے نگران ہو گے۔ وہ بڑی دلچسپ جگہ ہے، چاہو تو آج دیکھ بھال کے بہانے وہاں خوش گوار وقت گزار سکتے ہو۔"

"بنیادی طور پر وہاں کیا ہوتا ہے؟" میں نے اپنی معلومات میں اضافے کے لیے سوال کیا۔

"دراصل یہ جال اہم سرکاری عہدے داروں کے لیے بچھایا گیا ہے، بہت سے افسر بظاہر بہت سخت اور باکردار بنے پھرتے ہیں اور اونچی اونچی باتیں کرتے ہیں لیکن اندر سے حریص، بودے اور کھوکھلے ہوتے ہیں۔ انھیں گھیر کر وہاں لایا جاتا ہے۔ وہاں مخلوط دوستیاں ہوتی ہیں، شراب فراہم کی جاتی ہے، جوا ہوتا ہے۔ اس اڈے پر ہم خاصی بھاری رقم خرچ کر رہے ہیں۔ ہماری پسند کا ہر جواری وہاں جیتتا ہی رہتا ہے۔ جن سے گلوخلاصی حاصل کرنی ہو انھیں لمبی ہار کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہاں ہم کام کے افسروں کا تفصیلی ریکارڈ تیار کرتے ہیں اور پھر اُن سے کام لیتے ہیں۔ کوئی ہم سے آڑنے کی کوشش کرے تو پھر اُس کے کرتوتوں کا ریکارڈ اُسے ہماری ڈگڈگی پر ناچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔"

"وقت ملتے ہی میں اُدھر ضرور جاؤں گا۔ ایسے کسی حمام میں وقت گزارنے کا مجھے ابھی تک موقع نہیں ملا جہاں سب ایک جیسے ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمھاری مجبوری کی بنا پر سینڈو اس شہر پر راج کر رہا ہے۔"

"لیکن یہ یاد رکھنا کہ وہ ہمیشہ میرے اعتماد پر پورا اُترا ہے۔" اُس نے مجھے یاد دہانی کرائی۔ "یہ احساس ہر وقت اس کے ذہن پر چوکے لگاتا رہتا ہے کہ اسی کے مشورے کی بنا پر میری زندگی برباد ہوئی ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں ایک سازش کے تحت جیل سے فرار ہو گیا۔ جس دن بھی میرے ہم شکل کو قید سے رہائی ملی اور میں نے عملی زندگی میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا تو مجھے معاشرے میں ایک سزا یافتہ قیدی کے طور پر پہچانا جائے گا۔"

"تم بے فکر رہو!" میں نے اسے یقین دلایا۔ "اس کے خلاف میرے دل میں کوئی عناد نہیں ہے۔ اُسے میرے رویے سے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔ جس کی تم عزت کرتے ہو وہ میرے لیے بھی محترم ہی رہے گا۔"

"اب عملہ آنے لگا ہوگا۔ میں زیادہ دیر یہاں نہیں رُک سکتا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا پھر گھوم کر میز کے عقب میں میری کرسی کے قریب آگیا۔ میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

"اوہ خدایا!" اچانک ہی اس کے منہ سے ایک تحیر آمیز آواز اُبھری اور اُس نے جھپٹ کر میز کے نیچے لگا ہوا ایک سُرخ سوئچ آن کر دیا۔ "تم نے یہ پرائیویسی لائٹ آن نہیں کی تھی۔ کسی وقت بھی کوئی شخص دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر آسکتا تھا۔ غنیمت ہے کہ کسی کو اندر آنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ورنہ آج میرا کام خراب ہو جاتا۔"

"سوری چیف!" میں نے پُرخلوص انداز میں معذرت طلب کی۔ "مجھے اس کے بارے میں علم نہیں تھا اگر کوئی اور بات ایسی ہو تو مجھے اس سے بھی آگاہ کر دو۔"

"اس پرائیویسی سوئچ سے تمھارے دفتر کا دروازہ برقی لاک سے مقفل ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی باہر ایک سُرخ لیمپ روشن ہو جاتا ہے، جب تک سُرخ بتی روشن رہے گی، تمھارے دفتر میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ اس سوئچ سے ایک لائن ٹیلی فون آپریٹر تک بھی جاتی ہے، اس کے پاس جب تک سُرخ روشنی برقرار رہے گی، وہ باہر سے آنے والی کوئی کال بھی تم کو منتقل نہیں کرے گی بلکہ پیغامات نوٹ کرتی رہے گی۔"

"یہ تو شاید اس میز کا سب سے اہم سوئچ تھا جسے میں نظرانداز کر رہا تھا۔"

"میرا خیال تھا کہ تم نے یہ سوئچ آن کر لیا ہوگا۔ اسی لیے اپنا دفتر چھوڑنے سے پہلے میں نے انٹرکام پر تم سے بات کی تھی تاکہ تم سوئچ آن کر دو۔ اس کے بعد دوسرا اہم سوئچ اس پلّے کی اوٹ میں ہے۔" اُس نے میز کے داہنے پائے کے پیچھے ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے دبا دیا ہے۔ اب تم پلٹ کر پیچھے دیکھو۔"

میں بڑی سُرعت سے پیچھے گھوما تھا اور یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ دیوار کا تقریباً چار فٹ اونچا اور دو فٹ چوڑا حصّہ اپنی جگہ سے غائب ہو چکا تھا۔ آواز پیدا کیے بغیر دیوار کا وہ حصّہ اپنی جگہ سے یوں غائب ہوا تھا جیسے کبھی وہاں موجود ہی نہ رہا ہو۔ میں اس کا جائزہ لینے کے لیے اس تاریک خلا کی طرف بڑھا تو دیوار کا فرش میں دھنسا ہوا وہی حصّہ تیزی کے ساتھ اوپر اٹھ کر اپنی جگہ پر آگیا اور خلا معدوم ہو گئی۔

میں اس بار میز کی طرف پلٹا تو سیٹھ حبیب فاتحانہ انداز میں مُسکرا رہا تھا۔ "دوسری بار یہ بٹن دبانے سے دیوار اپنی جگہ پر آجاتی ہے۔ اسی قسم کا ایک اور بٹن دیوار کے پار خلا میں بائیں ہاتھ پر موجود ہے۔ اس راستے سے گزرنے کے بعد وہی بٹن دبا دیا جائے تو دیوار اپنی اصل جگہ پر آجاتی ہے لیکن اس سرنگ سے دفتر میں داخل ہونے کے لیے دیوار اس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں کھسکتی جب تک اس سوئچ میں مخصوص چابی لگا کر بٹن نہ دبایا جائے۔ یہ احتیاط اس لیے رکھی گئی ہے کہ محکمہ ٹیلی فون کا ادھر آنکلنے والا کوئی کارکن اتفاقیہ خفیہ راستہ دریافت نہ کر سکے۔"

"اور وہ چابی کہاں ہے؟" میں نے دلچسپی کے ساتھ سوال کیا۔

"تمھاری شناختی چابی ہی اس سوئچ میں لگے گی لیکن یہ بتادوں کہ تمھاری چابی میرے دفتر والے راستے کے سوئچ پر کام نہیں کرے گی۔" اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"حد ہو گئی ہے۔ مجھے کیا ضرورت ہے تمھارے دفتر میں

جانے کی؟" میں نے بُرا سا منہ بنا کے کہا۔ اس کی فراخدلانہ ہنسی نے میرے سر پر سے بڑا بوجھ ہٹا دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ملاقات کی ابتدا میں ہونے والی تلخ گفتگو کو اپنے ذہن سے جھٹک چکا تھا۔

"ضرورت تو نہیں ہے لیکن تجسس بُری چیز ہے!" اس نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "باہر سے کوئی بھی اس راستے کے سوئچ میں چابی لگائے گا تو دفتر میں تمھاری میز پر رکھا ہوا یہ الارم لیمپ جل اُٹھے گا۔ جب تک دفتر میں موجود یا باہر سے آنے والا اسے آف نہ کرے لیمپ جلتا رہے گا۔"

اُس نے میز پر رکھے ہوئے آرائشی لیمپ کو ٹیسٹ سوئچ سے روشن کیا تو پورا کمرا تیز روشنی سے بھر گیا۔ وہ روشنی اس قدر تیز تھی کہ اُسے نظر انداز کرنا ناممکن تھا۔ سیٹھ حبیب نے ٹیسٹ سوئچ سے انگلی ہٹائی تو لیمپ آف ہو گیا۔ پھر اُس نے مجھے اس خوب صورت لیمپ کے پیندے میں لگا ہوا وہ بٹن دکھایا جو لیمپ کے خودکار طریقے سے روشن ہونے کی صورت میں اُسے بُجھانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

"یہ سب اس قدر پُرکشش ہے کہ اسی وقت یہ راستہ استعمال کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ ڈان تھری تمھارے دفتر سے اسی راہ سے نکلا تھا؟"

"ظاہر ہے!" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "اس کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔"

"اور یہ کہاں نکلتا ہے؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"یہ سفر کرنے والے کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ ان زیرِ زمین سرنگوں میں تم میلوں دور نکل سکتے ہو۔ بعض مین ہول تو سڑکوں کے وسط میں کھلتے ہیں البتہ چند محفوظ مقامات پر کھلتے ہیں۔"

"میں بھی انھی کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ کسی ہنگامی ضرورت کے وقت کسی غلط مقام پر مین ہول سے برآمد ہوتا ہوا پکڑا جاؤں۔" میں نے اپنا اندیشہ اس پر ظاہر کر دیا۔

"خلا سے باہر نکلتے ہی داہنی طرف مڑ کر کیبل ٹرینچ میں داخل ہو گے تو پانچواں مین ہول ایک متعفن کوڑا گھر کے عقب میں کھلتا ہے، وہاں کسی بھی وقت کوئی نہیں ہوتا۔ کوڑا گھر کے پیچھے سے تمھیں نمودار ہوتا دیکھ کر لوگ یہی سمجھیں گے کہ تم پیشاب کر کے ادھر سے نکل رہے ہو لیکن کبھی بھی ضرورت پیش آ جائے تو استعمال کے بعد مین ہول کو احتیاط سے بند کرنا نہ بھولنا ورنہ وہ راستہ ہمیشہ کے لیے مسدود ہو کر رہ جائے گا۔"

"ابھی تم دفتر میں رکو گے یا واپس جاؤ گے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں نے اپنا کام پورا کر لیا۔ اب تم جانو اور تمھارا کام جانے، لیکن اتنا بتا دوں کہ شی کے معاملے میں محتاط رہ کر پیش قدمی کرو

ایسا نہ ہو کہ ٹھوکر کھانے کے بعد سنبھلنے کی مہلت بھی نہ ملے۔"

"تم بے فکر رہو، میں شی اور اس کے رکھوالوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"راستہ کھولو!" اُس نے خوش دلی کے ساتھ مجھے ہدایت کی اور میں نے میز کے داہنے پائے کے پیچھے ٹٹول کر سوئچ دبا دیا۔ دیوار میں دوبارہ خلا نمودار ہو گیا اور سیٹھ حبیب پُراعتماد انداز میں چلتا ہوا اس تاریک سُرنگ میں داخل ہو گیا جو اُس نے کیبل ٹرینچ کو ملانے کے لیے غالباً خود تعمیر کرائی تھی۔ باہر نکل کر شاید اس نے بیرونی بٹن استعمال کیا تھا کیونکہ دیوار فوراً ہی اپنی جگہ پر واپس آ گئی تھی۔

میں تھکے ہوئے انداز میں اپنی کرسی پر گر گیا۔ سیٹھ حبیب کے ساتھ اس غیر متوقع ملاقات نے ذہنی طور پر مجھے تھکا دیا تھا۔ اس سے میرا نیا نیا واسطہ پڑا تھا اور اس سے بات کرتے ہوئے مجھے ہر لمحہ اپنے جواب اور لب و لہجے کے معاملے میں محتاط رہنا پڑا تھا تاکہ اُسے میرے اوپر حاوی ہونے کا کوئی آسان موقع نہ مل سکے اور میرا خیال تھا کہ میں اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔

سگریٹ سلگا کر میں نے ٹیلی فون آپریٹر سے لائن مانگی تو اُس نے لائن مجھے ٹرانسفر کرنے سے قبل نہایت ادب سے آگاہ کیا کہ میری میز پر موجود دو فون بورڈ سے ہو کر آتے تھے اور تیسرا نمبر ڈائریکٹ تھا۔ میں نے آپریٹر کو لائن دینے سے روک دیا اور تیسری کوشش میں ڈائریکٹ فون تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

سلمیٰ سے بات کیے ہوئے مجھے خاصی دیر گزر گئی تھی۔ میں دوبارہ اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ اپنی محتاط طبیعت کی بنا پر میں نے وہ نمبر آپریٹر سے ملوانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

مسلسل کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد میرے کانوں میں سلمیٰ کی سہمی ہوئی آواز گونجی تھی۔

"کیا بات ہے؟ اس وقت تم بہت زیادہ خوف زدہ معلوم ہو رہی ہو؟" میں نے اس کی تنہائی اور مجبوری کا تصوّر کرتے ہوئے پُرتشویش لہجے میں دریافت کیا۔

"ہم اس وقت موت کے سائے میں سانس لے رہے ہیں۔" اس کی آواز مرتعش اور بہت دھیمی تھی۔ "میرا دل کہہ رہا ہے کہ آج کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ باہر کے حالات سخت مخدوش ہو چکے ہیں۔"

"کچھ تو بتاؤ کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟" اس کے لہجے نے مجھے پریشان کر دیا۔

"تمھاری ہدایت پر میں نے گھر میں موجود سارا اسلحہ ملازمین میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک چوکیدار جو سابق فوجی ہے، اسے رائفل [illegible] دے کر چھت پر بھیج دیا ہے۔ وہاں

ے وہ چھپ کر دُور تک کا جائزہ لے سکتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ ہمارے مکان کے گرد کچھ دیر سے دو مشتبہ آدمی چکر لگا رہے ہیں۔ انھوں نے ابھی تک پھاٹک پر تو طبع آزمائی نہیں کی لیکن وہ مسلسل اس کے اطراف میں منڈلا رہے ہیں۔ پہلے وہ اکٹھے تھے لیکن بعد میں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ چوکیدار کا خیال ہے کہ وہ اندر گھسنے کے لیے موقع کی تلاش میں ہیں۔ چوکیدار نے یہ بات دوسرے ملازموں کو بھی بتا دی ہے اور وہ سب بُری طرح سہمے ہوئے ہیں، چوکیدار بھی ہیجان میں مبتلا ہو گیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ زیادہ دیر تک اعصابی دباؤ برداشت نہ کر سکے گا۔ اگر اس نے ضرورت پیش آئے بغیر چھت پر سے گولی چلا کر ان میں سے کسی کو ہلاک یا زخمی کر دیا تو کیا ہو گا؟ جہانگیر کو اس حالت میں چھوڑ کر میں کہیں جا بھی نہیں سکتی۔"

"جہانگیر کیا کر رہا ہے؟" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ دو مشتبہ افراد کی وہاں موجودگی کی خبر نے مجھے بھی بوکھلا کر رکھ دیا تھا کیوں کہ مجھے دلدار آغا سے اتنی جلدی کسی شدید ردِّ عمل کی توقع نہیں تھی۔

"وہ مسکن دواؤں کے زیرِ اثر ابھی تک بے ہوش ہیں۔ وہ ہوش میں آ بھی گئے تو موجودہ حالت میں ذہنی طور پر پریشان ہونے کے علاوہ کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔"

"تم جہانگیر کو لے کر کسی اچھے پرائیویٹ اسپتال میں منتقل ہو جاؤ اور ملازمین کو چھٹی دے کر گھر مقفل کر دو۔" میں نے چند ثانیوں تک سوچنے کے بعد اسے مشورہ دیا۔

"گھر میں کم از کم میں اپنی مرضی یا تمھارے مشوروں سے اُلٹے سیدھے حفاظتی انتظامات تو کرا رہی ہوں۔ اسپتال میں تو ہم دونوں بالکل ہی بے دست و پا ہو کر رہ جائیں گے۔ ملاقات کے وقفے میں کوئی بھی اجنبی بلا روک ٹوک اندر آ کر ہمیں ہلاک کر سکتا ہے۔ اسپتال سے تو گھر ہی بہتر اور محفوظ ہے۔ تم نے کہا تھا کہ تمھارے آدمی بھی ہمارے گھر کی حفاظت کے لیے آنے والے ہیں وہ کہاں مر گئے؟ وہ آ جاتے تو کم از کم باہر سے بھی کچھ مدد ملنے کی امید ہو جاتی۔"

"میں بندوبست کر چکا ہوں لیکن ابھی تک مجھے تصدیق موصول نہیں ہوئی ہے۔" میں نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ تمھارے چوکیدار نے جن دو آدمیوں کو دیکھا ہو وہ میرے ہی آدمی ہوں۔"

"اور جو لوگ اسلحہ تان کر ہمارے سینوں پر چڑھ آئیں گے، ہو سکتا ہے کہ وہ بھی تمھارے ہی آدمی ہوں۔" وہ جلے کٹے روہانسے لہجے میں بولی۔ "آخر تم تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ کیا ہمارے مرنے کا انتظار کر رہے ہو؟" اس کی آواز میں موت کی دہشت اور بے رونقی رچی ہوئی تھی۔ اس کی کیفیت کا تصور تک محال تھا۔

اس لیے اس کا طنز میں خاموشی سے برداشت کر گیا۔ اس کی جگہ کوئی مضبوط اعصاب کا مرد بھی ہوتا تو بول گیا ہوتا۔

"میں چند منٹ بعد دوبارہ فون کرتا ہوں۔" سلسلہ موقوف کرتے کرتے مجھے اچانک دھیان آ گیا۔ "اس دوران میں اس پاگل کی تو کوئی کال نہیں آئی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں... لیکن میں اس کی طرف سے خوف زدہ ہوں۔ ابھی بھی میں نے ڈرتے ڈرتے ریسیور اٹھایا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ دوسری طرف سے کہیں وہی موذی نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے! تم حوصلہ رکھو! میں ابھی اپنے آدمیوں سے بات کر کے تم کو دوبارہ فون کرتا ہوں۔" اپنی بات مکمل کر کے میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے اپنی طرف سے سینڈو کو دو گھنٹے کی مہلت دی تھی۔ مگر یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ مجھے جلد از جلد اس کی رپورٹ درکار ہے۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ نہ اس کا پتا تھا اور نہ ہی عجائب گل خان واپس آیا تھا۔ سینڈو کو دیا ہوا وقت پورا ہونے میں کچھ دیر باقی تھی لیکن سلمیٰ سے گفتگو کے بعد میرے لیے ایک ایک لمحہ گزارنا دوبھر ہو رہا تھا اس لیے میں نے فون پر آپریٹر سے رابطہ قائم کر کے سینڈو کے بارے میں دریافت کیا۔

"وہ تو کافی دیر سے آئے ہوئے ہیں سر!" آپریٹر کی آواز سُنائی دی۔

"پھر وہ کہاں مرا ہوا ہے؟ میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔" میں ماؤتھ پیس میں دہاڑا۔

"وہ خود کلیئرنس کے منتظر ہیں سر!" آپریٹر کی گھگیائی ہوئی شکستہ آواز اُبھری۔ "آپ کے دفتر کی پرائیویسی لائٹ کافی دیر سے روشن ہے۔" میں نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

سیٹھ حبیب کا آن کیا ہوا پرائیویسی سوئچ میں آف کرنا قطعی بھول گیا تھا۔ میں نے ہاتھ مار کر اسے جیسے ہی آف کیا، دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور سینڈو اندر گھس آیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ دروازے سے لگا سُرخ روشنی معدوم ہونے کا انتظار کر رہا ہو۔

"میں دس منٹ سے باہر کھڑا ہوا تھا باس!" وہ میری قہربار نظروں کا سامنا کرتے ہی منمناتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کام کی بات کرو سینڈو! وقت برباد نہ کرو۔" میں نے اپنے احمقانہ اشتعال کو دباتے ہوئے کہا۔ غلطی خود میری تھی اور میں بلاوجہ دوسروں کو پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ یہ میری کرسی کا دبدبہ تھا کہ آپریٹر میری دھاڑ سن کر بوکھلا گئی تھی ورنہ وہ نہایت اطمینان سے مجھے اپنا دماغ درست رکھنے کا مشورہ دے سکتی تھی۔

"شہر کے حالات ایک دم بہت خراب ہو گئے ہیں باس!" وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔ "ہر طرف لسانی فسادات کی وبا تیک آگ

بھڑک اُٹھی ہے کئی علاقوں میں زبردست خون ریزی ہوئی ہے لوٹ مار کا سلسلہ بھی چل نکلا ہے۔ پورے شہر میں خبر پھیلی ہوئی ہے کہ مقامیوں کے ایک گروہ نے شہر کے مضافات میں ایک پنجابی آبادگار کے فارم پر حملہ کر کے فارم اور کاٹیج کو آگ لگا دی اور جو بھی ہاتھ آیا اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس خبر کے نتیجے میں شہر میں ہر طرف فسادات پھوٹ پڑے ہیں۔ ان گنت لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے ہیں...“

وہ بولتا رہا لیکن وہ خبر سُن کر میرا دماغ سُن ہو کر رہ گیا۔ دلدار آغا کے شیطانی دماغ نے پورے شہر سے اپنی شکست کا بھیانک انتقام لے لیا تھا۔ اس نے درست ہی کہا تھا کہ وہ پورے شہر کو خون میں نہلا دے گا۔ ہم بے بسی سے تماشا دیکھیں گے لیکن اس کی مکروہ سازش کو ناکام بنانے کے لیے کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔

”اس خبر کا تمھارے کام سے کیا تعلق ہے؟“ میں نے اس کی لرزہ خیز کہانی کو کاٹ کر سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ میرے وجود میں شکست کی تلخی گھلی جا رہی تھی اور دل بوجھل ہو گیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جھوٹی خبر پھیلا کر دلدار آغا نے شہر کا امن و سکون غارت کیا تھا لیکن اسے مایوسی اور درندگی کی اس انتہا پر پہنچانے میں میرا ہی ہاتھ تھا۔

”اخبارات کے ضمیمے آنے والے ہیں۔ مضافات میں تباہ کیا جانے والا شاہ باغ دلدار آغا کی ہی ملکیت تھا۔“ اس کی زبان سے یہ حقیقت سُن کر مجھے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ اس نے قلیل ترین مدت میں بڑی محنت سے حقائق کا سراغ لگایا تھا۔ ورنہ شہر کے فساد زدہ ماحول میں افواہوں کا سینہ چیر کر حقیقت دریافت کرنا آسان کام نہیں تھا۔

”دلدار آغا کہاں ہے؟“ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس کی کارکردگی کی بنا پر میرے دل میں اس کے لیے یک لخت عزت و احترام کے جذبات اُمڈ آئے تھے۔

”اس کا کہیں پتا نہیں ہے۔“ وہ کرسی سنبھال کر میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔ ”پچھلی رات اس کے مکان پر بھی زبردست حملہ ہوا تھا۔ کافی دیر تک دونوں طرف سے جم کر فائرنگ ہوتی رہی۔ دلدار آغا کے بیان کے مطابق حملہ آوروں نے دستی بم بھی استعمال کیے تھے جن سے اس کے احاطے کی دیوار کا ایک حصہ منہدم ہو گیا تھا لیکن پولیس کے پہنچنے سے پہلے حملہ آور فرار ہو چکے تھے۔ سڑکوں پر کئی جگہ خون کے دھبے موجود تھے لیکن پولیس کو نہ کوئی لاش مل سکی اور نہ ہی کوئی زخمی گرفتار ہوا۔ دلدار آغا نے اپنے بیان میں پولیس کو بتایا کہ نامعلوم حملہ آور اس کی جواں سال بیوی کو اٹھا لے گئے۔ نہ اس نے کسی پر شبے کا اظہار کیا اور نہ ہی شاہ باغ کی تباہی کے بارے میں کچھ بتایا۔ اس کا گھر لٹے ہوئے محاذِ جنگ کا سماں پیش کر رہا ہے۔ گھر پر صرف ملازمین ہیں ان کے بیان کے مطابق وہ سویرے ہی اپنی سیاہ پجیرو میں اسلحے کا بھاری ذخیرہ لے کر کسی نامعلوم سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ کورنگی میں اس کی دواساز فیکٹری پر بھی چھاپا مارا گیا لیکن وہ سرے سے وہاں پہنچا ہی نہیں تھا۔ پورے شہر میں انتظامیہ وسیع پیمانے پر اس کی تلاش میں سرگرداں ہے تاکہ فسادات پر قابو پانے کے لیے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر افواہوں کے خلاف اس کا انٹرویو پیش کیا جا سکے لیکن وہ لاپتا ہے۔“

وہ بڑی بھیانک خبریں لے کر آیا تھا جنھوں نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ امیر دادا کی ہلاکت پر ہونے والے لسانی فسادات کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ دلدار آغا نے اپنے انتقام کی آگ کو سرد کرنے کے لیے شہر کی ہنستی کھیلتی بستیوں کو نفرت اور عداوت کی ہولناک آگ میں جھونک دیا تھا۔ وطن، مذہب اور رشتوں کو فراموش کر کے پورا شہر آگ و خون کی تعصب آمیز ہولی کھیلنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

موت کے اس سوداگر نے شہر میں موت بیچتے بیچتے اس کے مضافات میں موت کی مفت اور فراخ دلانہ تقسیم کا پورا پورا بندوبست کر لیا تھا جسے روکنا ہر ایک کے بس سے باہر تھا۔ میں جب دفتر آیا تو بظاہر راستے پُرسکون تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ افواہ منظم پیمانے پر اس قدر تیزی سے پھیلائی گئی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر ہی فسادات کی آگ میں جلنے لگا تھا۔

”تم نے اس پر ہاتھ ڈالنے میں ذرا سی تاخیر کر دی۔“ وہ توقف کے بعد متاسفانہ لہجے میں بولا۔ ”رات کو اس کے مکان پر حملے میں تمھارے ساتھ کتنے آدمی تھے؟“ وہ سوال اس نے بڑے اعتماد سے کیا تھا۔

”صرف ایک!“ میں نے آہستگی سے کہا ”یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ چوٹ کھا کر ایسی گھٹیا حرکت پر اُتر آئے گا۔ اب اس کتے کو ہر قیمت پر پکڑنا ہے۔“

”رات ہی تم نے مجھے اور میرے آدمیوں کو بلا لیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی لیکن وہی بات ہے کہ پہلے سے تمھیں کیا اندازہ ہو سکتا تھا؟ بہرحال کر جب شاہ باغ کے حوالے سے دلدار آغا کا نام سامنے آیا تو میں نے سمجھ لیا تھا کہ کھیل تم نے شروع کیا ہے اسی لیے صبح سویرے دفتر آ کر تم نے ہمیں کام سے لگا دیا۔“ اس نے ایک گہرا سانس لیا پھر بولا ”میں نے اپنے آدمی شہر میں پھیلا دیے ہیں۔ پولیس والوں نے بھی اس کے وارنٹ جاری کرا دیے ہیں۔ اس کا رات والے بیان میں شاہ باغ کی تباہی کا ذکر نہ کرنا اور صبح پجیرو میں اسلحہ لے کر روانہ ہونا اس کے خلاف جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پولیس والوں سے بچ جائے لیکن میرے آدمی شکاری کتوں کی طرح اس کی بو سونگھتے ہوئے اس تک پہنچ جائیں گے۔“

”اور جہانگیر کے مکان کا کیا ہوا؟“ اس کے آدمیوں کا ذکر سُن کر مجھے خوف زدہ سلمیٰ یاد آ گئی۔

”میں نے سب سے پہلے دو آدمی اُدھر بھیجے تھے پھر ... کلا تھا۔ وہ اپنی ڈیوٹی دے رہے ہوں گے۔“ اس نے اطمینان ... کہا۔ ”اس وقت شاہد اور میرو کی ڈیوٹی ہے رات میں کسی اور ... بندوبست کر لوں گا... ویسے عجائب گل خان کو تم نے ... بھیجا تھا؟ وہ ابھی تک واپس نہیں لوٹا ہے۔“ آخری سوال ... لہجے میں تشویش کے سائے لرز رہے تھے جیسے اسے ... عجائب گل خان کی سلامتی کی طرف سے اندیشہ لاحق ہو گیا ہو۔

اس وقت ہمارے درمیان گفتگو کا موضوع ایسا تھا ... میں ہم دونوں ... باتی طور پر بُری طرح ملوث تھے۔ اس ... غیر ارادی طور پر وہ مجھ سے بے تکلف ہو رہا تھا اور میں نے ... اس کی قابلِ رشک کارکردگی کی بنا پر اسے ٹوکنا مناسب نہ ... تھا۔ اس سے مراسم ... استوار کرنے کا یہ ایک سنہرا موقع تھا جس ... سے میں فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔

”اسے بھی دلدار آغا کے سلسلے میں کسی اور سمت میں بھیجا ہے۔ اس کا کام زیادہ مشکل نہیں ہے وہ کسی بھی وقت کامیاب ہو کر واپس آ سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”دلدار آغا کون ہے اور یہ اچانک تمھاری نظروں میں کیسے آ گیا؟“

وہ سیٹھ حبیب کا دستِ راست رہ چکا تھا اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ شی کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہو گا۔ ... لیے میں نے اسی سے سوال کیا۔ ”تم شی یا ڈی ڈی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”اس سے تو ہماری ساری کاروباری رقابت ہے مگر شی ... کا ہر راہ چھلاوا ہے۔ ہر طرف اس کا نام سُننے میں آتا ہے۔ ... لیکن آج تک کوئی ایسا آدمی نہیں مل سکا جو اس کی اصلیت جاننے کا دعوے دار ہو۔“

”دلدار آغا ہی ڈی ڈی کا اصل روپ ہے۔“ میرا انکشاف ... سُن کر وہ اپنی کرسی سے یوں اچھلا جیسے اسے یکایک کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

”یقین نہیں آتا۔“ وہ بے اعتباری سے بڑبڑایا۔ ”جسے ... آج تک سایہ سمجھ رہے تھے اس کی شہ رگ تمھارے ہاتھ میں ... دکی جبھی اس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے شہر میں ... فساد برپا کروا دیا ہے۔“

”آج اس شہر میں شی کے دفن ہونے کا دن ہو گا۔“ میں ... نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں اسے زیر کرنا اچھی طرح جانتا ہوں۔ ... اس کی موت میرے ہی ہاتھوں سے لکھی گئی ہے وہ اس نوشتۂ دیوار ... کو کسی قیمت پر نہ ٹال سکے گا۔“

”عجائب گل کے بارے میں ابھی تک تفصیل نہیں بتائی تم نے؟“ قدرے توقف کے بعد اس نے مجھے ٹوکا۔

میں نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر ڈائریکٹ فون کا ریسیور اُٹھا کر جہانگیر کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔ مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ شکست کے صدمے سے دلدار آغا کا دماغ اُلٹ گیا ہے۔ یہ بات اس کے لاشعور میں جم گئی تھی کہ اس کی تباہی میں جہانگیر کا بھی کوئی اہم کردار تھا اسی لیے وہ کئی بار فون کر کے سلمیٰ کو گالیاں دے چکا تھا اور اسے دھمکیاں بھی دی تھیں۔ وہ خونی دیوانہ کسی بھی لمحے اپنے بھاری اسلحے کے ساتھ جہانگیر کے گھر کا رخ کر سکتا تھا۔

سلمیٰ نے ریسیور اٹھایا تو خوف سے اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔

”حوصلہ رکھو سلمیٰ! باہر موجود دونوں آدمی تمھارے ہمدرد ہیں...“ میں نے اسے دلاسا دینا چاہا لیکن اس نے تڑپ کر میری بات فوراً ہی کاٹ دی۔

”خدا کے لیے فوراً یہاں پہنچو! اب مجھے کسی کی ہمدردی کی نہیں، مدد کی ضرورت ہے، ہمارے گھر پر موت نے دھاوا بول دیا ہے۔ اور کچھ نہیں کر سکتے تو تماشا دیکھنے کے لیے ہی آ جاؤ۔“ وہ بری طرح بلک رہی تھی۔

”کھل کر بات کرو، کیا ہوا ہے...؟“

”ایک پجیرو دو مرتبہ کسی گن سے مسلسل گولیاں برساتی ہوئی ہمارے گھر کے سامنے سے گزر چکی ہے۔ باہر والے دونوں آدمیوں کی بھاری فائرنگ نے ہی اسے فرار پہ مجبور کیا ہے... دیکھو سنو، وہ شاید پھر آ رہے ہیں...“ ریسیور پر فائرنگ کی گھن گرج نمایاں تھی۔ وہ یقیناً آٹومیٹک رائفل یا سب مشین گن کا فائر تھا۔

”چوکیدار کی رائفل کالی پجیرو والوں کا بال بھی بیکا نہیں کر سکی ہے۔“ وہ گولیوں کے شور میں سسک سسک کر بتا رہی تھی۔ ”وہ جتنی دیر میں کارتوس لوڈ کرتا ہے، وہ سیکڑوں گولیاں برساتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ باہر والے نہ ہوتے تو شاید پجیرو دیوار یا پھاٹک گرا کر اب تک اندر آ چکی ہوتی۔“

ریسیور پر فائرنگ کا شور جس طرح شروع ہوا تھا اسی طرح اچانک موقوف ہو گیا۔ شاید سینڈو کے آدمیوں نے تیسری بار بھی دلدار آغا کو جہانگیر کے مکان میں گھسنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

”تم ہمت سے کام لو سلمیٰ! میں فوراً آ رہا ہوں۔“ میں نے ریسیور کریڈل پر پھینکا اور کرسی چھوڑ دی۔

سینڈو بھی ہڑبڑا کر کرسی سے اُٹھا اور اس کی کرسی پیچھے اُلٹ گئی۔

”اسلحے کے ساتھ ساری نفری گاڑیوں میں نکالو، دلدار آغا کی کالی پجیرو دیکھ لی گئی ہے۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"یہ کس سے بات کر رہے تھے تم؟" میرے تیور دیکھ کر سینڈو کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔

"جاؤ!" میں آنکھیں نکال کر پوری قوت سے دہاڑا اور وہ کسی خارش زدہ کتے کی طرح دم دبا کر کمرے سے بھاگ گیا۔ میں اضطراب کے عالم میں بند کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ میں اسی لمحے پر لگا کر اس ملعون کے مدِمقابل پہنچ جاتا جس کی زندگی سے بھیڑیے بھی شرمانے لگے تھے۔

پھر اچانک ہی مجھے دلدار آغا کے ایک آدمی کی لاش سے حاصل کیے ہوئے ٹرانسمیٹر کا خیال آیا اور میں نے اسے اپنی جیب سے نکال کر آن کر دیا۔

دلدار آغا اس وقت اپنے خوف ناک مشن پر نکلا ہوا تھا۔ اسے شہر میں اپنے خونی درندوں سے ہر لمحہ رابطہ رکھنے کی ضرورت تھی اس لیے مجھے توقع تھی کہ میں اپریٹس پر اس کی آواز سن سکوں گا۔

"ڈی ڈی کالنگ فار الوری باڈی!" چند ثانیوں کے بعد ٹرانسمیٹر کے ریڈیائی شور میں وہ بھرائی ہوئی خوابناک آواز سن کر میرا دورانِ خون یک لخت تیز ہو گیا۔ "ہر وہ شخص جو میری آواز سن رہا ہے، یہ سمجھ لے کہ یہ ڈی ڈی کا پیغام ہے۔ آج جس نے ذرا بھی سستی دکھائی اس کی کھال کھنچوا دی جائے گی۔ اپنی ٹولیوں کے ساتھ چہروں پر نقاب لگا کر گاڑیوں میں نکلو اور جو سامنے آئے اسے خاک و خون میں نہلا دو! آج شہر میں اتنی لاشیں گراؤ کہ انھیں اٹھاتے اٹھاتے عبدالستار ایدھی کی جان آدھی رہ جائے۔ یہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارا ایک اپریٹس کسی غیر آدمی کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ میں موبائل ہوں، ہر شخص مجھے اسی اپریٹس پر رپورٹ دیتا رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اپریٹس حاصل کرنے والا بھی فساد کی زد میں آ کر مر چکا ہو۔ اس سے خوف زدہ ہونے کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی... اوور!"

وقفے وقفے سے مختلف افراد ڈی ڈی کو پیغام کی وصولی کی اطلاع دینے لگے۔ ان کی کل تعداد سات تھی جس کا مطلب تھا کہ فسادات کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے مزید سات ٹولیاں نقاب پوش قاتلوں کے روپ میں میدان میں اترنے والی ہیں۔ میرا دل چاہا کہ اسی وقت ٹرانسمیٹر پر ڈی ڈی کو للکاروں لیکن میں نے فوراً ہی اپنے جوش اور غصے پر قابو پا لیا۔ وہ مجھے بھول جانا چاہ رہا تھا اس لیے اپنی آواز سنا کر اسے چوکنا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میرے خاموش رہنے کی صورت میں وہ اپنے آدمیوں سے رابطے کے لیے اس ٹرانسمیٹر کا استعمال جاری رکھتا تو کم از کم مجھے ہر لمحے اس کے عزائم کا علم ہو سکتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جوشِ

انتقام سے مغلوب ہو کر اپنے نئے مسکن کی نشان دہی کر بیٹھتا۔

"تین گاڑیوں میں تیرہ آدمی تیار ہیں۔" پشت سے سنائی دینے والی سینڈو کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ میری لاعلمی میں نہ جانے کب دستک دے کر میرے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں میرے ہاتھ میں دبے ہوئے اپریٹس پر مرکوز تھیں لیکن وہ اس بارے میں مجھ سے کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔

"تم میری گاڑی میں میرے ساتھ آؤ گے۔ باقی گاڑیاں ہمیں فالو کریں گی۔" میں نے دفتر سے نکلتے ہوئے اسے آگاہ کیا۔ "مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ سات گاڑیوں میں نقاب پوش اور مسلح لوگ شہر میں اندھا دھند فائرنگ کرنے کے مشن پر نکلے ہیں۔ راستے میں ایسی جو بھی گاڑی نظر آئے اسے چھلنی کر دیا جائے۔"

"تم اپنی گاڑی میں چلو! میں آدمیوں کو ہدایات دے کر آتا ہوں۔" وہ دوڑتا ہوا مجھ سے آگے نکل گیا۔

زینے عبور کرتے ہوئے میں تازہ صورتِ حال کے بارے میں بہت زیادہ فکر مند تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاہ باغ اور پھر اپنے مکان پر ہونے والے تصادم کے بعد وہ عملاً تنہا رہ گیا تھا۔ اپنے لیے افرادی قوت وہ معراج دین عرف ماجا کے ذریعے حاصل کرتا تھا جس کو ناکارہ کرنے کے لیے عجائب گل خان کو روانہ کر دیا گیا تھا پھر اس کی ایک آواز پر لبیک کہنے والے سات افراد کہاں سے ابل پڑے تھے۔

دفتر میں سناٹا ہو گیا تھا۔ ٹیلی فون آپریٹر کے علاوہ مجھے کہیں کوئی متنفس نظر نہیں آیا۔ شاید سینڈو نے اس مہم کے لیے سارے ہی آدمی سمیٹ لیے تھے۔

میں دفتر سے باہر آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شہر کے اس مصروف ترین کاروباری علاقے میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اِکا دُکا دو کانیں کھلی ہوئی تھیں ورنہ پورا بازار بند تھا۔ جہاں تِل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی وہاں صرف چند ہی کاریں نظر آ رہی تھیں۔ باقی جگہ خالی پڑی ہوئی تھی۔ فٹ پاتھ پر کئی جگہ سہمے ہوئے لوگوں کی ٹولیاں کھڑی ہوئی تبادلۂ خیال کر رہی تھیں اور مسجد کے میناروں کے عقب میں کہیں قریب ہی آتش زنی کا کثیف دھواں سیاہ ناگنوں کی طرح لہراتا ہوا آسمان کی جانب اٹھ رہا تھا۔ فضا خاموش اور بوجھل تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہاں بھی کسی لمحے کوئی طوفان پھٹ پڑنے والا تھا جس کی نہ شدت کا پتا تھا اور نہ سمت کا۔

میرے انجن اسٹارٹ کرنے تک سینڈو بھی دوڑتا ہوا آ گیا۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں لٹکے ہوئے تھیلے میں کلاشنکوف اور میگزین موجود تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ مافیا والے شہر کے وسط میں یوں دیدہ دلیری کے ساتھ اسلحے کا ذخیرہ رکھتے تھے۔

"عجائب گل ابھی تک نہیں لوٹا۔" کار کے حرکت میں آتے ہی سینڈو ایک بار پھر مضطربانہ لہجے میں بول پڑا۔ "ایسے موقع پر وہ بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔"

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے کہا۔ "وہ معراج دین کی تلاش میں گیا ہے..."

میری زبان سے معراج دین کا نام سنتے ہی سینڈو کا چہرہ اتر گیا۔ "پھر وہ کبھی واپس نہیں لوٹ سکے گا۔" وہ کمزور لہجے میں آہستہ سے بولا۔ "میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ کسی مصیبت سے دوچار ہو گیا ہے۔"

"کیوں؟ کیا معراج دین اسی قدر خطرناک آدمی ہے؟ دلدار آغا سے بھی زیادہ؟"

"دراصل ڈی ڈی کو وہی چلا رہا تھا ورنہ ہم اب تک شی کو کھا گئے ہوتے۔ اس کے پاس بہت زیادہ آدمی ہیں جو شہر میں شی کا مال کھاتے ہیں۔ کچھ عرصے سے معراج دین شہر کا ہوّا بنا ہوا ہے۔ وہ جہاں جاتا ہے وہاں ڈوری لگ جاتی ہے۔ عجائب گل اس کے مخبروں سے نہیں بچ سکا ہو گا۔"

"یہ ڈوری کیا ہوتی ہے؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"حصار سمجھ لو۔" وہ بولا۔ "وہ جہاں بھی موجود ہوتا ہے اس مقام پر آنے والے ہر راستے پر کم از کم ایک میل تک مخبروں کا جال پھیلا رہتا ہے اور جونہی کوئی مشتبہ آدمی ان کی حدود میں داخل ہوتا ہے اس کا تعاقب شروع کر کے فوراً ہی خبر ماجے کو پہنچا دی جاتی ہے۔ عجائب گل خان خود ان مخبروں کی نگاہ میں آ گیا ہو گا۔ وہ مسلح ہو گا اور پھر اس علاقے میں اپنی موجودگی کا کوئی معقول بہانہ بھی نہیں پیش کر سکا ہو گا اس لیے ماجے نے فوراً ہی اسے مروا دیا ہو گا۔ اپنے بارے میں وہ ذرا بھی خطرہ مول نہیں لیتا۔ اسی لیے شہر کے بدمعاشوں پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ بے چارہ عجائب گل خان بڑی بے بسی کی موت مارا گیا ہو گا۔" وہ اپنے ساتھی کارکن کے لیے افسردہ تھا۔

لیکن میری نگاہ میں اس واقعے کو صرف اور صرف مکافاتِ عمل قرار دیا جا سکتا تھا۔ عجائب گل خان نے ڈان تھری کے ایما پر سب انسپکٹر محمود جیسے ایماندار افسر کو ٹرک کے پہیوں کے نیچے روند کر ہلاک کیا تھا اور قدرت نے میرے ذریعے اس کا ہانکا کر کے اسے معراج دین کے بھیانک چنگل میں پہنچا دیا تھا۔ حساب برابر ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

میرے خیال میں عجائب گل کے انجام کے بارے میں سینڈو کا اندازہ درست تھا۔ معراج دین کا بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا اور وہ کسی اچھے وقت کی امید میں پوری طرح دلدار آغا کا ساتھ دے رہا تھا۔ اسی لیے میری توقع کے برعکس، دلدار آغا کی ایک کال پر فوراً ہی سات لبیک کہنے والوں نے اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ وہ سب چڑی کے غلام تھے جنھیں دلدار آغا اپنے مذموم مقاصد کے لیے بڑی بے رحمی سے استعمال کر رہا تھا۔

ایم اے جناح روڈ سنسان پڑی ہوئی تھی جس سڑک کو دن بھر عبور کرنا دشوار ہوتا تھا اس پر نیو کلاتھ مارکیٹ کے سامنے خالی چوبی پیٹیوں سے وکٹ بنا کر کچھ بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ گلیوں میں ہجوم لگے تھے۔ میں نے وہیں سے کار چند ریگر روڈ کی طرف گھما لی۔ چاروں گاڑیوں کا قافلہ سبک رفتاری سے بڑھتا رہا۔ بلند و بالا عمارتوں سے آگے آنے پر بائیں طرف کی عمارات کے عقب میں جا بجا دھوئیں کے بادل نظر آئے۔ کہیں ٹائر جلائے جا رہے تھے اور کہیں مال و املاک۔ انسان کی کھوپڑیوں میں شیطان حلول کر گیا تھا اور کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم شہر کا جائزہ لینے کے لیے آبادیوں میں سے گزرتے تو ہمارا کیا حشر کیا جاتا اس لیے ہم سیدھے چل کر صدر سے ہوتے ہوئے دوبارہ جناح روڈ کی طرف ہو لیے۔

دلدار آغا والا اپریٹس آن کیا ہوا ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا تھا۔ عجائب گل خان کے عبرت ناک انجام پر کچھ دیر کی اندوہناک خاموشی کے بعد سینڈو کو اس آلے کا خیال آ گیا۔

"یہ شاید شی والوں کا ہے۔ تمھیں کہاں سے مل گیا؟" اس نے افسردہ لہجے میں سوال کیا تھا۔

"کل رات کی لڑائی میں ہاتھ آیا تھا۔ شاید تم نے سن ہی لیا تھا کہ ڈی ڈی نے اپنے آدمیوں کو کیا حکم دیا ہے؟"

"ہاں! یہ اس شہر کی بڑی بدنصیبی ہے کہ اس کی لگامیں جو چاہتا ہے تھام لیتا ہے۔ اب کسی کو چلتے توے پر بیٹھ کر بھی بتا یا جائے کہ ساری سازش ایک آدمی کی ہے تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔"

"اب یہ دیکھنا ہے..." مجھے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑنا پڑا کیوں کہ ٹرانسمیٹر پر پیغام آ رہا تھا۔

"ڈی ڈی کے لیے طافو بول رہا ہوں۔ ہم لوگ طارق روڈ پر فائرنگ کرتے ہوئے نکلے ہیں۔ جلتی ہوئی

گاڑی سے اندھا دھند فائرنگ میں گولیاں بہت ضائع ہو رہی ہیں، اب شہیدِ ملت روڈ سے جمشید روڈ نکلنے کا ارادہ ہے، اس کے بعد شاید ہمارا میگزین ختم ہو جائے گا... اوور!"

"جمشید روڈ کو چھوڑ دو اور تین ہٹی اور لسبیلہ کے درمیانی علاقے میں اپنے آخری میگزین کی آخری گولی چلا کر لوٹ جاؤ۔ ایریٹس آن رکھنا، ضرورت ہوئی تو نئی ہدایات دوں گا۔ اوور اینڈ آل۔"

"انسانی جانوں سے زیادہ انھیں گولیاں ضائع ہونے کی فکر ہے۔" سینڈو بڑبڑایا۔

"اتنے پارسا ہم بھی نہیں ہیں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "دونوں میں تھوڑا سا ہی فرق ہے۔"

"ہم اس پر ہتھیار اٹھاتے ہیں جو ہمارے لیے خطرہ ہوتا ہے، جنگ میں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے لیکن یہ تو بلا امتیاز شہر میں قتل اور دہشت گردی کرتے پھر رہے ہیں نہتے لوگوں کو گولیوں سے بھوننا تو کھلی نامردی ہے۔"

"کاش یہ ہماری موجودگی میں جہانگیر کے مکان کا رُخ کرے تو پھر تم دیکھو گے کہ دلدار آغا کے حشر سے موت بھی پناہ مانگے گی۔" یک بیک میرا خون کھول اُٹھا۔

اس لمحے مجھے کافی دیر بعد غزالہ کا خیال آیا تھا ورنہ سلمیٰ اور جہانگیر کی سلامتی کی فکر میں پڑ کر میں اسے بھول ہی گیا تھا۔

وہ میری خاطر اپنا گھر بار چھوڑ کر در بدر ہو چکی تھی، کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں تھی، شہر میں ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی، انسان درندے بنتے جا رہے تھے، ان حالات میں غزالہ کو بے پناہ دشواریاں پیش آ سکتی تھیں لیکن غنیمت یہ تھا کہ کراچی اس کے لیے اجنبی شہر نہیں تھا۔ اگر اسے موقع ملتا تو وہ جہانگیر کے گھر بھی پہنچ سکتی تھی، اس اعتبار سے اس وقت میرے لیے جہانگیر کا گھر بربادیوں کے سمندر میں امن کے جزیرے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

شورش اور ہنگاموں سے بچتے بچاتے آخر کار ہم جہانگیر کے مکان پر پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ میں نے اپنی گاڑی پھاٹک پر روک دی اور ہارن بجایا تو سینڈو کے بھیجے ہوئے دونوں آدمی اپنے آدمیوں اور گاڑیوں کو پہچان کر اپنی کمین گاہوں سے نکل کر سامنے آ گئے، انھوں نے مجھے بہت ادب سے سلام کیا تھا جیسے وہ مجھے پہچان گئے ہوں لیکن میرے لیے ان کے چہرے قطعی اجنبی اور نئے تھے۔

"کیا صورتِ حال ہے؟" میں نے جذبات سے عاری لہجے میں سوال کیا۔

"ایک کالی پجیرو تین بار مکان میں گھسنے کی کوشش کر چکی ہے وہ لوگ خود کار رائفل چلاتے ہوئے آئے مگر ہر بار انھیں بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا، گاڑی کی باڈی ہماری گولیوں سے چھلنی ہو چکی ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"آخری بار وہ کتنی دیر پہلے آئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"بیس پچیس منٹ ہو گئے، شاید اب وہ واپس جا چکے ہیں، انھوں نے تینوں حملے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کیے تھے، میں نے اپنی گاڑی میں علاقے کا ایک راؤنڈ بھی لگا لیا ہے لیکن میدان صاف ہے۔"

"اس خیال میں نہ رہنا۔ وہ پھر واپس پلٹ سکتے ہیں۔ چوکنے رہو اور ضرورت ہو تو پچھلی کسی گاڑی سے گولیاں لے لو، شام تک تمھیں یہیں رہنا ہے۔"

وہ دونوں سر جھکا کر واپس چلے گئے۔

سلمیٰ کے چوکیدار نے تیسرے ہارن کے بعد ڈرتے ڈرتے اندر ہی سے چلا کر سوال کیا تھا، میرے لیے وہ ایک نازک مرحلہ تھا، ڈینی کہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، بیٹراک کے نام سے صرف سینڈو واقف تھا جب کہ مافیا کے دوسرے کارندوں کے لیے میں صرف شوٹر تھا، اس لیے کئی مکالمات کے تبادلے کے بعد ذیلی دروازہ کھلنے کی نوبت آ سکی، چوکیدار کے ہاتھ میں بھری ہوئی رائفل تیار تھی اور اس کے پیچھے سلمیٰ پستول لیے کھڑی تھی۔ خوف سے اس کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا، آنکھیں ویران تھیں اور پورا بدن بیدِ مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔

"یہ... یہ کون لوگ ہیں؟" اس نے پستول کی نال سے دوسری گاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پھنسی پھنسی اور خوفزدہ آواز میں سوال کیا۔

"پھاٹک کھلواؤ، یہ سب تمھارے محافظ ہیں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا اور ڈرائیونگ سیٹ سے نیچے اُتر گیا۔

"خود کو تماشا نہ بناؤ، اب اندر جا کر آرام کرو۔ میں انھیں کام سمجھا کر اندر آتا ہوں۔" میں نے سلمیٰ کے ہاتھ سے پستول لیتے ہوئے نرمی سے کہا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی برآمدے کی طرف چل دی، اس ایک ہی جھٹکے میں وہ برسوں کی بیمار اور عمر رسیدہ نظر آنے لگی تھی۔ دہشت نے آواز کی شوخی اور چہرے کی رونق تک نچوڑ لی تھی۔

شہر میں رونما ہونے والے واقعات کے پیشِ نظر گاڑیوں یا مسلح افراد کو باہر چھوڑنا مناسب نہیں تھا اس لیے میں نے گاڑیاں اس ترتیب سے اندر پورچ میں پارک کرائیں کہ ضرورت پیش آنے پر کسی کو چھیڑے بغیر اپنی کار باہر لے جا سکوں۔ پہلے سے موجود دو افراد کو بھی اندر بلا کر میں نے پھاٹک بند کرا دیا اور سینڈو کو مختصر سی ہدایات دے کر ایریٹس سمیت اندر چلا گیا۔ سینڈو کسی اطاعت شعار نائب کی طرح اپنے آدمیوں کو پھیلانے

...عروف ہو گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ مجھے جہانگیر کو پکارتے ہوئے اس کی ...ب گاہ تک جانا ہو گا تاکہ سلمیٰ میری آمد سے آگاہ ہو سکے ...ن وہ میرے انتظار میں ڈرائنگ روم کے ایک صوفے ...بیٹھی ہانپ رہی تھی۔

"آج میں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا ...مجھے پہلی بار اندازہ ہوا ہے کہ موت کا خوف کیا ...ہے۔" اس نے میرے بیٹھ جانے کے بعد گہرے ...ے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تمھارے دونوں آدمی ...ئے ہوتے تو ان پجیرو والوں نے ہمارا قیمہ بنا ڈالا ... اُف خدایا! کیسا بھیانک تجربہ تھا۔"

"جو کچھ ہوا۔ اسے بھول جاؤ۔" میں نے اپنے بجھے ...ئے دل کے ساتھ زبردستی کرتے ہوئے خوش دلی کے ...تھ کہا۔ "اب یہاں ہر وقت پیشہ ور مسلح محافظ موجود رہیں ...ے۔ تم نہا دھو کر آرام کرو، ورنہ ایسی ہی بہکی بہکی باتیں کرتی ...وگی۔"

"یہ اتنے سارے آدمی تم کہاں سے لے آئے؟ ...ب ہی جنگلی اور خونخوار نظر آ رہے ہیں۔" میرے کہنے پر ...س نے فوراً ہی اپنے رویے میں مثبت تبدیلی کا مظاہرہ ...کرنے کی کوشش کی تھی۔ خوف اور دہشت نے اسے ...اِس وقت موم کی ناک بنا کر رکھ دیا تھا جسے ذرا سے ...اشارے سے کسی بھی طرف موڑا جا سکتا تھا۔

"یہی لوگ کالی پجیرو والوں کو روک سکتے ہیں۔ اب ذرا ...ایک نظر جہانگیر کو بھی دیکھ لوں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی بھی ...لمحے مجھے یہاں سے اچانک روانہ ہونا پڑ جائے۔" میں نے جگہ ...چھوڑتے ہوئے کہا۔

"تو تم پھر چلے جاؤ گے؟" اس کی آواز میں ایک مرتبہ ...پھر مایوسی اُمڈ آئی۔

"یہ اسلحہ بردار لوگ ساری عمر یہیں نہیں بیٹھے رہیں ...گے۔ مجھے پجیرو والے پر ہاتھ ڈالنا ہے تاکہ ہمیشہ کے لیے ...اس خطرے کا سدِباب ہو جائے۔" میں دانستہ اسے شہر ...کے حالات سے آگاہ کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

وہ میرے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھی تھی، پھر ہم آہستہ ...آہستہ اس کی خواب گاہ میں پہنچے تو جہانگیر قابلِ رحم حالت میں بستر پر ...بے سُدھ پڑا ہوا تھا۔ اس کے ورم آلود چہرے پر ڈریسنگ ...کے نیچے سے جا بہ جا نیل جھانک رہے تھے سر پر بھی پٹی ...بندھی ہوئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ لباس کے نیچے بھی اس ...کا جسم زخموں سے ڈھکا ہوا تھا۔

"دیکھو کیا حالت ہوئی ہے ان کی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں تو اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ یہ زندہ سلامت گھر لوٹ آئے ورنہ انھوں نے تو مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

اسی لمحے ٹرانسمٹر پر پھر کوئی پیغام آنے لگا اور میں نے تیزی کے ساتھ خواب گاہ سے باہر نکل کر ایریٹس کا والیوم بڑھا دیا۔ اور اُس سے ابھرنے والی آواز واضح ہو گئی۔ ایگل ڈی ڈی سے رابطہ قائم کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کی آواز میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ اسی لیے مجھے اندازہ ہوا کہ اس وقت اس کی آواز مضمحل سی تھی۔

"لالو کھیت میں فائرنگ کرتے ہوئے ہم ایک ہجوم کے شدید پتھراؤ کی زد میں آ گئے۔" ڈی ڈی کی آواز سنتے ہی ایگل نے اپنی کہانی شروع کر دی۔ "گاڑی کے شیشے چکنا چور ہو گئے۔ ایک شیشہ میری پیشانی میں پیوست ہوا ہے، کئی پتھر بھی لگے ہیں۔ میرا ساتھی مجھ سے زیادہ زخمی ہے۔ زبردست فائرنگ کرنے کے باوجود ہم بہت مشکل سے نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اب ہم چوراہے سے مڑ کر غریب آباد کے راستے گلشنِ اقبال پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ وہاں سے واپسی ہو جائے گی کیونکہ ہم دونوں کے زخموں سے تیزی سے خون بہہ رہا ہے۔ ہم سے کوئی بھی زیادہ دیر تک ڈرائیونگ کرنے کے قابل نہیں ہے اور تیز فائرنگ کی وجہ سے سارے میگزین بھی خالی ہو گئے ہیں... اوور!"

"واپس چلے جاؤ۔" ڈی ڈی کی آواز میں جھلاہٹ تھی۔ "اب نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ ہتھیار چلانے والے پتھروں سے زخمی ہو رہے ہیں۔ گھر جاؤ اور آرام کرو، اپنے کام میں خود دیکھ لوں گا... اوور!"

"وہاں گلیوں میں بڑے بڑے ہجوم ہیں۔ پتھروں کی پوری پوری چادریں ہواؤں میں تیر رہی تھیں۔ ان سے بچنا کسی کے بس میں نہیں ہے پھر لوگ مرنے اور زخمی ہونے کے باوجود منتشر نہیں ہوئے۔ میرا مشورہ ہے کہ کسی پارٹی کو اُدھر نہ بھیجا جائے ان تخریب کاروں نے ہماری کوئی گاڑی پکڑ لی تو دشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں... اوور!"

"اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو... اوور اینڈ آل...!"

ایریٹس پر خاموشی طاری ہو گئی۔

سلمیٰ میرے قریب کھڑی حیرت سے وہ گفتگو سن رہی تھی۔ خاموشی ہوتے ہی اس نے مجھ سے سوالات شروع کر دیے اور میں بہ مشکل اسے مطمئن کر کے اندر واپس جانے پر آمادہ کر سکا۔ "تم بیڈ روم میں جاؤ۔ میں ایک دو آدمیوں کو مشورے کے لیے ڈرائنگ روم میں بلانا چاہتا ہوں۔" وہ چلی گئی تو میں نے لان سے سینڈو کو ڈرائنگ روم

میں بلالیا۔

"اس کے ستارے اچھے تھے کہ وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے اس علاقے سے نکل گیا۔ اب مشکل ہے کہ دوبارہ ادھر کا رخ کرے کالی پجیرو کی تو پولیس کو بھی تلاش ہے۔" اس نے آتے ہی کہا۔

"ہماری کامیابی کا انحصار صرف اس پر ہے۔" میں نے صوفے پر دراز ہو کر ٹرانسمٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں کچھ علم نہیں کہ وہ اس وقت شہر کے کس حصے میں ہے۔ جب تک اس کا سراغ نہ ملے، بلا وجہ سڑکوں پر مارے مارے پھرنا بے سود ہے۔ فی الحال ہم پوری نفری کے ساتھ یہیں رہیں گے۔"

تقریباً نصف گھنٹے بعد اپریٹس پر ڈی ڈی کی آواز ابھری تھی۔ وہ ایگل کو کال کر رہا تھا۔ اس کی کئی بار کی کوششوں کے بعد بھی دوسری طرف سے جواب نہیں ملا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ ایگل کو کاری زخم آئے تھے جن کے باعث وہ بیہوش ہو چکا تھا یا کسی اسپتال میں تھا اسی وجہ سے اس کا اپریٹس آف تھا۔

ڈی ڈی نے ایگل سے رابطہ قائم ہونے میں ناکامی پر کسی ابرار کو طلب کیا جس نے فوراً ہی جواب دیا۔

"ایگل بکواس کر رہا تھا۔" ڈی ڈی کہنے لگا۔ "میں اس وقت تین ہٹی کا پل عبور کر کے لالوکھیت سے گزر رہا ہوں۔ ویران سڑک پر ٹائر جل رہے ہیں کچھ گاڑیوں کے ڈھانچے بھی سلگ رہے ہیں۔ سڑک پر کافی پتھر پڑے ہوئے ہیں لیکن میں حفاظت سے گزر رہا ہوں۔ یہ ڈاک خانے کا چوراہا آگیا۔ یہاں ایک طرف ہجوم ہے، دوسری طرف پولیس، کچھ نعرے بازی کے ساتھ پتھراؤ بھی ہو رہا ہے مگر میرا بال بیکا بھی نہیں ہوا۔ مارکیٹ، نیرنگ اور اب میں اگلے چوراہے سے ایگل ہی کا راستہ لوں گا یہاں لوگ بہت ہیں۔"

اس مرحلے پر اپریٹس پر ڈی ڈی کی ایک بے ساختہ چیخ سنائی دی اور اس کی آواز معدوم ہو گئی۔ شاید کسی پتھر نے اس کے گھمنڈ کے ساتھ ہی اس کی کھوپڑی بھی توڑ دی تھی اور ٹرانسمٹر اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اسی لیے بٹن پر سے دباؤ ختم ہوتے ہی وہ اپنا سفرنامہ دوسروں کو سنانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

ابرار نے بار بار بے تابانہ انداز میں اپنے ڈی ڈی کے لیے پیغام نشر کیے لیکن دوسری طرف سناٹا چھایا رہا۔

ڈی ڈی اگر صرف زخمی ہوا تھا اور وہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو گیا تھا تو اس کی طرف سے اتنی طویل خاموشی بے معنی تھی۔ اسے کم از کم ابرار کو خاموش رہنے کا حکم ہی

دے دینا چاہیے تھا لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ٹرانسمٹر ڈی ڈی کے ہاتھ سے نکل کر باہر جا گرا تھا یا پھر وہ خود اس قابل نہیں رہا تھا کہ اپریٹس استعمال کر سکے۔

اس صورت حال کا تصوّر کر کے ہی میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

رازداری کے خبط میں مبتلا ڈی ڈی ہمیشہ سے دوسروں کے لیے ایک سایہ بنا ہوا تھا اور صرف اپنی آواز سے پہچانا جاتا تھا اس لیے یہ بات یقینی تھی کہ اس نے پجیرو میں اپنے ساتھ کسی کو نہیں لیا تھا تاکہ اس کی اصلیت بے نقاب نہ ہو سکے۔ اس نے اپنے گھر سے پجیرو میں جو اسلحہ لادا تھا اس کا بیشتر حصہ تو معراج دین عرف ملبجے کے آدمیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا لیکن دلدار آغا نے اپنی ضرورت کے لیے اس کی کچھ مقدار پجیرو میں بھی ضرور رکھی ہو گی۔ اس اسلحے کے ساتھ پہلے اس نے جہانگیر کے گھر پر یلغار کرنا چاہی اور تین ناکامیوں کے بعد دوسری راہ اختیار کر لی۔ اپنی پے در پے ناکامیوں کی بنا پر وہ انا پرست درندہ اس قدر حساس ہو گیا تھا کہ اس کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں کا برداشت کرنا بھی ناممکن ہو گیا تھا اس لیے جب ایگل نے اسے لالوکھیت میں اپنی بے بسی کی کہانی سنائی تو دلدار آغا کی شامت نے اسے گھیر لیا اور وہ اس علاقے سے گزرنے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا بیٹھا۔

اس نے خود کو ایگل سے برتر ظاہر کرنے کے لیے لالوکھیت میں داخل ہونے سے قبل اسی سے رابطہ قائم کرنا چاہا لیکن ناکامی کے بعد ابرار کو اپنے سفر کی تفصیل سنانے لگا۔ درحقیقت اس طرح وہ اپنے لیے کام کرنے والے، ملبجے کے سب آدمیوں کو سنانا چاہ رہا تھا کہ جس علاقے کو ایگل نے خطرناک قرار دیا، اس کے نزدیک وہ غیر اہم تھا۔

لیکن نیرنگ اور دس نمبر کے درمیان وہ کسی پتھر یا گولی کا نشانہ بن گیا۔ وہ اکیلا تھا اس لیے شاید پجیرو کو نہ سنبھال سکا اور گاڑی کسی چیز سے ٹکرا کر رک یا اُلٹ گئی، پھر شاید ہجوم بڑھا تو پجیرو میں اسلحہ نظر آیا، کچھ لوگ اسلحہ لے بھاگے، کسی نے ٹرانسمٹر اُٹھایا اور بقیہ لوگ اس اسلحہ بردار زخمی پر ٹوٹ پڑے جو ان کی آبادی کے درمیان سے وہ سب لیے جا رہا تھا۔ موت کے اس سوداگر کو وہ لوگ معاف نہیں کر سکتے تھے۔

"پجیرو سے یہ بولنے والا سیاہ آلہ جس نے بھی اُٹھایا ہے وہ میری آواز ضرور سن رہا ہو گا۔" میں نے بٹن دبا کر پہلی بار بولنا شروع کر دیا۔ "میں بھی پجیرو والے کا حشر جاننا چاہتا ہوں۔ اس آدمی سے میری التجا ہے کہ صرف تھوڑی دیر کے لیے جالی کے اوپر لگا ہوا سرخ بٹن دبا دے تاکہ میں بھی ساری آوازیں سن سکوں۔"

میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اپریٹس پر غضب ناک ہجوم کی آوازوں کے درمیان لرزہ خیز انسانی چیخیں سنائی دینے

کچھ لوگ شاید مفت میں ہاتھ لگنے والے اسلحے سے ہوائی فائرنگ کر رہے تھے مگر دلدار آغا کی روح کی گہرائیوں سے اُبھرنے والی چیخیں ان سب آوازوں پر بھاری تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پتھروں اور لاتوں سے اس کی ایک ایک ہڈی کو توڑا جا رہا ہو، اس کے بدن سے ایک ایک ریشہ الگ کیا جا رہا ہو۔ اپریٹس کے قریب موجود کچھ لوگ آوازے کس رہے تھے جو میرے علاوہ شاید جہانگیر کے آدمی بھی سُن رہے تھے۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے وجود پر سکون کی ایک چادر پھیلتی جا رہی ہو۔ مجھے دُکھ تھا کہ میں اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکا تھا، اس سے اپنے بدلے نہیں چکا سکا تھا لیکن موت کا وہ سوداگر جس طرح اپنی ہی بھڑکائی ہوئی آگ کا ایندھن بنا تھا وہ عبرت ناک تھا۔ ایسی سزا تو شاید میں اسے مر کر بھی نہ دے سکتا جس کا انتخاب اس نے خود کیا تھا۔

میرے لیے دلدار آغا عرف ڈی ڈی کا وہ روح فرسا انجام بہت اچانک اور غیر متوقع تھا لیکن اپنے سیاہ اعمال کی بدولت وہ ایسی ہی لرزہ خیز موت کا مستحق تھا بلکہ موت سے کہیں زیادہ وہ تو ایسی عبرت ناک زندگی کا حقدار تھا کہ اس کا سارا جسم چور چور کر کے اسے شہر کے کسی بڑے چوراہے پر بٹھایا جاتا اور اس وقت مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ لالوکھیت کے مشتعل لوگ اسے لاتوں اور تھپڑوں سے ہلاک ہی کرنے پر تُلے ہوئے تھے یا وہ بے غیرت شخص سارے جوڑ کھلنے کے بعد بھی کسی بہانے زندہ رہ جاتا۔

پھر اچانک ٹرانسمٹر خاموش ہو گیا۔

اپریٹس کے خاموش ہوتے ہی جہانگیر کے ڈرائنگ رُوم میں بھی موت کا بوجھل سکوت پھیل گیا۔ میرے ساتھ سینڈو بھی بالکل خاموش تھا۔ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی دلدار آغا یا ڈی ڈی کی موت کا ذرا بھی غم نہیں تھا لیکن کم از کم میرے ذہن میں یہ خیال ضرور سر اُبھار رہا تھا کہ انسان اس دنیا میں ہی جیتے جی کیسے کیسے اور کس طرح مکافاتِ عمل سے دوچار ہوتا ہے۔

دلدار آغا نے کراچی جیسے ہنستے کھیلتے شہر کو محض اپنے انتقامی جذبے کی تسکین کے لیے جس طرح افواہیں پھیلا کر اور اپنے نقاب پوش غنڈوں سے نہتے شہریوں پر گولیوں کی برسات کروا کے شہر میں ہولناک نسلی فساد کی آگ بھڑکائی تھی اس نے میرے ساتھ ہی شہر کی انتظامیہ کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ شہر والوں کی خوش نصیبی تھی کہ ذمّے دار اہل کاروں نے جلد ہی دلدار آغا کی تضاد بیانی کو سمجھ لیا تھا اور مشتعل مزاج، بے لگام فسادیوں کے ٹولوں کی مدھاؤ دھند سرگرمیوں کو روکنے کے لیے پورے شہر میں دلدار آغا کی تلاش کی مہم کا آغاز کر دیا تھا لیکن وہ خونی بھیڑیا ان کی گرفت میں نہ آسکا کیونکہ قدرت اسے خود بخود اس کے ایسے انجام کی

طرف دھکیل رہی تھی جو اس کے لمبورنگ اور داغ داغ ماضی سے پوری طرح میل کھاتا تھا۔

اسے پے در پے شکست کے کئی زخم لگے تھے جس کے سبب وہ انا پرست درندہ مشتعل ہو کر صحیح فیصلے کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا۔ اپنے آدمیوں سے لیاقت آباد یا لالوکھیت میں عوام کے اشتعال اور حوصلے کے بارے میں تشویش ناک خبریں سننے کے بعد محتاط ہونے کے بجائے اس نے اپنے آدمیوں کی فراہم کی ہوئی اطلاعات کو ان کی بزدلی اور کم ہمتی سے منسوب کیا اور انھیں جھوٹا ثابت کرنے کے لیے خود لیاقت آباد کی مرکزی شاہراہ سے گزرنے کا احمقانہ فیصلہ کر بیٹھا۔ اجنبیوں اور دہشت گردوں کے ہاتھوں اپنے جگر گوشوں، عزیزوں اور پیاروں کو ان کے خون میں غلطاں دیکھتے ہی اس علاقے کے لوگ اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر مشتعل ہو کر سڑکوں پر نکل آنے کی پرانی تاریخ رکھتے ہیں۔ ایسے ماحول میں دہشت گردوں اور سازشیوں کے لیے وہ علاقہ زخمی شیر کی کچھار بن جاتا ہے جہاں کبھی کبھی ہمدرد اور ہم نوا بھی قہر و غضب کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

پھر دلدار آغا تو مسلّمہ دہشت گرد اور تخریب کار تھا۔ فسادزدہ علاقے میں بدقسمتی یا اپنے مقدر کا نشانہ بننے کے وقت اس کے قبضے میں ایک لاسلکی اپریٹس موجود تھا، کالی پجیرو میں اسلحہ اور فاضل راؤنڈز کی بھاری مقدار موجود تھی اس لیے وہاں اس کے بدن کے ٹکڑے اُڑا دیے جانے کا قوی امکان تھا جس کی توثیق ٹرانسمٹر پر سنائی دی جانے والی آخری آوازوں سے بخوبی ہو جاتی تھی۔

دلدار آغا اپنے مقدر کی لڑائی ہار گیا تھا مگر حیرت پھر بھی شی کی رہی تھی۔ دلدار آغا کی موت کے حوالے سے اخبارات اور تفتیشی اداروں کی ساری توجہ اسی ایک امر پر مرکوز رہتی کہ متوفی کی گاڑی میں غیر قانونی اسلحے کی بھاری مقدار تھی کسی کو بھول کر بھی یہ دھیان نہ آتا کہ مرنے والا پاکستان میں ہیروئن کو فروغ دینے والا کسی ایسی ناپاک تنظیم کا سربراہ بھی ہو سکتا تھا جسے ایک بڑی عالمی طاقت کی مکمل سرپرستی اور بھرپور مالی اعانت حاصل تھی۔ اگر وہ مشتعل لوگوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے کے بجائے کسی طرح سے میرے آہنی پنجے میں آجاتا تو میں ٹھوس شواہد کے ساتھ اس کے تمام تہ در تہ چہرے بے نقاب کر کے اسے اس طرح قانون کے حوالے کرتا کہ اسے ہیروئن کے بارے میں اپنے گھناؤنے کردار کا خود ہی اعتراف کرنا پڑتا۔ اسے تو شاید قید یا زیادہ سے زیادہ انسانی جانوں کے اتلاف کے جرم میں پھانسی کی آسان سزا نصیب ہو جاتی لیکن اس کے ذریعے پاکستان میں شی ضرور بے نقاب ہو جاتی۔

اس نے اپنے لیے لرزہ خیز موت کا انتخاب کر کے مجھ سے وہ موقع چھین لیا تھا لیکن پھر بھی میرے سامنے ایک راہ باقی تھی۔ وہ شی کی سربراہی ڈی ڈی کے نام سے کرتا تھا لیکن سوسائٹی میں دلدار آغا کے نام سے پہچانا جاتا تھا اسی حیثیت میں وہ جاذب فارما سیوٹیکل

کا مالک بھی تھا۔ اس کی اور اس سے قبل اس کے مینیجر ہارون کی موت کے بعد یہ قیاس کرنا دشوار تھا کہ اس فیکٹری کے ذریعے ہارمونیم نامی کیپسولز میں ہیروئن بھر کر مقوی دوا کی آڑ میں اس کی باہر اسمگلنگ کا کاروبار جاری رہتا یا ٹھپ ہو جاتا۔ بہر حال اسی ایک لائن پر محنت کر کے میں کچھ نتائج حاصل کرنے کی امید کر سکتا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ سلطان شاہ پہلے ہی سے فیکٹری کے ملازمین میں شامل ہو چکا تھا۔

مگر وہ بعد کی بات تھی فوری طور پر فکر کی بات یہ تھی کہ غزالہ جو دلدار آغا کی منکوحہ بیوی تھی، اپنے شوہر کی مجرمانہ سرگرمیوں کی بنا پر اس کے گھر سے فرار ہو گئی تھی۔ وہ کہاں گئی تھی؟ یہ کسی کو علم نہیں تھا لیکن دلدار نے بھاری اسلحے کے ساتھ فرار ہونے سے قبل پولیس میں رپورٹ درج کرا دی تھی کہ نامعلوم حملہ آوروں نے ہتھیاروں اور دستی بموں سے حملہ کر کے اس کی نوجوان بیوی غزالہ کو اغوا کر لیا تھا۔

اگر اس کے گھر پر حملہ کرنے والا میں خود نہ ہوتا تو شاید رپورٹ میں درج کرائے جانے والے آخری سنگین الزام سے گمراہ ہو جاتا۔ اس واردات میں سلطان شاہ کم و بیش میرے ساتھ ہی ساتھ رہا تھا اور ہم دونوں نے ڈی ڈی کے ایک آدمی سے چھینے ہوئے ٹرانسمٹر پر غزالہ کے بارے میں ان لوگوں کی تمام گفتگو سنی تھی اس لیے میں غزالہ کی طرف سے فکر مند تھا۔ وہ آزاد ضرور ہو گئی تھی لیکن محفوظ نہیں تھی۔

دلدار کے گھریلو ملازمین اسے اچھی طرح پہچانتے تھے، دلدار کے بہت سے ملاقاتی بھی اس سے واقف رہے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بھی اسے دیکھ کر ایک نظر میں پہچان سکتا تھا۔ دوسری طرف دلدار کی موت کے بعد پولیس کے لیے یک بیک غزالہ کی ذات اہمیت اختیار کر جاتی اور وہ اپنے پورے وسائل اس جانب مرکوز کر دیتی۔

ہم دونوں خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور میرا دماغ انھی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے تو اپنی گاڑی کی چابی عجائب گل خان کو دے دی تھی اور سینڈو کے بیان کے مطابق وہ معراج دین کے ٹھکانے پر جا کر غالباً کام بھی آ گیا تھا پھر جب سلمٰی سے آخری بار فون پر بات کرنے کے بعد میں بے دھیانی میں باہر نکلا تو میری گاڑی وہاں کیسے موجود تھی؟

"عجائب گل چلا گیا تھا تو میری گاڑی کیوں موجود تھی؟ اس کی چابی بھی اگنیشن میں موجود تھی۔" میں نے اپنے ذہن پر زیادہ زور دینے کے بجائے سینڈو سے یہ سوال دریافت کر ڈالا۔

"شاید اسے تمہاری گاڑی پہچان لیے جانے کا ڈر ہو گا۔" اس نے مسمسی آواز میں کہا اور مجھے یاد آ گیا کہ میں نے جاتے جاتے اسے خود ہی تاکید کی تھی کہ نہ وہ خود پہچانا جائے اور نہ میری گاڑی کسی کی نظروں میں آئے۔

"اس نے تمہارے خوف سے زبان نہیں کھولی ہو گی لیکن باہر نکل کر اس نے تمہاری چابی تمہاری گاڑی میں چھوڑ دی اور نیچے گیراج سے جعلی نمبر پلیٹ والی ایک جیپ نکال کر لے گیا۔ پچھلے کے کاموں میں ہم اکثر وہی جیپ استعمال کرتے تھے۔ اگر عجائب گل پکڑا گیا ہو گا تو سمجھو کہ جیپ بھی گئی۔" اس نے اپنی بات مکمل کی۔

"جیپ کے بارے میں تم نے مجھے نہیں بتایا۔" میں نے اس پر آنکھیں نکال کر کہا۔

"جس وقت میں آدمیوں کو اکٹھا کر رہا تھا اسی وقت مجھے جیپ غائب ہونے کا علم ہوا تھا۔ اس وقت تم غصے سے آگ بگولا ہو رہے تھے اور اپنے احکام کی تعمیل سے پہلے کسی کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس لیے میں نے اپنی زبان بند رکھنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اس وقت کیسے خیال آ گیا اس کا؟" میرے موڈ میں نرمی محسوس کرتے ہی اس نے ایک سوال داغ دیا۔

وہ ایک بے ضرر سی بات تھی جس کا جواب دینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا لیکن سینڈو بہت خرانٹ آدمی تھا۔ وہ ابتدا ہی سے میری کمزوریوں کا اندازہ لگا کر فاصلہ ختم کرنا چاہ رہا تھا اس لیے میں نے سختی سے اسے جھڑک دیا۔ "جتنا پوچھا جائے اتنا ہی جواب دیا کرو، میں اپنے ماتحتوں سے سوال سننے کا عادی نہیں ہوں۔"

"میں خود بھی فالتو بات نہیں کرتا۔ دفتر میں تم نے خود ہی میرے بعض سوالات کے جواب دیے تھے اس لیے اس بار پھر زبان کھولنے کی ہمت کر بیٹھا۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"یہ بتاؤ مجھے کہ عجائب گل کے بارے میں مصدقہ خبر کب تک مل سکے گی؟" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد میں نے تفکر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"فی الحال ساری نفری یہاں ہمارے ساتھ موجود ہے، فرصت ملتے ہی عجائب گل کے بارے میں کھوج لگاؤں گا لیکن مجھے اس کے زندہ بچنے کی ذرا بھی امید نہیں ہے۔ وہ فرماں بردار ہونے کے ساتھ ساتھ بہادر بھی تھا لیکن اس میں مکاری یا چال بازی نام کو بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے طور پر پلان نہیں بنا سکتا۔ ہاں اسے جتنا سمجھا دیا جائے اس کام پر لفظ بہ لفظ اسی قدر عمل کر گزرتا ہے۔"

"دلدار آغا کی وجہ سے ہم سب یہاں آنے پر مجبور ہوئے تھے۔ اب اس کا خاتمہ ہو چکا ہے تو یہاں بھیڑ کی ضرورت نہیں رہی۔ تم اپنے آدمیوں کو واپس بھیج دو۔ انھی میں سے کسی کو عجائب گل کی خبر گیری پر مامور کر دو۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟" اس نے نشست چھوڑتے ہوئے سر جھکا کر سوال کیا

"تم میرے پاس ٹھہرو گے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "ابھی مجھے چند اور معاملات بھی نمٹانے ہیں۔ جس آدمی کو عجائب گل کی خبر گیری پر مامور کرو اسے یہاں کا نمبر دے دینا تاکہ مجھے فوراً خبر مل سکے۔"

میں نے ایک سادہ کاغذ پر جہانگیر کا نمبر لکھ کر اسے تھما دیا اور وہ باہر اپنے آدمیوں کی طرف چل دیا۔

وہ جوں ہی باہر نکلا سلمٰی فوراً اندرونی دروازے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔ یوں معلوم ہوا جیسے وہ دروازے سے لگی ساری گفتگو سنتی رہی ہو اور دوبارہ اندر لوٹنے کے لیے سینڈو کی روانگی کی منتظر رہی ہو۔

"تم جہانگیر کے پاس نہیں گئیں؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"انھیں دیکھ کر واپس لوٹ آئی تھی، وہ بے خبر سو رہے ہیں۔" وہ مجھ سے نظریں چراتے ہوئے ہراساں لہجے میں بولی۔ "جیسے جیسے تمھیں قریب سے دیکھنے کا موقع مل رہا ہے تمہاری ذات سے مجھے دہشت آنے لگی ہے۔ میں تو اس موذی کے خوف سے سہمی جا رہی تھی لیکن تم تو اس سے بھی چار ہاتھ آگے نظر آتے ہو۔ وہ گمنام تھا مگر تم میرے سامنے ہو۔"

وہ اس وقت تک واقعی اپنے بکھرے ہوئے اعصاب پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ تھوڑی دیر قبل پیش آنے والے روح فرسا واقعات اور دردناک موت کے تصور نے اس کی ذات کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے وہ سنجیدہ گفتگو کرنے کے موڈ میں نظر آ رہی تھی لیکن میں نے ہلکے سے مصنوعی قہقہے کے ساتھ موضوع کو مذاق میں ٹالتے ہوئے کہا۔ "غنیمت ہوا کہ یہ سارا خونی کھیل جلد ہی نمٹ گیا ورنہ تم اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگتیں۔"

"میں تو شاید کئی دن تک نارمل نہ ہو سکوں۔" وہ کوئی گزری ہوئی بات یاد کر کے بے ساختہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ "جب کالی بھیڑ گولیاں برسا رہی تھی تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ لوگ سامنے آنے والی ہر رکاوٹ کو روندتے ہوئے پھاٹک یا دیوار گرا کر اندر گھس آئیں گے..."

"لیکن تم نے دیکھ لیا کہ میرے آدمی نمٹنے کے لیے ڈھال بنے ہوئے تھے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر اسے یاد دلایا۔ "تم کو یقین ہی نہیں تھا کہ باہر بھی کوئی تمہاری حفاظت کر رہا ہے۔"

"یقین آ ہی نہیں سکتا تھا۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ "اب بھی وہ سب ایک خواب کی طرح معلوم ہو رہا ہے۔ تم طویل جلاوطنی کے بعد حال ہی میں باہر سے واپس آئے ہو۔ تمہارے شب و روز بڑی حد تک میرے سامنے ہیں۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ تمہارے ایک اشارے پر اتنے سارے مسلح اور خوفناک آدمی جمع ہو سکتے ہیں۔ میں نے بیڈ روم کی کھڑکی سے دیکھا ہے کہ ہمارا پورا لان بھرا ہوا ہے اور وہ سب ہی اپنی صورتوں سے سفاک قاتل اور درندے معلوم ہو رہے ہیں پھر یہ ٹرانسمٹر؟ یہ کہاں سے مل گیا تم کو؟"

"اس کا مطلب ہے کہ تم باقاعدہ میری جاسوسی کرتی رہی ہو... خیر وہ سب اب روانہ ہو جائیں گے۔ اب یہاں ان کی ضرورت نہیں رہی ہے۔"

"وہ رہیں یا چلے جائیں، میرا سوال اپنی جگہ رہے گا کہ وہ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اور تمہارے اس قدر اطاعت گزار کیوں ہیں کہ ضرورت پڑتے ہی اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر اپنے گھروں سے نکل آئے؟"

"کراچی میں جیب میں مال ہو تو ہر کام بہت آسانی سے ہو جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی میرا مخلص جاں نثار نہیں ہے۔ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ یہ سب کرائے کے بدمعاش ہیں۔ معاوضہ لے کر پوری تن دہی سے اپنا کام سرانجام دیتے ہیں غنیمت ہے کہ ضرورت پیش نہیں آئی ورنہ تم دیکھ لیتیں کہ جہانگیر کے خون کے پیاسوں کو تمہاری چار دیواری سے دور رکھنے کے لیے ضرورت پیش آ جاتی تو ان میں سے دو چار کے ڈھیر ہو جانے کے بعد بھی مزاحمت میں کمی نہ آتی۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "اس پورے شہر میں ایک جہانگیر ہی تو میرا جگری دوست رہ گیا ہے۔ اس کی ضرورت کے وقت بھی میں بے دریغ پیسہ نہ بہاتا تو میرا ضمیر مجھے عمر بھر اس بخیلی پر معاف نہ کرتا۔"

"پیسہ خرچ کیا تم نے؟" اس نے ایک بار پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "تمہارے سارے ڈالر تو میرے پاس ہیں پھر یہ رقم کہاں سے آئی تمہارے پاس؟"

میں پھر ہنس پڑا۔ "بچوں جیسے سوال نہ کرو سلمٰی! میں نے تمہارے سامنے اپنی جیبیں نہیں جھاڑی تھیں۔ بیشتر رقم تمہاری تحویل میں ضرور دے دی تھی لیکن میں بالکل تہی دست نہیں تھا۔ دو چار لاکھ اب بھی پھینک سکتا ہوں۔"

"اتنی بات بڑھ جانے کے بعد بھی تم مصر ہو کہ یہ جہانگیر کی کوئی کاروباری رقابت تھی؟"

"گندی کاروباری رقابت۔" میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ حریف بدقسمتی سے ہیروئن کا اسمگلر تھا۔ اسے شبہ تھا کہ اس کا مال جہانگیر نے پکڑوایا ہے۔ آڑ کاروباری رقابت کی لی گئی تھی لیکن سچ پوچھو تو یہ جہانگیر جیسے امن پسند شہری کے خلاف ایک گروہ بند مجرم کی کارروائی تھی جو خوش قسمتی سے ناکام

بنا دی گئی۔"
"جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے ڈئیر!" وہ تلخ لہجے میں بولی "تم بھول رہے ہو کہ میں تمہارے پاس موجود ٹرانسمٹر پر ڈی ڈی سے ایگل نامی کسی کارندے کی گفتگو سن چکی ہوں اور ڈی ڈی کوئی نیا نام نہیں ہے۔ ایک بار تم خود کہہ چکے ہو کہ غزالہ کو دلدار آغا نامی ایک بدمعاش نے اپنے شریفانہ بہروپ کا اسیر بنا لیا ہے جب کہ درحقیقت وہ ڈی ڈی کے نام سے شہر میں ہونے والے بے شمار جرائم کی سرپرستی کرتا ہے۔"

میں نے تھکے ہوئے انداز میں سر جھکا لیا۔ "اتنا کچھ سمجھ گئی ہو تو مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو؟" میری آواز کمزور اور لہجہ ندامت آمیز ہو گیا تھا۔ اس نے اچانک ہی میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ "میں روپوشی کی زندگی گزار رہا ہوں اسی لیے وہ مجھ پر ہاتھ نہ ڈال سکا لیکن اُسے کسی طرح میری اور جہانگیر کی گہری دوستی کا علم ہو گیا اور اس نے جہانگیر پر ہاتھ ڈال دیا تاکہ مجھے سامنے آنے پر مجبور کر سکے لیکن کل کے اخبارات سے تمھیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے کس طرح جہانگیر کو اس کے چنگل سے بچایا ہے لیکن پھر بھی مجھے قلق ہے کہ جہانگیر کو محض مجھ سے دوستی رکھنے کی وجہ سے تشدد سہنا پڑا..."

"میری باتوں کا غلط مفہوم اخذ نہ کرو۔" وہ میری بات کاٹ کر جلدی سے بولی۔ "جو کچھ ہوا، وہ تمہارے بس سے باہر تھا۔ تم نے دوستی کا پورا حق ادا کیا ہے لیکن مجھے شکوہ اس بات کا ہے کہ تم اب بھی مجھ سے حقیقت چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں اتنی بے وقوف تو نہیں ہوں۔"

"یہ میری نہیں، جہانگیر کے دماغ کی اپج تھی۔ میں اصل بات بتا کر اسے تمھاری نظروں میں جھوٹا کیسے بنا سکتا تھا؟"

"لیکن اب کیا ہوا؟ ٹرانسمٹر پر آنے والی کال نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔"

"وہ میرے بس سے باہر تھا۔ تم نے یاد دلایا تو میں نے بلاوجہ بحث جاری نہیں رکھی، ہتھیار ڈال دیے لیکن یہ نہ سمجھنا کہ باہر موجود نفری کو میں نے غزالہ کے لیے جمع کیا تھا، یہ سب صرف اور صرف تمھیں اور تمہارے گھر کو بچانے کے لیے یہاں لائے گئے تھے اور اب واپس لوٹ جائیں گے۔"

"یہ میں نے کب کہا؟" اس نے تیز لہجے میں چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا پھر فوراً ہی نرم پڑتے ہوئے بولی۔ "میں نے ڈرائنگ روم سے باہر چھپ کر ڈی ڈی کی اچانک چیخ کے علاوہ وہ کربناک آوازیں بھی سنی تھیں جو آخر میں تمھاری فرمائش پر کسی بلوائی نے جالی کے اوپر لگا ہوا سرخ بٹن دبا کر سنوائی تھیں۔ ڈی ڈی تو جہنم واصل ہو گیا مگر اب غزالہ کہاں ہے؟"

"وہ اس کے اصل روپ سے واقف ہونے کے بعد اسے چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن ڈی ڈی نے اسے اپنے گھر میں قید کر لیا۔ کل رات میں ادھر گیا تو اندر گولیاں چل رہی تھیں اور باہر ہر طرف ڈی ڈی کے مسلح آدمی پھیلے ہوئے تھے جن پر میں نے دھاوا بول دیا۔ اس ہڑبونگ میں غزالہ کو وہاں سے فرار کا موقع مل گیا اور اب وہ لاپتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس اور دلدار آغا کے حمایتیوں سے بچتی بچاتی جلد ہی آملے۔"

"تم کرائے کے ان بدمعاشوں کو اس کی تلاش اور حفاظت پر کیوں نہیں لگاتے؟" غزالہ کا ذکر آتے ہی اس کا فطری اور نسوانی تجسّس بیدار ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی اس کے لہجے میں غزالہ کے لیے تحقیر کا ہلکا سا رنگ بھی جھلک آیا تھا کیونکہ وہ خود میری ذات میں دلچسپی رکھتی تھی اور ہمیشہ سے اس معاملے میں غزالہ کو اپنا رقیب تصور کرتی تھی۔

"میں اس پر ان پیشہ ور خونیوں کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"اپنے دل کو خوش رکھنے کے لیے جو چاہو، وہ کہتے رہو لیکن تمھاری غزالہ کو اب دوسرے ہی مزے پڑ گئے ہیں۔ وہ ایسے ہی خونیوں، بدمعاشوں اور لڑاکا لوگوں میں خوش رہنے لگی ہے۔ ٹارزن کی بیٹی پہلے انگلینڈ میں روپوش ہو کر مار دھاڑ کرتی رہی، یہاں آئی تو ڈی ڈی سے بیاہ رچا لیا۔ اب غائب ہوئی ہے تو دیکھو کہ کس کے ساتھ سامنے آتی ہے؟"

میں خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ وہ کلمات مسز جہانگیر کے علاوہ کسی اور عورت نے ادا کیے ہوتے تو میں نے انگلیاں ڈال کر اس کا دہانہ کانوں تک چیر کر رکھ دیا ہوتا لیکن وہ میرے عزیز ترین دوست کی بیوی تھی، میں اس کا ممنون احسان آشنا تھا، میری وجہ سے اس کا شوہر موت کے منہ سے بال بال بچ کر زخموں سے نڈھال پڑا ہوا تھا، اس لیے میں نے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا، بس ہاتھ میں موجود سگریٹ کے بھرے ہوئے پیکٹ کو غیر ارادی طور پر مٹھی میں جکڑ کر پیس ڈالا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟ کیا ہوا تمھیں؟" سلمیٰ کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اخلاقاً مسکرا دیا۔ میری اس مسکراہٹ میں یقیناً کوئی خوفناک انداز پنہاں تھا کیوں وہ یکلخت اٹھی اور تیزی کے ساتھ ڈرائنگ روم سے نکلتی چلی گئی۔

میں نے مسلا ہوا پیکٹ بڑے ایش ٹرے میں ڈال دیا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی اداسی چھانے لگی تھی۔

جس سے انسان اپنا دل لگا بیٹھے، اس کی ذات کس قدر اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ اس کے خلاف کہا جانے والا ہر لفظ تیر بن کر انسان کے دل میں ترازو ہو جاتا ہے۔ نہ جانے سلمیٰ کو غزالہ سے

ایسی کیا پرخاش تھی کہ وہ میرے سامنے غزالہ کی توہین اور تذلیل کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔

میری نظروں میں غزالہ پھولوں سے زیادہ نازک، پریوں سے زیادہ حسین اور فرشتوں سے زیادہ پارسا اور دل ربا تھی جس کی صرف یادوں کے سہارے ہی ایک طویل عمر گزاری جا سکتی تھی۔

وہ جب تک میری محبت کا دم بھرتی رہی اس نے نگاہ بھر کر کسی دوسرے مرد کی طرف نہیں دیکھا اور جب تنہائیوں کے پرآشوب دور سے گھبرا کر اپنی آبرو کے تحفظ کے لیے اس نے روپ بدلے ہوئے ڈی ڈی کو اپنا شریک سفر بنانے کا فیصلہ کیا تو مجھے اپنے سائے سے بھی دور رہنے کی ہدایت کر دی کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک مشرقی عورت تھی جو ایک وقت میں صرف ایک ہی کی ہو کر رہتی ہے۔ دوسرے کو اپنے وجود کے لیے ایک گالی سمجھتی ہے پھر وقت نے اس کی نگاہوں سے سراب کے پردے سرکا دیے۔ اس نے دلدار آغا کا اصل روپ پہچان لیا تو اسے ٹھکرا کر دوبارہ میری طرف آنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس مرحلے پر نہ دلدار آغا کے رکھوالے اس کی راہ روک سکے، نہ بارودی اسلحہ اسے اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر سکا۔ اسے تو شاید یہ بھی یقین نہیں تھا کہ اگر وہ اپنی کشتیاں جلا دے گی تو میں اسے قبول کر لوں گا لیکن پھر بھی اس نے دلدار آغا کو ٹھکرا کر رات کی سیاہی میں کھلے آسمان کی بیکراں تاریکی میں پناہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔

مگر سلمیٰ ان سب باتوں، خوبیوں اور اچھائیوں کو نظر انداز کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ غزالہ کے کردار اور گفتار پر اس نے ہر وہ تہمت رکھ دی تھی جو اس کی مکروہ کھوپڑی میں جنم لے سکی تھی اور یہ میری بدنصیبی یا شاید غزالہ کی تقدیر تھی کہ میں سلمیٰ کی لگائی ہوئی ان تہمتوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک بار غزالہ کو میرے پاس پناہ لینے اور اپنی محبتوں کے چراغ روشن کرنے کا موقع مل گیا تو سلمیٰ خود کھسیائی ہوئی بلی کی طرح اپنے سکڑتے ہوئے سائے میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائے گی مگر اس کے لیے مجھے انتظار کرنا تھا۔ ایسا انتظار جس کی طوالت کا خود مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا مگر میرا وجدان کہتا تھا کہ غزالہ کسی بھی لمحے مجھ سے مل سکتی تھی۔

میں اپنے انھی خیالات کے گرداب میں پھنسا ہوا تھا کہ سینڈو اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس لوٹ آیا۔ اس نے سب لوگوں کو دفتر واپس روانہ کر دیا تھا اور انھی میں سے ایک شخص کو جلد از جلد عجائب گل خان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ہدایات دے کر اسے معلّج دین عرف ماجا کے اڈّے کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ اسے جہانگیر کے گھر کا فون نمبر دے دیا گیا تھا تاکہ وہ اپنی حاصل کی ہوئی معلومات براہ راست مجھے پہنچا سکے۔

"اب تم کیا کرو گے؟" اس کی کہانی سننے کے بعد میں نے خالی الذہنی کے عالم میں اس سے سوال کیا۔

"جو حکم ملے گا، وہی کروں گا، چاہو تو واپس لوٹ سکتا ہوں۔" اس نے سعادت مندانہ لہجے میں کہا۔

میں نے فوراً ہی سنبھالا لے لیا اور مجھے یاد آیا کہ اس سے فوری طور پر مجھے دو کام لینے تھے۔

سیٹھ حبیب جیوانی سے ٹریڈ لائن کے دفتر میں میری جو تلخ کلامی ہوئی اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ میں دلدار آغا کی اصل شخصیت سے واقف ہو کر اس کی راہ پر لگا ہوا تھا جبکہ سیٹھ حبیب کی نظروں میں شی کا سربراہ، ڈی ڈی، دلدار آغا سے الگ کوئی اور پُراسرار شخص تھا جس کے بارے میں پورے شہر میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ حبیب جیوانی کو اپنے اس نظریے پر اتنا پختہ یقین تھا کہ اس نے دلدار آغا کے معاملے کو میرے لیے ٹیسٹ کیس قرار دے کر مجھے اپنی بات ثابت کرنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت دی تھی اور اسی کے نتائج پر ہمارے آئندہ تعلقات کی نوعیت منحصر تھی۔ اس معاملے میں مجھے سُرخروئی حاصل ہوئی تھی۔ میں نے چوبیس گھنٹے سے بھی کم مدت گزرنے سے پہلے دلدار آغا کے بارے میں اپنے دعوے کو سچ ثابت کر دکھایا تھا اور مجھے پورا یقین تھا کہ سیٹھ حبیب کو کھسیائے ہوئے انداز میں میری برتری کو تسلیم ہی کرنا پڑتا مگر اسی کے ساتھ ساتھ میں نے تنظیم میں اپنی حیثیت منوانے کے لیے سینڈو کے کردار کو مسترد کرتے ہوئے اس رات اولڈ کلفٹن پر ہیروئن کی کھیپ کی وصولی اور تقسیم کا کام اپنے سر لے لیا تھا جو اس سے قبل بلا شرکت غیرے سینڈو کے ذمے تھا۔ اس کام میں وہ جو کچھ حبیب جیوانی کو بتا دیتا وہی حرفِ آخر ہوا کرتا تھا جب کہ میرا نظریہ یہ تھا کہ میری ماتحتی میں کام کرنے والا ہر شخص میرے احکام کا تابع تھا۔ حرفِ آخر صادر کرنے کا اختیار صرف اور صرف مجھ کو حاصل تھا جب کہ دوسروں کا کام، میری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو حقیقت کا روپ دینا تھا۔

کلفٹن کے علاقے سے مال وصول کرنا بظاہر کوئی دشوار کام نہیں تھا۔ کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر سے پھاڑا ہوا ایک حصّہ میرے پاس تھا جس کا دوسرا حصّہ فریق ثانی کی تحویل میں تھا۔ دونوں ٹکڑوں کے ملنے کے بعد ہی میری شناخت کا مرحلہ پورا ہو سکتا ہے۔ متعلقہ آدمی سے رجوع کے لیے مجھے رات کے آٹھ بجے اولڈ کلفٹن پہنچ کر ایسی اچھوتی گاڑی دیکھنی تھی جس کے عقب میں جیک لگا کر ایک پہیہ نکال دیا گیا ہو اور اسی کے ساتھ کار والا ٹائر تبدیل کرنے کے بجائے کار کا بانٹ اُٹھا کر ریڈی ایٹر میں پانی چیک کر رہا ہو۔ پھٹے ہوئے کاغذ سے شناخت ہو جانے کے بعد پارٹی سے مال وصول کرنا مشکل نہیں تھا۔ اصل مسئلہ حاصل ہونے والی ہیروئن کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ اس سے قبل وہ شعبہ آزادانہ طور پر سینڈو کے ذمے رہا تھا

لیکن میں نے خودسری میں اسے اپنے سر لے لیا تھا مگر مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ سینڈو سے مشورہ کیے بغیر میں اس کام کو سرانجام نہیں دے سکوں گا۔

مجھے سینڈو کے پیشہ ورانہ مشورے کی ضرورت تھی مگر میں اس سے سرسری طور پر بات کر کے سب کچھ اگلوانا چاہتا تھا اس لیے میں نے براہِ راست سوال کرنے کے بجائے کِی کلب کا ذکر چھیڑ دیا۔

میری زبان سے کِی کلب کا نام سُن کر اس کی سنجیدگی میں سرِمو بھی فرق نہیں آیا اور وہ بولا۔ "ڈیفنس کے علاقے میں رہنے والے معززین اور شرفا کو شکایت ہے کہ ایک منظم منصوبے کے تحت ان کے علاقے کو ہر موقع پر بدنام کیا جاتا ہے لیکن یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ اس علاقے میں وسیع و عریض پلاٹوں کی کثرت اور اپنی دُنیا میں آپ مگن رہنے والے طرزِ زندگی نے اس علاقے کو ہم لوگوں کے لیے محفوظ بنا دیا ہے۔ اوسطاً ہزار، پانچ سو شرفا کے درمیان اگر کوئی ایک آدھ قحبہ خانہ یا جوا گھر چل رہا ہو تو کسی کو کانوں کان بھی پتا نہیں چلتا۔ اس علاقے کی زرخیزی کا اصل سبب یہ ہے کہ مکین اپنی چار دیواری میں مست رہتے ہیں۔ کسی کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اس کے پڑوس میں کون رہتا ہے اور کیا کرتا ہے؟ پڑوسیوں کے بارے میں ساری معلومات کا انحصار گھریلو ملازمین اور ڈرائیوروں پر ہوتا ہے جو فرصت کے اوقات میں ایک دوسرے سے مل بیٹھنے کے مواقع نکال لیتے ہیں۔ ان سے حاصل ہونے والی بیشتر اہم معلومات کو ان کے مالکان محروم ذہنوں کی تخلیق کی ہوئی فرضی کہانیاں سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں اسی لیے زیرِ زمین دُنیا کا ہر آسودہ حال شخص اُدھر گھسنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ یہ ساری باتیں میں نے اس لیے کہیں کہ ہمارا کِی کلب بھی ساحلِ سمندر کے قریب کلفٹن اور ڈیفنس فیز فائیو کے سنگم پر واقع ہے۔ بڑی دلچسپ جگہ ہے، ابھی تک میں وہاں کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا اب جیسا تم چاہو گے، وہی ہوگا۔"

"پچھلی رات سے میں تھکا دینے والی بھاگ دوڑ میں مصروف رہا ہوں، میرا خیال ہے کہ آج کی شام وہیں گزاری جائے تو کچھ دھول جھڑ جائے گی۔ پروگرام کب شروع ہوتا ہے وہاں؟"

اس کے جواب سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرا وہ سوال بہت ناموزوں تھا لیکن سینڈو نے کسی ردِعمل کا مظاہرہ کیے بغیر کہا۔ "وہ کوئی روایتی کلب نہیں ہے جہاں ڈسکو، نیلے یا کوئی اسٹرپ ٹیز ہوتا ہو۔ وہ ایک فیملی کلب ہے جہاں ممبران کے علاوہ کسی اور کا داخلہ ناممکن ہے۔ وہاں لکھ پتی تاجروں سے اعلیٰ سرکاری حکام تک بہت سے لوگ آتے ہیں اور آپس میں بے تکلف گھرانے کے افراد کی طرح خوشگوار وقت گزار کر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے بہت سے مشاغل ہوتے ہیں۔ کچھ شراب کے رسیا ہیں، بعض پرانی عورتوں سے دوستی بڑھا کر خوشی محسوس کرتے ہیں، اکثر جُوا کھیلتے ہیں۔ وہاں کسی پر بھی کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔"

اس نے جو کچھ کہا، اس میں میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ حبیب جیوانی سے گفتگو کے بعد میں اپنے ذہن میں کِی کلب کی ایک تصویر بنا چکا تھا جس میں تین رنگ بہت نمایاں تھے۔ عورت، شراب اور قماربازی۔ لیکن سینڈو کو بتدریج اپنی راہ پر لانے کے لیے وہ ساری پیش بندی لازمی تھی۔

"مال بھی وہیں سے تقسیم کرتے ہو؟" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا اور وہ بے چینی کے ساتھ صوفے پر پہلو بدل کر رہ گیا۔

"مال کا کِی کلب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس نے متذبذب لہجے میں جواب دیا۔ "باہر سے آنے والا مال میں خود وصول کرتا ہوں اور اسے تقسیم کرنے کے لیے میرے اپنے ذرائع ہیں۔ نقد رقم لے کر پارٹیوں کو مال دیتا ہوں۔"

"مال کی طلب اور فراہمی کا کوئی شیڈول بھی ہوتا ہوگا؟" میں نے سوال کیا۔

"میں سمجھا نہیں!" اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ "شیڈول سے کیا مراد ہے تمہاری؟"

"فرض کرو کہ آج مال آجاتا ہے تو تم اسے کسی منڈی میں نیلام تو نہیں کرو گے۔ پہلی کھیپ تمہیں کسی کو دینی ہوگی۔ اس سے اگلی کوئی اور لے گا۔ میں اس کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔"

"شہر میں پانچ آدمی مجھ سے مال لیتے ہیں۔ . . ." اس نے قدرے توقف کے بعد کہنا شروع کیا لیکن میں نے سرد لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

"زبانی نہیں، یہ معلومات مجھے تحریری طور پر درکار ہیں۔ ان میں ہر پارٹی کا نرخ بھی ہونا چاہیے۔"

میرے ان الفاظ پر سینڈو کا چہرہ دُھواں ہو گیا۔ اس کا وہ اضطراری ردِعمل دیکھ کر میرے لیے اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ اس کے بارے میں میرے شبہات درست تھے۔ سیٹھ حبیب جیوانی کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھا کر وہ یقینی طور پر لین دین میں ہیرپھیر کرتا تھا جسے چھپائے رکھنا اسے محال نظر آرہا تھا۔

"نرخ تو سب کا ایک ہی ہے مگر مجھے دلالی بھی دینی پڑتی ہے۔ . . ." وہ کمزور لہجے میں بولا۔

"جب تم مال براہِ راست دیتے ہو تو دلالی کس بات کی؟" میں نے ترش لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "تم پرانے آدمی ہو، میں تمہاری عزت کرتا ہوں لیکن اسی وقت تک جب تک تم میرے ساتھ سیدھے سیدھے چلتے رہو۔ مجھے کوئی چکر دینے کی کوشش کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ کھُل کر بات کرو اور سچ بولتے چلے جاؤ۔"

"جن لوگوں نے ان پارٹیوں کو مجھ سے متعارف کرایا تھا، ان

یہ میرا قول ہے کہ ہر گرام پر انھیں کمیشن دوں گا۔" اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا لیکن میں اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ اس کی کھُلی بکواس تھی۔

"دیکھو سینڈو! تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں اپنے قریب جھوٹے آدمی کا سایہ تک برداشت نہیں کر سکتا، گردن توڑ کر اس کی لاش کسی گٹر میں ڈال دیتا ہوں۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ میرے آنے سے پہلے کیا ہوتا رہا۔ وہ تمہارے اور چیف کے معاملات تھے جس پر میں کوئی گرفت نہیں کروں گا لیکن مجھے اب صرف سچ درکار ہے اس پر کسی سمجھوتے کی گنجائش نہیں ہے۔"

وہ اچانک ہی میرے قدموں میں گر پڑا اور گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ "مجھے معاف کر دو، پہلے میں دو فیصد رقم اپنے پاس رکھ لیتا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہوگا، بلکہ میں تمہیں ہر بات سچ سچ بتا دوں گا۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے ماضی میں ہونے والی بے اعتدالیوں سے کوئی سروکار نہیں۔ تمہیں میرے سامنے کسی اعتراف کی ضرورت نہیں، بس اُٹھو اور سچ بولتے چلے جاؤ۔" اپنے قدموں میں پڑے ہوئے کسی انسان کو ٹھوکروں سے پرے دھکیلنا احترامِ آدمیت کے منافی تھا لیکن شی اور مافیا والوں میں سے کوئی بھی اپنی آدمیت کا مرتبہ برقرار نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ سب ہی انتہائی پست اور کمینے لوگ تھے جو اپنے مفادات کے لیے دوسروں کی ہر چیز سے کھیلنا اپنا حق سمجھتے تھے اس لیے میں نے ہاتھ لگائے بغیر سینڈو کو پیروں سے ہی ہٹایا اور وہ مجرمانہ انداز میں سکڑا اور سہما ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور مشینی انداز میں اس کی زبان چل پڑی۔

وہ صرف پانچ نام اور تین دام تھے جنھیں زبانی یاد رکھنا مشکل نہیں تھا اس لیے میں نے سینڈو کو قلم اور کاغذ فراہم کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ انھیں باری باری مال دیا جاتا تھا، ادائیگی نقد ہوتی تھی اس لیے لین دین میں کوئی دقت پیدا ہونے کا امکان نہیں تھا۔

میں نے مافیا پر اپنی گرفت مضبوط کرنے اور چیف پر سینڈو کا سحر ختم کرنے کے ارادے سے اس رات آٹھ بجے اولڈ کلفٹن کے علاقے سے خود ہی مال وصول کر کے آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ میں لین دین میں سینڈو کے ہیرپھیر کا سراغ لگانا چاہتا تھا جس کا اس نے خود ہی اعتراف کر لیا تھا اس لیے مناسب یہی تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے کر مال کی وصولی اور تقسیم کا کام مکمل کرتا۔

پھر کِی کلب بھی اولڈ کلفٹن سے زیادہ دور نہیں تھا اس لیے ہم نہایت آسانی کے ساتھ اپنا وقت کِی کلب میں گزار کر وہاں کے حالات کا مشاہدہ کر سکتے تھے اور بوقتِ ضرورت چند منٹ میں اولڈ کلفٹن پہنچ سکتے تھے۔

اسے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر میں اندر گیا تو جہانگیر کی خواب گاہ کا دروازہ بند تھا لیکن مقفل نہیں تھا۔ میں نے بند دروازے پر ہولے سے دستک دی۔ جب چند ثانیوں تک اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ مجھے جہانگیر کی حالت کی بنا پر پورا یقین تھا کہ میں اس کی خلوت میں کسی نازیبا مداخلت کا مرتکب نہیں ہو رہا تھا۔

اندر پہنچ کر کوئی جواب نہ ملنے کا سبب بھی سامنے آگیا۔ جہانگیر مسہری پر ایک ہلکا کمبل اوڑھے ہوئے گہری نیند سو رہا تھا اور اس کے قریب ایک ادھیڑ عمر ملازمہ بیٹھی ہوئی تھی۔

کمرے میں سلمٰی کا کہیں پتا نہیں تھا لیکن ادھیڑ عمر ملازمہ نے مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ چھوڑ دی۔

"مالکن کہاں ہے تمہاری؟" میں نے جہانگیر کی مسہری کے قریب جاتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"نہار ہی ہیں۔" اس نے ملحقہ غسل خانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے صاحب کی دیکھ بھال کے لیے یہاں بٹھا کر تھوڑی دیر پہلے اندر گئی ہیں۔ بس اب باہر نکلتی ہی ہوں گی۔"

میں اسے نظرانداز کر کے زخموں سے چور، جہانگیر کی طرف بڑھ گیا جو آنکھیں بند کیے دُنیا ومافیہا سے بے خبر گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اس کی نبض کی رفتار قدرے ہلکی تھی لیکن مجموعی طور پر تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کے بہت سے زخموں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں لیکن غنیمت یہ تھا کہ پلاسٹر کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کی ہڈیوں کو اس تنازعے میں کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا اور وہ جلد ہی آزادانہ نقل و حرکت کے قابل ہو سکتا تھا۔

"مجھے اجازت ہو تو میں جاؤں؟" ادھیڑ عمر ملازمہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہاں جاؤ!" میں نے روا روی میں کہہ دیا لیکن پھر فوراً ہی اسے روک لیا کیونکہ سلمٰی غسل خانے میں تھی۔ وہاں سے برآمد ہو کر اگر وہ صرف مجھے موجود پاتی تو کچھ دیر پہلے پیدا ہو جانے والی تلخی کو دھونے کے لیے وہ میرے ساتھ قدرے جارحانہ رویّہ اختیار کر سکتی تھی جبکہ ملازمہ کی موجودگی میں اسے محتاط رہنا پڑتا۔

میں وہیں جہانگیر کے سرہانے بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ ملازمہ قدرے دور، دیوار کے ساتھ قالین پر جا بیٹھی تھی۔ چند ثانیوں بعد جہانگیر کی ہلکی سی آواز سُن کر مجھے قدرے حیرت ہوئی پھر اس نے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔

ابتدا میں اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا تو اس کی نظریں سپاٹ تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کی بینائی زائل ہو چکی ہو۔ وہ خیال آتے ہی میں نے تڑپ کر اپنی پوزیشن تبدیل کی

اور اسی کے ساتھ جہانگیر کے لبوں پر بے جان سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو۔" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ "شاید وہ لوگ ابھی تک تمہارا سراغ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔"

"کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟" میں نے محبت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"سلمیٰ کہاں ہے؟" اس نے سر گھمانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے نقاہت آلود سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"نہا رہی ہے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔ "تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"ڈی ڈی تمہارے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔" وہ رک رک کر بولا۔ "کسی طرح اسے شبہ ہو گیا ہے کہ تم کراچی واپس لوٹ آئے ہو اور اس کے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہو۔۔۔"

"اس کے بارے میں تم اپنے ذہن کو نہ تھکاؤ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ اب ماضی کا قصہ بن چکا ہے۔ اس وقت وہ اپنی پیاس جہنم کے کسی آتشی کنویں سے بجھا رہا ہوگا۔"

"اوہ! تو کیا وہ مر گیا؟" اس نے آنکھیں موندتے ہوئے تحیر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"ہم دونوں میں سے کسی ایک کو جلد از جلد مرنا تھا۔ یہ حالات کا منطقی مطالبہ تھا اور اس بار میں جیت گیا۔ اب تم اس کے بارے میں نہ سوچو۔ صحت یاب ہو جاؤ گے تو باتیں ہوتی رہیں گی۔" اس سے بات کرتے ہوئے میرے ذہن کی تہ میں اچانک ہی ایک خیال نے ڈنک مارا اور میری زبان دوبارہ چل پڑی۔ "سلمیٰ نے پچھلے بارہ چودہ گھنٹے بڑے عذاب کے عالم میں گزارے ہیں۔ وہ لوگ کئی بار تمہارے گھر پر دھاوا بولنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ ڈی ڈی کی موت کی خبر سن کر سلمیٰ نے اطمینان کا سانس لیا ہے اور اب نہانے دھونے گئی ہے تاکہ اپنے اوسان درست کر سکے۔ وہ تمہیں آہستہ آہستہ بہت کچھ بتلائے گی۔ ہم لوگوں نے بڑے بھیانک حالات میں وقت گزارا ہے۔"

"تازہ دم ہو کر وہ میری زیادہ دیکھ بھال کر سکے گی۔" وہ نقاہت آمیز انداز میں مسکرایا۔ "اب ڈی ڈی کا قصہ ختم ہو گیا تو تم فلیٹ میں کیا کر رہے ہو، تم بھی یہیں آجاؤ!"

"آجاؤں گا۔" میں نے مفاہمانہ لہجے میں کہا۔ "ذرا سلطان شاہ کا مسئلہ حل کر لوں۔"

"وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، اسے فلیٹ میں چھوڑ دو اور تم یہاں آجاؤ۔"

"میں آجاؤں گا۔ اس معاملے میں تم اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ دو، آنکھیں بند کرو اور آرام کرتے رہو۔ دوبارہ صحت مند ہونے کے بعد تمہیں میرے ساتھ کافی محنت کرنی ہوگی۔"

وہ اتنی سی دیر میں ہی تھک گیا تھا اس لیے میری ہدایت پر اس نے اپنی آنکھیں موند لیں اور میں ملازمہ کو اشارہ کرتا ہوا آہستگی کے ساتھ جہانگیر کی خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔

ڈرائنگ روم میں سینڈو اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس وقت دن کے دو بجنے والے تھے اور میری دانست میں وہ وقت کلب جانے کے لیے خاصا مناسب تھا ورنہ شام میں وہاں شروع ہونے والی سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کی وجہ سے وہاں کوئی بھی اہل کار اپنے کام کو متاثر کیے بغیر مجھے وقت نہیں دے سکتا تھا۔

برآمدے سے نیچے تک جہانگیر کے ملازمین میرے احترام میں یوں صف آرا تھے جیسے جنگ جیت کر لوٹنے والے کسی جرنیل کو اعزازی سلام پیش کرنا چاہ رہے ہوں۔ اس گھر میں میری آمد و رفت ایک طویل عرصے سے تھی لیکن ان لوگوں نے مجھے بھاری اسلحہ برداروں کی بھیڑ کے ساتھ پہلی بار دیکھا تھا اس لیے وہ مجھے نہیں بلکہ اس طاقت کو سلام کر رہے تھے جس کا میں بھرپور مظاہرہ کر چکا تھا۔

اشاروں سے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اس دور میں بھی بھینس اسی کی تھی جو لاٹھی پر قابض تھا۔ طاقت اور اختیار کے بغیر کسی کی کوئی وقعت نہیں تھی۔

وہ دو ہزار گز یا شاید اس سے زیادہ رقبے پر بنا ہوا ایک خوبصورت مکان تھا جو پتھریلی فصیل پر جھاگ اڑاتے ہوئے بحیرۂ عرب سے قریب تر اور آباد مکانوں سے قدرے فاصلے پر واقع تھا۔ ڈیفنس سوسائٹی کے اس بلاک میں ترقیاتی کام شاید پورے نہیں ہو پائے تھے اس لیے کافی پلاٹ غیر آباد پڑے ہوئے تھے۔ بعض نئے بنائے مکانات بھی کافی مدت سے اپنے مکینوں کے منتظر نظر آ رہے تھے اس لیے کلب جیسی کسی سوشل تفریح گاہ کے قیام کے لیے وہ علاقہ ہر اعتبار سے موزوں تھا لیکن کسی مشہور کلب کے حوالے سے جیسی پُرشکوہ عمارت کا تصور ذہن میں سر ابھارتا تھا، اس کا عشرِ عشیر بھی وہاں نہیں پایا جاتا تھا۔

"قانونی اور غیر قانونی اڈوں میں یہی ایک فرق ہوتا ہے۔" سینڈو نے اس دو منزلہ عمارت کے برآمدے کی طرف میری رہنمائی کرتے ہوئے کہا۔ دربان نے اس کی صورت دیکھتے ہی مشینی انداز میں پھاٹک کھول دیا تھا۔

"لیکن اندر جا کر تم محسوس کرو گے کہ حدود آرڈی نَنس کے دائرے میں یہ مکان محبت، آزادی اور عیش و عشرت کا ایک ایسا خواب ناک جزیرہ ہے جہاں آنے والے، بس یہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔"

"سارے معاملات کی ذمّے داری تو تم پر ہی ہے لیکن اس کلب کو چلانے کی ذمّے داری کس پر ہے؟" میں نے برآمدے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"مس پارسن اس کلب کی مینیجر ہے۔ وہ ہماری ملازمت میں آنے سے قبل بنکاک کے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں اپنے گاہک پھانسا کرتی تھی۔ بہت منجھی ہوئی اور تجربے کار لڑکی ہے لیکن صورت سے اس قدر معصوم لگتی ہے کہ دیکھنے والے کا دل اچانک اس کے ہاتھوں میں آجاتا ہے۔ کاؤنٹر کے قریب وہ خود موجود رہتی ہے۔" وہ مجھے بتلانے لگا۔ "اس عمارت کے احاطے میں کسی اجنبی کا داخل ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ اس وقت تمہیں اندر صرف اس لیے رسائی حاصل ہو گئی کہ میں تمہارے ساتھ تھا ورنہ اس کلب کے ارکان کو بھی مہمان ساتھ لانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"اس کے علاوہ کلب میں کتنے باقاعدہ ملازمین ہیں؟" میں اپنی تحویل میں آنے والی نئی سلطنت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔

"چوکیدار کے روپ میں یہاں ایک ریٹائرڈ چھاپا مار گوریلا مامور ہے اور وہ کلب کا واحد مرد ملازم ہے۔ اس کے علاوہ مس پارسن کے نیچے کچن اور روم سروس میں چھ لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ ان سب کا تعلق مشرقِ بعید کے ملکوں سے ہے لیکن ان کے انتخاب میں یہ احتیاط رکھی گئی ہے کہ سب ہی بے انتہا حسین ہیں اور ان میں سے پانچ کا تعلق دوغلی نسل سے ہے جس کی وجہ سے ان کا کھٹراناک نقشہ ہے جو ہماری طرف کے لوگوں کو بڑی شدت سے اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ بعض اہم ترین ممبروں کی دلجوئی کے لیے ہم ان سے بھی کام لیتے ہیں۔"

اسی اثنا میں ہم اندر داخل ہو گئے جہاں پورے فرش پر بیش قیمت سادہ قالین بچھا ہوا تھا۔ وہ کلب میں کام کرنے کا وقت نہیں تھا لیکن شاہ بلوط کی خوبصورت لکڑی سے بنے ہوئے استقبالیہ کیبن میں کاؤنٹر کے پیچھے ایک بے حد حسین اور نوخیز غیر ملکی رجسٹروں کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے عجلت میں رجسٹر بند کیے اور تقریباً اضطراری طور پر سینڈو کے استقبال کے لیے کاؤنٹر سے باہر نکل آئی۔

سینڈو سے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے اس نوخیز لڑکی کی نگاہیں استفسار طلب انداز میں میرے چہرے پر مرکوز تھیں اس لیے سینڈو نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارے نئے باس مسٹر شوٹر ہیں اور سر! یہ مس پارسن اینڈی زولا ہیں جو فی الحال اس کلب کے انتظام کی ذمّے دار ہیں۔"

"تم واقعی خوبصورت لڑکی ہو۔" میں نے مس پارسن کا بڑھا ہوا نرم و نازک ہاتھ اپنے پنجے میں لیتے ہوئے سرسری لیکن تحکمانہ لہجے میں کہا تاکہ اسے عملاً اپنی برتری کا احساس دلا سکوں۔

وہ اپنے شعبے میں خصوصی مہارت رکھتی تھی اس لیے میرے منصب سے آگاہ ہوتے ہی اس نے مجھ پر ڈورے ڈالنے کی پیشہ ورانہ کوششوں کا آغاز کرتے ہوئے میرے ہاتھ میں اپنی انگلیوں کو معنی خیز انداز میں اس طرح جنبش دی کہ اس کے گداز نسوانی لمس کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا لیکن میں نے سرد مہری سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور مس پارسن کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ میرے رویّے سے شاید اس کے نسوانی پندار کو ٹھیس پہنچی تھی۔

"ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔" میں نے مس پارسن سے کہا۔ "میں حُسن پرست بھی ہوں اور عیش طلب بھی۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی تم کو کڑے ذاتی امتحان سے دوچار ہونا پڑے لیکن فی الحال میں مشن پر آیا ہوں اور سب سے پہلے کلب کے ارکان کی فہرست دیکھنا چاہتا ہوں، رجسٹر لے کر دفتر میں آجاؤ!"

"دفتر اِدھر ہے سر!" سینڈو نے ایک بار پھر رہنمائی کا فرض سنبھال لیا۔ وہ بہت گھاگ آدمی تھا۔ مس پارسن کے ساتھ میرا رویّہ دیکھ کر اس نے اچھی طرح اپنے رول کا اندازہ کر لیا تھا اور اسی کو نباہ رہا تھا۔

دفتر مختصر لیکن تاثر انگیز تھا۔ میں نے میز کے پیچھے پڑی ہوئی گھومنے والی کرسی سنبھال لی۔

"یہاں کسی کی رہائش تو نہیں ہے؟" میں نے سینڈو سے سوال کیا۔

"اوپر کی منزل پر چھوٹے چھوٹے متعدد رہائشی کمرے ہیں۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "ان کے بغیر تو کلب کا تصوّر ہی نہیں بن سکتا۔ ویسے یہ کمرے کسی کو مستقل رہائش کے لیے نہیں دیے جاتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ رات بسر کرنے والے جوڑے اگلا دن تھکان اتارنے کے لیے استعمال کر لیتے ہیں۔"

"اسٹاف کہاں رہتا ہے؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوال کیا۔

"مین بلڈنگ میں تہ خانے میں گیمز ہوتے ہیں۔ یہ فلور عام تفریحات اور ملاقاتوں وغیرہ کے لیے مخصوص ہے۔ اوپری منزل پر ممبران کے لیے پرائیویٹ ریٹائرنگ روم ہیں۔ اسٹاف کے لیے مین بلڈنگ سے الگ، عقب میں بلاک بنا ہوا ہے۔ عملے کے لوگ وہیں رہتے ہیں تاکہ کلب کا ماحول برقرار رکھا جا سکے۔"

اسی اثنا میں پارسن ایک مختصر سا رجسٹر لیے دفتر میں آگئی۔ وہ میرے ساتھ سینڈو کے احترام آمیز رویّے کی وجہ سے مرعوب تو ہو گئی تھی لیکن اس کے پتلے پتلے خوبصورت ہونٹوں پر سجی ہوئی دلنواز مسکراہٹ میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

"یہ ہمارے ممبر لوگ کا رجسٹر ہے۔" وہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ وہ غیر ملکی تھی لیکن اپنے لب و لہجے سے قطع نظر

بہت عمدہ اُردو بول رہی تھی۔ "آج کل ٹوٹل نفری نائین ہے۔ تھرٹی میل ممبرز اور ٹوینٹی نائین فیملی ممبرز ہیں۔ انڈکس کے حساب سے اس رجسٹر میں ہر ممبر کا ہسٹری موجود ہے۔"

"تمھاری عمر کتنی ہے پارسن؟" میں نے رجسٹر جوں کا توں اپنے سامنے رکھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"جو چاہے سمجھ لو۔" وہ اسی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "میں خود کو بڑی محنت سے مین ٹین کرتی ہوں اور خود کو مہمانوں کے ڈسپوزل پر چھوڑ دیتی ہوں۔ کوئی مجھے بیس برس کی دوشیزہ سمجھتا ہے اور کوئی چالیس سال کی پختہ کار عورت۔ میرے لیے اہم بات یہ ہے کہ میں نے اپنے پروفیشن میں آج تک کسی کو مایوس نہیں کیا۔" اس نے لحظہ بھر کے لیے خاموش ہو کر سینڈ دکی طرف دیکھا پھر ہولے سے بولی۔ "میں اپنی ریاضت اور محنت کو چند الفاظ میں برباد نہیں کرسکتی۔ میں نے اپنا نیا اسائنمنٹ لیتے ہوئے بھی اپنی عمر نہیں بتائی تھی۔ یہ میرا پروفیشنل سیکرٹ ہے جو میرے ساتھ قبر میں جائے گا۔"

"اور فی الحال تمھارا قبر میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

"اوہ نو!" وہ فضا میں ہاتھ لہرا کر اضطراری لہجے میں بولی۔ "جس دن نوجوانوں نے مجھے اپنا ہم عمر سمجھنا چھوڑ دیا اُس دن کو میں اپنے زوال کی ابتدا سمجھوں گی اور تم کو معلوم ہوگا عُمر ڈھلنے کے لیے بھی ایک مدّت درکار ہوتی ہے۔"

"پارسن صحیح معنوں میں پروفیشنل لڑکی ہے۔" سینڈ دنے دخل انداز ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ ہالی ووڈ کے نامور پلاسٹک سرجن میکس ہورنیشو کی مستقل گاہک ہے اور اب تک شاید سات آٹھ مرتبہ اپنی پلاسٹک سرجری کرا چکی ہے تاکہ دفتر سے گھر تک، کہیں بھی اس کی عمر کا راز نہ فاش ہو سکے۔ اس کے ہونٹوں پر تم جو مسکراہٹ دیکھ رہے ہو وہ بھی پلاسٹک سرجری کا کمال ہے۔ اس کے چہرے کی جلد کو اتنی مہارت سے کھینچا گیا ہے کہ یہ ہر وقت مسکراتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ روتے ہوئے بھی یہ مسکراہٹ پارسن کے ہونٹوں پر جمی رہتی ہے۔"

"لیکن تمھاری یہ سرجیکل مسکراہٹ بڑی فطری معلوم ہوتی ہے۔ لوگوں کو اس کا راز اسی وقت معلوم ہوگا جب مرنے کے بعد تمھاری لاش بھی اسی طرح مسکراتی رہے گی۔"

وہ ایک جھرجھری لے کر رہ گئی۔ میرے الفاظ پر اس کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا تھا لیکن ہونٹوں پر دلنواز مسکراہٹ بدستور جمی ہوئی تھی جس سے پیچھا چھڑانا اس کے بس سے باہر تھا۔

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو یا کوئی اطلاع دے رہے ہو؟" اس نے بدیہی طور پر اپنے غصّے پر غالب آتے ہوئے سپاٹ لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"یہ یاد رکھنا کہ میں اپنے کسی بھی ماتحت، خاص طور سے عورتوں کو دھمکیاں نہیں دیتا۔ دھمکیاں کمزور لوگ دیتے ہیں۔ میں نے جو کچھ کہا وہ تمھاری تعریف اور تمھارے دعوے کی تائید میں کہا ہے۔ اس مسکراہٹ کا راز واقعی تمھارے مرنے سے پہلے کبھی فاش نہیں ہو سکے گا کیونکہ تم نے اپنے مزاج کو سرجیکل مسکراہٹ سے ہم آہنگ کیا ہوا ہے۔"

اسے جواب دیتے ہوئے میں نے انڈکس رجسٹر کے ابتدائی صفحات کھولے تو فہرست میں حروف تہجّی کے اعتبار سے موجود نام پڑھتے ہوئے میری کھوپڑی میں روشنی کے گولے پھٹنے لگے۔ اس فہرست میں مقامی انتظامیہ کے کلیدی عہدیداروں کے نام موجود تھے جن میں بیوروکریسی کے انتظامی شعبے کے علاوہ چند بڑے پولیس افسران کے نام بھی موجود تھے۔ میں نے انڈکس کے مطابق ایک ایس ایس پی کے نام کا صفحہ پلٹا تو اس پر مندرج تفصیلات میرے ہوش اُڑا دینے کے لیے کافی تھیں۔

نام کے نیچے جو کچھ لکھا ہوا تھا وہ اس طرح میرے ذہن پر نقش ہوا کہ آج بھی یاد ہے۔ ان تفصیلات کے مطابق وہ افسر متوسط زرعی گھرانے سے پولیس سروس میں آیا تھا۔ بیوی کے علاوہ اس کے چار بچّے تھے جن میں سے دو بیرونِ ملک زیرِ تعلیم تھے اور دو مقامی اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ اس کی پوری تنخواہ ان چاروں بچّوں کے مجموعی تعلیمی اخراجات سے بھی کم تھی۔ اس کے باوجود شہر میں چار مکانات اس کی ملکیت تھے جن میں سے ایک بیوی کے نام پر، دوسرا سالی کے نام پر، تیسرا بھائی کے نام پر اور چوتھا بہنوئی کے نام پر تھا۔ وہ خود کرائے کے سرکاری مکان میں رہتا تھا۔ بینک آف سوئٹزرلینڈ میں اس کا ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ زرِ مبادلہ کا اکاؤنٹ تھا۔ بظاہر وہ تند خو اور خشک مزاج بنا رہتا تھا لیکن خوبرو عورتیں اس کی کمزوری بن جاتی تھیں۔ شہر کے ایک مشہور صنعت کار کی بیوی سے اس کے خفیہ مراسم تھے اور وہ کِی کلب کی پارسن کا دیوانہ تھا۔ ہفتے میں کم از کم ایک بار کلب ضرور آتا تھا۔ جُوا کھیلنے کا شوق نہیں تھا لیکن شراب شیرِ مادر کی طرح پیتا تھا اور مافیا کا پوری طرح سے وفادار تھا۔ اسے کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا تھا لیکن وہ اپنی نجی زندگی کے رازوں کی قیمت چُکانے کے لیے مافیا کو اندر کی خبریں پہنچایا کرتا تھا۔ رابطے کا کام مس پارسن کرتی تھی جو اسے ابتدا سے ہی اپنی خلوت میں مدعو کرنے کے وعدوں پر ٹال رہی تھی البتّہ اس افسر کو صنعت کار کی بیوی کے ساتھ کئی بار کِی کلب میں، ضابطوں سے انحراف کرتے ہوئے، قیام کی سہولت دی گئی تھی اور ان دونوں کی لاعلمی میں خفیہ کیمروں سے اُن کی فلم تیار کر لی گئی تھی جس کے سہارے اس کروڑپتی خاتون سے تین بار بھاری رقوم وصول کی جا چکی تھیں۔

وہ تفصیل پڑھ کر مجھے کراہت سی آنے لگی۔ ہیروئن کی غیر قانونی تجارت اور قانون شکن افسران کو اپنے قابو میں لانے کی حد تک تو جرائم قابلِ قبول تھے کیونکہ اُن میں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح مردانگی کا اظہار ملتا تھا لیکن کسی بے راہ رو عورت کو اس کے کردار کی خامیوں کی بنا پر بلیک میل کر کے رقم وصول کرنا میری نظروں میں ایک کریہہ فعل تھا اور یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں ایسے بلیک میلروں کا سربراہ بن بیٹھا تھا۔

وہ صفحہ ختم کر کے میں نے پھر فہرست کا جائزہ لینا شروع کر دیا اور اس بار مسز ریٹا ڈی سوزا کا نام پڑھ کر میری آنکھیں حیرت سے پیشانی پر جا چڑھیں کیونکہ ریٹا سلمٰی کی اس فیشن زدہ سہیلی کا نام بھی تھا جس نے جہانگیر کی گمشدگی کے بعد اسے ساتھ فراہم کیا تھا اور اس کے شوہر کا نام ڈی سوزا تھا جو شہر کا ایک کامیاب وکیل تھا۔ میرے دل میں شدّت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش نام کی یہ مماثلت اتفاقی ہو اور کِی کلب کی ممبر کوئی اور ریٹا ہو جسے میں نہ جانتا ہوں لیکن جب میں نے اس کا ورق پلٹا تو میری خواہش مٹّی میں مل گئی۔

وہ شہر کے کامیاب ترین وکلاء میں شامل ڈی سوزا کی بیوی ہی تھی۔ شادی سے قبل اس کے ہاتھ اپنے ایک نامولود بچّے کے خون سے آلودہ تھے اسی وجہ سے اسے کلب کا رُکن بنا لیا گیا تھا۔ ان دونوں کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے وہ شہر میں بھرپور سوشل زندگی گزار رہے تھے جس کی وجہ سے شہر کے اُمراء اور دوسرے حلقوں میں اُن کی خاصی رسائی تھی۔ ریٹا کے ذریعے مافیا کو بہت سی اہم اطلاعات ملتی رہتی تھیں لیکن میرے لیے پوری رپورٹ میں صرف وہ نکتہ اہم تھا کہ ریٹا کی محکمۂ ایکسائز کے ایک اعلیٰ افسر سے قابلِ رشک دوستی تھی جو کِی کلب میں ہی استوار ہوئی تھی۔

اس رجسٹر میں موجود کوائف میری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی تھے۔ ابتدا میں پیدا ہونے والا میرا اندرونی ردِّعمل بھی ختم ہو چکا تھا کیونکہ مافیا والے صرف ہیروئن کی سوداگری نہیں کرتے تھے بلکہ وہ آفاقی سطح پر جرائم کی آبیاری کا مشن چلا رہے تھے۔ ان کے نزدیک جیب تراشی سے لے کر بلیک میلنگ اور قتل تک، سارے جرائم کا ارتکاب جائز تھا۔ اپنے اور اپنے بڑوں کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کے لیے نچلی سطح کے لوگوں کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی جس پر قدغن لگانے والوں کو وہ لوگ بے رحمی سے اپنے راستے سے ہٹا دیتے تھے، ان کو خرید لیتے تھے یا پھر ان کی کمزوریوں کے سہارے انھیں اپنے قدموں میں جُھکا لیتے تھے۔

ڈان بھتری اور سیٹھ حبیب جیوانی سے اشتراکِ عمل کا معاہدہ کرتے ہوئے میرے ذہن پر صرف اور صرف شی کی مخاصمت سوار تھی۔ میں مافیا کا سہارا لے کر موت کے اُن سوداگروں کی بیخ کنی کرنا چاہتا تھا جو پاکستان سے ہیروئن کی نام نہاد اسمگلنگ کا سہارا لیتے ہوئے پاکستان کے گلی کوچوں میں اس سفید موت کو متعارف کرا رہے تھے اور ساتھ ہی ملک میں غیر قانونی اسلحہ درآمد کر کے جنگِ افغانستان کی لُوٹ مار کے حوالے سے وہ اسلحہ نہایت سستے داموں ملک و قوم کے دُشمنوں میں پھیلا رہے تھے۔ پورے ملک میں لوگ ہیروئن اور کلاشنکوف کلچر کی بڑھتی ہوئی یلغار سے خوفزدہ تھے۔ مذاکرے اور سیمینار ہو رہے تھے۔ ہر طرف اس لعنت کے خلاف نفرت اور دہشت پائی جاتی تھی لیکن کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ اس سازش کے پس پُشت کون لوگ کام کر رہے تھے۔ میں ان کو بے نقاب کر کے قانون اور پورے معاشرے کو اس کے دُشمنوں سے آگاہ کرنا چاہتا تھا لیکن میری کوششیں ہر بار ناکامی سے دوچار ہوئی تھیں۔ قتل و غارت، آتش زنی، تباہی اور بربادی کے متعدد واقعات میں، مَیں کہیں بھی شی کا نام اخبارات کی شہ سرخیوں میں لانے میں ناکام رہا تھا۔ اس ناکامی کے لیے میں نے مافیا والوں سے اپنے مراسم استوار کیے تو میرے ذہن پر صرف ہیروئن سوار تھی لیکن شی کے مقامی سربراہ، دلدار آغا کے جہنم واصل ہوتے ہی مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ شی کی دُشمنی میں، مَیں مافیا کی اندھی دلدل میں جا گرا تھا جہاں ہر طرف جرائم کا گھور اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ان لوگوں کو پاکستان میں ہیروئن اور اسلحے کے فروغ سے بے شک ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی، نہ وہ مغرب کے انتشار زدہ معاشرے کو ہیروئن کے نشے میں پناہ لینے سے روکنے کے لیے پاکستان کی سرزمین پر ہیروئن کی مقامی منڈی پیدا کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے لیکن ان کا مشن ہر جگہ اور ہر قیمت پر جرائم کا فروغ تھا جس میں ہیروئن کی اسمگلنگ سے قتل و غارت گری تک سارے ہی مشاغل شامل تھے۔

"اس وقت کلب میں کوئی مہمان موجود ہے؟" میں نے اپنے سُلگتے ہوئے ذہن کو کسی اور راہ پر لگانے کی نیّت سے پارسن سے یہ بے ضرر سا سوال کیا۔

"صرف ایک لیڈی اوپر کے کمرے میں ہے۔ شاید اندھیرا پھیلنے سے پہلے چلی جائے گی۔"

"کب آئی تھی وہ؟" میں نے اپنا دھیان بانٹنے کے لیے یوں ہی روا روی میں سوال کیا۔

"صبح اس کا فرینڈ آیا تھا اس نے لیڈی کو فون کر کے بلایا تھا۔ دو تین گھنٹے بعد فرینڈ چلا گیا، لیڈی رہ گئی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی چلی جائے گی۔ بس ذرا موڈی عورت ہے وہ!"

"تو کیا وہ اور اس کا فرینڈ، دونوں کِی کلب کے ممبر ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اوہ یس! اس کے بغیر وہ دونوں یہاں کیسے یکجا ہو سکتے تھے۔ یہ مس پارسن کا پرائیویٹ کلب ہے، کسی طوائف کا کوٹھا نہیں جہاں پیسہ دینے والا ہر شخص جا سکتا ہے۔ یہ کلب تو ممبروں کی باہمی تفریح اور بہبود کے لیے خالص غیر تجارتی بنیادوں پر

چلایا جا رہا ہے۔ سینڈ وہر مہینے بجٹ میں مجھے لاکھوں روپے کی سب سیڈی دیتا ہے۔"

"کون ہے وہ؟" میں نے متجسّس لہجے میں سوال کیا۔ پارسن کی باتوں نے اس لیڈی کے بارے میں جاننے پر مجبور کر دیا تھا۔

"مسز ریٹا ڈی سوزا!" پارسن کے یہ الفاظ کسی بم کی طرح میرے اعصاب پر گرے اور میں اس انکشاف پر بھونچکا رہ گیا۔ پچھلی رات دو بجے تک سلمٰی کی دیکھ بھال کرنے والی ریٹا صبح ہوتے ہی اپنے کسی آشنا کی کال پر وہاں آ پہنچی تھی۔ میں اندازہ نہیں لگا سکا کہ پارسن کے اس انکشاف پر مجھے حیرت ہوئی تھی یا صدمہ۔

"وہ سینٹرل ایکسائز کے ایک ڈپٹی کلکٹر سے ہُک اَپ ہے۔ صبح اسی نے ریٹا کو بُلایا تھا۔" پارسن کہہ رہی تھی۔ "وہ بڑی گریٹ لیڈی ہے۔ دردمند دل کی مالک ہے اور بہت زیادہ سوشل رہتی ہے۔" پارسن میرے ردّعمل سے بے خبر بولے جا رہی تھی۔ "یہاں آنے والے بیشتر ممبر اس پر نگاہ رکھتے ہیں لیکن وہ ہر ایک کے ساتھ سوبر رہتی ہے اس لیے کسی کی پیش قدمی کرنے کی ہمّت نہیں پڑتی۔ چاہو تو میں اسے نیچے بلائے لیتی ہوں۔"

"میں اس سے اسی کے کمرے میں ملنا چاہوں گا، مجھے اس کے کمرے کا نمبر بتا دو۔"

"سیڑھیاں چڑھ کر داہنے ہاتھ پر دوسرا دروازہ اسی کی خواب گاہ کا ہے۔ لیکن میں اسے انٹرکام پر بتا دوں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بے خبری میں تم سے کوئی بدتمیزی کر بیٹھے۔"

"تم فکر نہ کرو، میں دردمند خواتین کے ہاتھوں کوئی بھی دُکھ جھیل کر دُکھی نہیں ہوتا۔ میں اسے سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔" میں نے کُرسی چھوڑتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میں اسے پہلے سے جانتا ہوں۔"

"وِش یو گڈ لک سر!" اس نے اپنی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور میں دفتر سے نکل گیا۔

استقبالیہ کاؤنٹر والے ہال میں، میں زینے دیکھ چکا تھا۔ اوپر اور نیچے جانے والے دونوں راستے وہیں واقع تھے، اس لیے میں کسی کی مدد یا رہنمائی کے بغیر سرخ قالین سے آراستہ زینے عبور کر کے اوپری منزل پر پہنچ گیا۔ پہلی منزل سے مزید زینے اوپر جا رہے تھے لیکن میں باہر سے دیکھ چکا تھا کہ وہ ایک منزلہ عمارت تھی جہاں پہلی منزل سے اوپر کھلی چھت کے علاوہ کچھ اور ملنے کا امکان نہیں تھا۔

زینوں کے اختتام پر خوب صورت تنگ راہداری تھی۔ وہاں بھی دبیز قالین پڑا ہوا تھا۔ راہداری میں قریب قریب نظر آنے والے دروازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس منزل پر پورے رقبے کو نہایت کفایت سے استعمال کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے کمرے بنائے گئے تھے تاکہ ان کی مطلوبہ تعداد پوری ہو سکے۔

داہنے ہاتھ کے دوسرے کمرے پر چوبی دروازے پر لگی ہوئی سلائیڈڈ پلیٹ ایسی پوزیشن میں تھی کہ سرخ زمین پر سفید انگریزی حروف میں لکھا ہوا لفظ آکوپائیڈ نمایاں تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ کمرا کسی کے زیرِ استعمال ہے جب کہ قرب و جوار کے دوسرے دروازوں پر سبز گراؤنڈ پر ویکینٹ یعنی خالی کے مترادف انگریزی حروف چمک رہے تھے۔

میں اس آراستہ راہداری میں دوسرے دروازے کے سامنے رکا ہی تھا کہ کسی قریبی سروس کیبن سے سُرخ منی اسکرٹ اور باریک سیاہ بلاؤز میں ملبوس ایک سفید فام لڑکی تیر کی طرح میرے پاس آ پہنچی۔

"یس سر! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" اُس نے آتے ہی ادب و احترام سے انگریزی میں سوال کیا تھا۔ لڑکی وہ بھی دلکش اور خوبرو تھی۔

"تم خدمت ضرور کر سکتی ہو لیکن اس وقت نہیں۔" میں نے اس کے سراپا کا بغور جائزہ لیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "میں اس کمرے میں ٹھہری ہوئی خاتون سے ملنے آیا ہوں۔"

"مناسب ہو گا کہ تم نیچے ریسپشن میں انتظار کرو، میں خاتون کو تمھارا پیغام دے دیتی ہوں۔ وہ چاہے گی تو تم سے نیچے آ کر مل لے گی۔" اُس نے قدرے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"نیچے نہیں، میں اُس سے اسی کے کمرے میں ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا کیونکہ اس دوران میں وہ لڑکی آہستہ آہستہ میرے اور دروازے کے درمیان حائل ہو چکی تھی اور اگر میں اس کے مشورے کو نظرانداز کر کے براہِ راست دروازے پر دستک دینے کی کوشش کرتا تو وہ پُرتشدد مزاحمت بھی کر سکتی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ یہ یہاں کے ضابطوں کے خلاف ہے۔" اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ "خاتون کی واضح ہدایت کے بغیر کسی کو اس کے تخلیے میں مداخلت کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ میں تمھارا ممبر شپ کارڈ دیکھ سکتی ہوں؟"

"تم اس فلور کو سرو کرتی ہو۔ نیچے والے وہاں بیٹھے جھک نہیں مار رہے ہیں۔ میں ان کے ضابطے پورے کر کے اوپر آیا ہوں۔ اس لیے تم کو میرا راستہ روکنے کا کوئی حق نہیں ہے . . ."

"یہ ہمارا نارمل بزنس ٹائم نہیں ہے۔" وہ بے خوفی کے ساتھ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہو سکتا ہے کہ نیچے کوئی بھی موجود نہ رہا ہو اور تم آنکھ بچا کر اوپر آ گئے ہو۔ اس کلب کی رُکنیت کا یہ بنیادی ضابطہ ہے کہ ممبر شپ کارڈ جب بھی اور جہاں بھی طلب کیا جائے گا، دکھانا ہو گا۔

"درمیان سے ہٹ جاؤ ورنہ مجھے دوسرا طریقہ استعمال کرنا پڑے گا۔" میں نے اُسے گھورتے ہوئے کھُردرے لہجے میں کہا۔ اس وقت میں اس لڑکی کو آزمانے میں دلچسپی محسوس کر رہا تھا۔

وہ خوبرو اور نازک اندام لڑکی میری توقع سے کہیں زیادہ طرار اور پھُرتیلی ثابت ہوئی۔ وہیں کھڑے کھڑے وہ بجلی کی سی سرعت سے تڑپی تھی۔ اگر مجھ سے لمحہ بھر کی بھی غفلت ہوئی ہوتی تو اس کے جُوتوں کی ایڑیوں نے میرا چہرہ اُدھیڑ کر رکھ دیا ہوتا۔ میں نے پیچھے سرک کر خود کو اس کے وار سے بچاتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور خوش قسمتی سے اس کی چمکدار داہنی پنڈلی میری مضبوط گرفت میں آ گئی۔ اس ناگہانی افتاد کی وجہ سے اس کا توازن بگڑ گیا۔ گرتے گرتے اس نے دم توڑتے ہوئے کسی وحشی سانڈ کی طرح ایک زبردست جھُرجھُری لی تھی لیکن اس کے لیے میری گرفت سے بچ نکلنا آسان نہیں تھا۔ وہ ہتھیلیوں کے بل قالین پر رُک گئی۔ اس کی داہنی پنڈلی میری بے رحمانہ گرفت میں تھی اور بائیں ٹانگ فضا میں گردش کرتی ہوئی، میرے چہرے کو نشانہ بنانے کی فکر میں تھی۔ اس جدوجہد میں وہ ستر پوشی کی تہمت سے بھی آزاد ہو چکی تھی لیکن اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔

میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ بات بڑھ جانے کے باوجود اس کے منہ سے ذرا بھی آواز نہیں نکلی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ اُس وقت بھی کسی بیرونی مدد کے بغیر میرے اوپر اپنی بالادستی قائم کرنے کے بارے میں پُراُمید تھی۔

میں نے اس کی داہنی ٹانگ کو ایک شدید جھٹکا دے کر اُسے اپنے سے دُور اُچھال دیا۔ وہ قالین پر گرتے ہی کسی ربر کی گُڑیا کی طرح اپنے قدموں پر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے لحظہ بھر میں اپنے اُلٹے ہوئے منی اسکرٹ کو سیدھا کیا اور جارحانہ نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔

جُوں ہی میں نے دروازے پر دستک دی، وہ اچانک فضا میں اُڑتی ہوئی دوبارہ میری طرف آئی تھی۔ میں اسے دیکھ نہیں سکا تھا لیکن اپنی چھٹی حس کی کسی تنبیہ کی بنا پر فوراً ہی بیٹھ گیا اور اس مارشل فائٹر کی دونوں لاتیں پوری قوت کے ساتھ بند دروازے پر پڑیں۔

دروازے کے عقب سے ایک تیز نسوانی چیخ بلند ہوئی اور پٹ اندر کی طرف کھُلتا چلا گیا۔ لڑاکا لڑکی بند دروازے پر لاتیں رسید کرنے کے بعد ایک خوشگوار بوجھ کی طرح میرے اوپر آ گری اور میں نے اُسے مزید کسی کارروائی سے باز رکھنے کے لیے پوری قوت سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

اُسی لمحے کمرے کے کھُلے ہوئے دروازے کے عقب سے ریٹا کا غصّے سے دہکتا ہوا چہرہ نمودار ہوا اور مجھ پر پوری صورتِ حال یک بیک واضح ہو گئی۔

شاید ریٹا دروازے پر میری دستک سن کر دروازہ کھول ہی رہی تھی کہ چوبی پٹ پر لڑاکا لڑکی کی بھرپور لاتیں پڑیں اور دروازہ پوری قوت کے ساتھ اندر کو کھُلتا چلا گیا۔ اس ناگہانی اتفاق سے یقیناً ریٹا کھُلتے ہوئے دروازے کی زد میں آ کر مضروب ہوئی تھی اور اس نے سنبھالا لیتے ہی باہر نکل کر اس طوفانِ بدتمیزی کا جائزہ لینا چاہا تو اُس کی نگاہ مجھ پر پڑی، میرے بازوؤں میں لڑاکا لڑکی دبی ہوئی تھی۔ وہ اس قدر بدمعاش تھی کہ مجھے ریٹا کے کمرے سے دُور رکھنے کے لیے اس نے میری گرفت میں آتے ہی اپنا بدن سپردگی کے انداز میں ڈھیلا چھوڑ دیا تھا تاکہ میں اس کے بدن کی حرارت آگیں نشیب و فراز میں اُلجھ کر ریٹا کے کمرے کو بھول جاؤں۔

"یہ کیا بدمعاشی اور غنڈا گردی ہو رہی ہے یہاں؟" ریٹا باہر آتے ہی غضبناک لہجے میں چلّائی تھی۔ "یوں ہی کُتّوں اور بلّیوں کی طرح مُنہ کالا کرنا ہے تو لان بڑ بہتیرے کُنج بکھرے ہوئے ہیں۔ میں ابھی پارسن کو بُلاتی ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں والے اب شرفا کی میزبانی سے عاجز آ گئے ہیں . . ."

وہ غصّے میں نہ جانے اور کیا بکتی رہتی مگر میں نے اسے لب کشائی کی مزید مہلت دیے بغیر اپنی آغوش میں موجود مٹھاس کی گٹھری کو قالین پر پھینک دیا اور اچھل کر ریٹا کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

میرے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ریٹا کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے میں زندہ انسان کے بجائے کوئی آسیب رہا ہوں۔ "تت . . . تت . . . تم . . . یہاں . . . کک . . . کیا کر رہے ہو؟" وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں ہکلاتے ہوئے مجھ سے بمشکل سوال کر سکی تھی۔

"تمھاری تلاش میں آیا تھا۔" میں نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ لڑاکا لڑکی ظالم سماج بن کر میری راہ میں حائل ہو گئی۔ اگر مسٹر ڈی سوزا کو اعتراض نہ ہو تو میں اندر آ جاؤں؟"

"ڈی سوزا یہاں نہیں ہے، میں اکیلی ہوں۔" وہ میرے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔ مجھے دیکھ لینے کے بعد اس کی سراسیمگی قابلِ دید تھی۔

"اکیلی؟" میں نے مصنوعی حیرت سے دہرایا۔ "صبح تو تم اکیلی نہیں تھیں — پھر وہ کون تھا؟"

"تم جاؤ!" ریٹا منی اسکرٹ والی فلور میڈ کی طرف مُڑ کر تیز لہجے میں بولی۔ "یہ میرے مہمان ہیں۔"

اس نے سر کو قدرے خم دیا اور اُسی طرف غائب ہو گئی جدھر سے آئی تھی۔ میں یہ اندازہ قائم کر چکا تھا کہ اس کلب کے ملازمین جنس کے کسی امتیاز کے بغیر انتہائی غیر جذباتی انداز میں اپنے مقاصد کے حصول میں کوشاں رہتے تھے۔ یہ فریقِ ثانی کا اپنا ذہنی

فتور تھا کہ وہ ان خوبرو اور نازک بدن لڑکیوں کے جال میں آ جاتا تھا۔

میں ریٹا کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوا تو اس مختصر سی خواب گاہ کی نفاست اور آرائش دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مکلّف خوابگاہ بمشکل دس بارہ فٹ طویل اور اتنی ہی عریض رہی ہوگی۔ اسپرنگوں پر ٹھہرے ہوئے لچکدار گدّے والے ڈبل بیڈ، دو کرسیوں اور دیوارگیر ڈریسنگ ٹیبل کے درمیان چلنے پھرنے کے لیے بہت کم دبیز قالین باقی رہ گیا تھا۔ ایک گوشے میں وال بریکٹ کے ساتھ چھت سے قدرے قریب رنگین ٹیلی وژن لٹک رہا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے ایک گوشے پر مختصر سادی سی پی رکھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر چوبی ریک میں کتابوں کی طرح متعدد وڈیو کیسٹ سجے ہوئے تھے۔ کمرا مختصر ضرور تھا لیکن اندر موجود ذیلی دروازے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہاں ملحقہ باتھ روم کی سہولت موجود تھی۔

لیکن ان تمام جزئیات سے زیادہ دلچسپ وہ خاتون تھی، جو ان سب پر قابض و متصرّف تھی۔ اُس کے بکھرے ہوئے بالوں اور چہرے کے اُڑے ہوئے رنگ سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کم از کم اُس دن کے لیے اُس پیکر کا جوہر کشید کیا جا چکا تھا۔ اس کے بدن پر شب خوابی کا باریک اور ریشمیں لبادہ موجود تھا۔ اس چلمن سے یہ اندازہ لگانا زیادہ دشوار نہیں تھا کہ فی الحقیقت ریٹا اس سے کہیں زیادہ خوش بدن تھی جتنا وہ خود کو بناوٹ کے ذریعے ظاہر کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

”تم یہاں کیسے آئے ہو؟“ خواب گاہ کا دروازہ بند کر کے ریٹا نے اضطراری طور پر ایک لمبی سی غیر ملکی سگریٹ سلگاتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

”تم یہاں کیسے موجود ہو؟“ میں نے براہِ راست اس کی سیاہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”شاید تم چوری چھپے یہاں گھُسے ہو اسی لیے شوچان تم کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی؟“ اس نے مجھ سے نظریں چرائے بغیر کہا۔ ”یہ ایک پرائیویٹ کلب ہے اور میں آرام کرنے کے لیے یہاں آئی ہوں۔ لیکن تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمھیں اس کلب کا پتا کیسے چلا؟“

”تمھاری بُو سونگھتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔“ میں نے پُرمزاح لہجے میں کہا۔ ”مجھے علم ہے کہ اس شہر میں جسموں اور ذہنوں کی آسودگی کے لیے بہتیرے اہم لوگ اسی کلب کا رخ اختیار کرتے ہیں۔“

”چبا چبا کر باتیں نہ کرو۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”تم سے میری شناسائی بہت مختصر ہے اور اس وقت میں محض سلمیٰ کے خیال سے تم سے بات کر رہی ہوں ورنہ میرے ایک اشارے پر اس کلب کی انتظامیہ تمھیں یہاں سے نکال باہر کرے گی۔ تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟“

”مجھے معلوم ہے کہ تم دوسروں کی طرف گُل اور ثمر کی برسات کر رہی ہو اس لیے سوچا کہ سلمیٰ کی نظر بچا کر تم سے اپنا حصہ بھی وصول کر لوں۔ ویسے دن دہاڑے اس نائٹی میں تم خاصی دلکش نظر آ رہی ہو۔“ میں نے بلا کسی سبب کے اسے اشتعال دلانے کی نیّت سے کہا۔

”تم بہت گھٹیا آدمی ہو۔“ وہ انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تمھارا بندوبست کرنا ہی ہوگا۔“

”عجب دَور آ گیا ہے۔“ میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ”اب مہمان اپنے میزبانوں کو دھمکیاں دینے لگے ہیں۔“

اس کا انٹرکام کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ رُک گیا اور اس کے بشرے پر حیرت کے آثار نظر آنے لگے۔ ”میزبان؟ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟ مقصد کیا ہے تمھارا؟“

”سیدھی سی بات ہے مادام ریٹا! تم جب بھی یہاں آئی ہو، میری مہمان رہی ہو۔ یہ کلب میری ملکیت ہے اور تم میری چھت کے نیچے مجھے ہی دھمکیاں دے رہی ہو۔ یہ بڑی بُری بات ہے۔“

”لیکن میں نے تو آج سے پہلے کبھی تمھیں یہاں نہیں دیکھا۔“ اُسے میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

”ضرورت پیش نہیں آئی تھی لیکن اب تمھارے تعاون کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔“

”تم یہاں سے نکل جاؤ! تم نے مجھے ہاتھ بھی لگایا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔“ وہ ترش لہجے میں بولی۔ ”تم اس کلب کے مالک ہوتے تو شوچان یوں لاتوں اور مُکّوں سے تمھاری تواضع نہ کر رہی ہوتی۔“

”ہاتھ کیا، میں تمھیں کچھ بھی نہیں لگاؤں گا لیکن تم نے مجھے ابھی تک بیٹھنے کی پیش کش نہیں کی، زیادہ دیر تک کھڑا رہنے کی وجہ سے میں تمھاری شان میں کوئی نازیبا گستاخی بھی کر سکتا ہوں۔“

”بیٹھ جاؤ اور جلدی بکو کہ کیا چاہتے ہو؟“ وہ غراتے ہوئے بولی۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”گھر جانا ہے یا اسرار رضوی دوبارہ آنے والا ہے؟“ میں نے چُبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا اور ریٹا نے جھلا کر شیشے کی ایش ٹرے میرے اوپر کھینچ ماری۔ اگر میں پہلے سے ہوشیار نہ ہوتا تو وزنی ایش ٹرے نے مجھے خاصا زخمی کر دیا ہوتا۔ میں نے ایش ٹرے اپنے ہاتھوں میں لپکی اور سنجیدگی کے ساتھ بولا۔ ”میں نے یہ سوال تمھیں چڑانے کے لیے نہیں کیا بلکہ میں تمھاری معرفت اسرار رضوی سے ملنا چاہتا ہوں، اس سے مجھے ایک ضروری کام ہے۔“

پہلی بار وہ نظریں جھکانے پر مجبور ہو گئی اور دھیمے لہجے میں بولی۔ ”مجھے کچھ نہیں معلوم کہ تم کیا بک رہے ہو۔ اب میں تم سے اسی وقت مزید گفتگو کر سکوں گی جب تم میرے اطمینان کے مطابق اس عمارت میں اپنی حیثیت کا تعین کرا سکو گے ورنہ ابھی تک تو تم محض ایک اُچکے معلوم ہو رہے ہو۔“

”تمھارے اس حریری لبادے میں ایسے ایسے لعل اور گوہر چمک رہے ہیں کہ میں کوئی اُچکا ہوتا تو اب تک ان پر ہاتھ صاف کر کے واپس بھاگ گیا ہوتا۔“ میں نے اس کے سراپا پر ناقدانہ نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”میری شناخت ہی چاہتی ہو تو نیچے سے انٹرکام پر پارسن کو بلا لو۔“

”شوچان تمھیں کیوں نہیں جانتی؟“ اس نے اشتباہ آمیز لہجے میں سوال کیا۔

”وہ نچلے درجے کی ملازمہ ہے۔ میرا تعلق صرف پارسن سے رہا ہے۔ تمھارا معاملہ درپیش نہ ہوتا تو آج بھی شوچان سے یوں دُو بدُو مقابلہ نہ ہوتا۔ وہ احمق لڑکی مجھ سے ناواقف ہے اور میں نے تمھیں ملاقات کے لیے نیچے بلانا مناسب نہیں سمجھا، اس لیے خود اوپر آ گیا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اب تم شوچان کو نوکری سے نکال دو گے؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ مجھے نہیں جانتی اس لیے مقابلے پر اُتر آئی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس کی کارکردگی پر خوشی ہے کہ وہ ہر وقت ڈیوٹی پر مستعد اور چوکنی رہتی ہے۔“

”خود کو متعارف کرائے بغیر اپنی ملازماؤں سے یوں زور آزمائی کرتے پھرنا تمھیں زیب نہیں دیتا۔ ایسی حرکتیں تو ذہنی مریض کرتے ہیں جنھیں وسائل میسر ہونے کے باوجود احساسِ کمتری ستاتا رہتا ہے۔“

”جو چاہو، سمجھ لو! لیکن پارسن کو بلاؤ تاکہ بات آگے بڑھ سکے۔“ میں نے سر جھٹک کر کہا۔

”اگر واقعی تم ذہنی مریض ہو تو شاید تمھیں عورتوں کے سامنے اپنی مظلومیت اور بے چارگی کے اظہار میں لطف آتا ہوگا۔ چلو میرے پیر کا انگوٹھا چوسنا شروع کر دو۔“ اُس نے سلیپر سے داہنا پیر نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ اُس کا انداز اس قدر تحکمانہ تھا کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو بے چون و چرا اُس کے حکم کی تعمیل شروع کر دیتا۔

”پارسن کو بلاؤ لیکن پھر تمھیں میرے انگوٹھے نہیں شاید تلوے چاٹنا پڑیں گے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”میں پارسن کو بُلاتی ہوں۔“ اُس نے ریسیور کا انٹرکام اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تمھیں وعدہ کرنا ہوگا کہ سلمیٰ کو ان تمام واقعات کی بھنک بھی نہیں ملے گی۔ یہاں طے ہونے والے سارے معاملات ہمیشہ میرے اور تمھارے درمیان محدود رہیں گے، کسی تیسرے فریق کو ان سمجھوتوں کا علم نہیں ہو سکے گا۔“

”تم یہاں کھُلے بندوں عیش و عشرت کے لیے آتی ہو، پھر تمھیں اس قدر رازداری کی کیا ضرورت ہے؟ ہو سکتا ہے کہ ڈی سوزا کے لیے بھی تمھاری یہ سرگرمیاں راز نہ ہوں۔“

”ڈی سوزا کرسچین ضرور ہے مگر کٹر مشرقی مرد ہے۔“ وہ بلا توقّف بول پڑی۔ ”وہ مجھ پر بھروسا کرتا ہے، جس دن بھی اُسے علم ہو گیا کہ میں اُس سے بے وفائی کر رہی ہوں تو وہ پہلی فرصت میں مجھے گولی مار کر خودکشی کر لے گا۔“

”وہ اس قدر حسّاس مرد ہے تو تمھاری اس بے راہ روی کا کیا جواز ہے؟“

”اولاد!“ اُس نے بے ساختہ جواب دیا۔ ”ڈی سوزا سے نہ سہی، کسی اور سے اگر ایک دو بچے ہو جائیں تو میرا شوہر اپنی ساری زندگی اُن کی پرورش میں گزار دے گا۔ اُسے علم نہیں مگر میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ مر کر بھی کسی کی ولدیّت کا دعوے دار نہیں بن سکے گا۔ اس کی اَنا اور اپنے مادرانہ جذبات کی تسکین کے لیے میں یہاں اسرار رضوی سے ملنے کا اہتمام کرتی ہوں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ وہ بھی لاولد ہے۔ اس کی بیوی پچھلے پندرہ برس سے اپنے وجود میں کسی نئے وجود کی کلبلاہٹ کی منتظر ہے مگر وہاں گہرا سکوت طاری ہے۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں اس کا مقصد عیاشی نہیں بلکہ کسی مقصد کا حصول ہے۔ اب اگر محاذ پر ہر طرف سنّاٹا طاری ہو تو تم جیسے نرم دل اور مہربان لوگ کیسے ان بدمعاشیوں کا تدارک کر سکتے ہیں؟“

”یہ تمھارے ذاتی معاملات ہیں مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔“ میں نے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے صرف اسرار رضوی سے ملنا ہے اور اسی وجہ سے میں تم تک پہنچا ہوں۔“

”میرا ذہن اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ یہ کلب تمھاری ہی ملکیت ہے لیکن پھر یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ کل رات تمھارے دوست جہانگیر کا کیا حشر ہوا تھا۔ شریفانہ کاموں میں تو ایسی خونریزیاں کہیں دیکھنے میں نہیں آتیں۔ سچ سچ بتاؤ کہ تم کون ہو اور اس کلب سے تمھارا کیا تعلق ہے؟“ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے چہرے پر غصّے کے بجائے فکرمندی کے آثار پیدا ہوتے جا رہے تھے۔

میں نے اُس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اُس کے ہاتھ سے انٹرکام کا ریسیور لے کر محض اندازے کی بنا پر ایک نمبر دبا دیا۔ دوسری طرف سے میری توقع کے عین مطابق پارسن

کی رسیلی آواز سنائی دی تھی۔

"ذرا تم اوپر آجاؤ تاکہ ریٹا کو میری شناخت میں آسانی ہو سکے۔" میں نے اپنی بات مکمل کرکے اُس کا جواب سُنے بغیر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

"پارسن کی گواہی کے بغیر بھی مجھے تمھارے بیان پر یقین ہے لیکن یہ کس قدر عجیب اتفاق ہے کہ کل ہماری ملاقات کہیں اور کسی دوسرے ماحول میں ہوئی تھی۔ لیکن آج ہم ایک دوسرے کے سامنے بے نقاب ہیں۔"

"مجھے اپنے بے نقاب ہونے پر کوئی ملال نہیں لیکن تمھارے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اسرار کے ساتھ تمھارے مراسم میں خاصی گہرائی معلوم ہوتی ہے ورنہ اُس کی ایک کال پر یوں دن دہاڑے یہاں دوڑی نہ آتیں۔ اسی لیے مجھے اُمید ہے کہ وہ بھی تمھارے پیغام پر فوراً یہاں آجائے گا۔"

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، ریٹا نے اپنے شانوں پر شال ڈالتے ہوئے کم اِن کہا اور اگلے ہی لمحے پارسن اپنی سدا بہار مُسکراہٹ کے ساتھ اس کمرے میں آگئی۔

"یہ ہمارے باس اور اس کلب کے چیف ایگزیکٹو ہیں۔"

پارسن نے چند پیشہ ورانہ رسمی فقروں کے بعد ریٹا سے کہا "تمھارے بارے میں مَیں جو کچھ جانتی ہوں، باس اُس سے کہیں زیادہ جانتے ہیں اس لیے تم کو ان کے ساتھ بے تکلفی کے ساتھ بات کرنے میں عُذر نہیں ہونا چاہیے۔ انھیں کوئی شکایت ہوئی تو تم دشواریوں سے دوچار ہو سکتی ہو۔"

"مَیں جانتی ہوں۔" ریٹا نے تلخ لہجے میں کہا۔ "جس روز مجھ سے میری ماضی کی ایک لغزش کے حوالے سے رابطہ قائم کیا گیا تھا مَیں نے اُسی دن سمجھ لیا تھا کہ اب مجھے ساری عمر تم لوگوں کے اشاروں پر ناچنا ہوگا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ میرا شوہر ایک حسّاس آدمی ہے اور سچ کا زہر کبھی برداشت نہیں کر سکے گا۔ اس لیے تم مطمئن رہو، تمھارے باس کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ تم بے فکری سے واپس جا سکتی ہو۔"

پارسن نے میری طرف دیکھا، مَیں نے اپنے سر کی ہلکی سی جُنبش سے اُسے جانے کی اجازت دے دی اور وہ بلا توقف اس کمرے سے باہر نکل گئی۔

"بار بار اسرار کا حوالہ دینے کے بجائے کُھل کر بتاؤ کہ کیا چاہتے ہو؟" ریٹا نے اپنے شانوں پر سے چادر اُتار کر پھینکتے ہوئے کھُردرے لہجے میں کہا۔ "مَیں عورت ہوں اور جانتی ہوں کہ مجھ سے تمھارا ایک ہی مطالبہ ہو سکتا ہے۔ . . ."

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ عورتوں کی رفاقت کے معاملے میں مَیں انتخاب کا قائل ہوں۔ مَیں تمھارے ذریعے اسرار سے ملنا چاہتا ہوں تاکہ اپنے دوست جہانگیر کے دشمنوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا سکوں۔ تم جانتی ہو کہ اس کلب کے حوالے سے میں اسرار سے براہِ راست بھی بات کر سکتا ہوں مگر مَیں کلب کو درمیان میں لائے بغیر ذاتی سطح پر یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔ اتفاق سے تم یہاں مل ہی گئی ہو تو تم سے کام لینا پڑ رہا ہے ورنہ کوئی اور راہ نکالتا۔"

میرے الفاظ پر اس کا چہرہ بجھ گیا۔ شاید اُسے یہ جان کر دُکھ ہوا تھا کہ مَیں اس کے نیم پوشیدہ سراپا کے خوفناک سحر سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ وہ بولی تو اس کی آواز بھی قدرے بوجھل تھی۔ "تم اس کلب کے سربراہ ہو اس لیے یہاں کے ضابطوں سے مجھ سے زیادہ واقف ہو گے۔ کیا مَیں اُمید رکھوں کہ تم سلمیٰ کو میری ان مصروفیات سے آگاہ نہیں کرو گے۔"

"مَیں اسے کمینگی کہوں گا۔" مَیں نے پُرسکون لہجے میں کہا "وہاں تم صرف سلمیٰ کی سہیلی تھیں، یہاں ہم دونوں کے درمیان ایک کاروباری رابطہ ہے۔ کسی ایک رشتے کو دوسرے پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔"

پہلی بار ریٹا کی نگاہوں میں میرے لیے ممنونیت کے جذبات اُمڈ آئے اور اس نے انٹرکام کے برابر میں رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

اسرار سے جس لب و لہجے میں ریٹا کی گفتگو ہوئی، اس سے میرے پیٹ میں گرہیں سی پڑنے لگیں۔ مَیں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک عورت کسی کی بیوی ہوتے ہوئے ایک اجنبی مرد سے اتنی محبت اور اپنائیت سے بات کر سکتی تھی۔ مَیں سگریٹ کے گہرے گہرے کش لیتے ہوئے چھت کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن میرے کان ریٹا کے مکالموں پر مرکوز تھے۔ وہ رسیلے لب و لہجے میں ناز و انداز کے ساتھ اپنے مخاطب سے بات کر رہی تھی اور شاید فریقِ ثانی بھی اس کے ایک ایک لفظ پر فدا ہوا جا رہا تھا کیونکہ ریٹا اس کی فدّے داری نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی تھی۔

"دفتر کے کاموں پر لعنت بھیجو!" ریٹا دل رُبایانہ انداز میں اس سے کہہ رہی تھی۔ "ابھی آجاؤ، مَیں تمھیں اپنے ایک جاننے والے سے ملوانا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد عیش کریں گے۔"

"ایسی باتیں نہ کرو اسرار۔" قدرے توقف کے بعد ریٹا کا دوسرا مکالمہ سُنائی دیا۔ "تم دوست ہو اور وہ میرا جاننے والا ہے۔ مَیں ہر ایک کے ساتھ وہ تعلق نہیں رکھ سکتی جو تمھارے ساتھ ہے۔ تم جانتے ہو کہ ڈی سوزا میری آزادیوں کے معاملے میں کس قدر متعصّب اور تنگ نظر واقع ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی مَیں کلب میں ہی ستا رہی تھی گھر کا ایک چکّر مار کر کسی بہانے سے نو بجے لوٹ آؤں گی۔ تم نیچے ہی میرا انتظار کرنا لیکن یہ خیال رہے کہ رات مجھے اپنے شوہر کے ساتھ ہی گزارنا ہوگی۔"

نو بجے کا وقت میرے لیے مناسب تھا اس لیے میں نے

مداخلت کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ریٹا نے مرد و زن کی روایتی محبوبانہ گفتگو کے ساتھ وقت مقرر کرکے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

"تھینک یو مائی ڈارلنگ!" مَیں نے فوراً اپنی جگہ چھوڑ دی۔

"ٹھیک نو بجے مَیں نیچے تمھارے دوست کا انتظار کروں گا۔ اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے یہ یاد رکھنا کہ میرا اس کلب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"جیسا چاہو گے، وہی ہوگا لیکن یہ یاد رکھنا کہ وہ خود بھی کلب کا ممبر ہے اور یہاں کے بیشتر ضابطوں سے واقف ہے۔"

"وہ سب مَیں سنبھال لوں گا۔" مَیں اس سے رخصت ہو کر نیچے آگیا۔

دفتر میں سینڈو، پارسن کے ساتھ میرا منتظر تھا اس وقت تک عملے میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ ان کا نیا باس معائنے کے لیے آیا ہوا ہے اس لیے کئی لڑکیاں دفتر کے آس پاس منڈلا رہی تھیں تاکہ باقاعدہ تعارف ہونے سے قبل میری ایک جھلک دیکھ سکیں۔

"شوچان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔" میرے بیٹھتے ہی مس پارسن نے کہا۔ "وہ حسّاس لڑکی ہے اور جب سے اسے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ بے خبری میں اپنے نئے باس سے اُلجھ بیٹھی تھی، وہ گھٹنوں میں مُنہ دیے مسلسل روئے جا رہی ہے۔"

"اس سے کہو کہ وہ اس واقعے کو بھول جائے! اس معاملے میں غلطی تم سے ہوئی ہے۔ تمھیں مجھ کو بتانا چاہیے تھا کہ اوپر ایسی صورتِ حال بھی پیش آسکتی ہے۔ وہ غیر متوقع طور پر میرے سامنے آئی تھی۔ مَیں نے محض اس لیے اس کی غلط فہمی دور نہیں کی کہ اس کی کارکردگی دیکھ سکوں۔ وہ واقعی بہت دلیر اور حوصلہ مند لڑکی ہے۔ اسے مارشل آرٹ میں کافی مہارت حاصل ہے۔"

"مجھ سمیت سب لڑکیاں مارشل آرٹ کے کسی نہ کسی شعبے میں مہارت رکھتی ہیں تاکہ ضرورت پیش آنے پر کسی اسلحے کے بغیر اپنا دفاع کر سکیں۔ ہمارا کام ایسا ہے کہ بد دماغ اور نشے میں دُھت مَردوں سے ہر وقت واسطہ پڑتا رہتا ہے جو کسی معقول جواز کے بغیر اچانک تشدّد اور ایذا رسانی پر اُتر آتے ہیں۔ ایسی حرکتوں کی ابتدا عموماً اس وقت ہوتی ہے جب لباس اور اس میں پوشیدہ ہر دفاعی ہتھیار ہماری دسترس سے باہر ہو چکا ہوتا ہے۔"

مَیں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو اولڈ کلفٹن والے معاملے میں خاصا وقت باقی تھا اس لیے مَیں نے پارسن سے کہا۔ "مَیں وقتاً فوقتاً یہاں آتا رہوں گا لیکن اس وقت پورے کلب کا غیر رسمی جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ اس دوران میں اگر شوچان سے ملاقات ہو گئی تو اس کی بھی دلجوئی کر لوں گا۔"

"وہ کچن میں بیٹھی سسک رہی ہے۔" پارسن نے کُرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ سمجھ رہی ہے کہ اسے اپنی گستاخی کے جُرم میں اب ایک عمدہ ملازمت کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ اگر تم ذاتی طور پر اسے دلاسا دے سکو تو اس کا کھویا ہوا اعتماد اور حوصلہ بحال ہو سکے گا۔ وہ میرے عملے کی بڑی مستعد اور فرض شناس لڑکی ہے۔"

مَیں نے جواب میں کوئی تبصرہ نہیں کیا اور سینڈو کے ہمراہ پارسن کے پیچھے ہو لیا۔

آٹھ بجنے میں سات منٹ باقی تھے کہ مَیں سینڈو کے ہمراہ اولڈ کلفٹن پہنچ گیا۔ وہاں کاروں کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی۔ لوگ گھاس کے قطعات اور پتھریلی بینچوں پر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ مَیں نے اپنی کار سے اتر کر قرب و جوار میں نظریں دوڑائیں لیکن کسی ایسی کار کی نشان دہی میں کامیاب نہیں ہو سکا جو مجھے بتائی ہوئی تعریف پر پوری اُترتی۔

پارکنگ لاٹ میں دور دور تک گاڑیاں موجود تھیں۔ وہ پُرفضا علاقہ مردوں، عورتوں اور بچّوں سے بھرا ہوا تھا اور اس بھیڑ میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شہر میں آئے دن ہونے والی بدامنی نے شام کی رونقوں کو تباہ کرکے رکھ دیا تھا لیکن وہاں اس وقت زندگی کی جولانیاں اپنے عروج پر تھیں۔ آگ، خون اور بارود کی بُو سے رچے ہوئے شہر میں ایک طویل مدّت کے بعد مَیں نے بے فکروں کا اتنا بڑا اجتماع دیکھا تھا لیکن دل میں یہ خوف بھی تھا کہ شہر والوں کی خوشیوں کا یہ ننھا سا جزیرہ بھی موت کے سوداگروں کی نگاہوں سے نہیں بچ سکا تھا۔

یہ درست ہے کہ وہاں نہ کوئی خونریزی ہوئی تھی، نہ کسی کے عمر بھر کے اثاثوں کو آگ لگائی گئی تھی مگر یہ حقیقت تھی کہ مافیا کے چیف، سیٹھ حبیب جیوانی نے ہیروئن کی وصولیابی کے لیے اسی ٹھکانے کا انتخاب کیا تھا اور اگر وہ علاقہ ایسے مجرموں کی سرگرمیوں کی آماجگاہ بن رہا تھا تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کب وہاں گولیاں چلنے لگتیں اور ذہن کو تازگی بخشنے والی آوازوں سے مالا مال فضا میں بارود کی زہر سرایت کر جاتا۔

ہم دونوں کسی تجسّس کا مظاہرہ کیے بغیر وہیں کاروں کے قریب ٹہلتے رہے پھر اچانک سینڈو نے سرگوشیانہ لہجے میں مجھے ایک کار کی طرف متوجّہ کیا جو ایک مکان کے احاطے کی دیوار کے ساتھ پارک کی ہوئی تھی۔ نئے ماڈل کی اس نیلی ہنڈا سوک کے پچھلے حصّے میں جیک لگایا جا رہا تھا۔

میری رسٹ واچ میں آٹھ بجنے میں دو منٹ باقی رہ گئے تھے۔ مَیں رخ بدل کر لان سے نیچے اترا اور لاتعلقانہ انداز میں اسی کار کی طرف ہو لیا۔ سیاہ رنگت اور تنومند جسم والا میری توقع سے کہیں زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ڈھیل اگل کیا

اور پھر میری توقع کے عین مطابق آٹھ بجنے سے نصف منٹ قبل کار کا بونٹ اٹھا دیا۔

مطلوبہ شخص سامنے آچکا تھا اس لیے تردد کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں تیزی سے اس کے قریب پہنچا تو وہ ریڈی ایٹر کا ڈھکن ہٹا کر اس میں پانی کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

"فاضل ٹائر ڈھونڈ رہے ہو؟" میں نے قریب پہنچ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ میرا لمس محسوس کرتے ہی وہ بھڑک کر پلٹا تھا۔

نگاہیں چار ہوتے ہی اس کی آنکھوں میں میرے لیے شناسائی کی جھلک پیدا ہوئی تھی پھر وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ارے ڈینی دادا! تم یہاں؟" اس نے بھرپور اعتماد کے ساتھ میرا نام لیا تھا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ "میں نے تو کافی دن پہلے سنا تھا کہ تم کسی مقابلے میں کام آگئے تھے۔"

لمحے بھر کے لیے میں چکرا کر رہ گیا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ جس اعتماد کے ساتھ اس نے مجھے شناخت کیا تھا، اسی اعتماد کے ساتھ میں اس کے قیاس کی تردید کر دوں۔

وہ یقیناً زیرِ زمین دنیا کا کوئی پرانا پاپی تھا جو کبھی مجھ سے مل چکا تھا میں تو اسے یکسر فراموش کر چکا تھا لیکن میرا نام اس کے حافظے میں محفوظ تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھا کم از کم دلدار آغا کے ساتھیوں یا ہمدردوں میں سے نہیں تھا ورنہ بصورتِ دیگر اس کے مافیا والوں سے کاروباری مراسم نہ ہوتے اس لیے میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"زندہ ہوں اور تمہارے سامنے ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں شرمندہ ہوں کہ تمھیں اب بھی نہیں پہچان سکا۔ تمھیں اپنا تعارف کرانا ہوگا۔"

"میرا خیال تھا کہ تم نے پہچان کر ہی مجھے چھیڑا ہے۔" مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے مضطربانہ انداز میں میرے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تعارف میں ذرا وقت لگے گا اور اس وقت میں مصروف ہوں پھر کسی وقت ملاقات ہوگی تو باتیں کریں گے یہاں میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔"

اس پر اپنے آٹھ بجے والے ملاقاتی کی فکر سوار ہو رہی تھی اس لیے وہ جلد از جلد مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہ رہا تھا... شاید اسے یہ خیال بھی رہا ہو کہ کہیں میری وجہ سے اس کا ملاقاتی اس سے ملنے کا ارادہ ہی ترک نہ کر دے۔

"کس کا انتظار کر رہے ہو؟" میں نے اس کی الجھن سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سوال کیا۔

اس نے مجھے ملامت آمیز نظروں سے گھورا۔ "دوسروں کے معاملات میں اتنی دخل اندازی اچھی نہیں ہوتی تمھیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔"

اس کے تیوروں میں جارحانہ رنگ جھلکنے لگا تھا اس لیے میں نے جیب سے نکال کر وہ پھٹا ہوا رقعہ اس کی طرف بڑھا دیا جسے دوسرے ٹکڑے سے ملا کر میری شناخت ہوتی تھی۔

میرے ہاتھ سے کاغذ لیتے ہی اس کے ہونٹوں سے بے اختیار ایک گہرا سانس آزاد ہوگیا۔ "تو یہ بات ہے۔ میں تو تمھیں بن بلایا مہمان سمجھ کر زبردستی رخصت کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

بات کرتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے اسی کاغذ سے پھاڑا ہوا دوسرا حصہ نکالا اور دونوں ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے ملانے کے بعد موڑ کر جیب میں رکھ لیا۔

"اگلی بار کا ٹوکن یہ ہوگا۔" اس نے دوسری جیب سے دو روپے کا ایک نوٹ نکال کر بے پروائی سے پھاڑا اور اس کا ایک حصہ مجھے تھما دیا۔

"کہاں ملنا ہوگا؟" میں نے نوٹ کا پھٹا ہوا حصہ احتیاط سے جیب میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ تمہارے اوپر والے کو بتایا جائے گا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "تم آج پہلی بار آئے ہو۔ سینڈ و پورے پروٹوکول سے واقف تھا معلوم ہوتا ہے اس کی چھٹی کر دی گئی ہے۔"

اپنی بات پوری کرتے ہوئے اس نے اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور مضبوطی سے پیک کیا ہوا ایک چوکور پیکٹ میری طرف بڑھا دیا۔

"ہینڈز اپ!" اسی لمحے آس پاس کی کئی گاڑیوں کی اوٹ سے متعدد تحکمانہ آوازیں سنائی دیں اور وہ پیکٹ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر پختہ سڑک پر گر گیا۔

میں جب ادھر آیا تو اس شخص کی نیلی سوک کے آس پاس کوئی بھی موجود نہیں تھا پھر پتا نہیں وہ چاروں مسلح آدمی کہاں سے نکل پڑے تھے۔

میرے ساتھی نے نوواردوں کے حکم کی فوری تعمیل کی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ سر سے اوپر اٹھاتے ہوئے گردن گھما کر قرب و جوار کا جائزہ لیا تو صورتِ حال سمجھ میں آگئی۔ شاید وہ چاروں گاڑیوں میں چھپ کر موقع کا انتظار کر رہے تھے اور لین دین مکمل ہوتے ہی دروازے کھول کر باہر آگئے تھے۔

ان چاروں کے ہاتھوں میں پستول دبے ہوئے تھے ان کے چہروں کی ساخت اور نرمی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پیشہ ور لٹیرے نہیں تھے لیکن ان کے سادہ لباس میرے ذہن میں الجھن پیدا کر رہے تھے۔

وہ جگہ ہنگاموں سے قدرے دور ایک ایسے گوشے

میں تھی کہ جب تک ریوالور نہ دیکھ لیے جاتے یا کوئی فائر ہوتا کوئی بھی اس طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا غنیمت یہ تھا کہ سینڈو میرے ساتھ آیا تھا اور میرے کام کی نوعیت سے پوری طرح واقف تھا اس لیے وہ مجھے بچانے کے لیے کوئی موثر کارروائی کر سکتا تھا۔

"خبردار! جو کوئی بھی شرارت کرنے کی کوشش کی۔" ان میں سے ایک نے بارعب لہجے میں کہا۔ "اس وقت تم دونوں سینٹرل ایکسائز والوں کی حراست میں ہو... باری! سڑک پر پڑا ہوا پیکٹ احتیاط سے اٹھا لو اس پر ان دونوں کے فنگر پرنٹس موجود ہوں گے۔ وہ ضائع نہیں ہونے چاہئیں۔"

"صوبائی آبکاری والوں کا کام مرکز والوں نے کب سے سنبھال لیا؟" میں نے ان پر اپنے اعتماد کا اظہار کرنے کی نیت سے خوش دلی سے کہا۔ "یہ بتا دوں کہ اس پیکٹ یا کار سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو اس بے چارے کو ٹائر بدلنے میں مدد دینے کے لیے ادھر آیا تھا کہ تم لوگوں نے دھاوا بول دیا۔"

"یہاں چہکنے کی ضرورت نہیں۔" افسر نما شخص نے تیز لہجے میں کہا۔ "ہمیں معلوم تھا کہ آج گڑبڑ کے بعد شہر میں امن و امان کی صورتِ حال خراب ہے تو تم لوگ بھرپور فائدہ اٹھاؤ گے۔ یہ کالیا پچھلے دس دن سے ہماری نظروں میں ہے اور آج یہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ ہم اس سے کھایا پیا تک اگلوا لیں گے۔"

"ضرور اگلوا لینا مگر اس کالیے کے ساتھ مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہو؟" میں نے احتجاج کیا۔

"بکواس مت کرو!" اس بار افسر کے بجائے اس کا ایک ماتحت غرایا تھا۔ "تمہاری پوری گفتگو سنی گئی ہے۔ اس نے اگلی مرتبہ کے لیے ٹوکن پھاڑ کر تمھیں دیا ہے، صرف وہی تم کو سزا دلوانے کے لیے کافی ہے۔"

"اس گاڑی کو یوں ہی جیک پر لاک کر دو۔" افسرِ اعلیٰ نے اپنے ماتحتوں کو ہدایت دی۔ "باری یہاں رکے گا۔ ہم دفتر سے کوئی بندوبست کر کے گاڑی وہیں منگوا لیں گے۔"

"مگر میں تو بے قصور ہوں۔" میں نے ان لوگوں کے غیر جارحانہ رویے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے احتجاج کیا کیونکہ میں دیکھ چکا تھا کہ سینڈو نے دور ہی سے گڑبڑ کا اندازہ لگا لیا تھا اور اپنے ساتھ کچھ اور تماشائیوں کو شامل کر کے ایک گروہ کی صورت میں ہماری طرف آ رہا تھا۔

ہنڈا سوک کا بونٹ بند کر دیا گیا۔ پنکچر شدہ ٹائر، وہیل پانا اور لیور راڈ، ڈکی میں ڈال دی گئی اور دروازے مقفل کر کے افسرِ اعلیٰ نے کار کی چابی اپنی تحویل میں لے لی۔ اسی اثنا میں سینڈو اپنے ہمراہ چند متجسس تماشائیوں کو لے کر ہمارے قریب آگیا۔

"یہ کارروائی قانون کے نام پر ہو رہی ہے۔" انھیں دیکھتے ہی افسر نے تحکمانہ آواز میں کہا۔ "یہ دونوں موت کے سوداگر ہیں اور اس وقت ہماری تحویل میں ہیں۔ جس کسی نے مداخلت کی کوشش کی اسے بھی کارِ سرکار میں رکاوٹ ڈالنے اور قانون سے تعاون نہ کرنے کے الزام میں حراست میں لے لیا جائے گا۔ اس لیے جو جہاں ہے وہیں رکا رہے۔ پیش قدمی کو سنگین جرم تصور کرتے ہوئے سخت کارروائی کی جائے گی۔"

سرکار اور قانون کا تذکرہ بڑھتے ہوئے تماشائیوں کے قدموں میں زنجیر بن گیا۔ ان میں سینڈو سب سے آگے تھا۔ وہ بہت مضطرب اور متجسس نظر آ رہا تھا۔

"پتا نہیں کہ یہ کون لوگ ہیں جو ہمیں اغوا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔" میں نے سینڈو کو آگاہ کرنے کی نیت سے رکے ہوئے مجمع سے فریادی انداز میں خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "ان کا دعویٰ ہے کہ یہ سینٹرل ایکسائز والے ہیں لیکن ان کے پاس نہ وردی ہے، نہ شناختی کاغذات۔ ہتھیار تو چور ڈاکو بھی لیے پھرتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو ورنہ مار مار کر سور بنا دیں گے۔" ان میں سے ایک غرایا اور پھر ہمیں قریب ہی کھڑی ہوئی، کھلی ہوئی گاڑیوں کی طرف دھکیلا جانے لگا۔

میرے لیے وہ میری زندگی کا تلخ ترین تجربہ تھا کیونکہ پولیس یا کسی اور سرکاری محکمے سے میرا کم ہی واسطہ پڑا تھا لیکن مافیا میں شرکت کے بعد پر پرزے نکالنے کے چکر میں میں گردش میں آگیا تھا۔ اگر میں نے حبیب جیوانی سے بلاوجہ بحث نہ کی ہوتی تو اس وقت میرے بجائے سینڈو اس مرحلے سے گزر رہا ہوتا اور میں کہیں اور چین سے بیٹھا ہوتا۔

ان کی دونوں گاڑیوں پر سرکاری نمبر پلیٹیں تھیں جس کا مطلب تھا کہ وہ جھوٹے نہیں تھے۔ ہم دو تھے اور گاڑی کی نگرانی پر چھوڑے جانے والے آدمی کے بعد ان کی نفری کل تین رہ گئی تھی اس لیے بیک وقت دونوں گاڑیوں کا استعمال ممکن نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی بھی ایک گاڑی مقفل کر کے وہیں چھوڑ دی۔ دوسری میں ہم پانچوں اس طرح سوار ہوئے کہ ان لوگوں کو دھوکا دے کر کوئی مدافعانہ کارروائی کرنے کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔

رہی سہی کسر آہنی ہتھکڑیوں نے پوری کر دی جو گاڑی اسٹارٹ کرنے سے قبل ہمارے ہاتھوں میں پہنا دی گئی تھیں۔

"تم لوگ میرے ساتھ ظلم کر رہے ہو۔" گاڑی کے حرکت میں آتے ہی میں نے احتجاج کیا۔ "مجھے تو اس کالیے کا نام بھی معلوم نہیں ہے جس کے ساتھ تم مجھے لیے جا رہے ہو۔"

"لیکن اسے تمہارا نام معلوم ہے۔" کار ڈرائیو کرنے والا غرایا۔

"اب خاموش رہو ورنہ کھوپڑی توڑ دی جائے گی۔"

"یہ کچا آدمی ہے سرجی!" کالیے نے پہلی مرتبہ بھرّائی ہوئی آواز میں زبان کھولی۔ "تم مجھ سے معاملے کی بات کرو۔ اپنے قول سے پھر جاؤں تو میری زبان کٹوا کر کسی نالے میں پھکوا دینا۔ . . ٹکا ٹکا ہو جائے تو میرے ساتھ تمھارا بھی کچھ فائدہ ہو جائے گا ورنہ تم جانتے ہو کہ تم لوگوں نے پورا زور بھی لگا لیا تو دو چار برس سے زیادہ کی جیل نہیں ہو سکے گی۔ ہو سکتا ہے کہ تمھارے مال خانے سے یہ پیکیٹ عدالت میں پیش کیا جائے تو اس سے گلوکوز برآمد ہو۔ یہ جن لوگوں کا مال ہے ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ اپنے آدمیوں کو کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتے۔"

مجھے حیرت تھی کہ اسے درمیان میں کسی نے نہیں ٹوکا تھا بلکہ وہ تینوں بظاہر غور سے اس کی بات سن رہے تھے۔

"سزا کی تم فکر نہ کرو۔" کار ڈرائیو کرنے والا بولا۔ "سزا بڑھانے کی ترکیبیں ہمیں معلوم ہیں۔ ہیروئن رکھنے پر دو سال کی سزا ہوگی تو سرکاری ملازم کی وردی پھاڑنے اور سرکاری اسلحہ چھیننے کے جرم میں سات برس کی قید ہوگی۔ ہم لوگ بھی سجانے پاپیوں کے سامنے کچی گولیاں نہیں کھیلتے۔"

"خدا کی پناہ!" کالیا کراہا۔ "تم لوگوں نے تو وردیاں ہی نہیں پہنی ہوئی ہیں تو پھر کوئی کیا پھاڑے گا اور نہ ہی ہم دونوں میں سے کسی نے تمھارے اسلحے کو ہاتھ لگایا ہے . . ."

"یہ سب تمھیں عدالت میں ثابت کرنا ہوگا۔ ہم چاروں کے علاوہ کچھ چشم دید گواہ بھی ہوں گے جو حلفیہ تمھارے حرامی پن کی گواہی دیں گے۔ قانون کی کمی ہم اپنے جوڑ توڑ سے پوری کر لیتے ہیں۔"

"سر! اتنے دردِ سر سے تم کو کیا حاصل ہوگا۔ سرکاری نوکری میں تو گھر کا خرچ بھی مشکل سے چلتا ہے۔ سودا کرو تو پورے دو لاکھ مل سکتے ہیں۔ فی کس پچاس ہزار خاصی بڑی رقم ہوتی ہے۔"

"اور اس پیکیٹ میں مال کتنی مالیّت کا ہے؟" چبھتی ہوئی آواز میں سوال کیا گیا۔

"پتا نہیں۔" وہ بولا۔ "لیکن ایسے کیسوں میں مال تو چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔ اسے بیچ کر تمھیں جو کچھ ملے گا وہ دو لاکھ کے علاوہ ہوگا۔ یہ سودا کر کے تم گھاٹے میں نہیں رہو گے۔ مجھے سزا دلوا بھی دی تو محکمہ تمھیں کیا دے گا؟ ترقی باری آنے پر دی جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی سرٹیفکیٹ دے دیا جائے گا۔ ایسے کاغذ کے چیتھڑے نہ تمھارا پیٹ بھر سکتے ہیں اور نہ میرے کاروبار کو نیست و نابود کر سکتے ہیں۔ کیا پتا کہ میرے جیل سے رہا ہونے سے پہلے ہی میرے بے رحم مالکان تم میں سے کسی سے اپنے نقصان کا بدلہ لے ڈالیں۔ وہ بڑے سفّاک اور بے رحم لوگ ہیں۔ دشمن کو زندہ چھوڑنا ہی نہیں جانتے۔ میں تو کرائے کا آدمی ہوں، جیل چلا گیا تو وہ میری جگہ کسی اور آدمی سے کام لینا شروع کر دیں گے۔"

"ہمیں تمھارے مالکان ہی کی تلاش ہے۔" تلخ لہجے میں جواب دیا گیا۔ "تم جیسے کرائے کے ٹٹو تو آئے دن پکڑے جاتے ہیں۔ جب تم اپنی بولی دو لاکھ لگا سکتے ہو تو تمھارے مالکان تو کروڑوں کی اسامی ہوں گے۔"

کالیا اس کا مقصد فوراً بھانپ گیا اور شاطرانہ لہجے میں بولا۔ "اسامی وہ ہوتی ہے جو سامنے ہو۔ ان سے جب ان کے آدمی ہی واقف نہیں ہوتے تو تم کیسے ان کا سراغ لگا سکتے ہو۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مفت میں ہاتھ ملتے رہ جاؤ۔" میں نے انھیں ترغیب دلانے کی نیّت سے کہا۔ "تم نے سمجھوتا نہ کیا تو وہ لوگ تمھارے کسی افسر کو خرید لیں گے اور تم اس کالیے کو رہا کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ تمھارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔ جو لوگ بڑے دھندے کرتے ہیں ان کے ہاتھ بھی لمبے ہوتے ہیں۔"

"کم از کم تم تو مجھے کالیا نہ کہو۔" وہ مجھ سے شکایتی لہجے میں بولا۔ "میرا نام سراج ہے۔"

اس کی زبان سے اس کا نام سنتے ہی میرا ذہن روشن ہو گیا۔ اور مجھے یاد آ گیا کہ وہ کون تھا۔ وہ حکیم زادہ خان کا بہت پرانا نمک خوار تھا اور ابتدا ہی سے اس کا مال تقسیم کرتا تھا۔ حکیم زادہ سرحدی علاقے میں واقع ہیروئن کشید کرنے کے دو کارخانوں کا مالک تھا اور اپنے علاقے کو اس لعنت کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے معاملے میں اس قدر کٹر تھا کہ اس نے اپنے گاؤں کے ایک غریب چرواہے کو ہیروئن کے چند کش لینے کے جرم کی پاداش میں تھپیڑوں سے اس بری طرح زخمی کیا تھا کہ وہ پشاور کے ایک اسپتال میں مہینوں صاحبِ فراش رہا تھا۔

حکیم زادہ اپنے اصولوں کی سختی سے پابندی کرتا تھا اور اپنے آدمیوں کو بُرے وقت میں کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا تھا جس کے صلے میں پکڑے جانے والے افراد بدترین تشدّد سہہ کر بھی اس کا نام زبان پر نہیں لاتے تھے۔ اگر حبیب جیوانی اسی سے دھندا کر رہا تھا تو اس غیر تعلیم یافتہ قبائلی سے اسے نقصان پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

"افسر اس وقت کام خراب کر سکتا ہے جب واردات کا ڈاکومینٹیشن نہ ہوا ہو اور معاملات زبانی کلامی چل رہے ہوں۔ ایک بار تفصیلات سرکاری کاغذات پر آ جائیں تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ میں دیکھوں گا کہ تم دونوں کو میرے چنگل سے کون مائی کا لال چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔"

اس کے طرزِ گفتگو نے میرے دل میں خوف پیدا کر دیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ کام کرنے والے اپنے لیے ہر جگہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے ہیں جس کا توڑ نیچے والوں کے پاس نہیں ہوتا۔ . . منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

ان . . . یوس کن حالات میں مجھے صرف اس بات کی خوشی . . . ہیں تنہا اولڈ کلفٹن پہنچ کر اس جال میں نہیں پھنسا تھا بلکہ . . . نے پوری صورتِ حال کو بچشمِ خود دیکھا تھا اور وہ واپس . . . ہی اپنے طور پر یا حبیب جیوانی کے ذریعے میری گلو خلاصی کی . . . شوں کا آغاز کر دیتا۔

شہر میں صبح پھوٹ پڑنے والے خوں ریز ہنگاموں کی . . . ت ہر طرف لہرا رہی تھی۔ سڑکیں ویران پڑی ہوئی تھیں۔ . . . کلفٹن پہنچنے والے نہ جانے شہر کے کن علاقوں کے باسی . . . ان کے دلوں پر شہر کی پامالی اور ویرانی ذرا بھی اثر انداز . . . ہوئی تھی اور وہ اپنی تفریحات میں پوری طرح مگن تھے۔ . . . ڈیفنس، کالاپل اور طارق روڈ کے علاقے سے گزرتی . . . وہ کار سوسائٹی کے علاقے میں ایک بڑے بنگلے میں واقع . . . ائز والوں کے دفتر کے احاطے میں داخل ہوئی۔ وہاں . . . روں کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ دفتر بظاہر ویران نظر آ رہا . . . باہر ایک چبوترے پر دو باوردی سپاہی شاید ہمیں لانے . . . والوں کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

اپنے افسروں کا ہاتھ بٹانے کے لیے دونوں باوردی . . . سپاہی اپنے ڈنڈوں سمیت جارحانہ تیوروں کے ساتھ کار . . . طرف لپکے تھے۔ میں موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے خاموشی . . . کے ساتھ نیچے اُتر گیا۔ سراج کی شامت ہی آئی ہوئی تھی کہ . . . اس نے پیچھے سے اپنا کالر کھینچے جانے پر غرّا کر احتجاج . . . کیا اور طویل انتظار سے اکتائے ہوئے ایک سپاہی نے . . . کھلے ہوئے دروازے میں سے اپنا دھڑ اندر ڈال کر اس کی . . . کھوپڑی پر ڈنڈا رسید کر دیا۔

اس چپقلش کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب سراج کو کھینچ کھانچ . . . کر کار سے باہر نکالا گیا تو اس کے سر کے عقبی حصّے سے . . . خون بہہ رہا تھا اور قمیص کئی جگہ سے تار تار ہو چکی تھی۔

کار ڈرائیو کرنے والے نے، جو ان میں سب سے سینئر افسر . . . معلوم ہو رہا تھا، اونچی آواز میں ہم دونوں کو حوالات میں بند . . . کرنے کا حکم دیا اور ہمیں چار افراد کی نگرانی میں اندر لے جایا . . . جانے لگا۔ ہماری ہتھکڑیوں کی زنجیریں ہمارے ساتھ آنے . . . والے ایک شخص نے تھامی ہوئی تھیں۔

ایکسائز والوں کی حوالات پولیس اسٹیشن کے لاک اپ . . . سے بدرجہا بہتر اور صاف ستھری تھی البتہ وہاں گرد و غبار کی کثرت . . . سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کافی مدت کے بعد اسے آباد کیا گیا . . . تھا اور شاید اس کا کم استعمال ہی اس کی مجموعی بہتر حالت . . . کا سبب تھا۔ چھت میں لگے ہوئے بلب کی ناکافی روشنی . . . میں ہمیں اندر دھکیل کر آہنی دروازہ مقفّل کر دیا گیا۔

ہتھکڑیوں کی زنجیروں کے سرے آپس میں اس طرح جوڑ دیے گئے تھے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بندھ کر رہ گئے۔

"سالے نے بڑے زور سے ڈنڈا مارا تھا۔" سراج بائیں ہاتھ سے اپنی کھوپڑی کے عقبی حصّے کو ٹٹولتا ہوا بڑبڑایا۔ "ہاتھ آ جاتا تو نتیجے کی پروا کیے بغیر اس کی گردن رگڑ کر رکھ دیتا۔"

"ایسے موقع پر چپ سادھ لینے میں ہی عافیت رہتی ہے۔" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "نچلے درجے کے لوگ افسروں کے سامنے اپنی بہادری جتانے کے لیے ایسی ہی اوچھی حرکتوں پر اُتر آتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ سر تو زخمی ہوا ہے لیکن ہمارے ستارے یاوری کرنے والے ہیں۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں سرگوشی کی۔

"تم ڈنڈا کھا کر پُرامید نظر آ رہے ہو مگر میں پٹے بغیر بھی مایوسی کا شکار ہوں۔ یہ لوگ لین دین کے عادی ہوتے تو تمھاری پیش کش پر ضرور غور کرتے۔" میں نے فرش پر پڑے ہوئے کمبل کا سرا جھاڑتے ہوئے کہا۔

"قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے کاغذات بنانے کے بجائے ہمیں براہِ راست حوالات میں ڈال دیا ہے۔"

"اس میں کون سی اچھی بات ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"انھوں نے ہماری پیش کش تو سُن لی لیکن انھیں آپس میں مشورہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اب وہ کچھ طے کرنے کے بعد ہی ہماری طرف آئیں گے۔ میں اپنی آفر دے چکا ہوں۔ اب اگر اس میں کچھ اضافہ کرنا پڑا تو اس کا بوجھ تم کو اٹھانا ہوگا کیوں کہ اب ہم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔"

ہم دونوں کافی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پولیس کے مقابلے میں ایکسائز والوں کا رویّہ بہت نرم تھا کہ انھوں نے ہماری جامہ تلاشی لے کر ہمیں اپنے اثاثوں سے محروم نہیں کیا تھا جن میں میری سگریٹ کا ذخیرہ بھی شامل تھا۔ سراج تمباکو نوشی کا عادی نہیں تھا لیکن اس کے پاس اپنے پانوں کی پڑیا موجود تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد بڑا افسر اپنے ایک ماتحت کے ساتھ حوالات کی طرف آیا تو مجھے توقع تھی کہ وہ ہمیں باہر نکال کر اپنے کمرۂ مدارات میں لے جا کر بازپرس کا سلسلہ شروع کرے گا لیکن وہ دروازہ کھولے بغیر باہر ہی کھڑا ہو کر ہمیں گھورنے لگا۔ ہم دونوں فدویانہ انداز میں آہنی جالیوں کے قریب پہنچ گئے۔

"تم کس کے آدمی ہو؟" اس نے باری باری ہم دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"ویسے تو دس نام بتا سکتے ہیں لیکن اصل آدمی سے ہم خود لاعلم ہیں۔" سراج نے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کر کے مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لیا مگر میں دانستہ خاموش ہی رہا۔

"پھر تمھیں چھڑانے کون آئے گا؟" اس افسر کا لہجہ غیر ارادی طور پر قدرے نرم اور دھیما ہو گیا تھا۔ مجھے سراج کا اندازہ درست ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔

"کوئی بھی آسکتا ہے، کوئی کام کی بات تو سامنے آئے۔" سراج نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"میرے علاوہ بھی اوپر نیچے والے ہیں۔ یہ چھاپا مخبری پر مارا گیا تھا اس لیے مخبر کی زبان بند رکھنے کے لیے اسے بھی ایک معقول رقم دینی پڑے گی۔ یہ حساب دس سے کم میں نہیں بنے گا۔"

"باپ رے!" سراج کراہا۔ "ہم اتنے اہم آدمی نہیں ہیں کہ ہمارے لیے. . ."

"اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ اپنی خاموشی توڑ دو۔" وہ سراج کی بات کاٹ کر بولا۔ "اپنے بڑوں کے نام بتا دو، ان سے معاملہ بن گیا تو تمھیں بھی شریک کر لیں گے اور مقدمہ چلنے کی نوبت آئی تو تمھیں وعدہ معاف گواہ بنا کر صاف بچا لیں گے۔ تم دونوں ہر طرح فائدے میں رہو گے۔"

"جو بات میں خود نہیں جانتا، وہ تم کو کیسے بتا سکتا ہوں۔" سراج نے اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم مال جوں کا توں واپس لوٹانے کا وعدہ کرو تو رقم میں تھوڑا بہت نہیں بلکہ دوگنا اضافہ ہو سکتا ہے۔"

"مال کو تو بھول جاؤ، آدھا ہمارا ہو گیا۔ آدھا روزنامچے میں درج ہو کر سرکاری مال خانے میں جائے گا۔" اس نے مکارانہ لہجے میں کہا۔

"روزنامچے میں مال کی برآمدگی دکھاؤ گے تو ہمارا کیا بنے گا؟" سراج نے بوکھلا کر سوال کیا۔

"اب آخری بات سن لو۔" وہ نیچی آواز میں بولا۔ "چار لاکھ سے کم میں سودا نہیں بنے گا۔ رقم بھی آج رات ہی ملنی چاہیے۔ روزنامچہ بنانا ہمارا کام ہے، ہم لکھ دیں گے کہ مجرم سرکاری گاڑی سے خوف زدہ ہو کر مال چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ تم پر آنچ بھی نہیں آئے گی۔"

سراج نے استفسار طلب نظروں سے میری طرف دیکھا اور کوئی جواب نہ پا کر اس سے بولا۔ "مجھے فون کرنا پڑے گا۔ بات دو لاکھ کی بھی ہوتی تو مجھے رقم باہر سے منگوانی پڑتی۔"

"تم دفتر سے فون کر لو، تمھارا ساتھی یہیں بند رہے گا۔" افسر نے تائید طلب لہجے میں کہا۔

"منظور ہے۔ کام تو ویسے بھی مجھی کو کرنا پڑے گا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "لیکن میں تخلیے میں فون کروں گا۔ میرے آس پاس کوئی موجود نہیں ہو گا۔ نہ ہی دوسری کسی لائن پر میری بات سنی جائے گی۔" افسر کی کمزوری سامنے آنے کے بعد سراج کا لہجہ پُراعتماد ہو گیا تھا اور وہ اپنی شرائط بھی پیش کرنے کی پوزیشن میں آ گیا تھا۔ رقم کا ذکر زبان پر لاتے ہی ساہوکار، چور اور چور، ساہوکار بن گیا تھا اور یہی ایک نکتہ ایسا تھا جس کے سہارے ڈرگ مافیا جنوبی افریقہ سے مشرقِ بعید تک، ہر جگہ اپنی جنگ جیتتی چلی آ رہی تھی۔ اس کی پیش قدمی کی رفتار اس قدر بھیانک تھی کہ اگلی صدی سے پہلے مہذّب دنیا میں ہر طرف اس کی حکمرانی یا پھر حکمرانوں کے ذریعے بالادستی کے امکانات روشن نظر آ رہے تھے۔

"میں یہاں سے لے جا کر تمھیں اپنے دفتر میں بند کر دوں گا۔ ہم لوگ اسٹینو کے کمرے میں تمھارے فارغ ہونے کا انتظار کریں گے، ہم میں سے کوئی تمھاری گفتگو نہیں سنے گا۔" اندھے اور بہرے قانون نے اس افسر کے ذریعے ایک گھناؤنے مجرم کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور سراج میرا بازو پکڑ کر مجھے حوالات میں جالیوں سے دُور لے گیا۔

"ابھی بھی سوچ لو، دو لاکھ کا اپنا حصّہ دینے کے لیے تیّار ہو تو میں یہ قصّہ ابھی ختم کرتا ہوں۔ بعد میں کوئی گڑبڑ ہو جائے تو شکوہ نہ کرنا کہ سراج دَغا دے گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے والے میری خاطر دو لاکھ سے زیادہ ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں دیں گے۔ مقدّمہ بنا تو اس سے بہت کم رقم خرچ کر کے وہ مجھے بَری کرا لیں گے۔"

"انھیں اتنی اچھی طرح جانتے ہو تو یہ فون وغیرہ کا چکر چلانے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے ترش لہجے میں کہا۔ "اصولی طور پر تاوان دینا تمھاری ذمّے داری ہے کیونکہ ان خبیثوں کو تم ہی اپنے پیچھے لگا کر لائے تھے۔"

"میرا کام ختم ہو چکا تھا۔" وہ اپنی جیب تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "کاغذ کے دونوں ٹکڑے میرے پاس ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ میں اپنی ڈیل پوری کر کے ہلکا ہو چکا تھا۔ رنگے ہاتھوں گرفتاری تمھاری ہوئی ہے اس لیے لین دین کا سارا بوجھ تم کو اُٹھانا چاہیے۔"

اس کی مکاری پر میرا خون کھول اُٹھا۔ حالات میں ذرا سی تبدیلی آتے ہی اس نے گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا تھا۔ میرے لیے دو لاکھ روپے کی حیثیت استنجا کرنے والے ڈھیلے سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس کے رویّے کو دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس مد میں ایک روپے کی بھی ذمّے داری قبول نہیں کروں گا۔ میرا اپنا کھونٹا بہت مضبوط تھا۔ میرا خیال تھا کہ جلد یا بدیر مجھے اس قید سے نجات مل ہی جانی تھی۔

"تم اب توتے کی طرح آنکھیں بدل رہے ہو۔ یہ لوگ میرے نہیں، تمھارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ڈیلیوری مکمل نہیں ہو سکی تھی اس لیے میرا کاغذ مجھے لوٹا دو ورنہ یہ یاد رکھنا کہ اس کا ایک پیسہ بھی نہیں مل سکے گا۔"

ہم دونوں نیچی آوازوں میں اپنی بحث میں اُلجھے ہوئے تھے اور بے ضمیر افسر اپنے ماتحت کے ہمراہ اردلی کی طرح ہمارے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ سراج اپنی جگہ اڑا ہوا تھا اور میں بھی اپنے مؤقف پر ڈٹ گیا تھا۔ مجھے ڈر ہوا کہ ہماری بحث تکرار میں نہ بدل جائے اور اونچی آوازیں باہر کھڑی ہوئی مسکینوں کی جوڑی کو ہماری طرف متوجّہ کرنے کا سبب نہ بن جائیں۔ سراج سے وہ معاملہ اس کی واپسی پر بھی طے کیا جا سکتا تھا۔

"اسے لے جاؤ!" میں نے اونچی آواز میں باہر والوں سے کہا اور ماتحت تالا کھول کر حوالات کے اندر آ گیا۔ اس نے ہماری ہتھکڑیوں کی زنجیروں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ سراج نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "زنجیر نہیں، میری ہتھکڑی کھولو، میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔"

ماتحت نے بے بسی سے اپنے افسر کی طرف دیکھا اور اس نے سر ہلا کر سراج کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ کلائی آہنی زیور سے آزاد ہوتے ہی سراج حوالات سے باہر نکل گیا اور میں دو ہتھکڑیوں کے ساتھ حوالات میں تنہا رہ گیا۔ ماتحت حوالات میں تالا لگا کر اپنے افسر اور سراج کے پیچھے چل دیا۔ میں نے کمبل پر دراز ہو کر وقت گزاری کے لیے نئی سگریٹ سلگا لی۔

وقت دھیمے دھیمے گزرتا رہا۔ میرے اپنے انتظامات کے مطابق اس محکمے کے ایک اعلیٰ افسر کو نو بجے ریٹا سے ملاقات کے لیے کی کلب آنا تھا۔ اس افسر سے مل کر میں دلدار آغا کی جانہ فارماسیوٹیکل کے معاملے پر بات کرنا چاہتا تھا تاکہ زندگی میں نہ سہی تو دلدار آغا کے مرنے کے بعد ہی لوگوں کو علم ہو سکے کہ وہ دوا سازی کی آڑ میں کس قدر گھناؤنا دھندا کر رہا تھا۔ فیکٹری کے اہم اور خفیہ حصّوں تک رسائی کے لیے وہاں کسی بااختیار سرکاری ادارے کی دخل اندازی ناگزیر نظر آتی تھی لیکن گرفتاری کی ناگہانی افتاد کی وجہ سے میرا وہ مقصد عارضی طور پر پس پشت چلا گیا تھا اور میری دلچسپی اتنی رہ گئی تھی کہ اسرار کی کلب آئے اور سینڈرا سے مشکل سے آگاہ کر دے تاکہ میری گلوخلاصی کی کوئی راہ نکل سکے۔

سراج کو گئے ہوئے جب تقریباً بیس منٹ ہو گئے تو میری طبیعت پر اضطراب طاری ہونے لگا۔ ایک فون کر کے جواب حاصل کرنے میں اتنی دیر لگنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

پھر عمارت کے دُور افتادہ حصّے سے بھاگ دوڑ کی آوازیں آنی شروع ہوئیں تو میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ شاید مطالبے سے انکار پر سراج کے ساتھ تشدد کا آغاز ہو گیا تھا۔

اسی دوران میں احاطے میں کسی کار کا انجن بیدار ہوا اور وہ آواز تیزی کے ساتھ دُور ہوتی چلی گئی جیسے کوئی عجلت میں وہاں سے روانہ ہوا ہو۔ میں اپنی جگہ چھوڑ کر بے اختیار حوالات کی جالیوں کے قریب چلا گیا۔ سراج جو کچھ بھی تھا، اس وقت میری ہی برادری کا ایک فرد تھا اور اگر وہ کسی مشکل سے دوچار ہو گیا تھا تو یہ بات یقینی تھی کہ تھوڑی دیر میں میری بھی باری آنے والی تھی جس سے مفر کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

دلدار آغا کے ڈی ڈی ہونے کے بارے میں میں نے سیٹھ حبیب جیوانی کو چیلنج کر کے بہت قلیل مدت میں سُرخروئی حاصل کر لی تھی لیکن سینڈرا کے بارے میں میری ضد مجھے اپنے گلے پڑتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

پھر باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی تیز آواز کے ساتھ ایک ڈنڈا بردار، باوردی سپاہی راہداری میں نمودار ہوا اور میری جھلک دیکھتے ہی اُلٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ فضا میں کسی انجن کی تیز غراہٹ قریب آتی ہوئی سنائی دی اور احاطے میں آ کر دم توڑ گئی۔ چند ثانیوں بعد کسی کار کا دروازہ پُرشور آواز سے بند ہوا اور عمارت کے اندرونی حصّے سے ایک بار پھر ہلچل کی آوازیں سنائی دینے لگیں جو انتہائی غیر منظم بلکہ عاجلانہ محسوس ہو رہی تھیں۔

بے یقینی اور بے فکری کی وہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکی کیوں کہ مجھے گرفتار کرنے والا افسر اپنے دو سادہ پوش ماتحتوں اور دونوں باوردی سپاہیوں کے ساتھ حوالات کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ ان سب کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ میں نے ہتھکڑی سے منسلک دُہری زنجیر اپنی کلائی کے گرد لپیٹ کر اس طرح پکڑ لی کہ ضرورت پیش آنے پر، کھلی ہوئی دوسری ہتھکڑی سے انھیں خود سے دُور رکھنے میں کامیاب ہو سکوں۔

"پکڑ لو اس . . . کو۔" افسر نے قریب آ کر ایک غلیظ گالی دیتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔ "اور اس کی ہڈیاں توڑ دو۔ جب تک یہ زبان نہ کھولے، اسے بُری طرح مارتے رہو، مر گیا تو اسے کہیں بھی پھینک دیں گے۔ اس کا نام بھی فسادات

کا نشانہ بننے والوں کی فہرست میں شامل ہو جائے گا۔"

"خبردار! میرے قریب نہ آنا۔" میں نے سنگین خطرہ بھانپ کر دروازے سے دُور ہٹتے ہوئے کہا۔ "میں اسی ہتھکڑی سے تم سب کے سر کھول دوں گا خواہ بعد میں مجھے سُولی چڑھنا پڑے۔"

میری اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ حوالات کا دروازہ کھول لینے کے باوجود ان میں سے کسی نے اندر آنے کی جرأت نہیں کی لیکن اپنے آدمیوں کی کم ہمتی دیکھ کر افسر کا پارہ چڑھ گیا اور اس نے غصے سے اپنا پستول نکال لیا۔

"اندر گھس جاؤ! اور مارو اِسے!" وہ غرّایا۔ "اگر کسی کو ہتھکڑی سے ضرب آئی تو میں فائر کر کے اس کی پنڈلی کی ہڈی توڑ دوں گا۔"

اس کی وہ ہدایت سنتے ہی چاروں افراد وحشیوں کی طرح اندر گھسے تھے اور جونکوں کی طرح میرے بدن سے لپٹ گئے۔ مجھے اپنا ہاتھ تک ہلانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ بلکہ زنجیر ہاتھ سے چھوٹ جانے کی وجہ سے میرا ہتھکڑی والا ہاتھ بالکل ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا اور مجھے صرف ایک ہاتھ سے اپنا دفاع کرنا پڑ رہا تھا۔

ان چاروں میں ایک سپاہی میرے حق میں جلاّد بنا ہوا تھا۔ وہ مُکّوں اور لاتوں کے درمیان اچھل اُچھل کر میرے بازوؤں، شانوں اور کھوپڑی پر ڈنڈے سے وار کر رہا تھا۔ آخرکار ایک بار اُس کا ڈنڈا میری گرفت میں آ ہی گیا اور میں نے مشینی انداز میں تیزی کے ساتھ اُن چاروں کی کھوپڑیاں بجانی شروع کر دیں۔ اُن میں سے دو چیخیں مارتے ہوئے مجھ سے دُور بھاگ گئے۔ تیسرے نے ہتھکڑی کی زنجیر پکڑ کر پوری قوت سے جھٹکا دے کر مجھے نیچے گرا دیا۔ سنبھلنے کی ناکام کوشش میں میرے ہاتھ آیا ہوا واحد ہتھیار بھی میری گرفت سے نکل گیا اور وہ چاروں ایک بار پھر مجھ پر ٹوٹ پڑے۔

اکیلے آدمی پر چار سورماؤں کی یلغار کو سہنا آسان کام نہیں تھا۔ پے در پے مُکّوں اور چہرے پر پڑنے والی دوسری ضربات نے آناً فاناً میں مجھے اپنے دفاع پر مجبور کر دیا۔ میں نے گھٹنے سمیٹ کر پوری قوت سے اپنے سینے سے لگا لیے اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ جنونی تھکے بغیر مجھ پر طاقت آزمائی کا سلسلہ ترک نہیں کریں گے۔

"یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟" ان چاروں کے پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان اچانک ایک نئی، درشت اور تحکمانہ آواز گونجی۔ اُس آواز میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ میری مشکل آسان ہو گئی اور وہ چاروں مجھے چھوڑ کر تیزی سے الگ ہو گئے۔

"سر! یہ بدمعاش ہیروئن کے اسمگلروں کے گروہ کا کارندہ ہے۔ ہم نے ایک مخبر کی اطلاع پر اسے ہیروئن کے ایک وزنی پیکٹ کے ساتھ اولڈ کلفٹن سے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا ہے۔" افسر کی بوکھلائی ہوئی آواز سُنائی دی۔

"میں نے پوچھا تھا کہ حوالات میں کیا ہو رہا ہے؟" نئی آواز میں بلا کی کاٹ پیدا ہو گئی۔ "ملزم کے ساتھ کون سے ضابطے کے تحت کشتی لڑی جا رہی ہے؟"

میں نے اپنی انگلیوں کے درمیان خفیف سی جھریاں پیدا کر کے نئی صورتِ حال کا جائزہ لیا تو وہ خاصی دلچسپ نظر آئی۔ مجھے مارنے والے مجرموں کی طرح سہمے ہوئے حوالات میں ایک طرف کھڑے ہوئے تھے اور باہر اُن کے افسر کے پاس سیاہ سوٹ اور بے داغ سفید قمیص میں ملبوس ایک نیا شخص کھڑا ہوا تھا۔ جس کی کنپٹیوں کے سفید بالوں نے سنہری فریم کے ہلکے عدسوں والی عینک سے مل کر اس کی وجاہت میں چار چاند لگا دیے تھے۔

"اس کا ایک ساتھی بھی تھا سر!" افسر کے ماضی کے صیغے نے مجھے چونکا دیا وہ ہکلاتے ہوئے انداز میں بتا رہا تھا۔ "اسے میں بیان کے لیے اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔ اسے وہاں بند کر کے میں انسپکٹر مہدی سے مشورہ کرنے کے لیے چند منٹ کے لیے باہر آیا تو وہ اتنی سی دیر میں میز پر کرسیاں رکھ کر روشندان کے ذریعے فرار ہو گیا۔ سب طرف دیکھ بھال کر لینے کے باوجود اس کا کہیں سراغ نہیں مل سکا۔ اِس سے اُسی کے بارے میں پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔"

اس انکشاف پر میری کھوپڑی بھک سے اڑ گئی۔ سراج بہت چالاک اور مکّار نکلا تھا کہ تخلیے میں فون کرنے کی مہلت طلب کر کے ان لالچی افسروں کی تحویل سے فرار ہو گیا تھا جبھی وہ لوگ اپنے لاکھوں کے نقصان پر بھنّا کر میرے اوپر ٹوٹ پڑے تھے۔ اُن کے نزدیک تو ہاتھ آئی ہوئی سونے کی چڑیا اُڑ گئی تھی جس کا کسی نہ کسی سے انتقام لینا ضروری تھا اور اس وقت میں ہی اُن کا بے بس ولاچار قیدی تھا اس لیے سارا نزلہ مجھ پر گرا تھا۔

آنے والا اُن لوگوں کا ہم نوا نہیں تھا۔ مجھے موہوم سی اُمید تھی کہ کہیں وہی ریٹا کا فرستادہ ڈپٹی کلکٹر نہ ہو اسی لیے میں نے بسورتے اور کراہتے ہوئے فرش چھوڑ دیا تاکہ اپنی گلوخلاصی کے امکانات پیدا کر سکوں۔

"ہیروئن، دونوں میں سے کس کے قبضے سے برآمد ہوئی تھی؟" عینک والے نووارد نے بغور میرا جائزہ لیتے ہوئے باہر کھڑے ہوئے افسر سے سوال کیا۔

"میں بالکل بے قصور ہوں جناب!" اُس افسر سے پہلے ہی میں رو دینے والے انداز میں بول پڑا۔ "یہ سارا چکر اِن لوگوں اور دوسرے آدمی کا تھا۔ یہ لوگ اسے بتا رہے تھے کہ یہ پندرہ

سے اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اس کی گاڑی کا ٹائر پنکچر تھا۔ میں اس کی مدد کے لیے گیا تھا کہ ان سب نے اچانک ڈال کر ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ ان کی ملی بھگت سے بھاگ اور اب یہ سارا الزام میرے اوپر ڈال دیں گے۔"

"یہ جھوٹا ہے سر!" افسر نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے ہم مفرور کے پیچھے ضرور لگے ہوئے تھے لیکن یہ اُس سے وصول کرنے آیا تھا۔ جب ہم نے چھاپا مارا تو ہیروئن کا اسی کے ہاتھوں میں تھا۔"

"تم میرے ساتھ آؤ۔" عینک والے نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ایک سپاہی نے جیب سے چابی نکال کر میری ں سے ہتھکڑی کھول دی جو میرے لیے نیک شگون تھا۔

"اصغر تم بھی آؤ!" عینک والے نے باہر کھڑے ہوئے سے کہا اور ایک طرف چل دیا۔

اس سفر کا اختتام ایک وسیع اور آراستہ کمرے پر ہوا جس کے دروازے پر زور آزمائی کے آثار موجود تھے اور اندر کی عقبی دیوار میں، چھت کے قریب بنے ہوئے روشن دان کے نیچے پر ایک کرسی اور اس پر اسٹول رکھا ہوا تھا جس کی مدد سے سراج وہاں سے فرار ہوا تھا۔ وہ کمرا یقینی طور پر اصغر ہی کا دفتر تھا۔

"اب تم سچی بات بتاؤ۔" عینک والے نے معنی خیز انداز میں دفتر کا جائزہ لینے کے بعد میز کے پیچھے پڑی ہوئی کرسی سنبھالتے ہوئے اصغر سے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ یہ شخص میرا انفارمر ہے اس لیے خود بھی گھپلے کے کاموں میں ملوّث ہوتا رہتا ہے ہو سکتا ہے کہ جو کچھ تم نے دیکھا تھا، وہ درست ہو مگر میں جانتا ہوں کہ اس شخص میں جرم کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ یہ اتنا ہی دلیر ہوتا تو میرا انفارمر ہونے کے بجائے کوئی بڑا مجرم ہوتا۔"

"صاحب! تمھاری عمر دراز ہو، سچّے جیس، کیسی لاکھ روپے کی بات کی ہے تم نے۔" میں نے تیسرے درجے کے بے ضمیر خوشامدیوں کی طرح دانت نکال کر کہا۔

وہ جو کوئی بھی تھا، بہت ذہین اور عالی دماغ شخص تھا۔ اس نے میری گردن بچانے کے لیے اس قدر فطری اور بے ساختہ بہانہ تراشا تھا کہ اصغر چکرا کر رہ گیا تھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔

"یہ آپ کا انفارمر ہی ہے تو مجھے چند سیکنڈ کے لیے اس سے علیحدگی میں بات کرنے کا موقع دیجیے پھر میں سب کچھ من وعن بتا دوں گا۔" اصغر نے گھگھیاتے ہوئے التجا کی۔

"ایسی کس رازداری کی ضرورت پڑ گئی؟ میرے سامنے بات کرو۔" عینک والے نے خشک لہجے میں کہا۔ وہ مرتبے میں اصغر سے بہت بالا نظر آ رہا تھا۔ "یہ بات ذہن میں رکھنا کہ میں تمھیں ضابطے کی کسی کارروائی سے نہیں روک رہا ہوں۔ تم چاہو تو روزنامچے میں ذکر کر سکتے ہو کہ تم نے اپنے چھاپے میں میرے انفارمر کو بھی رنگے ہاتھوں گرفتار کیا تھا اور بعد میں میری ذاتی مداخلت پر اُسے رہا کر دیا۔"

"نہیں سر!" اصغر اس طنز پر بلبلا کر بولا۔ "میں اتنا نمک حرام نہیں ہوں، آپ میرے محسن ہیں۔ آج آپ ہی کی وجہ سے اس کرسی پر نظر آ رہا ہوں ورنہ کب کا معطل کر دیا گیا ہوتا . . . در . . . دراصل مجھے آپ کے انفارمر سے ایک بہت ہی خاص ذاتی بات کرنی ہے، میں اسی کمرے کے ایک گوشے میں اس سے بات کر لوں گا۔"

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، جلدی بات کرو۔" عینک والا ناگواری کے ساتھ بولا۔

اصغر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اسی کمرے کے ایک گوشے میں لے گیا اور بھرائی ہوئی خوشامدانہ آواز میں بولا۔ "مجھے معاف کر دو، میرے باپ! چاہو تو بعد میں آ کر اپنی مرمّت کے جواب میں میرے سر پر جُوتے مار لینا مگر صاحب کو یہ نہ بتانا کہ میں سراج سے سودے بازی کر رہا تھا یا اُسے فون کرانے کے لیے حوالات سے نکال کر اپنے دفتر میں لایا تھا۔"

وہ بڑی مضحکہ خیز صورتِ حال تھی۔ جو شخص فرعون بنا ہوا کچھ دیر قبل میری ٹھکائی کرا رہا تھا، وہ اس وقت میرے سامنے کسی مجبور اور معذور آدمی کی طرح گڑگڑا رہا تھا۔

"ایک شرط ہے۔" میں نے اسی کی طرح رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "اپنے بیان میں تصحیح کر لینا۔ پیکٹ میرے ہاتھوں میں نہیں

تھا بلکہ تم نے سراج کی کار سے برآمد کیا تھا۔"

"منظور،" وہ ممنونیت سے لبریز سرگوشیانہ لہجے میں بولا اور ہم دونوں میز کی طرف آ گئے۔

"میں سچ سننے کا منتظر ہوں اصغر!" عینک والے نے سختی سے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ آپ کا انفارمر اصل مجرم کے پاس مدد کرنے کے لیے ہی آیا ہو۔ ہم نے کہانی میں زور پیدا کرنے کے لیے اسے ملوث کر لیا تھا حالانکہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ہیروئن کا پیکٹ اصل مجرم کی کار کی ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے برآمد کیا گیا تھا۔"

"شکر ہے خدایا! سچ آخر کار سر چڑھ کر بولتا ہے۔" میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر عابدانہ انداز میں اپنی نگاہیں چھت کی طرف اُٹھا دیں۔ "اپنی پیشانی پر ذلت کا یہ داغ لے کر میں تو جیتے جی مر جاتا۔ ۔ ۔"

"خاموش رہو،" عینک والے نے مجھے پھٹکار دیا۔ پھر وہ اصغر سے مخاطب ہوا۔ "مجرم شاید اسی کمرے سے فرار ہوا ہے۔ یہاں مجھے کسی قسم کی تفتیش کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے۔"

"یس سر، ہم سے چوک ہو گئی سر! ۔ ۔ ۔" وہ گڑگڑایا، مگر عینک والے نے بے رحمی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"چوک نہیں، بھاری لغزش کہو،" وہ جھٹکے سے کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "یہ نہ بھولو کہ میں برسوں پہلے ان راستوں سے گزر چکا ہوں جن پر تم اب بھٹک رہے ہو۔ یہ خیال رکھنا کہ مجھے مجرم کے فرار کے حالات و واقعات کی ذاتی طور پر تفتیش کی ضرورت پیش نہ آئے۔ ورنہ تمہارے عملے کو روسیاہی کے سوا کچھ نہ مل سکے گا۔"

وہ اصغر کے لیے کھلی ہوئی دھمکی تھی۔ عینک والے خرانٹ افسر نے موقع کا جائزہ لیتے ہی سراج کے فرار کے بارے میں اپنی ایک رائے قائم کر لی تھی جو میری دانست میں حقیقت سے بہت قریب تھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ ایماندار اور تجربہ کار افسروں کو حقیقت کی تہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، یہ اور بات ہے کہ بعض مجبوریاں انھیں حقائق سے چشم پوشی پر مجبور کر دیتی ہیں۔

عینک والا مجھے ساتھ لے کر دفتر سے نکلا تو اصغر بھی دست بستہ اس کے پیچھے نکلا تھا لیکن اُس نے اصغر کو وہیں روک کر اپنے عملے کی خبر لینے کی ہدایت جاری کر ڈالی۔

سیڑھیوں سے اُترنے کے بعد دیکھا کہ عینک والے کی کار احاطے کے ایک تاریک حصے میں کھڑی ہوئی تھی۔ اُس نے اشارے سے مجھے اگلی نشست پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے مجھے موہوم سا شبہ ہوا کہ کار کی عقبی نشست پر دراز قامت، برقع پوش خاتون بیٹھی ہوئی تھی جو اندھیرے کا ہی ایک جزو بنی ہوئی تھی۔

اس وقت عینک والا میرا محسن تھا اس لیے میں نے فوراً مڑ کر پیچھے دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کوئی سوال کرنا مناسب سمجھا۔

"یہ تو برا ہو گیا۔ اب کدھر چلا جائے؟" دفتر سے دور شہید ملت روڈ کی کشادہ شاہراہ پر نکل آنے کے بعد عینک والے نے سوال کیا۔

"چوکنڈی کے قبرستان کی طرف چلو،" عقبی نشست سے اُبھرنے والی بھرائی ہوئی مردانہ آواز سن کر میری رگوں میں لہو جم گیا، رونگٹے کھڑے ہو گئے اور بدن کے سارے مساموں سے یک بیک پسینے کی دھاریں بہہ نکلیں کیونکہ درد و اذیت کی شدت کے باوجود وہ آواز میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ "یہ وہی ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔" بولنے والے نے دوسرے فقرے میں اپنی بات مکمل کی۔

دلدار آغا مرا نہیں تھا بلکہ زندہ تھا اور اپنی کسی ناقابلِ یقین حکمت عملی کے ذریعے اس وقت مجھے اپنا قیدی بنا لینے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

میری آنکھوں کے سامنے تاریکی کے گنجان دائرے رقص کرنے لگے، صورت حال کے اس ناقابلِ یقین موڑ پر مجھے اپنا ذہن ماؤف ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے جس ازلی حریف اور دشمن کو میں اپنی دانست میں مردہ تصور کر رہا تھا وہ میرے محسن کے روپ میں سامنے آ کر ایک بار پھر مجھے زیر کر چکا تھا اور اس بار اس سے گلو خلاصی محال نظر آ رہی تھی۔

ڈی ڈی صبح سے کہاں روپوش تھا؟ اُسے کیسے علم ہوا کہ میں ایکسائز والوں کی حوالات میں قید تھا؟ وہ عینک والا افسر کون تھا؟ جسے میں سینڈو کا بھیجا ہوا اپنا ہمدرد تصور کر رہا تھا، لیکن وہ ڈی ڈی کا غلام ثابت ہو رہا تھا؟ یہ سب سوالات ایسے تھے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور جو شخص عقل کو ماؤف کر دینے والے ان سوالوں کے جوابات دے سکتا تھا وہ برقع اوڑھے، پچھلی سیٹ پر میری گھات لگائے بیٹھا تھا۔

آنے والے لمحات میرے لیے یقیناً بھیانک اور دہشت ناک ثابت ہونے والے تھے۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ جولائی 2002ء کو شائع ہو گا۔